نقارہ
باقر نقوی

# نقّارہ

گنتر گراس

---

باقر نقوی

پہلی اشاعت : دسمبر ۲۰۱۲ء
کمپوزنگ : لیزر پلس، فون: 32751324
قیمت : ۱۲۰۰؍ روپے


# نقّارہ

گنٹر گراس

باقر نقوی

*Naqqara*

(Novel)

*by* Gunter Grass

*Translated by* Baqar Naqvi

Kitab Market, Office# 17, St.# 3,
Urdu Bazar, Karachi, Pakistan
Ph: (92-21) 32751428
e-mail:a.bazyaft@yahoo.com

عمدہ شاعر، اہم دانش ور اور عزیز دوست

**سحر انصاری**

کے نام

# فہرست

# مُشک آنست...

اگر الفریڈ نوبیل سے متعلق میرے کام کو ایک تسلسل میں دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس سلسلے کا چھٹا حصہ معروف وممتاز جرمن ادیب گنتر گراس کے مشہورِ زمانہ ناول The Tin Drum کے اردو زبان میں ترجمے "نقارہ" کی صورت اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

گنتر گراس کی تخلیقی نگارشات میں یوں تو اس ناول کی حیثیت انفرادی ہے، تاہم یہ اُس کے تین سلسلے وار ناولوں کا پہلا حصہ بھی ہے۔ ناولوں کا یہ سلسلہ Danzig Trilogy کے نام سے مشہور ہوا اور کہنے والے کہتے ہیں کہ گراس کو شہرت کے بامِ عروج پر لے گیا تھا۔ کسی حد تک متنازعہ ہونے کے باوجود گراس کے اس ناول کو بیس ویں صدی کے جرمن زبان کے دس بہترین ناولوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس ایک بات سے بھی اس ناول کی ادبی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں کسی کتاب کا متنازعہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ لکھنے والے نے اپنے موضوع کو نئے انداز میں دیکھنے اور نئے طور سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ یقینی طور پر اپنے موضوع کے کچھ نہ کچھ ایسے پہلو نمایاں کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے جو عمومی مزاج کے خلاف ہیں اور اسے بدلنے کی قوت رکھتے ہیں۔ گنتر گراس کا بجا طور سے عالمی سطح پر پہچانے اور پڑھے جانے والے ممتاز ناول نگاروں میں شمار ہوتا ہے۔ اُسے ۱۹۹۹ء میں ادب کا نوبیل عطا کرتے ہوئے

اعتراف کمال کے لیے کہا گیا تھا:

جس کی شوخیوں بھری مگر سنگین حکایتیں تاریخ کے فراموش کردہ چہرے کی پیکر تراشی کرتی ہیں۔

۱۹۷۹ء میں گراس کے زیرِ نظر ناول پر مبنی فلم بھی بنی تھی جس کو غیر ملکی زبانوں میں بنائی جانے والے فلموں کا اکاڈمی ایوارڈ دیا گیا تھا۔

جو لوگ گنتر گراس کو اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں، وہ اس کے اندازِ تحریر سے اچھی طرح واقف ہوں گے۔ البتہ جو لوگ اس کو پہلی بار پڑھ رہے ہیں، ان کو یہ اندازِ تحریر انوکھا اور بسا اوقات بے ربطی کی حد تک نامانوس معلوم ہو سکتا ہے۔ تاہم اس کے بارے میں سرِدست میرا کچھ کہنا قبل از وقت اور شاید غیر ضروری ہوگا، اس لیے کہ یہ حق قاری کا ہے کہ وہ اس ناول کو اپنے انداز سے پڑھے اور صرف اسی کے بارے میں ہی نہیں، بلکہ خود گنتر گراس کے اسلوب اور اندازِ نگارش کے بارے میں بھی خود اپنی رائے قائم کرے۔ البتہ میں اتنی بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ میرے خیال میں اس قسم کی کتابوں کو گرفت میں لینے کے لیے چند باب، خواہ وہ کتنے ہی ادق یا سپاٹ کیوں نہ محسوس ہوں، اطمینان کے ساتھ پڑھنے ضروری ہوتے ہیں۔ میں اس سے زیادہ کچھ عرض نہیں کروں گا، اس لیے کہ میرا اس کتاب یا اس کے اندازِ تحریر کے بارے میں کچھ کہنا فارسی کے اس مقولے "مشک آنست کہ خود ببوید، نہ کہ عطار بگوید" جیسا ہوگا، اور میں عطار نہیں بننا چاہتا۔

اس ناول کے متن کے سلسلے میں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ناول میں دو ایک ایسے مقامات آئے ہیں، جہاں ہمارا عقیدہ اور تمام انبیا کے لیے ہمارا جذبۂ احترام ہمیں متن کو من و عن بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے میں نے ان جملوں کو اس ناول سے حذف کر دینا ناگزیر خیال کیا، لیکن یہ کام اس انداز سے کیا گیا کہ ان کے نہ ہونے سے ناول کے متن، اس کے بیانیے، اس کے تسلسل اور معنویت پر کوئی اثر نہ پڑے۔ بہ تکمیلِ تذکرہ آٹھ سو صفحات پر مشتمل اس ناول میں ایسے صرف اور صرف چند جملے تھے، جو حذف کیے گئے۔

اس امر کا اظہار بے جا نہ ہوگا کہ جب میں نے ناول کا ترجمہ شروع کیا تو اس کے اسلوب اور موضوع دونوں ہی نے مجھے الجھن میں ڈالا، لیکن پھر یہ ہوا کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا، ناول میں میرا جی اس طرح لگنے لگا کہ مجھے اس کے کردار اور اُن کو درپیش صورتِ حال سے کچھ نہ کچھ مماثلت اپنے عہد اور اس کے انسانی تجربے سے محسوس ہونے لگی۔ بڑا ادب اور بڑے ادیب اسی لیے زندہ رہتے ہیں کہ وہ اپنے عہد اور اپنے معاشرے ہی سے نہیں، بلکہ بعد کے زمانوں اور دوسرے معاشروں سے بھی اپنی معنویت کا رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ کمتر گراس کا زیرِ نظر ناول ایسی ہی نگارشات میں شامل ہے۔

باقر نقوی

لندن

نومبر ۲۰۱۲ء

# کشادہ لہنگا

میں دماغی اسپتال میں داخل ایک قیدی ہوں۔ میرا نگہبان ہر وقت مجھ پر اپنی نظریں جمائے رکھتا ہے، کبھی اپنی آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ میرے کمرے کے دروازے میں جھانکنے کے لیے ایک سوراخ بنا ہوا ہے۔ میرے نگہبان کی آنکھ ہلکے بھورے رنگ کی ہے جو میری جیسی نیلی آنکھ کے ذریعے کبھی دیکھ نہیں سکتا ہے۔

تو آپ دیکھیں گے کہ میرا نگہبان میرا دشمن نہیں ہو سکتا۔ اب وہ مجھے اچھا لگنے لگا ہے؛ جب وہ سوراخ کے ذریعے مجھ دیکھنا بند کر دیتا ہے اور میرے کمرے میں داخل ہو جاتا ہے تو میں اس کو اپنی زندگی کے حادثات کے بارے میں بتانے لگتا ہوں، تاکہ وہ ہمارے درمیان کے سوراخ کے بجائے براہِ راست مجھے دیکھے اور سمجھ سکے۔

ایسا لگتا ہے کہ وہ میری سرگزشت کو بہت پسند کرتا ہے، اس لیے کہ جب بھی میں اس کو اپنی زندگی کے افسانے سنانے لگتا ہوں تو شکرانے کے طور پر وہ مجھے اپنی کوئی تازہ ترین فن کاری دکھانے لگتا ہے۔ میں یہ وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ بہت اچھا فن کار ہے، مگر مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ اپنی تخلیقات کی نمائش کا انتظام کر لے تو اخبار والے اسے بہت پسند کریں گے اور ان کے کچھ خریدار بھی مل جائیں گے۔

جب مریضوں سے ملاقات کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو میرا نگہبان سب کے کمروں میں پڑی ڈوریوں کے ٹکڑے جمع کرتا ہے اور ان کو ملا کر ٹیڑھے میڑھے بھوتوں جیسے پتلے بناتا ہے، پھر

ان کو پلاسٹر آف پیرس کے محلول میں ڈبو ڈبو کر سخت ہونے کے لیے چھوڑ دیتا ہے، پھر ان کو بنائی کرنے والی تیلیوں پر نصب کر دیتا ہے جو لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں گڑی ہوتی ہیں۔

کبھی کبھی وہ اپنے بنائے ہوئے پتلوں کو رنگنے کا ارادہ کرتا ہے۔ میں اسپتال کے اپنے پلنگ کی مثال دے کر، اس کو اس کے خلاف مشورہ دیتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کی ذرا تصور کرو کہ یہ سارے بہترین قسم کے پلنگ اگر مختلف رنگوں میں رنگے ہوئے ہوں تو کیسے لگیں گے۔ وہ اس تصور کے خوف سے ہی اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کر دیتا ہے، اپنے ہمیشہ کے بے تاثر چہرے پر مصنوعی نفرت کا تاثر دے کر اپنے 'رنگین' ارادوں سے دست کش ہو جاتا ہے۔

دیکھا آپ نے !میرا سفید تام چینی کے رنگ کا بنا، دماغی اسپتال کا پلنگ ایک عام نوعیت کا معیار بن چکا ہے۔ میرے لیے تو یہ اس سے کہیں زیادہ ہے: میرا پلنگ وہ ہدف ہے جو بالآخر میں نے حاصل کر لیا ہے، یہ میرا دلاسا بن گیا ہے، بلکہ میرا عقیدہ بھی بن جائے گا، اگر اسپتال کی انتظامیہ مجھے اس میں کچھ تبدیلیاں کرنے کی اجازت دے — مثال کے طور میں چاہوں گا کہ اس میں لگی آڑ کو اونچی کر دوں، تا کہ یہ لوگوں کو میرے قریب آنے سے روک سکے۔

ہفتے میں ایک بار، ملاقات کا دن ایسی تنہائی کا دن ہوتا ہے کہ میں پلنگ میں لگی دھات کی بنی سفید رنگ کی آڑ کی شکن بن جاتا ہوں۔ یہی وقت ہوتا ہے جب وہ لوگ جو مجھے بچانا چاہتے ہیں، جو مجھ سے محبت کرنے میں دل چسپی رکھتے ہیں، جو اپنے آپ کو محترم اور معزز بنانا چاہتے ہیں، میرے ذریعے سے ہی اپنے آپ کو پہچانتے ہیں۔ کتنے کور چشم، کتنے بے چین اور کتنے بد نہاد ہیں وہ لوگ —وہ میرے پلنگ میں لگے ستونوں کی سفیدی کو قینچیوں جیسے ناخنوں سے کھرچتے ہیں، ان پر بال پوائنٹ قلم اور نیلی پنسل سے آدمیوں کے چھوٹے چھوٹے بیہودہ نقوش بناتے ہیں۔ میرا وکیل کمرے میں داخل ہوتے ہی دہاڑتا ہوا ہیلو کہتا ہے، اور اپنی نائیلون کی ہیٹ کو اچھال کر میرے پلنگ کے بائیں طرف کے نچلے ستون پر ٹانگ دیتا ہے۔ یہ عمل ایسے تشدد کے مانند ہوتا ہے جو اُس دن کا میرا ذہنی سکون برباد کر دیتا ہے۔ وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور نکال لیتا ہے جس پر دیر تک باتیں کرتا رہتا ہے۔

جب میرے ملاقاتی اپنے تحفے اس سفید رنگ کی چھوٹی سی میز کے نیچے رکھ دیتے

ہیں جس پر آئل کا اتھ کا رنگین پودوں سے مزیّن میز پوش پڑا رہتا ہے، اور جب وہ میری بہتری کے سارے تازہ ترین منصوبے بیان کر دیتے ہیں، اور مجھے، یعنی اُسے قائل کر لیتے ہیں جس کو بچانے کے لیے وہ اعلیٰ درجے کی خیرات کی ان تھک محنت کر رہے ہوتے ہیں، اور خود اپنے وجود کے بارے میں لطف اندوز ہوجاتے ہیں، تو مجھے چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ تب میرا نگہبان آ کر کمرے کی کھڑکیاں کھولتا ہے اور تحائف کے پیکٹوں کے تمام فیتے اور ڈوریاں جمع کرتا ہے۔ کمرے کی صفائی کے بعد چند لمحے میرے پاس بیٹھنے کا وقت بھی نکال لیتا ہے، مگر اس وقت وہ صرف ڈوریوں کو سلجھاتا رہتا ہے، اور جب خاموشی زیادہ طویل ہونے لگتی ہے تو میں اس خاموشی کو 'برونو' کا نام دے دیتا ہوں، یعنی 'برونو خاموشی'۔

برونو منسٹربرگ — اس بار میری مراد میرا نگہبان ہے، کہ میں اب لفظوں کے پھیر میں نہیں پڑنا چاہتا — میرے لیے لکھنے والے سادہ کاغذ کے پانچ سو صفحات لایا ہے۔

اگر اتنا کاغذ کافی نہ ہوا تو، برونو جو غیر شادی شدہ ہے، اس کے بچے نہیں ہیں اور اس کا تعلق 'سارلینڈ' سے ہے، وہ اس چھوٹی سی کاغذ پینسلوں کی دکان پر جائے گا جس پر کھلونے بھی بکتے ہیں، اور میرے لیے مزید سادہ کاغذ لائے گا جس پر لکھنے کے لیے لکیریں نہیں بنی ہوتیں، جنھیں میں اپنی یادداشت لکھنے کے لیے استعمال کرتا ہوں — میں صرف امید ہی کر سکتا ہوں کہ وہ سب تحریریں درست ہوں گی۔ میں اپنے ملاقاتیوں سے، مثلاً اپنے وکیل سے، یا کلیپ (klepp) سے اس قسم کی خدمت کے لیے نہیں کہہ سکتا۔ میرے بارے میں بہت محتاط توجہ کے باعث میرے دوست، میرے ذہن کے لیے سفید کاغذ جیسی خطرناک چیز مہیا نہیں کر سکتے جو ہمہ وقت الفاظ خارج کرنے پر تیار رہتا ہے۔

''او برونو'' میں نے کہا، ''کیا تم مجھے کنوارے کاغذوں کا ایک دستہ خرید کر لادو گے؟'' برونو نے چھت کی طرف نظر کی اور اپنی انگشتِ شہادت اٹھاتے ہوئے کہا، ''مسٹر آسکر آپ کا مطلب ہے، سفید کاغذ؟''

میں ''کنوارے'' پر اڑا رہا اور اس سے، دکان والے سے یہی لفظ کہنے کے لیے اصرار بھی کیا۔ جب شام کے وقت برونو کاغذ کا بنڈل لیے واپس آیا تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ

پریشان سا ہو۔ اس نے کئی بار چھت پر اپنی نظریں گاڑ دیں، جس سے وہ اپنا وجدان حاصل کرتا تھا۔ اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا، "وہ لفظ بالکل صحیح تھا، جو تم نے کہا تھا۔ جب میں نے دکان پر موجود لڑکی سے کنوارا کاغذ مانگا تو کاغذ لانے سے پہلے وہ بہت شرما گئی تھی۔"

اس خیال سے کہ کہیں اس قسم کی دکانوں کی لڑکیوں کے بارے میں کبھی نہ ختم ہونے والی گفتگو کا سلسلہ شروع نہ ہو جائے میں نے کنوارے کاغذ کے بارے میں معذرت کی، اور برونو کی کمرے سے واپسی تک انتظار کیا۔ اس کے بعد ہی میں نے لکھنے والے پانچ سو کاغذوں کا وہ بنڈل کھولا۔ تھوڑی دیر تک تو میں اپنے ہاتھوں میں۔ لیے کاغذ کے اس پیچ دار بنڈل کو تولتا رہا؛ پھر میں نے اس میں سے، گن کر دس صفحات نکالے، اور بقیہ کاغذ کو سرھانے رکھی میز کی دراز میں رکھ دیا۔ پھر تصویروں کے البم والی دراز سے میں نے اپنا قلم نکالا، قلم پوری طرح بھرا ہوا تھا، اس لیے روشنائی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا — تو اب کہاں سے شروعات کی جائے؟

کہانی کہیں درمیان سے بھی شروع کی جا سکتی ہے اور خلفشار پھیلانے کے لیے، آگے پیچھے سے کچھ سطریں کاٹی بھی جا سکتی ہیں۔ آپ جدید بھی ہو سکتے ہیں۔ وقت اور فاصلوں کو ایک جانب رکھتے ہوئے، جب پورا کام ہو جائے تو، آپ دعویٰ کریں، یا کسی اور کو اپنی جانب سے دعویٰ کرنے دیں، کہ آپ نے عین آخری وقت میں، بالآخر خلا اور وقت کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ یا بالکل شروع ہی میں آپ یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ آج کل ناول لکھنا ناممکن ہو گیا ہے، مگر پھر، بقول شخصے، اپنے پسِ پشت، آپ ایک بہت بڑے جھوٹ — یعنی ایک فرضی کہانی — کو جنم دیتے ہیں، ایسا ایک ناول جو تمام ناولوں کو ختم کر دیتا ہے۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس سے اچھا تاثر پیدا ہوتا ہے، بقول شخصے انکسار کا تاثر، اگر آپ اس بات سے ابتدا کریں کہ اب ناول میں کوئی ہیرو نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اب شخصیت پرستی باقی نہیں رہی ہے، اس لیے کہ انفرادیت ماضی کی بات رہ گئی ہے، اس لیے کہ آدمی — ہر آدمی، بلکہ تمام آدمی ایک ساتھ مل کر — اپنی تنہائیوں میں بھی اکیلے ہو گئے ہیں، اور کسی شخص کو بھی اپنی تنہائی کا حق نہیں رہ گیا ہے، اور تمام لوگ مل کر ایک "تنہائی کا انبار" بن چکے ہیں جن کے نہ کوئی نام ہیں اور نہ کوئی ہیرو۔

یہ سب کچھ صحیح ہو سکتا ہے، مگر جہاں تک میرا اور میرے نگہبان برونو کا معاملہ ہے،

میں بہ صد عجز کہنا چاہتا ہوں کہ ہم دونوں ہی ہیرو ہیں— بہت مختلف قسم کے ہیرو— وہ دروازے کے سوراخ کے اس جانب کا ہیرو ہے اور اپنی جانب کا ہیرو میں ہوں؛ اور اس وقت بھی جب وہ دروازہ کھول دیتا ہے، ہم دونوں ہی، اپنی تمام تر دوستی اور تنہائی کے باوصف، بے نام ہوتے ہوئے بھی، بغیر ہیرو کا ایک انبار ہوتے ہیں۔

تو میں، اب میں، اپنے آپ سے بہت فاصلہ رکھ کر، کہانی کی ابتدا کروں گا، اس لیے کہ کسی کو بھی اپنی کہانی خود نہیں کہنی چاہیے، جسے اپنے وجود کی نفی کیے بغیر، اپنے بزرگوں کے نصف کے بارے میں، کم از کم، کچھ کہنے کا بھی یارا نہیں ہوتا۔ اس لیے، میرے پیارے قاری، میں آپ سے جو، بلا شبہ اس ادارے سے باہر رہ کر بھی ابتر قسم کی زندگی گزارتے ہیں، اور اپنے دوستوں اور ہفتے وار آنے والے ملاقاتیوں سے بھی، جو مجھے کاغذ کی سپلائی سے کسی شبہے میں نہیں پڑتے، آسکر کی— یعنی اپنی نانی کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔

کچھ دن پہلے، اکتوبر کے آخری دنوں میں میری نانی انا برانسکی ( Anna Bronski) اپنے لہنگے میں ملبوس آلو کے کھیت کے کنارے پگڈنڈی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ صبح کے وقت میری نانی کتنے ماہرانہ انداز میں آلو کے گرے ہوئے پودوں سے ایک نفیس قسم کا انبار بنا رہی تھی؛ دوپہر کے وقت اس نے ڈبل روٹی پر چربی اور شہد لگا کر کچھ ٹکڑے کھائے تھے؛ اور اس کے بعد، آخری بار، اس نے کھیت میں کچھ کھدائی بھی کی تھی؛ اور اب وہ اپنے لہنگے سمیت، وہ تقریباً بھرے ہوئے ٹوکروں کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔

اس کے جوتوں کے تلے زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے زمین پر جھکے ہوئے تھے، دونوں جوتوں کی نوکیں ایک ساتھ ملی ہوئی تھیں، اور ان کے بالکل سامنے آلو کے جلتے ہوئے پودوں کے الاؤ سے دھواں اٹھ رہا تھا، جو کبھی کبھی سانس لینے میں تکلیف کا باعث ہو رہا تھا، اور ابکائی پیدا کرنے والی دھوئیں کی چادر زمین کو ڈھانکے لے رہی تھی۔

یہ واقعہ 1899 کا ہے— وہ کشوبیا کے مرکزی علاقے میں بیٹھی ہوئی تھی، جو بساؤ سے زیادہ دور نہیں، مگر رامکاؤ اور ویریک کے اینٹیں بنانے کے کارخانوں سے قریب ہے۔ اس کے سامنے برنتاؤ شاہراہ، ایسے نقطے پر ہے جہاں ڈرشاؤ اور کارٹ ہاؤس واقع

ہیں، جب کہ اس کے پیچھے گولڈ کروگ کا سیاہ جنگل ہے؛ اس مقام پر بیٹھی، وہ کسی جھاڑی کی جلی ہوئی ایک شاخ کی مدد سے بھوبل کے نیچے آلو دبا رہی تھی۔

میں نے اپنی نانی کے لہنگے کا خاص طور پر ذکر اس لیے چھیڑا ہے، تا کہ کسی کو شبہ نہ ہو کہ وہ اپنے لہنگے سمیت بیٹھی ہوئی تھی۔ اور شاید میں اس حد تک آگے چلا گیا ہوں کہ میں نے اس پورے باب کو ''کشادہ لہنگا'' کا عنوان بھی دیا ہے۔ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کی میں اس لہنگے کا کتنا مقروض ہوں۔ میری نانی صرف ایک ہی لہنگا نہیں پہنے ہوئے تھی، بلکہ، تلے اوپر چار تھے۔ اس سے یہ قیاس نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ ایک لہنگا پہنے ہوتی تھی اور نیچے تین عدد پیٹی کوٹ تھے۔ نہیں! وہ بہت سارے لہنگے ایک ساتھ پہنتی تھی، سب کو، ایک مخصوص نظام کے طور پر۔ اور وہ نظام یہ تھا کہ، ہر روز لہنگا تبدیل ہو جاتا تھا۔ کل جو لہنگا اوپر تھا وہ آج دوسرے لہنگے کی جگہ لے لیتا تھا؛ دوسرے لہنگا تیسرا بن جاتا تھا۔ وہ لہنگا جو پچھلے دن تیسرا تھا، آج اس کے جسم سے متصل تھا۔ کل جو اس سے قریب ترین تھا، آج اس کے نقش و نگار ظاہر ہو رہے تھے، یا وہ نقش و نگار سے ماورا تھا؛ میری نانی انا برانسکی کے تمام لہنگے آلو کے رنگ سے مشابہ ہوتے تھے۔ یہی اس کی پسند تھی۔

رنگ کے علاوہ، پارچے کی کشادگی کے باعث لہنگے قابلِ دید ہوتے تھے۔ ہوا چلتی تو پھول جاتے اور لہراتے، ہوا پاس سے گزرتی تو چڑ چڑاتے، اور جب ہوا گزر جاتی تو ڈھلک جاتے تھے؛ اور جب ہوا پیچھے کی ہوتی تھی تو چاروں اس سے آگے آگے اڑتے۔ وہ بیٹھتی تو اپنے تمام لہنگوں کو سمیٹ لیا کرتی تھی۔

لہراتے، ڈھلکتے، تہہ در تہہ لٹکتے، یا ایستادگی کی حالت میں اکڑے ہوئے، یا بستر کے کنارے لٹکے ہوئے چار لہنگوں کے علاوہ، میری نانی کے پاس ایک پانچواں لہنگا بھی تھا۔ یہ بھی آلو جیسے رنگ والے چاروں سے مختلف نہیں تھا، مگر دراصل یہ پانچواں ہمیشہ پانچواں ہی نہیں ہوتا تھا۔ اپنے بھائیوں کی طرح — کہ لہنگا بھی مذکر ہی ہوتا ہے — یہ لہنگا بھی تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ اس کو چاروں کی طرح ہی پہنا جاتا تھا، اور ان ہی کی طرح جب اس کا نمبر آتا تھا، تو اس کو ہر پانچویں دن، جمعے کو دھونے کے برتن میں ڈال دیا جاتا تھا۔ پھر سنیچر کے دن یہ باورچی خانے

کی کھڑکی سے بندھی الگنی پر ہوتا تھا اور، خشک ہو جاتا تو استری کے تختے پر ہوتا تھا۔

پھر جب گزرے سنیچر کے دنوں کے بعد، جو گھر کی صفائی، ڈبل روٹی کی پکائی، کپڑوں کی دھلائی، کپڑوں پر استری اور گایوں کی دوھائی اور چارہ پانی دیے جانے کے بعد میری نانی خود کو سر سے پاؤں تک نہانے کے ٹب میں ڈبو لیتی، اور جب کافی دیر صابن کے بلبلوں میں ڈوبی رہنے کے بعد سے ذرا دیر کو نکلتی، اور ٹب کا پانی اپنی عام سطح پر آجاتا، تو وہ اپنے جسم کو پھول دار تولیوں میں لپیٹے ٹب کے کنارے پر ٹکی بیٹھی رہتی۔ اس کے سامنے دھلے ہوئے چاروں لہنگے فرش پر پھیلے رہتے تھے۔ پھر وہ اپنے داہنے ہاتھ کی پہلی انگلی کی مدد سے اپنی پلک کو اٹھا کر، وہ کسی سے، حتیٰ کہ اپنے بھائی وِنسنٹ سے بھی مشورہ کیے بغیر ہی خود طے کرتی تھی کہ اس کیا کرنا ہے۔ پھر وہ کھڑی ہوتی اور اپنے پاؤں کی نوک سے آلو کے رنگ والے لہنگوں کو ایک طرف کر دیتی جن کے رنگ اپنی دمک کھو چکے تھے۔ ان کی جگہ تازہ ترین دُھلا ہوا لہنگا لے لیتا تھا۔

اتوار کی صبح کو وہ رامکاؤ گرجا گھر گئی تھی اور اس نے اپنے نئے لہنگے کو یسوع مسیح کے نام کیا تھا، جن کے بارے میں اس کے اپنے طے کردہ تصورات تھے۔ اس نے تازہ دُھلے ہوئے لہنگے کہاں پہنے تھے؟ وہ نہ صرف صاف مزاج والی، بلکہ خیالات سے خالی قسم کی عورت تھی؛ جب موسم ذرا اچھا ہوتا تو وہ اپنا بہترین لہنگا زیبِ تن کیا کرتی تھی؛ تا کہ سورج کی روشنی میں وہ اچھا دکھائی دے۔

مگر، آج دوشنبے کی دوپہر تھی اور میری نانی آلو کے پودوں سے جلنے والے الاؤ کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ آج اس کا اتوار والا لہنگا اس کے جسم سے ایک تہہ قریب تھا، جب کہ وہ جو اتوار کے دن میں اس کے جسم کی گرمی سے نہایا ہوا تھا، دوشنبے کی بے رونقی میں اس کی کمر سے چپکا ہوا تھا۔

بغیر کسی ارادے کے منہ سے سیٹی بجاتے ہوئے، اس نے بھوبل میں دبا ہوا پہلا آلو کسی جھاڑی کی ایک شاخ کی مدد سے ڈھونڈ کر باہر نکالا، اور اس کو دھواں دیتی ہوئی راکھ کے ڈھیر سے ذرا پرے کر دیا، تازہ ہوا میں ٹھنڈا ہونے کے لیے۔ پھر اس جلے ہوئے، کھرے چھلکوں

والے گومڑے کو ایک نوکیلی لکڑی پر گود کر اپنے منہ کے قریب لے گئی تھی؛ اس وقت اس نے سیٹی بجانی چھوڑ دی تھی اور اس نے ہوا سے خشک اپنے پپڑی بھرے ہونٹوں سے، راکھ سے نکالے ہوئے آلو پر پھونک مارنی شروع کی تا کہ اس کے چھلکے میں لگی مٹی اور راکھ علاحدہ ہو جائے۔

پھونک مارتے ہوئے میری نانی نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ جب اس کے خیال میں پھونک کافی ہو گئی تھی، تو اس نے پہلی اپنی ایک آنکھ کھولی، پھر دوسری، پھر اس نے اپنے کھڑکی والے سامنے کے دانت جو بالکل ٹھیک لگتے ہیں، آلو میں گاڑ دیے، اور آلو کا نصف حصہ الگ کر لیا، جس کو ہاتھ میں جملا کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی، اس لیے کہ آلو ابھی اتنا ٹھنڈا نہیں ہوا تھا کہ کھایا جا سکتا۔ اکتوبر کی ہوا میں وہ آلو سے نکلتی ہوئی بھاپ کو سونگھ رہی تھی؛ جب کہ اس کی پوری طرح کھلی ہوئی آنکھیں سامنے پھیلے میدان کے افق پر لگی ہوئی تھیں، جسے ٹیلی گراف کے کھمبوں نے، اور اینٹوں کے بھٹے کی چمنی نے الگ الگ حصوں میں بانٹ دیا تھا۔

کوئی شے تھی جو ٹیلی گراف کے کھمبوں کے درمیان حرکت کر رہی تھی۔ نانی نے اپنا منہ بند کر لیا۔ کچھ تھا ضرور جو اچھل رہا تھا۔ وہاں تین آدمی تھے جو ایک کھمبے سے دوسرے کھمبے تک بھاگ رہے تھے، تین آدمی چمنی کی طرف گئے، پھر اس کے اطراف سے ہو کر سامنے آ گئے، جب کہ ان میں سے ایک دوبارہ پیچھے کی طرف واپس بھاگ گیا۔ وہ چھوٹے قد اور گٹھے بدن کا آدمی لگتا تھا، اس نے نئے سرے سے بھٹے کے احاطے میں دوڑ لگائی، جب کہ دوسرے دو، جو دُبلے اور قد آور تھے، اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ پھر وہ بھٹے سے باہر نکلے، اور ٹیلی گراف کے کھمبوں کے درمیان آ گئے تھے، مگر چھوٹے قد اور گٹھے بدن والا مڑ کر گھوم گیا، ایسا لگتا تھا جیسے اسے قد آور اور دُبلے والوں کے مقابلے میں زیادہ جلدی تھی جنھیں بھی چمنی تک واپس جانا تھا، اس لیے کہ وہ پہلے ہی جانا چاہ رہا تھا، جس سے وہ دونوں دو ہاتھ کے فاصلے پر تھے، تیاری کر رہے تھے، اور وہ اس طرح اچانک چلے گئے گویا ان کی ہمت ٹوٹ گئی تھی، اور وہ، چھوٹا والا بھی، چمنی کے چھلانگ لگانے کے دوران ہی افق کے پیچھے غائب ہو گیا تھا۔

وہ سب نظروں سے غائب رہے کہ یہ ایک وقفہ تھا، کہ وہ اپنی پوشاک بدل رہے تھے، یا اینٹیں بنانے لگے تھے جس کی انھیں اُجرت ملتی تھی۔ اس وقفے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے

میری نانی نے بھوبل سے ایک اور آلو نکالنے کی کوشش کی، مگر وہ ناکام رہی۔ اس لیے کہ وہ آدمی جو چھوٹے قد اور گٹھے بدن کا تھا، جس نے اس ساری حرکت کے بعد بھی اپنی پوشاک نہیں بدلی تھی، افق کے اوپر اس طرح نظر آیا تھا گویا وہ ایک باڑھ تھی، اور اس کا تعاقب کرنے والے پیچھے رہ گئے تھے، اینٹوں کے درمیان یا برنٹاؤ جانے والی سڑک پر۔ مگر وہ بہت عجلت میں تھا؛ اس کوشش میں کہ وہ بجلی کے کھمبوں کے درمیان تیز دوڑ سکے، اس نے میدان میں لمبے لمبے مگر آہستہ قدم بھرے؛ جب وہ گیلی زمین پر بھاگ رہا تھا تو اس کے جوتوں میں لگی مٹی فضا اُڑ رہی تھی اور اگرچہ وہ چھلانگ لگا رہا تھا، وہ رینگتا دکھائی دے رہا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ زمین سے جڑا لگتا، اور کبھی ہوا میں اڑتا لگتا تھا، پھر بھی اس کے پاس اتنا وقت تھا کہ وہ اپنا چہرا پونچھتا جاتا تھا، قبل اس کے کہ اس کا پاؤں تازہ تازہ جوتی ہوئی زمین پر پڑتا، جو پانچ ایکڑ پر محیط آلو کے کھیت اور ایک تنگ گلی کے کنارے تھی۔

وہ، چھوٹے قد اور گٹھے بدن والا، گلی تک پہنچ گیا تھا؛ ابھی وہ گلی میں غائب بھی نہیں ہوا تھا کہ دوسرے دو، یعنی لانبے قد اور دُبلے بدن والے، جو شاید اس دوران اس کو بھٹے کے احاطے میں تلاش کر رہے تھے، افق کے اوپر چڑھتے، اور کیچڑ میں پاؤں گھسیٹتے ہوئے نظر آئے، وہ لانبے اور دُبلے تھے، مگر اتنے دُبلے بھی نہیں کہ بالکل ہڈی چمڑا ہوں۔ میری نانی ایک بار پھر بھوبل سے آلو نکال نہیں پائی تھی؛ اس لیے کہ اس قسم کا تماشا روز روز تو نہیں ہوتا، تین سالم، پتلے بڑھے آدمی، حالاں کہ وہ ایک ہی انداز میں نہیں پتلے بڑھے تھے، ٹیلی گراف کے تاروں کے درمیاں اچھلتے کودتے، اس طرح گویا وہ اینٹوں کے بھٹے کی چمنی کو توڑ ہی ڈالیں گے، پھر وقفے کے دوران، پہلا چھوٹے قد اور گٹھے جسم والا، مگر سب کو وہی مشکل تھی، کہ ان کے جوتے زیادہ سے زیادہ مٹی اٹھا رہے تھے، کھیت سے اچھل کر نکلے، جسے وِنسنٹ نے دو دن قبل ہی جوتا تھا، اور پھر وہ نچلی گلی میں غائب ہو گئے۔

تینوں غائب ہو گئے تو میری نانی نے ایک بار پھر آلو نکالنے کی ٹھانی، جو اَب تک تقریباً ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے فوراً پھونک مار کر چھلکے سے مٹی اور راکھ دور کی، اور پورا آلو سیدھا منہ میں ڈال لیا۔ وہ لوگ یقیناً بھٹے والے ہوں گے، اگر وہ سوچ رہی تھی تو اس نے

یہی سوچا تھا، اور وہ ابھی تک منہ کو دائرے کی شکل میں چلا کے کچھ چبا رہی تھی کہ ان میں سے ایک آدمی اچھل کر گلی سے نکلا؛ کالے رنگ کی مونچھ پر وحشی وحشی آنکھیں، دو چھلانگوں میں ہی الاؤ تک پہنچ گیا، آگے کھڑا ہوا، پیچھے گیا، اور پھر آگ کے برابر، اور یہ سب کچھ ایک ہی جست میں کیا تھا، گالیاں بکتے ہوئے، خوف کے عالم میں، یہ خبر نہیں کہ کدھر کو جانا ہے۔ واپس بھی نہیں جا سکتا تھا اس لیے کہ پیچھے سے وہ دونوں، لانبے اور دُبلے پتلے، گلی سے نکل آئے تھے۔ اس نے اپنے گھٹنے پر ہاتھ مارا، اس کے کاسۂ سر سے آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں، ماتھے سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ زور زور سے سانسیں لیتے ہوئے، پورا چہرہ لرز رہا تھا، اور وہ اس حالت میں نانی کے جوتوں کے تلوں کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر اس طرح منہ اُٹھا کر دیکھا جیسے وہ کوئی خوف زدہ چھوٹا سا جانور ہو۔ گہرا سانس لیتے ہوئے، جس کے باعث ان کا منہ چلنا بند ہو گیا تھا، میری نانی نے اپنے گھٹنے بلند کیے، اینٹیں بنانے والوں کے بارے میں سوچنا بند کر دیا، اور اپنا لہنگا اٹھا دیا، ایک نہیں چاروں لہنگے اتنے بلند کیے کہ وہ کم قامت اور گٹھے جسم والا، جو اینٹیں بنانے والوں میں سے نہیں تھا، لہنگے کے اندر رینگ کر چلا جائے۔ اس کی کالی مونچھیں غائب ہو چکی تھیں، اب وہ جانور جیسا نہیں لگ رہا تھا، نہ ہی وہ 'رام مکاؤ' والا تھا نہ 'وریک' والا، کسی نہ کسی طرح وہ اپنے خوف سمیت غائب ہو گیا تھا۔ اب وہ نہ چھوٹا رہ گیا تھا اور نہ گٹھے بدن والا، مگر جگہ اس نے اتنی ہی گھیر لی تھی۔ وہ زور زور سے سانسیں لینا اور لرزنا بھول گیا تھا، گھٹنوں پر ہاتھ مارنا بھی بند کر دیا تھا؛ سب کچھ اس طرح ساکت ہو گیا تھا گویا یہ روزِ ازل تھا، یا روزِ قیامت۔ آلو کے الاؤ کو ہوا لگ رہی تھی، ٹیلی گراف کے کھمبے خاموشی میں خود کو گن رہے تھے، بھٹے کی چمنی اٹین شن کھڑی تھی اور میری نانی نے اپنے سب سے اوپر والے لہنگے کو دوسرے لہنگے کے اوپر، نفاست اور ہوشیاری سے برابر کر لیا تھا۔ اپنے چوتھے لہنگے کے نیچے اسے وہ آدمی مشکل ہی سے محسوس ہو رہا تھا، اور تیسرے لہنگے کو تو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ اس کی جلد کے برابر کوئی شے تھی۔ ہاں! یہ عجیب سے بات تھی، مگر اوپر والے لہنگے قرینے سے برابر کر لیے گئے تھے، اور دوسرے اور تیسرے لہنگے کو کچھ خبر نہیں تھی؛ اب اس نے بھوبل میں سے دو یا تین آلو نکالے، اپنے داہنے بازو کے نیچے

والی جھاڑی سے چار کچے والے نکالے، ان کچے آلوؤں کو ایک ایک کر کے بھوبل میں دبا دیا، ان پر مزید راکھ ڈال دی، اور آگ کو کُریدا جب تک کہ اس میں سے بادل جیسا دھواں نہیں اٹھنے لگا تھا —— بیچاری، اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

میری نانی کا لہنگا ابھی مشکل ہی سے برابر ہوا تھا؛ آلو کی آگ کا الاؤ اس تمام چھیڑ چھاڑ کے باعث ہر طرف سے بے ہنگم ہو گیا تھا، اور اسے ٹھیک سے ہوا نہیں لگ رہی تھی۔ اچانک نچلی گلی سے وہ لمبا اور دُبلا پتلا والا آدمی اچھل کر سامنے آ گیا۔ وہ چھوٹے قد اور گٹھے بدن والے کو ڈھونڈ رہا تھا جو میری نانی کے لہنگے کے نیچے رہنے کا اپنا سارا انتظام کر چکا تھا؛ وہ دونوں واقعی لمبے اور دُبلے پتلے تھے، اور وہی پولیس کی وردی زیبِ تن کیے ہوئے تھے۔

وہ اتنی تیزی سے دوڑتے ہوئے آ رہے تھے کہ نانی کے پاس سے ہوتے ہوئے آگے چلے گئے تھے۔ پھر اچانک انھیں خیال آیا ہوگا کہ ان کے جوتے میں ایڑیاں بھی ہیں وہ جنھیں بریک کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے پلٹ کر الاؤ پر چھلانگ لگائی اور اپنی وردی، پیٹی، جوتوں اور تمام لوازمات سمیت، دھوئیں کے باعث کھانستے اور اپنی وردی کو دھوئیں سے بچاتے ہوئے، میری نانی سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ کیا اس نے کو واچکی (Koljaiczek) کو دیکھا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اسے ضرور دیکھا ہوگا، اس لیے کہ وہ گلی کے کنارے یہاں بیٹھی ہوئی ہے، اور وہ اسی طرف بھاگا ہوا آیا تھا۔

میری نانی نے کوواچکی کو نہیں دیکھا تھا، اس لیے کہ وہ اسے نہیں جانتی تھی۔ کیا وہ اینٹوں کے بھٹے میں کام کرتا ہے، نانی نے پوچھا، اس لیے کہ وہ صرف انھیں لوگوں کو جانتی ہے جو بھٹے میں کام کرتے ہیں، مگر وردی والوں کا کہنا تھا اس آدمی کوواچکی کا اینٹوں کے بھٹے سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا تھا، وہ بس اتنا جانتے تھے کہ وہ پستہ قد، چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ میری نانی کو یاد آیا کہ اس نے اس قسم کے ایک آدمی کو دوڑتے دیکھا تھا، اور نانی نے اپنی چھڑی سے، جس کی نوک پر بھاپ دیتا ہوا آلو لگا ہوا تھا، اوھر، بساؤ کی طرف اشارہ کیا، جس کو اگر آلو کی کھیت کے حساب سے دیکھا جائے تو مغرب کی طرف تقریباً چھ یا سات ٹیلی گراف کے کھمبوں کے برابر دور گیا ہوگا۔ مگر کیا وہ شخص جو بھاگ رہا تھا کوواچکی ہی

تھا، نانی اس کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ نانی کو اس کا الاؤ ہی خاصا پریشان کیے ہوئے تھا۔ اس نے کہا، یہ کم بخت مشکل سے جل رہا ہے، تو وہ کس طرح ان سب دوڑتے بھاگتے یا دھوئیں میں کھڑے لوگوں کے بارے میں اپنا سر کھپا سکے گی۔ اور یہ بھی، کہ وہ جن سے واقف نہیں ان کے بارے میں کیوں پریشان ہو، وہ تو صرف بساؤویریک، رامکاؤ اور اینٹوں کے بھٹے کے بارے میں ہی جانتی ہے، اور اس کے لیے تو اتنا ہی بہت ہے۔

اتنا کہنے کے بعد، میری نانی نے شکھ کا سانس لیا، مگر یہ سانس کچھ اس قسم کا تھا جس نے وردی والوں کو یہ پوچھنے پر مجبور کر دیا کہ ایسی کون سی بات ہوئی ہے جو سُکھ کے سانس کا باعث ہوئی ہے۔ نانی نے الاؤ کی طرف دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ شاید وہ یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ اس نے اس لیے گہرا سانس لیا تھا کہ الاؤ ٹھیک سے جل نہیں رہا تھا، یا پھر اس وجہ سے بھی کہ لوگوں دھوئیں میں کھڑے ہوئے تھے؛ پھر اس نے اپنے کھڑکی والے سامنے کے دانتوں سے آدھا آلو کاٹ لیا، اور اپنی تمام تر توجہ چبانے پر مرکوز کر دی، جب کہ اس کے دیدے آسمان کی طرف تھے۔

میری نانی کی لاپروا نظریں وردی والوں سے کچھ نہیں کہہ رہی تھیں؛ اور وہ لوگ یہ نہیں طے کر پائے تھے کہ ٹیلی گراف کے کھمبوں کے پیچھے بساؤ کی طرف دیکھیں، پھر انھوں نے اپنی سنگینیں آلو کے پودوں کے اس ڈھیر میں گھونپ دیں جن کو ابھی آگ نہیں لگائی گئی تھی۔ کسی اچانک خیال کے تحت، انھوں نے اس کے ساتھ ہی، ان دونوں ٹوکروں کو بھی ٹھوکا مار کر الٹ دیا جو نانی کی کہنیوں کے نیچے رکھے ہوئے تھے۔ وہ حیران تھے کہ ان میں سے سوائے آلوؤں کے بکھر جانے کے اور کچھ نہیں نکلا، کہ کوواچکی بھی نہیں نکلا۔ شبہے سے بھرپور، وہ آلو کے تمام ڈھیروں کی طرف چکر لگاتے رہے، گویا کسی طرح کوواچکی ان میں چھپ گیا ہو گا۔ پھر انھوں نے ان میں بھی سنگینیں بھونک دیں، اس طرح جیسے وہ کسی کو جان بوجھ کر نشانہ بنا رہے تھے، اور اس بات پر حیران ہو رہے تھے کہ ان میں سے کوئی چیخ نہیں نکل رہی تھی۔ انھیں ہر شے پر شبہ ہو رہا تھا، چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں پر، چوہوں کے بلوں پر حتیٰ کہ چیونٹیوں کی بنائی ہوئی مٹی کی ڈھیریوں پر؛ خود نانی کے وجود پر بھی، جو اس طرح جم کر بیٹھی

ہوئی تھی گویا اس کی جڑیں زمین میں پیوست ہوں، گہرے سانس لیتی، آسمان کی طرف اس طرح دیکھتی ہوئی کہ اس کے دیدوں کی سفیدی دکھائی دے رہی تھی، اور وہ تمام پیروں فقیروں کے کشوبیائی نام گنوا رہی تھی — گویا جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سب آگ کی خراب کارکردگی اور آلو کے ٹوکروں کی ابتری کا باعث ہوا تھا۔

وردی والے تقریباً آدھ گھنٹے وہیں جمے رہے۔انھوں نے آگ سے مختلف فاصلوں پر بیٹھ کر پوزیشنیں سنبھال لی تھیں، انھوں نے چمنی کی بلندی کو اپنے نشانے پر رکھ لیا تھا، بساؤ پر حملہ کرنے کی ٹھان لی تھی، اور اپنے اُودے رنگ کے ہاتھ اس وقت تک آگ کی جانب کیے رہے، جب تک کہ میری نانی نے، اپنی شکھو کی گہری سانسیں روکے بغیر، ان کے ہاتھوں میں جلے ہوئے آلو پکڑا نہیں دیے تھے۔آلو کھانے کے دوران وردی والے یہ نہیں بھولے تھے کہ وہ وردی والے ہیں، اور، وہ اچانک بھاگ کر کھیتوں کی جانب گئے، جہاں سے گلی گزرتی تھی، اور انھوں نے ایک خرگوش کو پریشان کر دیا تھا، جو بدقسمتی سے کوواچکی نہیں نکلا۔ آگ کی طرف واپس آتے ہوئے انھوں نے بھاپ دیتے ہوئے سوکھے شکوے آلو اٹھائے اور، اپنی لڑائیوں سے تھکے ہارے ہونے کے باعث، فیصلہ کیا کہ وہ کچے آلوؤں کو واپس ٹوکروں میں ڈال دیں گے، جنھیں انھوں نے اپنا فرض نبھانے کے دوران الٹ دیا تھا۔

جب شام ہو چلی اور اکتوبر کے افق پر اندھیرا پھیلنے لگا تو انھوں نے مختصر عرصے کے لیے، بغیر کسی مقصد کے، کھیت کی دوسری جانب ایک سیاہ رنگ کی ڈھیر نما شے پر حملہ کر دیا، اور جب ان کے خیال میں دشمن کا تیا پانچا ہو گیا تو انھوں نے ہاتھ روک لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک دو دقیقے پیروں کو تازہ دم کر لینے، اور ہاتھوں کو تقریباً بجھے ہوئے الاؤ پر شفقت کے انداز میں پھیلائے رکھنے کے بعد انھوں نے جانے کا فیصلہ کر لیا، آخری کھانسی کھانستے ہوئے اور ہرے اور پیلے دھویں سے نکلتے ہوئے آنسو ٹپکاتے وہ بساؤ کی طرف چل دیے۔ اگر کوواچکی یہاں نہیں تھا تو بساؤ میں ضرور ہوگا۔ وہی پولیس والے دو امکانات سے زیادہ کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔

آہستہ آہستہ بجھتی ہوئی آگ کا دھواں نانی کے پانچویں لہنگے پر چھا گیا تھا، اس

طرح کہ اس کے چاروں لبنگے، اس کی گہری سانسیں، اس کے لیے ہوئے متبرک نام، سب کچھ ایک لبنگے کے نیچے تھے۔ صرف اس وقت جب وردی والے لڑکھڑاتے ہوئے نقطے بن گئے تھے، اور ٹیلی گراف کے کھمبوں کے درمیان کی دھند میں غائب ہو گئے تھے، نانی اپنی جگہ سے اٹھی، آہستہ اور تکلیف دہ انداز میں، گویا اس نے اپنی جڑیں بھی اکھاڑ لی ہیں، جن کے ساتھ مٹی اور اس کے ریشے بھی تھے، سب کچھ زمین سے اکھاڑ لیا گیا تھا۔ اور اچانک کوواچکی نے خود کو پستہ قد، چھریرا اور بغیر کسی پناہ کے بارش میں بھیگتا پایا تھا، اور وہ یخ ہو رہا تھا۔ تیزی سے اس نے اپنی پتلون کے بٹن بند کر لیے، جنھیں لبنگے کے نیچے لامتناہی عرصے چھپے ہونے کے درمیان خوف اور لامتناہی پناہ کی ضرورت کے باعث کھلا رکھا تھا۔ اس نے جلدی جلدی انھیں بند کیا، اس خوف سے کہ کہیں اس کا ہوسناک ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا نہ ہو جائے اس لیے کہ خزاں کی فضا میں مہیب ٹھنڈک کے امکانات ہوتے ہیں۔

میری نانی کو بھوبل میں چار مزید آلو ملے تھے۔ اس نے تین کوواچکی کو دیے اور ایک خود لے لیا؛ اس کو دانت لگانے سے پہلے کوواچکی سے پوچھا کہ کیا وہ بھٹے کا آدمی تھا، حالاں کہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ کوواچکی کہیں اور سے آیا تھا اور اینٹوں کے بھٹے سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ جواب کا انتظار کیے بغیر، اس نے ہلکا والا ٹوکرا اُس کے کاندھے پر رکھوایا اور بھاری والا اپنے کاندھے پر رکھ لیا، اس کا ایک ہاتھ کھانچے اور بیلچے کے لیے خالی تھا۔ پھر اپنے ٹوکرے، اپنے آلو، اپنے کھانچے اور اپنے بیلچے کے ساتھ بساؤ کی کان کی طرف اس طرح چل پڑی جیسے ہوا سے بھرا بادبان آگے بڑھتا ہے۔

یہ علاقہ بساؤ نہیں تھا۔ یہ جگہ رامکاؤ سے زیادہ قریب تھی۔ اینٹوں کے بھٹے کی داہنی طرف سے گزرتے ہوئے دونوں بلیک فارسٹ کی طرف چلے جس کے عقب میں گولڈ کرُگ اور برنتاؤ کے علاقے تھے، مگر اس سے آگے چل کر بساؤ کی کان آتی ہے۔ جوزف کوواچکی اپنے آپ کو اس سے الگ نہیں کر پایا تھا، اس لیے نانی کے ہمراہ چلتا چلا گیا۔

# رافٹ کے نیچے

ادھر اسپتال کے صاف ستھرے بستر پر لیٹے، شیشہ لگے سوراخ کے نیچے، جس سے ہمہ وقت بہ وفو کی آنکھیں لگی ہوئی ہوں، کشویا میں جلائے جانے والے آلو کے پودوں سے اٹھنے والے دھوئیں کے بادلوں، اور اکتوبر کے مہینے کی ترچھے زاویے سے ہونے والی بارش کی تصویر کشی کرنا اتنا آسان نہیں۔ میرے پاس میرا نقارہ موجود نہیں تھا، جسے چابک دستی اور صبر کے ساتھ استعمال کیا جائے تو وہ اُن سارے واقعات کو محفوظ کر لیتا۔ مجھے کاغذ پر تحریر کرنے کے لیے جن کی ضرورت ہوتی ہے، اور اگر مجھے انتظامیہ سے دن میں چار گھنٹے اسے بجانے کی اجازت نہ ہو تو میں ایک نالائق ولد الحرام ہوں گا، جس کے پاس اپنے بزرگوں کے کہنے کے لیے کچھ بھی نہ ہو۔

کچھ بھی ہو، میرا نقارہ یہ کہتا ہے: 1899 کی اس دوپہر، جب جنوبی افریقا میں اوم کروگر اپنی برطانیہ دشمن جھاڑی نما بھنویں درست کر رہا تھا، 'بِزرشاؤ' اور 'کارٹ ہاؤس' کے درمیان، 'بِساؤ' کے اینٹوں کے بھٹے سے زیادہ فاصلے پر نہیں: دھوئیں، دہشت، گہری سانسیں، صوفیا کے ناموں، ایک ہی رنگ کے چار لہنگوں کے نیچے، ترچھے زاویے سے ہوتی ہوئی بارش، اور دیہی پولیس کے دو عدد احمق کاروں کی دھوئیں بھری آنکھوں اور فضول قسم کے سوالات کے درمیان، پستہ قد اور چھریرے بدن کے جوزف کوواچکی نے میری ماں اینگنس کی بنیاد رکھ دی تھی۔

اسی رات میری نانی انا برانسکی نے ایک پادری کی مدد سے اپنا نام تبدیل کر لیا تھا۔

اس نے اپا کو واچکی کے وجود میں اپنی قلب ماہیت کر لی، اور وہاں سے جوزف کے ساتھ، اگر مصر نہیں تو کم از کم، 'موتلاؤ' نامی دریا کے کنارے واقع صوبائی دارالحکومت چلی گئی تھی، جہاں جوزف کو رافٹمین (raftman) کی عارضی ملازمت گئی، اور پولیس سے چھٹکارا۔

تاکہ ذرا قاری کے تجسس میں اضافہ ہو جائے، میں موتلاؤ دریا کے دہانے پر واقع شہر کا نام بتانے میں کچھ دیر توقف کروں گا، حالاں کہ اس کو اسی وقت بتانے کی کئی وجوہ ہیں، اس لیے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں میری ماں نے اپنی زندگی میں پہلی بار سورج کی روشنی دیکھی تھی۔ جولائی 1900 کے آخر میں — جب شاہی بحریہ کو دوگنا بڑھانے کی منصوبہ بندی کا فیصلہ کیا جا رہا تھا — میری ماں اسد کے بُرج میں پیدا ہوئی تھی — خود اعتماد، رومانوی، فیاض اور شیخی باز۔ پہلا بُرج، جسے domus vitae بھی کہا جاتا ہے، بُرج حوت کا پیدا نہایت حساس ہوتا ہے۔ سورج کی سیارگان میں neptune کے مقابلے میں، ساتواں بُرج یا Domus matrimonii uxoris، پراگندگی اور انتشار لاتا ہے۔ مشتری جس کو بدمزاج سیارہ کہا جاتا ہے، جیسا کہ سب جانتے ہیں، جگر اور تلی کی بیماریوں کا باعث ہوتا ہے، جو Capricorn پر غالب ہوتا ہے اور اس کا اختتام اسد میں ہوتا ہے، جسے Neptune بام مچھلی پیش کرتا ہے اور بدلے میں کورموش پاتا ہے، جو پیلا ڈوڈا، پیاز اور چقندر کو پسند کرتا، جو لاوا کھانستا ہے، اور وائن کو ترش بناتا ہے؛ یہ مشتری کے ساتھ آٹھویں گھر میں رہتا تھا، جس کو موت کا گھر کہتے ہیں؛ جس کا مطلب حادثاتی موت کا امکان ہوتا، جب کہ آلو کے کھیت میں بنیاد رکھی جانے کا مطلب حادثاتی خوشی، اور مریخ یعنی رشتے داروں کے گھر میں تحفظ۔

اس مرحلے پر مجھے اپنی مما کی جانب سے ایک احتجاج ریکارڈ کرانا ہے، اس لیے کہ اس نے ہمیشہ اس بات کی سختی سے تردید کی ہے کہ اس کے وجود کی بنیاد آلو کے کھیت میں رکھی گئی تھی۔ اس نے اس بات کا ضرور اقرار کیا ہے کہ اس کے باپ نے اس یادگار موقعے پر بہت اچھا کام کیا تھا، مگر نہ وہ اور نہ اپا بہ نسکی اس کیفیت میں تھے جس میں حمل ٹھہر سکتا۔ "ہو سکتا ہے کہ یہ عمل اس رات کسی وقت ہوا ہو، ممکن ہے کہ انکل ونسنٹ کی گھوڑے لے جانے والی گاڑی میں، یا اس کے بعد بعد ٹرویل (Troyl) میں جب رافٹمین ہمیں اندر لے گیا تھا۔"

میری مما ان جیسے الفاظ میں اپنے وجود کی ابتدا کی تاریخ معلوم کرنا پسند کرتی تھی، اور میری نانی، جسے ضرور معلوم رہا ہوگا، بہت پُرسکون انداز میں اثبات میں سر ہلا دیتی اور کہتی، ہاں بیٹی، یہ گاڑی میں، یا پھر بعد میں ٹروبل پہنچ کر ہوا ہوگا۔ یہ کھیت میں نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے کہ اس دن بہت تیز ہوا تھی اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

ونسنٹ میری نانی کا بھائی تھا۔ اس کی بیوی نوجوانی ہی میں انتقال کر گئی تھی اور اس کے بعد وہ مقدس سفر پر 'چیستو کوا' گیا تھا جہاں ماتکا بوسکا چیستو کواسکا (Matka Boska Czestochowska) نے اس کو ہدایت دی تھی کہ وہ اسے مستقبل کی ملکۂ پولینڈ تسلیم کر لے۔ اس کے بعد سے اس نے اپنا سارا وقت عجیب عجیب کتابیں کھنگالنے میں لگایا، اور ہر جملہ جو اس کی نظر سے گزرا کنواری ماں کے پولینڈ کے تختِ شاہی پر حق کی تصدیق کے بارے میں تھا۔ اس نے اپنا گھر اور اپنی چند ایکڑ زمینیں اپنی بہن کی نگرانی میں چھوڑ دی تھیں۔ اس کا بیٹا Jan (جان) جو اس وقت صرف چار برس کا تھا، ہمیشہ بیمار اور رونے پر تیار بچہ تھا، جو تازوں) کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا؛ اس کو چھوٹی چھوٹی رنگین تصویریں جمع کرنے اور اس نو عمری میں، ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا بے تکا شوق تھا۔

اس چھوٹے سے زرعی فارم میں جو آسمانی ملکۂ پولینڈ کے لیے وقف تھا، میری نانی اپنے آلوؤں کے ٹوکرے اور گوواچی کے ساتھ پہنچ گئی تھی۔ پولینڈ کے نقشے سے واقفیت ہوتے ہی، ونسنٹ فوراً 'رامکاؤ' گیا اور پادری کو تیار کیا کہ وہ اپنے مذہبی کاغذات لے کر چلے اور انا اور جوزف کو شادی کے مقدس رشتے میں باندھ دے۔ شاید ہی کبھی مقدس پادری نے، نیند میں لڑکھڑاتے ہوئے، لمبی جماہی کے ساتھ کسی جوڑے کو شادی میں رحمت کی دعائیں دی ہوں گی، اور بیکن کے بہترین ٹکڑے کی اُجرت پائی ہو گی۔ پھر، ونسنٹ نے ریس کے گھوڑے لے جانے والی گاڑی کے ڈبے میں نئے بیاہتاؤں کو پیال اور آلو کے خالی بوروں سے تیار کیا گیا بستر مہیا کیا، اپنے کانپتے، کراہتے، روتے بیٹے جان کو ڈرائیور کی کرسی کے ساتھ ہی اپنے پاس بٹھالیا، اور گاڑی کھینچنے والے گھوڑے کو گاڑی میں جوت دیا تھا۔ گھوڑا سمجھ گیا ہوگا کہ رات میں ہی گاڑی چلنی ہے، اس لیے کہ ہنی مون

جوڑا جلدی میں ہے۔ابھی بہت رات باقی تھی جب گاڑی صوبائی شہر کی چوبی بندرگاہ پہنچ گئی۔وہاں کوواچکی کو اپنے کچھ دوست اور ساتھی رافٹ مین مل گئے جنھوں نے بھگوڑے جوڑے کو پناہ فراہم کر دی۔وِنسنٹ نے گھوڑے کی باگ موڑی اور پساؤ کی طرف واپس چل پڑا: اسے ایک گائے، ایک بکری، کچھ سؤر، آٹھ قازیں، اور ایک بچے کو غذا فراہم کرنی تھی، جب کہ جان کو بخار بھی ہو گیا تھا اور اسے بستر میں آرام کرنا تھا۔

جوزف کوواچکی تین ہفتے تک روپوش رہا۔اس نے سیدھی مانگ نکال کے اپنے بالوں کا اسٹائل بدل لیا، مونچھیں مونڈ دیں، اپنے لیے شبہے سے بالاتر کاغذات بنوا لیے، اور جوزف رانکا کے نام سے رافٹمین کی ملازمت کر لی۔مگر سوال یہ ہے کہ کوواچکی نے جوزف رانکا کے نام کے کاغذات پر ملازمت کی درخواست کیوں کی، جو ایک لڑائی کے درمیان رافٹ سے پانی میں گر پڑا تھا، اور اربابِ اقتدار کو اس کی اطلاع نہیں تھی کہ وہ موڈلن کے قریب بگ نامی دریا میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا تھا؟

اس لیے کہ کوواچکی کافی عرصے سے رافٹ چلانا چھوڑ کر اورشویٹز میں لکڑی کاٹنے کے آرے پر کام کر رہا تھا کہ اس کی اپنے افسر سے ایک باڑ کے معاملے میں کچھ ان بن ہو گئی تھی، جسے اس نے مشتعل کر دینے والے سُرخ وسفید رنگ سے پینٹ کر دیا تھا۔جس پر اس کے افسر نے ایک سرخ اور ایک سفید تختہ اور جس تختے پر وطن پرستانہ نعرے لکھے ہوئے تھے، ان کو کوواچکی کی غیر موجودگی میں نذرِ آتش کر دیا تھا۔کوواچکی کے لیے یہ واقعہ اس آرے کے کارخانے کو اگلی رات ہی، جو بلاشبہ ایک حسین اور ستاروں بھری رات تھی، آگ لگا کر راکھ کر دینے کا بہترین جواز پیدا ہو گیا تھا، جسے تقسیم شدہ پولینڈ کے اعزاز میں، جو پولینڈ کے اتحاد کا باعث ہو گئی تھی، نہایت خوب صورت طریقے سے پینٹ کیا گیا تھا۔

اس طرح کوواچکی ایک آتش زن بن گیا، اور محض ایک بار نہیں، آنے والے دنوں میں پورے مغربی پروشیا میں آرے کی مشینیں اور لکڑی کے ذخیرے دو رنگے قومی جذبات کو ایندھن فراہم کر رہے تھے۔ہمیشہ کی طرح، جب پولینڈ کا مستقبل داؤ پر لگا ہو تو کنواری مریم پکاری جانے لگتی ہیں، اور لوگ اس امر کے گواہ تھے—— ان میں کچھ آج بھی زندہ ہوں

گے، جن کا دعویٰ تھا کہ انھوں نے خداوند کی مادر کو پولینڈ کا تاج پہنے، کئی آرا مشینوں کے کارخانوں کی شکستہ چھتوں پر تخت نشین دیکھا ہے۔ کہا جاتا ہے، وہ مجمع جو آگ لگنے کی جگہ پر ہمیشہ اکٹھا ہو جاتا ہے، خداوند کی ماں Bogarodzica سے منسوب کرتا ہے، گویا کوواچکی کی آتش زنی ایک متبرک واقعہ بن جاتی ہے اور قسمیں کھا کھا کر بیان کی جاتی تھی۔

چناں چہ کوواچکی آگ لگانے کے لیے مطلوب تھا، جب کہ رافٹ مین جوزف رانکا، ایک بے ضرر آدمی، بے داغ ماضی والا، بن ماں باپ کا، محدود نظریات کا آدمی تھا، کسی کو جس کی طلب نہیں تھی، جس کا مشکل ہی سے کوئی شناسا رہا ہوگا، جس نے اپنے چبانے کے تمباکو کا یومیہ راشن بنا لیا تھا۔ بالآخر ایک دن وہ دریائے بگ میں غرق ہو جاتا ہے، اور اپنے پیچھے، اپنے کوٹ کی جیب میں تین دن کے تمباکو کا راشن اور اپنے ذاتی کاغذات چھوڑ جاتا ہے۔ اور جب سے رانکا غرق ہوا ہے، وہ کام پر آ نہیں سکا تھا، اور کسی نے بھی اس کے، کوواچکی کے، بارے میں پریشان کر دینے والے سوالات بھی نہیں پوچھے، جس کی جسمانی ساخت رانکا جیسی ہی ہے، ویسی ہی گول کھوپڑی، پہلے اسی کا کوٹ زیب تن کیا، پھر بے داغ سرکاری وردی، پائپ پینے کی عادت ترک کر دی، تمباکو چبانا شروع کر دیا، حتیٰ کہ رانکا کا بے حد ذاتی نمایاں خد و خال، اس کی گفتگو کے نقص کی نقالی بھی کر لیتا ہے۔ گزرنے والے برسوں میں وہ ایک مشقت کرنے والا اور کفایت شعار رافٹ مین رہا، جس میں ہلکا سا توتلا پن بھی ہے، جو پورے جنگل میں، نرمن بوبر، بگ اور وستولا دریاؤں میں رافٹ بھی چلاتا ہے۔ وہ میکنسن کی ماتحتی میں شہزادہ ولی عہد کے ذاتی رسالے کے سپاہیوں میں کارپورل کے عہدے تک بھی پہنچ گیا تھا، اس لیے کہ رانکا نے اپنی فوجی خدمات انجام نہیں دی تھیں [جو اس کو پوری کرنی پڑی ہیں]، جب کہ تھارن کے توپ خانے میں بہت خراب کارکردگی چھوڑ آیا تھا۔ اس وقت یہ، کوواچکی، چار برس زیادہ عمر کا تھا۔

اپنی تمام تر بد معاشیوں کے درمیان بھی زیادہ تر مایوس چور، قاتل، اور آتش زن موقعوں کے انتظار میں ہوتے ہیں کہ وہ کوئی باعزت کام تلاش کر لیں۔ وہ کوشش کے ذریعے ہو یا قسمت کے باعث، کچھ کو موقع مل ہی جاتا ہے: رانکا کی شناخت کے پردے میں، کوواچکی

ایک اچھا شوہر تھا، جو اپنی برائیوں سے اتنا اوب چکا تھا کہ محض ایک دیا سلائی کی روشنی ہی اس پر لرزہ طاری کر دیتی تھی۔ باورچی خانے کی میز پر قرینے سے رکھی ہوئی دیا سلائی کی ایک ڈبیا اس قسم کے آدمی سے کبھی محفوظ نہیں تھی، جیسے شاید اسی نے دیا سلائی ایجاد کی ہو۔ اس نے اپنی ایسی تمام ترغیبات ترک کر دی تھیں۔ میری نانی کے لیے وقت پر گرم کھانا فراہم کرنا بہت مشکل کام تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ لیمپ جلانے کے لیے کسی قسم کا روغن بھی نہیں ہوتا تھا۔

اس کے ماسوا، رانکا ظالم آدمی نہیں تھا۔ اتوار کے دن وہ انا رانکا کو شہر کے گرجا گھر لے جاتا تھا، اس کی قانونی طور پر شادی شدہ بیوی، اسی طرح تلے اوپر چار لہنگے پہنتی تھی، جیسے وہ آلو کے کھیت میں کیا کرتی تھی۔ جاڑے کے موسم میں جب دریاؤں کا پانی جم جاتا تھا اور رافٹ چلانے والے فارغ کر دیے جاتے تھے، وہ 'ٹرویل' کے اپنے گھر میں چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا، جہاں صرف رافٹ مین، ساحلوں پر نگاہ رکھنے والے، اور بندرگاہ پر کام کرنے والے رہا کرتے تھے۔ اس نے ہمیشہ اپنی بیٹی ایگنس کی نشوونما پر نظر رکھی، جو اپنے والد کے نقشِ قدم پر چلتی تھی، کہ جب وہ پلنگ کے نیچے نہیں ہوتی، تو کپڑوں کی الماری میں ہوتی، اور جب مہمان آئے ہوئے ہوتے تو وہ اپنی کپڑے سے بنی گڑیا کے ساتھ میز کے نیچے ہوتی تھی۔

ننھی ایگنس کی ضرورت چھپے رہنا تھی: روپوشی میں اس نے دوسری لذتیں ڈھونڈھ لی تھیں، مگر یہ بھی ویسا ہی تحفظ تھا جیسا کہ جوزف کو انا کے لہنگے کے نیچے ملا تھا۔ آتش زن کو واچکی اپنی بیٹی کی پناہ گاہ کی ضرورت کو سمجھنے کے لیے بہت کچھ جلا چکا تھا۔ جب ضروری ہو گیا کہ گھر کی بالکنی پر خرگوش کے لیے ایک صندوق فراہم کیا جائے، جو ڈیڑھ کمروں پر مشتمل فلیٹ میں اضافے کے مترادف تھا، تو اس نے اس کی ناپ کا ایک خاص قسم کا چھوٹا سا گھر بنا دیا تھا۔ یہ تھی وہ جگہ جہاں میری ماں بیٹھتی تھی جب وہ بچی تھی، گڑیوں سے کھیلتی، بڑی ہوتی گئی۔ بعد میں جب وہ اسکول جانے لگی تھی تو کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی تمام گڑیاں پھینک دی تھیں، اور اس کی پہلی دل چسپی، شیشے کے دانوں اور رنگین پَروں کے پیکر میں حسنِ نازک سے ہو گئی تھی۔

شاید، چوں کہ میں اپنی ابتدا کا اعلان کرنے کے لیے بے چین ہو رہا ہوں،

مجھے اجازت دیجیے کہ میں راتکا کے خاندانی رافٹ کو چھوڑ دوں جو، 1913 تک، بڑے سکون کے ساتھ تیرتا پھر رہا تھا، جب 'شی شاؤ' کے پانیوں میں کولمبس نامی رافٹ کو اتارا گیا تھا؛ اس وقت یوں ہوا کہ پولیس والے، جو کبھی بھولتے نہیں، راتکا تک پہنچ گئے تھے۔

اس مصیبت کی ابتدا اگست 1913 میں ہوئی تھی جب، حسبِ معمول، کوا چکی کو، ہر گرمی کے موسم کی طرح، اس بڑے رافٹ میں مدد کرنی پڑی تھی جو کیو (Kiev) سے وستولا — پریپٹ (Pripet) نہر کے ذریعے — بگ اور موڈلین دریاؤں میں باربرداری کے لیے چلایا جاتا تھا۔ اس لیے کُل بارہ رافٹ مین، 'راداؤنے' نامی راہنما دخانی کشتی پر سوار ہوئے، جو اسی آرے کے کارخانے والے چلاتے تھے، جو 'وَسطی نیو فاہر' سے 'ڈیڈ وستولا' سے 'آئینلاگے' تک جاتی، پھر وستولا سے ہوتی ہوئی 'کاسیمارک'، طیبز اکو' چانکاؤ، ورشاؤ اور پینکیل جاتی اور رات بھر 'تھارن' میں لنگر انداز رہتی تھی۔ وہاں اس آرے کے کارخانے کا منیجر عمارتی لکڑی کی خریداری کی نگہبانی کے لیے کشتی پر سوار ہوا تھا۔ جب تک 'راداؤنے' صبح کے چار بجے روانہ ہوتی، یہ اطلاع پھیل گئی تھی کہ وہ کشتی پر سوار ہو گیا ہے۔

کوا چکی نے اسے پہلی بار ناشتے کے لیے آتا دیکھا تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے میز پر بیٹھے جَو کا دلیا اور کافی کھا پی رہے تھے۔ کوا چکی اسے فوراً ہی پہچان گیا تھا۔ چوڑے کاندھوں اور گنجے سر والے افسر نے ووڈکا طلب کی اور اس کو خالی پیالوں میں ڈلوا لیا۔ کھانے کے دوران، جب میز کے دور والے سرے پر ووڈکا انڈیلی جا رہی تھی، اس نے اپنا تعارف کرایا، ''قبل اس کے کہ تم کو معلوم ہو کہ کون کیا ہے — میں نیا افسر ہوں — میرا نام ڈورکرہوف ہے — اور میں حکم دینا پسند کرتا ہوں، اور جو مانگتا ہوں، حاصل کر لیتا ہوں۔''

اس عمل کے بعد ملاحوں نے بلند آواز میں، یکے بعد دیگرے، اپنے اپنے نام بتائے اور اپنے جام خالی کرتے گئے۔ سب سے پہلے کوا چکی نے اپنا جام خالی کیا اور کہا ''راتکا''، اور اس دوران ڈورکرہوف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر ہلایا، جیسے کہ بعد میں ہر نام کے بعد سر ہلایا تھا، اور ''راتکا'' کو دہرایا، جس طرح دوسرے ملاحوں کے نام دہراتا گیا تھا۔ پھر بھی، کوا چکی کو محسوس ہوا کہ ڈورکرہوف کے مرے ہوئے رافٹ مین

کے نام دہرانے میں کوئی خاص بات تھی، جو اچھی طرح معلوم نہیں تھی، مگر قابلِ غور ضرور تھی۔

'رادا ؤنے' کشتی مٹیالے پانی کی لہروں کے آگے، ہچکولے کھاتی، ہوشیاری سے پانی کے درمیان ریت کے ڈھیروں سے بچتی بچاتی، بدلتے ہوئے پائلٹوں کی مدد سے بڑھتی جا رہی تھی۔دائیں اور بائیں، پشتوں کے اس پار، ہمیشہ کی طرح ملک کی سرزمین ویسی ہی تھی؛ جب مسطح نہ ہوتی تو سنگلاخ ہوتی، مگر فصلیں دیتی تھی۔باڑ کی جھاڑیاں، گلیاں، اکا دکا زرعی فارم، ایسا زمینی منظر جو گھڑسوار فوجوں کے حملوں کے لیے موزوں ہو، Uhlans کے ایک ڈویژن کے بائیں جانب سے داخل ہونے کے لیے، جھاڑیوں کی باڑوں کو پھلانگتے hussars کے لیے، نوجوان گھڑسوار فوجی افسروں کے خوابوں کے لیے، ماضی کی جنگوں اور آنے والی لڑائیوں کے لیے، بہادرانہ مصوری کے لیے رنگوں سے بنائی ہوئی ان تصویروں میں ہوتے ہیں،تتار اپنے گھوڑوں کی گردنوں سے لپٹے ہوئے؛عقب سے حفاظت کرتے ہوئے dragoons؛ زرہ بکتر میں ملبوس سورما؛ خون کے چھینٹوں بھرے چوغے پہنے، چھاتیوں پر آویزاں چمچماتی اور بے داغ پیتل کی پلیٹوں والے بڑے بڑے افسران؛ ایک،جس میں Mazowsze کے ڈیوک نے کسی کو ضرب لگا کر گرا دیا تھا؛ اور، کسی سرکس سے کہیں بہتر،جھالروں سے مزین گھوڑے، ؛فن کاری سے ابھاری ہوئی نسیں؛ پھولے ہوئے نتھنے،قرمزی سرخ، چھوٹے چھوٹے بادل نما غبار اڑاتے ہوئے، اوران غباروں کو احساسِ شرمندگی سے جھکے ہوئے نیزوں کے پھلوں سے چھیدتے ہوئے؛ آسمان اور غروب آفتاب کا حصہ بنی ہوئی تلواریں؛ ہر تصویر کے پس منظر میں—کہ پس منظر ضروری ہوا کرتا ہے— سیاہ رنگ کے گھوڑے کی پچھلی ٹانگوں کے درمیان نظر آتا، ایک چھوٹا سا گاؤں جس کے گھروں کی چمنیوں سے نکلتا پُرامن انداز میں لہراتا دھواں؛چھوٹے چھوٹے جھونپڑے نما پھوس کی چھتوں والے گھر جن کی دیواروں پر اُگی ہوئی کائی؛ ان گھروں میں خوب صورت چھوٹے چھوٹے ٹینک، اس دن کے خواب دیکھتے ہوئے جب وہ بھی ویسٹولا کے عقبی پشتوں کی تصویروں میں بھاری بکتر بند گاڑیوں کے درمیان گھوڑوں، گدھوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی طرح نظر آئیں گے۔

ولوکلاوک پہنچ کر ڈور کرہوف نے کوواچکی کے کاندھے پر تھپکی دی۔ ''رانکا! سچ کہو— کیا تم نے چند برس قبل— کبھی 'شوبتز' کے آرے پر کام نہیں کیا ہے؟ وہی جو آگ میں جل کر خاکستر ہو گئی تھی؟ کوواچکی نے نفی میں زور سے اپنا سر ہلا دیا، جیسے اس کی گردن اکڑ گئی ہو، اور اپنی آنکھوں میں افسردگی پیدا کرنے کی ایسی کوشش کی کہ ڈور کرہوف کے مزید سوال اس کے دل ہی میں رہ گئے تھے۔

جب کوواچکی موڈلن پہنچا، جہاں بگ دریا وستولا دریا میں مل جاتا ہے، اور راؤوائے کشتی بگ کی طرف مڑی، تو جنگلے پر ہاتھ رکھے ہوئے، جیسا کہ اس زمانے کے تمام ملاح کیا کرتے تھے، اس نے دریا میں تین بار تھوکا تھا: اسی وقت ڈور کرہوف ہونٹوں میں سگار دبائے اس کے پاس ہی کھڑا ہوا تھا اور کوواچکی سے دیا سلائی طلب کی تھی۔ اس معمولی سے لفظ ''دیا سلائی'' نے کوواچکی پر عجیب قسم کا اثر کیا تھا، اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ ''عجیب آدمی ہو، میرے دیا سلائی مانگنے پر تمھیں شرمانا تو نہیں چاہیے۔ تم لڑکی تو نہیں، یا واقعی لڑکی ہی ہو؟''

ان کو 'مُڈلن' چھوڑے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کوواچکی کا احساسِ شرم دور ہو گیا، جو احساسِ شرم نہیں، احساسِ گناہ تھا؛ وہ دراصل آرے کے کارخانے کی آگ کی روشنی تھی، جو اس نے لگائی تھی۔

'موڈلن' اور 'کیو' کے درمیان، بگ دریا میں جاتے ہوئے، نہر کے ذریعے، جو بگ اور 'پرپیٹ' کو ملاتی ہے، اور جب تک کہ راؤوائے، پرپیٹ میں چلتے ہوئے، 'ڈنیپر' نہیں پہنچی تھی، ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا جس کو کوواچکی/ رانکا اور ڈور کرہوف کے درمیان تبادلۂ الفاظ کہا جا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کشتی پر سفر کے دوران کچھ بد مزگی ضرور ہوئی تھی؛ رافٹ مینوں کے آپس میں؛ کوئلہ جھونکنے والے اور رافٹ مین کے درمیان؛ helmsman، کوئلہ جھونکنے والوں اور کپتان کے درمیان؛ کپتان اور بار بار بدلنے والے پائلٹوں کے درمیان۔ کہتے ہیں کہ ایسا کچھ تو ان آدمیوں کے درمیان ہوتا ہی رہتا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ یہ صحیح بھی ہو۔ میں بڑی آسانی سے اس بات کا تصور کر سکتا ہوں کہ اس نوعیت کی کشمکش چلتی رہتی تھی، کشوبیائی ملاحوں اور اس کشتی چلانے والے کے

درمیان، جو شاید بغاوت کی ابتدا کے وقت سے، 'اسٹیشن' کا باسی تھا: راہداری میں میٹنگ کرنا، گروہ بندی کرنا، خفیہ کوڈ دینا، قرولیوں پر دھار رکھنا وغیرہ۔ بس اسی حد تک۔ نہ ان کے درمیان سیاسی اختلافات ہوتے ہیں، نہ جرمن اور پولینڈ والوں کے درمیان چاقو چھریاں چلتی ہیں، نہ ہی سماجی شکایات کی وجہ سے بغاوت ہوتی ہے۔اپنا روزانہ کا کوئلے کا راشن ہضم کرتی ہوئی راداؤ نے اپنے راستے پر چلتی رہتی ہے؛ ایک بار ایسا ہوا تھا کہ 'پلاک' سے گزرتے ہوئے کشتی ریت کے ڈھیر سے ٹکرا گئی تھی۔میرا خیال ہے کہ اس کی بجلی فیل ہو گئی تھی۔ 'نیو فار واسر' سے متعلق کپتان بارٹش اور یوکرین سے تعلق رکھنے والے پائلٹ کے درمیان گرما گرمی ہو گئی تھی؛ بس اتنا ہی ہوا تھا؛ اور یقین رکھیے کہ آپ کو کشتی لاگ بک میں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔

لیکن، اگر مجھے کوواچکی کے اپنے خیالات اور ڈوکرہوف کی نجی زندگی کا روزنامچہ لکھنا پڑے تو ایسی بہت سی باتیں ہوں گی جن پر کام کرنا ہوگا: شک وشبہ، شبہات کی توثیق، بدگمانی، پس وپیش، شبہات کو دفنا دینا اور زیادہ بدگمانی کرنا۔

ڈوکرہوف کوواچکی سے بڑھ کر چالاک ہے؛ کہ دونوں ہی روس میں رہے ہیں۔ بہت آسانی سے ڈوکرہوف، اپنے دنوں میں، غریب رانکا کی طرح رافٹ سے پانی میں گر سکتا تھا، یا 'کیو' کے لکڑی کے باڑوں میں گم ہو سکتا تھا کہ وہ ایسی بھول بھلیاں ہوتے ہیں اور اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ اس میں آپ آسانی سے اپنے مربی فرشتوں کو بھی کھو سکتے ہیں؛ وہ اچانک کسی لڑھکتے ہوئے لکڑی کے لٹھے کی زد میں آکر پانی میں گر سکتا تھا۔یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس کو پانی سے زندہ نکال لیا جاتا۔کوواچکی کے ہاتھوں بچا لیا جاتا: 'پریپیت' یا بگ کے پانی سے، یا 'کیو' کے لکڑی کے باڑے سے، پھسلتے لٹھوں کے ریلے میں آنے کے بعد آخری وقت میں نکال لیا جاتا، کہ ہمارے پاس مربی فرشتوں کی کتنی کمی ہے۔یہ منظر کتنا رقت انگیز ہوگا، اگر میں آپ سے کہوں کہ ڈوکرہوف کس طرح، نیم غرقاب یا نیم پامال ہوتا، مگر سانسیں لیتا ہوا، موت کی جھلک دیکھتے ہوئے بھی رانکا کے کان میں کہتا: ''شکریہ، کوواچکی، تمھارا شکریہ اولڈ مین'' اور پھر اس کی آنکھوں نے ایک وقفے

کے بعد بظاہر سب کچھ کہہ دیا ہوتا، "اب ہم دونوں برابر ہو گئے ہیں، چلو ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں، گزشتہ را صلوات" اور اکھڑ مزاج یا بشاشی کے ساتھ، آنکھوں ہی آنکھوں میں بے شرمی سے مسکراتے ہوئے، ایسی چمک کے ساتھ جو شاید آنسو بھی ہو سکتا ہے، وہ ایک دوسرے کے بے حوصلہ مگر سخت ہاتھوں کو گرفت میں لے لیتے۔

ہم فلموں میں ایسے مناظر دیکھتے رہتے ہیں: دو دشمن بھائیوں کے درمیان مصالحت، لاجواب طریقے سے کھیلا گیا کھیل، خوب صورتی سے فلمایا گیا منظر۔ اور پھر اس کے بعد سے ہمیشہ کے لیے یاری دوستی، مشکل میں بھی اور راحت میں بھی؛ اوہ خدایا! ان کا اس طرح ساتھ رہنا کیسی عجیب بات ہو گی!

مگر، کوواچکی کو نہ تو ڈورکر ہوف کو غرق کر دینے کا موقع ملا، نہ ہی اس کو موت کے منہ سے چھین لینے کا۔

شعوری طور پر، ادارے کے بہترین مفاد میں رہتے ہوئے، ڈورکر ہوف نے 'کیڈ میں لکڑی خریدی، نو عدد نئے رافٹ تیار کرنے کی نگرانی کی، آدمیوں میں روبی کرنسی میں خاصی رقم تقسیم کی تا کہ وہ واپسی کا سفر کریں، اور خود ریل گاڑی پر سوار ہوا، جو اس کو وارسا، 'موڈلس'، 'ڈوبچ-ایلاؤ'، 'میرین برگ' اور 'ڈرشاؤ' کے راستے واپس اس کی کمپنی تک لے گئی، جس کے آرے کا کارخانہ 'کلاویٹر' ڈاک یارڈ اور 'نعیشاؤ' ڈاک یارڈ کے درمیان لکڑی کی بندرگاہ میں واقع تھا۔

قبل اس کے کہ میں ہفتوں کی سخت محنت کے بعد رافٹ مینوں کو، نہر کے ذریعے، 'کیڈ سے، 'وستولا' لے آؤں، ایک سوال ہے مجھے جس پر غور کرنا ہوگا: کیا ڈورکر ہوف کو یقین ہے کہ یہ شخص رانکا، کوواچکی آتش زن ہی ہے؟ میں تو یہ کہوں گا کہ جب تک کارخانے کے افسر نے رانکا کو ملازم رکھا تھا، یہ ایک اچھی فطرت والا آدمی تھا، جس کو اس کی درمیانہ درجے کی ذہانت کے باوجود سب، ٹگ (tug) پر ہم سفر کے طور پر، پسند کرتے تھے، اور اسے امید تھی کہ یہ شخص غنڈہ کوواچکی نہیں تھا۔ جب تک وہ ریل گاڑی میں آرام سے بیٹھ نہیں گیا تھا، اس کی امید ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت تک جب گاڑی اپنی منزل،

'ڈانتسِگ' تک پہنچ نہیں گئی تھی — اور یہ میں اب کہہ رہا ہوں — ڈیو کرہوف نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے ایک گاڑی میں اپنا سامان گھر بھیج دیا، اور تیز تیز چلتا 'ویبنی وال' کے پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچا، سیڑھیوں کو پھلانگتا مرکزی دروازے میں داخل ہوا، اور ایک مختصر مگر محتاط تلاش کے بعد اس دفتر تک پہنچ گیا جہاں جانا چاہتا تھا، اور جہاں ایک مختصر سی حقیقت پر مبنی رپورٹ پیش کر دی۔ اس نے کوواچکی/رانکا پر الزام تراشی نہیں کی؛ اس نے محض یہ درخواست کی کہ پولیس کو اس معاملے کو دیکھنا چاہیے۔ پولیس نے اس کا وعدہ کر لیا۔

آنے والے ہفتوں میں، جب لکڑی کے لٹھے، نرکل سے بنے جھونپڑوں اور رافٹ مینوں کے بوجھ کو لیے بہتے جا رہے تھے، کئی دفتروں کو درخواست دینے میں خاصا کاغذ استعمال ہوا تھا۔ اور اب سب کے سامنے جوزف کوواچکی کا ملازمتی ریکارڈ موجود تھا — پرائیویٹ سپاہی، فلاں ابنِ فلاں، مغربی پروشیائی توپ خانہ رجمنٹ۔ ایک معمولی سپاہی، جسے شراب کے نشے میں، آدھی پولش اور آدھی جرمن زبان میں حکومت دشمن نعرے لگانے کی پاداش میں تین دن کے لیے گارڈ ہاؤس میں قید کر دیا گیا تھا۔ کارپورل رانکا کے ملازمتی کاغذات میں اس قسم کا کوئی اندراج نہیں تھا، جس نے 'لانگفوہر' میں دوسری لائب ہُسار رجمنٹ میں خدمت کی تھی۔ اس کا کام اچھا تھا۔ اس نے جنگی حکمتِ عملی کے بارے میں اطلاعات پہنچانے کے لیے بٹالین ڈاکیے کے فرائض انجام دیے تھے۔ اس نے شہزادہ ولی عہد پر اچھا تاثر چھوڑا تھا اور اس کو شہزادے کی جانب سے مارک نقرئی سکّے انعام میں دیے گئے تھے، شہزادہ ہمیشہ جنھیں جیب میں بھرے پھرتا تھا۔ کارپورل کے فوجی کاغذات میں ان سکّوں کا اندراج نہیں تھا، مگر اس کی اطلاع ہماری، بآوازِ بلند رونے والی نانی، انا نے دی تھی، جب اس سے اور اس کے بھائی وِنسینٹ سے تفتیش کی گئی تھی۔

اور آتش زنی کے الزام کے خلاف اس کی صرف یہی ایک حجت نہیں تھی۔ وہ ایسے کاغذات بھی پیش کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی کہ جوزف رانکا نے 1904 کے سردی کے موسم میں ڈانتسگ-نیدراشتات (Danzig-Niederstadt) میں آگ بجھانے والے شعبے میں رضاکارانہ خدمات بھی انجام دی تھیں، جب رافٹ مین فارغ بیٹھے ہوتے

ہیں، اور بجائے آتش زنی کے وہ تو آگ بجھانے کے کام میں مدد کیا کرتا تھا۔ایک اور دستاویز بھی تھی جو ثابت کرتی تھی کہ 1909 میں 'ٹروپل' ریلوے کے کارخانے میں لگنے والی بہت بڑی آگ کے موقعے پر آگ بجھانے والے رانکا نے تو زیرِ تربیت کارکنوں کی جانیں بھی بچائی تھیں۔آگ بجھانے والے کپتان ہیکٹ (Hecht) نے بھی کچھ اسی طرح کی باتیں کہی تھیں جب اس کو گواہی کے لیے طلب کیا گیا تھا۔''کیا وہ شخص جو آگ بجھاتا ہو، آگ لگانے کا کام بھی کر سکتا ہے؟'' اس نے چلا کر کہا تھا۔''تو کیوں میں نے اب بھی اسے سیڑھی پر چڑھا دیکھا ہے، جب 'میوبوڈے' کے گرجا گھر میں آگ لگی ہوئی تھی اور اس کے شعلوں اور راکھ سے ایک ققنس بلند ہو کر پرواز کرتا، نہ صرف آگ بجھاتا، بلکہ اس دنیا میں لگی آگ اور ہمارے آقا یسوع مسیح کی پیاس بھی بجھاتا دیکھتا ہوں— درحقیقت، میں آپ سے یہ کہوں گا، کوئی بھی جو آگ بجھانے کی ہیلمٹ پہنے کسی اہل کار کے نام کو آلودہ کرتا ہے، جس کو جانے کا حق حاصل ہوتا ہے، بیمہ کمپنیاں جس سے محبت کرتی ہیں، جس کے جیب میں ہمیشہ تھوڑی سی راکھ ہوتی ہے، شاید اس لیے کہ وہ فرائض کی انجام دہی کے دوران اس میں گر گئی ہو، یا شاید گندے تعویز کرنے والے کی طرح، جو آتش زنی کے اس عالی شان ققنس کو الزام دیتا ہے، میرے خیال میں سزا کے طور پر اس کے گلے میں چکی کا ایک پاٹ ڈال دیا جانا چاہیے......''

جیسا کہ آپ نے دیکھا ہو گا، کپتان ہیکٹ ایک پادری، ایک عالمی مجاہد تھا۔ ہر اتوار کو وہ 'لانگ گارمن' میں واقع سینٹ باربرا کے اپنے گرجا کے منبر سے خطاب کرتا تھا، اور جب تک کواچکی/رانکا تفتیش جاری تھی وہ اجتماع میں موجود لوگوں کو مہربان آگ بجھانے والوں اور سفاک آتش زنوں کے تمثیلی قصے سنایا کرتا تھا۔

مگر، چوں کہ اس مقدمے کے تفتیش کار سینٹ باربرا کے گرجا گھر نہیں گئے تھے، ان کے نزدیک ''ققنس'' کا لفظ رانکا کی برأت کے بجائے lese-majèsté جیسا تھا، آگ بجھانے کے شعبے میں رانکا کی سرگرمیاں بُرے معنوں میں لی جاتی تھیں۔

آرے کے کئی کارخانوں اور دونوں آدمیوں کے اپنے علاقے کے ٹاؤن ہال

میں ثبوت اکٹھا کیے گئے تھے: رانکا نے 'تھارن' میں توضیل'، کواچک کے علاقے میں پہلی بار آنکھ کھولی تھی۔ جب پرانے رافٹ مینوں کے اور دور کے رشتے داروں کے سارے بیانات یک جا کیے گئے تو ان میں معمولی تضادات پائے گئے تھے۔ڈول بار بار کنویں میں ڈالا جاتا رہا— آخر میں ہوتا کیا— ڈول ہی ٹوٹ گیا؟ یہ تھے وہ حالات جب بڑا رافٹ جرمنی کے علاقے میں داخل ہوا تھا: 'تھارن' کے واقعے کے بعد سے یہ کڑی خفیہ نگرانی میں تھا، اور جب بھی ساحل پر پہنچتا، اس کے آس پاس جاسوسی سایے لہرایا کرتے تھے۔

یہ 'ڈرشاؤ' کے بعد سے ہوا تھا کہ میرے نانا کو لہراتے سایوں کا علم ہوا۔ وہ ان کی توقع کر رہا تھا۔ اسے سخت سستی کہا جائے یا وحشت، یا سودا، جس نے اس کوڑھ اکو یا 'کیسمارک' سے تعلق توڑنے کی کوشش سے باز رکھا تھا؛ وہ شاید اس میں کامیاب بھی ہو گیا ہوتا، اس لیے کہ وہ علاقے کے اندر باہر سے اچھی طرح واقف تھا اور رافٹ مینوں میں اس کے اچھے خاصے دوست بھی تھے۔ 'آئن لاگے' کے بعد، جہاں، ڈیڈ وِستولا میں، رافٹ آہستہ آہستہ تیرا کرتا تھا، ضرورت سے زیادہ ملاحوں سے بھری ماہی گیری کی ایک کشتی، بہ ظاہر یہ ظاہر کرتی ہوئی کہ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی کہ اس کا اصل مقصد کیا ہے، اس کے آس پاس رہا کرتی تھی۔ 'پلنڈارف' سے ذرا آگے، ناگر موتھے کی جھاڑیوں سے نکل کر پولیس کی دو تیز رفتار کشتیوں نے، دریا کے دہانے کے نمکین پانی میں جھاگ اڑاتا، آر پار اور آگے پیچھے دوڑ لگانا شروع کر دیا تھا۔ 'ہوبوڈے' لے جانے والے پُل سے پرے، پولیس نے ایک حلقہ بنا لیا تھا۔ جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی، پولیس ہی پولیس نظر آتی تھی: لٹھوں سے بھرے میدانوں میں، گھاٹوں اور آبی مچانوں پر، آرے کے کارخانے کے گودیوں پر، کمپنی کی گودیوں پر جہاں آدمیوں کے رشتے دار ان کے انتظار میں ہوتے تھے۔ وہ ہر جگہ تھے، سوائے 'شیشاؤ' دریا کے اس پار؛ وہاں ہر طرف جھنڈے ہی جھنڈے دکھائی دے رہے تھے، وہاں شاید کچھ ہو رہا تھا، ایسا لگتا تھا گویا کوئی کشتی پانی میں اتاری جا رہی تھی، پُرجوش مجمع، ہیجانی کیفیت، جہاں کے آبی پرندے بھی قابو سے باہر ہو رہے تھے، وہاں ایک تقریب ہو رہی تھی — میرے نانا کے لیے ایک تقریب؟

صرف اسی وقت جب میرے نانا نے لکڑی برآمد کرنے والی کھاڑی کو نیلی وردی

والوں سے بھرا دیکھا، صرف اسی وقت، جب کشتیاں زیادہ بیہودہ طریقے سے آگے پیچھے دوڑنے لگی تھیں، اور اٹھتی ہوئی لہریں رافٹوں سے ٹکرانے لگیں، جب وہ مہنگے maneuvers کی اس حقیقت سے واقف ہو گیا تھا کہ یہ سب اسی کے فائدے کے لیے منظم کیے گئے ہیں، تب ہی کوواچکی کا پرانا آتش زن دل جاگ اٹھا تھا۔ تب اس نے مہذب رانکا کو اُگل دیا، رضا کار رانکا نے آتش زن کی کیچلی اتار پھینکی، علی الاعلان اور رواں لہجے میں ہنکلے رانکا سے ناتا توڑ لیا، اور فرار ہو گیا، رافٹ چھوڑ کر بھاگ نکلا، ہمہ وقت وسیع ہوتی خلیج کو پھاند گیا، ننگے پاؤں کھردرے تختوں پر دوڑتا نکلا، ایک لٹھے سے دوسرے لٹھے، تختے پھلانگتا 'ٹھیشاؤ' کی طرف گیا، جہاں ہوا میں جھنڈے لہرا رہے تھے، لکڑی کے تختوں پر ہوتا ہوا، جہاں جہاز کے پانی میں اتارے جانے کی تقریب ہو رہی تھی، جس میں خوب صورت تقریریں کی جا رہی تھیں، جہاں کوئی "رانکا، رانکا" چلا نہیں رہا تھا، چہ جائے کہ "کوواچکی" کا نام لیا جاتا، اور پھر الفاظ گونجے : میں، America , HMS Columbus تیرا بپتسما کرتا ہوں، چالیس ہزار ٹن وزن، تین ہزار ہارس پاور طاقت، جلالت مآب شاہنشاہ کے جہاز، فرسٹ کلاس ڈائننگ روم، سیکنڈ کلاس ڈائننگ روم، جمنازیم، کتب خانہ، جلالت مآب شاہنشاہ کے جہاز، توازن برقرار رکھنے والے جدید پرزے سے لیس، چہل قدمی کے لیے ڈیک اور وہاں شہزادہ ہائن ریخ (Heinrich) کھڑا ہوا ہے، اور میرا نانا کوواچکی، ننگے پاؤں، جس کے پاؤں مشکل سے لٹھوں کو چھو رہے ہیں، پیتل کے چمچماتے بینڈ باجے کی طرف دوڑ رہا ہے، ایسا ملک جس میں ایسے شہزادے ہوں، ایک رافٹ سے دوسرے رافٹ تک، لوگ دل بڑھا رہے ہیں، اور ڈاکیارڈ کے سائرن، بندرگاہ کے ہر جہاز کا سائرن بج رہا ہے، ہر ٹگ اور تفریح کے جہاز، کولمبس، امریکا، آزادی کا، اور دو کشتیاں خوشی سے پاگل، اس کے ساتھ دوڑتی ہوئی، رافٹ سے رافٹ تک، جلالت مآب شاہنشاہ کے رافٹ، اور یہ ان کا راستہ روک رہی ہیں، بہت بُری بات ہے، وہ تو مزے کر رہا تھا، وہ رافٹ پر اکیلا کھڑا ہے، کولمبس، امریکا کو دیکھ رہا ہے، اور وہاں تیز رفتار کشتیاں بھی ہیں۔ وہاں کرنے کو اور کچھ نہیں سوائے پانی میں اُتر جانے کے، اور میرا نانا تیرتا

دکھائی دے رہا، ایک رافٹ کی طرف جاتا ہوا، جو 'موٹلاؤ' میں تیرتا پھر رہا ہے۔

مگر، اسے تیز رفتار کشتیوں کی وجہ سے ڈبکی مارنا پڑ رہا ہے، اور ان کشتیوں کی وجہ سے پانی کے اندر ٹھہرنا پڑے گا، اور رافٹ اس کے اوپر سے گزر جاتی ہے، رُکے گی نہیں، ایک رافٹ دوسری رافٹ کو اکسا رہی ہے: تمھاری رافٹ کی رافٹ، ابدالآباد کے لیے: رافٹ!

کشتیوں نے اپنے انجن بند کر دیے ہیں۔ سنگ دل آنکھوں نے پانی کی سطح پر نظریں دوڑائیں، مگر کوواچکی تو ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے، موسیقی کے بینڈ سے دور، سائرنوں سے دور، جلالت مآب کے جہاز کے گھنٹوں سے دور، شہزادہ ہائن رخ کے مجسمے کے پتے سے دور، اور جلالت مآب شاہنشاہ کے آبی پرندوں سے دور، اور جلالت مآب کے soft soap سے دور جو اِن جہاز کے راستوں کو soap کرتا ہے، امریکا سے اور کولمبس سے دور، پولیس کے تعاقب سے دور اور لٹھوں کی لامتناہی خلیج سے دور۔

میرے نانا کی لاش کبھی نہیں ملی۔ حالاں کہ جس طرح بھی مرا ہو، رافٹ کے نیچے، مگر میری محبت، مکمل سچائی، مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں کچھ جدا جدا وجوہ پیش کروں جن کے باعث وہ معجزانہ طور پر بچا لیا گیا تھا۔

ایک روایت یہ ہے کہ اسے دو لٹھوں کے درمیان ایک دراڑ مل گئی تھی، بس اتنی سی دراڑ جس کی مدد سے اس کی ناک پانی سے اوپر تھی، مگر دراڑ اوپر سے اتنی تنگ تھی کہ وہ قانون کے نچلے درجے کے ملازمین سے روپوش رہا جو اس کو رات گئے تک رافٹوں میں، حتیٰ کی ان پر سرکنڈے سے بنے جھونپڑوں میں تلاش کرتے رہے۔ اور کہانی یہ ہے کہ— رات کے اندھیرے میں اس نے خود کو، تھکن سے نیم مردہ حالت میں، پانی کے رحم پر تیرتا چھوڑ دیا تھا، اور دوسرے کنارے پر واقع 'شیشاؤ' ڈاکیارڈ پہنچ گیا تھا: وہاں وہ لوہے کے ناکارہ ٹکڑوں کے ڈھیر پر پڑا رہا، اور بعد میں یونانی ملاحوں کی مدد سے ان کثیف تیل بدبودار جہازوں پر لے جایا گیا جو بھگوڑوں کو پناہ دینے کے لیے مشہور ہیں۔

ایک اور روایت یہ ہے کہ کوواچکی، جو باکمال پھیپھڑے رکھنے والا مشاق پیراک ہے، نہ صرف رافٹ کے نیچے پیرتا رہا، بلکہ اس نے موٹلاؤ دریا کا بقیہ حصہ بھی زیرِ آب پیرتے ہوئے

پار کیا اور 'شیشاؤ' ڈاکیارڈ تک پہنچ گیا جہاں، لوگوں کی نظروں میں آئے بغیر پُر جوش عوام میں گھل مل گیا، جہاز کے بپتسمے کے موقعے پر شہزادے ہائن ریخ کے خطاب پر تالیاں بجانے والوں میں شامل ہو گیا، اور جہاز کے پانی میں اتارے جانے کے بعد، جب اس کے کپڑے نصف خشک ہو گئے تھے، عوام کے ساتھ اِدھر اُدھر ہو گیا۔ اگلے دن— اب یہاں دونوں روایتیں مل جاتی ہیں— وہ اسی بدنام یونانی جہاز پر چھپ گیا تھا جو اس سلسلے میں مشہور ہے۔

بات مکمل کرنے کی خاطر، میں ایک تیسرا لغو قصہ بھی بیان کرتا چلوں، جس کے مطابق میرا نانا لکڑی کے ٹکڑے کی طرح تیرتا ہوا سمندر تک پہنچ گیا تھا اور 'بانساک' کے مچھلی شکار کرنے والوں نے اس کو پانی سے نکال لیا تھا، اور جب وہ تین میل کی حد سے باہر ہو گئے تھے تو اس کو گہرے سمندروں میں مچھلی کا شکار کرنے والے سویڈن کے ماہی گیروں کے حوالے کر دیا تھا۔ اس طرح ایک معجزاتی بازیافت کے ذریعے وہ 'مالمو' پہنچ گیا تھا غیرہ......وغیرہ۔

یہ سب ماہی گیروں کی کہانیاں، محض فضولیات ہیں، اور کچھ نہیں۔ میں چشم دید گواہوں کو گواہی کے عوض ایک کھوٹا سکہ بھی نہ دوں —ایسے چشم دید گواہ دنیا بھر میں ہر بندرگاہ پر پائے جاتے ہیں --جو دعویٰ کرتے ہیں کہ انھوں نے میرے نانا کو پہلی عالمی جنگ کے تھوڑے دنوں بعد امریکا کے شہر 'بفلو' میں دیکھا تھا، جس نے خود کو 'جو-کولچک' کے نام سے مشہور کر رکھا تھا اور کینیڈا سے لکڑیاں درآمد کرتا تھا، بہت بڑا ذخیرہ کرنے والے، دیا سلائی بنانے کے کارخانوں کے لیے، جو آتش زدگی کا بیمہ کرنے والی کمپنیاں بناتے ہیں۔یہ تھے میرا نانا، ایک تنہا کروڑ پتی، آسمان چھو لینے والی عمارت میں، ہر انگلی میں ہیروں سے مزیّن انگوٹھیاں پہنے، ایک بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھا، آگ بجھانے والوں کی وردی میں ملبوس اپنے باڈی گارڈ کو دوڑاتا رہتا ہے جو آگ بجھانے والوں کی وردی پہنے، پولش زبان میں گانا گاتے اور، پولش زبان کے گانے گاتے رہتے ہیں، جن کو ققنس کے نام سے جانا جاتا تھا۔

# پتنگا اور بجلی کا بلب

ایک تھا آدمی، جو ایک دن اپنا سب کچھ چھوڑ کر سمندر پار چلا گیا تھا، اور وہاں پہنچ کر دولت مند بن گیا۔ ہم اسے جو کچھ بھی نام دے لیں، Goljaczek کہیں (پولش)، Koljaiczek کہیں (کشوبیائی)، یا Joe Colchic کہیں (امریکی)۔ میرے دادا کے بارے میں یہ اتنا آسان بھی نہیں کہ وہ ٹین سے بنے ایک نقارے جیسا تو نہیں ہے، اس نوعیت کا، جسے آپ کسی دکان سے خرید سکتے ہیں، کہ ہم دریا سے، جو تقریباً افق کی بلندی تک لٹھوں سے بھرا ہوا ہو، اس کے بارے میں سوال کریں۔ اس کے باوجود میں نے ناگر موتھے کی جھاڑیوں یا دریا کے پیچ وخم میں چھپی ہوئی، اور عیشاؤ کے 'کلاوز' شپ یارڈ کے اور خشک گودی کے دھات کے ٹکڑوں کے ڈھیر، مارجرین کے کارخانے کے بدبودار ریل کے ذخیروں، اور تمام چھپنے کی جگہوں پر جو مجھے معلوم تھیں، نقارہ بجا بجا کر لکڑی کی بندرگاہ تلاش کی تھی۔ وہ انتقال کر چکا ہے، وہ مجھے جواب نہیں دیتا، نہ شاہی جہازوں کے پانی میں اتارے جانے میں اسے دلچسپی ہے، نہ وہ کسی جہاز کی تنزلی میں دلچسپی لے رہا ہے، پانی میں اتارے جانے کے وقت سے جس کی عمر کی ابتدا ہوتی ہے اور کبھی کبھی تیس تیس برس تک جاتی ہے۔ تازہ ترین معاملے میں، کولمبس جہاز کی تنزلی میں بھی اسے کوئی دلچسپی نہیں،، جس کو کبھی بیڑے کی شان سمجھا جاتا تھا اور اسے شمالی اوقیانوس کے راستے پر چلایا جاتا تھا۔ بعد میں کیا ہوا؟ یا تو وہ غرق ہو گیا، یا کہیں بھاگ گیا تھا، پھر شاید کہیں

نئے نام سے، اور مرمت اور آرائش کے بعد دوبارہ چلا دیا گیا ہوگا، یا جہاں تک مجھے علم ہے، ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا۔ شاید میرے نانا کی طرح، کولمبس جہاز بھی کہیں محض غوطہ لگا گیا ہے، اور آج اپنے چالیس ہزار ٹن وزن، اپنے ڈائننگ کمروں، نہانے کی حوضوں، جمنازیم اور مالش کرنے والے کمروں سمیت سمندر میں ہزاروں فٹ نیچے، فلپائن ڈیپ' یا 'ایمبڈن حالو' میں کہیں پڑا ہوگا؛ آپ کو پورا قصہ Weyer's Steamships یا شپنگ کے کیلنڈروں میں مل جائے گا — مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کولمبس بھی فرار ہو گیا تھا، اس لیے کہ کپتان جنگ میں ملوث ہونے کی بدنامی سے بچ نہیں سکتا تھا۔

میں نے اپنے نگہبان برونو کو رافٹ کے بارے میں اپنی کہانی سنائی اور پھر یہ کہہ کر کہ اسے معروضی انداز میں دیکھنا، اس سے اس کے بارے میں سوال کیا۔ برونو نے پُرجوش ہو کر کہا، "ایک خوب صورت موت" اور فوراً ہی اس نے میرے غرق شدہ غریب دادا کی اپنے گھٹیلے بھوت میں قلبِ ماہیت کرنی شروع کر دی تھی۔ میں صرف اس کے جوابات ہی پر قناعت کر سکا اور اس کے امریکا جانے کے تمام احمقانہ منصوبوں کو بھیک میں ملنے والی وراثت کی امید پر چھوڑ دیا تھا۔

میرے دوست کلیپ اور وِٹلر (Vittlar) مجھ سے ملنے آئے۔ کلیپ میرے لیے جاز کا ایک ریکارڈ لایا تھا، جس کے دونوں جانب "کنگ آلیور" تھا؛ وِٹلر، نے نہایت تکلف سے مجھے گلابی ربن میں بندھا چاکلیٹ کا دل پیش کیا تھا۔ دونوں بیٹھے دیر تک مجھ سے اٹکھیلیاں کرتے رہے؛ میرے مقدمے کے ٹرائل کی نقل اتارتے رہے۔ اور، ان کی خوشنودی کی خاطر میں صرف مسکراتا رہا، جیسا کہ میں عام طور پر ملاقاتیوں کے دنوں میں کیا کرتا تھا، اور قنوطی لطیفے پر بھی ہنسنے کی کوشش کرتا رہا۔ قبل اس کے کہ کلیپ جاز اور مارکسزم پر لیکچر دینا شروع کر دیتا، میں نے اپنی کہانی بیان کی، اس آدمی کی کہانی جس نے 1913 میں گولی چلنے سے پہلے ایک بڑے سے رافٹ کے نیچے غوطہ لگایا تھا اور پھر پانی کی سطح پر کبھی نظر نہیں آیا، اور انھیں اس کی لاش بھی نہیں ملی تھی۔

میرے سوالات کے جواب میں — جو میں نے بیزاری کے باعث بے ساختہ

کیے تھے، کلاپ نے بد دلی سے اپنی موٹی سی گردن پر رکھا ہوا سر ہلا دیا تھا، اپنی صدری کے بٹن کھولے اور پھر بند کر لیے، دریا میں پیر نے جیسی حرکات کیں، اور ایسی اداکاری کی گویا وہ کسی رافٹ کے نیچے ہو۔ آخر میں، اس نے نفی میں اپنا سر ہلا کر میرے سوال کو رَد کر دیا اور کہا کہ محض ایک دوپہر کے عرصے میں کوئی رائے قائم کرنا جلد بازی ہوگی۔

ڈیکر اس طرح اپنے پاؤں پر پاؤں دھرے اکڑا بیٹھا رہا کہ اس کی دھاری دار پتلون کی استری خراب نہ ہو، اور اپنے چہرے پر متکبرانہ، سکی مزاج اور جنت کے فرشتوں جیسا تاثر دیتا ہوا بولا، "میں رافٹ پر سوار ہوں۔ رافٹ کی فضا خوش گوار ہے۔ مچھر مجھے کاٹ رہے ہیں، جو خاصا تکلیف دہ ہے۔ اب میں رافٹ کے نیچے ہوں۔ رافٹ کے نیچے بھی حالات خوش گوار ہیں۔ مچھر اب مجھے کاٹ نہیں رہے ہیں، جو بہت اچھی بات ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں رافٹ کے نیچے مزے سے رہ سکتا ہوں، اگر مجھے رافٹ پر آنے اور مچھروں سے کٹوانے کی تمنا نہ ہو۔" ڈیکر نے ہمیشہ کی طرح اثر پیدا کرنے کے لیے کچھ دیر توقف کیا، مجھے سر سے پیر تک دیکھا، اپنے اونچے اونچے ابرو اور بلند کیے، جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتا ہے جب اس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اُلّو کی طرح نظر آئے، اور تمیز کے تیز لہجے میں کہا، "میرا قیاس ہے کہ وہ شخص جو غرق ہو گیا، رافٹ کے نیچے والا آدمی، وہ اگر تمھارا نانا نہیں تو گریٹ انکل رہا ہوگا۔ وہ اس لیے موت سے دوچار ہوا کہ گریٹ انکل کی حیثیت میں، یا بڑے پیمانے پر نانا ہوتے ہوئے، اس کا خیال تھا کہ وہ تمھارا قرض دار ہے، اس لیے کہ زندہ نانا ہوتے ہوئے وہ تم پر زیادہ بوجھ ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہوا گویا تم نہ صرف اپنے گریٹ انکل کے بلکہ اپنے نانا کے بھی قاتل ٹھہرے۔ پھر بھی تمام اچھے ناناؤں کی طرح وہ تم کو کچھ سزا دینا چاہتا تھا؛ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تم ایک پھولی اور پانی بھری لاش کی طرف فخر سے انگلی اٹھا کر یہ کہنے میں اطمینان محسوس کرو اور وعظ کرنے لگو، دیکھو یہ ہے میرے نانا کی لاش۔ یہ شخص ایک ہیرو تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے تعاقب کرنے والوں کے ہاتھ لگ جاتا، اس نے دریا میں چھلانگ لگا دی تھی۔

تمھارے نانا نے اپنی لاش سے دنیا کو، اور اپنے نواسے کو بھی دھوکا دیا تھا۔ کیوں؟ تاکہ اس کی اولاد اور اس کا نواسہ، آنے والے برسوں تک پریشان رہے۔"

پھر اچانک، ایک گداز سے دوسرے گداز، قلابازی کھاتے ہوئے وہ آگے بڑھ کر ذرا ساتھم ہوا اور جھوٹا دلاسا دینے والا مکار چہرہ بناتے ہوئے بولا، ''بس، امریکا! حوصلہ رکھو، آسکر۔ تمھارے سامنے ایک مقصد ہے، زندگی کا ایک مشن ہے۔ تم بَری ہو جاؤ گے۔ تو تم کو کہاں جانا چاہیے، امریکا! وہ سرزمیں جہاں لوگ وہ سب کچھ پالیتے ہیں جو کھو چکے ہوتے ہیں، حتیٰ کہ گم کردہ نانا بھی۔''

طنزیہ اور دھمکی کے انداز میں جیسا کہ وِٹلر کا جواب تھا، اس نے مجھے میرے دوست کلیپ کے اکھڑ پن انداز کے مقابلے میں زندگی اور موت کے درمیان فیصلہ کرنے کے بجائے زیادہ یقین فراہم کیا، یا میرے نگہبان برونو کا جواب، جس کا خیال تھا کہ میرے نانا کی موت بڑی خوب صورت موت صرف اس لیے تھی کہ اس کے فوراً بعد ہی کولمبو جہاز کو پانی میں اتارا گیا تھا۔ خوش باش! وِٹلر کے امریکا، نانا دادا کے پالن ہار، ہدف اور آدرش کے پورا کرنے والے، جس کے ذریعے میری آبادکاری ہو جائے، جب یورپ تھکا ہوا ہے، اور میں اپنا نقارہ اور قلم ایک طرف رکھ دینا چاہتا ہوں۔

''آسکر، لکھتے رہو آسکر! اپنے دولت مند نانا کے لیے، جو دولت مند تھا، کوواچکی کے لیے لکھو، وہ جو بفلو، امریکا کے چوب کے کاروبار کا بادشاہ ہے، اس تنہا ملکِ التجار کے لیے جو اپنی بلند و بالا عمارت میں بیٹھا دیا سلائی سے کھیل رہا ہے۔''

جب کلیپ اور وِٹلر دونوں چلے گئے، تو برونو نے ان کی پریشان کن بو کو دور کرنے کے لیے کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں۔ میں اپنے نقارے کی طرف متوجہ ہوا مگر اب میں موت کو چھپانے والے لٹھوں کو نقارہ نہیں بنا رہا تھا؛ نہیں! میں نے اُکھڑے اُکھڑے تال میں نقارہ بجانا چھوڑ دیا، جو ہر ایک کی حرکتوں کو اگست 1914 کے بعد بہت دنوں تک کمانڈ کرتا رہا تھا۔ اس طرح میرے لیے ممکن نہیں کہ میں، اپنی پیدائش کے اولین لمحے تک اپنی زندگی اور میرے نانا کا سوگ کرنے والے لوگوں کے بارے میں کچھ بیان کر سکوں، جنھیں وہ یورپ چھوڑ آیا تھا۔

جس وقت کوواچکی رافٹ کے نیچے جا کر غائب ہوا تھا اس وقت میری نانی، اس

کی بیٹی ایگنس، ویسنٹ برانسکی اور اس کا سات برس کا بیٹا 'جان' رافٹ مینوں کے اہلِ خاندان کے ساتھ آرے کے مل کی گودی پر کھڑے دیکھ رہے تھے۔

وہاں سے ذرا دور، مگر دوسری جانب جوزف کا بڑا بھائی گرگر کوواچکی بھی کھڑا تھا، تفتیش کے لیے جسے پولیس نے طلب کیا تھا۔ گرگر کے پاس بس ایک ہی جواب ہوتا تھا ''میں اپنے بھائی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ بس میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ اس کو جوزف کہتے ہیں۔ پچھلی بار جب میں نے اسے دیکھا تھا، اس وقت اس کی عمر دس یا بارہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے میرے جوتے چمکائے تھے اور بیئر لینے چلا گیا تھا، جب میں میری ماں دونوں بیئر پینا چاہ رہے تھے۔''

حالاں کہ یہ پتا چل گیا تھا کہ میری نانی نے واقعی بیئر پی تھی، گرگر کوواچکی کا جواب پولس کی کوئی مدد نہیں کرسکا تھا۔ مگر بڑے کوواچکی کی موجودگی میری نانی اناکے بہت کام آئی تھی، جس کی پوری زندگی اسٹیٹن، برلن، میں گزری تھی، اور آخر میں وہ 'شنائیڈے مول' اور وانٹسنگ میں رہا تھا، جہاں بارود بنانے والے کارخانے میں اسے ملازمت مل گئی تھی۔ اور ایک برس بعد، جب ساری الجھنیں، جیسے جعلی رانکا کے ساتھ نانی کی شادی وغیرہ کی گتھیاں سلجھا لی گئی تھیں، گرگر نے میری نانی سے شادی کر لی، جس نے حتمی طور پر کوواچکی کے خاندان کے ساتھ رہنے، اور گرگر سے، اگر وہ کوواچکی خاندان کا نہ ہوتا تو، اتنی جلدی شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہوتا۔ بارود کے کارخانے میں گرگر کی ملازمت نے زمانۂ امن اور جنگ کے دوران فوج میں بھرتی سے بچائے رکھا تھا۔ تینوں ایک ساتھ اسی ڈیڑھ کمرے کے فلیٹ میں زندگی گزار رہے تھے جس نے اتنے برسوں تک آتش زن کو پناہ فراہم کی تھی، مگر جلد ہی یہ واضح ہو گیا تھا کہ ضروری نہیں کہ ایک کوواچکی دوسرے کوواچکی جیسا ہی ہو، اس لیے کہ شادی کے ایک برس بعد میری نانی کو 'ٹرویل' کے تہہ خانے والی دکان کو کرایے پر لینا پڑا، جو اتفاق سے خالی ہو گئی تھی، اور اس طرح اس نے سوئی سے کرم کلّے تک بیچ کر بھی جو کچھ کما سکتی تھی، کمایا، اس لیے کہ، اگرچہ گرگر بارود کے کارخانے میں بہت کماتا تھا مگر سب کچھ پینے پلانے میں اڑا دیا کرتا تھا؛ اور جتنا وہ گھر لاتا تھا، گھر

کی ضروریات کے لیے کافی نہیں ہوتا تھا۔ میرا نانا جوزف سے بہت مختلف تھا، جو کبھی کبھار برانڈی کی دو ایک چسکیاں لے لیا کرتا تھا، گریگر واقعی شرابی تھا، اور یہ عادت اس نے میری پرنانی سے ورثے میں پائی تھی۔ وہ اس لیے نہیں پیتا تھا کہ غم غلط کرے۔ وہ جس وقت بہت خوش و خرم بھی ہوتا، جو اتفاقیہ ہوا کرتا تھا، اس لیے شراب سے پرہیز نہیں کرتا تھا کہ وہ خوش ہوتا تھا۔ اس لیے پیتا تھا کہ وہ پورا مرد تھا، جو صرف بوتلوں کی ہی نہیں ہر شے کے معاملات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا، کسی نے گریگر کو جام میں ایک قطرہ شراب بھی چھوڑتے نہیں دیکھا ہوگا۔

اُس وقت میری ماں پندرہ برس کی گول مٹول سی لڑکی تھی، جو گھر میں بھی کام کرتی اور دکان میں بھی ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی؛ وہ بھی کھاتے میں غذا کے ٹکٹ چسپاں کرتی تھی، سنیچر کے دن گاہکوں سے لین دین کرتی تھی، اور مقروض گاہکوں کو تکلیف دہ مگر دلچسپ تخیلاتی خطوط بھی لکھا کرتی تھی، جن میں قرض اتارنے کی تاکید ہوا کرتی تھی۔ افسوس کے وہ خطوط موجود نہیں۔ کتنا اچھا ہوتا، اگر اس مرحلے پر میں اپنی ماں کی پریشانی سے بھرپور ریکانہ چٹھیوں کے کچھ اقتباسات پیش کر سکتا—یاد رہے کہ اس وقت وہ ایک نصف یتیم لڑکی تھی، اس لیے کہ گریگر کوواچکی اس کو سوتیلے باپ جیسی بھی مدد فراہم نہیں کرتا تھا۔ اس کے بالکل برعکس، میری نانی اور اس کی بیٹی بڑی مشکل سے اپنے غلّے (cash box) کو بارود بنانے والے کی تیز اور پیاسی نظروں سے بچا پاتی تھیں، جس میں ٹین کی دو چادروں کے درمیان چاندی کم اور تانبا زیادہ تھا۔ اس وقت، جب 1917 میں گریگر کا انفلوئنزا میں انتقال ہو گیا تب ہی دکان سے نفعے میں کچھ اضافہ ہوا تھا، زیادہ نہیں، کہ 1917 میں دکان میں بیچنے کے لیے تھا ہی کیا؟

وہ چھوٹا سا کمرہ جو بارود بنانے والے کی موت کے بعد سے خالی تھا، ممّا نے اس میں منتقل ہونے سے انکار کر دیا تھا اس لیے کہ وہ بھوتوں سے بہت خوف کھاتی تھی۔ اس میں جان برانسکی منتقل ہو گیا تھا جو میری ماں کا عم زاد تھا، اور اس وقت صرف بیس برس کا تھا۔ اس نے کارٹ ہاؤس کے اسکول سے گریجویشن کیا تھا اور صوبے کے دارالحکومت کے محکمۂ ڈاک میں کچھ عرصے کے لیے تربیتی کام کر رہا تھا۔ وہ اپنے والد کو چھوڑ کر ملازمت

کی خاطر بساؤ سے ڈاینتسگ کے ڈاک خانے میں کام کرنے لگا تھا۔ ایک صندوق کے علاوہ، جان اپنے ساتھ ڈاک کے ٹکٹوں کا ایک ذخیرہ بھی لایا تھا، وہ اپنے بچپنے سے جن پر کام کر رہا تھا۔ سو، آپ نے دیکھا کہ اسے ڈاک خانے سے پیشہ ورانہ لگاؤ بھی تھا؛ بلا شبہ، وہ اس تنظیم کے اس شعبے کے بارے میں فکرمند رہا کرتا تھا۔ وہ بیمار نوجوان تھا، اور اس عمر میں بھی وہ ہلکے سے جھکاؤ کے ساتھ چلتا تھا، مگر وہ نہایت خوب صورت بیضوی چہرے کا مالک تھا جس پر کچھ ذرا زیادہ ہی دلکشی تھی۔ نیلے رنگ کی دو آنکھیں، جن کے باعث میری مما، جو اس وقت صرف سترہ برس کی تھی، اس پر ریجھ گئی تھی۔ تین بار اس کو فوجی خدمت کے لیے طلب کیا گیا تھا مگر ہر بار اسے افسوس ناک جسمانی حالت کے باعث رد کر دیا جاتا تھا، اُن حالات کے پیشِ نظر جو اس زمانے کے جان برانسکی کی جسمانی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہیں، جب ہر بالغ شخص، کم از کم نصف حد تک کھڑا ہو سکتا تھا، اسے وردون میں جسمانی کجی کو دور کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ دونوں کے درمیان دل چسپی اس وقت شروع ہوئی ہوگی جب دونوں سر جوڑ کر ٹکٹوں کے واٹر مارک اور اس میں کیے گئے سوراخ دیکھنے کے لیے اکٹھے ہوتے رہے ہوں گے۔ دونوں کی آپس میں محبت آہستہ آہستہ شروع ہوئی، یا اچانک اس وقت پھوٹ پڑی تھی جب جان کو چوتھی بار فوجی خدمت کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ میری ماں، جان کے ساتھ کئی بار آئی گئی۔ وہ شہر گئی، ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر گئی اور فوجی کیمپ کے باہر انتظار کیا جہاں پہرے دار کھڑا ہوتا ہے۔ اور دونوں اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ اب جان کو جانا ہی ہوگا، کہ اس بار جان کو اس کے سینے کے علاج کے لیے فرانس کی فضا میں بھیجا جائے گا، جو لوہے اور سیسے سے پُر ہوا میں موجودگی کے لیے مشہور ہے۔ بہت ممکن ہے کہ میری ماں نے کئی بار، مختلف نتائج کے ساتھ، فوجی کیمپ کے پہرے دار کی وردی میں لگے بٹن بھی گن لیے ہوں۔ میں بڑی آسانی سے اس امر کا بھی تصور کر سکتا ہوں کہ وردیوں میں بٹن اس طرح لگائے جاتے ہوں گے کہ جب آخری بٹن گنا جائے تو اس کا مطلب ہمیشہ وردون، یا 'ہارٹمانز وائیلر کاف'، یا کسی چھوٹے سے دریا کا نام نکلتا ہوگا، مثال

کے طور پر 'سومے' یا 'مارنے' (Marne)۔

جب، مشکل سے ایک گھنٹا گزرا ہوگا کہ، چار بار طلب کیا گیا آدمی ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر کے پھاٹک سے باہر نکلا، تو سیڑھیوں پر لڑکھڑایا اور میری مما ایگنس کی گردن پر گرتے وقت وہ جملہ دہرایا جو اُن دنوں بہت بولا جاتا تھا:

They can't have my front, they can't have my rear.

They've turned me down for another year.

ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ جان میری مما کی بانہوں میں تھا، اور میرا خیال ہے کہ ان کی اس ہم آغوشی سے زیادہ خوشی انھیں شاید ہی کبھی ملی ہوگی۔

جنگ کے زمانے کی اس محبت کی تفصیل کا مجھے علم نہیں۔ جان نے میری مما کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے ٹکٹوں کے ذخیرے کا ایک حصہ فروخت کر دیا تھا، جسے خوب صورت چیزیں پسند آتی تھیں، اور کہا جاتا ہے کہ وہ ڈائری بھی لکھتا تھا، بدقسمتی سے جو گم ہو گئی ہے۔ بہ ظاہر، میری نانی نے دو نوجوان افراد کے درمیان اس سلسلے کو—جو عم زاد سے کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا— برداشت کیا۔ جان برانسکی جنگ کے ختم ہونے کے بعد تک 'ٹرول' کے اس چھوٹے سے فلیٹ ہی میں قیام پذیر رہا تھا۔ جان اس وقت یہ فلیٹ چھوڑ کر چلا گیا تھا جب مسٹر ماتسیرات (Matzerath) کا وجود ناقابلِ انکار ہو گیا تھا۔ میری ماں 1918 کے گرمیوں کے موسم میں اس سے ملی ہوگی، جب وہ مددگار نرس کے طور پر 'آلیوا' کے قریب واقع سلبر ہامر (Silberhammer) اسپتال میں کام کر رہی تھی۔ رھائن لینڈ (Rhineland) کا رہنے والا مسٹر ماتسیرات بندوق کی گولی سے زخمی ہو کر اسپتال داخل ہوا تھا۔ گولی اُس کی ران سے ہو کر نکل گئی تھی۔ جلد ہی وہ اپنی رہائنی خوش مزاجی کے باعث نرسوں کا پسندیدہ مریض بن گیا تھا۔ سسٹر ایگنس ان میں سے خارج نہیں تھیں۔ جب وہ اٹھنے کے قابل ہو گیا تھا تو کسی ایک نرس کے بازو کے سہارے برآمدے میں لنگڑا لنگڑا کر چلتے اور باورچی خانے میں سسٹر ایگنس کی پکانے ریندھنے میں مدد بھی کیا تھا، اس لیے کہ اس کے گول چہرے پر پہنا ہوا نرسوں کا سرپوش اُسے بہت اچھا لگتا تھا اور چوں کہ وہ ایک

اچھا باورچی بھی تھا، وہ جذبات کو شوربے میں تبدیل کر دینے کا ہنر جانتا تھا۔

جب اُس کے زخم بھر گئے، تو الفریڈ ماتسیرات نے ڈینسنگ میں قیام کیا اور جلد ہی اس کو لکھنے پڑھنے کی اشیا بنانے والے ایک رہائی ادارے کی نمائندگی مل گئی، جس میں وہ جنگ سے پہلے ملازم تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ ایسے امن کے معاہدے جو مزید جنگ کا باعث ہو سکتے تھے، دوبارہ لکھے جا رہے تھے: وِستولا دریا کے دہانے کے اطراف کے علاقے کی ایک خط کے ذریعے نئے سرے سے حد بندی کی جا رہی تھی۔ یہ خط 'ووگل سانگ' سے ہوتا ہوا 'نُہبرَنگ' اور 'نوگاٹ' سے 'پیکل' اور وِستولا سے 'تسانکاؤ' اور وہاں سے زاویہ قائمہ کی صورت 'شون فلیس' تک جاتا تھا۔ وہاں سے 'ساسکوشین' کے جنگل، 'اوتو مین' اور 'میگرن'، 'رامکاؤ' اور میری نانی کے گاؤں بِساؤ کو ایک طرف چھوڑتا ہوا بحرِ بالٹک کے علاقے 'کلائن کاٹز' جاتا تھا جس کو لیگ آف نیشنز کی زیرِ نگرانی آزاد ریاست بنا دیا گیا تھا۔ پولینڈ کو بھی 'ویسٹر پلاٹے' نام کی ایک آزاد بندرگاہ دے دی گئی تھی جس میں گولہ بارود رکھنے کے گودام تھے، اور ریلوے کی ایک انتظامیہ تھی، اور ہویلیس پلاٹز پر اس کا اپنا ایک ڈاک خانہ بھی تھا۔

فری سٹی کے ڈاک کے سُرخ و سنہرے رنگ ہنسائی حسب نسب سے مزیّن ہوتے تھے، جب کہ پولینڈ والے اپنی ڈاک کو 'کاسمیر' اور 'باتوری' کی زندگی کے مناظر سے سجاتے تھے جن میں بھیانک گہرا بنفشی رنگ استعمال کیا جاتا تھا۔ جان برانسکی نے پولینڈ کا انتخاب کیا اور اس کا تبادلہ پولش ڈاک آفس میں ہو گیا۔ یہ ایک برجستہ معنی خیز اشارہ محسوس ہوا جسے عام طور پر میری ماں کی بے وفائی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ 1920 میں جب مارشال پلڈسکی نے سُرخ فوج کو وارسا میں شکست دے دی تھی، تو ایک معجزہ ہوا جس کو وِنسینٹ برانسکی اور دوسروں نے کنواری مریم سے، اور فوجی ماہرین نے یا تو جنرل سیکارسکی یا جنرل ویگنیڈ سے منسوب کیا تھا — اور اسی برس، میری ماں کی ماتسیرات سے منگنی ہو گئی، جس کا تعلق جرمن رائخ سے تھا۔ میں اس کا یقین کرنے پر تیار ہوں کہ جان کے مقابلے میں اس شخص سے مما کے اختلاط پر میری نانی انا، مشکل سے ہی خوش ہوئی ہو گی۔ 'ٹروئل' کی سر دخانے والی دُکان کو، جو اس دوران خاصی منافع بخش ہو گئی تھی، اپنی بیٹی

کے حوالے کر کے وہ بساؤ میں اپنے بھائی ونسینٹ کے پاس منتقل ہو گئی، جو پولش علاقے میں واقع تھا، اور وہاں کے زرعی فارم کا انتظام سنبھال لیا، جس میں چقندر اور آلو کی کاشت کی جاتی تھی، جیسا کہ Koljaiczek کے عہد سے قبل کیا جاتا تھا، وہ اپنے بھائی کو کنواری ملکہ پولینڈ سے بات چیت کے لیے چھوڑ کر، اپنے تلے اوپر چار لہنگے پہن کر خزاں میں آلو کے پودوں سے جلائے جانے والے الاؤ کے قریب جا بیٹھتی، افق کی طرف پلکیں جھپکا کر دیکھتی، جسے ٹیلی گراف کے کھمبے اب بھی علاحدہ علاحدہ کیے ہوئے تھے۔ جب تک جان برانسکی نے کشوبیائی لڑکی ہیڈوگ سے شادی نہیں کر لی، جو شہر میں رہتی تھی، مگر اس کی کچھ زمینیں رامکاؤ کے علاقے میں تھیں، اس کے اور میری ماں کے تعلقات بہتر نہیں ہوئے تھے۔ اس کا قصہ کچھ یوں ہے کہ ایک شام دو نوجوان جوڑے کیفے وائیکے میں رقص کے دوران ایک دوسرے سے ملے، اور جان اور ماتسیرات کا تعارف ہوا۔ دونوں مرد جو فطرت میں ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہونے کے باوجود مما کے لیے ایک ہی جیسے جذبات رکھتے تھے، ایک دوسرے سے الجھ پڑے، اور ماتسیرات کی آوز بلند ہو گئی تھی، اکثر رہائی نے جان کے پولش ڈاک خانے میں تبادلے کو حد درجے کی حماقت قرار دیا تھا۔ جان مما کے ساتھ رقص کرتا رہا، ماتسیرات بڑی بڑی ہڈیوں والی ہیڈوگ کے ساتھ رقص کرنے لگا جس کی ناقابل فہم بیل جیسی آنکھیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ امید سے ہے۔ اس کے بعد وہ دونوں پوری شام ایک دوسرے کے ساتھ رقص کرتے رہے، اگلے رقص کے بارے میں سوچتے ہوئے، پولکا رقص کے بارے میں، یا انگریزی رقص والز کے بارے میں، چارلسٹن میں یا آہستہ فاکس ٹراٹ کی ہوس پرستی کے بارے میں جس کے ڈانڈے مذہب سے ملتے ہیں۔

1923 میں، جب آپ اپنی خواب گاہ کی دیواروں پر ایک دیا سلائی کے برابر قیمت میں کاغذ چڑھا سکتے تھے، الفریڈ ماتسیرات نے، میری مما سے شادی کر لی۔ اس کا ایک گواہ خود جان تھا، دوسرا ایک کریانے کی دکان والا موبلس تھا۔ اس کا بیان صرف اس لیے ضروری ہے کہ اس وقت جب رینٹن مارک آ رہا تھا، اس نے مما اور ماتسیرات کو لانگ فوہر کے مضافات میں کریانے کی ایک دکان فروخت کر دی تھی جو قرض لینے والے نادہند

گاہکوں کی وجہ سے مالی طور پر بد حال ہو گئی تھی۔تھوڑے عرصے کے اندر ہی مما، تہہ خانے کی دکان کے دوران سیکھ چکی تھی کہ قرض نہ چکانے والے گاہکوں سے کیسا نمٹا جاتا ہے، اور اس دوران وہ مقامی کاروباری ترکیبیں اور برجستہ مزاح و حاضر جوابی میں بھی طاق ہو گئی تھی، جلد ہی اس کی یہ دُکان اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی۔ماتسیرات کو جلد ہی اپنی ملازمت چھوڑنی پڑی تا کہ وہ دُکان میں ہاتھ بٹا سکے۔

ان دونوں کی آپس میں خوب بنی۔ دُکان کے کاؤنٹر کے پیچھے کے کام میں میری ماں کی مہارت، ماتسیرات کی منڈی والوں سے معاملے کرنے کے برابر ہو گئی تھی، مگر جس بات نے دونوں کے ساتھ کو کامل بنا دیا تھا، وہ باورچی خانے کے کاموں میں ماتسیرات کی دل چسپی تھی، جس میں وہاں کی صفائی بھی شامل تھی، جو مما کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں تھی، مما کھانا پکانے میں بہت اچھی نہیں تھی۔

دُکان سے ملحق فلیٹ بہت محدود اور خراب طریقے سے بنا ہوا تھا، مگر 'ٹروئل' کی جگہ کے مقابلے میں، جس کے بارے میں صرف سُن رکھا ہے، یہ جگہ درمیانہ درجے کی خصوصیت کی حامل تھی۔کم از کم شادی کے ابتدائی دنوں میں مما نے اس کو بہت آرام دہ محسوس کیا ہوگا۔

اس میں ایک بہت خستہ حال راہداری تھی، جس میں ہمیشہ صابن کے خالی ڈبے پڑے رہتے تھے۔باورچی خانہ خاصا وسیع تھا، حالاں کہ اس میں تجارتی سامان بھرا رہتا تھا: غذا کے سر بند ٹین کے ڈبے، آٹے کی بوریاں، دلیے کے ڈبے وغیرہ۔بیٹھک میں دو کھڑکیاں تھیں، جو گلی میں کھلتی تھیں، اور سبزے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا، گرمی کے دنوں میں جسے سیپیوں سے سجایا جاتا تھا۔دیواروں پر لگے کاغذ زیادہ تر سُرخ وائن کے رنگ کے تھے، اور صوفے پر، اس سے قریبی، ارغوانی رنگ کا کپڑا چڑھا تھا۔

گول کونوں اور چار پایوں پر مشتمل ایک میز تھی جس کو کھول کر بڑھایا جا سکتا تھا، اس کے ساتھ چار کرسیاں، جن پر سیاہ چمڑے کے گدے تھے؛ سیاہ رنگ کے پایوں والی ایک چھوٹی سی گول میز تھی، جو نیلے رنگ کے قالین پر دھری ہوتی تھی، جس کو اسموکنگ ٹیبل کہتے ہیں جسے ضرورت کے مطابق کسی بھی جگہ لے جایا جا سکتا تھا۔ دونوں کھڑکیوں

کے درمیان ایک عمودی گھڑی رکھی تھی جس کا فریم سیاہ اور سنہرا تھا۔ارغوانی رنگ کے صوفے کے سامنے سیاہ رنگ کا ایک پیانو تھا، جسے پہلے تو کرایے پر لیا تھا، بعد میں قسطوں پر خرید لیا گیا تھا؛ پیانو کے لیے ایک گھومنے والا اسٹول تھا جس کے نیچے کسی جانور کی ہلکے پیلے رنگ کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ پیانو کے دوسری جانب کٹ گلاس کے سرکانے والے دروازے کی ایک الماری تھی۔ اس کے نچلے دروازے کے پیچھے چینی کے برتن رکھے ہوتے تھے۔ دروازوں پر سیاہ رنگ کی، پھلوں کی، کندہ کاری کی گئی تھی؛ اس کے پایے عقاب کے سیاہ رنگ کے چنگل کی طرح کے تھے؛ اس کی کندہ کاری کی ہوئی اوپری سطح پر بلّور کا ایک بڑا سا پیالہ رکھا تھا جس میں مصنوعی پھل سجے ہوتے تھے، اور سبز رنگ کا ایک پیارا سا کپ تھا جو کسی لاٹری میں جیتا گیا تھا۔بعد میں باقی رہ جانے والی جگہ، مما کی کاروباری فراست کے طفیل، ہلکے بھورے رنگ کے ایک ریڈیو سے بھر دی گئی تھی۔

خواب گاہ کی دیواروں پر پیلا رنگ کیا گیا تھا، جس کی کھڑکیاں چار فلیٹوں پر مشتمل عمارت کے آنگن میں کھلتی تھیں۔مہربانی کر کے آپ یقین کر لیجیے، جب میں آپ کو بتاؤں، کہ اس ازدواجی قلعے [پلنگ] کے اوپر آسمانی رنگ کا ایک چھتر تنا ہوا تھا، جس سے چھن کر آنے والی ہلکے نیلے رنگ کی روشنی میں، دیوار پر لگے فریم میں متاسف اور گوشت کے رنگ کی، آرزو مندانہ کیفیت میں، مَیری میگڈالینا (Magdalene) کسی غار میں لیٹی دکھائی دیتی تھی، جس کے دونوں ہاتھ تصویر کے دائیں اوپری کونے کی طرف اٹھے ہوئے تھے، اور اس کی ساری انگلیاں اس طرح آپس میں جکڑی ہوئیں تھیں، کہ آپ اس خوف سے انھیں گننے کی کوشش نہیں کریں گے کہ کہیں انگلیاں دس سے زیادہ نہ ہو جائیں۔ پلنگ کے مقابل، سفید تام چینی کے رنگ کا ایک توشہ خانہ ایستادہ تھا، جس کے دروازوں پر آئینے جڑے ہوئے تھے؛ اس کی بائیں جانب ایک سنگھار میز رکھی ہوئی تھی، اور دائیں جانب سنگِ مرمر والی سطح کی دراز دار صندوق نما میز؛ کمرے کی چھت سے پیتل کی بنی دو لائٹیں ٹنگی ہوئی تھیں، مگر اس کی چھت پر بیٹھک والے کمرے کی طرح سائن کی چھت گیری نہیں لگائی گئی تھی۔

آج کی صبح میں نے نظارہ زنی کرنے میں گزار دی ہے، اور اپنے نظارے سے

ہر قسم کے سوالات کرتا رہا ہوں۔مثال کے طور پر، میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میری خواب گاہ میں لگے بجلی کے بلب چالیس واٹ کے تھے یا ساٹھ واٹ کے۔میری لیے یہ سوال بے حد اہمیت کا حامل ہے، اور ایسا پہلی دفعہ نہیں ہو رہا ہے کہ میں نے یہ سوال اپنے آپ سے اور اپنے نقارے سے کیا ہے۔کبھی کبھی تو روشنی کے ان بلبوں تک پہنچنے میں مجھے گھنٹوں لگ جاتے ہیں۔اس لیے کہ مجھے اپنے آپ کو نقارہ زنی کے ذریعے، نمائشی سجاوٹوں کے بغیر روشنی کے بلب کے جنگل سے نجات دلانا ہوتا ہے۔ مجھے اچھی خاصی نقارہ زنی کے ذریعے روشنی کی ہزارہا میکانزم کو بھلادینا ہے۔ مجھے بے شمار رہائشی عمارتوں میں داخل ہوتے یا نکلتے ہوئے، روشنی کرنے یا بجھانے کے لیے کتنے بٹن دبانے پڑے ہیں، تا کہ میں لیبس ویگ (Labesweg) کی اپنی خواب گاہ میں داخل ہونے سے پہلے ویسی ہی روشنی کر سکوں جیسی کہ پہلے ہوتی ہے۔

مما کے ہاں ولادت گھر پر ہی ہوئی تھی۔جب درد زہ شروع ہوا اس وقت تک وہ دکان میں ہی تھی؛ ڈیڑھ پاؤنڈ والے نیلے تھیلوں میں چینی بھر رہی تھی۔اس کو اسپتال لے جانے کے لیے وقت نہیں تھا؛ سوا ایک عمر رسیدہ دائی کو، جس نے کچھ دن پہلے ہی اپنا کام چھوڑا تھا، قریبی سڑک 'ہرتا اسٹراسے' سے طلب کرنا پڑا تھا۔خواب گاہ میں پہنچ کر اس نے مجھے اور مما کو ایک دوسرے سے علاحدہ کیا تھا۔

بس پھر ہونا کیا تھا، میں نے دنیا میں پہلی بار جو روشنی دیکھی تھی وہ ساٹھ واٹ کے بلب سے نکلی تھی۔اس وجہ سے انجیل کے الفاظ "حکم ہوا کہ روشنی ہو، اور روشنی ہو گئی" اب بھی مجھے 'اوسرام' بلب کے لاجواب اشتہاری نعرے معلوم ہوتے ہیں۔ میری ولادت کے دوران سوائے شقاق الرحم (rupture of uterus) کے جو عام طور سے ہوتا ہے، سب کچھ ہمواری سے ہوا تھا۔ مجھے اپنے آپ کو الٹی پوزیشن سے آزاد کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی، جو حاملہ عورتوں کی، خود حمل کی، اور دائیوں کی پسندیدہ پوزیشن ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں مجھے اور کچھ بھی کہنا ہے: میں باطنی سماعت رکھنے والے ان نوزائیدہ بچوں میں سے تھا جن کی ذہنی نشوونما پیدائش کے وقت ہی ہو جاتی ہے، اس کے بعد، ایک مخصوص مقدار کی اطلاعات کی بھرائی باقی رہتی ہے۔جس لمحے میں پیدا ہوا تھا، میں

نے روشنی کے بلب تلے اپنے والدین کے منہ سے نکلنے والے پہلے الفاظ کو بڑے تنقیدی انداز میں لیا تھا۔ میرے کان بہت شدت سے چوکس تھے۔ یہ طے ہے کہ میرے کان چھوٹے تھے، پیچھے کی طرف مڑے ہوئے، چپکے ہوئے سے تھے، پھر بھی خوب صورت تھے، اس کے باوجود انھوں نے وہ الفاظ گرفت میں لے لیے تھے جو میرا پہلا تاثر تھا، اس لیے میں نے ان کی اہمیت کو گرہ میں باندھ کر رکھ لیا تھا۔ اور میرے کان میں جو کچھ داخل ہوا تھا، میرے چھوٹے سے دماغ نے اس کی قدر اندازی بھی کر لی تھی۔ جو کچھ میں نے سنا تھا، اس پر کافی غور کرنے کے بعد میں نے کچھ کرنے کا فیصلہ کیا تھا، کچھ اور کرنے کا نہیں۔

''لڑکا ہے—'' مسٹر ماتسیرات نے کہا تھا، جس کا خیال تھا کہ وہ ہی میرا باپ ہے۔ ''یہ بڑا ہو کر دُکان سنبھالے گا۔ بالآخر ہمیں پتا چل گیا کہ ہمارا اندازہ صحیح تھا'' مگر، مما کو دُکان کی نہیں، اپنے بیٹے کو لباس پہنانے کی فکر تھی ''ارے ہاں، میں جانتی تھی کہ بیٹا پیدا ہوگا، حالاں کہ ایک بار میں نے یہ بھی کہا تھا کہ بیٹی ہوگی۔''

اس طرح ابتدا ہی میں، مجھے نسوانی منطق سے واسطہ پڑا تھا۔ اس کے اگلے الفاظ تھے، ''جب ننھا آسکر تین برس کا ہوگا تو اس کو نقارے کا کھلونا ملے گا۔''

ان مادرانہ اور پدرانہ وعدوں کا اندازہ لگاتے اور ان کا تقابل کرتے ہوئے، میں ایک پتنگے کا مشاہدہ کر رہا تھا اور اسے سن رہا تھا جو کہیں سے اُڑ کر کمرے میں آگیا تھا۔ درمیانہ درجے کے پتنگے نے، جس کے بدن پر ہلکے ہلکے بال تھے، ساٹھ واٹ کے دو جلتے ہوئے بلبوں کے درمیان تیر کی طرح، بار بار اڑ کر آتا جاتا اور اپنے پھیلے ہوئے پَروں کے، تناسب سے کہیں زیادہ بڑا سایہ ڈالنا شروع کر دیا تھا، جس نے پورے کمرے کو اور اس کی ہر چیز کو اپنی حرکت سے مرتعش کر دیا تھا، مگر جس چیز نے مجھے متاثر کیا تھا، وہ روشنی اور سایے کے درمیان کا کھیل نہیں تھا، بلکہ مکالمے کی پیدا کردہ وہ آواز تھی جو پتنگے اور بلب کے درمیان جاری تھا؛ پتنگا اس طرح بک بک کرتا جارہا تھا گویا اسے اپنی دانش کا بوجھ ہلکا کرنے کی جلدی ہو، گویا روشنی کے اس منبعے سے بات کرنے کا اُسے پھر کبھی موقع نہیں ملنے والا؛ اس طرح، گویا یہ اس کا آخری اعتراف ہوا؛ اور گویا اس قسم کا اعلانِ برءت ہے جو روشنی کے

دونوں بلب عطا کر رہے ہوں، کہ اس کے بعد گناہ اور غلطی کرنے کا دوسرا موقع نہیں ملے گا۔

آج، آسکر، سادہ لفظوں میں بس اتنا کہنا چاہ رہا ہے: کہ وہ پتنگا بھی ایک اعلان کر رہا تھا۔ میں نے خرگوشوں، لومڑیوں اور چوہوں کو بھی اعلان کرتے سنا ہے۔مینڈک اپنی مسلسل اور قائم مزاج کوششوں سے نقارے کے ذریعے کسی طوفان کو بیدار کر سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہُد ہُد کیڑوں کو اپنی پناہ گاہوں سے نقارے کے ذریعے ہی باہر نکال سکتے ہیں۔ آدمی ٹین کے تسلوں، پیتل سے بنے برتنوں، کیتلیوں اور پتیلیوں کو نقارے کی طرح بجا سکتے ہیں۔ حملے کے لیے آگے بڑھتی ہوئی فوجیں نقاروں کے ذریعے توپوں کی گولہ باری کا اعلان کرتی ہیں۔ ہم نقارے کے ذریعے نئے کام کا اعلان کرتے ہیں، لوگوں، کیڑوں مکوڑوں اور جانوروں کو باہر نکالتے ہیں، مسلسل نقارے بجا بجا کر کچھ یاد دلاتے ہیں۔نقارے بجانے والوں میں سپاہی بھی ہوتے ہیں اور افسر بھی۔موسیقار بھی ہوتے ہیں جو ساز کے تاروں اور مضراب کے لیے سازینے ترتیب دیتے ہیں۔ میں نقارے پر خود آسکر کی کوششوں کا بیان کر سکتا ہوں؛ مگر، یہ سب کچھ اس کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے، جو ایک پتنگا میری پیدائش کے لمحے دیوانہ وار اعلان کرتا پھر رہا تھا، جس میں سوائے ساٹھ واٹ کے دو بجلی کے معمولی بلبوں کے کوئی اور ساز شامل نہیں تھا۔شاید، پس ماندہ ترین افریقا میں، بلکہ امریکا میں ایسے سیاہ فام آدمی آج بھی موجود ہیں جو تال کی اپنی خداداد نعمت کے باعث افریقا کو نہیں بھولے ہیں، افریقا کے پتنگوں کی ایسی نقل سازی میں کامیاب ہو سکتے ہیں، جو نقارے بازی میں ایسے جذباتی نظم وضبط کے حامل ہوتے ہیں، جو مشرقی یورپ کے پتنگوں کے مقابلے میں بڑے اور زیادہ خوب صورت ہوتے ہیں۔میں اپنے مشرقی یورپ کے معیار کے ذریعے ہی، اپنی پیدائش کی ساعت کے، درمیانہ درجے کے پاؤڈر میں سنے، پتنگے کی تعریف کر سکتا ہوں؛ اور وہ پتنگا آسکر کا استاد تھا۔

وہ ستمبر کے مہینے کے ابتدائی دن تھے۔آفتاب سنبل کے برج میں تھا۔اس رات، پھل بھیجنے والی لکڑی کی پیٹیوں اور فرنیچر کو ادھر اُدھر کرتا ہوا، گرمی کی آخری دنوں کا ایک طوفان آ رہا تھا۔سیارے عطارد نے مجھے سیماب صفت، 'یورانس' نے اختراع پسند، مشتری

نے آرام پسند، اور مریخ نے بلند حوصلہ انسان بنایا۔ بُرج میزان نے، چڑھتے ہوئے گھر میں بلند ہو کر، مجھے حساس بنایا اور مبالغہ آرائی کے حوالے کر دیا۔ Neptune دسویں گھر، زندگی کے درمیانہ گھر میں، داخل ہوا اور مجھے معجزوں پر یقین کا قائل اور حقیقت میں بنایا۔ وہ سیارہ زحل تھا جس نے تیسرے گھر میں مشتری کے مقابلے پر آ کر میری ابتدا پر شبہات پیدا کیے تھے، مگر وہ کون تھا جس نے پنکھے کو، کالج کے پرنسپل کی طرح گرجتے، موسم گرما کے آخری دنوں کے طوفانِ برق و باراں کے درمیان، کمرے میں بھیجا تھا اور اجازت دی تھی کہ مجھ میں نقارے سے محبت کا میلانِ طبع پیدا کرے، میری ماں نے مجھ سے جس کا وعدہ کیا تھا؟

بہ ظاہر روتے ہوئے اور گوشت رنگ شیر خوار کے بھیس میں، اس بچے، یعنی میں نے، اپنے باپ کے منصوبے کو رَد کرنے، مختصراً، ہر اس شے سے یکسر اجتناب کا فیصلہ کر لیا تھا جو کریانے کی اس دُکان سے متعلق تھا، مگر، جب میری تیسری سال گرہ کا وقت آیا تو میں نے اپنی ماں کے منصوبے پر ہمدردی سے غور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اپنے مستقبل کی بابت اس تمام قیاس آرائی سے قطعِ نظر، مجھے فوراً احساس ہو گیا تھا کہ مما اور وہ مسٹر ماتسیرات، میرے فیصلوں کا احترام کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، وہ مثبت ہوں یا منفی۔ تنِ تنہا، اور غلط فہمی کا شکار، بے چارہ آسکر بجلی کے بلب کے نیچے لیٹا ہوا تھا، اور سوچ رہا تھا کہ اس طرح کے حالات تو ساٹھ یا ستر برس تک چلتے رہیں گے، جب تک کہ کوئی اچانک ہونے والا شارٹ سرکٹ روشنیوں کے تمام ماخذات کو قطع نہیں کر دیتا ہے، اس کے سارے ولولے، اس کی زندگی سے پہلے ہی ختم نہیں ہو جاتے ہیں، جس کی ابتدا روشنی کے بلب کے نیچے ہوئی تھی۔ صرف ایک ہی امکان، یعنی ایک نقارہ، باقی رہ گیا تھا جو ماں کے بطن میں واپس چلے جانے کی میری شدید خواہش سے مزاحم تھا۔

اس کے علاوہ، ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ دائی میری ناف کاٹ چکی۔ گویا، اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا!

# تصویروں کا البم

میں محافظ ہوں ایک خزانے کا۔ تمام بڑے برسوں کا، جن میں صرف کیلنڈر کے دن شامل ہوتے ہیں، میں نے اس کا تحفظ کیا ہے، اس وقت بھی چھپایا ہے جب اس کو دیکھ نہیں سکتا تھا: باربرداری کی گاڑی میں سفر کرتے وقت میں اس کو سینے سے لگائے رکھتا تھا، اور جب میں سوتا تھا تو آسکر اپنے خزانے، یعنی تصویروں کے البم پر ہی سوتا تھا۔

میں اس خاندانی قبرستان کے بغیر کیا کروں گا، جو ہر شے کو کامل طور پر اتنا واضح اور اتنا صاف رکھتا ہے؟ اس میں ایک سو بیس صفحات ہیں۔ ہر صفحے پر، چار یا چھ یا کبھی صرف دو تصویریں احتیاط سے لگی ہوتی ہیں، کبھی اسی تناسب سے، کبھی اس سے کم، مگر ہمیشہ ایک ترتیب سے، جو زاویہ قائمہ کے تابع ہوتی ہے۔ اس کی جلد چمڑے کی ہے اور یہ جتنا پرانا ہوتا جاتا ہے اس کے چمڑے کی بو اتنی ہی زیادہ تیز ہوتی جاتی ہے۔ بسا اوقات میرا البم ہوا اور موسم کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی تصویریں آزاد ہوتی ہیں اور اس طرح بے قابو ہو جاتی ہیں کہ ان کو کھینچ کر ان کی جگہ پر واپس لگانا پڑتا ہے۔

ایسا بھلا کون سا ناول ہوگا — یا دنیا میں کون سی ایسی شے ہوگی، جس کے اندر تصویروں کے ایک البم جیسا رزمیہ پوشیدہ ہوتا ہے؟ کاش جنت کا ہمارا باپ، کبھی نہ تھکنے والا شوقین، جو ہر اتوار اوپر سے ہماری تصویریں کھینچتا ہے، بدقسمتی سے ایسے زاویے سے کھینچتا ہے جو مکروہ طریقے سے ہمیں مختصر کر دیتا ہے: اور وہ ہماری تصویروں کو اپنے البم میں چپکا لیتا ہے، خواہ

وہ اچھی طرح بنائی گئی ہوں یا نہیں، اور بہت احتیاط سے ہمیں ہمارا البم دکھاتا رہتا ہے: کاش وہ کافی عرصے کے لیے مجھے اپنے پسندیدہ گھر سے دور رکھے اور آسکر کو خطرناک اور پُر پیچ شوق سے باز رکھے؛ اس لیے کہ میں تصویر سے اصل کی طرف جانے کا بہت خواہش مند ہوں۔

اس بارے میں اس وقت صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے۔ تو کیا اب ہم البم دیکھنا شروع کریں؟ ان تصویروں میں ہر قسم کی وردیاں ہیں، انداز ہیں اور طرح طرح کی بالوں کی تراش خراش ہے۔ مما موٹی ہوتی جا رہی ہے، اور جان ڈھیلا ڈھالا، ان میں سے کچھ کو تو میں جانتا بھی نہیں، مگر میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ میں حیران ہوں کہ یہ تصویریں کھینچی ہیں کہ فن تنزلی طرف جا رہا ہے۔ جی ہاں، 1900ء کی فنی تصویر بتدریج ہمارے وقت کی افادیت پسند تصویر میں ختم ہوتی جاتی ہے۔ ذرا میرے نانا کوواچکی کی اس یادگار پر، اور میرے دوست کلیپ کے پاسپورٹ کی تصویر پر بھی نظر کریں۔ آپ کو ان تصویروں کو صرف کنارے سے پکڑنا چاہیے، میرے نانا کی تصویر سیپیا، ہلکے بھورے سے رنگ کی چمک دار، پاسپورٹ کی تصویر ہے، جو ربڑ اسٹامپ کے نشان کو ترس رہی ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ہمارے فنِ عکس بندی میں کتنی ترقی ہوئی ہے۔ اور اس تمام ساز و سامان کو دیکھیں جو فنِ عکس بندی کی ضرورت ہوتا ہے۔ دراصل کلیپ کے بجائے، خود مجھے اپنے وجود کی خرابیاں تلاش کرنی چاہییں، اس لیے کہ میں البم کا مالک ہوں اور مجھے کچھ معیار برقرار رکھنے چاہییں تھے۔ اگر کوئی جہنم ہمارے انتظار میں ہے، تو میں جانتا ہوں کہ اس میں کون کون سی شیطان صفت اذیتیں موجود ہوں گی: برہنہ روح کو ایک کمرے میں بند کر دیا جائے گا اور سامنے ایک فریم میں دن بھر کی کارگزاری کی تصویریں لگی ہوں گی، جو یہ کہتی سنائی دیں گی: چلو، گداز کی ابتدا کرو: او! فوری پاسپورٹ کی تصویروں کے آدمی؛ او! فلیش بلب کی چمک میں نظر آنے والے آدمی؛ او! پیسا کے مینار کج کے سامنے تن کر ایستادہ آدمی؛ او! تصویروں کے آدمی، اگر پاسپورٹ کے قابل ہونا ہے تو اپنے داہنے کان کو واضح کرنا ہوگا؛ اور اب گداز کے ساتھ چلے جاؤ۔

ہو سکتا ہے کہ یہ جہنم قابلِ برداشت ہو، اس لیے کہ خراب ترین تصویریں لی نہیں جاتیں، صرف ان کے خواب ہی دیکھے جاتے ہیں، اور اگر لی جاتی ہیں تو دھلوائی نہیں جاتیں۔

کلِپ اور میں نے یہ تصویریں اپنے ابتدائی دنوں میں بھی لی ہیں اور 'جولیئر اشتراسے' میں دھلوائی بھی ہیں، جب ہم اکٹھے ہو کر اسپاگیٹی کھاتے اور دوست بناتے تھے۔ ان دنوں میں نے سفر کے بہت سارے منصوبے بھی بنائے تھے۔ اور میں اتنا افسردہ تھا کہ میں نے سفر کرنے کا فیصلہ کیا، اور اس کے لیے، پاسپورٹ کی درخواست بھی دے دی تھی، مگر چوں کہ میرے پاس ضروری سرمایہ نہیں تھا کہ میں اس سفر میں روم، نیپلز، یا کم از کم پیرس ہی کو شامل کر لیتا۔ میں خوش تھا کہ میرے پاس نقدی کی کمی تھی، اس لیے کہ اداسی کے عالم میں سفر کرنا کتنی مصیبت کا باعث ہوتا، مگر چوں کہ ہمارے پاس فلم دیکھنے بھر کی نقدی تھی، ان دنوں کلِپ اور میں تھیٹروں میں دکھائی جانے والی فلمیں دیکھنے جاتے تھے جہاں، کلِپ کے مزاج کے مطابق، وحشی ویسٹرن فلمیں دکھائی جاتی تھیں، اور میری اپنی ضرورت کے مطابق وہ فلمیں بھی ہوتی تھیں جن میں ماریا شیل آنسو بہانے والی نرس ہوتی تھی اور سرجن کے طور پر بورشے ہوتا تھا جو مشکل آپریشن کے بعد کھلی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر بیتھوون کے نغمے بجاتا تھا اور بڑی ذمے داری کا مظاہرہ کرتا تھا۔ ہم بہت غیر مطمئن ہوتے تھے کہ اس کا مظاہرہ دو گھنٹے تک ہی کیوں چلتا تھا۔ اس لیے، ہم کچھ پروگراموں کو دوبارہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ شو کے ختم ہوتے ہی، ہم دوسرے شو کے ٹکٹ خریدنے کے لیے بےقرار رہتے تھے۔ مگر تھیٹر کے ہال سے نکلنے کے بعد جب ہم ٹکٹ خریدنے والوں کی لمبی لمبی قطار دیکھتے تو ہمارے دل ڈوب جاتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ ٹکٹ بیچنے والے سے دوسرا مجادلہ کرنا ہوتا تھا، بلکہ ہمیں قطار میں لگے لوگوں کی توہین آمیز نظروں کا مقابلہ بھی کرنا ہوتا تھا اور اجنبی لوگ قطار بڑھتی دیکھ کر ہمیں شرمندہ کر دیتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ تقریباً ہر شو کے خاتمے کے بعد ہم ایک فوٹو اسٹوڈیو جاتے، جو گراف ایڈولف پلاٹز سے زیادہ دور نہیں تھا، یہاں ہم پاسپورٹ کے لیے تصویریں بنواتے تھے۔ اس اسٹوڈیو میں ہم خاصے معروف تھے، اور مسکراہٹ سے ہمارا استقبال ہوتا تھا؛ پھر بھی ہم خریدنے والے گاہک تھے، اس لیے ہم سے شائستگی کا سلوک کیا جاتا تھا۔ جوں ہی کوئی فوٹو بوتھ خالی ہوتا تو ایک نو جوان لڑکی فوراً ہمیں بوتھ میں پہنچا دیتی

تھی، جس کے بارے میں بس ہم اتنا جانتے ہیں کہ وہ بہت اچھی لڑکی تھی۔ وہ مہارت سے ہمارے سروں کے زاویے درست کرتی، پہلے میرا اور پھر کلپ کا، اور ہم سے ایک نقطے پر اپنی آنکھیں جمانے کو کہتی، اور ایک لمحے کے بعد روشنی کا ایک جھماکا ہوتا، اور اس سے مسلسل ایک اعلان ہو جاتا کہ چھ عدد نقوش تصویر کی پلیٹ پر منتقل کر دیے گئے ہیں۔

اپنے ہونٹوں کے اکڑے کونوں سمیت، شائستگی سے، مگر، زیادہ شائستگی سے نہیں، شائستہ لباس میں ملبوس، اس نوجوان لڑکی نے ہمیں بید سے بنی آرام دہ کرسیاں فراہم کیں اور ہم سے پانچ منٹ توقف کی درخواست کی۔ ہم نے خوشی خوشی انتظار کیا، اس لیے کہ اب ہمیں انتظار کا جواز مل گیا تھا—پاسپورٹ کی تصویریں— اور ہمیں یہ تجسس تھا کہ تصویریں کیسی نکلتی ہیں۔ سات منٹ کے اندر اس شائستہ مگر غیر معروف لڑکی نے ہمیں چھوٹے چھوٹے دو لفافے تھما دیے اور ہم نے قیمت ادا کر دی۔

کلپ کی تھوڑی سے ابھری ہوئی آنکھوں کی فاتحانہ چمک دیکھنے کے قابل تھی۔ جوں ہی ہمیں لفافے ملے، ہمیں قریب ترین بیئر خانے میں فوراً ہی دوبارہ مل بیٹھنے کا بہانہ مل گیا، اس لیے کہ کوئی بھی پاسپورٹ کی تصویروں کو کھلے عام، خاک آلودہ گلیوں میں، شوروغوغا میں اور ٹریفک، روک کر دیکھنے نہیں لگتا۔ جس طرح ہم اس فوٹو اسٹوڈیو کے وفادار تھے، اسی طرح ہم ہمیشہ 'فرائیڈ رخ اشتراسے' کے ایک ہی بیئر خانے میں جاتے تھے۔ ہم نے داخل ہوتے ہی بیئر، خون سے بنی ساسیج، پیاز اور رائی کی ڈبل روٹی کا آرڈر دیا، اور اس کا انتظار کیے بغیر ہی ذرا ذرا نم تصویروں کو میز پر پھیلا دیا، اور بیئر اور خون کی ساسیج میں شرکت کرتے ہوئے، جو اس دوران آ گئی تھی، ہم اپنے تناؤ زدہ خدوخال دیکھنے میں مصروف ہو گئے۔

ہم ہمیشہ پچھلے فلم شو کے بعد کی لی گئی تصویریں اپنے ساتھ لاتے تھے۔ یہ ہمیں تصویروں میں مقابلے کی بنیاد فراہم کرتی تھیں، اور جہاں مقابلے کی بنیاد ہوتی، وہیں دوسری، تیسری، اور چوتھی بیئر آرڈر کرنے، اور مزید تفریح کی، یا جیسا کہ دریائے رحائین کی وادی میں کہتے ہیں، ماحولی مزاج کا جواز مل جاتا تھا۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ پاسپورٹ کی تصویر کسی افسردہ آدمی کو افسردگی سے

نجات دلاتی ہے، جس کا کوئی جواز نہیں؛ اس لیے کہ بچی افسردگی اپنی فطرت میں بے بنیاد ہوا کرتی ہے؛ اور ایسی افسردگی کم از کم ہماری افسردگی، کی کوئی قابلِ شناخت وجہ نہیں تھی، اور اپنی تقریباً فساد انگیز نا جوازیت کے ساتھ، ہماری یہ افسردگی اس درجے تک پہنچ گئی تھی جس کا کوئی حامل نہیں تھا۔ اگر افسردگی سے دوستی کرنے کا کوئی طریقہ تھا تو وہ تصویروں کے ذریعے ہی تھا، اس لیے کہ ان فوری لی جانے تصویروں میں ہمیں اپنے وجود کا ایک نقش مل گیا تھا، جو اگرچہ بالکل صاف نہیں تھا، مگر تھا، اور وہ ضروری بھی تھا— غیر متحرک اور غیر جانب دار۔ انھوں نے اپنے آپ سے معاملہ کرنے میں ہمیں ایک قسم کی آزادی فراہم کی ہے؛ ہم بیئر پی سکتے ہیں، خون کی سانچ پر تشدد کر سکتے ہیں، خوش رہ سکتے ہیں اور کھیل کود سکتے ہیں۔ ہم تصویروں کو موڑتے ہیں، تہہ کرتے ہیں، انھیں چھوٹی سی قینچی سے کاٹ سکتے ہیں، جسے ہم اسی کام کے لیے ہمیشہ ساتھ رکھتے ہیں۔ ہم نے پرانی اور نئی تصویروں کو برابر برابر رکھا، اپنے آپ کو یک چشمی یا سہ چشمی بنایا، اپنی ناکوں کو اپنے کانوں کے اوپر رکھا، اپنے نظر آنے والے داہنے کانوں کو بولنے یا خاموشی کے عضویات بنایا، پیشانیوں اور ٹھوڑیوں کو ملایا۔ اور اس میں صرف ہماری شباہتیں ہی نہیں تھیں جن سے یہ مونتاج بنے تھے۔ کلیپ نے مجھ سے خدوخال لیے، اور میں نے اس سے: اس طرح ہم، امید ہے کہ ایک نئی اور زیادہ خوش حال مخلوق بنانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ہم اکثر تصویریں دیتے بھی تھے۔

ہمیں— میں تمام تصویری شخصیتوں کو الگ رکھ کر، صرف کلیپ اور اپنی جانب سے بول رہا ہوں— ویٹر کو تصویریں دینے کی عادت سی پڑ گئی ہے، جس کو ہم، جب بھی دیکھتے ہیں، روڈی کے نام سے پکارتے ہیں، اور یہ ہفتے میں ایک بار ضرور ہوتا ہے۔ روڈی اس قسم کا آدمی ہے جس کے بارہ بچے اور کم از کم آٹھ لے پالک ہونے چاہییں، اور وہ ہماری مشکل کو سمجھتا ہے؛ اس کے پاس ہمارے درجنوں خاکے ہیں، اور اس بھی زیادہ سامنے سے پورے چہرے کی تصویریں بھی ہیں۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں ہمارے لیے ہمدردی جھلک رہی تھی، جب طویل غور و خوض کے بعد ہم نے اس کو ایک تصویر دی تو اس نے کہا تھا، ''آپ کا شکریہ۔''

آسکر نے کبھی کاؤنٹر پر بیٹھنے والے خاتون ویٹر کو، یا سُرخ بالوں والی جوان عورت کو تصویر نہیں دی ہے جس کے پاس ایش ٹرے ہوتی ہے۔ عورتوں کو تصویریں دینا اچھی بات نہیں ہوا کرتی، اس لیے کہ آپ کو کیا معلوم کہ وہ اس کا کیا استعمال کریں گی، مگر کلپ، جو اپنی لاپروافربہی کے باوجود بھی صنفِ نازک کے لیے جاذبیت رکھتا ہے، اور جو حماقت کی حد تک باتیں کرتا ہے، کہ اسے اپنا سب کچھ اگل دینے کے لیے ایک عورت چاہیے، اور اس نے مجھے بتائے بغیر سگریٹ والی لڑکی کو تصویر ضرور دی ہوگی، اس لیے کہ اس نے اس لڑکی سے منگنی کرلی تھی اور ایک دن اس سے شادی بھی کر ڈالی اس لیے کہ اسے اپنی تصویر واپس چاہیے تھی۔

میں نے البم کے آخری صفحات کے لیے نہ جانے کتنے الفاظ کہہ ڈالے ہیں۔ وہ احمقانہ تصویریں اس قابل نہیں؛ پھر بھی، اگر ان کو تقابل کی نظر سے دیکھا جائے تو آپ کو پتا چلے گا کہ وہ کتنی ارفع اور پُرشکوہ، اور کتنی فن کارانہ ہیں، بالخصوص میرے نانا کوواچکی کی پہلی صفحے کی تصویر۔

وہ بھرے بھرے جسم والا، نفیس کندہ کاری سے مزیّن ایک کافی کی میز کے پیچھے کھڑا ہے۔ بدقسمتی سے اُس نے اس تصویر میں خود کو آتش زن کی حیثیت میں نہیں، آگ بجھانے والے رضاکا کی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ مگر آگ بجھانے والے کی چُست وردی، اور اس پر بجے، لوگوں کو بچانے والے تمغے اور آگ بجھانے والوں کی ٹوپی، اس میز کو کسی گرجا گھر کے شہ نشین کا رُتبہ دے رہے ہیں، اور یہ سب مل کر آگ لگانے والے کی مونچھوں جیسی بن گئی ہے۔ کس قدر رنجیدہ ہے اس کی نظر، تمام آزردہ دنوں کی آزردگی کو اپنے اندر سموئے ہوئے۔ جرمن سلطنت کے زمانے میں اس قسم کی فاخرانہ نظریں پسندیدہ ہوتی تھیں اور بہت عام تھیں؛ یہ ہمیں گریگر کوواچکی، بلانوش بارود ساز میں بھی ملتی ہیں جو ان تصویروں میں قدرے سنجیدہ دکھائی دیتا ہے۔ 'چیستوکوا' میں کھینچی گئی وینسنٹ برانسکی کی یہ تصویر جس میں وہ ایک نذر کی گئی شمع لیے ہوئے ہے، اور کچھ عارفانہ رنگ پیش کرتی ہے۔ سدا کے روگی جان برانسکی کی نوجوانی سے بھرپور یہ تصویر ایک دستاویز ہے، خود آگاہ اداسی کی جو پہلے زمانے کی تصویر کشی کی کے طریقوں کے ذریعے حاصل کی جاتی تھی۔

اس زمانے کی عورتیں اپنی شخصیت کی مناسبت کے تأثرات دینے میں زیادہ ماہر نہیں ہوتی تھیں۔عالمی جنگ سے کچھ عرصہ پہلے لی گئی تصویروں میں میری نانی اما بھی، جو یقین کیجیے کہ بہت کچھ تھی، اپنے چہرے پر سجائے تبسم کے پیچھے خود کو چھپانے کی کوشش کرتی نظر آتی ہے، جس سے اس کے چار عظیم پناہ گاہ جیسے لہنگوں کا شائبہ بھی نہیں ملتا۔خواتین، اس زمانے میں تصویر کھینچنے والے کی اپنے کالے رنگ کے کپڑے کے اطراف کو دوپھاند پر مسکرایا کرتی تھیں۔

میرے پاس اس زمانے کی ایک تصویر ہے جو دفتی سے بنے دُگنے سائز کے پوسٹ کارڈ پر بنائی گئی تھی، جس میں تیس نرسیں، جن میں میری ماں بھی شامل ہے، ایک فوجی ڈاکٹر کے اطراف اعتماد افزا مگر بزدلانہ انداز میں جمع ہیں۔ایک اور تصویر میں نرسیں ایک 'کاسٹیوم بال' میں خاصی پُرسکون دکھائی دے رہی ہیں، جس میں شفا پانے والے جنگجو مریض بھی شامل ہیں۔مما، فرشتوں جیسے پروں اور بالوں میں افشاں جیسے چمکتے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں کے باوجود، گلاب کی کلی جیسے ہونٹ بنائے ہوئے آنکھ مارتی دکھائی دے رہی ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے فرشتے بھی جنسی عمل کرتے ہیں۔ماتسیرات ایسے لباس میں اس کے قدموں میں جھکا نظر آرہا ہے، جسے وہ ہر روز پہنتے ہوئے بہت خوش ہوگا: اس کے سر پر کلف لگی باورچیوں جیسی ہیٹ ہے، حتیٰ کے ہاتھ میں ایک بڑی سی ڈوئی بھی ہے، مگر اپنی وردی پہنے، جس پر لوہے کے دوسرے درجے کی صلیب ہے، وہ بھی، کوواچکی اور برانسکی کی طرح، المناک مزاحیہ انداز میں خلا میں گھورتا دکھائی دے رہا ہے، اور ان تمام تصویروں میں وہ خواتین سے بدتر نظر آرہا ہے۔

جنگ کے بعد کی تصویروں میں چہرے تبدیل ہوگئے۔مرد فوجی خدمات سے آزاد ہیں: اب خواتین کے لیے آگے بڑھنے کا موقع ہے، جنھیں سنجیدہ نظر آنے کا جواز فراہم ہوگیا ہے، جو، مسکراتے ہوئے بھی، اپنی اندرونی افسردگی نہیں چھپاتیں۔صدی کے تیسرے عشرے کی غمناک عورت بن رہی تھی۔ان کے چہرے پر بکھری گھونگھریالی لٹیں، اٹھتے بیٹھتے اور نیم استراحت کی کیفیت میں، ان کو تقدس اور فحاشی کے ایک ہم آہنگ انداز میں پیش کرتی ہیں۔

مما کی تیئس برس کی عمر کی تصویر، جو حمل کی ابتدا کے فوراً بعد لی گئی ہوگی، خاصی موٹی گردن پر گول پُرسکون اور کچھ کج انداز کا چہرہ پیش کرتی ہے، مگر انداز کج ہو یا نہیں، وہ ہمیشہ آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دکھائی دیتی ہے۔ اچھا خاصا چھریرا بدن، مگر اس زمانے کی افسردگی سے مملو مسکراہٹ، چھریرے پن پر ایک سوالیہ نشان ہے، اور وہ آنکھیں جو نیلے پن سے زیادہ بھوری ہیں، اپنے ساتھی مُردوں کی روحوں کو — اور اپنی روح کو بھی — جامد شے دیکھتی ہیں، جیسے چائے کا پیالہ یا سگریٹ کی ہولڈر۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ میری مما کی نظریں کچھ زیادہ روحانی شے ہیں۔

اس زمانے کی تصویریں زیادہ دل چسپ تو نہیں، مگر آسانی سے جائزے کے قابل ہیں، اس لیے زیادہ انکشاف کرنے والی ہیں۔ میثاقِ ریپالو کے دور کے شادی کے لباس کتنے خوب صورت اور کتنے ازدواجی ہوا کرتے تھے۔ اپنے ازدواجی لباس میں بھی، ماتسیرات نے کلف زدہ سخت کالر پہن رکھا ہے۔ نفیس مردانہ خد و خال میں، وہ شائستہ دکھائی دے رہا ہے، کسی دانش ور جیسا۔ اس کا دایاں پیر آگے کو بڑھا ہوا ہے، اس طرح کہ وہ اس زمانے کے فلمی اداکار، شاید ہیری لائیڈ کے جیسا لگتا ہے۔ اس زمانے میں لباس چھوٹے ہوا کرتے تھے۔ میری مما کی شادی کا لباس، سفید رنگ کا، اکارڈین جیسی تہوں والا، مشکل سے اس کے گھٹنے تک ہے، اس کی سڈول ٹانگیں، اور تیز رفتار پیروں میں بکل لگے سفید رنگ کے جوتے ہیں۔ دوسری اور تصویریں پورے ازدواجی اجتماع کو پیش کرتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے نرغے میں، جو شہری باسی معلوم ہوتے ہیں، میری نانی انا، اور اس کا دل آویز و مقبول بھائی ونسنٹ ہمیشہ اپنی صوبائی حیثیت اور اعتماد بڑھانے والی فضا پیش کرتا نظر آتا ہے۔ جان برانسکی، جو مما اور اپنے باپ اور اپنی پھوپھی انا کی طرح اسی آلو کے کھیت سے نکلا ہے، اپنے کشوبیائی نسب کو پولینڈ کے ڈاک خانے کے پُرمسرت جشن کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ تصویروں میں جگہ گھیرنے والے تندرست افراد میں وہ پستہ قد ہے، کم زور ہے، پھر بھی اس کی غیر معمولی نظریں، تقریباً نسوانی خد وخال، اس کو ہر تصویر کا مرکز بنادیتے ہیں، خواہ وہ کنارے پر ہی کیوں نہ ہو۔

کچھ دیر سے میں ایک گروہی تصویر کو دیکھ رہا ہوں جو شادی کے کچھ دیر بعد لی گئی تھی۔ مجھے اپنے نقارے کو اور چوب نقارہ کو، اُٹھانے پر مجبور کر دیا گیا ہے اور میں اس بدرنگ بھورے چوکور پر نظریں گاڑے، منہدم نظر آنے والا، تصویروں کا ایک تکونا جھرمٹ تیار کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

یہ تصویر 'ماگدے بدگر اشتراسے' پر واقع برانسکی کے فلیٹ سے لی گئی ہوگی، جو پولش طلبہ کے گھر سے زیادہ دور نہیں، اس لیے کہ پس منظر میں ہمیں سورج کی کرنوں سے روشن ایک بالکنی نظر آ رہی ہے، ایسی جو پولش علاقوں میں ہوا کرتی ہے، انگور کی بیلوں جیسے پتے والی بیل سے نصف مخفی ہے۔ مما بیٹھی ہوئی ہے، ماتسیرات اور جان برانسکی کھڑے ہیں، مگر یہ دیکھنا ہے کہ وہ کس طرح بیٹھی ہے، اور دونوں کھڑے کس طرح ہیں۔ تھوڑی دیر تو میں نے احمقانہ انداز میں اس اتحادِ ثلاثہ کا ایک رولر، ایک مثلث اور اسکول کے پرکار کی مدد سے جھرمٹ تیار کرنے کی کوشش کی، جو برونو کو مہیا کرنے پڑے تھے۔

گردن اور کاندھے کے درمیانی زاویے سے ابتدا کرتے ہوئے، میں نے ایک مثلث بنایا؛ میں نے کونوں کو موڑا، اس میں سے یکسانیت کو نکالا، اور ان قوسوں پر نشان لگائے جو ایک مثلث سے، یعنی پتوں سے باہر تھے، اس لیے کہ مجھے ایک نکتہ چاہیے تھا، برتری کا نکتہ، انحراف کا نکتہ، رُتبے کا نکتہ، نظارے کا نکتہ۔ جو کچھ بھی میں نے اپنی مابعدالطبیعیاتی جغرافیہ سے حاصل کیا تھا وہ بیش قیمت تصویریں میں پرکار کی سوئی سے بننے والے سوراخ تھے۔ میں سوچتا رہتا ہوں کہ ان تصویروں میں ایسی کون سی خاص بات ہے؟

وہ بات کیا تھی جس نے مجھے ان میں تصویروں میں ریاضیاتی، اور بے سروپا طریقے سے، کائناتی حوالے تلاش کرنے پر اکسایا تھا؟ تین افراد: ایک عورت بیٹھی ہوئی، دو مرد کھڑے ہوئے۔ عورت سیاہ بال کی گھونگریالی لٹوں والی: مرد، ماتسیرات گھونگریالے سنہرے بالوں والا، جان، گہرے بھورے بالوں والا اور بال ماتھے سے پیچھے کی طرف کنگھی کیے ہوئے۔ تینوں مسکرا رہے ہیں، ماتسیرات جان سے بڑھ کر؛ اور دونوں مرد مما سے زیادہ تبسم خیز ہیں، اس لیے کہ دونوں کے تبسم ان کے اوپری دانت واضح کر رہے ہیں، مما کا

تبسم اس کی جاف کے کونوں تک ایک مبہم سی لکیر ہے، جس کا اس کی آنکھوں میں کوئی شائبہ نہیں۔ ماتسیرات کا ہاتھ مما کے دائیں کاندھے پر ٹکا ہوا ہے؛ جان نے کرسی کی پشت پر اپنا دایاں ہاتھ رکھ لینے پر اکتفا کی ہے۔ مما کے گھٹنے ایک طرف کو مڑے ہوئے ہیں، مگر اس کا چہرہ کیمرے کی طرف ہے، اور اس کی گود میں ایک بستہ ہے جسے میں نے کئی برس ہوئے جان کے ڈاک کے ٹکٹوں کے لیے لے لیا تھا، جو بعد میں ایک فیشن رسالے کے طور پر، اور حالیہ دنوں میں فلمی ستاروں اور سگریٹ کے پیکٹوں کے حوالے سے جانا گیا ہے۔ اس کے ہاتھ اس انداز میں نظر آتے ہیں جیسے، اس وقت جب یہ تصویر لی گئی تھی، ہاتھ البم کا ورق الٹنے ہی والے تھے۔ تینوں خوش لگتے ہیں، گویا ایک دوسرے کو اس کی تعجب انگیزی سے مامونیت پر مبارک باد دے رہے ہیں، جیسے ان تینوں میں سے کوئی بھی خفیہ زندگی اختیار کرنے والا ہو، اگر ابھی تک کر نہ لی ہو۔ اس تکونے اتحاد میں، چوتھے کی شمولیت کی ضرورت نہیں، کہ جان کی بیوی ہیڈوگ برانسکی (ماضی کی لیمکے – Lemke) مستقبل کے اشٹیفن کی ماں بننے والی تھی؛ ان لوگوں کو اس کی صرف اس لیے ضرورت تھی کہ وہ ان سب کو کیمرے کا نشانہ بنائے، اور تا کہ اس تکون کو، کم ازکم، تصویری مسرت نصیب ہو جائے۔

میں نے تمام مستطیل تصویروں کو البم سے نکال کر اس تصویر کے برابر لگا دیا ہے جن میں یا تو مما ماتسیرات کے ساتھ ہے یا جان برانسکی کے ساتھ۔ ان میں سے کوئی تصویر نا قابلِ تغیر نہیں، وہ آخری حل جو بالکنی کی تصویر میں اس قدر نمایاں ہے۔ جان اور مما اکیلے اکیلے؛ یہ تصویر المیہ ہے، دولت ہتھیانے کا، بلندی کا بسیار نوشی میں بدل جانے کا۔ ماتسیرات اور مما: اس میں ہمیں گھر پر ازدواجی تعطل کا سا ماحول نظر آتا ہے، چھن چھن پکتے گوشت کے ٹکڑے، رات کے کھانے سے پہلے تھوڑا سا گلہ شکوہ، اور ڈنر کے بعد کی تھوڑی سی جماہیاں؛ بستر میں جانے سے پہلے کے لطیفے، اور محصول کے گوشواروں پر اظہارِ خیال: یہاں ہمیں سارا ازدواجی پس منظر دکھائی دیتا ہے۔ اس کے باوجود میں اس تصویری بیزاری کو بعد کی اس ناگوار فوری تصاویر پر فوقیت دیتا ہوں جن میں فرائنڈینتھال کے قریب کے اولیوا کے جنگل میں مما جان برانسکی کی گود میں بیٹھی ہے؛ اس لیے کہ یہ آخری تصویر اپنی

شہوت پرستی کے ساتھ — جان کا ہاتھ مما کے لہنگے کے نیچے غائب ہے — اور کسی قسم کی ترسیل نہیں کرتی سوائے ان ناشاد حیوانی جذبات کے جو مما کی شادی کے اول دن سے زناکاری میں نم رہے ہیں؛ میرے خیال میں ماتسیرات ہی اس تصویر کا بیوقوف بنایا ہوا فوٹوگرافر تھا۔ اس میں آپ کو بالکونی کی طمانیتوں میں سے ایک بھی طمانیت نظر نہیں آتی، اور نہ وہ معنی خیز اور ہوشیار حرکتیں ہیں جو اسی وقت ممکن ہوئی تھیں جب دونوں مَرد ایک ساتھ تھے، مما کے ساتھ یا اس کے پیچھے، یا Heubude کے ساحل پر اس کے قدموں پر لیٹے ہوئے : ذرا اس تصویر پر نظر کیجیے۔ اس میں ایک اور بھی تصویر ہے جس میں میرے ابتدائی برسوں کے یہ کردار ایک تکون بناتے دکھائی دے رہے ہیں۔ اگرچہ اس میں بالکونی کے منظر کے ارتکاز کی کمی ہے، یہ ویسا ہی جذباتی تناؤ والا سکون خارج کرتی ہے، جو شاید ایسے ہی تین افراد کے درمیان ہو سکتا ہے۔ ہم کھیلوں میں تکونی کیفیات سے بہت جلد اُکتا جاتے ہیں؛ مگر ذرا سوچیے، کہ اگر صرف دو افراد کو اسٹیج پر چھوڑ دیا جائے تو وہ سوائے تادمِ مرگ ڈائیلاگ بولتے رہنے کے، یا کوئی خفیہ سلسلہ رکھنے کے، کر بھی کیا سکتے ہیں۔ وہ تاش کا کھیل skat کھیل رہے ہیں، یعنی وہ اپنے پتوں کو، ٹرمپ کارڈ کی طرف دیکھنے اور کھیل کی حکمتِ عملی بنانے کے بجائے قرینے سے بنائے ہوئے پنکھے کی طرح پکڑے ہوئے، اور کیمرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ جان کا ہاتھ کھلا ہوا ہے سوائے اُٹھی ہوئی پہلی انگلی کے؛ قریب میں سکّوں کا انبار ہے؛ ماتسیرات ناخنوں سے میز کے کپڑے کو کھرچ رہا ہے، مما مذاق کر رہی ہے جو مجھے اچھا لگ رہا ہے: اس نے ایک کارڈ نکال لیا ہے اور کیمرے کے عدسے کو دکھا رہی ہے مگر اپنے ساتھی کھیلنے والوں کو نہیں۔ کتنا آسان ہے یہ سب کچھ، جب ایک واحد اشارے سے، پان (hearts) کی ملکہ کو دکھا کر ایک نہایت واضح اشارہ کیا جا رہا ہے: اس لیے کہ کون ہے جو پان کی ملکہ کی قسم نہیں کھائے گا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں skat کھیلنے کے لیے تین افراد کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ کھیل مما اور دو مَردوں کے لیے آسان نہیں تھا: یہ تو بس بہانہ تھا وقت گزاری کا، یہ ان کی پناہ گاہ تھا، جس میں وہ ہمیشہ چلے جایا کرتے تھے جب بھی ان کی جان کو خطرہ ہوتا تھا،

دھوکا دینے کے لیے وہ کھیل کھیل رہے ہیں، ایک طریقے سے یا دوسرے طریقے سے؛ ایسے احمقانہ کھیل جیسے backgammon یا sixty-six ۔

ان تین کے لیے اس وقت یہ کافی تھا، جو مجھے اس دنیا میں لے آئے تھے حالاں کہ وہ اس کام کے عوض کچھ نہیں چاہتے تھے۔ قبل اس کے میں اپنے بارے میں کچھ کہوں، چند الفاظ گریچن شیفلر کے بارے میں، میری ماما کی دوست، اور اس کے روٹی بنانے والے ہم نوا الیکزانڈر شیفلر کے بارے میں بھی ہو جائیں۔ وہ گنجے سر والا الیکزانڈر، اپنے گھوڑے جیسے دانتوں سے ہنستا تھا، جن کا نصف سونے سے بنا تھا۔ اس کے پاؤں اتنے چھوٹے تھے کہ جب وہ کرسی پر بیٹھا ہوتا تو فرش پر بچھے قالین سے چند انچ اوپر لٹکے رہتے، جب کہ اس کی خاتون دوست گریچن شیفلر ہمیشہ اپنے ہاتھوں بُنے ہوئے لباس ہی پہنتی تھی، ایسے نقش والے جو زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے تھے۔ بعد کے برسوں کی تصویروں میں دونوں شیفلر ڈیک کی کرسیوں پر بیٹھے ہوتے یا لائف بوٹ کے پہلو میں کھڑے نظر آتے ہیں جو "طاقت بذریعہ مسرت" نامی ادارے کی ملکیت ولہم گسٹلاف جہاز کی تھیں، یا پھر وہ مشرقی پروشیائی جہاز راں کمپنی کے جہاز "تانین برگ" کی سیر گاہ پر ہوتے تھے۔ سال بہ سال، وہ پھیرے لگاتے تھے اور پلاؤ (Pillau)، نا روے ایزورس کے یادگار تحائف بہ حفاظت 'کلائن ہیمر ویگ' پر واقع گھر میں لاتے تھے، جہاں الیکزانڈر ڈبل روٹیاں بناتا اور گریچن تکیوں کے غلاف بُنتی تھی۔ جب الیکزانڈر بات نہیں کر رہا ہوتا تھا تو وہ زبان کی نوک سے اپنا اوپری ہونٹ تر کرتا رہتا تھا، ایک عادت جسے ماتسیرات کا سبزی فروش دوست گریف، جو سڑک کے اس پار رہتا تھا، فحش اور نفرت انگیز سمجھتا تھا۔

اگر چہ گریف شادی شدہ تھا، وہ شوہر کم اور اسکاؤٹ لیڈر زیادہ ہوتا تھا۔ ایک تصویر میں وہ چوڑا، صحت مند، مگر مسکراہٹ سے ماوراء، ایسی وردی میں جس میں جانگیا شامل تھی، اسکاؤٹ کی ٹوپی پہنے اور لیڈر کی لٹکی ہوئی چوٹی سمیت نظر آتا ہے۔ اس کے پہلو کی ng کے برابر بہت بڑی بڑی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا ایک لڑکا تھا، جو شاید تیرہ برس کا رہا ہوگا۔ گریف کا بازو محبت سے اس کے کاندھوں پر ہے۔ میں لڑکے سے واقف نہیں تھا مگر بعد

میں گریف کی بیوی لینا (Lina) کے ذریعے معلومات ہوئیں اور میں اس کو سمجھ سکا۔

میں ''طاقت بذریعہ مسرت'' نامی ادارے کے سیاحوں اور نابالغ بوائے اسکاؤٹ، شہوانیت کے اندراجات اور تصویروں میں گم ہوتا جا رہا ہوں۔اب میں چند صفحات چھوڑ کر اپنے آپ کی طرف، اپنی پہلی تصویری شباہت کی طرف، آنا چاہتا ہوں۔ میں ایک خوب صورت بچہ تھا۔ وہ تصویر 1925 میں پینٹے کوسٹ میں لی گئی تھی۔اس وقت میں آٹھ ماہ کا تھا، اسٹیفن برانسکی سے دو ماہ چھوٹا، جو اسی ناقابلِ بیان گھٹیا پن میں، اگلے صفحے پر نظر آتا ہے۔میرے پوسٹ کارڈ کا کنارہ لہریا دار نقوش سے مزین ہے۔عقب میں پتا لکھنے کے لیے لکیریں بنی ہوئی ہیں، اور خاندان کے استعمال کے لیے شاید بڑے اڈیشن میں طبع ہوا تھا۔ایک چوڑے مستطیل کے اندر کی تصویر کا اپنا ضرورت سے زیادہ متوازن انڈے جیسا پیکر ہے۔ میں برہنہ اور زردی کی علامت، اپنے پیٹ کے بل ایک سفید رنگ کی پوستین پر لیٹا ہوا ہوں جو بچوں کی تصویریں بنانے والے ماہر مشرقی یورپ کے کسی فوٹو گرافر کے لیے شاید کسی فیتی رساں قطبی ریچھ کا تحفہ رہا ہوگا۔میری پہلی شباہت کے لیے، جیسی اس زمانے کی تصویریں ہوا کرتی تھیں، انھوں نے بے مثال گرم ہلکے بھورے رنگ کا شیڈ منتخب کیا تھا جس کو میں اپنے زمانے کی غیر انسانی سیاہ سفید چمک دار تصویروں کے مقابلے میں ''انسانی'' کہتا ہوں، کسی قسم کی مبہم، غالباً مصنوعی ہریالی ایک گہرا پس منظر پیش کرتی ہے، جس کو روشنی کے صرف کچھ نقطے ابھار دیتے ہیں۔ جب کہ میرا نرم اور صحت مند جسم پوستین پر سپاٹ اور آسودہ لیٹا ہوا ہے، قطبی دھوپ میں مطمئن ہے، اور میرا بلیئرڈ کے گیند جیسا کاسۂ سر اوپر کی جانب اُٹھا ہوا ہے، اور اپنی چمک دار آنکھوں سے میری برہنگی کو دیکھنے والے کی طرف دیکھ رہا ہے۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تصویر کسی بھی بچے کی تصویر جیسی ہے۔اگر آپ کر سکیں تو مہربانی کر کے ذرا ہاتھوں پر غور کیجیے۔آپ کو ماننا پڑے گا کہ میری شباہت صریحاً ان تمام بے شمار ہوشیار بچوں سے کہیں مختلف ہے، جنھیں آپ نے دنیا بھر کے البموں میں دیکھا ہوگا۔آپ میری مٹھیاں بھنچی دیکھ رہے ہیں۔آپ کو کوئی ساسیج جیسی چھوٹی سی انگلی پوستین کے بالوں کے گچھے سے کسی مبہم اتفاقیہ خواہش کے زیر اثر کھیلتی نظر نہیں آئے

گی۔میرا چھوٹا سا پنجا نیچے آنے اور ضرب لگانے کی تیاری میں میرے سر کے برابر کسی پُرخلوص ارتکاز میں لہراتا رہتا ہے۔کس چیز کو ضرب لگانے کے لیے؟ نقارے کو ــــ!

وہ اب بھی غائب ہے، تصویر میں اس نقارے کا نام ونشان نہیں جس کا، میری تخلیق کی روشنی کے بلب کے نیچے، میری سالگرہ کے موقعے پر وعدہ کیا گیا تھا؛ اس کے باوجود تصویروں کا مونتاج بنانے میں ماہر کے لیے مناسب ناپ کا ایک کھلونا نقارہ شامل کر دینا کتنا آسان تھا۔اس کے لیے کسی طرح بھی، میرے موقع محل میں تبدیلی کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔صرف تجسس بھرے نامعقول جانور کو، میں جس پر کوئی توجہ نہ دیتا ہو، ہٹانا پڑے گا۔ ہر طرح سے ہم آہنگ ساخت میں، چالاک اور صاف ستھری عمر میں جب پہلا دودھ کا دانت نکلنے کی کوشش کر رہا ہو، یہ ایک خلل ڈالنے والا عنصر ہوتا ہے۔

کچھ دنوں بعد انھوں نے مجھے قطبی ریچھ کی کھال پر لٹانا بند کر دیا تھا۔میں اندازاً ڈیڑھ برس کا تھا جب انھوں نے زبردستی مجھے اونچے پہیوں والی بچوں کی گاڑی پر بٹھانا شروع کر دیا تھا، جسے ایک بورڈ سے بہت قریب بنی لیکھ پر چلایا جاتا تھا جس پر برف کی ایک تہہ جمی ہوتی تھی، جس کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تصویر 1926 میں لی گئی ہوگی۔جب میں اس پر دیر تک غور کرتا ہوں تو، باڑ کی نہایت بھدی بناوٹ، اور اس سے نکلنے والی کولتار کی بو، مجھے 'ہوخترلیس' کے مضافات کی یاد دلاتی ہے، جس کی طویل بیرکوں میں پہلے میکنسن کے ہسار (Mackensen Hussars) رہا کرتے تھے، اور میرے زمانے میں فری سٹی پولیس والے۔جب سے میری یادداشت شروع ہوئی ہے اس میں کوئی رہا نہیں ہے، اس لیے میں نتیجہ نکال سکتا ہوں کہ یہ تصویر اس دن لی گئی ہوگی جب میرے والدین کچھ لوگوں سے ملنے گئے تھے جنھیں ہم نے بعد کے وقتوں میں پھر کبھی نہیں دیکھا، یا شاید یوں ہی کبھی دیکھا ہو۔

سردی کے موسم کے باوجود، مما اور ماتسیرات، جو بچوں کی گاڑی کے پاس کھڑے ہیں، اوورکوٹ پہنے ہوئے نہیں ہیں۔مما پوری آستین کا کڑھائی والا روسی بلاؤز پہنے ہوئے ہے: اس کو دیکھ کر یہ تصور کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ زار کا خاندان یہ تصویر گہرے اور سب سے زیادہ سرد روس میں بنوا رہا ہے، کہ راسپوتین کے ہاتھوں میں کیمرا ہے، کہ

میں زار کے خاندان کا وارث ہوں، اور یہ بھی کہ میرے عقب میں منشیوک اور بالشیوک افراد گھروں میں بنائے گئے بموں میں تبدیلیاں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور آمرانہ خاندان کے زوال کے منصوبے بنا رہے ہیں، مگر اس التباس کو ماتسیرات کا، مرکزی یورپی، پیبرانہ دکان کا،، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، بیرون توڑ چھوڑ دیتا ہے۔ ہم لوگ 'بوختر لیس' کے پُرسکون مضافات میں تھے، اور میرے والدین ہمارے میزبان کے گھر سے تھوڑی سی دیر کے لیے باہر گئے تھے — کوٹ پہننے کی زحمت کی کیا ضرورت ہے؟ — کہ ان کا میزبان ذرا سی دیر میں ننھے آسکر سمیت ان کی ایک فوری تصویر کھینچ دے گا۔ اس نے اپنی ہوشیار نظروں سے دیکھتے ہوئے ان کی خواہش پوری کردی، اور ایک لمحے بعد وہ حواس باختہ، خود کو کافی، کیک اور پھینٹی ہوئی کریم سے گرم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس میں ابھی کئی درجن، یا اس بھی زیادہ، تصویریں ہیں، ایک برس، دو برس اور ڈھائی برس پرانی، لیٹے، بیٹھے، گھٹنوں چلتے اور دوڑتے ہوئے۔ یہ سب تصویریں بُری نہیں جو میری تیسری سالگرہ کے اعزاز میں بنائی گئی تھیں، کہ یہ سب مل کر میرا ایک تفصیلی خاکہ بناتی ہیں۔

اس موقعے پر مجھے وہ مل گیا ہے۔ میرا نقارہ مل گیا ہے۔ سامنے، میرے پیٹ کے سامنے لٹک رہا ہے، بالکل نیا، دندانے دار سُرخ و سفید لکیروں والا۔ ایک نہایت سنجیدہ تاثر کے ساتھ، میں اس کے اوپر، صلیب کے انداز میں رکھی، بجانے والی لکڑیوں کو اٹھا لیتا ہوں۔ میں دھاری دار سویٹر اور چمک دار چمڑے کے جوتے پہنے ہوئے ہوں۔ میرے بال برش کی طرح کھڑے ہوئے ہیں، گویا حملہ کرنے والے ہوں؛ میری نیلی نیلی دونوں آنکھوں میں طاقت حاصل کر لینے کا اعتماد جھلک رہا ہے جس کو نوکر چاکر یا بد معاش لوگوں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہی وہ تصویر تھی، میں نے جس میں اپنی زندگی کا پہلا فیصلہ کیا تھا، جسے تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں پڑی ہے۔ اسی وقت میں نے اعلان کیا تھا، اور پوری طرح طے کر لیا تھا کہ میں کریانے کی دکان کھول لوں گا نہ کبھی سیاست داں نہیں بنوں گا، کہ میں اس قد سے آگے نہیں بڑھوں گا، ویسا ہی رہوں گا جیسا کہ ہوں — اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ نہ صرف یہ کہ برسوں میں اسی ناپ کا، بلکہ اسی قسم کے لباس میں رہا ہوں۔

چھوٹے لوگ اور بڑے لوگ۔ چھوٹا کلاؤس اور بڑا کلاؤس، ننھا ٹم اور کیرولس میگنس، ڈیوڈ اور گولائتھ، جیک دی جائنٹ کلر اور بلا شبہ دیو بھی: میں تین برس ہی کا رہا، مٹی سے بنا بالشتیا، نام انگوٹھے والا، گھگنا لمّی پُشت والا، پستہ قد بونا، جسے بڑھنے پر کوئی قائل نہیں کر سکا ہے۔ میں نے ایسا اس لیے کیا ہے تا کہ مجھے بڑے اور چھوٹے کے مکالمے سے نجات مل جائے، اور جب میں پانچ فٹ آٹھ انچ کا ہو جاؤں، تب بھی یہ آدمی مجھے چلا نہ سکے، یہی جو آئینے کے سامنے کھڑا ڈاڑھی بنا رہا ہے، جس کو میرا باپ کہا جاتا ہے، مجھے کاروبار میں ڈھکیل نہ سکے، نہ کریانے کی دُکان میں لگا سکے، جیسا کہ ماتسیرات نے کہا تھا کہ وہ کرے گا جب آسکر اکیس برس کا ہو جائے گا، اور اس کی اپنی بالغ دنیا ہو گی۔ دُکان کے کیش رجسٹر سے کھیلنے کے بجائے میں اپنے نقارے میں جٹا رہا، اور اپنی تیسری سالگرہ کے بعد سے میں نے چھوٹی انگلی کی لمبائی کے برابر بھی بڑھنے سے انکار کر دیا۔ میں قبل از وقت نشوونما پانے والا سہ سالہ بنا رہا، جس کے اطراف بڑے بڑے مینار تھے، مگر میں ان سارے میناروں سے بلند رہا، جس نے اپنے سایے کو ان کے سایے سے ناپنے سے انکار کر دیا، جو اندر اور باہر، دونوں جانب سے مکمل تھا، جب کہ وہ، جو قبر میں پیر لٹکائے تھے، فکر اور ترقی کے منکر تھے، جنھیں صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ تجربے سے سخت ہوئے ہیں، اور وہ جسے، سال بہ سال، جوتے اور پتلون بدلنے کی ضرورت نہیں تھی تا کہ وہ ثابت کرے کہ وہ بڑھ رہا ہے۔

بہر حال، اس مقام پر آسکر کو ایک نوع کی ترقی کا اعتراف کرنا پڑے گا؛ کہ کچھ ترقی ہوئی ہے، مگر ہمیشہ میرے فائدے کی نہیں رہی ہے — بالآخر، مسیحانہ تناسب کی ترقی ہوئی ہے؛ مگر کیا میرے زمانے کے بڑوں کے پاس، سہ سالہ نقارچی، آسکر کے لیے کان تھے، اور آنکھیں تھیں؟

# توڑ دو! کھڑکی کا شیشہ توڑ دو

میں ابھی ایک تصویر کا تذکرہ کر چکا ہوں جس میں آسکر کے نقارے اور اس کی چوب کا تفصیل سے ذکر آ چکا ہے، ساتھ ہی یہ راز بھی افشا کیا جا چکا ہے کہ جب اس کی تیسری سالگرہ کی تقریب میں، جس میں کیک اور تین شمعیں جل رہی تھیں، تصویر بنائی جا رہی تھی تو آسکر نے کیا فیصلے کیے تھے جن کو پورا کرنے میں تین برس لگ سکتے ہیں، مگر اب البم میرے پہلو میں خاموش پڑا ہے، اور مجھے کچھ واقعات کے بارے میں کچھ کہنا پڑے گا جن پر کہنے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر چہ واقعات اس امر کی تشریح نہیں کر سکتے کہ میں کیوں تین برس ہی کا رہا ہوں، اس میں شبہ نہیں کہ وہ ہوئے ہیں، اور مزید یہ ہے کہ میں نے ان کو ہونے دیا ہے۔

اوّل دن ہی سے مجھ پر واضح ہو گیا تھا: بالغ لوگ تم کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ اگر تم ان کو قابلِ فہم نشو ونما دینا بند کر دو گے تو، وہ کہیں گے کہ تم ذہنی طور پر پس ماندہ ہو؛ وہ تم کو اور تمھاری دولت کو کشاں کشاں درجنوں ڈاکٹروں کے پاس لے جائیں گے، اس تشریح کی تلاش میں، کہ تمھارے نقص کا علاج ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے نتیجے میں، طبی مشوروں کو برداشت کی حد تک رکھنے کے لیے مجھے خود احساس ہوا کہ مجھے اپنی نشو ونما کی ناکامی کا معقول جواز پیش کرنا چاہیے، اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اپنی تشریح پیش کرے۔

ستمبر کے مہینے کا ایک روشن دن ہے، میری تیسری سالگرہ کا دن۔ جاتے ہوئے گرمی کے موسم کے محویات کا دن؛ گریٹیشن مشفلر کا قہقہہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔ مما پیانو پر بیٹھی ہوئی Gypsy

Baron سے کچھ مانگ رہی تھی، جان اس کے عقب میں کھڑا ہوا تھا، اس کا ہاتھ مما کے شانے پر چہل کر رہا تھا اور خود کو موسیقی سے بہلا رہا تھا۔ ماتسیرات باورچی خانے میں رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ نانی، ہیڈوگ برانسکی اور الیکسانڈر شیفلر کے ساتھ گریف کے پاس بیٹھے جا رہی تھی، اس لیے کہ سبزی فروش کے پاس ہمیشہ کہانیاں ہوتی تھیں، ہمت اور وفاداری سے بھرپور بوائے اسکاوٹ کی کہانیاں؛ اور پس منظر میں، دیوار سے لگی رکھی ہوئی گھڑی تمبر کے ٹپک دن کا ایک چوتھائی گھنٹا بھی ضائع نہیں کر رہی تھی۔ اور چوں کہ گھڑی کی طرح وہ سب مشغول تھے اور جیبی بیرن کے بجگری سے، گریف کے بوائے اسکاوٹ سے (جو Vosges کی پہاڑیوں میں گھوم رہے تھے) ہوتی ہوئی ایک لکیر گزرتی تھی، جو ماتسیرات کے باورچی خانے سے گزر کر، جہاں فرائنگ پین میں کشوبیائی مشروم، بھینے انڈے اور اوجھڑی پکائی جا رہی تھی، راہ داری سے دکان تک جاتے ہوئے میں، اپنے نقارے پر کچھ بجاتا ہوا جا رہا تھا۔ جوں ہی میں دکان میں داخل ہوا، کاونٹر کے پیچھے رکھا پیانو، مشروم اور Vosges مجھ سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ تہہ خانے میں جانے والا دروازہ کھلا تھا؛ ماتسیرات، جو میٹھا بنانے کے لیے پھلوں کے ڈبے لینے نیچے گیا تھا، دروازہ بند کرنا بھول گیا ہوگا۔ ایک لمحہ گزرا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ تہہ خانے کا دروازہ مجھ سے کیا چاہتا ہے۔ خودکشی! نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ تو بہت آسان بات ہوگی، مگر اس کا متبادل، مشکل اور تکلیف دہ ہوگا۔ وہ قربانی مانگ رہا تھا، اور اس کے باوجود، جیسا کہ اس وقت ہوا تھا، جب مجھ سے ایک قربانی طلب کی گئی تھی، تو اس قسم کے خیال سے ہی میری پیشانی تر بتر ہو گئی تھی۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے نقارے کو گزند نہیں پہنچنی چاہیے؛ مجھے اس کو بھی ہوئی سولہ سیڑھیوں سے نیچے احتیاط سے لے جانا ہوگا اور اسے آٹے کے بوروں پر رکھنا ہوگا۔ تا کہ اس کی حالت صحیح و سالم رہے۔ پھر اس کو واپس لانا ہوگا، آٹھویں قدمچے تک، نہیں ساتویں، نہیں در اصل پانچویں تک بھی ٹھیک ہی رہے گا۔ مگر اس بلندی سے حفاظت اور مناسب زخم کو یک جا کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ پھر پیچھے واپس آتے ہیں، اس بار زیادہ بلندی پر، دسویں قدمچے تک؛ بالآخر، نویں قدمچے سے، میں فرش پر کود گیا میرے ہاتھوں میں رس بھری کے شربت کی بوتلوں سے بھرا ایک شیلف تھا، اور میں سر کے بل سیمنٹ سے بنے فرش پر جا گرا تھا۔

ہوش پر پردے پڑنے سے پہلے ہی، مجھے اپنے تجربے کا احساس ہو گیا تھا: رس بھری کے شربت کی بوتلوں کے گرنے سے، جنھیں میں جان بوجھ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا، اتنی آواز پیدا ہوئی تھی کہ باورچی خانے سے ماتسیرات، پیانو کے پاس سے مما، اور سالگرہ کے لیے Vosges کی وادیوں سے آئی ہوئی پارٹی کے بقیہ افراد، دُکان سے دوڑتے ہوئے، کھلے دروازے اور سیڑھی سے نیچے پہنچے۔ ان کے آنے سے پہلے، میرے پاس اتنا وقت تھا، میں نے رس بھری کے شربت کا ایک گھونٹ مار لیا تھا، اور یہ دیکھنے کے لیے کہ میرے سر سے خون بہہ رہا تھا— اس وقت تک وہ لوگ سیڑھیوں پر پہنچ گئے تھے— اور یہ آسکر کا خون تھا یا رس بھری کا شربت، جس کی مہک اتنی میٹھی اور سرور انگیز تھی، مگر مجھے اس امر کی خوشی تھی کہ سب کچھ بڑے قرینے سے ہو گیا تھا اور، میری دور اندیشی کے طفیل، نقارے کو کوئی گزند نہیں پہنچی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ گریف تھا جو مجھے سیڑھیوں سے اوپر لے گیا تھا۔ بیٹھک میں پہنچ کر ہی آسکر اس بادل سے باہر آیا تھا جو بلاشبہ رس بھری کے شربت اور اس کے آدھے بچگانہ خون پر مشتمل تھا۔ ڈاکٹر ابھی پہنچا نہیں تھا؛ مما چیخ رہی تھی اور ماتسیرات پر گھونسوں کی بارش کیے جا رہی تھی، جو اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا؛ اس کے چہرے پر تھپڑ مار رہی تھی، نہ صرف اپنی ہتھیلی سے بلکہ مٹھی سے بھی، اور اس کو قاتل بھی کہہ رہی تھی۔

اور محض ایک بار گر جانے سے، جو صرف کشش ثقل سے ہی نہیں بلکہ ثقل کی حد کے غلط اندازے سے ہوا تھا جس کا میں نے پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا، اور میں نے نہ صرف ڈاکٹر جس کو بار بار دُہرا چکے تھے، اور بزرگ جس کے بارے میں اپنی تشریحات پیش کر چکے تھے— اپنی نشوونما میں رُکاوٹ کا، بلکہ اس کے علاوہ نیک فطرت ماتسیرات کو بد فطرت ماتسیرات ثابت کرنے کا جواز پیش کر دیا تھا۔ ماتسیرات نے تہہ خانے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا اس لیے میری ماں نے سارا الزام اسی کے سر دھر دیا تھا، اور پھر آنے والے برسوں تک اُس نے خود کو مما کی بے رحم سرزنش کا، جو متعدد بار نہیں ہوتی تھی، ہدف بنا لیا تھا۔

میرے حادثے نے مجھے چار ہفتوں کے لیے اسپتال پہنچا دیا تھا، اور اس کے بعد، ہفتہ وار ڈاکٹر ہولائز معائنے کے بعد سے، اسے طبی پیشے کے دباؤ سے کچھ سکون ہو گیا تھا۔

میں نقارہ نوازی کی ابتدا ہی میں دنیا کو ایک اشارہ فراہم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا؛ کہ اب بالغ لوگوں کے سامنے میری نشو و نما میں رُکاوٹ کا جواز فراہم ہو گیا، جس کے بارے میں طرح طرح کے شبہات پیش کیے جاتے تھے۔ اس کے بعد سے ہمیشہ کے لیے کہانی کچھ یوں تھی: اپنی تیسری سالگرہ کے موقعے پر ننھا آسکر سیڑھیوں سے گر گیا تھا، کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی، مگر اس کے بعد سے اس کی مزید نشو و نما نہیں ہوئی ہے۔ اور میں نے نقارہ نوازی شروع کردی۔ ہماری رہائشی عمارت چار منزلوں پر مشتمل تھی۔ نچلی منزل سے بالاخانے تک میں سیڑھیوں پر، اوپر نیچے، نقارہ بجاتا پھرتا تھا۔ 'لیبز وِگ' سے 'میکس ہالبے پلاٹز' پھر وہاں سے 'نیوشاتلانڈ'، 'مارین اشتراسے'، 'کلائن ہامر پارک'، 'ایکٹین بروری'، 'ایکٹین پاونڈ'، 'فروبیل گرین'، 'پیستالوتسی' اسکول، 'نیو مارکٹ' اور وہاں سے واپس 'لیبز وِگ' تک میں تھا اور میرا نقارہ۔ نقارہ تو ٹھیک رہا مگر میرے اطراف کے بالغ لوگ پریشان ہوتے تھے، کوشش کرتے تھے کہ میں نقارہ بجانا بند کردوں، اس کو چھیننے، اور اس کی ضرب دینے والی چوب کو توڑنے کی کوشش کرتے تھے، مگر قدرت میری مددگار تھی۔

میرے گرنے کے کچھ دنوں بعد میرے اور بالغ افراد کے درمیان نقارہ نوازی کے باعث فاصلے بڑھ گئے تھے، مگر اس کے ساتھ ہی میری آواز ایسی ہو گئی تھی، میں جس میں تیز اور لرزہ پیدا کرنے کے انداز میں گا سکتا تھا، چیخ سکتا تھا کہ کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ میرے نقارے کو، جو اُن کے کان کے پردے پھاڑے دے رہا تھا، ہاتھ بھی لگا سکے: اس لیے کہ جب مجھ سے نقارہ چھینا جاتا، میں چیختا، اور جب میں چیختا تو قیمتی چیزیں ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتیں: اب میں اپنے گانے کے ذریعے بھی شیشے ریزہ ریزہ کر سکتا تھا: میری چیخ گلدان توڑ ڈالتی، میری چیخ سے کھڑکی کے شیشے ٹوٹ کر گر جاتے اور کمروں کے اندر سرد ہواؤں کا راج ہو جاتا؛ ایک بے رحم ہیرے کی طرح، میری آواز شیشہ لگی الماریوں کے دروازوں کو کاٹ ڈالتی اور، اپنی معصومیت گنوائے بغیر، ان میں داخل ہو کر پیار بھرے ہاتھوں کے ذریعے دیے گئے برانڈی کے بلوریں جام، جن پر خاک کی ہلکی سی تہہ جمی ہوتی تھی، تباہ کر دیتی تھی۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ 'بروزن وِگ' سے، ہوائی اڈے کے برابر کی رہائشی آبادی

تک، میری گلی میں رہنے والوں کو میری صلاحیت کی اطلاع مل گئی تھی۔ جب بھی میں اپنے محلّے کے بچوں کی توجہ کا مرکز بنتا، جن کے کھیل کود، "Pickled herring, one, two, three" یا "I see something you don't see" یا Where's the Witch, black as pitch? وغیرہ میں انھیں میری دل چسپی نظر نہیں آتی تو ان کا پورا گروہ چیخ چیخ کر گانے لگتا:

Smash a little windowpane,
Put sugar in the beer,
Mrs. Biddle plays the fiddle.
Dear, dear, dear.

یہ احمقانہ اور بے معنی جھنکار تھی، میں جس سے بالکل پریشان نہیں تھا: میں سیدھی سادی تال لیتا، جس میں دل فریبی کی کمی نہیں ہوتی تھی، اور اپنے راستے کی ابتدا سے آخر تک، چھوٹی چھوٹی چیزوں اور مسز بڈل کے درمیان سے ہوتا، نقارہ بجاتا جاتا تھا۔ اسی طرح نقارہ بجاتے، میں پوری گلی میں مارچ کرتا جاتا تھا، حالاں کہ میں کوئی متنوع قسم کا نے نواز نہیں تھا، کہ گلی کے بچے میرے پیچھے پیچھے چلتے۔

آج بھی، جب برونو میری کھڑکی کی صفائی کر رہا ہوتا ہے تو، کبھی کبھی، میرا نقارہ ایک لمحے کے لیے ہی سہی، مگر اس جھنکار کے لیے کچھ وقت نکال لیتا ہے۔

بچوں کی غنائی تضحیک سے زیادہ جھلا دینے والی، خصوصاً میرے والدین کے لیے، یہ حقیقت تھی کہ چھوٹے بڑے بد معاش لوگوں کی توڑی ہوئی پورے محلّے کی کھڑکیوں کا الزام بھی میری آواز ہی کے سر آتا تھا۔ پہلے تو مما دیانت دارانہ انداز میں نقصان کا ازالہ کر دیا کرتی تھی، زیادہ تر جو پتھراؤ کی وجہ سے ہوا کرتا تھا، مگر بعد میں وہ اپنے چہرے پر کاروباری سرد مہری سجائے نقصان کا ثبوت طلب کرنے لگی تھی۔ دراصل مجھے غیر منصفانہ طور پر الزام دیا جاتا تھا۔ اس سے زیادہ بے انصافی کیا ہو سکتی تھی کہ مجھے تباہی پھیلانے والے بچپنے کا الزام دیا جاتا تھا، کہ مجھ میں بے وجہ شیشے یا شیشے سے بنی چیزوں سے نفرت کا جذبہ موجزن رہتا ہے۔ وہی بچے جو کھیل کود کرتے ہیں اس طرح کی تباہ کن حرکتیں کر سکتے ہیں۔ میں تو کبھی کھیلتا

بھی نہیں تھا، میں صرف اپنا نقارہ بجاتا تھا، اور جہاں تک میری آواز کا سوال ہے تو اس کی معجزانہ طاقت، کم از کم شروع میں، حفظِ ما تقدم کے طور پر استعمال ضرور ہوئی تھی۔ جب میرے نقارہ بجانے کے حق کو خطرہ ہوتا تھا، تب ہی میں اپنے گلے کے آواز پیدا کرنے والے اسلحے کا استعمال کرتا تھا۔ اگر اسی آواز اور تکنیک سے میں گریچن شیمر کے نفرت انگیز کڑھائی والے میز پوش کاٹ سکتا، یا پیانو کی پالش خراب کر سکتا تو میں خوشی خوشی تمام شیشے کے برتنوں کو صحیح سالم چھوڑ بھی سکتا تھا۔ مگر میز پوش اور وارنش کی خرابی میری آواز کے لیے بہت مشکل کام تھا۔ میری چیخیں دیوار پر لگے کاغذ کے نمونوں کو مٹانے کی قوت نہیں رکھتیں، یا جس طرح ہمارے قدیم آبا و اجداد چقماق کے دو پتھروں کو آپس میں رگڑ کر حرارت پیدا کر سکتے تھے، تو اسی طرح ہم بھی چنگاریاں پیدا کر کے بیٹھک کے کمرے کی کھڑکیوں پر پڑے آگ پکڑ لینے والے خشک پردوں کو شعلوں کے نقش و نگار اور تمباکو کے غبار سے مزین کر دیتے۔ میں نے اپنے گانے سے کبھی ماتسیرات یا الیگزانڈر کے کرسی کے پائے نہیں اکھاڑے۔ میں نے خوشی خوشی اپنے کم تباہی والے، کم معجزاتی طریقوں سے اپنا دفاع کیا ہوتا، مگر مجھے کوئی اور اسلحہ میسر نہیں تھا: صرف شیشہ ہی میرا حکم مانتا تھا اور اسی کو سب کچھ برداشت کرنا ہوتا تھا۔

اپنی تیسری سالگرہ کے بعد ہی، پہلی بار میں نے اس قسم کا کامیاب مظاہرہ کیا تھا۔ مجھے نقارہ ملے تقریباً چار ہفتے ہوئے تھے، اور اپنے مزاج کے مطابق میں نے اسے اتنا استعمال کیا تھا کہ اس کا حال خراب ہوگیا تھا۔ اس کے دندانے دار سُرخ و سفید ہینڈل نے اس کے اوپری اور نچلے حصوں کو تھام رکھا تھا، مگر بجانے کی سطح میں سوراخ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا؛ اور چوں کہ میں دوسری جانب کی سطح کو استعمال نہیں کرتا تھا، سوراخ بڑا ہوتا گیا، اور ہر طرف پھیلتا گیا، اور اس کے کنارے کٹے پھٹے ہو گئے تھے۔ بجانے سے ٹین کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر نقارے کے اندر جا گرا تھا، اور اس پر لگنے والی ہر چوٹ کی آواز میں اس کی کھڑکھڑاہٹ بھی شامل ہوجاتی تھی، اور رنگ چینی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نقارے سے نکل نکل کر بیٹھک اور خواب گاہ میں بچھے قالین میں دھنس گئے تھے۔ اس بات کا خطرہ بھی ہوگیا تھا کہ ان ٹکڑوں سے مجھے گزند پہنچ سکتی تھی۔ بالخصوص ماتسیرات، میرے سیڑھی سے گرنے کے بعد سے بہت محافظ مزاج ہو گیا

تھا، مجھے ان سے بچنے کی تلقین کرتا رہتا تھا۔ چوں کہ جب میں نقارہ بجاتا تھا میری زور زور سے ہلنے والی کلائیاں اس سوراخ کے کٹے پھٹے کناروں کے بہت قریب ہوتی تھیں، اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ماتسیرات کا خوف بے بنیاد نہیں، مگر مبالغہ آمیز ضرور تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایک نیا نقارہ دینے سے ان خطرات کی پیش بندی ہو سکتی تھی؛ سیدھی بات یہ تھی کہ وہ مجھ سے میرا پیارا نقارہ چھین لینا چاہتے تھے، جو میرے ہمراہ سیڑھی سے گر چکا تھا، جو میرے ہمراہ اسپتال جا چکا تھا اور میرے ہمراہ گھر واپس آ چکا تھا، جو میرے ساتھ اوپر نیچے جاتا رہتا تھا — جی ہاں! وہ لوگ اس کو مجھ سے چھین لینا اور اس کے عوض کچھ دینا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھے فضول قسم کی چاکلیٹ کے ذریعے رشوت دینے کی بھی کوشش کی تھی۔ مما نے مجھے چاکلیٹ پیش کرنے کے لیے ہاتھ بڑھائے تھے، مگر وہ ماتسیرات ہی تھا جس نے میرے خستہ حال آلے کو مجھ سے زبردستی چھیننے کی کوشش کی تھی۔ میں اپنی تمام قوت کے ساتھ اس سے چمٹ گیا تھا۔ اس نے کھینچا، میری طاقت جو مشکل سے اس کے بجانے کے لیے کافی ہوتی تھی، میرا ساتھ چھوڑنے لگی۔ آہستہ آہستہ سلنڈر میرے ہاتھ سے پھسلتا جا رہا تھا۔ اس مرحلے پر آ کر، جو اس وقت تک خاموش اور تقریباً نہایت مہذب بچہ تھا، وہ پہلی سی تباہ کن چیخ نکالنے میں کامیاب ہو گیا، اور وہ چمک دار گول بلوریں شیشہ، جو گھڑی کے شہد رنگ ڈائل کو دھول اور قریب المرگ مکھیوں سے محفوظ رکھتا تھا، پھٹ کر فرش پر گر پڑا (اس لیے کہ قالین فرشِ زمین پر دھری گھڑی تک نہیں بچھا تھا) مگر گھڑی کے اندر کے قیمتی میکانزم کو نقصان نہیں پہنچا تھا؛ پنڈولم آرام سے اپنے راستے چلتا رہا، اور گھڑی کی سوئیاں بھی حرکت کرتی رہیں۔ گھڑی کی سریلی گھنٹیاں بھی نہیں بجیں، حالاں کہ یہ ہلکے سے جھٹکے سے ہی دیوانہ وار ردِ عمل پیش کرتی تھیں، گزرتے ہوئے بیئر کے ٹرک سے ہی جھنجھنانے لگتی تھیں، مگر میری چیخ سے ذرا بھی پریشان نہیں ہوئیں۔ صرف شیشہ ہی تھا جو ٹوٹ گیا تھا، اور اس کی شکستگی بھی خوب تھی۔ ''گھڑی ٹوٹ گئی'' ماتسیرات چلایا، اور اس نے نقارے کو چھوڑ دیا۔ ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر میں نے دیکھ لیا تھا کہ خود گھڑی کو کچھ نہیں ہوا تھا، کہ صرف شیشہ ہی گیا تھا۔ مگر ماتسیرات کے، مما اور انکل جان برانسکی کے نزدیک — جو ہمیشہ کی طرح اتوار کی سہ پہر آیا

ہوا تھا — نقصان زیادہ ہوا تھا۔ ان کے چہروں کے رنگ فق ہو گئے تھے، مجبور نظریں ملیں اور پھر انھوں نے قریب رکھی دوسری ٹھوس اشیا، یعنی ٹائل سے بنے آتش دان، پیانو اور سائیڈ بورڈ کو دیکھا۔ وہ لوگ آگے بڑھنے سے ڈر کر خاموش کھڑے رہے۔ جان بدانسکی کی آنکھیں التجا سے پُر نظر آ رہی تھیں اور میں اس کے خشک ہونٹ آہستہ آہستہ ہلتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا، شاید ان الفاظ میں: "او! خدا کے میمنے، وہ جو دنیا کے تمام گناہ اپنے سر لے لیتا ہے، رحم کر" اس کو تین بار دہرایا، اس کے بعد "میرے آقا! میں اس قابل نہیں کہ تو میرے سائبان میں داخل ہو؛ بس کچھ کہہ دے......"

ظاہر ہے کہ آقا نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس کے علاوہ، گھڑی نہیں، صرف شیشہ ہی تو ٹوٹا تھا، مگر بالغ لوگ بھی تو اپنی گھڑیوں کے بارے میں بچوں کے انداز میں سوچتے ہیں — مگر میں ان معنوں میں کبھی بچہ نہیں رہا تھا۔ میں یہ قبول کرنے پر تیار ہوں کہ شاید گھڑی وہ غیر معمولی چیز ہے جو بالغ لوگوں نے بنائی ہے۔ بالغ لوگ تخلیقی مزاج والے ہوتے ہیں، اور کبھی کبھی، شوق، سخت محنت اور تھوڑے سے خوش قسمت ہونے کے باوجود، مگر بالغ ہونے کے باعث، جوں ہی کوئی عہد ساز چیز ایجاد کرتے ہیں، خود ہی اس کے غلام ہو جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ گھڑی کیا شے ہے؟ کسی بالغ انسان کے بغیر یہ بیکار ہوتی ہے۔ بالغ شخص ہی اس میں چابی بھرتا ہے، اس کو آگے پیچھے کرتا ہے، اس کو معائنے، صفائی، اور جب ضروری ہو، مرمت کے لیے گھڑی ساز کے پاس لے جاتا ہے۔ اسی طرح جیسے آپ اس ککو کے ساتھ ہوں جو جلد بولنا بند کر دیتی ہے، جیسے اتر تمک دان کے ساتھ صبح کو مکڑیاں نظر آتی ہیں، کالی بلّیاں بائیں جانب ہوتی ہیں، انکل کی آئل پورٹریٹ دیوار سے گر پڑتی ہے اس لیے کہ پلاسٹر میں لگی ہوئی کیل ڈھیلی ہو گئی ہے، جس طرح کہ بالغ لوگ کسی آئینے میں کم اور اس کے پیچھے زیادہ دیکھتے ہیں، بہ نسبت ایک گھڑی کے۔

الغرض مما نے جو اپنی تمام تر پختگی اور تیزی کے ساتھ اپنے کاندھوں پر ایک ٹھنڈے دماغ والا سر بھی رکھتی ہے، اور جس کی بیہودگی تمام ظاہری نشانیوں یا نحوستوں کی خوش امید تشریحات پیش کر دیتی ہے، اور اس نے موقع محل کی مناسبت سے ان کے لیے الفاظ بھی

تلاش کر لیے ہیں۔ اس نے اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے چلّا کر کہا تھا، ''شیشے کے ٹکڑے نیک شگون ہوتے ہیں۔'' اور پھر خود ہی خاک دان اور جھاڑو لے آئی اور خوش قسمتی کو اٹھا لے گئی۔

اگر ممّا کے الفاظ کو ان کے اصل معنوں میں لیا جائے، تو میں خوش قسمتی لایا ہوں، اپنے والدین کے، رشتے داروں کے، دوستوں کے، بلکہ بہت سارے اجنبی لوگوں کے لیے، چیخ یا گا کر شیشے سے بنی اشیا توڑ کر، جس میں کھڑکی کے شیشے، مصنوعی پھلوں سے بھرے بلّور کے پیالے، بیئر سے بھرے گلاس، بیئر کی خالی بوتلیں یا موسمی خوشبوؤں سے بھری وہ ننھی ننھی شیشیاں بھی ہیں جنھیں عام لوگ خوشبو کی بوتلیں کہتے ہیں، المختصر کوئی بھی شے جو شیشے کو منہ سے پھلانے کے فن سے تیار کی گئی ہو۔

اس لیے کہ میں شیشے سے بنی نفیس اشیا کا عاشق رہا ہوں، نقصان کو محدود کرنے کی غرض سے میں نے اپنی توجہ ایک یا ایک سے زیادہ بجلی کے بلب توڑنے پر مرکوز رکھی تھی، جب وہ مجھ سے میرا نقارہ چھیننا چاہتے تھے، بجائے اس کے مجھے اس بستر میں لے جانے دیتے۔ میں نے 1928 کی ابتدا میں، اپنی چوتھی سالگرہ پر پورے اجتماع کو باہر نکال دیا تھا— اپنے والدین کو، برانسکیوں کو، نانی کوواچکی کو، شیفلروں کو اور گریفوں کو، جنھوں نے مجھے وہ سب دیا تھا جس کا میں تصور کر سکتا تھا: ٹین سے بنے سپاہی، بادبانی کشتی، آگ بجھانے والا انجن؛ مگر کسی نے مجھے نقارہ نہیں دیا تھا: جو چاہتے تھے کہ میں ٹین سے بنے سپاہی سے کھیلوں، اور اس احمقانہ آگ بجھانے والے انجن سے کھیل کر اپنا وقت ضائع کروں؛ اور وہ میرا ٹوٹا پھوٹا، زنگ آلودہ نقارہ چرا کر میرے لیے یہ بادبانی کشتی چھوڑ جانا چاہتے تھے جو بالکل بے کار تھی، اور جیسا کہ میں کہہ رہا تھا، میں نے ان سب کو باہر نکال دیا تھا، جن کا مقصد مجھے اور میری خواہشوں کو قدیم ظلمت میں نظر انداز کرنا تھا، کے ذریعے جو ہمارے آویزاں فانوس کے چاروں بلب کو تباہ کر دینا چاہتے تھے۔

اف یہ بالغ لوگ! پہلی وحشت انگیز چیخ کے بعد، روشنی کے پہلے مایوس کن مطالبے کے بعد، وہ اندھیروں کے عادی سے ہو گئے تھے، اور جب تک کہ صرف میری نانی کوواچکی، جو ننھے اسٹیفن برانسکی کے علاوہ واحد شخص تھی جسے اندھیرے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا

تھا، دُکان پر گئی نہیں تھی، روتے دھوتے ننھے اسٹیفن کے ساتھ جو اس کے لنگے پر لٹکا تھا، اور جب وہ روشنی لیے کمرے میں واپس آئی تو بقیہ لوگ جو اب بلند درجے کی بدمستی میں جا چکے تھے، حیرت انگیز طور پر جوڑوں کی صورت چمٹے ہوئے تھے۔

جیسی کہ توقع تھی، مما بکھرے بالوں اور پھول دار لباس پہنے جان برانسکی کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ عمل الیکزانڈر شیفلر کو دیکھنے کی رغبت دلانے کے برعکس تھا، وہ چھوٹی چھوٹی ٹانگوں والا، مسز گریف کی لبروں میں تقریباً غرق تھا۔ ماتسیرات گرٹچن شیفلر کے گھوڑے جیسے سونے کے دانتوں کو چاٹ رہا تھا۔ صرف ہیڈویگ برانسکی گود میں ہاتھ دھرے اکیلی بیٹھی ہوئی تھی، اور شمع کی روشنی میں اس کی گائے جیسی متقی آنکھیں، گریف سبزی فروش سے قریب مگر زیادہ قریب نہیں تھیں، حالاں کہ اس نے پی نہیں تھی، وہ غم زدگی اور توانائی سے ملی افسردہ مگر سریلی آواز میں گا رہا تھا۔ ہیڈویگ برانسکی کی طرف مُڑ کر اُس نے ہیڈویگ کو ساتھ مل کر گانے کی دعوت دی اور دونوں نے مل کر Rübezahl ٹامی اسکاؤٹ ماسٹر کے بارے میں ایک بوائے اسکاؤٹ گیت گانا شروع کر دیا، جس کی روح بوہیمیا کے پہاڑوں پر آسیب کے مانند لہرایا کرتی تھی۔

ارے، میں تو بھول ہی گیا تھا۔ میز کے نیچے آسکر اپنے تباہ شدہ نقارے کے ساتھ بیٹھا ہوا موسیقی کے آخری قطرے نچوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری کم زور مگر باقاعدہ تھاپ، وجد میں کھوئے افراد کو پسند رہی ہوگی، جو کمرے میں بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ اس لیے کہ میری نقارہ نوازی، چومنے اور چوسنے کی مسلسل آوازوں پر وارنش کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

میں میز کے نیچے بیٹھا تھا جب میری نانی اپنی شمع سمیت، غضب کے فرشتے کی طرح، کمرے میں داخل ہوئی، وہ اس Sodom اور Gomor ah [عہدِ قدیم کی بستیاں جو لواطت کے باعث آسمانی آگ سے تباہ ہو گئی تھیں] کو شمع کی روشنی میں دیکھ کر چراغ پا ہو گئی، جس سے شمعیں لرزنے لگیں، اور ان سب کو خنزیر کہہ کر للکارا، شمعوں کو طشتریوں میں نصب کر کے دیہاتی گیتوں کو ختم کیا، skat کھیلنے کے لیے سائیڈ بورڈ سے تاش کے پتے نکالے، اور انھیں میز پر پھینکا، جب کہ اس دوران وہ اسٹیفن کو بہلا بھی رہی تھی، جو اب بھی رو رہا تھا۔ جلد ہی ماتسیرات نے لیمپ میں نئے بلب لگائے، کرسیاں کھسکائی گئیں، بیئر کی

بوتلیں کھولی گئیں، اور عین میرے سر کے اوپر، یعنی میز پر ایک پینی کے دسویں حصے کی بازی skat کا کھیل شروع ہوگیا۔ مما نے ابتدا ہی میں تجویز پیش کی تھی کہ بازی کی رقم ایک پینی کے چوتھائی کے برابر بڑھائی جانی چاہیے، مگر انکل جان کے نزدیک یہ زیادہ خطرناک تھا؛ اور پھر کنجوسی کی سطح کا کھیل شروع ہوا، مگر بعد میں بازی کی سطح بڑھا دی گئی تھی۔

میں میز کے نیچے میز پوش کی پناہ میں آرام سے تھا۔ ہلکے ہلکے نقارہ بجاتے ہوئے، میں اوپر سے آنے والے آوازوں میں کھو گیا تھا، اور کھیل کے بارے میں سوچتا رہا اور ایک گھنٹے کے بعد اعلان ہوا کہ جان برانسکی ہار گیا ہے۔ اس کے پاس اچھے پتے تھے، مگر وہ سب ہار گیا، مگر یہ تعجب کی بات نہیں تھی؛ دراصل وہ کھیل پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اس کی توجہ تاش کے پتوں کے بجائے مختلف چیزوں پر مرکوز تھی۔ بالکل ابتدا ہی میں، جب وہ اپنے چاچا سے کہہ رہا تھا کہ اندھیرے میں ہونے والی رنگ رلیوں کے بارے میں جوش میں نہیں آنا چاہیے، اس نے اپنا ایک جوتا اتارا، اور، میز کے نیچے، آگے بڑھا کر، میرے سر کے اوپر سے ایک موزہ بڑھایا جس کے اندر اس کا پیر موجود تھا۔ وہ میز کے نیچے میری مما کا گھٹنا تلاش کر رہا تھا۔ اسی وجہ سے مما میز سے اور قریب آ گئی تھی، اور جان نے، جو مما کی بازی کو آگے بڑھا چکا تھا، اپنے پیر کی نوک سے اس کے اسکرٹ کے کنارے کو اٹھایا اور پیر سمیت، اپنا موزہ، جو خوش قسمتی سے اسی دن تازہ تازہ پہنا تھا، اس کی رانوں کے درمیان کچھ ٹٹولنے کے لیے ڈال دیا تھا۔ مجھے اپنی مما کو داد دینی چاہیے کہ وہ میز کے نیچے ہونے والی اس اونی چھیڑ چھاڑ کے باوجود، میز پوش کے اوپر، زندہ دل گفتگو کے دوران، مستعدی سے کھیل کھیلتی رہی، اور جیتتی رہی، جب کہ جان، جو میز کے نیچے زیادہ دلیر ہوتا جا رہا تھا، کئی بازیاں ہار گیا، جنھیں شاید آسکر بھی کامیاب اختتام تک پہنچا دیتا۔

بعد میں، بے چارہ تھکا ماندہ ننھا اسٹیفن بھی میز کے نیچے آ گیا تھا؛ اور نہایت حیرانی سے دیکھ رہا تھا جو اس کا باپ، پتلون میں اپنے پیر کے ذریعے، مما کی اسکرٹ کے نیچے کر رہا تھا؛ پھر وہ جلد ہی سو گیا۔

صاف آسمان، ہلکے بادلوں کی توقع، سہ پہر ہلکی بارش۔ دوسرے دن ہی جان برانسکی میرے گھر آیا اور وہ بد بخت بادبانی کشتی لے گیا جو اس نے مجھے تحفے میں دی تھی، اور اس

کے بدلے کھلونے کی دکان Sigismund Markus سے، میرے لیے ایک نقارہ لے آیا تھا۔یارش سے دل برداشتہ، وہ سہ پہر کے بعد بالکل نیا، اسی ماڈل کا نقارہ لیے آیا، میں جس کا عادی ہو چکا تھا، اسی قسم کے سفید پس منظر پر سُرخ شعلے بنے ہوئے تھے، اور مجھے پیش کیا، ساتھ ہی پرانا خستہ نقارہ لے لیا، جس کے اصلی رنگ کے صرف کچھ نقوش باقی رہ گئے تھے۔جب جان کے ہاتھوں میں وہ تھکا مارا نقارہ گیا اور نیا میرے ہاتھ آیا تو جان، مما اور ماتسیرات کی آنکھیں آسکر پر جم گئیں: مجھے تقریباً مسکرانے پر مجبور ہونا پڑ گیا تھا: تو کیا وہ لوگ یہ سمجھ رہے تھے میں روایت سے اس لیے چمٹا ہوا ہوں کہ مجھ پر اصولوں کا بار ہے؟

بغیر کوئی آواز نکالے، سب جس کی توقع کر رہے تھے، اور شیشہ شکن گانا گائے بغیر ہی میں نے وہ یادگار چھوڑ دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنے نئے آلے کے لیے وقف ہو گیا۔دو گھنٹے کی مکمل توجہ کے ساتھ نقارہ نوازی کے بعد، مجھے اس کی اونچ نیچ معلوم ہو گئی تھی۔

مگر، میرے اطراف کے سارے بالغ افراد اتنے سمجھ دار ثابت نہیں ہوئے جتنا کہ جان برانسکی تھا۔میری پانچویں سالگرہ کے کچھ دنوں بعد، 1929 میں نیویارک کے اسٹاک مارکیٹ میں اچانک قیمتیں گر جانے کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں، اور میں نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ بھیلو میں مقیم میرے نانا کواچکی کو بھی اپنے لکڑی کے کاروبار میں نقصان ہوا ہوگا— میری بظاہر ناکافی نشوونما سے پریشان ہو کر مما نے مجھے بُرنشوفروگ کے ڈاکٹر ہولائز کے ہاں ہر بدھ کو لے جانا شروع کر دیا۔اس کا معائنہ بے حد طویل اور برانگیختہ کر دینے والا ہوتا تھا، مگر میں نے برداشت کیا، اس لیے کہ اس کم عمری میں بھی ڈاکٹر ہولائز کی مددگار نرس اِنگے کا سفید لباس مجھے نرس کی حیثیت میں مما کی عالمی جنگ کے دوران سرگرمیوں کی یاد دلانے لگا تھا، جس کی بہت ساری تصویریں موجود تھیں۔اس کی وردی میں نئی شدید قسم کی چنٹوں پر شدید ارتکاز نے مجھے اس کے، اور باری باری تحکمانہ، ناپسندیدہ اور بزرگانہ انداز میں ڈاکٹر کے لبوں سے بہتے الفاظ کے چشموں سے لاپروا کر دیا تھا۔اس کی عینک، جس میں اس کے دفتر کی آراستگی کا عکس صاف دکھائی دیتا تھا— کروم، نکل، اور چکنے تام چینی کے ساز و سامان، شیلف، شیشے کی الماریاں، قرینے سے لیبل لگی بوتلیں جن میں سانپ، مینڈک، گرگٹ؛ اور

انسانی، خنزیر اور بندر کے جنین ) سجے ہوئے تھے — ہر معائنے کے بعد ہولائز خیالات میں ڈوبا، اپنا سر ہلاتا، معالجے کے کاغذات کے ورق پلٹتا، مما سے میرے گرنے کے بارے میں سوالات کرتا، اور مما کو چپ کرا دیتا تھا جب وہ ماتسیرات کو اس بات پر لعن طعن کرنے لگتی کہ اس نے تہہ خانے کا دروازہ کیوں کھلا چھوڑ دیا تھا، کہ وہ ہمیشہ یہی کرتا ہے۔

کئی مہینوں تک معائنے کے لیے جانے کے بعد، ایک بدھ، شاید اپنے آپ کو، اور شاید نرس اِنگے کو کسی بات پر قائل کرنے کے لیے کہ اس کے علاج کے نتائج نکلنے شروع ہوگئے ہیں، جب ڈاکٹر ہولائز نے میرا نقارہ چھیننے کی کوشش کی تو میں نے اس کے سانپوں، مینڈکوں اور جنین کے ذخیروں کا بڑا حصہ تباہ کر دیا تھا۔

یہ پہلی بار ہوا تھا کہ آسکر نے احتیاط سے بھری اور سربہ مہر بوتلوں پر اپنی آواز کو آزمایا تھا۔ تمام حاضرین کے لیے یہ کامیابی بے مثال اور زبردست تھی، حتیٰ کہ مما کے لیے بھی، جو میرے اور شیشے کے درمیان کے ذاتی رشتے سے واقف تھی۔ میری پہلی کاٹ، کفایت شعار چیخ، نے اس الماری کو کاٹ دیا تھا جس میں ہولائز نے اپنی متجسس مکروہات کھلے بندوں سجا رکھی تھیں، اور تقریباً ایک مربع شکل کا شیشے کا ٹکڑا لائینو لگے فرش پر، گر پڑا تھا جہاں، اپنی مربع شکل برقرار رکھتے ہوئے، ہزاروں ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا۔ اس کے بعد، اپنی چیخ کو زیادہ آرام دیتے ہوئے اور کفایت شعاری کو ہوا میں اڑاتے ہوئے، میں نے، ایک کے بعد دوسرا، ہر ٹیسٹ ٹیوب ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

ٹیسٹ ٹیوب آتش بازی کے پٹاخوں کی طرح پھٹتے جا رہے تھے۔ سبزی مائل اور جزوی طور پر جمی ہوئی الکحل پچکاری کی طرح نکلی اور چھینٹوں کی طرح پھیل گئی اور ساتھ ہی، تیار کیا ہوا پیلا مادہ لائینو کے فرش پر پھیل گیا تھا، اور کمرہ ایسی عفونت سے بھر گیا تھا کہ مما کو بھی ابکائی آنے لگی تھی، اور نرس اِنگے کو کمرے کی کھڑکیاں کھولنی پڑ گئی تھیں۔

ڈاکٹر ہولائز نے اپنے نقصان کو فائدے میں بدل دیا۔ میرے تشدد کے عمل کے چند ہفتوں کے اندر، اس نے میرے بارے میں ایک مضمون ”Oscar M — شیشہ ریزہ ریزہ کرنے والی آواز“ کے عنوان سے ایک میڈیکل جرنل میں شائع کیا۔ ڈاکٹر ہولائز نے جس

نظریے کے بارے میں بیس صفحات بھر دیے تھے، اس نے جرمنی اور اس کے باہر کے طبی حلقوں میں دل چسپی پیدا کردی، اور اس کی موافقت و مخالفت میں ماہرین نے ہزاروں صفحات سیاہ کردیے تھے۔ اس نے اپنے مضمون کی کئی نقلیں مما کو بھیجیں، اور اس نے جس بات پر فخر کیا تھا، مجھے سوچنے پر مجبور کردیا۔ وہ گریٹوں کو، شینفلروں کو، اپنے جان کو، اور، ہر ڈنر کے بعد پابندی سے ماتسیرات کو اس مضمون کے حصے سناتے تھکتی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ مما کے گاہک بھی مما کو تعریفی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے، جس میں بڑے پُرتخیل طرح سے طبی اصطلاحات کو غلط انداز میں پڑھنے کا ملکہ تھا۔ پہلی بار رسالوں میں میرے نام کے چھپنے نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ میرے ازلی تجسس نے مجھے ایک ڈاکٹر کی، لمبے لمبے لچھے دار جملوں، اور غیر ہنرمند و بے ربط، تقریباً ادبی تحریر پڑھنے کا موقع فراہم کیا تھا جو ایک ذاتی مظاہرے پر مشتمل تھی کہ وہ پروفیسر بننے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

آج وہی لڑکا ذہنی امراض کے ایک اسپتال میں پڑا ہوا ہے اور وہ اپنے گانے سے دانت کا برش رکھنے والا ایک معمولی سا گلاس بھی نہیں توڑ سکتا، جب کہ ہولاٹز جیسے ڈاکٹر آتے جاتے رہتے ہیں اور اس کے Rorschach ٹیسٹ، association ٹیسٹ، اور جن کا تصور ممکن ہو طرح طرح کے ٹیسٹ ہوتے رہتے ہیں، اس امید پر کہ اس کے انتشار کو کوئی بڑا سا نام مل جائے گا، جس نے اس کو اسپتال میں قید کردیا ہے، جب کہ آسکر اپنے آواز کے پرانے دنوں کو یاد کرنا پسند کرتا ہے۔ ان دنوں وہ اسی وقت شیشے کے گلاس ریزہ ریزہ کرتا تھا جب ضروری ہوتا تھا، مگر پھر بعد میں ایک تکمیلی کیفیت کے ساتھ اس نے اس کی مشق جاری رکھی تھی، اس وقت بھی جب حالات اس کو اُکساتے نہیں تھے۔ پچھلے زمانے کے راہ و رسم کی پابندی کے شکار، آسکر نے خالص خوش مزاجی سے گانا شروع کردیا، اور فن کی خاطر فن کا پرستار بن گیا۔ اس نے شیشے کو اظہارِ نفس کو ذریعہ بنایا تھا، اور اس عمل کے دوران وہ بالغ ہوگیا۔

# نظام الاوقات

کلپ اکثر نظام الاوقات بنانے میں گھنٹوں لگا دیتا ہے۔ یہ حقیقت کہ جب وہ کام کرتا ہے، مسلسل خون کی ساسیج اور گرم کی ہوئی مسور کھاتا رہتا، میرے نظریے کی تصدیق کرتی ہے، جس کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ خواب دیکھنے والے پیٹو ہوتے ہیں۔ اور وہ سخت محنت جس سے وہ اپنے گھنٹا اور آدھ گھنٹا گزارتا ہے میرے ایک اور نظریے کی تصدیق کرتی ہے، یعنی صرف اوّل درجے کے کاہل ہی محنت بچانے والی ایجادات کرتے ہیں۔

اس برس پھر، کلپ نے اپنی سرگرمیوں کا نظام الاوقات بنانے میں دو ہفتے صرف کر دیے ہیں۔ وہ کل مجھ سے ملنے آیا تھا۔ کچھ دیر تو وہ پُر اسرار حرکتیں کرتا رہا، پھر اس نے اپنے سینے کے جیب سے قرینے سے تہہ کیا ہوا کاغذ کا ایک صفحہ نکالا، اور میرے حوالے کر دیا۔ بظاہر وہ اپنے آپ سے بہت خوش تھا: محنت بچانے والا ایک اور نظام الاوقات تیار تھا۔

میں نے اس کے کام کی تفصیل دیکھی؛ اس میں کوئی نئی بات نہیں تھی:

دس بجے ناشتا؛

لنچ کے وقت تک غور و خوض؛

لنچ کے بعد قیلولہ (ایک گھنٹا)، اس کے بعد کافی؛ سواری موجود ہو تو بستر میں جانا؛ بستر میں بانسری بجانا (ایک گھنٹا)؛

بستر سے اٹھنا، کمرے میں مارچ کرتے ہوئے بیگ پائپ (bagpipe) بجانا

(ایک گھنٹا)؛ مزید بیگ پائپ بجانا آنگن میں (آدھ گھنٹا)؛ اس کے بعد دو گھنٹے کا عرصہ آتا ہے جو ہر روز بیئر اور خون کی ساسیج کھانے میں صرف کرنا، اور ہر دوسرے دن فلم دیکھنا؛ ہر صورت میں، فلم سے پہلے یا بیئر پیتے وقت جرمنی کی غیر قانونی کمیونسٹ پارٹی کے لیے خفیہ پروپیگنڈا، آدھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے، ضرورت سے زیادہ ہرگز نہیں۔

ہفتے کی تین راتیں یونی کارن (Unicorn) میں رقص وسرود؛

سنیچر کے دن، بیئر اور پروپیگنڈا شام کو ہوگا، سہ پہر گرون اشترا سے' میں مالش اور غسل کے لیے مخصوص، جس کے بعد "U 9" میں لڑکی کے ساتھ صحت و صفائی (پون گھنٹا)؛ پھر اسی لڑکی اور اس کی دوست لڑکی کے ساتھ 'شواب' میں کیک اور کافی، شیو، اور اگر ضروری ہو تو حجام کے وقت سے ذرا پہلے بال کٹوانا؛ فوراً فوٹو مشین کی طرف جانا؛ پھر بیئر، خون کی ساسیج، پارٹی پروپیگنڈا، اور تفریح۔

میں نے کلاپ کے خصوصی طور پر تیار کیے گئے نظام الاوقات پر آفریں کہا، اس سے ایک نقل طلب کی، اور دریافت کیا کہ کسی اتفاقیہ وقفے کو استعمال کرنے کے لیے وہ کیا کرتا ہے۔ مختصر ترین غور کے بعد اس نے جواب دیا، "سونا یا پارٹی کے بارے میں سوچنا۔"

ظاہر ہے کہ اس نے آسکر کے نظام الاوقات کے پہلے تجربے کی طرف میری رہنمائی کر دی ہے۔

اس کی ابتدا بڑی معصومیت سے آنٹی کاؤر (Kauer) کے کنڈر گارٹن سے ہوئی تھی۔ ہیڈ ویگ برانسکی ہر صبح مجھے بلاتی، اور اسٹیفن کے ساتھ مجھے آنٹی کاؤر کی جگہ Posadowski-Weg میں لے جاتی، جہاں ہم چھ سے دس، دوسرے شریر بچوں کے ساتھ — چند بچے ہمیشہ بیمار ہوتے تھے — لگاتار کھیلنے پر مجبور کیے جاتے تھے۔ خوش قسمتی سے میرے نقارے کو کھلونے کا درجہ دے دیا گیا تھا، مجھ پر بلڈنگ بلاک سے کھیلنا واجب نہیں تھا، اور مجھے مجبوراً جھولنے والے گھوڑے پر سواری کرنی پڑتی تھی، صرف اس وقت تک، جب کاغذ کی ہلمٹ میں ایک شہ سوار نقارہ نواز کی ضرورت ہوتی تھی۔ میرے نقارے کا نشان آنٹی کاؤر کا بٹنوں سے بھرا ہوا غیر معمولی سیاہ ریشمی لباس ہوتا تھا۔ دن میں کئی بار میں

اپنے نقارے پر اس کے بٹن کھولتا، اور ایک بار لباس کھلتا تو دوبارہ بٹن بند کر دیے جاتے تھے۔ وہ جھریوں بھری چلد اور ہڈیوں کا ڈھانچا تھی۔ میں اس کے جسم کے بارے میں سوچتا بھی نہیں تھا۔ سہ پہر کی چہل قدمی ان راستوں پر ہوتی تھی جن پر شاہ بلوط کے درختوں کی قطار، گوٹن برگ (Gutenberg) یادگار سے ہوتی ہوئی، 'جیش کینغالز' کے جنگل تک لے جاتی تھی، اور وہ چہل قدمی 'اربس برگ' نامی پہاڑی تک، خوش گوار حد تک تکلیف دہ اور ملکوتی طور پر سادہ لوح ہوتی تھی، کہ آج بھی میں بخوشی ان کتابی تصویروں جیسے علاقے میں آنٹی کاٹز کے کاغذی ہاتھوں کی رہنمائی میں تفریح کے لیے جانا پسند کروں گا۔

سب سے پہلے ہم لوگوں کو چھ، آٹھ، یا بارہ، سب کو لگام جیسی ڈور سے باندھا جاتا تھا۔ ہر طرف گھنٹیاں باندھی جاتی تھیں۔ آنٹی کاٹز عنان سنبھالتی تھی، اور ہم دوڑتے، سرمستیاں کرتے، آپس میں اٹکھیلیاں کرتے جاتے تھے، اور میں دھیمے دھیمے نقارہ نوازی کرتا جاتا، اور ہم سب خزاں رسیدہ مضافاتی گلیوں میں ہوتے ہوئے جاتے تھے۔ کبھی کبھی آنٹی کاٹز بھی گاتی تھی:

"Jesus, for thee we live, Jesus, for thee we die" or

"Star of the Sea, I greet thee."

ہم اکتوبر کی سہانی فضا کو

"O Mary, help me" and "Swe-e-e-t Mother of God,"

سے بھر دیتے تھے۔ اور راستہ چلنے والے اس کو بہت رقت انگیز پاتے تھے۔ جب ہم شاہراہ پر آجاتے تو ہمارے لیے گاڑیاں رک جاتی تھیں۔ ٹرام، موٹر گاڑیاں، گھوڑا گاڑیاں، سب ساکت کھڑی ہو جاتی تھیں، اور ہم سڑک کے اس پار Star of the Sea لے جائے جاتے تھے۔ جب آنٹی کاٹز رہنمائی کرنے والے پولیس مین کو ہاتھ ہلا کر اشارے کرتی تو کاغذ جیسی کڑ کڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔

''ہمارے آقا، یسوع مسیح تمھیں اجر دیں گے'' آنٹی کاٹز اپنے ریشمی لباس کی سرسراہٹ کے ساتھ وعدہ کرتی تھی۔

دراصل، مجھے اس وقت بہت افسوس ہوا تھا، جب اپنے ساتویں برس کے موسم بہار

میں، اسٹیفن کی وجہ سے، آسکر کو فرولائن کارٹز اور اس کے بلّوں کو چھوڑنا پڑا تھا۔ اس کے پیچھے سیاست تھی، اور جہاں سیاست ہوتی ہے وہاں تشدد ہوتا ہے۔

ہم ابھی ہم 'ارس برگ' پہنچے ہی تھے کہ آنٹی کورٹز نے ہم سے بندھی اونی ڈوریاں ہٹا دیں؛ ہوا چلنے سے پتیاں رہ رہ کر چمک رہی تھیں اور پیڑوں کی چوٹیوں پر نئی زندگی لہرا رہی تھی۔ آنٹی کارٹز کائی زدہ راستے کے ایک نشان پر بیٹھ گئی جو اُن جگہوں کی طرف رہنمائی کر رہا تھا جن پر، ایک، ڈیڑھ یا دو گھنٹوں میں پا پیادہ چل کر پہنچا جا سکتا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی کی طرح جس کے اندر موسمِ بہار سے انجانے احساسات جاگ اٹھے ہوں، اس نے اپنے سر کی تشنجی حرکات کے ساتھ جھوم جھوم کر "ترا--لا--لا--" گانا شروع کر دیا؛ جس طرح کی حرکات ایک تجرباتی مرغی سے ہی کی جا سکتی ہے۔ اس دوران وہ ایک نیا اون کا بنڈل بھی بُنتی جا رہی تھی، جس کا رنگ سُرخ شعلے کے مانند ہوتا تھا۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ مجھے کبھی ڈوری سے باندھا نہیں گیا۔ عین اسی وقت، جوں ہی جھاڑیوں سے آتی رونے کی آواز سنائی دی، تو فرولائن کارٹز اچھل کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی اور، اپنے پیچھے اون کی ایک لکیر چھوڑتی ہوئی، اس طرح اُچھلتی ہوئی جھاڑیوں کی طرف دوڑی گویا اس کے پاؤں میں [بانس پر چلنے والے لوگوں کی طرح stilt لگے ہوئے ہوں۔ میں اس کے اور اون کی لکیر کے پیچھے پیچھے تھا، جو اتنی سُرخ نہیں تھی جتنی کہ جلد ہی میری نظروں میں سما گئی تھی۔ اسٹیفن کی ناک سے، تیزی سے، خون بہہ رہا تھا اور لوتھر نام کا ایک لڑکا، جس کے گھنگریالے بال تھے، اور کنپٹیوں پر مہین مہین نیلے رنگ کی رگیں ابھری ہوئی تھیں، اس چھوٹے سے بچے کے سینے پر گھٹنے کے بل ٹکا اس کی ناک پہ ٹکے لگا رہا تھا۔

"پولا...ک!" مکّوں کی مار کے دوران وہ نفرت سے چلّایا، "پولا...ک۔" اور جب پانچ منٹ بعد آنٹی کارٹز نے ہمیں ہلکے نیلے رنگ کی ڈور میں جکڑ دیا تھا، میں آزاد دوڑتا ہوا سُرخ رنگ کا اونی دھاگا سمیٹ رہا تھا، اور فرولائن کارٹز دعا کر رہی تھی، جیسی کہ محترم اجتماعات کے دوران کی جاتی ہے:

"Bowed with shame, full of pain and remorse..."

ہم 'ارس برگ' سے نیچے اتر رہے تھے، کہ 'گوٹس برگ' یادگار پہنچ کر رُکے۔
اسٹیفن کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے، جو اپنی ناک پر رومال رکھے روں روں کر
رہا، آنٹی نے زیرِ لب کہا: 'کیا کرے بے چارہ— وہ— ننھا سا— پولش بچہ ہی تو ہے—''
آنٹی کائز کے مشورے کے مطابق اسٹیفن کو کنڈر گارٹن سے نکال لیا گیا۔
حالاں کہ آسکر پولش نہیں تھا، نہ ہی وہ اسٹیفن کو پسند کرتا تھا، اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ
اگر اسٹیفن کنڈر گارٹن نہیں جا سکتا تو وہ بھی نہیں جائے گا۔ پھر ایسٹر کی چھٹیاں آگئیں اور
انھوں نے اسکول جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر ہولاٹز نے ہڈی جیسے فریم کے چشمے کے پیچھے
سے فیصلہ کیا کہ آسکر کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، اور اس نے یہ فیصلہ سنا بھی دیا۔
جان برانسکی، جو ایسٹر کے بعد اسٹیفن کو پولش پبلک اسکول بھیجنے کا منصوبہ بنا رہا
تھا، اپنے منصوبے سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ مما اور ماتسیرات دونوں کو بار بار
سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ پولینڈ کا سرکاری ملازم ہے، اس کو پولش ڈاک خانے
سے اچھی خاصی تنخواہ ملتی ہے۔ وہ بالآخر ایک پولش ہے اور جلد ہی ہیڈوگ بھی پولش بن
جائے گی، جب اس کے کاغذات تیار ہو کر آجائیں گے۔ اس کے علاوہ، اسٹیفن جیسا
ہونہار بچہ گھر پر جرمن زبان بھی سیکھ لے گا۔ جہاں تک آسکر کا سوال تھا— جان ایک آہ
سرد بھرتا تھا— جب بھی اس کی زبان پر ''آسکر'' آتا تھا— وہ اسٹیفن کی طرح چھ برس کا
تھا: سچ، کہ وہ اب بھی ٹھیک سے بول نہیں سکتا تھا: عام طور پر وہ، اپنی عمر کے اعتبار سے،
بہت پیچھے تھا، اور قد کے معاملے میں، جس پر بہت کچھ کہا جا چکا تھا: نگران کو ویسا ہی کرنا
چاہیے، اسکول میں جانا بہر حال ضروری تھا، بشرطے کہ اسکول کے بورڈ کو اعتراض نہ ہو۔
اسکول کے بورڈ نے اندیشوں کا اظہار کیا، اور ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ طلب کیا۔ ڈاکٹر
ہولاٹز کا کہنا تھا کہ میں صحت مند بچہ ہوں: وہ مانتا تھا کہ میری جسمانی نشو و نما تین برس
کے بچے جیسی ہے، اور یہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا، مگر اس کے علاوہ، میں ذہنی اعتبار سے ایک
عام پانچ یا چھ برس کے بچے کے مقابلے میں کمتر نہیں تھا۔ اس نے میرے تھائیرائیڈ کے
بارے میں بھی کچھ کہا تھا۔

میرے ہر طرح کے معائنے اور تجزیات ہو چکے تھے، مگر میں اس قسم کی چیزوں کا عادی ہو چکا تھا اور میرا رویہ خیر خواہی سے لاپروائی کے درمیان ہوتا تھا، خاص کر، اگر کوئی میرا نقارہ نہیں چھینتا تھا۔ہولائز کی مکروہات، سانپ، مینڈک اور جنین وغیرہ کا حشر سب کو اب بھی اچھی طرح یاد تھا۔

صرف اپنے گھر کے اندر مجھے اپنی آواز کے ہیرے کو نیام سے نکالنے کی اجازت تھی۔وہ میرا اسکول کا پہلا دن تھا جب ماتسیرات نے، اپنے بہتر فیصلے کے خلاف، مطالبہ کیا تھا کہ میں اپنا نقارہ گھر چھوڑ جاؤں اور اس کے بغیر ہی 'پیتالوتسی' اسکول کے پھاٹک کے اندر قدم رکھوں۔

جب، بالآخر، اس نے طاقت استعمال کی، اور وہ شے لینے کی کوشش کی جو اس کی ملکیت نہیں تھی، جسے وہ استعمال کرنا بھی نہیں جانتا تھا، نہ ہی اس کے دل میں اس کے بارے میں کسی قسم کا احساس تھا، میں نے ایک گلدان توڑا، بڑوں کے مطابق جو اصلی قسم کا تھا۔ جب اصلی قسم کا گلدان اصلی قسم کے ٹکڑوں کی صورت بکھرا پڑا تھا، ماتسیرات نے، جو اس کو بہت پسند کرتا تھا، مجھ کو مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا تھا، مگر اسی وقت مما بیچ میں کود پڑی اور جان نے، جو اسٹیفن اور ایک مبارک منقش سینگ (cornucopia) کے ساتھ، چند منٹ کے لیے گھر میں داخل ہوا تھا، بیچ بچاؤ کر دیا تھا۔

الفریڈ..... پلیز..... پلیز! اس نے اپنے مصنوعی رقت کے انداز میں کہا؛ اور ماتسیرات، نے جان اور مما کی ٹیڑھی نظر دیکھ کر اپنا ہاتھ نیچے کر کے اپنے پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا۔

'پیتالوتسی' اسکول سرخ اینٹوں کی، تین منزلہ، مسطح چھت والی، بکس جیسی عمارت میں واقع ہے، جس کی دیواروں اور چھتوں پر نقش و نگار بنائے گئے ہیں، اور جس کی تعمیر ہمارے زرخیز مضافات کی سینیٹ کے سوشل ڈیموکریٹ ارکان کے زوردار اصرار پر کی گئی تھی، جو اُس وقت بہت سرگرم تھے۔مجھے اس کا بکس جیسا انداز پسند آیا تھا، سوائے اس بو کے جو دیواروں اور چھتوں کے Jugendstil نقش و نگار سے آتی ہے۔

اس کے پھاٹک کے باہر کی حیرت انگیز وسعتوں میں کھڑے، چند پیڑ غیر فطری

طور پر اتنے کتاو گتے ہیں کہ ان کے سبز ہونے کی شروعات پر حیرانی ہوتی ہے؛ ان کو لوہے کے چھڑوں سے سہارا دیا گیا تھا جو مذہبی عصاؤں جیسے نظر آتے ہیں۔ وہاں، ہر طرف سے مائیں آتی ہیں جن کے ہاتھوں میں رنگین cornucopia اور نقش و نگار ہوتے ہیں، یا ان کے پیچھے ماڈل لڑکے ہوتے ہیں۔

آسکر نے اتنی ساری ماؤں کو ایک جگہ جمع ہوتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ سب کسی بازار کی طرف رواں معلوم ہوتی ہیں جہاں ان کے پہلوٹھی کے— یا دوسری بار— پیدا ہونے والے بچے فروخت کے لیے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

اسکول میں داخلے کی جگہ قدم رکھتے ہی مجھے اسکول کی اس خوش بو کا ایک جھونکا سا محسوس ہوا جس کا اکثر تذکرہ سن چکا تھا، اور جو دنیا کی کسی بھی خوش بو سے زیادہ آشنا محسوس ہوتی ہے۔ دالان میں سنگِ خارا کے چار یا پانچ بڑے بڑے پیالے، دھرے نظر آئے، جو بغیر کسی ترتیب کے ٹائل کے فرش میں گڑے ہوئے ہیں۔ ان کے اندر، گہرائی سے آنے والے کئی نلکوں سے اچھل اچھل کر ایک ساتھ پانی نکلتا ہے۔ لڑکوں کے حصار میں، جن میں کچھ میری عمر کے تھے، مجھے میرے انکل ونسنٹ کا 'بساؤ' میں بیج ڈالنا یاد آ گیا، جو ایک پہلو پر لیٹ جایا کرتا تھا اور ان ہی کے جیسے پیاسے اور بے قابو خنزیر کے بچوں کو برداشت کرتا تھا۔

اسکول کے لڑکے ان بڑے بڑے پیالوں کے گرم چشموں پر اس طرح جھک جاتے تھے کی ان کے بال آگے کی طرف گر جاتے اور نلکوں سے نکلتے فوارے کا پانی ان کے کھلے دہانوں میں تیزی سے داخل ہو جاتا تھا۔ مجھے معلوم نہیں وہ اس طرح کھیل کرتے تھے یا پانی پیا کرتے تھے۔ بسا اوقات، دولڑ کے گال پھلائے، تقریباً ایک ساتھ کھڑے ہو کر، کریہہ انداز میں غرارے کرتے، اور منہ میں گرم پانی کو، جس میں یقیناً لعاب دہن اور پاؤ روٹی کے ٹکڑے ملے ہوتے تھے، ایک دوسرے کے چہرے پر پچکاری کی طرح تھوک دیتے تھے۔ دالان میں داخل ہوتے ہی، غیر متوقع طور پر میری نظریں جمنازیم کے کھلے دروازے سے چمڑے سے بنے گھوڑے، اوپر چڑھنے والی سلاخوں، چڑھنے والی رسّی، اور ڈراؤنے افقی ڈنڈوں پر پڑیں، جو ہمیشہ ایک بڑے جھولے کو ترستا رہتا ہے۔ ان سارے

مناظر نے مجھے بے حد پیاسا کردیا، اور جی چاہا کہ دوسرے لڑکوں کی طرح میں بھی ایک گھونٹ پانی لے لوں۔ مگر میرے لیے مما سے کہنا، جو میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی، مشکل تھا کہ وہ لمحے بھر کو رک کر مجھے اُن میں سے ایک فوارے تک بلند کر دے۔ اگر میں اپنے نقارے پر بھی چڑھ کر کھڑا ہوتا تو بھی وہ فوارہ میری پہنچ سے دور ہوتا۔ مگر جب میں نے تیزی سے اچھل کر پیالے کے اندر ایک نظر ڈالی تو میں نے دیکھا کہ اس کے پیندے کی موری فاسد کیچڑ سے بھری ہوئی تھی، اور وہ پیاس، میں نے جس کو اپنی روح میں سنبھال لیا تھا، جب کہ مرا جسم جمنا سٹک کے ویرانے میں آوارہ پھر رہا تھا، اچانک غائب ہو گئی تھی۔

مما مجھے اس عظیم الشان سیڑھی پر لے گئی، جو دیوؤں کے لیے تراشی گئی تھی، اور گونجتی ہوئی غلام گردشوں میں سے ہوتے ہوئے ایک کمرے میں لے گئی، جس کے دروازے کے اوپر ایک بڑا سا سائن بورڈ لگا ہوا تھا جس پر A-I لکھا ہوا تھا۔ کمرہ میری عمر کے بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ ان کی مائیں کھڑکی کے سامنے بنی دیوار سے لگی، اپنے بازوؤں میں ٹشو پیپر سے ڈھکے رنگینcornucopias لیے ہوئے تھیں، جو پہلے دن کے اسکول کی روایت تھی۔ cornucopias میری قد سے بلند تھے۔ ماما بھی ایک لے آئی تھی۔

جوں ہی میری مما مجھے لے کر کمرے میں لے کر داخل ہوئی سارا مجمع ہنسنے لگا، ساتھ میں ان کی مائیں بھی ہنسنے لگیں۔ ایک چھوٹے سے، موٹے تازے لڑکے نے بڑھ کر میرے نقارے پر تھاپ لگانی چاہی۔ شیشہ شکنی سے پرہیز کرتے ہوئے، میں نے اس کی پنڈلی پر چند تگڑی ٹھوکریں جڑ دیں، جس کے باعث وہ گرا اور اس کا نفاست سے کنگھی کیا ہوا سر ایک میز سے ٹکرا گیا۔ اس جرم کی پاداش میں مما نے میرے سر کے پیچھے ایک دھپ لگائی۔ وہ ننھا عفریت دہاڑا۔ میں نہیں، میں تو اس وقت دہاڑتا ہوں جب کوئی میرا نقارہ چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ مما نے، جس کے لیے مجمعِ عام میں یہ عمل بہت شرمندگی کا باعث ہوا تھا، مجھے کھڑکی کے قریب رکھی کلاس کی پہلی میز کے پیچھے دھکیل دیا۔ ظاہر ہے کہ میز بہت اونچی تھی، مگر پیچھے بھی، جہاں کا انبوہ زیادہ بدنہاد اور بے ہنگم تھا، میزیں اس سے بھی زیادہ بلند تھیں۔

مجھ کو اکیلا چھوڑ دیا گیا، اور میں سکون سے بیٹھ گیا، اس لیے کہ وہاں بے سکون

ہونے کی اور کوئی وجہ نہیں تھی۔ مما نے، جو میرے خیال میں اب بھی شرمندگی کا شکار تھی، دوسری ماؤں کے درمیان غائب ہونے کی کوشش کی۔ یہاں اپنے ہم رُتبہ لوگوں کی موجودگی میں شاید اسے میری پس ماندگی کی وجہ سے شرمندگی ہوئی تھی۔ سارے ہم رُتبہ لوگوں کا برتاؤ ایسا تھا جیسے کہ ان کے غبی لڑکے، جو میرے ذوق کے مطابق زیادہ جلد ہی بڑے ہو گئے تھے، فخر کیے جانے کے لائق تھے۔

میں کھڑکی کے باہر، فروبیل مرغزار کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ کھڑکی کی دہلیز کی سطح بھی، میز کی طرح، میری قامت کے لیے مناسب نہیں تھی۔ لا حول ولا۔ مجھے خوشی ہوتی اگر میں سبزہ زار کی طرف دیکھ سکتا، جہاں، جیسا کہ مجھے علم تھا، گریف سبزی فروش کی سرکردگی میں، اسکاوٹ خیمے نصب کر رہے تھے، تاش کے پتوں سے lansquenet کھیل رہے تھے، اور جیسا کہ بوائے اسکاؤٹوں کو زیب دیتا ہے، اچھے اچھے کام کر رہے تھے۔ یہ نہیں، کہ مجھے ان کی کیمپ کی زندگی کی ناپسندیدہ حرکات کی ثنا خوانی میں دل چسپی ہے۔ جو چیز مجھے اچھی لگی ہے وہ گریف کا جانگھیہ پہنے گھومنے کا منظر ہے۔ اس کی دُبلے پتلے، بڑی بڑی آنکھوں اور پیلے رنگ والے لڑکوں میں دل چسپی ایسی تھی گویا اس نے بابائے بوائے اسکاوٹ، باڈن پاول (Baden-Powell) کی وردی زیب تن کر لی۔

اپنے پسندیدہ منظر کے بارے میں اس فرسی فنِ تعمیر سے چوٹ کھانے کے بعد، میں نے آسمان پر نظر کی اور فوراً ہی میرا دل خوش ہو گیا۔ ننھے ننھے بادل بن رہے تھے اور جنوب مغرب کی جانب اُڑے جا رہے تھے، گویا اس سمت بادلوں کے لیے کوئی خاص کشش تھی۔ میں نے اپنا نقارہ میز اور اپنے گھٹنوں کے درمیان جکڑ دیا، حالاں کہ اس نے کبھی جنوب مغرب کی جانب چلے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ آسکر کا سرگرسی کی ٹیک کے باعث پیچھے کی طرف سے محفوظ تھا۔ میرے پیچھے میرے نام نہاد ساتھی طلبہ، غراتے، دہاڑتے، ہنستے، روتے اور غصہ کرتے رہے۔ انھوں نے چبائے ہوئے کاغذ کے گولے بنا بنا کر میری جانب پھینکے، مگر میں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں؛ میں نے سوچا کہ منہ چڑانے اور بے مقصد مجنونانہ حرکت کرنے والے گنواروں کے جھنڈ کی طرف دیکھنے سے بہتر ہے کہ

میں پُرسکون، بامقصد اُڑنے والے بادلوں کا نظارہ کروں۔

کلاس I-A میں ایک شخص کے داخل ہوتے ہی سکوں ہو گیا، جس نے بعد میں مس اسپولس آور کے نام سے اپنا تعارف کرایا۔ مجھے پُرسکون ہونے کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے کہ میں پہلے ہی سے پُرسکون تھا۔ میں اس انتظار میں تھا کہ تمام چیزیں تقریباً مکمل خود استغراقی کی حالت میں آجائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آسکر مشکل سے ہی سوچتا تھا کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے، اس لیے کہ وہ اضطراب اور پریشانی نہیں چاہتا تھا۔ تو پھر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ انتظار نہیں کر رہا تھا، بلکہ محض اپنی میز پر بیٹھا ہوا تھا، خوش اور مطمئن تھا، کہ اس کا نظارہ وہیں تھا، جہاں اسے ہونا چاہیے تھا، اور وہ ایسٹر کی آمد کی خوشی میں صاف کیے ہوئے کھڑکی کے شیشوں کے اس پار بادلوں میں مصروف تھا۔

مس اسپولس آور ایک زاویائی قطع کا سوٹ پہنے ہوئے تھی جس سے اس کی شخصیت کسی سکھائے ہوئے مرد جیسی دکھائی دیتی تھی، اور یہ تاثر اس کے تنگ اور اکڑے ہوئے کالر کی وجہ سے بڑھ گیا تھا، ایسا، میرے خیال میں جسے پونچھ کر صاف کیا جا سکتا ہو، جو اس کے کنٹھ کے اطراف بند ہوتا تھا، جس کے نتیجے میں اس کی گردن کی جلد میں گہری لہریں سی بن جاتی تھیں۔ جوں ہی وہ اپنے بغیر ایڑی کے، چپل قدمی کرنے والے جوتے پہنے، کلاس روم میں داخل ہوئی، اس کو اپنے آپ کو ہر دلعزیز بنانے کا خیال آیا اور طلبہ سے پوچھا، ''اچھا! میرے پیارے بچو، کیا آج ہم ایک چھوٹا سا گانا گانے کے لیے تیار ہیں؟''

اس کا ردِ عمل ایک دہاڑ میں آیا، جس کا مطلب 'ہاں' رہا ہوگا، اس لیے کہ اس نے فوراً ہی نرم اور تیز آواز میں، ''یہ مئی کا ہے دلکش مہینہ'' گانا شروع کر دیا، حالاں کہ ابھی صرف اپریل کے درمیانی دن تھے۔ اس کا قبل از وقت مئی کا اعلان ہی قیامت ڈھانے کے لیے کافی تھا۔ کسی اشارے کے بغیر، مبہم ترین الفاظ میں دی جانے والی رائے کے بغیر، یا گانے کی سادہ سی تال کی پسندیدگی کے بغیر، میرے پیچھے کے غول کے غوغا اور دہاڑ سے دیواروں کا پلاسٹر لرزنے لگا تھا۔

اس کے زردی مائل رنگ کے باوجود، لٹکتے ہوئے بال اور مردانہ ٹائی کے باوجود،

جو اس کے تنگ کالر سے نکلی پڑتی تھی، مجھے اسپولس آور پر ترس آ رہا تھا۔ اپنے آپ کو بادلوں کے چنگل سے چھڑاتے ہوئے، بظاہر جنھیں، اس دن اسکول نہیں جانا تھا، میں اچھل کر کھڑا ہو گیا، اپنی گیلس کے نیچے سے کھینچ کر نقارہ بجانے والی چوب نقارہ نکالیں اور زور زور سے، نقارہ بجانا شروع کر دیا۔ مگر لوگ میری کوشش پر کان دھرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ صرف مس اسپولس آور نے سر کے اشارے سے میری ہمت بڑھائی، اور دیوار سے چپکی ماؤں کی طرف دیکھ کر مسکرائی، جس میں مما کے لیے ایک خاص ڈھنگ تھی۔

اسے جاری رکھنے کا اشارہ سمجھ کر، میں نے نقارہ نوازی جاری رکھی، پہلے تو آہستہ اور سادگی سے، اس کے بعد بحر اور تال کی میری ساری فن کاری بہار دکھانے لگی تھی۔ میرے پیچھے کا غول اپنی بڑبڑی دہاڑ روک چکا تھا۔ میں نے تصور کرنا شروع کر دیا تھا کہ میرا نقارہ میرے ساتھی طلبہ کو سکھا پڑھا رہا ہے، ان کو میرا شاگرد بنا رہا ہے؛ کہ اسپولس آور میری میز کی قریب آئی۔ تھوڑی دیر تک تو وہ میرے ہاتھوں اور میرے چوب نقارہ کو چلتا دیکھتی رہی۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ اس کا دیکھنے کا انداز ناموزوں تھا؛ وہ خود فراموشی کے انداز میں مسکرائی اور میرے نقارے کی تھاپ پر تالی بجانے کی کوشش کرنے لگی۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ بالکل ایک غیر ناپسندیدہ ملازمہ کی طرح لگی جو اپنا پیشہ ورانہ نقشہ بھول گئی ہو، اور بچوں جیسی، متجسس، پیچیدہ اور غیر اخلاقی انسان بن گئی ہو۔

بہر حال، وہ میری تال کے ساتھ چل نہیں سکی، اور اپنے عمومی سیدھے سادے، اور بھدے انداز میں واپس چلی گئی، اور اپنے کم اجرتی کردار کو مزید خراب کرنے کے ساتھ، خود کو استاد کے روپ میں واپس لا کر، جیسا کہ عام طور پر کہتے ہیں، آسکر سے مخاطب ہوئی، ''تم ضرور ننھے آسکر ہو گے!۔۔۔ ہم نے تمھارے بارے میں بہت سن رکھا ہے۔۔۔ تم کتنی خوب صورتی سے نقارہ بجاتے ہو!۔۔۔ ہے نا؟۔۔۔ بچو!۔۔۔ ہمارا آسکر۔۔۔ کتنا اچھا نقارہ نواز ہے۔۔۔!''

سارے بچے، ملی کروہاڑے، ان کی مائیں، بے ترتیبی سے یک جا ہوئیں، اور مس اسپولس آور ایک بار پھر اپنے آپے میں آ گئی۔ ''مگر اب'' ۔۔۔ اس نے پنسل بنانے والے شارپنر کی طرح سیٹی بجانے والے انداز میں منہ، چونچ سی بنا کر کہا، ''ہم نقارے کو

صندوق میں بند کردیں گے، بے چارہ بہت تھک گیا ہوگا، سونا چاہتا ہوگا۔ اور جب اسکول بند ہوگا، یہ تم کو واپس مل جائے گا۔"

قبل اس کے کہ وہ اپنی منافقانہ بکواس کو واپس لیتی، اس نے استانیوں کی طرح باقاعدگی سے کاٹے ہوئے ناخنوں والی انگلیاں نکالیں، اور دس باقاعدگی سے کاٹے ہوئے ناخنوں والی انگلیوں نے مل کر میرا نقارہ چھیننے کی کوشش کی، جو نہ تھکا ہوا تھا اور نہ سونا چاہتا تھا۔ سختی سے پکڑے ہوئے، میں نے سُرخ وسفید رنگ دھاریوں والے خول کو اپنے سوئیٹر کی آستینوں میں چھپے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ پہلے تو میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا، مگر جب وہ ایک پبلک اسکول کی نقلی جیسی استانی کی طرح دیکھتی رہی، میں نے اس پر ایک گہری نظر ڈالنا زیادہ پسند کیا۔ مس اسپولن آور کے اندرون میں مجھے، تین ناہموار باب کے لیے، خاصی دل چسپ چیزیں ملیں، مگر چوں کہ میرا نقارہ خطرے میں تھا، میں نے اس کی اندرونی زندگی سے جان چھڑائی اور، میری دیتی بہ ما جیسی آنکھوں نے اس کے دونوں شانوں کی بلیڈ جیسی ہڈیوں کے درمیان سوراخ کرتے ہوئے، اس کی بہترین انداز میں محفوظ کی ہوئی جلد پر، ولندیزی چاندی کے سکّے کے برابر، ایک مسّا دریافت کیا جس پر لمبے لمبے بالوں کا ایک گچھا سا اُگا ہوا تھا۔

میں کہہ نہیں سکتا تھا کہ ایسا اس لیے ہوا تھا کہ اس کو اپنے جسم کے پار دیکھے جانے کا احساس ہوگیا تھا؛ یا میری آواز کے باعث ہوا تھا، جس کے ذریعے میں نے اس کے چشمے کے دائیں عدسے پر ایک معصوم سی خراش ڈال دی تھی: بہرحال، اس نے طاقت کا مظاہرہ روک دیا تھا، جو اس کی بند مٹھی کو پہلے ہی زرد کر چکا تھا۔ غالباً ایسا ہوا تھا کہ وہ شیشے کی خراش برداشت نہیں کر سکی تھی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ تھرتھراہٹ کی ایک لہر کے ساتھ ہی اس نے میرا نقارہ چھوڑ دیا اور میری مما پر شکایت کی ایک نظر ڈالتے ہوئے، جو شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی، اعلان کیا، "کیوں، ننھے آسکر— تم اتنے شریر کیوں ہو؟" اس کے بعد اس نے میرے پوری طرح جاگتے ہوئے نقارے کو میرے ہاتھوں میں چھوڑ دیا، اور گھوم کر، بغیر ایڑی کا جوتا پہنے، مارچ کرتی ہوئی اپنی میز کی طرف چلی گئی،

جہاں پہنچ کر اس نے، اپنے بریف کیس سے اپنی دوسری عینک نکالی، جو شاید اس کی پڑھنے والی عینک تھی، تیزی سے اُس عینک کو اپنی ناک سے اتارا جس کو میری آواز خراش دے چکی تھی، اس طرح جیسے کوئی اپنے ناخنوں سے کھڑکی شیشے کو کھروچ دے، اور منہ بناتے ہوئے، جس کا مطلب تھا گویا میں نے اس کی عینک کی بے حرمتی کردی ہو، دوسرا چشمہ لگا لیا، اور پھر اس طرح انگڑائی لی کہ آپ اس کی ہڈیوں کے چٹخنے کی آواز سن لیں، اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے اعلان کیا، ''اب میں تمھارا نظام الاوقات پڑھنا شروع کرتی ہوں۔''

اس بار اس کے بریف کیس سے جو کچھ نکلا وہ کارڈ کا ایک بنڈل تھا۔ ان میں سے ایک کارڈ اپنے پاس رکھتے ہوئے، بقیہ کو، مما سمیت، ماؤں کے حوالے کردیا، اور بے چین کلاس کے سامنے نظام الاوقات کی تفصیل بیان کرنے لگی:

دوشنبہ: مذہب، لکھنے کی مشق، ریاضی، کھیل؛

منگل: ریاضی، قلم کاری، گانا، قدرت کا مطالعہ؛

بدھ: ریاضی، لکھنے کی مشق، ڈرائنگ، ڈرائنگ؛

جمعرات: جغرافیہ، ریاضی، لکھنے کی مشق، قلم کاری؛

سنیچر: ریاضی، گانا، کھیل، کھیل؛

سخت لہجے میں کیے جانے والے اس اعلان میں جس میں ذرہ برابر غفلت نہیں کی گئی تھی، اساتذہ میں ایک سنجیدہ میٹنگ کی پیداوار نے، جس کا ناقابلِ تمنیخ فیصلہ کردیا تھا، مگر پھر اس خیال سے جو اس نے ایک عام قسم کے اسکول میں سیکھا تھا، مس اسپولس آور کا لہجہ اچانک ہلکا اور ملائم ہوگیا۔ ''اور اب — میرے بچو!'' اس نے بڑھتی ہوئی خوش طبعی میں چیختے ہوئے کہا، ''آؤ — ہم سب — ایک ساتھ مل کر دہرائیں — اب: دوشنبہ!؟

پورا غول چیخا: ''دوشنبہ!''

''مذہب؟'' مجسمہ شدہ مشرکین کے غول نے دہاڑ کر کہا، ''مذہب'' بجائے اس کے کہ میں اپنی آواز پر قابو رکھتا، اپنے جانب سے میں نے یہ ارکان نقارے کے تھاپ میں ادا کیے۔

میرے پیچھے سے اسپولس آور نے لقمہ دیا، اور مشرکین دہاڑے، ''لکھنے کی مشق'': اور پھر —

بوم بوم — میرے نقارے نے ساتھ دیا، "اُرتھ —مے —ٹِک" یہ چار تھاپ میں ہوتا تو اچھا ہوتا۔

میرے سامنے اسپولس آور کی دعا، میرے پیچھے کا رونے چلانے والا مجمع؛ اس افسوس ناک اور بے مقصد کاروبار کو بہتر صورت دینے کے لیے، میں نے وہ الفاظ، معتدل انداز میں بجا دیے، اور یہ اس وقت تک چلتا رہا، جب اندر کے کسی شیطان نے اسپولس آور کو کچوکا لگایا اور وہ، قاتلِ حسن غضب میں اچھلی، مگر میرے پیچھے کے تاتاریوں پر نہیں: نہیں وہ دراصل میں تھا جس نے اس کے گالوں کو سرخ کر دیے تھے: آسکر کا چھوٹا سا بے چارہ نقارہ اس کی راہ کا پتھر، وجہِ نزاع بنا ہوا تھا: اور وہ میں ہی تھا جس کو سرزنش کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

"آسکر — اب ذرا غور سے سنو: جمعرات — جغرافیہ؟" جمعرات کے لفظ کو نظر انداز کرتے ہوئے، میں نے جغرافیہ کے لیے چار تھاپ لگائیں، چار تھاپ ریاضی کے لیے، اور دو تھاپ لکھنے کی مشق کے لیے؛ مذہب کے لیے چار تھاپ نہیں، مگر مستحکم دینیاتی اصولوں کے مطابق تین کی اکائی کی تین تھاپ۔

مگر، اسپولس آور اتنی چالاک نہیں تھی۔ اس کے نزدیک ساری نقارہ نوازی بھی بدذوقی تھی۔ ایک بار پھر، اپنے دس کٹے ہوئے ناخن والی انگلیاں نکالیں اور ان لوگوں نے ایک بار پھر میرا نقارہ چھیننے کی کوشش کی تھی۔

مگر قبل اس کے کہ وہ اس کو ہاتھ لگا سکتی، میں نے اپنی شیشہ شکن چیخ کو آزاد کر دیا، جس نے بڑی بڑی تین کھڑکیوں کے اوپری شیشے تباہ کر دیے۔ درمیانہ کھڑکیاں دوسری چیخ میں ڈھہ گئیں۔ کسی رکاوٹ کی غیر موجودگی نے موسمِ بہار کی ہلکی ہوا کلاس روم میں انڈیل دی تھی۔ اور تیسری چیخ سے میں نے نچلی کھڑکیوں کے شیشے ختم کر دیے، مگر مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ یہ غیر ضروری تھا، اور جیسا کہ کہا جاتا ہے، یہ خالص پُرجوشی تھی، اس لیے اسپولس آور نے اوپری اور درمیانی کھڑکی کے شیشوں کے لیے اپنے پنجے نکال لیے تھے۔ بقیہ کھڑکیوں کے شیشوں پر حملہ کرنے کے بجائے، فنی نقطۂ نگاہ، اور قاتلِ اعتراض عداوت کے مطابق، آسکر کی عقل مندی ہوتی کہ وہ اسپولس آور پر نظر رکھتا، اس لیے کہ اس نے ایک بے ترتیب پسپائی کو شکست دی تھی۔

خدا جانے اسے وہ بید کہاں سے مل گئی تھی۔ بس اچانک وہ اس کے ہاتھ آ گئی تھی، کلاس روم کی ہوا میں تھرتھراتی جس میں اب نسیم بہار شامل ہو گئی تھی۔ اگرچہ اس نغماتی آمیزے کے ذریعے اس نے چاہا تھا کہ چٹختی ہوئی بھوکی پیاسی جلد کے لیے، سیٹی بجاتی ہواؤں کے لیے، سرسراتے پردوں کے لیے اس کو کام کرنے کی قوت دے، جو ایک خواہش مند بید اختیار کر سکتی ہو۔ اور پھر وہ بید میری میز سے ٹکرائی، اس شدت سے کہ میری دوات سے بینگنی رنگ کی پھوار سے پھیل گئی۔ پھر جب مار سہنے کے لیے میں نے اپنے ہاتھ نہیں پھیلائے، تو اس نے میرے نقارے پر ضرب لگائی۔ اس نے میرے پیارے کو ضرب لگائی۔ اسپولس آور نے میرے آلۂ موسیقی کو ضرب لگائی تھی۔ کیا حق تھا اس کو ضرب لگانے کا؟ اور اگر وہ کسی شے کو ضرب لگانے پر تُلی ہوئی تھی، تو میرا نقارہ ہی کیوں؟ میرے پیچھے والے دہقانی کیوں نہیں؟ کیا میرے نقارے ہی کو نشانہ بنا تھا؟ کس حق سے اس نے، جس کو کچھ پتا ہی نہیں ایک نقارہ نواز کے فن کا، بالکل نہیں، میرے نقارے کو ضرب لگائی ہے؟ کون سی چمک تھی اس کی آنکھ میں؟ کون سا وحشی تھا، جو ضرب کے لیے تیار تھا؟ کس چڑیا گھر سے نکلا تھا وہ، کس ہوائے نفس کے لیے، کس شکار کے پیچھے تھا وہ؟ اسی قسم کا درندہ آسکر پر بھی حملہ آور ہو گیا تھا: وہ نادیدہ گہرائیوں سے اٹھا تھا، اپنے جوتوں کے تلے سے اٹھا تھا، اپنے پیروں کے تلے سے اٹھا تھا، اٹھا، اور اٹھتا چلا گیا، اپنے صوتی تانت (vocal chord) کو استعمال کرتا، اور اس کو شہوانی آواز نکالنے پر مجبور کیا، جو ایک پورے گوتھک گرجا گھر کو، اس کی سیکڑوں کھڑکیوں کو، منعکس کرنے والی روشنی سے روشن کرنے والے تمام شیشوں سے محروم کر سکتی تھی۔

میں نے، دوسرے لفظوں میں، دو چند چیخ ترتیب دے دی تھی، جس نے، لغوی معنوں میں، اسپولس آور کی عینک کے دونوں عدسوں کو سفوف میں تبدیل کر دیا تھا۔ ابرووں کے قریب خون کی معمولی سی ریزش کے ساتھ، چشمے کے خالی فریم سے کج نظری کرتی، وہ ٹٹولتی پیچھے ہٹی اور، بالآخر نفرت انگیزی سے، اس ضبطِ نفس کی کمی کے باعث جو ایک تعلیم دینے والی شخصیت میں ہوتی ہے، رونا شروع کر دیا تھا: جب کہ میرے عقب کے انبوہ پر دہشت انگیز خوف سے سناٹا طاری ہو گیا تھا اور ان میں سے کچھ اپنے بک بک کرنے

والے دانتوں سمیت بیٹھے رہے اور کچھ اپنی میزوں کے نیچے غائب ہو گئے۔ان میں سے کچھ ایک میز سے دوسری میز، اپنی ماؤں کے جانب، پھسلتے چلے گئے ۔ ان کی مائیں نقصانات کا اندازہ لگاتی ہوئی مجرم تلاش کرنے لگیں، اور میری ماں پر جھپٹنے ہی والی تھیں۔ وہ اس کو۔یقیناً ٹکڑے ٹکڑے کردیتیں، اگر میں اپنے نقارے کو سنبھالتے ہوئے اس کی مدد کو دوڑ نہیں پڑتا۔

نیم کور آنکھوں والی مس اسپولس آور کے پاس سے گزرتا ، میں اپنی ماں کی جانب بڑھا، جو غیض وغضب سے ڈری ہوئی تھی، میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کلاس I-A کے ٹھنڈے ہیڈ کوارٹر سے کھینچتا ہوا باہر لے گیا۔ گونجتی غلام گردشیں، دیو نما بچوں کے لیے پتھر سے بنے زینے۔اُبلتے ہوئے فواروں کے سنگِ خارا کے بڑے بڑے پیالوں کی نالیوں میں پھنسے ڈبل روٹیوں کے چھلکے۔کھلے ہوئے جمنازیم میں کسرت کے لیے لگے افقی ڈنڈے کے نیچے لرزتے ہوئے لڑکے۔مما اب بھی وہ چھوٹا سا کارڈ لیے ہوئے تھی۔ 'پیستالوتسی' اسکول کے برآمدے کے باہر، میں نے اس کے ہاتھ سے وہ کارڈ لے لیا، اور اس نظام الاوقات کو موڑتوڑ کر بے زبان کاغذ کی گولی میں تبدیل کر دیا۔

پھر بھی آسکر نے فوٹو گرافر کو اجازت دے دی تھی، جو برآمدے کے دو کھمبوں کے درمیان ، طالب علموں اور ان کی ماؤں کے انتظار میں تھے، اس کی اور اس کے cornucopia کی تصویر لینے کے لیے انتظار کر رہے تھے، جو تمام اتھل پتھل کے بعد بھی گم نہیں ہوا تھا ۔سورج نکل آیا تھا، اور اوپر کے کلاس روم میں چہل پہل تھی، اورفوٹو گرافر نے آسکر کو ایک تختۂ سیاہ کے برابر کھڑا کیا جس پر لکھا ہوا تھا:

'اسکول کا پہلا دن'

# راسپوتین اور حروفِ تہجی

تھوڑی دیر پہلے میں اپنے دوست کلپ اور اپنے نگہبان برونو کو بتا رہا تھا، جو آسکر کے پہلے تجربے کے بارے میں صرف آدھا کان لگا کر سن رہے تھے، جو ایک اسکول کے نظام الاوقات سے متعلق تھا۔ تختۂ سیاہ پر (جیسا کہ میں بتا چکا ہوں) جو سفری تھیلوں اور cornucopias سمیت چھ برس کے بچوں کے بارے میں روایتی پوسٹ کارڈ کی ناپ کی تصویروں کے بارے میں اطلاعات فراہم کر رہا تھا، یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے: "اسکول کا پہلا دن"۔

یہ الفاظ صرف مائیں ہی پڑھ سکتی تھیں جو، بچوں سے زیادہ پُر جوش ہو رہی تھیں، اور فوٹو گرافر کے پیچھے کھڑی تھیں۔ وہ بچے، جو تختۂ سیاہ کے آگے کھڑے تھے، ایک سال بعد کم از کم اس تحریر کے راز افشا کر سکیں گے، یا تو ایسٹر کے موقع پر جب اس کے بعد والے گریڈ کے لڑکے اسکول میں داخل ہوں گے یا ان کی تصویروں پر لکھے ہوں گے۔ تب اور صرف اسی وقت انھیں ان پیاری پیاری تصویروں کو پڑھنے کا استحقاق ہوگا جو اسکول میں ان کے پہلے دن کے موقعے پر لی گئی تھیں۔

ان کی نئی زندگی کا یہ صداقت نامہ سوٹرلن (Sütterlin) تحریر میں لکھا جاتا تھا جو بد اندیش زاویہ کاری سے پورے تختۂ سیاہ پر پھیل جاتا تھا۔ پھر بھی ان کے دائرے صحیح نہیں ہوتے تھے، بہت ملائم اور گول کیے گئے ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوٹرلن میں لکھے جانے والے بیانات اور نعرے بہت جامع اور متاثر کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور ان میں

کچھ دستاویزات بھی ہیں جنھیں، مجھے اعتراف ہے کہ میں نے دیکھا نہیں ہے، جن کا میں سوئرلس تحریر میں ہی تصور کر سکتا ہوں۔ اس وقت میرے ذہن میں ٹیکے کے سرٹیفکیٹ، کھیل کود کے scrolls، اور ہاتھ سے لکھے ہوئے وفات کے سرٹیفکیٹ آرہے ہیں۔ اس کے باوجود، گو میں انھیں پڑھ نہیں سکتا میں ان کا مطلب اخذ کر سکتا ہوں: سوئرلس کے حرفِ تہجی M کے دہرے حلقے، جس سے تحریر کی ابتدا کی گئی ہو، میرے نتھنوں کو اس ریشے دار پودے کی بو کی یاد دلاتے ہیں جس سے رسی بنائی جاتی ہے، جو پھانسی دینے والے آدمی کی یاد دلانے کا ایک خفیہ اشارہ ہوتا ہے۔ پھر بھی، میں اس کو حرف بہ حرف پڑھنا چاہتا تھا، صرف ہلکا سا مطلب اخذ کرنے کے لیے نہیں، کہ اس میں کیا کہا گیا ہے۔ کسی کو یہ قیاس نہیں کر لینا چاہیے کہ میں نے مس اسپولس آور سے پہلی ملاقات پر انقلابی احتجاج کے طور پر نقارہ بجایا تھا اور شیشہ شکنی کی تھی، اس لیے کہ میں نے اس کی الف، بے، جیم، دال سیکھ لی تھی۔ ارے نہیں! میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا یہ ادارہ سوئرلس تحریر کے بارے میں کافی نہیں تھا، کہ مجھ میں اسکول کی ابتدائی تعلیم کی کمی تھی۔ یہ محض بد قسمتی تھی کہ مس اسپولس آور کے علم کو دل نشین کرانے کے طریقے آسکر کو قائل نہیں کر سکے تھے۔

لہٰذا جب میں نے 'پیتالوتسی' اسکول چھوڑا تو میں فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اسکول کا میرا پہلا دن آخری دن بھی ہونا چاہیے، کہ میرے پاس، استانی کی گندی نظروں کے علاوہ، ڈھیروں پنسلیں اور کتابیں بھی تھیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اس وقت بھی، جب فوٹوگرافر میری شباہت کو ہمیشہ کے لیے اپنی تصویر میں بند کر رہا تھا، میں سوچ رہا تھا: تم ایک تختۂ سیاہ کے سامنے ہو، ایسی تحریر کے نیچے، جو غالباً اہم ہے اور شاید منحوس بھی۔ آپ اس نقش کو اس کے اندازِ تحریر سے سمجھ سکتے ہیں، اور ان تمام رفاقتوں کو یاد کر سکتے ہیں، جیسے کہ، قیدِ تنہائی، حفاظتی تحویل، انسپکٹر، اور سب -کو-ایک-رسی-سے-لٹکا-دو، مگر آپ حروف کو پڑھ نہیں سکتے۔ اور اس کے علاوہ، اپنی تمام تر لاعلمی کے باوجود جو بادلوں سے ڈھکی بہشت سے فریاد کرتی ہے، آپ کبھی اس اسکول/ نظام الاوقات میں قدم نہیں رکھ سکیں گے۔ کہاں؟ ارے، آسکر، تم اپنے بڑے اور چھوٹے حروف کہاں سے سیکھو گے؟

دراصل میرے لیے ایک چھوٹا سا حرف ہی کافی ہوتا، مگر مجھے احساس ہو گیا تھا کہ، چھوٹے حرف کی طرح کوئی بڑا حرف بھی ہوگا، دندان شکن اور نا قابلِ انکار وجود کے علاوہ بڑے لوگوں کا حرف، جو خود کو بالغ کہتے ہیں۔

اگلے چند ماہ نہ ماتسیرات نہ مما میری تعلیم کے بارے میں فکرمند ہوئی تھی۔انھوں نے مجھے اسکول بھیجنے کی کوشش کی تھی، جب کہ ان کے نزدیک، یہ پہلی کوشش ہی، جو مما کے لیے ذلت آمیز تھی، بہت کافی تھی۔ان کا رویہ بھی انکل جان کی طرح کا تھا، جب وہ مجھے پر نظر ڈالتا تو ٹھنڈی آہیں بھرتا، اور ساری پرانی کہانیاں نکالنے لگتا، جیسے کہ وہ واقعہ، جو میری تیسری سال گرہ پر ہوا تھا: ”تہہ خانے کا دروازہ! تم نے ہی کھلا چھوڑا تھا، ہے ناں؟ تم باورچی خانے میں تھے، اور اس سے پہلے تم تہہ خانے گئے تھے، ہے نا؟ تم میٹھے کے لیے ملے جلے پھلوں کا ایک ڈبا لائے تھے، ہے نا؟ تم نے تہہ خانے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا، ہے نا؟“

جتنا کچھ مما نے ماتسیرات کے سامنے پیش کیا تھا، سب سچ تھا، اس کے باوجود جیسا کہ ہم جانتے ہیں، یہ سچ نہیں تھا۔مگر اس نے سارا الزام اپنے سر لے لیا تھا، اور کبھی رویا بھی تھا، کہ وہ ہمیشہ کا حساس انسان تھا۔پھر مما اور جان یہ انسکی دلاسا دیتے، میرے بارے میں بات کرتے تھے۔آسکر، ایک صلیب کی طرح تھا جو انھیں برداشت کرنی تھی، ایک ظالمانہ، اور بلاشبہ، نا قابلِ تنسیخ تقدیر کی، ایک آزمائش جو اُن پر آ پڑی تھی، اور یہ معلوم کرنا ممکن نہیں تھا کہ ......کیوں؟

بظاہر ایسی شدت سے آزمائے، تقدیر کے شکار اور صلیب برداروں سے کسی مدد کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔نہ ہی آنٹی ہیڈوگ سے جو غالباً میری اتالیق رہی تھی، اکثر مجھے اسٹیفنس پارک لے جایا کرتی تھی، ریت کے ڈھیر میں دو برس کی مارگا کے ساتھ کھیلنے کے لیے۔اچھی عادتوں والی تھی وہ مگر ایک طویل دن کی طرح، ذہن سے عاری۔مجھے ڈاکٹر ہولاٹز کی نرس اِنگے کے خیالات بھی چھوڑ دینے پڑے تھے، وہ نہ غبی تھی اور نہ ذہن سے عاری، اس لیے کہ وہ عام قسم کی، دروازہ کھولنے والی نہیں، بلکہ، حقیقی اور ایک ڈاکٹر کی ایک ناگزیر معاون تھی، لہٰذا اس کے پاس میرے لیے وقت نہیں تھا۔

اس چار منزلہ عمارت میں، جس میں فلیٹ بنے ہوئے تھے، اس علاقے میں ایسی سیکڑوں عمارتیں تھیں اور میں ہر منزل پر کسی مشورے کی امید میں، دھم دھم کرتا سیڑھیاں چڑھتا اُترتا تھا۔ سوگھ کر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ تمام اُنیس کرایہ دار آج رات ڈنر پر کیا کھانے والے ہیں، مگر میں کبھی کسی کے دروازے پر دستک نہیں دیتا تھا، اس لیے کہ میں مستقبل کے لیے میرا اتالیق، نہ بوڑھا بائی لانڈ ہونے والا تھا، نہ گھڑی ساز لاوبشاد، جیسم مسز کاٹر تو ہرگز نہیں، اور نہ مدر ٹروژنسکی، حالاں کہ میں اس کو بہت پسند کرتا تھا۔

اولتی کے نیچے بگل بجانے والا مین (Meyn) رہتا ہے۔مسٹر مین چار بلّیاں پالے ہوئے ہے اور ہمیشہ نشے میں رہتا ہے۔ اس نے "Zinglers Höhe" میں اور شبِ کرسمس موسیقی بجائی تھی؛ وہ اور پانچ پرانے شرابی برف سے ڈھکی سڑک پر پریڈ کرتے ہوئے کرسمس کے گیت گاتے برف سے لڑ رہے تھے۔ایک دن میں نے اس کو اپنی دوچھتی میں دیکھا تھا: سیاہ رنگ کی پتلون اور سفید رنگ کی، شام میں پہنی جانے والی قمیص میں ملبوس، چت لیٹا، اپنے ننگے پاؤں سے جن کی ایک خالی بوتل کو، بے مقصد، اِدھر سے اُدھر لڑھکا رہا تھا، ساتھ ہی حیرت انگیز طور پر بگل بجاتا جارہا تھا۔ اس نے باجا اپنے لبوں سے ہٹایا نہیں، بس ایک لمحے کے لیے مجھ پر یوں ہی ترچھی سی نظر ڈالی تھی۔وہ مجھے ساتھی نقارہ نواز مانتا ہے۔

اس کا باجا اس کے لیے اتنا قیمتی نہیں جتنا کہ میرا نقارہ میرے لیے ہے۔ ہمارے 'دوساز نغمے نے اس کی چار بلّیوں کو چھت پر بھگا دیا تھا، اور گٹر کے ناکوں میں لرزہ پیدا کردیا تھا۔ جب موسیقی ختم ہوئی اور ہم دونوں نے اپنے اپنے باجے نیچے کیے، تو میں نے اپنے سویٹر کے اندر سے Neueste Nachrichten [تازہ خبریں] کا ایک پرانا صفحہ نکالا، کاغذ کو سیدھا کیا، بگل نواز کے پہلو میں بیٹھ گیا، پڑھنے کا مواد آگے بڑھایا، اور اس سے کہا کہ وہ مجھے بڑے اور چھوٹے حروف کے بارے میں کچھ بتائے۔

مگر مسٹر مین بگل نوازی ختم ہوتے ہی گہری نیند کی وادی میں چلا گیا تھا۔اس کی روح صرف تین ظروف کی قائل تھی: اس کی جن کی بوتل، اس کا بگل اور اس کا بستر۔یہ سچ ہے کہ اس کے کافی دیر بعد بھی — جب تک کہ وہ باقاعدہ Mounted SA کا میں بینڈ میں

شامل نہیں ہو گیا تھا، اور عارضی طور پر جن نوشی سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر لی تھی — ہم دونوں اکثر و بیشتر، دو چھتی میں بیٹھ کر، چھت کی ناکوں، چمنیوں، کبوتروں اور بلیوں کی خاطر، بغیر کسی تیاری کے، 'دو ساز' نغمے بجاتے تھے، مگر ایک استاد کے حیثیت میں، اس سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہو سکا تھا۔

میں نے گریف سبزی فروش کو بھی آزمایا۔ میرے نقارے کے بغیر گریف نے مجھے پسند نہیں کیا تھا۔ میں اکثر تہہ خانے کی دُکان میں جایا کرتا تھا، جو ہمارے راستے میں پڑتی تھی، ہر پہلو سے باقاعدہ مطالعے کے لیے، جو ہمارا ضروری سرمایہ تھی۔ دو کمروں کے فلیٹ میں، پوری دُکان میں، ہر طرف، کاؤنٹر کے پیچھے، حتیٰ کہ خشک آلو کے تہہ خانے میں کتابیں بکھری پڑی تھیں: مہمات کی کہانیاں، گانے کی کتابیں، Der Cherubinische Wandersmann، والٹر فلیکس کی تخلیقات، Wiechert کی Simple Life، Daphnis اور Chloe، فن کاروں کے مونوگراف، ڈھیروں رسالے، اور تصویری جلدیں، نیم عریاں جوانوں کی، جن میں زیادہ تر، ناقابلِ یقین وجوہ کی بنا پر، ریت کے ٹیلوں کے درمیان، اپنے چکنے جسم کی نمائش کرتے ہوئے، ایک گیند کا پیچھا کر رہی تھیں۔

اس کے باوجود اپنی دُکان میں گریف کو بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ ناپ تول کے محکمے کے انسپکٹر اس کے باٹوں سے مطمئن نہیں تھے۔ جعل سازی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ گریف کو جرمانہ دینا پڑا تھا، اور نئے باٹ خریدنے تھے۔ وہ فرائض کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا؛ اس کی کتابیں، اسکاؤٹ میٹنگ، اور ہفتے وار تفریحات ہی بہلانے کا ذریعہ ہوتی تھیں۔

جب میں پہنچا تو وہ قیمتوں کے کارڈ بنا رہا تھا، اور شاید ہی مجھے دیکھا ہو۔ اس کی مصروفیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، میں نے بھی دفتی کے تین چار ٹکڑے اٹھائے، ایک سُرخ پنسل اٹھائی، اس امید میں کہ میرے طرف اس کی توجہ مبذول ہو گی، اور بڑی تن دہی سے، اپنے سوترلن طرزِ تحریر میں اس کے کام کی نقل بنانے لگا۔

مگر اس کے نزدیک آسکر بہت چھوٹا تھا۔ میں نے سُرخ پنسل پھینک دی، اور عریانی سے بھرا ایک رسالہ اٹھا لیا، گریف جس کو بہت پسند کرتا تھا، اور خود کو بہت مصروف

ظاہر کرنے لگا، لڑکیوں کی جھلکیے، انگڑائی لینے کی تصویریں دیکھنے میں، اور میں صفحات کو اس طرح موڑ رہا تھا تا کہ وہ دیکھ لے کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔

مگر اس کی دُکان میں چقندر یا بند گوبھی طلب کرنے والے گاہک نہیں تھے، اور سبزی فروش قیمت کے کارڈ بنانے میں منہمک تھا۔ میں کتابوں کی جلد پر ہاتھ مار کر، صفحات کو کڑ کڑا کر موڑتے ہوئے اسے اپنی غیر متوقع موجودگی کا احساس دلانا چاہ رہا تھا۔

اگر سادہ لفظوں میں کہا جائے تو، گریف مجھ کو سمجھ نہیں سکا ہے۔ جب اسکاوٹ دُکان میں تھے— سہ پہر کے وقت اس کے دو چار مددگار وہاں ضرور موجود ہوتے تھے— گریف نے آسکر کو نہیں دیکھا تھا۔ اور جب گریف اکیلا ہو گیا تو اعصابی اشتعال میں اچھل کود کرنے کے قابل ہو گیا اور احکامات جاری کرنے لگا: "آسکر، اس کتاب کو رکھ دو، تم اس کو سمجھ ہی نہیں سکو گے۔ تم ابھی کم عقل ہو۔ بہت چھوٹے ہو۔ تم اس کو برباد کر دو گے۔ یہ کتاب سولہ گلڈن سے زیادہ قیمت کی ہے۔ اگر تمھیں کھیلنا ہی ہے تو یہاں بہت سارے ٹماٹر اور کرم کلے ہیں۔ اور یہ سب کہہ اس نے اپنی نفیس کتاب میرے ہاتھ سے لے لی، اور چہرے پر کسی تاثر کے بغیر اس کی ورق گردانی کرنے لگا، اور مجھے آلوؤں، اور کرم کلے خاندان کی کئی ترکاریوں سفید کرم کلوں، سرخ کرم کلو ں، savoy کرم کلوں، برسلز اسپراؤٹوں ، kohlrabi، کے درمیان تنہا چھوڑ دیا، اس لیے کہ میں اپنا نقارہ گھر چھوڑ آیا تھا۔

وہاں مسز گریف بھی موجود تھی۔ اور اپنے شوہر کی جھڑک کے بعد حسبِ معمول اس نے تجلۂ ازدواج کی راہ لی۔ اس کے باوجود، مسز لینا گریف ہفتوں اپنے بستر میں لیٹی رہتی، مبہم انداز میں بیمار، اس کے گندے نائٹ گاؤن سے بو آتی، اور حالاں کہ اس کے ہاتھ بہت باعمل رہتے تھے، ایک چیز تھی جسے وہ کبھی ہاتھ نہیں لگاتی تھی، وہ کتاب تھی جو مجھے بہت کچھ سکھا سکتی تھی۔

یہ کسی رشک کے شبہے کی وجہ سے نہیں تھا کہ آسکر، آنے والے ہفتوں میں، اپنے ہم عصروں اور ان کے بستوں پر نظریں ڈالتا تھا، جن سے کوئی نہ کوئی اسفنج یا سلیٹ صاف کرنے والا کپڑا ضرور لٹکا ہوتا تھا۔

اس کے باوجود، اس کو یاد نہیں کہ اس کے دل میں کبھی اس قسم کے خیالات آئے ہوں گے: آسکر، تم نے اپنا بستر خود بچھایا ہے؟ تم کو اسکول کے معمولات خوش دلی سے قبول کرنے چاہئیں: تم کو اسپولن آور سے طویل عرصے کی دشمنی نہیں لینی چاہیے تھی۔ وہ دیہاتی تم سے آگے بڑھ رہے ہیں۔انھوں نے بڑے یا کم از کم چھوٹے حرف تہجی پر قدرت حاصل کر لی ہے، جب کہ تمھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ Neueste Nachrichte رسالے کو قرینے سے کس طرح تھاما جاتا ہے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اسے بس رشک کا شبہ تھا، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ بس ایک معمولی سی بو کی جانچ چاہیے تھی ،اسکول سے ہمیشہ کے لیے نفرت دلانے کے لیے۔کیا آپ نے کبھی سونگھا ہے ان ناکافی طور پر دھلے ،کپڑوں کے کاٹے ہوئے، پیلے رنگ کے کناروں والی سلیٹوں سے منسلک اسفنجوں کو جو کسی طرح تمام تحریروں اور ریاضی کی بدبو دار ہوا کو اپنے اندر جمع کر لیتے ہیں: آواز کرنے والی، روکنے والی، پھسلنے والی سلیٹ کی پنسلوں کو، جنھیں لعاب دہن سے نم رکھا جاتا ہے؟ اکثر و بیشتر، جب لڑکوں نے اسکول سے گھر جاتے ہوئے فٹ بال یا وولکر بال کھیلنے کے لیے اپنے بستے ڈال دیے ہوں، اور میں سورج کی کرنوں میں پڑے ان اسفنجوں پر جھکا ہوں تو میرے ذہن میں خیال آیا ہے کہ اگر واقعی شیطان ہوتا تو اس کے بغلوں کی بو اتنی ہی تیز و تلخ ہوتی۔

یقینی طور پر میرے دل میں سلیٹوں اور اسفنجوں والے گندے اسکولوں کی کبھی آرزو نہیں رہی ہے، مگر اس کے برعکس، یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ گریچن شیفلر جس نے فوراً ہی میری تعلیم کی ذمے داری اپنے ہاتھوں میں لے لی تھی، صحیح معنوں میں آسکر کے خوابوں کا جواب تھی۔

'کلائن ہیمر ویگ' نامی گلی میں، بیکری کے پیچھے والی شیفلر کی قیام گاہ کی ہر شے مجھے کچھ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے سارے اس گھر کا کچھ بیاں ہو جائے ۔وہ آرائشی پلنگ پوش، نشانِ امارت سے مزین وہ گدے، صوفے کے کونوں سے جھانکتی ہوئی Kathe Kruse کی گڑیاں، نجانے کہاں کے بنے ہوئے وہ روئیں دار جانور، بلیوں کو پکارتے ہوئے وہ چینی کے ظروف، وہ ہر جگہ موجود سفری تحائف، وہ بُنائی اور کروشیائی بُنت ، اور وہ چنٹ کاری،

گرہ کاری اور دھاگے کے کام کی کشیدہ کاری! ایسی جگہ تھی وہ قیام گاہ، جس کی تعریف نہ ہو سکے، اتنی نفیس اور اتنی فرحت بخش، دم گھونٹنے کی حد تک مختصر، سردی کے موسم میں ضرورت سے زیادہ گرم، اور گرمی کے دنوں میں پھولوں سے زہر آلودہ۔ میرے ذہن میں [ان سب نفاستوں اور قیمتی اشیا کی] صرف ایک ہی تشریح آتی ہے: گرتچن شیفلر لاولد تھی: کاش، اسے کچھ بُنائی کڑھائی کرنی ہوتی، تو کون اس کو الزام دے سکتا تھا؛ وہ کتنی خوش وخُرم ہوتی اگر اس کے ایک ننھا سا چینی ہوا جیسا کچھ ہوتا، ایسی کچھ شے ہوتی جسے، کروشیا سے بُنی جھالروں اور رِبن لگے کمبلوں کے غلاف میں، اسے سنبھالنا پڑتا۔

یہ تھی وہ جگہ جہاں میں بڑے حروف تہجی سیکھنے گیا تھا۔ میں نے چینی کے ظروف اور تحائف کو بچانے کی بہادرانہ کوشش کی تھی۔ میں اپنی شیشہ شکن آواز کو اپنے گھر چھوڑ آیا تھا، اور مسکین صورت بنائے بیٹھا تھا، جب گرتچن نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کافی نقارہ نوازی کر چکا ہوں، اور اپنے سونے کے دانت دکھاتے ہوئے اس نے، نقارے کو میری گود سے اٹھایا اور ٹیڈی بیئروں کے درمیان رکھ دیا تھا۔

میں نے Käthe Kruse کی بنی دوعدد گڑیوں سے دوستی کر لی تھی، ان چھوٹی چھوٹی پیاری گڑیوں کو اپنے سینے سے لگا لیا، اور ان کی ہمیشہ حیرت میں کھلی آنکھوں کی پلکوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا تھا، اس طرح جیسے میں انھیں بے حد پیار کرتا ہوں۔ گڑیوں سے محبت کا اظہار کرنے سے میری مراد، جو سنجیدہ محسوس ہوگی، اس لیے تھی کہ وہ مکمل طور پر جھوٹی تھی، اور مجھے گرتچن کے دِل کے، گروزردوزی کے تاروں کے پھندے بننے تھے۔

میرا منصوبہ ناقص نہیں تھا۔ صرف دوبار جانے سے ہی گرتچن نے میرے لیے اپنے دل کا دروازہ کھول دیا تھا؛ یعنی اس طرح جیسے کوئی اپنی جراب کھول دے، جس کا ایک لمبا سا شکن آلود دھاگا رگڑ کھا کھا کر جگہ جگہ سے گھس گیا ہو۔ اس نے اپنی تمام الماریاں، تمام صندوق، اور سارے بکسے کھول دیے تھے اور اپنی گول دانوں والی ساری فضولیات ہر طرف پھیلا دی تھیں؛ بچوں کی بہت ساری جیکیٹیں تھیں، بچوں کے پتلون تھے، اور شیرخوار بچوں کے گلے میں باندھنے والی رال گدیاں تھیں؛ یہ سب ایک ساتھ پیدا

ہونے والے پانچ بچوں کے لیے کافی ہوتیں۔اس نے ان کو میرے بدن سے لگا کر دیکھا، مجھے پہنایا اور پھر اُتار کر رکھ دیا تھا۔

پھر اس نے نشانہ بازی کے تمغے، جو شیفلر نے آزمودہ کاروں کے کلب میں جیتے تھے، اور ان سے متعلق تصویریں دکھائیں، جن میں کچھ ہماری جیسی تھیں۔پھر وہ دوبارہ بچوں کے کپڑوں کی طرف متوجہ ہوئی؛ وہ نجانے کون سی لبھانے والی چیز تلاش کر رہی تھی، کہ بالآخر اس کے ہاتھ کچھ کتابیں آ گئیں۔ یہی وہ چیز تھی آسکر جس کی تلاش میں تھا۔ اسے پوری توقع تھی کہ اسے بچوں کی ان چیزوں میں کتابیں ملیں گی؛ اس نے گریچن کو مما سے کتابوں کے بارے میں باتیں کرتے سنا تھا؛ وہ جانتا تھا کہ کس بے چینی سے، ایسی ہم جولیوں کی طرح جن کی تقریباً ایک ساتھ ہی شادی ہوئی ہو، وہ آپس میں کتابوں کا تبادلہ کیا کرتی تھیں، اور فلم دکھانے والے سینما کے قریب واقع کتابیں ادھار دینے والے کتب خانوں سے کتابیں ادھار لیا کرتی تھی، اس امید میں کہ ان کے مطالعے سے ان کے آفاق روشن ہوں گے، اور اس کی کریانے کی دُکان اور بیکری، یک جا، زیادہ کامیاب ہوں گی۔

گریچن کے پاس، مجھے دینے کے لیے بہت کچھ تھا۔مما کی طرح، جس نے جان برانسکی کی خاطر پڑھنا چھوڑ دیا تھا، یہ بھی پڑھتی نہیں تھی، اور اب تو وہ اپنا سارا وقت بُنائی کڑھائی میں صرف کرتی تھی، اور اس نے اپنی بیش قیمت کتابوں کے ڈھیر کتابوں کے کلب کو دے دیے تھے، برسوں سے وہ دونوں جس سے متعلق تھیں، اُن لوگوں کے لیے جو اَب بھی پڑھتے تھے، اس لیے کہ وہ بنائی نہیں کرتے تھے کہ ان کے پاس جان برانسکی نہیں تھا۔

خراب کتابیں بھی کتابیں ہی ہوتی ہیں، اس لیے مقدس ہوتی ہیں۔وہاں مجھے جو کچھ ملا تھا اس کو متفرق ہی کہا جا سکتا ہے؛ بلاشبہ ان میں سے زیادہ تر گریچن کے بھائی تھیو کی کتابوں کے صندوق سے آئی تھیں جو Dogger-Bank پر ایک ملاح کی موت مرا تھا۔ Köhler کے بحری کیلنڈروں کی سات یا آٹھ جلدیں، (مُنتخب) جہاز جو زمانہ ہوئے غرق ہو چکے تھے، شاہی بحریہ کے بحری ہیرو پال بینے کے (Paul Beneke) کے خدماتی پلّے (نشانات)— یہ سب شاید ہی گریچن کے دل کی ٹھنڈک کا باعث ہوئے ہوں گے، اس

نے جس کی ہمیشہ آرزو کی تھی۔ ایرک کیزر کی A History of the City of Danzig اور A Struggle for Rome جو فیلکس ڈان نامی ایک شخص نے Totila اور Teja، Belisarius اور Narses کی مدد سے لڑی تھیں؛ یہ سب ایسی حالت میں اس کے ہاتھ آئی تھیں جو اس کے ملاح بھائی کے ہاتھوں میں بری کیفیت میں ہوتی تھیں۔ ان میں، گریچن کی DebitCredit کے بارے میں گستاف فریتاگ کی ایک کتاب، اور گوئٹے کی Elective Affinities، اور ایک بڑی بھاری تصویروں بھری کتاب Rasputin and Women بھی شامل تھی۔

ایک طویل تذبذب کے بعد میں نے پہلے راسپوتین، اور اس کے بعد گوئٹے کی کتابیں اٹھائیں۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ میں کیا اٹھا رہا ہوں؛ اس وقت میں صرف اپنے اندروں کی آواز پر عمل کر رہا تھا۔ ان دونوں کتابوں کی متضاد ہم آہنگی میری پوری زندگی کی تشکیل کرنے میں اس پر اثر انداز ہونے والی تھی، کم از کم وہ زندگی، نقارے کے علاوہ، جو میں نے گزارنے کی کوشش کی ہے۔ آج بھی — اور اب بھی کہ آسکر رفتہ رفتہ اسپتال کا پورا کتب خانہ چھان چکا ہے — میں شکر اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر انگلیاں چٹخاتا ہوں اور راسپوتین اور گوئٹے کے درمیان، تعویذ گنڈے کرنے والے اور روشن خیال آدمی کے درمیان، بدروح کی جادو کی ہوئی عورتوں اور روشن شاعر شہزادے کے درمیان، جو عورتوں کے کیے ہوئے جادو کا بڑا شیدائی تھا، ڈگمگاتا رہتا ہوں۔ اگر کسی وقت میں راسپوتین کی طرف زیادہ جھکا ہوں، اور گوئٹے کی عدم برداشت سے خوف زدہ ہوا ہوں، تو یہ ایک ہلکے سے شبہے کی بنا پر تھا کہ اگر تم، آسکر، اُس وقت زندہ ہوتے اور نقارہ نوازی کر رہے ہوتے تو گوئٹے تم کو غیر فطری تجسیم سمجھ کر رد کر دیتا، کہ خود اپنی قیمتی فطرت کو منتقل کرتے ہوئے — جس کی تم نے ہمیشہ تعریف کی ہے، اور حصول کی کوشش کی ہے، اس وقت بھی جب وہ اسے مصنوعی شان و شوکت سے پیش کرتا ہے — اس نے تم بیچارے، آسکر، پر توجہ کی ہوتی، اور تمھارے سر پر "فاوسٹ" کو، اپنی ایک وزنی تخلیق Theory of Colors کو، دے مارا ہوتا۔

مگر اب ہم راسپوتین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ گریچن کی مدد سے اس نے مجھے بڑے حروف تہجی سے آشنا کیا ہے، عورتوں پر توجہ دینا سکھایا ہے، اور مجھے اس وقت تسلی

دیتا تھا جب گوئٹے میرے احساسات کو ٹھیس لگاتا تھا۔

احمق بنے رہتے ہوئے پڑھنا سیکھنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ تو سوتے میں پیشاب کرنے کی نقل کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا، جو میں کئی برس کرتا رہا تھا۔ بہرحال، اپنا بستر گیلا کرنے میں مجھے ہر صبح ایک خرابی کا صرف مادی ثبوت پیش کرنا ہوتا تھا، اول تو جس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر احمق بنے رہنے کا مطلب ہوتا تھا اپنی تیز ترقی کو چھپانا، اور اپنے نوخیز شعور کے ذریعے ایک مسلسل جہد کو جاری رکھنا۔ اگر بالغ لوگ مجھے سوتے میں پیشاب کرنے والا گردانا چاہتے تو میں اسے اپنے اندرون میں اپنے کندھے اچکا کر قبول کر سکتا تھا، مگر یہ جو مجھے سال بہ سال اناڑی بنے رہنا پڑتا تھا، آسکر، اور اس کے استاد کے لیے بھی برہمی کا باعث ہوتا تھا۔

عین اس وقت جب میں نے بچکانہ کپڑوں میں سے کتابیں اٹھائی تھیں، گریچن خوشی سے چیخ پڑی؛ اسے احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ ایک استانی بننے والی ہے۔ میں ایک بے چاری بے اولاد عورت کو، اس کے اون کے گولوں سے نجات دلا کر، تقریباً خوش کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دراصل وہ اس بات کو پسند کرتی کہ میں اس کو Credit Debit والی کتاب پڑھانے والی کے طور پر منتخب کر لیتا، مگر میں نے راسپوتین پر اصرار کیا، اور راسپوتین ہی کا مطالبہ کیا تھا، جب اس نے دوسرے سبق کے لیے ایک ابتدائی کتاب پیش کی تھی، اور بالآخر، میں نے بولنے کا فیصلہ کر ہی لیا، جب وہ بار بار مجھے Dwarf Longnose اور Tom Thumb جیسی فرضی کہانیاں پیش کرنے لگی تھی۔

''راسپوتین!'' میں چلاتا، یا کبھی ''راشوتین'' کہتا۔ آسکر تو ''راشو...... راشو'' پر اٹک کر رہ گیا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ میں صاف طور پر بیان کر دوں کہ میں کیا پڑھنا چاہتا ہوں، مگر میں ساتھ ہی، اسے اپنے ہوش مند جینئس سے لاعلم بھی رکھنا چاہتا تھا۔

میں تیزی سے سیکھ رہا تھا۔ ایک برس بعد ایسا محسوس ہونے لگا تھا، گویا میں سینٹ پیٹرز برگ میں، تمام روس کے زار کے دولت خانے میں مقیم ہوں، بیمار Tsarevich کے بچہ خانے میں ہوں، سازشیوں، مختلف کلیساؤں کے پوپ کے درمیان گھرا، راسپوتین کی

رنگ رلیوں کا چشم دید گواہ ہوں۔یہاں کا ماحول مجھے اچھا لگا تھا؛ میں نے جلد ہی دیکھ لیا تھا کہ یہاں ایک غالب شخصیت تھی۔کتنی غالب تھی، یہ کتاب میں بکھرے عصری نقوش سے ظاہر ہوتا تھا، جس میں ڈاڑھی والا، کوئلے جیسی آنکھوں والا راسپوتین، صرف سیاہ موزے—— اور کچھ نہیں—— پہنے خواتین کے جھرمٹ میں نظر آتا تھا۔اس کی موت نے مجھ پر گہرا اثر کیا تھا: انھوں نے اس کو زہر آلود کیک اور زہر آلود وائن سے زہر دیا تھا؛ اور جب اس نے مزید کیک طلب کیا تو انھوں نے اسے پستول سے گولی ماردی تھی، اور جب انھوں نے، اس کے سینے میں داخل ہونے والے سیسے کے باعث، اسے رقصِ بسمل کرتا محسوس کیا تو اُس کو رسیوں میں جکڑ کر، برف میں سوراخ کے ذریعے، دریائے نیوا (Neva) میں غرق کردیا تھا۔یہ سارا کام مرد افسروں کے ہاتھوں ہوا تھا۔سینٹ پیٹرز برگ کی عورتیں اپنے پیارے، باپ جیسے، راسپوتین کو کبھی زہریلا کیک نہ دیتیں، بلکہ کچھ اور طلب کرتا تو وہ بھی دے دیتیں۔عورتیں اس کو بہت مانتی تھیں، جب کہ اُن مرد افسروں کو، اگر انھیں کبھی اپنے آپ پر یقین کرنا تھا، تو اسے ختم کرنا تھا۔

کیسی حیرت کی بات ہے کہ اکیلا میں ہی تہیں ہوں جو athletic faith healer کی زندگی اور موت پر مسرور ہوتا ہے؟ آہستہ آہستہ گریٹیکن میں بھی مطالعے کا پرانا شغل واپس آتا گیا۔کبھی کبھی، جب وہ بلند آواز میں پڑھتی، تو مکمل طور پر ڈھیر ہوجاتی تھی؛ وہ "عیاشی" کے لفظ پر کانپنے لگتی، اور اس کو ایک خاص قسم کی گرفت میں لے کر ادا کرتی تھی؛ کہ جب وہ "عیاشی" کہتی تو وہ عیاشی کے لیے راضی اور تیار بھی ہوتی تھی، حالاں کہ اس کو بالکل علم نہیں تھا کہ عیاشی کیا ہوسکتی ہے۔ایک دن، اس وقت حالات میں کچھ بدمزگی شامل ہوگئی جب بیکری کے اوپر والے فلیٹ میں پڑھائی کے سبق کے دوران، ممابھی آگئی تھی۔

کبھی کبھی پڑھائی خراب ہوکر واقعی عیاشی میں بھی تبدیل ہوجایا کرتی تھی؛ ننھے آسکر کا سبق بالکل بھلا دیا جاتا تھا۔ہر تیسرے جملے پر کھلکھلانے کا 'دوگانا' شروع ہوجاتا، اور خواتین کے ہونٹ خشک ہوجاتے۔راسپوتین کے ذکر کے دوران دونوں خواتین ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر آجاتیں؛ صوفے پر بے چین ہونے لگتیں، اور ایک

دوسرے کی رانوں کو دبانے لگتیں۔آخر میں آپس کی چُہل، کراہ میں تبدیل ہو جاتی۔ راسپوتین کے احوال پر مشتمل بارہ صفحات سے وہ نتائج نکلے تھے، جن کی اس سہ پہر انھیں توقع نہیں تھی، مگر انھوں نے اس کو بخوشی قبول کر لیا تھا۔کسی طرح بھی، راسپوتین کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا؛ اس کے برعکس، وہ تو ایسی نعمتیں سب تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جب دونوں خواتین ''یا خدا...... یا خدا'' کہتی ہوئی شرمندگی میں غرق اپنی اپنی جگہوں پر جا بیٹھیں، تو مما نے کچھ خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا، ''کیا تمھیں یقین ہے کہ ننھا آسکر سمجھ نہیں سکتا؟'' گریچن نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا، ''احمق نہ بنو— تمھیں اندازہ نہیں کہ میں اس پر کتنی محنت کر رہی ہوں— مگر یہ کچھ سیکھ کر نہیں دیتا...... میری ایمان دارانہ رائے ہے کہ یہ کبھی پڑھ نہیں سکے گا۔''

میری ناقابلِ اصلاح نادانی کا اشارہ دیتے ہوئے، اس نے مزید اضافہ کیا: ''ذرا غور تو کرو، ایگنس۔ یہ ہماری راسپوتین کی کتاب کے صفحات پھاڑ کر موڑ توڑ دیتا ہے۔اور وہ نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے ہیں۔کبھی کبھی تو میں تنگ آکر سوچنا چھوڑ دیتی ہوں، مگر جب میں دیکھتی ہوں کہ وہ اس کتاب سے کتنا خوش ہوتا ہے تو میں اسے پھاڑنے، برباد کرنے دیتی ہوں۔میں نے الیکس سے کہہ دیا ہے کہ وہ کرسمس کے لیے مجھے راسپوتین کی ایک اور کتاب لا دے۔''

مجھے یقین ہے، جیسا کہ آپ کو شبہ ہوا ہے، میں تین یا چار برس کے عرصے میں، رفتہ رفتہ کامیاب ہو رہا تھا— گریچن شیفلر مجھے اتنے دنوں تک، بلکہ اور زیادہ دنوں تک پڑھاتی رہی— اور میں اس دوران راسپوتین کے ذکر کے صفحات کا نصف نکال لے گیا تھا۔ میں بچپنے کی شوخی کی آڑ میں، احتیاط سے ان صفحات کو پھاڑتا، ان کو موڑ توڑ کر اپنے سویٹر کے اندر چھپا لیتا۔ پھر اپنے گھر جا کر اپنے نقارہ نوازی کے کونے میں، ان کو سیدھا کرتا، صاف کرتا، ان کو جمع کرتا جاتا، اور رازداری میں، جہاں کسی عورت کی موجودگی کا خدشہ نہ ہو، پڑھتا رہتا۔یہی عمل میں نے گوئٹے [کی کتاب] کے ساتھ کیا تھا، جسے میں ہر چار سبق کے بعد گریچن سے ''گوئٹے'' کہہ کر طلب کرتا تھا۔میں نہیں چاہتا کہ سب کچھ

راسپوتین ہی پر لگا رہے، اس لیے اور بھی کہ مجھے جلد پتا چل گیا تھا کہ ہماری اس دنیا میں ہر راسپوتین کا اپنا گوئٹے ہوتا ہے، کہ ہر راسپوتین ایک گوئٹے کا خاکہ بناتا ہے، یا آپ چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر گوئٹے اپنے ساتھ ایک راسپوتین رکھتا ہے، یا اگر اس کو ضرورت ہوئی تو بنا بھی لیتا ہے تا کہ بعد میں اس کو بدنام کرنے کے قابل ہو سکے۔

آسکر، بغیر جلد کی اس کتاب کو مرمت کے لیے دو چھتی میں لے جاتا، یا مسٹر ہائی لانڈ کے سائبان میں لے جا کر بائیسکل کے فریم کے پیچھے چھپا دیتا، جہاں وہ Rasputin and The Elective Affinities کے الگ الگ صفحات کو تاش کے پتوں کی طرح دوبارہ ترتیب دیتا، اور اس طرح ایک نئی کتاب تیار کر لیتا۔ پھر آرام سے بیٹھ کر اپنے کام کا مطالعہ کرتا، اور مسکراہٹ بھری حیرانی سے دیکھتا، جب آٹیلی (Ottilie) شرمندگی کے ساتھ مرکزی جرمنی کے باغوں میں راسپوتین کے بازوؤں کا سہارا لیے چہل قدمی کرتی، بدچلن امیرانہ ٹھاٹھ والی اولگا (Olga) کے برابر بیٹھتی، اور سردی کے موسم کے سینٹ پیٹرز برگ میں برف پر پھسلنے والی گاڑی میں ایک عیاشی کے بعد دوسری عیاشی کرتی جاتی۔

مگر ذرا دیر کے لیے ہم اپنے 'کلائین ہیمر ویگ' کے اسکول میں واپس چلتے ہیں۔

اگر میں ترقی کرتا نظر نہیں بھی آتا، تب بھی گریچن مجھ سے کنوارپنے کی دل چسپیاں لیتی رہتی۔ میرے طفیل، نظر نہ آنے والا روسی تعویذ گندے ہاتھ بھی یہی کچھ کرتا رہتا تھا، اور وہ تیزی سے کلی سے پھول بنتی چلی گئی تھی، اور اپنی نو یافتہ قوتِ حیات کو اپنے لگائے درختوں اور کیکٹسوں میں منتقل کرتی رہتی تھی۔ اگر ان برسوں میں شیفلر کبھی مناسب سمجھتا تو اپنی انگلیاں اپنے گندھے ہوئے آٹے سے نکال لیتا تھا، تا کہ اپنی بیکری کے گندھے ہوئے آٹے کو کسی انسانی رول کے لیے فارغ کر دیتا۔ گریچن بخوشی اس کے ہاتھوں کو، اپنے جسم کو گوندھنے دیتی تھی، اور وہ اس کو انڈے کی سفیدی لگا کر پکنے کے لیے چھوڑ دیتا تھا۔ کون جانتا تھا کہ اس طرح بھٹی سے کیا برآمد ہوگا۔ شاید، آخر میں، ایک بچہ۔ بات ہے تو بہت بُری، مگر بس یہی ایک یہی مسرت تھی جو اس کو ملتی تھی۔

جیسا کہ ہمیشہ ہوتا تھا، راسپوتین کے ایک جذباتی مطالعے کے بعد وہ سُرخ

آنکھوں اور بکھرے بالوں سمیت بیٹھی رہتی؛ اس کے گھوڑے جیسے بڑے بڑے سنہرے دانت چلتے نگران میں کاٹنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا، اور یوں سرد آہ بھرتی، گویا کہہ رہی ہو کہ مجھ پر رحم کرو، آٹے اور گندھے آٹے کے بارے میں سوچتی، آٹا اور گندھا ہوا آٹا! اور، چوں کہ مما کے پاس اس کا جان موجود تھا، وہ کسی طرح بھی گرتچن کی مدد نہیں کر سکتی تھی، اور اگر گرتچن میں اتنا شناور دل نہ ہوتا تو شاید میری تعلیم کا ایک حصہ ملال پر ختم ہو جاتا۔

وہ بھاگ کر باورچی خانے میں جاتی، کسی عاشق کی طرح گلے سے لگائے، کافی پینے والی مشین لیے واپس آتی؛ اور اس میں کافی پیتے ہوئے وہ غم زدہ آواز میں "Dark Eyes" گاتی یا "Red Sarafan،" اور مما اس کا ساتھ دیتی جاتی تھی۔ باورچی خانے میں ساتھ لے جاتی اور کیتلی کو پانی اُبالنے کے لیے چولھے پر رکھ دیتی؛ اور پھر جب Dark Eyes گیس کے شعلوں پر رکھا پانی گرم ہوتا رہتا، تو دوڑ کر بیکری میں جاتی، اور اکثر مسٹفکر کے اختلاف کے باوجود، اپنے ساتھ کیک اور پیسٹریاں لے آتی، میز پر پھول دار کپ، کریم دان، شکر دان، کیک کھانے کے کانٹے سجاتی اور کچھ موسمی پھول بکھیر دیتی۔ وہ کافی انڈیلتے ہوئے The Tsarevich گنگناتی، اور جب وہ لوگ کھا پی رہے ہوتیں تو باتوں باتوں میں پھر راسپوتین کا ذکر آ جاتا تھا، مگر اب انھیں معاملات صحیح تناظر میں نظر آنے لگے تھے۔ کیک سے پیٹ بھر جاتا تو وہ تمام تر سنجیدگی سے زار کے دربار کی بے انتہا بدعنوانیوں کی بُرائی بھی کرنے لگتیں تھیں۔

ان دنوں میں کیک بہت کھایا کرتا تھا۔ جیسا کہ تصویروں میں نظر آتا ہے، میرا قد نہیں بڑھا، بس موٹا ہو گیا تھا۔ "کلائن ہیمر ویگ" کے اکتا دینے والے سبق کی مٹھاس کے بعد میں اپنی دُکان میں جا گھستا اور موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ جیسے ہی ماتسیرات کی پشت میری جانب ہوتی میں خشک ڈبل روٹی کے ایک ٹکڑے کو ڈور میں باندھ کر اچار بنائی ہوئی ہیرنگ مچھلی کے مرتبان میں ڈال دیتا اور اس وقت تک واپس نہیں نکالتا تھا جب تک کہ روٹی کا ٹکڑا اچار کے پانی میں پوری طرح بھیگ نہیں جاتا تھا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ایسا ٹکڑا، اُس کے لیے، جس نے بہت سارا کیک کھا لیا ہو، کتنی نعمت جیسی قے آور دوا بن جاتا تھا۔ اپنے وزن کو کم کرنے کی خاطر، آسکر، کبھی کبھی Danzig کے gulden کی قیمت کے

برابر شنٹزل کا کیک اپنے ٹوائیلٹ میں تے کردیا کرتا تھا۔ان دنوں یہ بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔

میں گرٹیچن کے پڑھائے سبق کی قیمت ایک اور بھی طریقے سے ادا کردیتا تھا۔اپنی سلائی، کڑھائی یا کروشیا سے بنے بچوں کے لباس کی تیاری میں، وہ مجھے درزی کی ڈمی (dummy) کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ مجھے ہر انداز کے، رنگوں کے، اور پارچوں کے، چھوٹے چھوٹے فراک، چھتری جیسی ٹوپیاں، پتلون، اور کوٹ پہن کر کھڑا ہونا پڑتا تھا۔

مجھے معلوم نہیں کہ وہ مما تھی یا گرٹیچن ، جس نے میری آٹھویں سالگرہ کے موقعے پر میری ایک روسی شہزادے میں قلبِ ماہیت کردی تھی، ان دنوں، جو گولی مار دینے کے لائق سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں ان کا راسپوتنی مسلک اپنے عروج پر تھا۔ میں،اس دن لی گئی ایک تصویر میں سالگرہ کے کیک کے پہلو میں کھڑا ہوں، جس کے اطراف موم بتیوں کی باڑ بنائی گئی تھی؛ میں کڑھائی والی ، سر سے پاؤں تک لمبی، ایک روسی عبا پہنے سر پر زاویے سے رکھی ہوئی قزاقی ٹوپی ،جسم پر کارتوس لگانے والی آڑی پٹیاں لگائے ، ڈھیلی ڈھالی برجس اور چھوٹے بوٹ پہنے کھڑا ہوانظر آتا ہوں۔

خوش قسمتی سے میرا نقارے کو بھی تصویر میں لانے کی اجازت تھی۔ایک اور خوش قسمتی کی چھوٹی سی بات یہ تھی کہ گرٹیچن نے —شاید جس کی میں نے کبھی درخواست کی تھی— میرے لیے ایک سوٹ سی دیا تھا، جو انیسویں صدی سے ملتے جلتے سادہ مزاج کا تھا، جو اَب بھی میرے البم میں گوئٹے کے جذبات اور، میرے سینے میں دو روحوں کی یک جائی کی گواہی دے رہا ہے اور مجھے اس قابل بنا رہا ہے کہ میں ،اپنے واحد نقارے سمیت، ایک ساتھ 'وائیمار'اور سینٹ پیٹرزبرگ میں رہوں، ماؤں کی مملکتوں میں اُتروں اور خواتین کے ساتھ عیاشیوں کا جشن مناؤں۔

# اسٹاک ٹرم — دور دراز سے گانے کے اثرات

ڈاکٹر ہارن اسٹیئر، خواتین کی ڈاکٹر، جسے میری نگہداشت کی ذمے داری سونپی گئی ہے، تقریباً ہر روز، صرف سگریٹ کا کش لگانے میرے پاس آدھمکتی ہے، مگر ہر معائنے کے بعد، میرے علاج کے طفیل، کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔ ہر بار وہ پریشان ہوتی ہے، مگر پہلے معائنے سے کچھ کم، جب وہ پچھلی بار اندر آئی تھی۔ ایک ریٹائرڈ آدمی کی طرح جو صرف اپنی سگریٹ سے محبت کرتا ہو، وہ اصرار کرتی رہتی ہے کہ میں اپنے بچپنے کی تنہائی کا مارا ہوا ہوں، کہ میں دوسرے بچوں کے ساتھ کافی کھیلا کودا نہیں تھا۔

ٹھیک ہے، جہاں تک دوسرے بچوں کا معاملہ ہے، وہ صحیح کہتی ہوگی۔ یہ سچ ہے کہ میں گریچن شیفلر کی تعلیمات میں اتنا مصروف ہوگیا تھا، گوئٹے اور راسپوتین کے درمیان اس طرح بٹ گیا تھا، کہ تمام تر ارادوں کے باوجود مجھے ring-around-a-rosy ڈاک خانے کے لیے بالکل وقت نہیں ملتا تھا۔ پھر بھی، جیسا کہ کبھی کبھی دانش ور کیا کرتے ہیں، میں کتابوں سے منہ پھیر لیا کرتا تھا، ان کو زبانوں کا قبرستان کہتا تھا، اور عام آدمیوں سے تعلقات کی کوشش کرنے لگتا تھا۔ میرا سابقہ ننھے ہم جنس خوروں سے پڑا تھا جو ہماری عمارت میں رہتے تھے، اور ان سے مختصر عرصے کی تعلقات کے بعد، میں خوش تھا کہ میں صحیح سالم اپنی پڑھائی کی طرف واپس آ گیا تھا۔

آسکر کو اپنے والدین کے فلیٹ سے نکلنے کے امکانات ان کی دکان فراہم کرتی تھی؛ پھر لیبس ویگ' کا راستہ مل گیا تھا، یا پھر سامنے کے اس دروازے سے جو سیڑھیوں کی

طرف کھلتا تھا۔ وہاں سے یا تو وہ سیدھا گلی تک جا سکتا تھا، یا چار منزل سیڑھیوں پر چڑھ کر دو چھتی میں چلا جاتا جہاں موسیقار مین (Meyn) اپنا بگل بجاتا رہتا تھا، یا وہاں سے آخری راستہ تھا آنگن میں جانے کا۔ گلی گول گول پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ ریت سے بھرا ایک علاقہ تھا جہاں خرگوش نسلی سازی کرتے تھے اور [صفائی کی غرض سے] قالین پیٹے جاتے تھے۔ مسٹر مین کے ساتھ مل کر 'دو سازہ' بجاتے وقت دو چھتی سے وہ منظر دکھائی دیتا تھا جس سے ایک احساسِ آزادی ہوتا تھا، جو میناروں پر چڑھنے والا ہر انسان چاہتا ہے، اور جو اُن لوگوں کو خواب دیکھنے والا بنا دیتا ہے جو دو چھتیوں میں رہتے ہیں۔

جب آنگن آسکر کے لیے خطرات سے پُر ہوتا تھا، تو دو چھتی اس وقت تک اس کو تحفظ فراہم کرتی تھی جب تک ایکسل مشکے اور اس کے حواری اس کو نکال باہر نہیں کر دیتے تھے۔ آنگن کی چوڑائی عمارت کی چوڑائی کے برابر تھی، مگر سات قدم زیادہ لمبی: عقب میں کولتار لگے تختوں سے، جن کے اوپر کانٹے دار تار تنے ہوتے تھے، اس کو دوسرے آنگنوں سے الگ کر دیا گیا تھا۔ دو چھتی سے اس بھول بھلیاں کا، جو بلاک کے اندر کے علاقے پر مشتمل ہے، اچھا نظارہ ہوتا تھا 'جو لیس وِیگ'، 'ہرنا اشتراسے' اور 'لیوزن اشتراسے' کے حصار میں ہے۔ بے ترتیب شکل میں بنے ہوئے آنگنوں سے بننے والے اچھے خاصے مستطیل علاقے میں کھانسی کی گولیاں بنانے والا کارخانہ اور مرمت کرنے والی کچھ از کار رفتہ دکانیں بھی شامل تھیں۔ احاطے میں، اِدھر اُدھر موجود، کچھ پیڑ اور جھاڑیاں بھی تھیں جن کو دیکھ کر سال کے وقت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ آنگنوں کی شکلیں اور رقبے مختلف تھے، مگر سب میں خرگوش ہوتے تھے، اور قالین پیٹنے کے آلے نصب تھے۔ خرگوش ہمیشہ موجود اور روز سرگرمِ عمل رہتے تھے؛ گھر کے اعلان شدہ قوانین کے مطابق قالین صرف منگل اور جمعہ کے دن پیٹے جاتے تھے۔ منگل اور جمعہ کے دنوں میں احساس ہوتا تھا کہ یہ بلاک واقعی کتنا بڑا ہے۔ آسکر، دو چھتی میں بیٹھا سیکڑوں قالینوں، راہ داری کے قالینوں، پلنگوں کے کنارے کے قالیچوں پر sauerkraut [ایک ترش مادّے] سے رگڑا جاتا، برش کیا جاتا، اور پیٹا جاتا دیکھتا رہتا تھا، جن کو اُن کی بُنائی کے مطابق، خاص طریقوں سے لپیٹا جاتا تھا۔ اپنے توانا بازوؤں کا مظاہرہ کرتی سو کے قریب بیویاں رومال سے جن کے بال سے بندھے ہوتے تھے، قالینوں کے ڈھیر

لیے گھر سے نکلتیں، اور اپنے قالینوں کو اس کام کے لیے پہلے سے بنے ہوئے ڈھانچوں پر ٹانگ دیتیں، پیٹنے والے اوزار اٹھاتیں اور فضا کو پٹائی کے شور سے معمور کر دیتی تھیں۔

آسکر کو صفائی کے دوران گائے جانے والے حمدیہ گیتوں جیسا یہ شور بہت ناگوار گزرتا تھا۔ وہ ان آوازوں کا نقارے سے مقابلہ کرتا، اور قالینوں کی پٹائی کی گرج سے اتنی دور، وہ چھتی میں ہونے کے باوجود، اپنی شکست تسلیم کر لیتا تھا۔ قالین پیٹنے والی ایک سو عورتیں آسمان سر پر اٹھا لیتیں، اور ان کی پیدا کردہ آواز فضا میں نیچی پرواز کرنے والی ابابیلوں کے بازو کند کر دیتی تھی: اور وہ آدھے درجن بار پر مار کر نیچے آ جاتیں اور اپریل کی ہوا میں آسکر کی نقارہ نوازی سے بنے چھوٹے سے مندر میں جا بیٹھتی تھیں۔

ان دنوں جب قالین پیٹے نہیں جاتے تھے، ہماری عمارت کے لڑکے قالین پیٹے جانے کے لیے لکڑی سے بنائے گئے racks پر جمناسٹک کیا کرتے تھے۔ میں آنگن میں بہت کم نکلا کرتا تھا۔ میں خود کو جس حصے میں نسبتاً محفوظ سمجھتا تھا وہ مسٹر ہائی لانڈ کا سائبان تھا۔ بڑے میاں لڑکوں کو اس سے دور رکھتے تھے، مگر شکنجوں، گراریوں، ٹوٹی پھوٹی مشینوں، نامکمل بائیسکلوں اور ٹیڑھی یا سیدھی کی گئی کیلوں سے بھرے سگار کے ڈبوں کے علاوہ صرف مجھ کو داخل ہونے کی اجازت دیتے تھے۔ ان کی اصل مصروفیت یہ تھی کہ جب وہ لکڑی کے بکسوں سے کیلیں نکال نہیں رہے ہوتے تھے، تو نہائی (anvil) پر پچھلے دن کی نکالی ہوئی کیلیں سیدھی کرتے تھے۔ کیلوں کی بازیافت کے علاوہ گھر بدلتے وقت لوگوں مدد کرتے تھے، چھٹی کے دنوں میں خرگوش ذبح کرتے تھے، اور تمام آنگن میں، سیڑھیوں پر اور دو چھتی میں تمباکو کی پیک کرتے پھرتے تھے۔

ایک دن، جیسا کہ بچے کرتے رہتے ہیں، بچے شوربا پکا رہے تھے اور وہ جگہ سائبان سے زیادہ دور نہیں تھی، جب، نوخی آئیک نے بڑے میاں، ہائی لانڈ، سے اس میں تین بار تھوکنے کے لیے کہا۔ بڑے میاں ہر بار اپنا گلا صاف کر کے اس کو ممنون کرتے اور پھر اپنی کٹیا میں غائب ہو جاتے، جہاں وہ کیلوں کے خم نکالنے لگتے تھے۔ ایکسل مشکے نے شوربے میں کچھ مقدار میں اینٹوں کا بُرادہ ملا دیا۔ آسکر، ایک کنارے کھڑا تجسس سے سب

کچھ دیکھ رہا تھا۔ ایکسِل، مشکے اور ہیری شلاگر نے مل کر، بالغ لوگوں کو شوربے سے دور رکھنے کی خاطر پرانے کمبلوں اور کپڑوں سے ایک قسم کا بند خیمہ بنا لیا تھا۔ جب اینٹوں سے بنا دیگیا اُبال پر آیا تو ہانشن کولِس نے اپنے جیب خالی کیے اور ایکٹین (Aktien) تالاب سے پکڑے ہوئے دو زندہ مینڈک پکتے ہوئے شوربے میں ڈال دیے۔ سوزی کائزر نے، جو اس خیمے میں موجود اکیلی لڑکی تھی، خوف اور تلخی کے عالم میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے، جب وہ دونوں مینڈک، بغیر کسی قسم کی تیرنے کی کوشش یا موت کا راگ الاپے بغیر ہی شوربے میں غائب ہو گئے تھے۔ سوزی کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر نوخی آئیک نے اپنے پتلون کے سامنے کے بٹن کھولے اور اس پکتی ہوئی ہانڈی میں پیشاب کر دیا۔ ایکسِل، ہیری اور ہانشن کولِس نے بھی اس کی پیروی کی۔ اُس ٹھنگنے نے دس برس کے بچوں کو دکھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کیا کر سکتا ہے مگر کچھ نہیں ہوا۔ سب کی آنکھیں سوزی کی طرف متوجہ ہو گئیں، اور ایکسِل نے آسمانی رنگ کی تام چینی کی ایک پتیلی سوزی کے حوالے کر دی، مگر اس نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک کی سوزی نے، جو بظاہر اپنے لباس کی نیچے کچھ نہیں پہنے تھی، اس برتن پر بیٹھ کر، اپنے دونوں گھٹنوں کو یکجا کر کے، چہرے پر کوئی تاثر ظاہر کیے بغیر، خلا میں گھورتے ہوئے، اپنی ناک سکوڑ لی تھی، اور جب نیچے رکھے برتن میں سے ہلکی سی جھنکار کی آواز آئی، تو پتا چلا تھا کہ سوزی نے بھی شوربے کے لیے اپنا حصہ فراہم کر دیا ہے۔

اس مرحلے پر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے بھاگنا نہیں چاہیے تھا: باوقار طریقے سے چل کر جانا چاہیے تھا۔ سب کی آنکھیں پکانے کے برتن میں کچھ تلاش کر رہی تھیں، مگر چوں کی میں دوڑ پڑا تھا، سب مجھے دیکھنے لگے تھے۔ میں نے سوزی کائزر کو کہتے سُنا تھا: ''یہ بھاگ کس لیے رہا ہے، کیا ہماری شکایت کرنے جا رہا ہے؟'' یہ جملہ میری پیٹھ پر تیر کی طرح لگا تھا، اور میں اس کو اپنے جسم میں گھستا محسوس کر رہا تھا۔ میں چار منزل سیڑھیاں اچھل کر چڑھتا، دو چھتی میں پہنچ کر اپنی سانسیں درست کر رہا تھا۔

اس وقت میری عمر ساڑھے سات برس تھی۔ ٹھگنا ٹھیک آٹھ برس کا تھا۔ ایکسِل، نوخی، ہانشین وغیرہ دس یا گیارہ برس کے تھے۔ وہاں ماریا ٹروزنسکی بھی موجود تھی۔ وہ مجھے

سے کچھ بڑی تھی، مگر میں کبھی اس کے ساتھ آنگن میں کھیلا نہیں تھا؛ وہ مادر ٹروزنسکی کے باورچی خانے میں گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی، یا اپنی بڑی بہن گُستے (Guste) کے ساتھ جو لوتھرن کنڈرگارٹن میں مدد کرتی تھی۔

کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ آج بھی، میں پیشاب دان میں کسی عورت کے پیشاب کرنے کی آواز کو برداشت نہیں کر سکتا؟ اوپر دوچھتی میں آسکر اپنے کانوں کو نقارہ نوازی سے بہلا رہا تھا۔ عین اس وقت جب اس نے محسوس کرنا شروع کیا کہ اُبلتا ہوا شوربا اس کے بہت پیچھے رہ گیا ہے، ان کا پورا گروہ، یعنی وہ سب، جنھوں نے شوربے میں اپنا حصہ ڈالا تھا، ننگے پاؤں یا بے آواز جوتوں میں وارد ہو گئے۔ نوخی وہ برتن لیے ہوئے تھا۔ انھوں نے آسکر کے گرد گھیرا بنا لیا۔ ٹھگنا کچھ دیر بعد پہنچا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو چھیڑتے ہوئے طعنہ دیا، "چل بے— دیکھ لیا تجھ کو"۔ اور بالآخر، ایکسل نے آسکر کو پیچھے سے دبوچ لیا اور اس کے بازو پکڑ لیے۔ سوزی، اپنے گیلے گیلے دانت دکھاتے ہوئے، جن کے درمیان زبان تھی، ہنس دی اور بولی، "کیوں نہیں، یہ کیوں نہیں کریں گے۔" اس نے نوخی سے ٹین کا چمچا لیا، اس کو اپنے پیچھے کپڑے پر رگڑ کر چمکایا، اور بھاپ دیتی ہوئی کشید میں ڈال دیا۔ پھر سعادت مند گھر والی کی طرح اس کو آہستہ آہستہ چلانے لگی؛ تھوڑے سے ملغوبے کو چمچے میں نکالا، چھو کر دیکھا، ٹھنڈا کرنے کے لیے بھرے چمچے پر پھونک ماری، اور ہاتھ بڑھا کر آسکر کے منہ میں ٹھونس دیا؛ جی ہاں، اس نے میرے منہ میں ٹھونس دیا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں، کبھی، ایسی چیز نہیں چکھی تھی؛ اس کی بدمزگی کبھی نہیں بھول سکوں گا۔

صرف اس وقت جب میرے دوست، جو میری غذا کے بارے میں بہت فکرمند تھے، اس لیے کہ نوخی نے شوربے میں قے کر دی تھی، میں پیٹ کے بل رینگتا کپڑے سکھانے والے بالاخانے پر گیا تھا جہاں اس وقت چند چادریں پھیلی ہوئی تھیں، اور چند چمچے بھر سرخ رنگ شوربا پھینکا گیا تھا، جس میں حیرت انگیز طور پر مینڈک کی باقیات نہیں پائی گئی تھیں۔ میں دوچھتی کی کھلی کھڑکی کے پاس رکھے ہوئے صندوق پر چڑھ گیا۔ پاؤڈر جیسی اینٹ کو کچلتے ہوئے، میں نے دور افتادہ آنکھوں کی طرف نظر کی اور مجھے اپنے عمل کی

ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ 'میرین اشتراسے' پر واقع مکانوں کی فاصلے پر کھڑکیوں کی طرف دیکھتے ہوئے، میں چیختا تھا اور اس طرف منہ کر کے گاتا گیا تھا۔ اس کا کوئی نتیجہ نظر نہیں آیا، اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ یہ سارے آنگن میرے لیے بہت چھوٹے تھے۔ میں نے فاصلے، جگہ، گرد و پیش کے مناظر کی تلاش کے دوران طے کیا تھا کہ ہر ممکن موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے 'ٹیلیس ویگ' کے مضافات کو چھوڑ دوں گا، اکیلے یا مما کے ساتھ، تاکہ آنگن میں شوربا بنانے والوں سے نجات ملے، جو بہت چھوٹا ہو گیا تھا۔

ہر جمعرات مما خرید و فروخت کے لیے شہر جاتی تھی۔ جب کوہلین مارکٹ سے نکلنے والی سڑک 'آرسنل پلیٹس' پر واقع Sigismund Markus کی دُکان سے نیا نقارہ خریدنا ضروری ہو جاتا تھا تو عام طور وہ مجھ کو اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔ اُن دنوں، میں اندازاً سات اور دس برس کی عمر میں، پورے دو ہفتے نقارہ بجاتا رہا تھا۔ دس سے چودہ برس کی عمر میں ایک ہفتے سے کم وقت میں میرا نقارہ خراب ہو کر کوڑا ہو جاتا تھا۔ بعد میں، میرا طریقہ ناقابلِ پیش گوئی ہو گیا تھا۔ میں ایک دن کے اندر ہی، بالکل نئے نقارے کو ناکارہ کر دیتا تھا، مگر پھر ذہنی توازن کا ایک عرصہ آ جاتا تھا، اور میں زیادہ سے زیادہ تین سے چار ماہ، زور شور سے نقارہ نوازی کرتا تھا، مگر اعتدال اور کنٹرول میں رہ کر، جس کے باعث سوائے تام چینی میں معمولی شگاف کے، میرا باجا سالم رہتا تھا۔

مگر آیئے، ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنے ان دنوں کو یاد کرتے ہیں جب میں، اپنی مما کے طفیل، اپنے آنگن، قالینوں کی پٹائی اور شوربے بنانے والوں سے فرار اختیار کر لیتا تھا، جو مجھ کو ہر دو ہفتے بعد Sigismund Markus کی کھلونوں کی دُکان پر لے جاتی تھی جہاں مجھے ایک نیا نقارہ منتخب کرنے کی اجازت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی مما مجھے اس وقت بھی آنے کی اجازت دیتی تھی جب میرا پرانا نقارہ نسبتاً بہتر حالت میں ہوتا تھا۔ ان دو پہروں میں، پرانے رنگا رنگ شہر میں جا کر میں کتنا خوش ہوا کرتا تھا! وہاں ہمیشہ عجائب گھر کی جیسی کوئی شے ضرور ہوا کرتی تھی اور ایک گرجا گھر سے دوسرے گرجا گھر تک ہمیشہ زور زور سے گھنٹیاں بجائی جاتی تھیں۔

عام طور پر ہماری تفریحات خوش گوار طور پر یکساں ہوا کرتی تھیں۔ ,Leiser's Sternfeld's یا Machwitz میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ خریداری ہو جاتی تھی؛ اس کے بعد ہم مارکس کی طرف جایا کرتے تھے۔ مارکس نے اپنی عادت سی بنا لی تھی کہ وہ مما سے مختلف نوعیت کی چاپلوسی کی باتیں ضرور کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ مما سے پیار کرتا تھا، مگر جہاں تک مجھے علم ہے، وہ میری مما کا ہاتھ پکڑنے سے آگے نہیں بڑھتا تھا، بڑی پُرجوشی سے اُس کو سونے میں تولنے کے برابر کہتا، اور ان کا ایک خاموش بوسہ لینے کے لیے بے قرار ہوتا تھا، سوائے اس وقت کے، میں جس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، جب وہ مما کے سامنے اپنے گھٹنوں کے بل جھک گیا تھا۔

مما، جس کو نانی اماں کو واچکی سے ورثے میں مضبوط جسم، چھا جانے والی شخصیت اور اچھے مزاج سے مملو خود نمائی ملی تھی، جس کی مدد سے وہ مارکس کی دل چسپیوں کا سامنا کرتی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ کسی حد تک وہ اس کے ریشمی موزوں سے بہت متاثر تھی— وہ جن کے ڈھیر کے ڈھیر خرید لاتا تھا؛ وہ اعلیٰ درجے کے معیار کے ہوا کرتے تھے— مگر وہ اُن کو اتنے سستے داموں فروخت کرتا تھا کہ عملی طور پر وہ تحفے معلوم ہوتے تھے۔ نقاروں کا تو ذکر ہی کیا، ہر دوسرے ہفتے ہم جنھیں اس کی دُکان سے سستے داموں خریدا کرتے تھے۔ معمول کے طور پر، ساڑھے چار بجے مارکس سے پوچھتی کہ کیا وہ مجھے، یعنی آسکر کو، اس کی حفاظت میں چھوڑ سکتی تھی، اس لیے کہ دیر ہو جایا کرتی تھی اور اس کو کچھ پھیرے لگانے ہوتے تھے۔ عجیب قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ مارکس قدرے خم ہو کر، پُرتکلف جملوں سے میری، یعنی آسکر کی حفاظت کا وعدہ کرتا؛ مثال کے طور پر مجھے اس وقت بھی ''میری آنکھوں کا تارا'' کہتا تھا، جب وہ اپنے اہم کام نمٹا رہا ہوتا تھا۔ اس کے لہجے کی چالاکی اتنی شائستہ ہوتی تھی کہ دل کو ٹھیس نہیں پہنچاتی تھی، مگر کبھی کبھی مما کے چہرے پر سُرخی ضرور طاری کر دیتی تھی، اور اس کو مارکس کے بارے میں شبہات ہو جاتے تھے۔

جہاں تک میرا معاملہ تھا، میں مما کے پھیروں کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا، جنھیں وہ اہم بنا کر پیش کرتی، اور بڑے جوش وخروش سے پیش کیا کرتی تھی۔ ایک بار تو وہ

مجھ کو شیلر گاسے' پر واقع ایک سستے سے ہوٹل میں بھی لے گئی تھی، جہاں اس نے مجھے مالکن کے پاس چھوڑ دیا تھا اور خود پورے پون گھنٹے کے لیے غائب ہو گئی تھی۔ایک لفظ بھی کہے بغیر مالکن، جو اپنے ''نصف-نصف'' شراب سے شغل کرتی رہتی تھی، میرے سامنے ایک گلاس بدمزہ، سوڈا واٹر رکھ دیتی، اور میں وہیں اپنی مما کا انتظار کیا کرتا تھا، واپسی پر جس میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نظر نہیں آتی تھی۔مالکن سے رخصت کے چند الفاظ کہہ کر، وہ میرا ہاتھ پکڑ لیتی۔اس کو کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھوں کی حرارت میرے دل میں عجب عجب خیالات موج زن کر دیتی ہو گی۔ زیادہ گرم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، ہم دونوں ٹوول ویبر گاسے' پر واقع کیفے وائز کے جاتے۔ مما mocha [نفیس کافی کی ایک قسم] آرڈر کرتی اور آسکر lemon ice، اور دونوں اس وقت تک انتظار کرتے، جو طویل نہیں ہوتا تھا، جب تک کہ اچانک جان برانسکی وہاں پہنچ نہیں جاتا اور پھر فرحت بخش ٹھنڈے سنگِ مرمر کی میز پر ایک اور پیالی mocha کی دھری ہوتی تھی۔

میری موجودگی میں وہ اس طرح باتیں کرتے گویا میں وہاں موجود ہی نہیں، اور ان کی گفتگو میں وہی کچھ ہوتا، میں بہت عرصے سے جس سے واقف تھا: کہ مما اور انکل جان تقریباً ہر جمعرات شیلر گاسے' کے ایک ہوٹل میں پون گھنٹا ساتھ گزارنے کے لیے ملتے تھے، جس کا کرایہ جان ادا کرتا تھا۔شاید وہ جان ہی تھا جسے میری موجودگی پر اعتراض ہوتا تھا، مگر کبھی تو وہ بہت انکسار کرتا، مما سے بڑھ کر، جسے ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی کہ میں ان کی محبت کا اختتامیہ کیوں نہیں دیکھ سکتا، جس کے جواز کی وہ ہمیشہ سے، بلکہ بعد میں بھی، قائل تھی۔

جان کی درخواست پر، میں تقریباً ہر جمعرات کی سہ پہر، ساڑھے چار سے، چھ بجے سے کچھ پہلے تک کا وقت، مارکس کے پاس گزارتا تھا۔مجھے اس کی دُکان کے ہر قسم کے نقاروں کو دیکھنے کی اجازت تھی، بلکہ انھیں استعمال کرنے کی بھی اجازت تھی۔ بھلا ایسی کون سی جگہ ہو سکتی تھی جہاں آسکر کو اتنے سارے نقارے ایک ساتھ بجانے کے لیے میسر ہوں؟اس دوران مجھے مارکس کی شکست خوردہ صورت پر بھی غور کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ مجھے خبر نہیں تھی کہ اس کے خیالات کہاں سے آتے تھے، مگر مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ وہ

جاتے کہاں تھے؛ وہ تو شلز گاسے میں، نمبروں والے کمروں کو کریدتے ہوتے تھے یا غریب لازرس [گئجے] کی طرح کینے وائز کے میں مرمری میز کے نیچے چھپے ہوتے تھے۔ کس شے کے انتظار میں؟ ڈبل روٹی کے بچے کھچے ٹکڑوں کے؟

مما اور جان برانسکی بچے کھچے ٹکڑے چھوڑنے کے قائل نہیں تھے، ایک بھی نہیں۔ وہ سب کچھ خود ہی کھا جاتے تھے۔ ان کی بھوک ندیدی تھی، جو کبھی ختم نہیں ہوتی تھی، جو خود اپنی دُم بھی کاٹ لیتی تھی۔

ان دنوں، یہ غالباً ستمبر کی بات ہے، کہ ایک سہ پہر مما زنگ کے رنگ کا موسم خزاں کا لباس پہنے مارکس کی دُکان سے نکلی ہی تھی کہ میں نے دیکھا کہ مارکس کاؤنٹر پر بیٹھا اپنے خیالات میں محو ہو گیا تھا۔ میں سمجھ نہیں سکا کہ اس وقت اچانک مجھے کیا ہو گیا تھا۔ میں اپنا نیا نقارہ لیے دُکان سے نکلا اور 'آرسنل پیسیج' کی طرف چل پڑا۔ سرنگ جیسے اس راستے کے دونوں جانب پُرتکلف انداز میں زیورات، کتابیں اور اعلیٰ درجے کی کھانے کی اشیا سے سجی دُکانوں کی کھڑکیاں تھیں۔ اگرچہ یہ اشیا قابلِ تمنا تھیں، مگر میری حیثیت سے کہیں پرے تھیں۔ وہ اشیا مجھے روک نہ سکیں؛ میں چلتا چلا گیا، اس راستے پر جو کوئلوں مارکٹ تک لے جاتا ہے۔ جب میں ایک غبار آلود گلی میں برآمد ہوا تو خود کو آرسنل کے سامنے کھڑا پایا۔ اس کی عمارت کا سامنے کا حصہ مختلف محاصروں سے متعلق توپ کے گولوں سے لدا ہوا تھا، جو گزرنے والوں کو ڈانزیگ کی تاریخ کا اہم حصہ پیش کرتا تھا۔ توپ کے اِن گولوں میں مجھے کوئی دل چسپی نہیں تھی، بالخصوص اس لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی مرضی سے دیواروں کی زینت نہیں بنے تھے، کہ ڈانزیگ شہر میں ایک معمار رہتا تھا جس کو Public Building Office اور Office for the Conservation of Monuments نے مشترکہ طور پر ملازم رکھا تھا، جس کا کام تھا کہ وہ گزری صدیوں کے گولہ بارود کو مختلف گرجا گھروں، ٹاؤن ہالوں، بالخصوص 'آرسنل' کی دیواروں میں نصب کرنے کے ذریعے محفوظ کرے۔

میں نے اِشتاٹ ) تھیٹر کی طرف جانے کا فیصلہ کیا، جس کا سامنے کا سائبان میری دائیں جانب دکھائی دیتا تھا، جسے ایک چھوٹی سی اندھیری گلی، 'آرسنل' سے علاحدہ کرتی

تھی۔ میری توقع کے عین مطابق تھیٹر بند تھا، کہ شام کے کھیل کے لیے اس کا باکس آفس سات بجے شام کھلتا تھا۔ وہاں سے واپسی کا ارادہ کرتے ہوئے میں نے بائیں جانب جانے کا قصد کیا، مگر آسکر نے خود کو اسٹاک ٹرم (Stockturm) اور لانگ گاسر گیٹ کے درمیان پایا۔ مجھے گیٹ سے گزر کر لانگ گاسر جانے اور وہاں سے بائیں مڑ کر گراسے وولویبر گاسے (Grosse Wollwebergasse) جانے کی ہمت نہیں ہوئی، اس لیے کہ مما اور جان وہاں بیٹھے ہوں گے؛ اور اگر وہ ابھی وہاں نہیں پہنچے ہوں گے تو، بہت امکان ہے کہ وہ اپنے 'شلر گاسے' والے پھیرے سے فارغ ہو کر اسی چھوٹی سے مرمر کی میز پر بیٹھے mocha سے تازہ دم ہو رہے ہوں گے۔

مجھے بالکل اندازہ نہیں کہ ٹن ٹن گھنٹیاں بجاتی اور محراب میں سے نکل کر گول چوراہے سے ہوتی، اپنے پہیوں سے دانتوں کو چکانے والی چیخ کی سی آواز نکالتی ٹرام گاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے جو 'بوٹز مارکٹ' اور مرکزی ریلوے اسٹیشن کی طرف جاری تھی، میں نے 'کویلن مارکٹ' کو کس طرح پار کیا تھا۔ شاید ایک بالغ آدمی یا شاید کسی پولیس والے نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ٹریفک کے خطرات سے نکالا تھا۔

اب میں اسٹاک ٹرم نامی مینار کے سامنے کھڑا تھا جس کی عمودی ڈھلان والی اینٹوں کی دیوار آسمان کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، اور یہ بھی ایک اتفاق تھا، جو میری اکتاہٹ کے ردِعمل میں ہوا تھا کہ میں نے اپنی چوبِ نقارہ کو دیوار کی اینٹوں اور دروازے کہ آہنی چوکھٹ کے درمیان اڑس دیا تھا۔ میں نے اینٹوں سے بنی دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر دیکھنے کی کوشش کی تھی، مگر عمارت کے سامنے کے حصے کے خط کے ساتھ ساتھ اس لیے دیکھنا مشکل ہو رہا تھا کہ جھروکوں اور دریچوں سے نکلے کبوتر اڑ اڑ کر تھوڑی دیر کے لیے چھجوں اور پرنالوں پر بیٹھتے اور پھر اڑ کر تیر کی طرح نیچے جاتے اور میری نظروں کو اپنا پیچھا کرنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

ان کبوتروں کی آمد و رفت واقعی میرے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ اوپر دیکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، اس لیے کہ میں آسمان تک جاتی پوری دیوار کو دیکھ نہیں سکتا تھا سو میں نے اپنی نظریں جھکا لیں اور اپنی جھنجھلاہٹ کو دور کرنے کے لیے میں نے اپنی چوبِ نقارہ کو بیرم (لیور)

کی طرح استعمال کرنا شروع کیا۔دروازہ کھل گیا۔دروازے کو زیادہ کھولنے کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے کہ آسکر مینار کے اندر پہنچ گیا تھا، اور اس کی پیچ دار سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا؛ وہ اپنا داہنا پیر آگے بڑھاتا اور بائیں پیر کو کھینچ کر اوپر کر لیتا۔اس طرح وہ پہلے عقوبت خانے تک پہنچا اور اس کے بعد اسی طرح چڑھتا چلا گیا، عقوبت خانے سے گزرتا ہوا، جس میں معلومات کے لیبل لگے آلات احتیاط سے محفوظ کیے گئے تھے۔اس مرحلے پر اس نے اپنا بایاں پیر آگے بڑھانا اور اس کے بعد بائیں کو کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ذرا اوپر پہنچ کر اس نے سلاخیں لگی کھڑکی سے نیچے کی طرف جھانکا، بلندی کا اندازہ لگایا، دیوار کی موٹائی کا مطالعہ کیا، اور کبوتروں کو ہشکار کر اڑا دیا۔سیڑھی کے اگلے موڑ پر، اسے پھر وہی کبوتر مل گئے۔اب آسکر اپنے دائیں پیر پر منتقل ہو گیا، اور اسی طرح کی ایک اور تبدیلی کے بعد مینار کے اوپر پہنچ گیا تھا۔

مجھے معلوم نہیں کی اسٹاک ٹرم کی بلندی کتنی تھی (اور اب بھی ہے، اس لیے کہ یہ جنگ کی تباہی سے بچ گیا تھا)۔نہ ہی میں چاہتا تھا کہ میں مشرقی جرمنی کے گوتھک اینٹوں کے کام کے حوالے اپنے نگہبان برونو سے دریافت کروں۔میرا اندازہ ہے کہ یہ اوپر سے نیچے تک 150 فٹ کا رہا ہوگا۔

مجھے راہداری میں رُکنا تھا، جو سیڑھی کے بیچ کے اطراف بنی ہوئی تھی۔میں بیٹھ گیا، اپنے پاؤں جنگلے کے ستونوں کے درمیان ٹھونس دیے اور آگے کی طرف جھکا۔میں نے ایک ستون کو اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیا، اور اس سے پرے، کولس مارکٹ کی طرف دیکھا، جب کہ اپنے بائیں ہاتھ سے میں نے یقین کر لیا کہ میرا نقارہ، جو پوری چڑھائی میں میرے ساتھ تھا، بالکل ٹھیک تھا۔

میں کسی پرندے کی آنکھ سے دانتسِگ کے— کئی میناروں، گھنٹا گھروں اور گھنٹوں والے واجب التنظیم شہر، جس میں کہا جاتا ہے کہ قرونِ وسطٰی سانس لیتا ہے، نظارے کی تفصیل بیان کر کے آپ کو اُکتانا نہیں چاہتا، پھر بھی آپ درجنوں لاجواب تصویروں میں اس کا پورا منظر دیکھ سکتے ہیں۔نہ میں کبوتروں یا فاختاؤں پر اپنا وقت ضائع کرنا پسند کروں گا، جس طرح اکثر لوگ ان کو ادب کے موضوعات کے لیے بہت موزوں سمجھتے ہیں۔میرے

نزدیک کبوتر کچھ نہیں؛ میں آبی پرندوں کو اس معاملے میں ان سے بھی زیادہ نا معقول سمجھتا ہوں۔آپ کے ''فاختہ برائے امن'' کی بات کچھ سمجھ میں آتی ہے، مگر ایک پیراڈاکس کے طور پر۔ میں تو جلد ہی بجائے کبوتر کے، امن کا ایک پیغام عقاب کے سپرد کرنے والا ہوں، جو خدا کی مخلوق میں شاید سب زیادہ لڑا کا پرندہ ہے۔قصہ مختصر، اسٹاک ٹرم پر بہت کبوتر تھے، مگر سچ تو یہ ہے کہ ہر قسم کے باعزت مینار پر کبوتر ہوا کرتے ہیں۔

ہر موقعے پر کبوتر ہی میری توجہ کا مرکز نہیں بنے رہتے تھے، بلکہ کچھ اور بھی زیادہ مختلف چیزیں ہوتی تھیں: مثال کے طور پر 'اشتاٹ تھیٹر'، 'جو آرسنل' سے میری واپسی کے وقت بند تھا۔یہ بکس نما عمارت، جس پر ایک گنبد بنا ہوا ہے، مجھے ایک دیوہیکل نو کلاسکی کافی پینے کی مشین جیسی دکھائی دیتی ہے۔یہ Temple of the Muses [نو ستونوں پر ٹکی چھتری جیسی عمارت جس پر جیمس یا مسن کا نصف مجسمہ نصب ہے] جیسی ہے، جس میں چکی جیسے دو پاٹوں کی کمی تھی، جن کے ذریعے اس کے اندر موجود مواد، اداکار اور عوام، گوئٹے اور شیلر کو، آہستہ آہستہ بے حد مہین پیس کر نکالا جا سکتا تھا۔اس عمارت نے مجھے بہت ناراض کر دیا، بالخصوص، ڈھلتی ہوئی سہ پہر میں سورج کی کرنوں میں چمکتی، لابی کی ستونوں والی کھڑکیوں نے، جو مصور کی رنگ آمیزی کرنے والی تختی میں مسلسل زیادہ سُرخ رنگ گھول رہی تھیں۔

اس مینار پر، کوہلن مارکٹ سے تقریباً ایک سو فٹ اوپر، تمام ٹراموں، اور گھر کی جانب رواں دفتروں میں کام کرنے والوں سمیت، مارکس کی پیار بھری خوش بو والی دُکان سے بھی اوپر، اور ٹھنڈے سنگِ مرمر کی میز والے کیفے 'وائز کے' میں، دو پیالے mocha کافی، اور مما اور جان برانسکی سے بلند، تمام آنکھوں سے بلند، تمام کج اور سیدھی کی ہوئی کیلوں، شوربا بنانے والے تمام نابالغ بچوں سے بھی اوپر، اس مینار پر، میں اب تک صرف کسی خاص وجہ سے ہی چیخا ہوں، اور ایک بلا معاوضہ چیخنے والا بن گیا ہوں۔اس روز تک، جب مجھے اسٹاک ٹرم پر چڑھنے کی دھن ہو گئی تھی، میں نے اپنی کاٹ کو شیشوں، بجلی کے بلب، بیئر کی بوتلوں پر ہی استعمال کیا تھا، صرف اس وقت، جب کسی نے میرا نقارہ چھیننے کی کوشش کی تھی؛ اور اب میں اس مینار پر چیخا ہوں، حالاں کہ اس وقت میرے نقارے کو ذرا

سا بھی خطرہ نہیں تھا۔ کوئی بھی آسکر کا نظارہ چھین نہیں رہا تھا، پھر بھی وہ چیختا تھا۔ کسی کبوتر نے اپنی بیٹ سے اس کے نظارے کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ میرے نزدیک، تانبے کے تختوں پر زنگ تھا مگر شیشہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود آسکر چیختا تھا۔ کبوتروں کی آنکھوں میں سُرخی جیسی چمک تھی، مگر کوئی بھی اس کو شیشے کی آنکھ سے دیکھ نہیں رہا تھا، پھر بھی وہ چیختا تھا۔ کس پر چیختا تھا وہ؟ کیا اسے دور کوئی شے دکھائی دی تھی؟ کیا بالاخانے پر اینٹ کا شوربا پینے کے بعد اس نے کسی سائنسی طریقے کا تجربہ کرنا چاہا تھا؟ آسکر کے ذہن میں اس وقت کون سا شیشہ تھا؟ کون سے شیشے پر — اور اس کو شیشہ ہی ہونا تھا — آسکر تجربہ کرنا چاہ رہا تھا؟

دراصل وہ اشتات تھیٹر، یعنی ڈرامائی کافی پینے والی مشین تھی، جس کی کھڑکی کے چمکتے شیشوں نے، آداب پرست، جدت پسند لچھوں کو اپنی جانب متوجہ کیا تھا، میں نے پہلی بار جسے اپنے بالاخانے پر استعمال کیا تھا۔ چند منٹ کی مختلف درجے کی چیخوں سے جنھیں کچھ حاصل نہیں ہوا تھا، میں ایک تقریباً بے آواز لہجہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا، اور ایک لمحے بعد آسکر پر، یہ دیکھ کر ایک تفاخر آمیز خوشی طاری ہو گئی تھی کہ تھیٹر کی لابی کی آخری دو کھڑکیوں کے درمیان دو سیاہ مستطیل علاقے سے بن گئے تھے جنھوں نے اپنے حصے کی کرنوں کو منعکس کرنا چھوڑ دیا تھا، جلد ہی جن کو کسی شیشہ بدلنے والے کی توجہ کی ضرورت ہوگی۔

ابھی اس اثر کی تصدیق باقی تھی۔ جدید دور کے ایک مصور کی طرح، جو بالآخر وہ طرز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو، ایک عرصے سے جس کی تلاش میں تھا، اس کی تکمیل کرتا ہے، اپنی پختگی کو آشکار کرتا ہے اور اپنے طرز کی درجنوں مثالیں بناتا ہے، جو ایک جیسی دلیرانہ اور شان دار ہیں، میں نے بھی ایک تخلیقی دور میں قدم رکھ دیا تھا۔

ابھی ایک چوتھائی گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ میں لابی کی تمام کھڑکیوں اور کچھ دروازوں کو ان کے شیشوں سے محروم کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایک ہجوم — جہاں میں کھڑا تھا وہاں اس کو پُرجوش ہجوم کہا جائے گا — تھیٹر کے باہر اکٹھا ہو گیا تھا، مگر ہمیشہ کوئی احمق ترین واقعہ ہی ہجوم اکٹھا کیا کرتا ہے۔ میرے فن کے پسند کرنے والوں نے مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں چھوڑا تھا۔ زیادہ سے زیادہ، انھوں نے آسکر کو اپنے فن کو منظم کرنے پر راغب

کیا تھا، تا کہ وہ اس میں زیادہ باقاعدگی اور نفاست پیدا کر سکے۔ میں ایک مزید دلیرانہ تجربے کے ذریعے سب کچھ واضح کر دینا چاہتا تھا، کھلی راہداری کے ذریعے ایک خاص صدا کی ذریعے، اندھیرے تھیٹر کے کسی دروازے میں بنے کنجی کے سوراخ کے ذریعے، ایک صدا کے ذریعے جو اندھیرا کرنے والوں کے گھمنڈ پر ضرب لگا سکے، اس فانوس پر اور اس کے تمام پالش کیے ہوئے، ہر پہلو سے، روشنی منعکس اور واپس کرنے والے پرزوں پر۔ اور جب نظر زنگ جیسے بھورے مادے پر ٹکی تھی جو تھیٹر کے باہر کے مجمعے میں تھا: مما اپنی mocha کافی پینے کے بعد اور جان برانسکی کو چھوڑ کر کینیفے وائز کے سے واپس جا رہی تھی۔

پھر بھی مجھے اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ آسکر نے فانوس کو چیخ کا نشانہ بنایا تھا، مگر بظاہر اس کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا، اس لیے کہ دوسرے دن کے اخبارات میں صرف کھڑکیوں اور دروازوں ہی کی باتیں کی گئی تھیں، جن کے شیشے نامعلوم، پُراسرار وجوہ کی بنا پر چکنا چور ہو گئے تھے۔ کئی ہفتے، سائنسی اور نصف سائنسی نظریات کا پرچار کرنے والے روز ناموں کے کالموں کو نفتاسی لغویات سے بھرتے رہے تھے۔ Neueste Nachrichten نے کائناتی وسعتوں سے آنے والی شعاعوں کی بات کی تھی۔ مقامی رصدگاہ کے، بلا شبہ، باخبر ملازمین نے سورج کے دھبوں کو ذمے دار ٹھہرایا تھا۔

میں پیچ دار سیڑھیوں سے تیزی سے، جس قدر میرے چھوٹے چھوٹے پاؤں سہار سکتے تھے، اترا۔ میرا سانس چڑھا ہوا تھا، اور میں تھیٹر کے باہر مجمعے میں شامل ہو گیا تھا۔ مما کا زنگ کے رنگ کا خزاں کا لباس کہیں نظر نہیں آیا، کہ بلاشبہ وہ مارکس کی دُکان میں میری آواز کی لائی ہوئی تباہی کے بارے میں اسے بتا رہی تھی۔ اور مارکس جو میری نام نہاد پس ماندگی اور ہیرے جیسی کاٹ والی آواز کا پوری طرح قائل ہو گیا تھا، اپنی زبان نکالتا اور اپنے زردی مائل سفید ہاتھ ملتا رہا ہوگا۔

میں دُکان میں داخل ہوا تو میرے سامنے وہ منظر تھا جو مجھے گانے والے کی حیثیت میں ہونے والی اپنی تمام کامیابیوں کو بھلا دینے کے لیے کافی تھا۔ مارکس مما کے آگے گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا اور تمام روئیں دار جانوروں کے کھلونے، ریچھ، بندر، کتے،

آنکھیں کھولنے اور بند کر لینے والی گڑیاں، آگ بجھانے والے انجن، آگے پیچھے چلنے والے گھوڑے، حتیٰ کہ وہ اچھل کود کرنے والے کھلونے بھی جو دُکان کی حفاظت کرتے ہیں، سب کے سب، اس کے ساتھ جھک جانے والی منزل پر نظر آرہے تھے۔ مارکس ممّا کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھا، اس کے ہاتھوں کی پشت پر بھوری خون آلود رنگت کے دانے نکلے دکھائی دے رہے تھے، اور وہ رو رہا تھا۔

ممّا بھی بہت سنجیدہ نظر آ رہی تھی، گویا وہ بھی اس صورتِ حال کی نزاکت کے مطابق، اس کے طرف متوجہ تھی۔ ''نہیں مارکس — نہیں'' وہ کہہ رہی تھی ''پلیز — مارکس، یہاں — دُکان پر نہیں —''

مگر مارکس رُکے بغیر، کہے جا رہا تھا۔ وہ ذرا زیادہ ہی بول رہا تھا، پھر بھی اس کی منت سماجت بھری آواز کے اتار چڑھاؤ کو میں کبھی نہیں بھول سکوں گا:

''برانسکی کے ساتھ یہ سب مت کرو — دیکھو نا — وہ ڈاک خانے کا ملازم ہے۔ وہ پولش لوگوں کے ساتھ ہے — یہ اچھی بات نہیں ہے — پولش لوگوں پر انحصار نہ کرو — اگر تمھیں کسی پر انحصار کرنا ہی ہے تو جرمنوں پر کرو — وہ آگے بڑھ رہے ہیں — جلد یا بدیر — اگر وہ چھا گئے اور مسز ماتسیرات برانسکی پر انحصار کرتی رہی تو کیا ہوگا؟ اچھا — اگر تم ماتسیرات پر انحصار کرنا چاہو تو، وہ تو تمھارا ہے ہی — یا پھر مجھ پر ایک احسان کرو — اس غریب مارکس پر انحصار کرو — یہ سمجھتے ہوئے کہ آج ہی اس کا بپتسمہ ہوا ہے — ہم لندن چلے جائیں گے — وہاں میرے بہت سے دوست ہیں — کمپنیوں کے حصص ہیں میرے پاس — تم میرے ساتھ چلنے کا فیصلہ کرو — اچھا — اگر تم مارکس کے ساتھ جانے کا فیصلہ نہیں کرنا چاہتیں — تو مجھ سے نفرت کرنے لگو — مگر میں تم سے التجا کرتا ہوں، تمھارے پاؤں پڑ کر، کہ برانسکی سے ملنا بند کر دو — وہ اتنا احمق ہے کہ اس وقت بھی پولش ڈاک خانے سے چمٹا ہوا ہے — جب جرمن لوگ آگے آئیں گے تو سارے پولش غائب ہو جائیں گے۔''

ممّا — اتنے سارے امکانات اور عدم امکانات کے باعث — رونے ہی والی تھی کہ مارکس نے مجھے دروازے سے آتا دیکھ لیا تھا، اور اپنی پانچوں بولتی ہوئی انگلیوں سے

میری جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''پلیز۔ مسز ماتسیرات، ہم اس کو بھی اپنے ساتھ لندن لے جائیں گے۔ ہم اسے شہزادے کی طرح رکھیں گے۔''

مما نے مڑ کر میری طرف دیکھا، اور مسکرائی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ تھیٹر کی لابی کی کھڑکیوں کے بارے میں سوچ رہی ہو، یا لندن شہر کا خیال تھا جس نے اس کو خوش کر دیا تھا۔ مگر مجھے حیرت ہوئی جب اس نے اپنا سر ہلایا اور آہستگی سے کہا، گویا وہ رقص کی دعوت سے انکار کر رہی ہو۔ ''شکریہ مارکس، مگر یہ سب ممکن نہیں۔ واقعی، برانسکی کی بابت تو یہ بالکل ہی ممکن نہیں۔''

میرے انکل کا نام آتے ہی مارکس کھڑا ہو گیا اور ایک بڑے چاقو کی طرح جھکا ''معاف کرنا'' اس نے کہا، ''یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا۔ اس کی طرف سے تو تم یہ نہیں کر سکتیں۔''

ابھی دُکان بند ہونے کا وقت نہیں ہوا تھا کہ ہم دونوں دُکان سے باہر آ گئے، مگر مارکس نے باہر سے دُکان بند کر دی تھی اور ہم کو ٹرام کے اسٹاپ تک چھوڑنے آیا تھا۔ گزرنے والے لوگ اور چند پولیس والے ابھی تک تھیٹر کے باہر کھڑے ہوئے تھے، مگر میں بالکل خوف زدہ نہیں تھا۔ میں اپنی کامیابی تقریباً بھول چکا تھا۔ مارکس نے بہت قریب آ کر سرگوشی میں، ہم دونوں کے بجائے، خود سے کہا، ''وہ ننھا آسکر— وہ نقارے پر چوٹ مارتا ہے، تو تھیٹر پر قیامت آ جاتی ہے۔''

ٹوٹے ہوئے شیشوں نے مما کو پریشان کر دیا تھا، مگر مارکس نے کچھ ایسی حرکات و سکنات کیں جو اس کے اپنے ذہن کو مطمئن کرنے کے لیے تھیں۔ اس کے بعد ٹرام آ گئی، اور ہم ٹرام پر سوار ہو رہے تھے کہ اس نے آخری درخواست کی، اتنی دھیمی آواز میں کہ اسے کوئی اور نہ سن سکے، ''اچھا، اگر یہ بات ہے تو، مہربانی کر کے ماتسیرات کے ساتھ ہی رہو کہ وہ تمھارا ہے ہی، اب اس پولینڈ والے کے پاس نہ جانا۔''

آج، اسپتال میں لیٹے بیٹھے، بلکہ ہر حال میں نقارہ نوازی کرتے ہوئے، جب آسکر [اپنے خیالوں میں] 'آرسنل پیسج' سے گزرتا ہے، اسٹاک ٹرم جاتا ہے، وہاں کے قید خانے کی دیواروں پر نوشتوں، عقوبت کرنے والے تیل لگے آلات کو دیکھتا ہے، اور جب اشتات تھیٹر کی

ان تین بیرونی کھڑکیوں پر نظر کرتا ہے، اور پھر 'آرسنل پینیج' اور سیگیس منڈ مارکس کی دکان میں واپس آتا ہے، اور ستمبر کے اس دن کو یاد کرتا ہے تو پولینڈ کو بھلا نہیں سکتا۔ کس طرح اس کو تلاش کرتا ہے — اپنی چوب نقارہ سے۔ کیا وہ پولینڈ کو اپنی روح کے ذریعے تلاش کرتا ہے؟ وہ اپنے وجود کے ہر عضو کے ذریعے اسے تلاش کرتا ہے، مگر روح تو عضو نہیں ہوا کرتی!

میں پولینڈ والوں کی سرزمین کی تلاش میں ہوں، جو کم از کم اس وقت جرمنوں کے قبضے میں ہے۔ آج کل جرمنوں نے پولینڈ کو قرضوں کے ساتھ، لائیکاؤں [پہلی کتیا کا نام لائیکا تھا جسے روسیوں نے خلا میں بھیجا تھا]، قطب نماؤں، ریڈاروں، طلسمی چھڑیوں، وفود اور طلبہ کی انجمنوں کے کپڑے لگے لباسوں کے ساتھ تلاش کرنا شروع کر دیا ہے۔ کچھ اپنے دلوں میں Chopin، جب کہ دوسرے لوگ بدلہ لینے کی آرزو لیے پھرتے ہیں۔ پولینڈ کی پہلی چار تقسیم کو رد کرتے ہیں مگر پانچویں تقسیم کے منصوبے بنا رہے ہیں؛ اور اس دوران ایئر فرانس کے ذریعے وارسا جاتے ہیں، مناسب پشیمانی کے ساتھ، اس مقام پر پھول رکھنے کے لیے جو کبھی یہودی پاڑہ تھا۔ کسی دن وہ لوگ راکٹ لیے لوگ، پولینڈ کو تلاش کرتے پھریں گے۔ اس دوران میں اپنے نقارے میں پولینڈ کو ڈالے لیتا ہوں۔ اور یہی تو میں اپنے نقارے پر گاتا پھرتا ہوں:

پولینڈ چھن گیا ہے — مگر ہمیشہ کے لیے نہیں
سب کچھ کھو گیا ہے — مگر ہمیشہ کے لیے نہیں
پولینڈ ہمیشہ کے لیے کھویا نہیں ہے

# شہ نشین

یہ اشتات تھیٹر کی لابی کی کھڑکیوں کی مسماری تھی جس نے مجھے ڈرامے کے فن سے متعارف کرایا تھا۔ مارکس کی توجہات کی ناپسندیدگی کی وجہ سے ممانے اس شام تھیٹر سے میرے براہِ راست رشتے کو دیکھا ہوگا، اس لیے کہ جب کرسمس کی تعطیل کے دن آئے تو اس نے اپنے لیے، اسٹیفن کے لیے، مارگا برانسکی کے لیے اور آسکر کے لیے تھیٹر کے چار ٹکٹ خریدے تھے اور بعثتِ مسیح کے آخری اتوار وہ ہمیں خاص کرسمس کے لیے پیش کیا جانے والا کھیل دکھانے لے گئی تھی۔ آرکسٹر کے اوپر آویزاں عالی شان فانوس نے مجھے لبھانے کی بہت کوشش کی تھی، اور میں خوش تھا کہ مجھے اس کو ٹکڑے کردینے کے لیے گانا نہیں پڑا تھا۔

اس زمانے میں بھی لوگوں کے بہت سارے بچے ہوا کرتے تھے۔ بالکنی میں، ماؤں کے مقابلے میں بچے زیادہ ہوتے تھے، جب کہ آرکسٹرا کے دوران آنے والے خوش حال لوگوں میں مرد/عورت کا توازن تقریباً برابر ہی تھا، جو حمل اور بچے جننے کے بارے میں زیادہ محتاط معلوم ہوتے تھے۔ بچے چین سے کیوں نہیں بیٹھ سکتے؟ مارگا برانسکی جو میرے اور نسبتاً شریفانہ مزاج اسٹیفن کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی اپنی کرسی سے، جو فوراً خود بخود تہہ ہو جانے والی تھی، کھسک گئی تھی، دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے کی کوشش کرنے لگی تھی، کہ اسے بالکنی کی پیرگی باڑ پر لٹک کر جمناسٹک کرنے میں زیادہ دل چسپی پیدا ہوئی تھی، واپسی پر اپنی تہہ ہو جانے والی کرسی میں پھنس گئی، اور چیخنا شروع کردیا تھا، مگر اتنی زور سے نہیں چیخی تھی جتنا

کہ ہمارے اطراف بیٹھے ننھے شیطان تھوڑی تھوڑی دیر بعد چیخ رہے تھے، اس لیے مما کہ نے عقل مندی کی تھی کہ فوراً اس کے کھلے ہوئے منہ میں چاکلیٹ ڈال دی تھی۔ چاکلیٹ کھاتے ہوئے، اور اپنی کرسی سے زور اندازی کرتے ہوئے، مارگا کو، کھیل شروع ہوتے ہی نیند آ گئی تھی، مگر کھیل کے ہر ٹکڑے کے اختتام پر تالی بجانے کے لیے اس کو اٹھا دیا جاتا تھا، اور وہ بہت جوش وخروش سے تالی بجاتی تھی۔

اس کھیل کا نام تھا 'نام تھمب'، جس میں مجھے بہت دل چسپی تھی، اور اس نے ابتدا ہی سے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ کھیل بڑی مہارت سے پیش کیا گیا تھا۔ نام تھمب کو دکھایا نہیں گیا تھا؛ آپ صرف اس کی آواز سن سکتے تھے، اور بڑے قد کے لوگ ہمیشہ اس کو تلاش کرتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ دکھائی نہیں دیتا تھا مگر بہت اُچھل کود کرنے والا تھا۔ اِدھر وہ کسی گھوڑے کے کان میں بیٹھا ہوا ہے؛ اُدھر اس کا باپ اسے کسی tramp کے ہاتھوں اچھے داموں فروخت کر رہا ہے؛ اب وہ گھوم پھر رہا ہے، بہت بلندی پر، tramp کی ہیٹ پر بیٹھا ہے۔ بعد میں وہ چوہے کے بل میں رینگ کر گھس رہا ہے؛ اس کے بعد گھونگھے کے خول میں؛ ڈاکوؤں کے غول میں شامل ہو رہا ہے، ان کے ساتھ لیٹ بیٹھ رہا ہے؛ اور منہ بھر بھوسا لیے گائے کے پیٹ میں پہنچ گیا ہے؛ اور [خوف سے] گائے کو ذبح کر دیا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ 'نام تھمب' کی آواز میں کلام کرنے لگتی ہے؛ مگر گائے کی اوجھڑی، جس میں نام تھمب موجود ہوتا ہے، کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دی جاتی ہے، جسے ایک بھیڑیا ہڑپ کر جاتا ہے؛ نہایت چالاکی سے، نام بھیڑیے کو اپنے باپ کے گودام میں چوری کرنے پر راضی کر لیتا ہے، اور جوں ہی بھیڑیا اپنا کام شروع کرتا ہے، نام چیخنا شروع کر دیتا ہے۔ کھیل کا اختتام ہمیشہ کی طرح پَری کہانی جیسا ہوتا ہے: باپ بد معاش بھیڑیے کو مار ڈالتا ہے؛ ماں اپنی قینچی سے بھیڑیے کی اوجھڑی چاک کرتی ہے، اور 'نام تھمب' صاحب باہر آ جاتے ہیں۔ بس، آپ ان کے رونے کی آواز سنتے ہیں: ''اوہ، بابا، میں چوہے کی بِل میں رہا ہوں؛ بابا، گائے کے پیٹ میں رہا ہوں، اور بھیڑیے کے پیٹ میں رہا ہوں: مگر، اب میں ہمیشہ گھر میں رہوں گا، تمھارے ساتھ۔''

اس کے اختتام نے مجھے جذباتی کر دیا تھا، اور جب میں نے مڑ کر مما کی طرف دیکھا تو وہ اپنے رومال سے اپنی ناک پونچھ رہی تھی؛ میری ہی طرح، وہ بھی اسٹیج پر ہونے والے کھیل میں شریک ہو گئی تھی۔ مما کے جذبات کو بہت آسانی سے جھڑکا دیا گیا تھا، اور اگلے کئی ہفتوں تک، خاص طور سے کرسمس کے بقیہ دن وہ بار بار مجھے گلے لگاتی، پیار کرتی، اور کبھی ہنستے ہوئے کبھی سنجیدگی سے مجھے 'ٹام تھمب' کہہ کر پکارتی یا میرے ننھے ٹام تھمب یا بیچارہ پیارا 'ٹام تھمب' کہتی رہی۔

سن 33ء کے گرمی کے موسم سے پہلے میں دوبارہ تھیٹر نہیں گیا۔ میری اپنی غلطی کے باعث وہ کوشش اُلٹی ہو گئی تھی، مگر یہ بہت اہم تجربہ تھا جو ہمیشہ میرے ذہن میں محفوظ رہا۔ اس کے اچانک پیش آنے کی گرج آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ جی نہیں، میں ہرگز مبالغہ آرائی نہیں کر رہا ہوں، یہ سب زوپوٹ میں ''اوپیرا ان دی ووڈز'' میں ہوا تھا جہاں ہر سال گرمی کے موسم میں، رات کے وقت کھلے آسمان کے نیچے واگنر [نفیری کی قسم کا باجا] بجایا جاتا تھا۔

ہمارے گھر میں صرف مما ہی تھی جسے اوپیرا میں دل چسپی تھی۔ چھوٹے اوپیرا بھی ماتسیرات کے لیے بہت ہوتے تھے۔ جان نے یہ سب مما سے سیکھا تھا اور 'یک صدائی نغموں' کے بارے میں تو وہ بالکل پاگل تھا، حالاں کہ موسیقی میں شمولیت کے باوجود بھی وہ مکمل طور پر سُر ناشناس تھا۔ پھر بھی اپنے سابقہ 'کارٹ ہاؤس' ہائی اسکول کے ساتھی طلبہ سے اس کی دوستیاں تھیں، جو 'زوپوٹ' میں رہتے تھے، جھیل کنارے کے راستوں پر اور قمار خانے کے باہر کے فوارے پر روشنی کرنا جن کی ذمے داری تھی۔ اس ''جنگل میں منگل'' (Opera-in-the-Woods) کی روشنی کا بھی انتظام وہی کیا کرتے تھے۔

'زوپوٹ' کا راستہ 'اولیوا' سے ہو کر جاتا تھا۔ کاسل پارک میں صبح سویرے کی ہوا خوری، سنہری مچھلیاں اور راج ہنس، مما اور جان بدانسکی مشہور Whispering Grotto میں۔ اس کے بعد مزید سنہری مچھلیاں اور راج ہنس، بظاہر فوٹو گرافر سے ان کی سازباز تھی۔ جب تصویر کھینچی جاتی تھی تو ماتسیرات مجھے اپنے کاندھوں پر چڑھا لیتا تھا۔ اپنے

نقارے کو میں اس کے سر پر رکھ دیا کرتا تھا، جس پر ہم لوگ خوب ہنستے تھے، تصویر کھینچے جانے اور البم میں چپکائے جانے کے بعد بھی ہنستے تھے۔اس کے بعد: خدا حافظ سنہری مچھلی؛ خدا حافظ راج ہنس؛ خدا حافظ Whispering Grotto۔صرف 'کاسل پارک' ہی میں اتوار نہیں آیا تھا بلکہ پھاٹک کے باہر بھی اور 'گلنٹکاؤ' جانے والی ٹرام کار میں بھی، اور 'گلنٹکاؤ' قمارخانے میں بھی، جہاں ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا تھا، جب کہ بحرِ بالٹک، جیسے کہ اس کے پاس کچھ کرنے کو نہ ہو، ہم کو نہانے کی دعوت دے رہا تھا؛ گویا ہر طرف اتوار ہی اتوار تھا۔ہم جب ساحل کنارے ہوتے ہوئے 'زوپوٹ' پہنچے تو، اتوار ہم سے ملنے باہر آیا اور ماتسیرات کو ہم سب کے داخلے کے لیے رقم دینی پڑی تھی۔

ہم نے جنوبی ساحل پر غسل کیا، اس لیے کہ اس دن شمالی ساحل کے مقابلے میں یہاں کم مجمعے کی توقع تھی۔ مردوں نے مردوں کے لیے مخصوص کیبن میں کپڑے تبدیل کیے۔ مما مجھ کو عورتوں کے کیبن میں لے گئی جہاں اس نے اپنے بدن کا سارا گوشت، جو لباس کے کناروں سے اُبلنے لگا تھا پیال کے رنگ کے نہانے کے سوٹ میں انڈیل دیا۔ مجھے برہنہ ہی رہنا تھا۔ اپنی شرم گاہ کو ہزاروں نظروں کے تیروں سے بچانے کے لیے میں نے اپنے نقارے کو ڈھال بنا لیا، اور بعد میں پیٹ کے بَل ریت پر لیٹ گیا تھا۔بالٹک کا پانی دعوتِ غسل دے رہا تھا، مگر میرا جی پانی میں جانے کو چاہ نہیں رہا تھا، شتر مرغ کی طرح میں نے اپنی حیا کو ریت میں چھپانا پسند کیا تھا۔ ماتسیرات اور جان برانسکی دونوں اپنی توندوں میں اتنے نامعقول، بلکہ رقت انگیز لگ رہے تھے۔ہم لوگ سہ پہر کے بعد حمام میں واپس پہنچے اور اپنے جسم پر سورج کی تمازت سے بننے والے دھبّوں پر کریم لگا کر شہریوں کا عام لباس پہنا تو بہت سکون ہوا۔

'سیسعرن' میں کافی اور کیک میسر تھے۔مما نے پانچ منزلہ کیک میں سے تیسری بار مزید لینا چاہا۔ ماتسیرات اس کے خلاف تھا، جان اس کے خلاف بھی اور موافق بھی تھا۔مما نے کیک کا آرڈر دے دیا، ماتسیرات کو بھی ایک لقمہ کھلایا، ایک چمچہ پھر جان کو بھی دیا، اور اپنے آدمیوں کی صحت مندی برقرار رکھنے کے لیے کچھ دے کر، بقیہ مکھنی میٹھا چمچے

تہچے اپنے پیٹ میں بھر لیا۔

اے متبرک چکنائی! اے پسی چپٹی ملی خاکی اتوار کی خاکی سہ پہر! پولینڈ کے اشراف نیلے رنگ کے دھوپ کے چشمے پہنے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے بغیر الکحل کے تیز مشروب رکھے رہے جنھیں انھوں نے چھوا بھی نہیں۔ خواتین اپنے بنفشئی رنگ میں رنگے ناخنوں سے کھیل رہی تھیں اور سمندری ہوا ہم تک فر سے بنی، بغیر آستینوں کی قباؤں کی خوش بو اڑا کر لا رہی تھی، جنھیں پہننے کے لیے کرایے پر لیا گیا تھا۔ ماتسیرات کا خیال تھا کہ فر سے بنی قبائیں احمقانہ ہوتی ہیں۔ اگر لی ہوتی تو مما نے، صرف ایک سہ پہر کے لیے لی ہوتی۔ جان کا خیال تھا کہ پولش لوگوں کی شرافت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ بڑھتے ہوئے قرض کے باوجود انھوں فرانسیسی زبان بولنی بند کر دی ہے، اور محض اپنے گھمنڈ کے باعث معمولی درجے کی پولش زبان میں بات کرنی شروع کر دی ہے۔ ہم نیلے رنگ کے چشمے اور بنفشئی ناخنوں کو دیکھنے کے لیے ہمیشہ تو 'مسیسر ن' میں بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ کیک سے بھری میری مما کو کسرت کی ضرورت تھی۔ ہم اکٹھے کیسینو پارک گئے، جہاں مجھے گدھے پر بیٹھنا تھا اور ایک اور تصویر کے لیے بیٹھنا تھا۔ سنہری مچھلی اور راج ہنس — فطرت اس کے علاوہ اور کیا سوچ رہی ہے — مزید سنہری مچھلیاں، مزید راج ہنس اور میٹھا پانی اور کس کام آئے گا؟

مگر، نفاست سے چھانٹے گئے صدا بہار صنوبر نما درختوں، Yew کے درمیان جنھوں نے سرگوشی نہیں کی جیسی کہ کرنی چاہیے تھی، ہماری ملاقات فورمیلا برادران سے ہوئی جو قمار خانے اور Opera-in-the-Woods کے میدانوں میں روشنی کرنے کے ذمے دار تھے۔ پہلے تو کم عمر فورمیلا نے اپنے تمام لطیفے سنا دیے، جو روشنی کرنے کی پیشہ ورانہ ذمے داریاں پوری کرنے کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔ بڑے فورمیلا بھائی کو سارے لطیفے ازبر تھے مگر برادرانہ محبت، اس کو موزوں مراحل پر ہنسنے پر مجبور کر رہی تھی، جس کے، تین بھائیوں میں سے ایک نے، اپنے چھوٹے بھائی کے مقابلے میں زیادہ، ایک سونے کا دانت لگوا رکھا تھا۔ ہم 'اسپر نگر' نام کے مے خانے جشن نوشی کے لیے گئے، جب کہ مما 'گر فورسٹ' جانا زیادہ پسند کرتی۔ پھر، کبھی نہ ختم ہونے والے لطیفوں کے انبار سے محظوظ ہوتے ہوئے، جو

جاری تھے، نہایت فیاض چھوٹے بھائی نے ہمیں 'پاپا گائی' میں رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔
'پاپا گائی' میں ہماری ملاقات نوشیل سے ہوئی جو، زوپوٹ میں Opera-in-the-Woods
کے نصف کا، اور پانچ سینماؤں کا مالک تھا۔ وہ فورمیلا بھائیوں کا سابقہ افسر بھی تھا اور اسے
ہم لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی تھی، اسی طرح، جیسے کہ ہم اس سے مل کر خوش ہوئے تھے۔
نوشیل مستقل اپنی انگلی کی انگوٹھی گھمائے جارہا تھا، مگر یہ کوئی منّتی یا جادوئی انگوٹھی نہیں رہی
ہوگی، اس لیے کہ اس کے اس عمل سے کچھ نہیں ہوا تھا، سوائے اس کے کہ نوشیل نے بھی لطیفے
سنانے شروع کر دیے تھے، وہی فورمیلا والے لطیفے جو ہم پہلے بھی سن چکے تھے، حالاں کہ اس
نے ان لطیفوں کو زیادہ پیچیدہ بنا دیا تھا، کہ اس کے منہ میں سونے کے دانت کم تھے۔ پھر بھی،
میز پر بیٹھے سب ہنستے رہے، اس لیے کہ اس بار نوشیل لطیفے سنا رہا تھا۔ اکیلا میں سنجیدہ بیٹھا،
اپنی چہرے کی بے ناگری سے اس کے بیپ کے جملوں کی ہوا نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔
اُف! خورد و نوش کے لیے مخصوص گوشے کو الگ کرنے والے ہمارے پارٹیشن میں لگے،
bull's-eye جیسے شیشوں کی طرح کی قہقہوں کی یہ بوچھاڑ، اگر وہ واقعی اصلی بھی تھی، تو ہمارے
کس کام کی تھی۔ نوشیل بظاہر خوش تھا، اس نے کچھ اور لطیفے سنائے، مزید بیئر کا آرڈر دیا، اور
اس نے بیئر اور قہقہوں میں مگن، اچانک اپنی انگوٹھی کو الٹا گھمایا۔ اور اس بار واقعی کچھ ہو گیا
تھا۔ نوشیل نے ہم سب کو Opera-in-the-Woods میں مدعو کیا تھا؛ بدقسمتی سے اپنی کچھ
مصروفیات وغیرہ کی وجہ سے وہ خود نہیں پہنچ سکا تھا مگر ہم نے اس کی پیش کش قبول کر لی
تھی۔ وہاں کی کرسیاں گدے دار، اتنی آرام دہ تھیں کہ وہ چھوٹا، اگر تھکا ہو، تو آرام سے سو
سکتا تھا: اس نے چاندی کی نئی تکنیکی پنسل سے نوشیل کے ہاتھوں، نوشیل کے تعارفی کارڈ پر
کچھ الفاظ لکھے؛ اور، اس نے کہا تھا کہ یہ سارے دروازے کھول دے گا، اور ایسا ہی ہوا۔

اس کے بعد کیا ہوا اس کو چند لفظوں میں بیان کیا جا سکتا ہے: اس چپ چپ
کرتی شام، Opera-in-the-Woods کے سارے ٹکٹ فروخت ہو گئے تھے۔ اوپرا غیر
ملکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ابھی کھیل شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ مچھر آ موجود ہوئے۔ اور جب
آخری مچھر نے، ہمیشہ جو، حسینوں کی طرح آخری وقت پر آتا ہے، اپنی خون کی پیاسی بھنبھن

بجن کے ذریعے اپنی آمد کا اعلان کیا، تبھی کھیل شروع ہوا تھا۔ کھیل کا نام Flying Duchman تھا۔ ایک جہاز، بحری قزاق کے بجائے جو چور شکاری لگ رہا تھا، جنگل کی جانب سے بہتا آ رہا تھا، اور اسی کے باعث اس کو Opera-in-the-Woods کا نام دیا گیا تھا۔ جہاز کے ملاحوں نے پیڑوں کی طرف دیکھ کر گانا شروع کر دیا تھا۔ مجھے نوشیل کی گدّے والی کرسی پر نیند آ گئی تھی، اور جب میری آنکھ کھلی تو ملاح گا رہے تھے، یا ہو سکتا ہے کہ وہ مختلف ملاّح تھے:— Helmsman —جاگتے رہنا—، مگر آسکر کو ایک بار پھر نیند آ گئی تھی، اور اس نیند سے خوش، لہروں پر پھسلتے اور بچے واگنری (جرمن موسیقار رچرڈ واگنر کے) جذبے میں گائے جانے والے گیتوں کے دوران مما Duchman میں بہت دل چسپی لے رہی تھی۔ اس کو نظر نہیں آیا تھا کہ ماتسیرات اور اس کے جان نے اپنے چہرے اپنے ہاتھوں سے چھپا رکھے تھے، اور مختلف موٹائی کے لٹھوں کو آرے سے کاٹ رہے تھے۔ پھر اچانک آسکر واقعی جاگ گیا تھا، اس لیے کہ جنگل میں اکیلی کھڑی ایک عورت اپنی پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔ اس کے بال پیلے تھے، اور وہ چلّائے جا رہی تھی، اس لیے کہ ایک اسپاٹ لائٹ، جسے شاید چھوٹا فورمیلا آگے پیچھے کر رہا تھا، اس کو تقریباً اندھا کر رہی تھی، ''نہیں'' اس نے چلاّ کر کہا، ''مجھ پر رحم کرو'' اور ''کون ہے جس نے مجھے اتنا پریشان کر رکھا ہے؟'' مگر فورمیلا نے، جو اس کو دکھ دے رہا تھا، اسپاٹ لائٹ جتائی نہیں۔ اس اکیلی عورت کی چیخ— جسے بعد مما نے soloist کہا تھا— کم ہو کر گھٹتی ہوئی ریں ریں ہو گئی تھی، مگر ایک بار پھر آواز اُبلتے ہوئے ایک نقرئی فوارے میں ابھری، جس نے پیڑوں کی پتیوں کو قبل از وقت کرم خوردہ کر دیا تھا، مگر جس کا فورمیلا کی اسپاٹ لائٹ پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک شان دار آواز تھی، مگر اس کی کوششیں کام نہیں آئیں۔ اب آسکر کے بیچ میں پڑنے کا وقت تھا، اس نا وقت روشنی کے مآخذ کو تلاش کرنے اور اس کو، دور دراز کی، مچھروں کی مستقبل بجن بجن سے بھی نیچے سُر کی چیخ سے تباہ کر دینے کا۔ میرا منصوبہ کوئی قصرِ دور (شارٹ سرکٹ) کرنے کا، اندھیرا کرنے کا، چنگاریاں اڑانے کا، جنگل میں خوف پھیلانے والی آگ لگانے کا نہیں تھا، جو جلد بجھائی جا سکے۔ مجھے کچھ حاصل نہیں

ہونے والا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں نے انتشار کی کیفیت میں مما اور دو جاگے ہوئے حضرات کو کھو دیا تھا؛ میرا نقارہ بھی گم ہو گیا۔

تھیٹر سے میرے اس تیسرے مجادلے سے میری ماں مل گئی، جس نے Opera-inthe-Woods کی اس شام کے بعد، ہمارے پیانو پر، آسان انداز میں واگنر کو پالتو بنانے کی اور مجھے سرکس لے جانے کے خیال کی ابتدا کر دی تھی ۔اور یہ منصوبہ 1934 کے موسمِ بہار میں پورا ہوا۔ آسکر کا، جمناسٹک کے جھولے پر تیر کی طرح جاتے کرتب دکھانے والے فن کاروں، خوف ناک چیتوں یا آبی جانور سیل (seals) کی نا قابلِ یقین ہنر مندی کے ذکر سے آپ کے کان کھانے کا ارادہ نہیں۔ سرکس کے گنبد کے اندروں کوئی بھی سر کے بل نہیں گرا تھا۔ جانوروں کو سدھانے والوں کے جسم سے کچھ نہیں کاٹا نہیں گیا تھا۔اور سیل نے بس وہی کچھ کیا جو انھیں سکھایا گیا تھا: وہ بڑے بڑے گیندوں سے کھیلتی تھیں اور اس کے صلے میں ان کے لیے زندہ مچھلیاں ہوا میں اچھال دی جاتی تھیں، جنھیں وہ اچھل کر پکڑ لیتی تھیں۔ میں سرکس کا احسان مند ہوں، ان بے شمار دل خوش کن گھنٹوں کے لیے، اور موسیقار بیرا (Bebra) مسخرے سے ملاقات کے لیے، جو میری زندگی میں بہت اہم ثابت ہوئی ہے، جس نے بوتلوں پر چل کر Jimmy the Tiger کا کردار کیا تھا، اور للی پٹ کے بونوں کے ایک گروہ کو ہدایت دی تھی۔ ہماری ملاقات جانور خانے میں ہوئی تھی، جہاں مما اور اس کے محسن کے دو پرستار بندروں کے ہاتھوں بندر بننے کی کوشش کر رہے تھے۔

ہیڈ وِگ برانسکی، جو صرف ایک بار ہمارے ساتھ آئی تھی، اپنے بچوں کو ٹٹو دکھا رہی تھی۔ ایک شیر کو اپنی جانب جمائی لیتے ہوئے دیکھنے کے بعد، میں بری بیوقوفی سے، ایک اُلو سے الجھ پڑا تھا۔ میں نے اس کو گھور کر شکست دینے کی کوشش مگر اس نے مجھے گھور کر شکست دے دی تھی۔ آسکر جلتے ہوئے کانوں اور اندرونی شکست خوردگی کے ساتھ رینگتا رہا، اور اس نے دو نیلے رنگ کے ٹھیلوں کے درمیان پناہ لے لی تھی، اس لیے کہ وہاں سوائے دو بندھے ہوئے بونے بکروں کے کوئی اور جانور نہیں تھا۔

وہ گیلس لگائے چپل پہنے ہوئے تھا اور اس نے پانی کا ایک برتن اٹھا رکھا تھا۔

گزرتے ہوئے ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور ہم ایک دوسرے کو فوراً پہچان گئے۔ اس نے اپنا برتن رکھ دیا، اپنے عظیم سر کو ایک جانب جھکایا، اور میری طرف آیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے تقریباً چار انچ بڑا تھا۔

"ذرا دیکھو تو—" اس کی برہم سی آواز میں رشک کی آمیزش تھی، "اس زمانے میں تین برس کی عمر والے ہوتے ہیں جو اپنی نشوونما کو روک دینے کا فیصلہ خود کرتے ہیں۔" جب میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پھر بولا، "میرا نام ہیرا ہے، اور میں شہزادہ ایوجینی کی اولاد میں سے ہوں، جن کا باپ شاہ لوئی چہاردہم تھا، Savoyard کا نہیں [فرانس، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے درمیان کا ایک علاقہ] جیسا کہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔ پھر بھی میں نے کچھ نہیں کہا، مگر وہ جاری رہا، "اپنی دسویں سالگرہ پر میں نے اپنی نشوونما روک دی تھی۔ دیر آید دُرست آید۔"

چوں کہ وہ کھلے دل سے بات کر رہا تھا، میں نے اپنا تعارف کرایا، مگر اپنے شجرے کی لغویات کے بغیر۔ میں صرف آسکر تھا۔

"اچھا پیارے آسکر، تم چودہ پندرہ برس کے تو ہو گے۔ شاید سولہ برس کے؟ کیا کہا—صرف ساڑھے نو برس کے؟ تم مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟"

اب میری باری تھی، عمر کا اندازہ لگانے کی۔ میں نے جان بوجھ کر کم عمر بتائی تھی۔

میرے پیارے نوجوان، تم بڑے چاپلوس ہو۔ پینتیس؟ وہ تو کسی زمانے میں تھی۔ اگست کے مہینے میں میری ترپنویں سالگرہ ہو گی۔ میں تمھارا دادا ہو سکتا ہوں۔"

آسکر نے اس کی قلابازی اور مسخرے پن کے بارے میں کچھ اچھے الفاظ کہے، اور اس کو موسیقی فہمی کی داد دی۔ اس کے ساتھ ہی میری خواہش بڑھی اور میں نے از خود ایک چھوٹا سا کرتب دکھا دیا۔ پہلے میں نے تین بلب اُڑا دیے۔ شاباش، بہت اچھے۔ مسٹر ہیرا چلایا، اور اس نے آسکر کو اپنے سرکس میں فوری بھرتی کی پیش کش کر دی۔

مجھے آج بھی افسوس ہے کہ میں نے اس کی پیش کش ٹھکرا دی تھی۔ میں نے یہ کہہ کر اس جال سے نکلنے کی کوشش کی تھی، "مسٹر، ہیرا میں خود کو دیکھنے والوں میں دیکھنا

پسند کرتا ہوں۔ میں اپنے فن کو تنہائی میں بڑھاتا ہوں، ہر قسم کی تحسین سے دور۔ مگر، مجھے تمھاری تحسین کرنے میں خوشی محسوس ہو رہی ہے۔" مسٹر ہیرا نے جھریوں بھری ایک انگلی اٹھائی اور مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا، "میرے پیارے آسکر، اپنے تجربے کار ساتھی پر یقین کرو۔ ہماری قسم کے لوگوں کی دیکھنے والوں میں کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ہمیں اپنا کام کرنا چاہیے، ہمیں اپنے شو کو چلانا چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو اس کو دوسرے لوگ چلانے لگیں گے۔ اور وہ اس کو بچوں کی طرح تو نہیں چلائیں گے۔"

اس کی آنکھیں کسی پہاڑی انسان کی طرح پرانی ہو گئیں، اور وہ میرے کان میں تقریباً رینگ گیا، "وہ آ رہے ہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔ وہ سارے مرغزاروں پر قبضہ کر لیں گے، جہاں ہم اپنے خیمے ڈالتے ہیں۔ وہ مشعل بردار جلوس نکالیں گے۔ وہ شہ نشین بنائیں گے، اور ان کو بھریں گے اور شہ نشینوں سے وہ ہماری بربادی کی تبلیغ کریں گے۔ جوان آدمی، اپنا خیال رکھنا۔ یاد رکھو کہ تم کو ہمیشہ شہ نشین ہونا ہے، کبھی لوگوں کے سامنے بیٹھنا نہیں۔"

میرا نام سن کر اس نے اپنا برتن اُٹھایا، "دوست، وہ تمھیں تلاش کر رہے ہیں۔ ہم پھر ملیں گے۔ ہم ایک دوسرے کو کھودینا برداشت نہیں کر سکتے۔" ہیرا ہمیشہ کہتا ہے، "ہمارے جیسے لوگ سب سے زیادہ مجمعے والے شہ نشین پر ہمیشہ جگہ بنا سکتے ہیں۔ اگر اوپر نہیں تو نیچے، سامنے کبھی نہیں۔" ہیرا یہی کہتا ہے، جو شہزادے ایوجین سے آنے والی شجرے کی سیدھی لکیر سے آیا ہے۔

آسکر کو بلاتے ہوئے، مما بالکل صحیح وقت پر ایک ٹریلر کے پیچھے سے اتری اور اس نے مسٹر ہیرا کو میرے ماتھے کا بوسہ لیتے دیکھ لیا تھا۔ پھر اس نے پانی کا برتن اُٹھایا اور اپنے کندھے ہلاتا دوسرے ٹریلر کی طرف چلا گیا۔

مما بہت غضب ناک ہو رہی تھی، "کیا تم سوچ سکتے ہو۔" اس نے ماتسیرات اور برانسکیوں سے کہا، "یہ بونوں کے ساتھ تھا۔ اور ایک بونے نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔ امید ہے کہ اس کا کوئی اور مطلب نہیں ہوگا۔"

میرے لیے پیشانی کا وہ بوسہ بہت کچھ تھا۔ اور اس کے بعد کے برسوں کے

سیاسی حالات نے اس کو صحیح ثابت کر دیا تھا: مشعل بردار جلوس اور پریڈوں کا شہ نشین اور معائنے کی شہ نشینوں کے سامنے سے گزرنا شروع ہو گیا تھا۔

میں نے مسٹر ہیرا کا مشورہ مان لیا تھا، اور مما، اپنے طور پر مارکس کے "آرسینل پلیج" میں دیے ہوئے مشوروں کے ایک حصے پر عمل پیرا تھی، اور ہر جمعرات اس کو دہراتی تھی۔ حالاں کہ وہ مارکس کے ساتھ لندن نہیں گئی تھی— مجھے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا— وہ ماتسیرات کے ساتھ ہی رہی اور برانسکی سے اعتدال کے ساتھ ملتی رہی، یعنی، شیلر گاسے میں جان کے خرچ پر اور خاندان کے کھیل skat پر، جو روز بہ روز مہنگا ہوتا جا رہا تھا، اس لیے کہ وہ ہمیشہ ہار جاتا تھا۔ بہرحال ماتسیرات نے، مما نے جس پر بازی لگا رکھی تھی، مارک کے مشورے کے بعد بازی جاری تو رکھی مگر دُوگنی نہیں کی، اور 1934 میں وہ پارٹی میں شامل ہو گیا تھا۔ مگر چوں کہ ماتسیرات ابتدا سے ہی ضابطے کی طاقتوں کی حمایت کرتا تھا، اسے پارٹی میں رہنما سے بڑھ کر کبھی کوئی عہدہ نہیں ملا۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، اس کی ترقی ایک موقع تھی خاندانی کھیل skat کھیلنے کا۔ اس وقت ماتسیرات نے اس خطرے میں تنبیہ کا ایک اور اشارہ شامل کر دیا تھا، جو وہ پولش ڈاک خانے کے معاملے میں اس کی سرگرمیوں پر، جان برانسکی کو ایک عرصے سے دیتا آ رہا تھا۔

اس کے علاوہ کوئی اور تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ افسردہ کیفیت کی بیتھوون کی تصویر، جو گریف کی جانب سے تحفہ تھی، پیانو کے اوپر ٹنگی کیل سے نکال دی گئی تھی، اور اسی کیل پر اسی قسم کی افسردگی سے معمور چہرے والی ہٹلر کی تصویر ٹانگ دی گئی تھی۔ ماتسیرات، جسے موسیقی سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا، تقریباً بہرے موسیقار کو اپنے گھر سے نکال دینا چاہتا تھا، مگر مما کا، جو بیتھوون کی آہستہ حرکات کو پسند کرتی تھی، جس نے ان میں سے دو تین کو تو زیادہ آہستگی سے بجانا سیکھ بھی لیا تھا، اور وقتاً فوقتاً انھیں ضرورت سے زیادہ آہستگی سے نکھارتی رہتی تھی، جس کا اصرار تھا کہ اگر بیتھوون کو صوفے کے اوپر کی نہیں تو اس کو سائیڈ بورڈ کے اوپر کی جگہ ضرور ملنی چاہیے۔ اس طرح وہ نامبارک چپقلش شروع ہوئی تھی: ہٹلر اور جینیئس، منہ در منہ، آنکھوں سے چار آنکھیں۔ اس کے بارے میں دونوں میں سے کوئی بھی خوش نہیں تھا۔

رفتہ رفتہ ماتسیرات نے اپنی وردی تیار کی۔ اگر میرا حافظہ غلط نہیں تو اس نے ٹوپی سے ابتدا کی تھی، جسے وہ اچھے موسم میں بھی ٹھوڑی پر پھنسے "مومی فیتے" کے ساتھ پہنتا جاتا تھا۔ کچھ دنوں تو وہ ٹوپی کے ساتھ سفید قمیص اور سیاہ رنگ کی ٹائی بھی لگاتا تھا، یا پھر سیاہ رنگ کے بازو بند سمیت ایک چمڑے کی جیکٹ۔ پھر اس نے پہلی بار بھورے رنگ کی ایک قمیص خریدی تھی، مگر ایک ہفتے بعد ہی نہایت خراب بھورے رنگ کی، گھڑسواری والی برجس اور اونچے جوتے بھی خریدے۔ مما نے ان سب کی مخالفت کی تھی۔ اس طرح، کئی ہفتوں کے بعد وردی مکمل ہوئی تھی۔

ہر ہفتے، وردی پہننے کا کوئی نہ کوئی موقع ہوتا تھا، مگر ماتسیرات اسپورٹ پیلس کے قریب 'میوائیزے' پر ہونے والے اتوار کے مظاہروں میں ہی وردی پہنتا تھا۔ مگر وردی کے بارے میں کسی قسم کی لچک نہیں تھی، حتیٰ کہ خراب موسم میں بھی، اور وہ وردی کے ساتھ چھتری لے جانے سے بھی انکار کردیتا تھا۔ "فرض اپنی جگہ اور شراب اپنی جگہ" وہ کہتا تھا۔ اس کے بعد ایک اور جملہ اس کی زبان پر چڑھ گیا تھا، جو اکثر سنائی دیتا تھا۔ ہر اتوار، رات کے کھانے کے لیے روسٹ کی تیاری کے بعد وہ باہر چلا جاتا تھا۔ اس کا یہ عمل مجھے شرمندگی سے دوچار کردیتا تھا، اس لیے کہ جان برانسکی کو فوراً اتوار کی نئی سیاسی کیفیت کا پتا چل جاتا تھا اور، یہ ناقابلِ اصلاح انسان، جو وہ ہمیشہ سے تھا، بے چاری مجبور مما سے ملنے آتا، جب ماتسیرات کسرتی دوڑ بھاگ اور پریڈ میں مصروف ہوتا تھا۔

سوائے غائب ہوجانے کے، میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ میں صوفے پر دراز، دونوں میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا، نہ ان کی جاسوسی کرنا چاہتا تھا۔ جوں ہی میرا وردی پوش باپ نظر سے اوجھل ہوتا اور قبل اس کے کہ وہ شہری، جسے میں نے ہمیشہ اپنا قیاسی باپ سمجھا ہے، واپس آتا، میں کسی بہانے گھر سے نکل جاتا اور اپنا نقارہ بجاتا 'میوائیزے' کی طرف چل دیتا تھا۔

آپ یہ سوال کرسکتے ہیں کہ میوائیزے ہی کی طرف کیوں؟ یقین کیجیے کہ اتوار کے دن ساحل پر کچھ نہیں ہوتا تھا، کہ جنگل کی طرف چہل قدمی کا ارادہ نہیں ہوتا تھا، اور ان دنوں مجھے Church of the Sacred Heart میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ مسٹر گریف کے

اسکاؤٹ ہوا کرتے تھے، مگر اس کے باجود کہ لوگ مجھے کوئی سیاح سمجھتے، مجھے اعتراف ہے کہ میں اسکاؤٹ جلسوں کی جنسی ہوس ناکی کے بجائے میوازیے کی کارگزاری کو زیادہ پسند کرتا تھا۔

وہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی تقریر ہوتی تھی، گرائیزر کی یا علاقے کے ٹریننگ چیف، لوبزاک کی۔گرائیزر نے مجھے کبھی متاثر نہیں کیا۔وہ کچھ زیادہ ہی اعتدال پسند تھا، جس کی جگہ باویریا کے نامزد فورسٹر نے گاؤلائیٹر کو تعینات کردیا تھا، جو زیادہ با اثر آدمی تھا، مگر، لوبزاک کے کوہان کے باعث، باویریائیوں کو ہماری شمالی بندرگاہوں کی طرف بڑھنا مشکل ہوتا تھا۔لوبزاک کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے، اس کے کوہان کو گہری ذہانت کا نشان سمجھتے ہوئے جماعت نے اس کو موضعے کا چیف آف ٹریننگ بنادیا تھا۔وہ اپنے کام سے اچھی طرح واقف تھا۔فورسٹر بس اتنا جانتا تھا کہ اس کے اپنے گندے باویریائی لہجے میں "Home to the Reich" کس طرح چیخ کر کہا جاتا ہے، مگر لوبزاک نرالے طریقوں کو خوب سمجھتا تھا۔وہ وانتینگ کی نچلے درجے کی جرمن کی ہر قسم بول سکتا تھا، بولر مان اور ولڑ وسکی کے بارے میں لطیفے سنا سکتا تھا، اور 'نعیشاؤ' کے گودی مزدوروں سے، 'اوہرا' کے پرولتاریوں سے، ایماؤس، 'شیڈلز'، 'بُم گروائیزن' اور 'پراوسٹ' کے درمیانے درجے کے افراد کے لہجوں میں گفتگو کرنے کے طریقے جانتا تھا۔اس آدمی کو بات کرتے سن کر لطف آتا تھا، جس کی مجبوری وردی اس کے کوہان کو خاص طور سے نمایاں کرتی تھی، جو سوشلسٹوں کی جملے بازی اور بیئر سے مدہوش کمیونسٹوں کی جارحیت سے نمٹنے کا ہنر رکھتا تھا۔

لوبزاک ذہین شخص تھا۔اس نے اپنی تمام تر ذہانت اپنے کوہان سے اخذ کی تھی، جس کو وہ اس کے نام سے ہی پکارتا تھا؛ مجمع ہمیشہ اس بات کو پسند کرتا تھا— کہ قبل اس کے کہ کمیونسٹوں کو قبضہ کرنے کی اجازت ملے وہ اپنا کوہان کھو دے گا— کہ یہ صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنا کوہان کھونے والا نہیں، کہ کوہان تو اس کا ہمیشہ کا ساتھی ہے، کہ کوہان بھی ٹھیک ہے اور اس کے ساتھ پارٹی بھی— جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ کوہان کسی بھی خیال کے لیے بہترین شے ہوتا ہے۔

جب گرائیزر، لوبزاک، یا بعد میں فورسٹر خطاب کرتے تھے، تو وہ شہ نشین سے

تقریر کرتے تھے۔ یہ ان شہ نشینوں میں سے ایک تھی ہوتے مسٹر ہیرا نے جس کی سفارش کی تھی۔ لہٰذا میں لوئبزاک کا ہمیشہ سے احترام کرتا تھا جس کی پشت پر کوہان تھا، جو بڑی صلاحیتوں کا مالک تھا اور ہیرا کے سفیر کے طور پر شہ نشین سے تقریر کرتا تھا، وہی جو بھوری وردی پہن کے شہ نشین پر ہوتا تھا کھڑا ہوتا تھا اور ہیرا اور میرے مقصد کے لیے لڑتا تھا۔

شہ نشین کسے کہتے ہیں؟ قطع نظر اس کے کہ یہ کسی کے لیے بنی ہو، شہ نشین کو ہمیشہ متوازن ہونا چاہیے۔ 'مائیوائزے' کی شہ نشین توازن میں اچھی تھی۔ پیچھے سے سامنے تک چھ عدد سواستکا پرچم لگے ہوئے؛ اس کے بعد پرچموں کی ایک قطار، کچھ جھنڈے، اس کے بعد سیاہ وردی میں SS کے لوگ، جو گانے اور تقریر کے دوران اپنی پیٹیوں کو پکڑے ہوتے تھے؛ اس کے بعد وردی پوش پارٹی کامریڈوں کی ایک قطار؛ تقریر کرنے والوں کے پیچھے مزید پارٹی کامریڈ، عورتوں کی انجمنوں کی ماؤں جیسی نظر آنے والی رہنما خواتین، شہریوں کے لباس میں ملبوس سینیٹ کے اراکین، رائخ کے مہمانان اور پولیس کے سربراہ یا اس کا کوئی نمائندہ۔

شہ نشین کا سامنے کا حصہ ہٹلر کے جوانوں سے رونق افروز، یعنی ہٹلر کے جوانوں کے علاقائی جتھوں کے نمائندے۔ کچھ مظاہروں میں ایک مخلوط سنگت، وہ بھی متوازن و منظم، نعرے لگاتی یا مشرقی ہواؤں کے تعریفی گیت گاتی، جو متن کے مطابق، جھنڈوں کے لہرانے میں دوسری کسی ہوا سے بہتر ہوتی تھی۔

ہیرا، جس نے میری پیشانی کا بوسہ لیا تھا، کہا تھا، "آسکر، کبھی سننے والوں میں نہ بیٹھنا۔ سامنے کبھی کھڑے نہ ہونا۔ تمھارے جیسے لوگوں کی جگہ شہ نشین پر ہوتی ہے۔"

عام طور پر میں خواتین کی انجمنوں کی رہنماؤں کے درمیان جگہ نکال لیتا تھا۔ بدقسمتی سے جلوس کے دوران پروپیگنڈے کی خاطر وہ مجھے پھسلانے کی کوشش کرنا کبھی نہیں بھولتی تھیں۔ میں شہ نشین پر رکھے نقارے اور بگل کے درمیان، اپنے نقارے کی وجہ سے، گھس نہیں پاتا تھا، اس لیے کہ موسیقار اس کو قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ لوئبزاک سے تعلقات استوار کرنے کی میری کوشش ناکام ہوگئی۔ افسوس کی میں صریحاً غلطی پر تھا۔ جیسا کہ میں سمجھتا تھا، نہ تو وہ ہیرا کا نمائندہ تھا، نہ ہی اپنے کوہان کے باوجود اسے میرے

بارے میں، میری حیثیت کے بارے ذرا بھی علم تھا۔

میں شہ نشین والے اتوار کے دنوں میں ایک دن اس کے پاس گیا، جب وہ منبر کے نزدیک کھڑا ہوا تھا، میں نے اس کو پارٹی کا سلام کیا، چند لمحے اس کی طرف خوش اخلاقی سے دیکھا، پھر آنکھ مار کر سرگوشی میں کہا، ''میرا ہمارا رہنما ہے۔'' مگر اس کا چہرہ روشن نہیں ہوا، اس نے میرے کندھے کو اسی طرح تھپتھپایا جیسے وہ خواتین کی انجمنوں کے ارکان سے پیش آتا تھا، اور بالآخر اس نے آسکر کو شہ نشین سے ہٹوا دیا— ظاہر ہے کہ اس کو تقریر کرنی تھی۔ مجھ کو League of German Girls کی نمائندہ دولڑکیوں نے گھیر لیا، اور تقریر کے دوران، مجھ سے میرے پاپا اور مما کے بارے میں سوالات کرتی رہیں۔

اس طرح، آپ کو ہرگز حیرت نہیں ہوگی جب میں آپ کو بتاؤں گا کہ میں 1934 کے موسمِ گرما سے ہی پارٹی سے مایوس ہونے لگا تھا، 'روئم' کی بغاوت سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ جتنا بھی میں شہ نشین کے سامنے ہونے پر غور کرتا اتنا ہی مجھے اس کے توازن پر شبہ ہوتا جاتا تھا، جس کو لوبسا ک کے کوہان سے مناسب مدد بھی نہیں ملی تھی۔ بلا شبہ، آسکر کی تنقید پہلے نقارہ نوازوں اور بگل بجانے والوں پر ہوئی تھی: اور میں 1935 کے ایک حبس زدہ مظاہرے میں، معائنہ کرتے نوجوان نقارہ نوازوں اور بگل بجانے والوں سے الجھ پڑا تھا۔

ماتسیرات، نو بجے ہی گھر سے چلا گیا۔ اس کو وقت پر جانے میں مدد دینے کے لیے میں نے اس کے بھورے رنگ کے چمڑے سے بنی پاؤں پر باندھنے والی پٹی پر پالش کر دی تھی۔ اتنی صبح بھی ناقابلِ برداشت گرمی ہو رہی تھی۔ جان کے دھوپ میں جانے سے پہلے ہی، اس کی پارٹی کی قمیص کی بغل میں پسینے سے گہرے رنگ کے دھبے پھیلنے لگے تھے۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے، ہلکے رنگ کے ہوادار گرمی کے سوٹ میں ملبوس، سر پر تنکوں سے بنا ہیٹ لگائے جان آموجود ہوا۔ وہ تھوڑی دیر تک میرے ساتھ کھیلا، کھیلنے کے دوران بھی وہ مما سے اپنی نظریں ہٹا نہیں پا رہا تھا، جس نے کل رات ہی اپنے بال دھوئے تھے۔ جلد ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میری موجودگی ان کی گفتگو میں مخل ہو رہی تھی: جان کی حرکتوں سے فضا میں ایک طرح کی شرمندگی اور تناؤ محسوس ہو رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ جان اپنے

گرمی کے دنوں کے پتلون میں تنگی محسوس کر رہا تھا۔ اس لیے میں ماتسیرات کے نقشِ قدم پر چلتا گھر سے باہر چلا گیا، حالاں کہ میں نے کبھی اس کو اپنا ماڈل نہیں بنایا تھا۔ میں احتیاط سے ٹمیوائزئے جانے والے، وردی پوش افراد سے بھری گلیوں کو چھوڑتا ہوا، ٹینس کورٹ کی جانب سے پہلی بار جسمانی مشقت کے میدان پہنچا تھا، جو اسپورٹ پیلس کے ساتھ ہی ہے۔ اس بالواسطہ گزرگاہ کے طفیل مجھے شہ نشین کو عقب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

کیا آپ نے کبھی شہ نشین کو پیچھے کی جانب سے دیکھا ہے؟ اگر میرا مشورہ مانا جائے تو، ہر مرد اور عورت کو، شہ نشین پر جانے سے پہلے، اس کو عقب سے دیکھنے کا عادی بنانا چاہیے۔ ہر وہ شخص جس نے کسی شہ نشین کو عقب سے اچھی طرح دیکھا ہو، اس پر کی جانے والے تمام جادوگری کو اچھی طرح سمجھ جائے گا۔ تقریباً یہی بات گرجا شہ نشینوں پر بھی صادق آتی ہے؛ مگر وہ ایک الگ موضوع ہے۔

آسکر ہمیشہ سے درشتگی کا قائل رہا ہے۔ وہ مچان بندی کی عریاں بدنمائی سے کبھی مطمئن نہیں ہوا۔ اپنے مربی بیبرا کے الفاظ کے مطابق وہ شہ نشین کی طرف جا رہا تھا۔ شہ نشین تو سامنے سے نظارے کے لیے ہوتی ہے، مگر اس نے اس کے بے سلیقہ عقب کی راہ لی تھی۔ اپنا نقارہ لیے، جس کے بغیر وہ کبھی باہر نہیں جاتا تھا، جھک کر گزرتے ہوئے اس کا سر باہر نکلی ہوئی شہتیر سے ٹکرا گیا، اور باہر نکلی ہوئی ایک کیل کھٹنے پر لگنے سے گہرا زخم آ گیا تھا۔ اس کو اوپر سے پارٹی کا مریڈ کے بوٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی، اور ایک لمحے بعد عورتوں کی انجمن کے جوتوں کی آواز آنے لگی تھی۔ وہ بالآخر، اس جگہ پہنچ گیا، جہاں اگست کی گرمی دم گھونٹ دے رہی تھی۔ اسی اثنا میں اسے اسٹینڈ کے نیچے، پلائی ووڈ میں چھپا، ایک گوشہ نظر آ گیا اور وہ اپنی سہولت سے، پرچموں اور وردیوں کے بھری اشتعال سے آزاد، سیاسی جلوس کی صوتی لطافتوں سے محظوظ ہو سکتا تھا۔

اور اس طرح، میں تقریر کے لیے بنے چبوترے کے نیچے گھس گیا۔ میرے دائیں بائیں اور اوپر، نوجوان لوگوں کے، اور ہٹلر کے جوانوں کے نقارہ نواز، تیز دھوپ میں، جیسا کہ مجھے اندازہ تھا، چندھیائی آنکھوں سمیت کھڑے تھے۔ اس کے بعد مجمع تھا۔ تختوں

کے شگاف سے میں سب کچھ سونگھ سکتا تھا۔ سب لوگ ٹکراتی کہنیوں اور رگڑ کھاتے ہوئے اتوار کے لباس میں تنے کھڑے تھے۔وہ پیدل آئے تھے یا ٹرام گاڑیوں سے؛ کچھ اپنے ساتھ اپنی منگیتر لڑکیوں کو بھی تفریح کرانے لے آئے تھے۔یہ تمام لوگ اس تاریخ ساز موقعے پر موجود رہنا چاہتے تھے،خواہ اس میں پوری صبح ہی کیوں نہ لگ جائے۔

نہیں، آسکر نے خود سے بات کرتے ہوئے کہا، یہ صحیح نہیں ہوگا اگر یہ لوگ کسی مقصد کے بغیر آئے ہیں۔وہ تختے کی ایک گانٹھ سے بنے سوراخ سے شوروغل مچاتے 'ہنڈن برگ ایلی' سے آتے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔وہ آرہے تھے۔کمانڈ کی آواز بلند ہوئی، بینڈ کے ماسٹر نے اپنی چھڑی کو گھمایا، اور باجے بجانے والوں نے اپنے پالش کیے چمک دار بگل اپنے دہنوں سے لگائے اور اپنی مہنالوں کو درست کیا۔اور پھر نوجوان فوجیوں کی بے رحم بگل بازی شروع ہوگئی۔"بے چارے SA کے لوگ!"، آسکر نے دردناک انداز میں خود کلامی کی،"بے چارے Hitler Youth Quex والے! تم سب کی قربانی بے کار گئی۔"

بگل کی آواز کے ساتھ بچھڑوں کی تنی ہوئی کھال والے نقاروں کی دل دہلا دینے والی زوردار دھمک اُبھری، گویا وہ آسکر کے غموں سے بھری، مرحومین کی یادوں کی تصدیق کر رہی تھی۔ میں شہ نشین کی طرف سے آنے والی گلی سے، مجمعے کی درمیان سے گزرتے ہوئے، دور سے آتے وردی میں ملبوس لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔"اب، اے میرے لوگو" آسکر نے چلا کر کہا، "اے میرے لوگو، میری بات سنو!" نقارہ بالکل تیار تھا۔لوچ اور نرمی کے ساتھ میں نے چوبِ نقارہ کو ہنر مندی اور پُرلطف انداز میں والٹز کی دُھن بجانے میں استعمال کرنا شروع کیا۔ دل میں ویانا اور ڈینیوب کا تصور تھا اور میں اس وقت تک زور زور سے نقارہ نوازی کرتا رہا، جب تک کہ پہلے اور دوسرے مدھر مُر والے نقارے میرے والٹز میں مل نہیں گئے، اور پرانے لوگوں کی بجائی جانے والی نوبتوں نے میرے ابتدائیے کو مختلف نوعیت کی ہنرمندی سے اپنا نہیں لیا تھا۔بلا شبہ اِدھر اُدھر، کچھ کٹر قسم کے، کان کے بہرے لوگ بھی تھے، جو اپنی بوم بوم میں مست تھے، جب کہ میرے ذہن میں جو کچھ بھی تھا وہ تین چار گنا عوام کا پسندیدہ تھا۔آسکر ختم کرنے ہی والا تھا جب بگل اور مُرلی والوں کو ہوش آیا اور انھوں نے blew !

oh, Danube, oh, how blue they کی تان لگائی۔ بگل والوں کے رہنماؤں اور نقارہ نوازوں نے والز کے بادشاہ کے سامنے جھکنے سے انکار کردیا اور چیخ چیخ کر اپنے احکامات جاری کرتے رہے، مگر میں نے اُن کو ناکارہ کردیا تھا، کہ اس وقت موسیقی میرے قبضے میں تھی۔ سادہ مزاج عوام بے حد شکر گزار تھے۔ جب شہ نشین کے آس پاس سے:

Oh, Danube,
across the whole field so blue,
as far as the Hindenburg-Allee so blue ,
Steffens-Park so blue

گانے کی آواز بلند ہوئی تو کھلے مائکروفون کے ذریعے دور دور تک میرے تال کی آواز سنی گئی تھی اور جب زور زور سے نقارہ نوازی کرتے ہوئے میں نے گانٹھ کے سوراخ سے جھانک کر دیکھا تو لوگ میرے والز سے لطف لے رہے تھے، خوشی سے اچھل رہے تھے۔ نوعدد جوڑے پہلے سے رقص کر رہے تھے،، بعد میں ایک جوڑا اور شامل ہو گیا تھا۔ صرف لوبزاک تھا، جو مرغزار میں نظر آیا تھا، اس کے پیچھے بھورے رنگ کی ایک قطار تھی پارٹی کے اہم لوگوں کی—— فورسٹر، گرائیزر، راوشننگ وغیرہ کی، جن کا شہ نشین کی طرف جانے والا راستہ مجمعے کی وجہ سے بند ہو گیا تھا، اور وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔ اس کو شہ نشین تک مارچ کی موسیقی اور سیدھے سیدھے نگہبانی میں لے جائے جانے کی عادت تھی۔ ان غیر سنجیدہ آوازوں نے لوگوں کے اعتماد کو متزلزل کردیا تھا۔ حالاں کہ تختے کی گانٹھ والے سوراخ سے میں اس کی اذیت کو دیکھ رہا تھا۔ سوراخ سے سرد ہوا سرسرا رہی تھی۔ اگرچہ میری آنکھ کو سوزش کا خطرہ تھا، مجھے اس پر رحم آرہا تھا، میں نے چارلسٹن کا Jimmy the Tiger بجانا شروع کردیا۔ یہ میں نے سرکس کے مسخرے بیرا سے سیکھا تھا، جب اس نے seltzers سوڈا واٹر کے سائفن (ترچھی نلی) سے نقارہ نوازی کی تھی؛ مگر نوجوان فوجیوں نے چارلسٹن میں دل چسپی نہیں لی، کہ ان کا تعلق مختلف نسل سے تھا۔ وہ چارلسٹن اور Jimmy The Tiger کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ وہ نقارے کیا بجا رہے تھے—— اور بیرا ڈیر—— وہ Jimmy the

Tiger نہیں تھا، خالص افرا تفری تھی، اور بگل نواز سوڈوم اور گومورہ بجا رہے تھے۔ ہمارے لیے یہ سب ایک جیسا ہے، بالکل مُرلیوں جیسا۔ بگل بازوں کا سربراہ ہر طرف دیکھ کر بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ اور باوجودے کہ فوجی لوگ نقارہ نوازی کر رہے تھے، بانسری بجا رہے تھے، اور اپنی توفیق کے مطابق اگست کی اس گرمی میں بگل بجا رہے تھے، کہ بالآخر قومی کامریڈوں نے جو ہزاروں کی تعداد میں اطراف کھڑے تھے گانا شروع کر دیا تھا، چارلسٹن کی طرف لوگوں کو بلانے کے لیے، اور وہ گانا تھا Jimmy the Tiger۔

وہ سب جو ابھی تک رقص نہیں کر رہے تھے، رقص کے لیے ساتھی تلاش کرنے لگے تھے، مگر لوبہزاک اپنے کوہان کے ساتھ رقص کرنے پر مجبور تھا، اس لیے کہ اس کے نزدیک صنف نازک میں سے کوئی موجود نہیں تھی، اور NS خواتین جو اس کی مدد کو آ سکتی تھیں، شہ نشین کی تخت بنچوں پر بے کلی سے بیٹھی تھیں اور بہت دور تھیں۔ اس کے باوجود— کوہان کے باوجود— اس نے بھیانک Jimmy موسیقی کو برداشت کرتے ہوئے، جتنا ممکن تھا، بچانے کے لیے، رقص کیا تھا۔

مگر حالات بچانے کے امکانات سے باہر ہو چکے تھے۔ قومی کامریڈ میوانزئے سے دور رقص کر رہے تھے اور جلد ہی سرسبز میدان، اگرچہ روندا جا چکا تھا، بالکل ویران تھا۔ قومی کامریڈ Jimmy the Tiger کے ساتھ ہی قریبی اسٹینفن پارک کے میدان سے فرار ہو گئے تھے۔ وہاں انھیں وہ جنگل مل گیا تھا، جمی نے جس کا وعدہ کیا تھا؛ وہاں کے چیتے اپنے مخملیں پنجوں پر چلتے تھے، جو جرمن قوم کے اُن لڑکوں لڑکیوں کے لیے ایک متبادل جنگل تھا، جو تھوڑی دیر قبل شہ نشین کے اطراف مجمع لگائے ہوئے تھے۔ سارے قاعدے قانون ہوا ہو گئے تھے۔ زیادہ مہذب عناصر ہنڈن برگ ایلی میں جمع ہو گئے تھے، جہاں اٹھارویں صدی میں شجرکاری کی گئی تھی، اور 1807 میں وہی پیڑ کاٹے گئے تھے جب نپولین کی فوجوں نے شہر کو گھیر لیا تھا، اور پھر 1810 میں نپولین کے اعزاز میں مزید شجرکاری بھی کی گئی تھی۔ اس تاریخی میدان میں، رقاص اب بھی میری موسیقی سے مستفید ہو سکتے تھے، اس لیے کہ کوئی میری مرضی کے بغیر میرے مائکروفون کو بند نہیں کر سکتا تھا۔ میری موسیقی 'اولیوا' گیٹ تک

سنی جا سکتی تھی۔ آخر میں، شہ نشین کے نیچے بیٹھے ہوئے جوان، جمی کے چھوڑے ہوئے ٹائیگر کی مدد سے، میوائزنے کو، گل بہار کے علاوہ ہر شے سے پاک کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ حالاں کہ میں نے اپنے نقارے کو ضروری آرام دیا تھا، دوسرے لڑکے نقارہ نوازی کرتے رہے تھے۔ یہ میرے موسیقی کے رسوخ کے ختم ہوجانے سے بہت پہلے کی بات تھی۔

آسکر اپنی پناہ گاہ کو اچانک چھوڑ نہیں سکتا تھا، کہ خفیہ کے لوگ ایک گھنٹے سے زیادہ عرصے تک تختوں کو ٹھوکریں مارتے، شگافوں میں جھانکتے، اور اپنی سیاہ اور بھوری وردی میں سوراخ کرتے رہے تھے۔ وہ شہ نشین کے نیچے کچھ تلاش کر رہے تھے، شاید کسی سوشلسٹ کو یا کمیونسٹ تخریب کاروں کے کسی گروہ کو تلاش کر رہے تھے۔ میں اپنے چکموں اور اپنی نقل و حرکت کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔

بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ وہ آسکر کو پا نہیں سکے تھے، اس لیے کہ وہ اس کے برابر کے نہیں تھے۔ کم ازکم، میری چوبی بھول بھلیاں میں خاموشی تھی، جو اس وہیل مچھلی کے پیٹ کے برابر تھی جس میں [حضرت] یونس بیٹھے اپنی پیغمبری عبا کو چربی سے داغ دار کرتے رہے تھے، مگر آسکر پیغمبر تو نہیں تھا، اس کو بھوک لگنی شروع ہو گئی تھی۔ وہاں کوئی آقا نہیں تھا جو کہتا چلو، ''اٹھو، نینوا تک جاؤ، جو ایک عظیم شہر ہے، اور وہاں تبلیغ کرو۔'' میرے لیے آقا نے کدو اُگانے اور اس کو تباہ کرنے کے لیے کیڑا بھیجنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔ نہ میں نے انجیلی کدو کے لیے آہ وزاری کی تھی، نہ نینوا کے لیے، خواہ اس کا نام واشنگٹن ہی کیوں نہ ہوتا۔ میں نے اپنے غیر انجیلی نقارے کو اپنے سوئٹر کے نیچے چھپا لیا اور اپنی مشکلات پر خود غور کرنے لگا تھا۔ لگی ہوئی شہتیروں اور باہر نکلی ہوئی کیلوں سے بچتا بچاتا، میں اپنے وسائل کی مدد سے شہ نشین کے معدے سے برآمد ہوا، ہر قسم کی میٹنگ اور جلوس کے لیے جو کسی ناقابلِ امکان حادثے سے ہی پیغمبر کو نگل لینے والی مچھلی بن سکے گی۔

کس نے ایک چھوٹی سی دیمک کو دیکھا ہوگا، ایک تین سالہ بچے کی، جو سیٹی بجاتا میوائزنے کے اطراف گھومتا اسپورٹس پیلس کی طرف گیا تھا۔ ٹینس کورٹ کے پیچھے، شہ نشین والے میرے لڑکے اپنے پیتل سے بنے نقاروں اور نوبتوں، ان کی مرلیوں اور بگلوں

سمیت اچھلتے پھر رہے تھے۔میں نے دیکھا کہ یہ سزا کے طور پر کی جانے والی جسمانی مشقت تھی جوان کے لیڈر کی سیٹی کے جواب میں کی جا رہی تھی۔۔مجھے ان پر ترس آ رہا تھا۔ اپنے جمع شدہ کارکنوں سے بے خبر، لوئبراک اپنے کوہان سمیت آگے پیچھے بے مقصد چہل قدمی کر رہا تھا۔اپنی ایڑیوں پر گھومتا،اس نے تمام گھاس اور گل بہار ختم کر دیے تھے۔

جب آسکر گھر پہنچا تو میز پر ڈنر کا اہتمام ہو رہا تھا۔گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا اور اُبلے ہوئے آلو، سرخ کرم کلا اور میٹھے میں چاکلیٹ پڈنگ اور ونیلا ساس۔ماتسیرات نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔مما کا ذہن کہیں اور تھا،مگر اس رات پولش ڈاک خانے اور حسد کی بنیاد پر ایک خاندانی جھگڑا ہونے والا تھا۔شام کے قریب تازہ کر دینے والا ایک طوفان، ایک موسلا دھار بارش، اور اس کے ساتھ نقارے کے اولوں کا ایک solo ہوا تھا۔ اور آسکر کا تھکاماندہ باجا اب آرام کر سکتا تھا، اور سن سکتا تھا۔

# دُکانوں کی بجی کھڑکیاں

کئی برس، نومبر 1938 تک، میرے نظارے اور میں نے اپنا خاصا وقت شہ نشینوں کے نیچے چھپے کامیاب یا ناکامیاب مظاہرے دیکھتے، جلوں کو خراب کرتے، خطیبوں کی توجہ بھٹکاتے، مارچ اور دعائیہ گیتوں کی والٹز اور فاکس ٹراٹ میں قلبِ ماہیت کرتے، گزار دیا تھا۔

آج میں، دماغ کے ایک اسپتال میں، ایک پرائیویٹ مریض ہوں، اور وہ سب کچھ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، سارا پُرانا مال و متاع، دروازے میں لگی کیل کی طرح بے جان ہو چکا ہے، اگرچہ ان کے بارے میں اب بھی بحث اور گفتگو کی جا سکتی ہے۔ اب میرے لیے شہ نشینوں کے نیچے اپنی نظارہ نوازی کو صحیح تناظر میں دیکھنا ممکن ہو گیا ہے۔ اور مجھے کبھی خیال بھی نہیں آیا کہ میں اپنے آپ کو ایک مزاحمتی جنگجو کے طور پر تیار کروں، اس لیے کہ میں نے چھ یا سات جلسے خراب کیے تھے، اور تین یا چار پریڈوں کے قدموں کو اپنے نظارے کی مدد سے بھٹکا دیا تھا۔ یہ جو "مزاحمت" کا لفظ ہے، اب فیشن بن چکا ہے۔ ہم "مزاحمت کی روح"، "مزاحمتی حلقے" وغیرہ جیسی اصطلاحات سنتے رہتے ہیں۔ کچھ لوگ تو "باطنی مزاحمت"، ایک قسم کی، "نفسیاتی ہجرت" کی بھی باتیں کرتے ہیں۔ ان کا تو ذکر ہی کیا، وہ ذہنی اور بے لچک لوگ جو خود کو مزاحمتی جنگجو، اور مزاحمت کرنے والے کہتے ہیں، اس لیے کہ جنگ کے دوران بلیک آؤٹ میں ان پر اپنی کھڑکیوں پر سیاہی نہ پوتنے کے باعث جرمانے کیے گئے تھے۔

آیئے، اب ذرا 'ٹامکز' کی شہ نشینوں کے نیچے جھانک کر دیکھتے ہیں۔ کیا 'ٹامکز' اپنا

نقارہ عوام کے لیے بجاتا تھا؟ کیا اس نے، اپنے مربی، بیرا، کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے، شہ نشین کے سامنے موجود لوگوں کو رقص کرنے پر اُکسایا تھا؟ کیا اس نے، تربیت کے نہایت قابل اور زیرک چیف 'لوئیبوا ک' کو ذہنی طور پر منتشر اور پریشان کیا تھا؟ کیا اس نے اگست 1935 میں اتوار کے ایک دن ڈش اجتماع کو، اور اس کے بعد ایسے کئی موقعوں پر، بھورے رنگ والے جلسوں کو نقارے کی مدد سے منتشر کیا تھا، حالاں کہ سُرخ اور سفید رنگ کا وہ نقارہ پولش نہیں تھا؟

جی ہاں! میں نے وہ سب کچھ کیا تھا تو کیا، ایسے وقت میں بھی، جب میں اس دماغی اسپتال میں پڑا ہوں، وہ سب باتیں مجھ کو مزاحمتی جنگجو گردانتی ہیں۔ مجھے اس سوال کا جواب نفی میں دینا چاہیے، اور امید ہے کہ آپ بھی یہی کریں گے، آپ لوگ، جو دماغی اسپتالوں کے قیدی نہیں ہیں، مجھے ایک کج رَو انسان سے زیادہ نہیں سمجھیں گے جو محض ذاتی بلکہ جمالیاتی وجوہ کی بنا پر، جس نے، اس یقین پر کہ میرے مربی بیرا کے مشورے صائب تھے، وردی کی تراش اور رنگ کو عام طور پر شہ نشینوں پر بجائی جانے والی موسیقی کی تال اور لہجے کو مسترد کر دیا تھا، اور اس بنا پر ایک موسیقی کے آلے کی مدد سے احتجاج کیا تھا جو محض ایک کھلونا تھا۔

اُن دنوں ایک بد بخت کھلونے نقارے کے ساتھ بھی شہ نشین کے سامنے یا اس پر بیٹھے لوگوں تک پہنچنا ممکن تھا، اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ میں نے اپنی اس معمولی سی ترکیب کو بہت بہتر کر لیا تھا، اس لیے کہ اب اسی کام کے لیے میرے پاس ایک دُور مار شیشہ شکن گانا بھی تھا۔ اس لیے کہ یہ صرف کسی بھورے رنگ کے ہدف کے مظاہرے کے لیے ہی نہیں تھا جس پر میں اپنی نقارہ نوازی سے حملہ آور ہوتا تھا۔ اکثر شہ نشین کے نیچے، سرخ اور سیاہ کے لیے، ہوائے اسکاؤٹوں اور Spinach Shirts کے لیے، Kyffhauser Bund کے لیے، Jehovah's Witnesses کے لیے، سبزی خوروں کے لیے، نوجوان پولش Fresh Air Movement والوں کے لیے گھستا تھا۔ انھیں جو کچھ بھی گانا، بگل بازی کرنا، کوئی اعلان کرنا ہوتا، میرا نقارہ اسے بہتر طور پر کر سکتا تھا۔ جی ہاں! میرا کام تباہ کن ضرور تھا اور میں جسے اپنے نقارے سے شکست نہیں دے پاتا تھا، اپنی آواز سے مار دیتا تھا۔ دن کے وقت میں شہ نشینوں کی بربادی پر حملہ آور ہوتا تھا؛ رات کے

وقت—اور یہ 1936 اور 1937 کی بات ہے— میں ورغلانے کا کھیل کھیلتا تھا۔ مجھے آدمیوں کو ترغیب دلانے کا پہلا سبق میری نانی 'کوواچکی' نے دیا تھا جس نے اس سخت سردی کے موسم میں 'لانگفوز' کے ہفتہ وار بازار میں ایک چھوٹی سی دُکان لگائی تھی جہاں وہ اپنے چار لہنگوں میں بیٹھی ''تازہ انڈے، سنہرا، چکنائی والا مکھن بھنیں، نہ بہت موٹی نہ بہت دُبلی'' آواز لگایا کرتی تھی۔ ہر منگل کو بازار لگتا تھا۔ وہ 'ویرک' سے چھوٹی لائن ریل گاڑی پر بیٹھ کر آیا کرتی تھی؛ 'لانگفوز' پہنچنے سے ذرا پہلے وہ ریل گاڑی میں پہنی اپنی چپلیں اتار دیتی تھی، جوتوں کے اوپر پہننے والے ربڑ کے موزے چڑھا لیتی، اپنی دو چھابیاں اٹھاتی، اور ریلوے روڈ پر اپنے اسٹال پر جاتی تھی۔ اسٹال پر ایک سائن بورڈ لگا ہوتا تھا: 'انا کوواچکی' 'بساؤ والی'۔ اس زمانے میں مرغیوں کے انڈے کتنے سستے ہوا کرتے تھے! ایک 'گلڈن' [ڈائیسنگ کے سکّے] میں ڈھائی درجن انڈے مل جاتے تھے، اور 'کشوبیائی' مکھن مارجرین سے کم قیمت میں ملتا تھا۔ میری نانی کی دُکان دو ماہی فروشوں کے بیچ ہوتی تھی جو آواز لگاتے تھے: ''تازہ 'فلاؤنڈر'—اور— تازہ 'کاڈ'!'' سردی کی وجہ سے مکھن پتھر جیسا ہو جاتا تھا، انڈے تازہ رہتے تھے، مچھلی کے سِپَر (scales) تیز ترین بلیڈ جیسے ہو جاتے تھے۔ سردی کا موسم وہیں کے ایک یک چشم آدمی کے لیے کام فراہم کر دیتا تھا جو کوئلے کی آگ پر اینٹیں گرم کرتا، ان کو اخبار کے کاغذ میں لپیٹتا اور بازار میں کام کرنے والی عورتوں کو کرایے پر دیتا تھا۔

ہر گھنٹے بعد 'شورٹ فیگر' (Schwerdtfeger) میری نانی کے چار لہنگوں کے نیچے، لوہے سے بنے کھانچے سے، ایک گرم اینٹ دھکیل دیتا تھا۔ پھر بھاپ دیتی اینٹوں کو پکٹ سے باہر نکال کے لہنگے کے کنارے رکھ دیتا تھا۔ پھر وہ اینٹ جو اس وقت تک ٹھنڈی ہو چکی ہوتی تھی، اسکرٹ کے نیچے سے نکالتا، اور اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔

نہ پوچھیے کہ مجھے اخباروں میں لپٹی، گرمی پہنچانے والی اینٹوں پر کتنا رشک آتا تھا۔ آج بھی میں اپنے آپ سے کہتا ہوں: کاش میں اپنی نانی کے اسکرٹوں کے نیچے کی گرم اینٹ ہو سکتا، اور بار بار اسکرٹ کے نیچے پہنچایا جاتا۔ کوئی پوچھتا کہ کیا 'آسکر' اپنی نانی کی اسکرٹوں کے نیچے ہو سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے نانا 'کوواچکی' کی نقل اتارنے اور اس عمر رسیدہ عورت کے

ساتھ زیادتی کرنے کا خواہش مند ہوتا؟ کیا وہ تغافلِ نسیاں کا کسی گھر کا، یا مروان کا متلاشی تھا؟
آسکر کا جواب ہوگا، میں اسکرٹ کے نیچے افریقا کو تلاش کر رہا ہوتا یا شاید نیپلز کو، جسے ہم سب مرنے سے پہلے ایک بار دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ تھا وہ مقامِ تفریق، تمام بہتے ہوئے چشموں کا نقطۂ ارتکاز؛ یہیں سے خاص ہوائیں چلتی تھیں، یا پھر بالکل ہوا نہیں ہوتی تھی؛ خشک اور گرم علاقے میں، جہاں آپ بارش کی گرتی ہوئی بوندوں کی سسکاریاں صاف سن سکتے تھے؛ یہاں جہاز تیز بنائے جاتے تھے، ان پر لنگروں کے بوجھ ڈال دیے جاتے ہیں؛ یہاں ہمارا آسمانی باپ، جو ہمیشہ گرمی پسند کرتا ہے، آسکر کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا؛ شیطان نے اس کے جاسوسی کے چشمے کا دھندلایا ہوا شیشہ صاف کیا تھا، اور فرشتوں نے اس سے آنکھ مچولی کھیلی تھی؛ میری نانی کی اسکرٹ کے نیچے ہمیشہ گرمی کا موسم ہوتا تھا، اس وقت بھی جب کرسمس کے درخت پر قمقمے جلانے کا، یا ایسٹر کے موقع پر؛ حتیٰ کہ All Saint's Day پر بھی ایسٹر کے انڈے شکار کرنے کا وقت ہوتا ہے؛ ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں میں اپنی نانی کی اسکرٹ کے سایے کے مقابلے میں زیادہ پُرسکون ہوا ہوں۔

مگر وہ شاذ و نادر ہی کسی کو اپنے خیمے کے نیچے یا بازار میں پناہ گزیں ہونے دے گی۔ میں اس کے ساتھ ایک لکڑی کے ڈبے پر بیٹھا، اس کے بازوؤں سے ایک قسم کی گرمی حاصل کر رہا تھا، اور اینٹوں کا آنا جانا دیکھ رہا تھا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں میں نے نانی سے لوگوں کو راغب کرنے کی ترکیب سیکھی تھی۔ اس کے کاروباری ساز و سامان میں 'ذیسنٹ' کی ایک پرانی جیبی کتاب تھی جس کو ایک ڈور سے باندھ کر وہ پیادہ چلنے والوں کے لیے بنے راستے کی سخت جمی برف پر پھینک دیتی تھی۔ پھسلنے والی سطح پر پھینکے گئے بھورے بالو کے پس منظر میں میری نانی اور میرے سوا کسی کو کتاب سے بندھی ڈور نظر نہیں آتی تھی۔

گھریلو خواتین اِدھر سے اُدھر آتی جاتی رہتی تھیں۔ چوں کہ نانی کا مال سستا ہوتا تھا، وہ عورتیں ان کو خریدنے میں دل چسپی نہیں رکھتی تھیں؛ وہ تو مفت مال چاہتی تھیں، یا ممکن ہو تو سستے داموں۔ اس ذہنی کیفیت میں کوئی خاتون برف پر پڑی 'ذیسنٹ' کی جیبی کتاب اٹھانے کو جھکتی، اور اُس کی انگلیاں کتاب کو چھو رہی ہوتیں تو میری نانی ڈور کھینچ لیتی

اور اچھے لباس میں ملبوس شرمندہ خاتون، اس کی دُکان پر آجاتی تھی۔ نانی اس سے کہتی، مائی ڈیئر لیڈی، کیا آپ کچھ مکھن وغیرہ خریدنا پسند کریں گی، سنہرا کریم جیسا مکھن یا چند انڈے، صرف ایک گلڈن میں ڈھائی درجن؟

اس طرح اما کو واچکی کا مال بکتا تھا۔ میں نے اسی طرح ترغیب کا جادو سیکھا تھا، وہی ترغیب نہیں جو ہمارے بلاک میں رہنے والے چودہ برس والوں کو تہہ خانے میں 'سوزی کیٹز' کے ساتھ ڈاکٹرنرس کا کھیل کھیلنے کے لیے دی جاتی تھی۔ اس کھیل سے مجھے کبھی رغبت نہیں ہوئی۔ میں اس سے طاعون کی طرح دور بھاگتا تھا، جب 'ایکسل مشکے' اور 'نوشی آئیک' خون دینے والوں کے کردار ادا کرتیں، اور 'سوزی کیٹز' ڈاکٹر بنی ہوتی تھی، اور مجھ کو مریض کی طرح استعمال کرتی تھی، اور مجھ کو ایسی دوائیں کھلاتی تھی، جو اتنی ریتیلی نہیں ہوتی تھیں جیسے کہ اینٹوں کا شوربا ہوتا تھا، مگر بعد میں ان کا مزہ سڑی ہوئی مچھلی جیسا ہو جاتا تھا۔ میری رغبت تقریباً غائب ہو جاتی تھی اور اپنے شکار سے فاصلہ رکھتی تھی۔

رات ہو جانے کے بعد، جب ایک یا دو گھنٹے بعد دکانیں بند ہو جاتی تھیں میں، مما اور ماتسیرات کے پاس سے غائب ہو جاتا اور سردی کے موسم کی راتوں میں باہر نکل جاتا تھا۔ دُکانوں کے دروازوں کی راہداری میں کھڑا سرد ہواؤں سے محفوظ، میں خاموش، تقریباً ویران سڑکوں پر، دُکانوں کی سجی کھڑکیوں میں کھانے پینے کی بہت سی اشیاء، مردانہ لباس، جوتے، گھڑیاں، زیورات، ہر طرح کے پسندیدہ اور آسانی سے ساتھ لے جانے والی سجی اشیا کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ تمام کھڑیوں میں روشنی نہیں ہوتی تھی۔ میں ان کھڑکیوں کو ترجیح دیتا تھا جو تقریباً نصف اندھیرے میں ہوتی تھیں، سڑکوں سے آنے والے روشنی کی کرنوں سے بچتا تھا، اس لیے کہ روشنی ہر شخص کو اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے، حتیٰ کہ ہر طرح کے عام لوگوں کو بھی، جنھیں نیم سایے کی کیفیت میں منڈلانا پسند ہوتا ہے۔

مجھے اس قسم کے لوگوں میں دلچسپی نہیں ہوتی تھی جو چلتے پھرتے، روشن کھڑکیوں کے اندر سجی اشیا پر، جن پر قیمت کی پرچی لگی ہو، ایک نظر ڈال لیتے تھے؛ نہ ان لوگوں سے مجھے دل چسپی تھی جو کھڑکی میں لگے شیشے میں اپنے آپ پر نظر ڈالنے لگتے تھے

کہ ان کے ہیٹ اچھی طرح سر پر جمے ہوئے ہیں یا نہیں۔ میں کاٹتی ہوئی سردی یا گرتی لہراتی برف سے پُر خاموش راتوں میں سایے کی طرح ان لوگوں کے ساتھ لگا رہتا تھا جو کھڑکیوں میں اس طرح جھانکتے تھے گویا وہ ٹیلی فون کال کا جواب دے رہے ہوں؛ ان کی آنکھیں اِدھر اُدھر بے مقصد نہیں پھرتی تھیں، بلکہ کسی ایک شے پر مرکوز ہوجاتی تھیں۔

میں شکاری تھا اور وہ سب میرے شکار۔ میرا کام صبر، ٹھنڈک، اور یقین کی نظریں مانگتا تھا۔ وہ میری آواز تھی جو میرے شکار کو، تکلیف دیے بغیر، خون بہائے بغیر، شکار کو ڈھیر کر دیتی تھی۔ ترغیب کے ذریعے! کس قسم کی ترغیب کے ذریعے؟

چوری کرنے کی ترغیب! میں نے ایک بالکل ناقابلِ سماعت چیخ سے دکان کی کھڑکی میں دائرہ نما کاٹ کا نشان بنایا، اس سطح پر جس کے قریب ایک انتہائی مرغوب شے رکھی ہوئی تھی۔ اور پھر آواز کی آخری کوشش سے، دائرہ نما شیشہ کٹ کر کھڑکی کے اندرون میں گر گیا تھا۔ وہ گول ٹکڑا ہلکی سی آواز سے گرا تھا، ٹوٹے شیشے کی جیسی آواز نہیں تھی اُس کی۔ یہ آواز مجھے سنائی نہیں دی کہ آسکر بہت دور تھا؛ نہایت فرسودہ، بھورے رنگ کا کوٹ پہنے، جس پر خرگوش کی کھال کا کالر لگا تھا، ایک عورت نے یہ آواز سنی، کٹے ہوئے گول سوراخ کو دیکھا اور اس کام کا قصد کیا جس نے خرگوش کے فر کے باوجود اس پر کپکپی طاری کر دی تھی، اور وہ برف پر بھاگ جانے کی تیاری کر رہی تھی، مگر ساکت کھڑی رہی، شاید اس لیے کہ برف گر رہی تھی اور برف گرتے وقت ہر طرح کی آزادی ہوتی ہے، بہ شرطے کہ سخت برف باری ہو رہی ہو۔ اس نے گرتی برف کے گالوں سے بھی خوف کھاتے ہوئے، اِدھر اُدھر دیکھا، گویا برف کے گالوں کے پیچھے، ان کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ وہ اس وقت بھی اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی جب اس کا داہنا ہاتھ آہستگی سے اونی دست پوش سے باہر نکلا جو خرگوش کی کھال کا بنا ہوا تھا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھنا بند کر دیا، دائرہ نما شگاف کی طرف ہاتھ بڑھایا، کٹے ہوئے گول شیشے کو، جو اس کی مطلوبہ شے پر پڑا ہوا تھا ہٹایا، اور اس سوراخ سے سیاہ suede کے جوتے کی جوڑی میں سے پہلے ایک جوتا اٹھایا، پھر دوسرا اٹھایا اور سوراخ میں سے، ایڑی پر کسی قسم کا نشان ڈالے بغیر، شیشے کے سوراخ کے کناروں سے اپنا ہاتھ زخمی کیے بغیر، باہر نکال لیا تھا۔ ایک

دائیں اور دوسرا بائیں ، دونوں جوتے کوٹ کی جیب میں غائب ہو گئے تھے۔تھوڑی دیر کے لیے،اتنی دیر جس میں پانچ عدد برف کے گالے گر جاتے ہیں، آسکر کی نظر ایک خوب صورت مگر غیر اہم ہیولے پر پڑی؛ اور اس کے ذہن میں خیال گزرا، کہ شاید یہ عورت 'اسٹرن فلڈ' میں ماڈل کا کام کرتی ہے؛ اور اتنی دیر میں وہ گرتی ہوئی برف میں غائب ہو گئی تھی۔ وہ ایک بار تھوڑی دیر کے لیے سڑک کے پیلے بلب کی روشنی میں دکھائی دی تھی، اور پھر وہ نجات یافتہ ماڈل یا نو بیاہتا بیوی، ہمیشہ کے لیے غائب ہو گئی تھی۔

میرا کام ختم ہو گیا تھا—اور یقین جانیے کہ نظارہ نوازی کے بغیر انتظار کرنا، اور گا کر برف جیسے شیشے میں جگہ بنانا بڑا مشکل کام تھا— میں نے بھی، لوٹ کا مال لیے بغیر، دل میں ٹھنڈی بے حسی اور گرم شعلہ لیے، اپنے گھر کی راہ لی۔ترغیب دلانے کا میرا فن کبھی اس قسم کی غیر مبہم کامیابی سے سرفراز نہیں ہوا ہے۔

میری آرزوؤں میں سے ایک آرزو یہ تھی کہ میں کسی عام قسم کے جوڑے کو چور جوڑے میں بدل دوں۔[ پھر یوں ہوا کہ ]یا تو وہ دونوں نا رضا مند لگ رہے تھے، یا جیسے ہی اس [مرد] نے ہاتھ بڑھایا، اس [عورت] نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا: یا یوں تھا کہ وہ عورت ہی تھی جس میں ہمت تھی کہ جب مرد نے اپنے گھٹنوں کے بل جھک کر اپنی خواہش کا اظہار کیا، تو نتیجے میں عورت مان گئی تھی، اور اس کے بعد سے اس نے مرد سے ہمیشہ ہمیشہ نفرت کی تھی۔ایک بار میں نے ایک جوڑے کو، جو گرتی برف میں خاص کر جوان لگ رہا تھا، گم راہ کیا تھا۔ اس بار ایک عطر فروش کی دُکان نشانہ تھی۔اس نے ہیرو بن کر کولون کی ایک بوتل ہتھیالی۔ عورت نے منہ بسور کر کہا تھا کہ اسے اس کی ضرورت نہیں، مگر وہ تو عورت کو 'خراماں خراماں، معطر معطر— نسیم آرہی ہے کہ وہ آرہے ہیں" جیسا بنانا چاہتا تھا، اور سڑک کی پہلی روشنی تک پہنچ گیا تھا، مگر اس روشنی میں وہ دوشیزہ کھڑی ہوئی، پنجوں کے بل آگے بڑھی اور مرد پر اپنا بوسہ ثبت کر دیا— اس کے جسمانی انداز اتنے بے باک طور پر اپنا اظہار کر رہے تھے، گویا اس کا مقصد مجھے ناراض کرنا تھا— مرد الٹے پاؤں گیا اور بوتل کو کھڑکی میں واپس رکھ دیا۔

مجھے عمر رسیدہ لوگوں کے بہت تجربات تھے، جن سے میں وعدے کی سرد راتوں میں تیز تیز چلنے سے کچھ زیادہ کی توقع کر رہا تھا۔ ایک عمر رسیدہ انسان بڑی عقیدت سے سگار کی ایک دکان کی کھڑکی میں جھانک رہا تھا؛ اس وقت اس کے خیالات 'ہوانا'، 'برازیل' اور 'برما یا گو' جزائر میں بھٹک رہے تھے، اور جب میری آواز نے ایک فرمائش کاٹ پیش کی، اور اس کی وجہ سے "Black Wisdom," کے بکس کے مقابل ایک روزن فراہم ہو گیا تو اس کا دل بے قابو ہو گیا تھا۔ وہ واپس پلٹا، اپنی چھڑی ہلاتے ہوئے سڑک پار کی، میرے اور دروازے کے پاس سے ہوتا ہوا چلا گیا، اور مجھے اور آسکر کو اپنے چہرے کو دیکھ کر مسکرانے کا موقع دیتے ہوئے، جی ہاں، اس کو دیکھ کر، ایسا لگا گویا شیطان نے اس کو اچھا سبق پڑھا دیا تھا، مگر میرے تبسم میں ہلکی سی پریشانی ملی ہوئی تھی اس لیے کہ اس بے چارے عمر رسیدہ آدمی کو — اور ان سگار نوشوں میں زیادہ تر بہت بوڑھے تھے — اس قدر سرد موسم میں بھی ٹھنڈا پسینہ آ رہا تھا اور مجھے خوف تھا کہ کہیں سردی سے وہ مر نہ جائے۔

ان مضافاتی دکانوں کا چوری کے خلاف بیمہ ہوتا تھا، اور اس سردی کے موسم میں بیمہ کمپنیوں کو ان کے نقصانات بھرنے پڑے تھے۔ حالاں کہ میں نے بڑے پیمانے پر غارت گری نہیں کی تھی اور [کھڑکی کے شیشوں میں] جان بوجھ کر اتنے چھوٹے روزن بنائے تھے کہ ان کے راستے کھڑکیوں میں سے، ایک وقت میں، صرف ایک یا دو چیزیں نکالی جا سکیں۔ پولیس کے پاس اتنی ساری چوریوں کی اطلاعات درج کرائی گئی تھیں کہ پولیس کو ایک لمحے کا بھی آرام میسر نہیں تھا، پھر بھی اخبار والے ان کے ساتھ بہت بُری طرح پیش آئے تھے۔ نومبر 1936 سے مارچ 1937 تک، جب 'کرنل کوچ' نے وارسا میں National Front کی حکومت بنائی تھی، چوریوں کی چونسٹھ بار کوشش کی گئی تھی، اور اٹھائیس چوریاں کامیاب ہوئی تھیں اور ان ہی کو فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں، ان سیلز مینوں، گھروں میں کام کرنے والیوں، عمر رسیدہ عورتوں اور ہائی اسکول کے پنشن یافتہ پرنسپل حضرات کا روزگار چوری نہیں ہوتا، اور پولیس والے عام طور پر دوسرے دن ہی چوری کیا ہوا مال برآمد نہیں کر سکتے تھے؛ یا پھر غیر پیشہ ور چوری کرنے والوں کو ان کا ضمیر

ملامت کرتا تھا تو وہ پولیس والوں کے پاس معذرت کرتے ہوئے کہتے، ''معاف کرنا بھائی، اب ایسا نہیں ہوگا۔بس یوں ہوا تھا کہ شیشے میں اچانک ایک روزن بن گیا تھا، اور جب میں خوف سے نکل کر نصف ہوش میں آیا، اور میں تین بلاک دور پہنچ چکا تھا کہ میں نے حیرانی سے دیکھا کہ میرے کوٹ کی جیب میں غیر قانونی طور پر بچھڑے کی کھال سے بنے دستانے تھے، جو یقیناً بہت قیمتی رہے ہوں گے۔''

چوں کہ پولیس والے معجزوں پر یقین نہیں رکھتے، وہ تمام لوگ جو پکڑے گئے تھے، اور وہ جو اپنے طور پر خود پولیس کے پاس گئے تھے انھیں بھی چار ہفتے اور آٹھ ہفتے کے درمیانی مدت کی قید کی سزائیں دی گئی تھیں۔

کبھی کبھی مجھے بھی گھر میں قید کی سزا دی گی تھی، اس لیے کہ مما کو شبہ تھا، حالاں کہ اس نے خود اعتراف نہیں کیا تھا، اور بڑی عقل مندی کے ساتھ، پولیس والوں کو بتانے سے احتراز کیا تھا کہ میری شیشہ شکن آواز جرم کی لہر اٹھانے میں کسی حد تک ملوث ہو سکتی ہے۔

اکثر و بیش تر، ماتسیرات اپنے اوپر قانون پر عمل کرنے والے کا کردار طاری کر کے، مجھ سے پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کرتا تھا۔میں چالاکی سے اپنے نقارے، اور ایک تین برس کے پستہ قد لڑکے کی پس ماندگی کے بہانے جواب دینے سے انکار کر دیتا تھا۔میری سن کر مما ہمیشہ چیخ چیخ کر کہتی تھی، ''یہ سب اس کم بخت ہونے کا کیا دھرا ہے، جس نے اس کے ماتھے کو بوسہ دیا تھا۔آسکر اس طرح کا تو کبھی نہیں تھا۔جوں ہی میں نے وہ منظر دیکھا تھا، میں سمجھ گئی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے۔''

میں اعتراف کرتا ہوں کہ مسٹر بیرا نے مجھ پر اپنے دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔حتیٰ کہ گھر کی قید بھی، جب بھی ممکن ہوتا، مجھے ایک آدھ گھنٹے کے لیے AWOL جانے سے باز نہیں رکھ پاتی تھی، جو بدنام زمانہ گانے کے ذریعے، کسی دکان کی کھڑکی کے شیشے میں روزن بنانے اور کسی پُرامید نوجوان آدمی کو، جو اتفاق سے کھڑکی کے پاس کھڑا ہوتا، خالص ریشم کی برگنڈی ٹائی کا مالک بنا دیتا تھا۔

اگر آپ مجھ سے سوال کریں گے کیا وہ کسی قسم کی شیطنت ہوتی ہے جو اچانک

آسکر کو ایک سجی سجائی کھڑکی کے صاف ستھرے چمکتے شیشے میں ایک روزن بنا دینے پر اُکساتی ہے؟ اس کے جواب میں مجھے کہنا پڑے گا، جی ہاں! یہ محض شیطنت ہوتی تھی جو مجھے دُکانوں کے اندھیرے دروازوں کی طرف لے جاتی تھی۔ اس لیے کہ سب جانتے ہیں کہ اس نوعیت کے دروازے بد روحوں کی پسندیدہ جائے قیام ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، اپنی شرارتوں کو کمتر ظاہر کرنے کی خواہش سے قطع نظر، اب جب کہ میں کسی کو ورغلانے کے تمام امکانات کھو چکا ہوں، میں اپنے آپ سے اور اپنے نگہبان برونو سے کہنے پر مجبور ہوں، آسکر، تم نے چھوٹی اور درمیانہ درجے کی خواہشات رکھنے والے، برف پر چلنے والے ان مطمئن مردوں اور عورتوں کو، جو اپنے خوابوں کی کسی شے سے محبت کرتے تھے، نہ صرف بھڑکایا ہے، بلکہ تم نے ان کو اپنے آپ کو پہچاننے کا موقع بھی فراہم کیا ہے۔ نہ جانے کتنی خوش پوش خواتین، کتنے نفیس عمر رسیدہ مرد، کتنی عمر رسیدہ کنواریاں، جن کے مذہب نے ان کی جوانی برقرار رکھی ہے، اپنے دل کے اندر چھپے چور سے کبھی واقف نہ ہو پاتیں، اگر تمھاری آواز نے ان کو چوری کرنے پر اُکسایا نہ ہوتا، جو، اپنے دل میں پیدا شدہ تبدیلی کے باعث، اس لمحے سے قبل، ایک نالائق اور معمولی جیب کترے کو ایک خطرناک مجرم گردانتے تھے۔

مسلسل کئی شام اس کے ساتھ سایے کی طرح پھرتے رہنے، اور اس کے، کم از کم تین بار چوری سے انکار کے بعد، وہ میری چوتھی کوشش پر آخر چور بن ہی گیا تھا، حالاں کہ پولیس کو کبھی پتا نہیں چل سکا تھا کہ بڑے رُعب والا سرکاری وکیل، ڈاکٹر 'اِروِن شائلِنس' صرف اس لیے نرم خو، شفیق منصف اور تقریباً نرم دل سزائیں دینے والا بن گیا تھا کہ اس نے میرے سامنے، چوری سے باز رکھنے والے، نیم دیوتا کو قربان کر دیا تھا اور نیولے کے بال کاٹنے والا ایک شیو رچ لیا تھا۔

میں جنوری 1937 کی ایک رات، سردی سے کپکپاتا، بہت دیر تک ایک جوہری کی دُکان کے پاس کھڑا رہا، جو میپل کے درختوں کی قطار والی ایک پُرسکون مضافاتی سڑک پر واقع تھی جسے شہر کی بہترین سڑک گردانا جاتا تھا۔ زیورات اور قیمتی گھڑیوں سے سجے دُکان کے شوکیس نے میرے کئی شکاروں کو اپنی جانب راغب کیا تھا، جنھیں میں بغیر جھجکے

گولی مار دیتا، اگر وہ ریشمی موزے، نمدے سے بنی ہیٹ، یا برانڈی کی بوتلوں سے سجے کسی اور شوکیس کی طرف راغب ہوتے۔

یہ ہوتا ہے زیورات کا اثر۔ آپ سست ہو جاتے ہیں، اور اپنی تمام سرگرمیوں کو کبھی نہ ختم ہونے والے [تسبیح کے] گول دانوں کے دور پر پھیرنے لگتے ہیں۔ اب میں وقت کو منٹ نہیں موتیوں کے برسوں میں گنتا ہوں، اس خیال کے ساتھ کہ گردن کے مقابلے میں موتی دیر پا ہوتا ہے، کنگن خاک نہیں ہوتے کلائی خاک ہو جاتی ہے، قدیم مقبروں سے انگلیاں نہیں انگوٹھیاں برآمد ہوتی ہیں؛ المختصر مجھے ونڈو شاپنگ کرنے والوں میں کوئی 'شو باز' اور ڈینگ مارنے والا اور کوئی نگینوں کو بالکل غیر اہم سمجھنے والا محسوس ہوا تھا۔

'باسیئر' جوہری کی دکان کے شوکیس پر مجمع نظر نہیں آیا تھا۔ اس کے شوکیس کے مرکز میں کچھ منتخب گھڑیاں، سوئس معیار والی، آسمانی رنگ کے مخمل میں سجی رکھی تھیں۔ ایک گھڑی تین کنڈل مارے سانپ کی مثال تھی، جس کو مختلف رنگ کے سونے، نفاست سے تراشے گئے پکھراج اور دو عدد ہیروں سے سجایا گیا تھا، جس میں آنکھوں کی جگہ دو عدد نیلم لگے ہوئے تھے۔ عام طور پر میں سیاہ مخمل کا شیدائی نہیں، مگر جس پر 'باسیئر' کا سانپ سجا تھا وہ بہت مناسب لگ رہا تھا؛ اسی طرح خاکستری مخمل بھی تھا جس نے پلاٹینم و چاندی سے بنی ہم آہنگ اشیا سے عجیب نوعیت کی اشتعال انگیز خاموشی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ وہاں ایک انگوٹھی بھی رکھی ہوئی تھی جس میں اس قدر خوب صورت نگینہ جڑا ہوا تھا کہ اس کو دیکھتے ہی آپ کہہ اٹھیں گے کہ اس کو پہن کر، اسی کی جیسی خوب صورت خواتین کے ہاتھ اس قدر خوب صورت ہوتے جائیں گے کہ ایک دن وہ غیر اخلاقی درجے پر فائز ہو جائیں گے جو بلا شبہ ہر نگینے کا حق ہوتا ہے۔ وہاں چمپاکلی کے کچھ ہار بھی رکھے ہوئے تھے، جنھیں کوئی بھی پہننے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی، یہ ہار اپنے پہننے والے کو تھکا دیتے تھے؛ اور آخر میں، ہلکے پیلے رنگ کے مخمل سے بنے گدے پر، جو گردن کی شکل میں ڈھالا گیا تھا، بے حد کم وزن کا اور نازک ہار رکھا ہوا تھا، اتنی نزاکت سے بنایا گیا ہوا، جیسے کسی مکڑی کے جالے سے توڑ کر الگ کر لیا گیا ہو۔ اور دنیا میں ایسی کون سی مکڑی ہو گی جو اپنے جال بنانے والے لعاب کے بجائے سونا اگل کر ایسا جال

بُن سکے گی جو چھ عدد چھوٹے چھوٹے اور ایک بڑے سے یاقوت کو اپنے جال میں گرفتار کر سکے گا؟ کہاں بیٹھی تھی وہ مکڑی اور کسی کی تاک میں تھی وہ؟ یقینی طور پر، مزید یاقوت کے ٹکڑوں کے لیے نہیں؛ غالباً وہ ایسے کسی شخص کے انتظار میں تھی جسے، خون میں ڈھلے ہوئے قطروں کی مانند یہ یاقوت اپنی طرف متوجہ کرلیں گے—یا میں دوسرے لفظوں میں اپنے منصوبے کے یا سونے کا جالا اُگلنے والی مکڑی کے مطابق، یہ ہار کسے دے دوں۔

اٹھارہ جنوری 1937 ، پیروں تلے کچلی ہوئی سخت برف میں، اس رات شاید جس میں محسوس ہوتا تھا کہ مزید برف پڑنے والی ہے، ایسی رات جو اس کے لیے تیار کی جاتی ہے جس کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ برف کو ہر بات کا ذمے دار ٹھہرائے، میں نے اپنی مشاہدے کرنے والی چوکی سے جان برانسکی کو جوہری کی دُکان کے قریب سے، نظر اُٹھائے، جھجکے یا بالکل ساکت ہوئے بغیر گزرتے، اور سڑک پار کرتے دیکھا تھا گویا اس کے نام کا عدالتی بلاوا آیا ہوا ہو۔ وہ مُڑا تھا موڑا گیا تھا اور پھر میپل کے برف سے لدے سفید، خاموش درختوں کے درمیان شوکیس کے قریب جان برانسکی کھڑا تھا۔

وہ وجیہ، نہایت وجیہ جان برانسکی، ہمیشہ کا بیمار، کام کے معاملے میں اطاعت شعار اور محبت کے معاملے میں جرأت مند، سُست، حُسن کا متوالا؛ جان برانسکی جو میری ماں کے جسم کا حصہ سا بن گیا تھا، جس نے، آج بھی مجھے یقین بھی ہے اور شک بھی کہ ماتسیرات کے نام سے میرا نطفہ ڈالا تھا—اپنے مروّج زمانہ اوورکوٹ میں ملبوس، جسے وارسا کے کسی خیاط نے تراشا ہوگا، کھڑا تھا اور خود اپنا مجسمہ یا خوف کی علامت بن گیا تھا۔ Parsifal [رچرڈ واگنر کے اوپرا کے کردار] کی طرح وہ گرتی ہوئی برف میں کھڑا تھا، مگر Parsifal کی توجہ تو برف پر پڑے خون کے قطروں نے اپنی گرفت میں لے لی تھی، جان کی نظر سنہرے ہار پر لگی ہوئی تھی۔

میں اس کو اپنی جانب بلا سکتا تھا یا نقارے کی مدد سے اس کو بھگا سکتا تھا۔ میرا نقارہ میرے پاس تھا۔ میں اسے اپنے کوٹ میں چھپا محسوس کر سکتا تھا۔ صرف ایک بٹن کھولنے کی دیر تھی اور وہ پالے بھری رات میں باہر نکل آتا۔ میں اپنے کوٹ میں ہاتھ ڈالتا

تو چوبِ نقارہ عمل کے لیے تیار ظاہر ہو جاتیں۔ [یاد ہے نا کہ] محبوب بدنظر شکاری نے اپنا تیر روک لیا تھا جب وہ خاص قسم کا بارہ سنگھا اس کے حیطۂ بصارت میں داخل ہو گیا تھا۔ 'ساؤل'، 'پال' بن گیا تھا۔ 'اٹیلا' (Attila) اُلٹے پاؤں واپس ہو گیا تھا، جب 'پاپائے اعظم لیو' (Pope Leo) نے اپنی انگوٹھی والی انگلی اس جانب کر دی تھی، مگر میں نے اپنا تیر چلا دیا تھا، میں بدلا نہیں تھا، میں واپس نہیں ہوا تھا، میں آسکر شکاری بنا رہا، اور اپنے ہدف کی طرف متوجہ تھا: میں نے اپنے کوٹ کے بٹن نہیں کھولے تھے، میں نے اس پالے بھری رات میں نقارے کو کوٹ سے باہر نکلنے نہیں دیا تھا، میں نے چوبِ نقارہ کو نقارے کی ٹھنڈی سفید سطح پر رکھ نہیں دیا تھا، میں نے جنوری کی اس رات کو نقارہ نوازی کی رات میں بدل نہیں دیا تھا، مگر خاموش لہجے میں چیخا تھا، اس طرح چیخا تھا، شاید جیسے کوئی ستارہ چیختا ہو یا گہرے سمندر میں کوئی مچھلی چیختی ہو۔ میں پہلے تو اس پالے بھری رات میں چیخا تھا کہ آخرِ کار برف گر سکے، اور پھر اس شیشے میں، موٹے سے شیشے میں، انمول شیشے میں، سستے شیشے میں، شفاف شیشے میں، علاحدگی کرنے والے شیشے میں، دنیا کے درمیان کے شیشے میں، اس کنوارے صوفیانہ شیشے میں جو جان برانسکی کو یاقوت کے ہار سے الگ کیے ہوئے تھا، ایک روزن کاٹنے کے لیے جو 'جان' کے دستانے کے لیے ٹھیک ہو، جو مجھے اچھی طرح معلوم تھا۔ میں نے کٹے ہوئے گول شیشے کو ایک چور دروازے کی طرف ڈال دیا تھا، جنت کے پھاٹک کی طرح، جہنم کے پھاٹک کی طرح: 'جان' ہچکچایا نہیں، اس کے چمڑے کے کوٹ سے چمڑے کا نفیس ہاتھ برآمد ہوا، آسمان کی طرف بلند ہوا، اس نے جنت سے یا جہنم سے ایک ہار اٹھا لیا جس کے یاقوت، راندہ فرشتے سمیت، دنیا بھر کے فرشتوں کو آسودہ کر دیتے۔ اس کا یاقوت اور سونے سے بھرا ہاتھ، کوٹ میں واپس چلا گیا، پھر بھی وہ شگاف شدہ کھڑکی کے پاس کھڑا رہا، حالاں کہ وہاں کھڑا رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا، حالاں کہ وہاں خون بھرے یاقوت نہیں تھے اس کو، یا Parsifal کو بتانے کے لیے، کہ وہ کس طرف دیکھے۔

اے میرے آسمانی باپ، بیٹے اور مقدس روح! یہی وقت تھا کہ روح حرکت کرتی یا پھر یہ 'جان'، باپ 'جان'، کے ساتھ ہوگی۔ بیٹے آسکر نے اپنے کوٹ کے بٹن

کھولے، تیزی سے چوب نقارہ نکالیں اور اپنے نقارے کے ذریعے چلّایا: بابا—بابا، جب تک جان برانسکی نے پلٹ کر اور آہستہ، بہت آہستگی سے سڑک پار کر لی تھی اور مجھے، یعنی آسکر کو دُکان کے دروازے کے قریب کھڑا پایا۔

کتنا اچھا لگ رہا تھا کہ جوں ہی 'جان'، بے خودی کی کیفیت میں جما ہوا، مگر پگھلنے کے قریب، مجھ پر نظر ڈالنے کے لیے پلٹا تھا کہ برف گرنی شروع ہو گئی تھی۔ اس نے میری جانب اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، مگر دستانہ نہیں، جس نے یاقوت چھوئے تھے، اور مجھے خاموش مگر بے خوف گھر کی طرف لے چلا تھا، جہاں مما میرے بارے میں فکر مند ہو رہی تھی اور ماتسیرات، زیادہ سنجیدگی سے نہیں، مگر معمول کے مطابق اپنی سخت گیری کے مظاہرے کے ساتھ، پولیس کو اطلاع کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ 'جان' نے کسی قسم کی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی؛ وہ زیادہ دیر ٹھہرا بھی نہیں، اور تاش کا کھیل کھیلنے پر مائل بھی نہیں تھا، حالاں کہ ماتسیرات نے میز پر بیئر لا کر رکھ دی تھی اور اس کو دعوت بھی دی تھی۔ روانگی کے دوران وہ آسکر کو سہلاتا جا رہا تھا اور آسکر کو علم نہیں تھا کہ یہ اس کا حق تھا، یا دوستی کی خواہش تھی، وہ جس کا طلب گار ہو رہا تھا۔

چند دنوں بعد برانسکی نے وہ ہار میری ماں کو دے دیا تھا۔ یقیناً یہ جانتے ہوئے کہ وہ کہاں سے آیا تھا، وہ ہار کو اسی وقت پہنتی تھی، جب ماتسیرات موجود نہیں ہوتا تھا، صرف اپنے لیے یا جان برانسکی کے لیے، اور شاید میرے لیے بھی۔

جنگ کے تھوڑے دنوں بعد میں نے اس ہار کا ڈوسلڈارف کے چور بازار میں بارہ کارٹن لکی اسٹرائیکس (Lucky Strikes) اور چمڑے کے ایک بریف کیس سے تبادلہ کر لیا تھا۔

# کوئی حیرانی سی حیرانی ہے

آج، جب میں دماغی اسپتال میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا ہوں، اکثر اپنی اس طاقت پر افسوس کرتا ہوں، جس کے ذریعے میں اپنی آواز کو سردی کے موسم کی راتوں میں شیشے پر جمے پالے کو گلانے میں، دُکان کی بجی کھڑکیوں میں روزن بنانے میں اور چوروں کو چوری کا راستہ بجھانے میں استعمال کیا کرتا تھا۔ میں کتنا خوش ہوں گا، اگر اپنے کمرے کے دروازے میں جھانکنے کے سوراخ کو شیشے سے آزاد کرسکوں تا کہ میرا نگہبان برونو براہِ راست مجھ پر نظر رکھ سکے۔

اسپتال میں قید ہونے سے پہلے برس میں اپنی طاقت کے ختم ہو جانے سے مجھے کتنی پریشانیاں ہوئی تھیں۔ وقتاً فوقتاً میں اپنی چیخ کو 'ڈوسلڈارف' کے بد بخت مضافات میں، جہاں میرا قیام تھا، روانہ کیا کرتا تھا۔ جب کامیابی کے اشتیاق کے باوجود کچھ نہیں ہوتا تھا تو میں جو خاموشی سے نفرت کرتا ہوں، اس قابل تھا کہ ایک پتھر اٹھاتا اور اس کو باورچی خانے کی کھڑکی کی درمیان سے باہر پھینک دیتا۔ مجھے دُکانوں کی کھڑکیاں سنوارنے والے ڈیلرز کے لیے خاص طور پر اپنا ایک مظاہرہ کرنے پر بہت خوشی ہوتی۔ وہ آدھی رات کے کچھ بعد کا وقت تھا جب میں نے اس کو مَردوں کے ایک فیشن اسٹور کی کھڑکی کے شیشے کے پیچھے کام کرتے دیکھا تھا۔ اس کے جسم کا کمر سے اوپر کا سارا حصہ پردے کی پیچھے تھا، پھر بھی میں اس کے سبز اور سُرخ رنگ کے موزوں کے ذریعے اسے پہچاننے میں کامیاب ہو گیا تھا اور حالاں کہ وہ میرا شاگرد ہے یا شاید کبھی ہو جائے، میری شدید خواہش تھی کہ میں اس کی

کھڑکی کے شیشے کو اپنے گانے سے ریزہ ریزہ کردوں، اس لیے کہ نہ اس وقت مجھے معلوم تھا اور نہ اس وقت معلوم ہے کہ میں اس کو 'جان' کہوں یا 'جوڈس'۔

'ڈلر' شریف آدمی تھا اور اس کا پہلا نام 'گاٹ فریڈ' تھا۔ اپنی توہین آمیز اور بے کار صوتی کوشش کے بعد جب میں نے اس کے شیشے پر ہلکے سے کھٹکا کر کے اپنی جانب اس کی توجہ مبذول کی تھی، اور چند منٹ کے لیے مجھ سے بات کرنے، اور اپنی سجاوٹ کی صلاحیت کو غیر اہم ظاہر کرنے کے لیے باہر نکلا تھا تو میں اس کو گاٹ فریڈ کہنے پر مجبور ہو گیا تھا، اس لیے کہ میری آواز وہ کرامت دکھانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی جو مجھے اس کو 'جان' یا 'جوڈس' کہنے کا حق دار بناتی۔

جوہری کی دُکان کے مالِ غنیمت نے، جس نے جان برانسکی کو چور اور میری مما کو یاقوت کے ہار کی مالک بنا دیا تھا، دل پسند اشیا سے سجی دُکان کی کھڑکیوں کے باہر میرے گانے کو عارضی طور پر ختم کر دیا تھا۔ مما کو مذہب ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ کس طرح؟ اس میں شک نہیں کہ جان برانسکی سے اس کے تعلقات، چوری کے ہار اور ایک بدکار عورت کی پُرلطف بدبختی پر مشتمل تھے، جس نے اس کو شعائرِ مقدسہ کا چور بنا دیا تھا۔ گناہ کی عادت کتنی آسانی سے اپنی جگہ بنا لیتی ہے اور جمعرات کے جمعرات ان دنوں شہر میں تفریح کے لیے جانا، ننھے آسکر کو مارکس کے پاس چھوڑنا، سرگرمی سے کسرت کرنا، عام طور پر تیشلر گاسے جانا، 'کیفے وائزکے' کی کافی پینا اور پیسٹری کھانا، بچے کو کچھ تحائف سمیت مارکس کے پاس سے لینا، اور سینے پرونے میں کام آنے والا ریشم خریدنا، اس قیمت پر بیچنا کہ وہ خرید کے بجائے تحفہ معلوم ہو، اور واپس جانے کے لیے ۵ نمبر ٹرام گاڑی پر بیٹھنا، ہم لوگوں کی مصروفیات ہوتی تھیں۔

مسکراتی اور دور دراز کے خیالات میں گم، میری مما، 'اولیوا' گیٹ سے گزر کر ہنڈن برگ ایلی جاتے ہوئے، شاید ہی کبھی 'میوائزنے' کے بارے میں غور کرتی یا تسیرات جہاں اپنی اتوار کی صبحیں گزارا کرتا تھا۔ اسپورٹس پیلس کے قریب کے موڑ پر وہ دانت پیستی — ایک خوب صورت تجربے کے بعد کتنی بدصورت لگتی ہے یہ بکس جیسی عمارت — ارے، ایک اور موڑ آ گیا ہے، اس طرف، خاک آلودہ درختوں کے پیچھے، سُرخ ٹوپیوں والے طلبہ کا اسکول

'کانزیڈینم' ہے—کتنا اچھا ہوتا اگر ننھا آسکر بھی سنہرے C والی سُرخ ٹوپی میں ہوتا؛ اسکول کے پہلے سال وہ ساڑھے بارہ برس کا ہوتا، لاطینی زبان پڑھنے کی ابتدا ہو گئی ہوتی، وہ تو ایک چھوٹا سا 'کانزیڈینم' ہو جاتا، ایک طالب علم، مگر شاید تھوڑا سا اکڑفوں والا!

سُرنگ سے گزرنے کے بعد، جیسے جیسے ہماری کار 'رائنگ شولوتی' اور 'ہیلن لانگے' اسکول کی طرف بڑھ رہی تھی، مسز ماتسیرات کے کانزیڈینم اور اس بچے کے آسکر کے مواقع کھو دینے کے بارے میں خیالات قطروں کی صورت گرتے چلے جا رہے تھے۔ بلب کی شکل کے کلس والے کلیسا سے گزر کر بائیں جانب جانے کا ایک اور موڑ تھا۔ پھر، 'ماکس'—'ہالبے'—'پلاٹز' پہنچ کر ہم کیزر کے کریانے کی دُکان کے بالکل سامنے کار سے اتر گئے۔ اور اپنے مقابلے کی کھڑکی پر ایک نظر ڈالتی ہوئی، مما 'لیبس وگیً' میں مُڑ گئی، اپنے اڈّے کی طرف، حال میں پیدا ہونے والی زود رنج ذہنی کیفیات کے ساتھ، اس عجوبے جیسے بچے کے ساتھ، اپنے پریشان کن ضمیر کے ساتھ، اور سب کچھ دوبارہ شروع کرنے کی خواہش کے ساتھ، میری مما، کچھ نہیں اور بہت کچھ کے درمیان، ماتسیرات کے لیے کراہت اور نیک خومیلان کے درمیان الجھتی، میرے ہمراہ 'لیبس وگیً' کی جانب چلی جا رہی تھی، اور میرا نقارہ اور اس کا کوڑیوں کی قیمت والے ریشم کا بنڈل، دُکان کی طرف، دبی ہوئی ولیا کی طرف، مٹی کے تیل کے کنستر اور ہیرنگ مچھلی کے ڈبوں کی طرف، یونانی کشمش، میٹھی کشمش، بادام، اور مصالحے، ڈاکٹر 'اوئٹکر' کے بیکنگ پاؤڈر کی طرف، 'پرسل صاف دھلائی کرتا ہے'، 'میگی' اور 'ناز'، 'کینے' کا سرکہ، 'کافی ہاگ' اور چار پھلوں سے بنے جام، مکھیاں بھگانے والی کاغذی پٹیوں کے بنڈل کی طرف، چھن چھن کرتی مختلف کنجیاں، جن کے ساتھ لٹکتا خوش بو پھیلانے والا 'ہنی سویٹ' جو گرمی کے موسم میں ہماری دُکان کے کاؤنٹر پر ہر ہفتے تبدیل کیا جاتا تھا، جب کہ مما گرمی کا موسم ہو یا سردی کا، ہمیشہ اپنی ہنی سویٹ شخصیت کے ساتھ، سال بھر، اپنے گناہوں کے ساتھ جو کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتے، ہر سنیچر کو 'سیکریڈ ہارٹ' کلیسا جاتی اور محترم و معظم 'فادر ویکنے' کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتی تھی۔

مما مجھے جمعرات کے دن شہر کی طرف لے جا رہی تھی، اس طرح جیسے مجھے

اپنے گناہوں میں شریک کرنا چاہتی ہو: ہفتے کے دن وہ مجھے لے گئی تھی گرجا گھر کے دروازے سے کیتھلک flagstones پار کرتی ہوئی : پہلے سے اس نے میرے نقارے کو میرے سویٹر کے یا اوورکوٹ کے نیچے ٹھونس دیا تھا، اس لیے کہ میں اپنے نقارے کے بغیر ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھتا تھا؛ اور اپنے نقارے کے بغیر تو میں اپنے ماتھے، سینے اور کاندھوں کو چھوکر مقدس صلیب بھی نہیں بنا تا تھا— نہ ہی میں اپنے گھٹنے موڑتا، جیسا کہ جوتا پہنتے وقت کیا جاتا ہے— نہ مقدس پانی سر سے بہتا ہوا میری ناک پر پہنچ کر آہستہ آہستہ خشک ہوتا اور نہ ہی میں پالش کی ہوئی بنچ پر خموشی اور شرافت سے بیٹھتا تھا۔

مجھے یہ گرجا گھر اپنے بپتسمے کے دن سے یاد ہے۔ مجھے مشرکانہ نام دینے پر بھی گڑبڑ ہوئی تھی، مگر میرے والدین کا اصرار آسکر پر ہی تھا، اور 'جان' بھی، گاڈ فادر کی حیثیت میں بھی اسی نام پر اڑا ہوا تھا۔ پھر 'فادر ویکنے' نے میرے منہ پر تین بار پھونک ماری تھی— جس کا مقصد مجھ میں سے شیطان کو نکالنا تھا۔ پھر صلیب کا نشان بنایا گیا، سر پر ہاتھ رکھا گیا، نمک چھڑکا گیا، اور شیطان کے خلاف کئی قسم کے اقدامات کیے گئے تھے۔ بپتسمے کے بعد ایک بار سب کچھ پھر رُک گیا تھا۔ میں ساکت بیٹھا تھا اور میرے لیے مناجات کی جا رہی تھی۔ 'فادر ویکنے' نے شیطان کو بھگانے کے لیے پھر کچھ پڑھا تھا، اور میری ناک اور کان چھوئے تھے، اس خیال سے کہ اس طرح وہ بچے کے احساسات کو جگا رہا تھا، مگر آسکر کو تو پہلے سے معلوم تھا، یہ سب کچھ کیا ہے۔ فادر نے آخری بار پھر اپنے کان سے سننا چاہا اور بچے سے پوچھا، ''کیا تم شیطان کی نفی کرتے ہو؟ اور اس کے سارے کام کی نفی؟ اس کی شان وشوکت کی نفی کرتے ہو؟''

قبل اس کے کہ میں انکار میں سر ہلاتا— اس لیے کہ میرا نفی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا— 'جان' نے از خود میرے وکیل کی حیثیت میں تین بار ''میں نفی کرتا ہوں'' کہہ دیا تھا۔

شیطان سے اپنے تعلقات خراب کرنے سے بچنے کے لیے میں نے کچھ کہا نہیں تھا، مگر 'فادر ویکنے' نے میرے سینے اور دونوں کاندھوں کے درمیان مقدس تیل کی مالش کر دی تھی۔ پھر تین بار مجھے پانی میں ڈبویا گیا، میرے سر پر مقدس تیل ملا گیا، مجھے سفید کپڑے پہنائے گئے تھے تا کہ اس پر دھبے بن سکیں، اندھیرے دنوں کے لیے انکل 'جان'

کو موم بتیاں دی گئیں، اور ہم سب کو فارغ کر دیا گیا۔ ماتسیرات نے فیس ادا کی، 'جان' مجھے گرجا گھر سے باہر لے گیا، جہاں صاف مگر جزوی طور پر ابر آلود موسم میں ٹیکسی ہمارا انتظار کر رہی تھی، اور میں نے اپنے اندرون کے شیطان سے پوچھا، "تم پر کیسی گزری!۔"

شیطان اچھل پڑا، اور سرگوشی میں مجھ سے پوچھا، "تم نے گرجا گھر کی وہ کھڑکیاں دیکھیں؟ ہر طرف شیشے ہی — شیشے!"

'سیکریڈ ہارٹ' کلیسا جرمن شہنشاہیت کے ابتدائی دور میں تعمیر کیا گیا تھا، اسی وجہ سے اس کا "Neo-Gothic" انداز پہچانا جاتا تھا۔ چوں کی اینٹیں جلد ہی گہرے رنگ کی ہو جاتی تھیں اور مینار پر چڑھے تانبے پر زنگ بھی لگ جاتا تھا، اس لیے قرونِ وسطیٰ کی اور جدید دور کی Gothic طرزِ تعمیر کو صرف تجربے کار ماہرین ہی پہچان سکتے تھے۔ نئے اور پرانے دونوں قسم کے گرجا گھروں میں اعترافات ایک ہی طرح سنے جاتے تھے۔ مکرم و معظم 'فادر ویکنے' ہی کی طرح سیکڑوں مکرم و معظم فادر حضرات ہر سنیچر کو اپنے دفتری اوقات میں اعترافات سننے کے لیے اپنے بالوں بھرے مشائخ جیسے کان چمک دار سیاہ جالی سے لگائے بیٹھا کرتے تھے اور اجتماع کے افراد اپنے گناہوں کی بے چینی کو گول دانوں کی طرح، ایک کے بعد دوسرا دانہ، جالی کے اس پار پادری کے کانوں میں ڈالا کرتے تھے۔

جب مما 'فادر ویکنے' کے سمعی اعضا کے معرفت اپنے اچھے اور بُرے کام کی تفصیلات، خیالات، الفاظ وغیرہ کلیسا کے صرف معاف کرنے والے اربابِ اقتدار تک پہنچا رہی ہوتی تھی، میں، جس کے پاس اعتراف کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا، لکڑی کی بنی چمک دار بنچوں سے کھسک جاتا تھا، جو میری پسند سے کچھ زیادہ ہی چکنی ہوتی تھیں، اور پتھر کے فرش پر کھڑا انتظار کرتا تھا۔

مجھے اس اعتراف میں باک نہیں کہ کیتھلک کلیساؤں کے فرش، کیتھلک کلیساؤں کی باس، بلکہ ہر کیتھولک شے، کسی ناقابلِ بیان وجہ سے آج بھی مجھے مسحور کر دیتی ہے، اسی طرح جیسے سُرخ بالوں والی لڑکیاں مجھے مسحور کر دیتی ہیں، حالاں کہ میں ان کے بال کے رنگ بدل دینا چاہوں گا، اور یہ بھی کہ کیتھلک عقائد مجھے کلمۂ کفر بکنے سے باز نہیں رکھتے تھے، جس سے

میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ کیتھولک کی حیثیت میں میرا مجسمہ ناقابلِ تنسیخ ہے، حالاں کہ اس کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔ میں اپنے نہایت عام قسم کے دنیاوی اور روزمرہ اعمال کے دوران خود حیران ہوتا ہوں، مثال کے طور پر دانت صاف کرتے ہوئے، یا اس وقت بھی جب میں اجابت کی کیفیت میں ہوتا ہوں، میں مذہبی اجتماعات میں کی گئی باتیں دُہراتا رہتا ہوں: ہمارے مقدس اجتماعات میں یسوع مسیح کے خون کی قربانی کی تجدید ہوتی ہے: ہمارے گناہوں کے معاف کرنے کے لیے ان کا خون پھر سے بہایا جاتا ہے: یسوع مسیح کے خون کے جام میں وائن کی قلبِ ماہیت ہوتی ہے: جب بھی خون بہایا جاتا ہے، وہاں یسوع مسیح کا اصل خون موجود ہوتا ہے: ان کے مقدس ترین خون کے منظر کے ذریعے، روحوں پر یسوع مسیح کا خون چھڑکا جاتا ہے: مقدس خون، خون میں دھلا ہوا خون، تقدیس میں بہتا ہے: یسوع مسیح کے خون کی آواز تمام آسمانوں میں گونجتی ہے: یسوع مسیح کا خون خدا کے سامنے خوش بو پھیلاتا ہے۔

آپ اعتراف کریں گے کہ میں نے ایک خاص قسم کا کیتھولک لہجہ استعمال کیا ہے۔ ایسا بھی ایک وقت تھا جب کنواری مریم کے خیال کے بغیر میں ٹرام گاڑی کا انتظار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ان سے کہا ہے، مقدس: شان دار: کنواریوں میں سب سے کنواری: ربانی صفات کی ماں: آپ عورتوں میں سب سے زیادہ بابرکت ہیں: آپ ہر احترام کی حق دار ہیں: آپ نے پیدا کیا ہے ان کو—: آپ سب سے زیادہ نیک طبع ماں ہیں: آپ سب سے محفوظ ماں ہیں: سب سے نمایاں کنواری ہیں: مجھے یسوع مسیح کے نام کی خوش بو سونگھنے دیجیے اسی طرح جیسے آپ اپنے دل میں اس کی خوش بو سونگھتی ہیں: کہ یہی صحیح ہے ہماری نجات کے لیے: اے بہشت کی ملکہ، اے تبرک برکتوں والی—

کبھی کبھی، بالخصوص سنیچر کے ان دنوں میں، جب مما اور میں 'سیکریڈ ہارٹ' کلیسا جاتے تھے، تو وہ چھوٹا سا لفظ ''blessed'' میرے دل میں اتنی زہریلی مٹھاس بھر دیتا تھا کہ میں شیطان کا شکر گزار ہوتا تھا کہ اس نے میرے اندروں میں رہتے ہوئے بھی میرے مجسمے کو برداشت کیا تھا، مجھے ایک تریاق فراہم کیا جس نے مجھ کو اس قابل بنایا تھا کہ میں ایک کیتھولک کی طرح ارتکابِ کفر کے بعد بھی 'سیکریڈ ہارٹ' کلیسا کے پتھروں پر کھڑا ہوتا تھا۔

یسوع مسیح، جن کے دِل پر اس کلیسا کا نام رکھا گیا تھا، صرف مقدس صحیفوں میں ہی نہیں 'کلواری' کی تیز رنگ تصویروں میں بھی جلوہ گر تھے؛ وہاں تین رنگین مجسمے بھی تھے جن میں وہ مختلف انداز میں دکھائے گئے تھے۔

ایک مجسمہ پینٹ کیے ہوئے پلاسٹر کا تھا۔وہ اس میں کھڑے ہوئے تھے، لمبے بال، سنہرے پائے پر، نیلے رنگ کی پروشیائی قبا میں، چپّل پہنے ہوئے تھے۔اس میں ان کی قبا سینے پر کھلی ہوئی تھی، اور عضویات کے تمام اصولوں کے خلاف، ان کے سینے کے درمیان، سُرخ ٹماٹر جیسا، درخشاں اور رسمی طور پر خون آلود، دِل بنا ہوا تھا، جس کے باعث اس کلیسا کا نام ان کے اس عضو پر رکھا گیا تھا۔

پہلی بار میں نے اس کھلے دِل والے یسوع مسیح کو غور سے دیکھا تھا، اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس نجات دہندے اور میرے گاڈ فادر، یعنی انکل اور قیاسی باپ، جان بہانسکی میں شرمندہ کرنے والی کتنی شباہت تھی۔ وہی خواب ناک اور خود اعتمادی سے لبریز معصومانہ آنکھیں! کھلتی ہوئی کلی جیسے لب، ہمیشہ رونے والی صورت۔ ابروؤں سے دُکھوں کا مردانہ اظہار۔ تادیب کے طلب گار سُرخ رنگ کے رخسار۔دونوں کے چہرے ایسے تھے، مرد جن کی ناک پر مکّے مارنا چاہیں اور عورتیں سہلانا چاہیں۔اور پھر کچھ تھکے ہوئے، عورتوں جیسے ہاتھ تھے، قرینے سے صاف کیے ہوئے جسمانی مشقت سے ماورا، جن کے دیکھنے کسی دربار کے جوہری کے انعام جیسے لگتے تھے۔ مجھے 'بہانسکی' کی ان آنکھوں سے خوف آتا تھا، وہ آنکھیں جو باپ کی آنکھوں کی طرح مجھے غلط سمجھتی تھیں، جو یسوع مسیح کے چہرے پر پینٹ کی گئی تھیں۔ میری آنکھیں بھی اسی قسم کی نظر آتی تھیں مگر قائل کرنے والی نہیں، صرف شبہات پیدا کرنے والی تھیں۔

آسکر نے کلیسا کے بیچ خوں چکاں دِل سے اپنا رُخ پھیر لیا، وہاں سے تیزی سے گزر کر ادھر گیا جہاں یسوع مسیح صلیب اٹھائے نظر آتے ہیں، اور ساتویں منزل تک، جہاں یسوع مسیح اپنی صلیب کے وزن کے باعث دوسری بار گرے تھے، اور بلند قربان گاہ تک جس کے اوپر ان کا تراشا ہوا ایک اور نقش آویزاں تھا۔شاید وہ تھکے ہوئے تھے یا

ہو سکتا ہے کہ وہ غور کرنا چاہتے ہوں؛ بہر حال اس یسوع مسیح کی آنکھیں بند تھیں۔ سبحان اللہ! کیا جسم تھا اس آدمی کا! اس مقدس دوڑ کی بازی جیتنے والے کھلاڑی کا جسم کو دیکھ کر میں مقدس دل والے 'مرانسکی' کو بھول گیا تھا۔ جتنی بار مما 'فادر ویکنے' کے سامنے اعتراف کرنے کے لیے وہاں آتی تھی، میں وہیں کھڑا قربان گاہ کے کھلاڑی کو بڑی عقیدت مندی سے دیکھا کرتا تھا۔ یقین کیجیے کہ میں دعا بھی مانگا کرتا تھا۔ میں اس کو بہت خوش خُلق کھلاڑی، عالمی چیمپئن، صلیب پر دستوری کیلوں کی مدد سے جھولنے والا سمجھتا تھا۔ جب کہ اس کے جسم میں نہ کوئی پھڑکن ہوئی تھی نہ تڑپ۔ ایک دائمی روشنی تھی جو جھلملا رہی تھی، مگر ان میں ایک مکمل باضابطگی نظر آ رہی تھی، جس کے لیے ان کو سب سے زیادہ نمبر ملتے۔ [دوڑ کے] وقت کا حساب کرنے والی گھڑیاں چل رہی تھیں۔ وقت کا حساب لگایا جا رہا تھا۔ متبرک اشیا کے کمرے میں کلیسا کی صفائی کرنے والی 'ڈیکسٹن' انگلیاں اس کے سونے کے تمغے کو چمکا رہی تھیں، مگر یسوع مسیح نے محض اعزاز حاصل کرنے کے لیے تو مقابلہ نہیں کیا تھا۔ مجھ میں اعتقاد پیدا ہو گیا تھا۔ میں گھٹنے کے بل، جس حد تک جھک سکتا تھا جھکا، اپنے نقارے پر صلیب کا نشان بنایا، اور برلن میں ہونے والے پچھلے اولمپک کھیلوں کے جیسی 'اوونس' اور 'روڈالف ہاربگ' کے لیے "مقدس" یا "afflicted" کا لاحقہ لگانے کی کوشش کی؛ مگر میں بہت کامیاب نہیں ہوا تھا، کہ مجھے اس امر کا اعتراف کرنا تھا کہ یسوع مسیح نے! ان دو چوروں کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔ ان کو نااہل قرار دینے پر مجبور، میں نے اپنا سر بائیں جانب موڑا، جہاں، نئی امیدوں کے ساتھ، کلیسا کے اندروں، مجھے اس آسمانی کھلاڑی کا تیسرا مجسمہ نظر آ گیا تھا۔

"جب تک میں اسے تین بار دیکھ نہیں لیتا، مجھے دعا نہیں کرنی چاہیے۔" میں اپنے آپ سے کہتے ہوئے ہکلایا، اور اپنے پاؤں flagstone پر رکھے، اور شطرنجی فرش پر چلتا بائیں جانب کی قربان گاہ تک گیا۔ ہر قدم پر مجھے احساس ہوتا تھا کہ وہ تمھاری حفاظت کر رہے ہیں، اولیا تمھاری حفاظت کر رہے ہیں، 'پیٹر' جس کو انھوں نے صلیب پر کیلوں سے نصب کر دیا تھا، 'اینڈریو' جسے انھوں نے ایک آڑی صلیب پر کیلوں سے جڑ دیا تھا، اسی لیے آڑی صلیب کو 'سینٹ اینڈریو' صلیب کہا جاتا ہے۔ ایک اور یونانی صلیب بھی

ہوتی ہے، لاطینی صلیب کے علاوہ، جذباتی صلیب بھی ہوتی ہے۔ دہری صلیبیں، ٹیو ٹانی (Teutonic -قدیم آلمانی) اور گلواری (Calvary -جس جگہ حضرت عیسیٰ کو مصلوب کیا گیا تھا) صلیبیں — کپڑوں پر، کتابوں میں، اور تصویروں پر بھی نقش کی جاتی ہیں۔ میں نے تو سموسے کی صلیب، بحری جہاز کے لنگر جیسی صلیب اور پُر سکون کرنے والی cloverleaf صلیب بھی دیکھی ہے۔مولین (Moline — چکّی کے پاٹ میں لگے پرزے نما) صلیب خوب صورت ہوتی ہے، مالٹا کی صلیب زیادہ پسند کی جاتی ہے، کانٹے دار صلیب، یا سواستیکا صلیب ممنوع ہیں، یا 'ڈی گال' (de Gaulle) صلیب، لورین (Lorraine) صلیب جس کو بحری لڑائیوں میں 'سینٹ انتونی' صلیب کہا جاتا ہے۔ 'سینٹ انتونی' صلیب زنجیروں میں ڈال کر پہنی جاتی ہے، چوروں کی صلیب بد صورت ہوتی ہے، پوپ کی صلیب پاپائی صلیب کہلاتی ہے، اور روسی صلیب کو 'لازرَس' صلیب بھی کہتے ہیں۔اس کے علاوہ 'صلیبِ احمر' بھی تو ہوتی ہے۔ اور نیلے رنگ کی صلیب الکحل مخالف ہوتی ہے۔زرد رنگ کی صلیب کا مطلب زہر ہوتا ہے، صلیبی مکڑیاں ایک دوسرے کو کھا جاتی ہیں۔ صلیبی راستوں پر ہم ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں، چلیپا، جرح، مختلف مقاصد، چلیپائی معمے وغیرہ ہوتے ہیں۔اور پھر میں چوراہے کو چھوڑتا ہوا مڑ گیا: میں نے بے چارے مصلوب کھلاڑی کو نظر انداز کردیا، اور بالک یسوع مسیح کی طرف بڑھا جسے کنواری مریم کی دائیں ران پر بٹھایا گیا تھا۔

آسکر، کلیسا کے مرکزی حصے میں واقع بائیں جانب کی قربان گاہ کے پاس کھڑا تھا۔ مریم کے چہرے پر ویسا ہی تاثر تھا جیسا کہ اس کی مما کے چہرے پر رہا ہوگا، جب 'ٹرائل' کی دُکان پر کام کرنے والی ایک سترہ سالہ لڑکی کے پاس فلم دیکھنے کی رقم نہیں تھی، اور اس نے حیرت بھری نظروں سے 'اَستا نیلسن' کے دیواری اشتہار دیکھ کر اپنا کلیجا ٹھنڈا کر لیا تھا۔

[شاید] مریم کو یسوع مسیح میں زیادہ دل چسپی نہیں تھی، اور وہ اپنی دائیں ران پر بیٹھے ایک اور لڑکے کی طرف متوجہ تھی — آپ کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے میں فوری طور پر اس لڑکے کا تعارف کرادوں — کہ وہ لڑکا 'جان دی بپٹسٹ' تھا۔ دونوں لڑکے تقریباً

میری عمر کے تھے۔ دراصل یسوع مسیح شاید ایک انچ بڑے رہے ہوں گے، حالاں کہ مقدس متون کے مطابق وہ ننھے 'بپٹسٹ' سے بھی چھوٹے تھے۔ اس تین سالہ نجات دہندے کا گلابی رنگ اور برہنہ مجسمہ بنانے والا سنگ تراش بہت خوش ہوا ہوگا۔ 'جان' بعد میں ریگستان میں تھا، بے ترتیب، چاکلیٹ کے رنگ کی پوستین پہنے ہوئے تھا، جس نے اس کا آدھا سینہ، پیٹ اور اعضائے بول چھپا رکھے تھے۔

آسکر کے لیے بہتر تھا کہ وہ بلند قربان گاہ سے دور ہی رہتا، یا مقامِ اعتراف کے اطراف اپنا کام کرتا بجائے اس کے کہ وہ ان دو بچوں کی معیت میں رہتا جن کی آنکھوں میں زود بالغی لگتی ہے جن میں ان کی اپنی خوف ناک شباہت ہے۔ فطری بات ہے کہ ان کی آنکھیں نیلی ہیں اور بال سرخی مائل بھورے ہیں۔ ان کی شباہت مکمل ہوتی اگر اس حجام/سنگ تراش نے ان ننھے آسکروں کے بال بحری جہاز کے سپاہیوں جسے تراشے ہوتے اور ان کی خلافِ فطرت، گھنگھریالی لٹیں کاٹ دی ہوتیں۔

میں اس 'بپٹسٹ' لڑکے پر زیادہ وقت نہیں لگانا چاہوں گا، جس نے اپنی بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے یسوع مسیح کی طرف اشارہ کیا تھا، گویا وہ بتانا چاہ رہا تھا کہ پہلے کون کھیلے گا: "Eeny meeny miny mo..." جیسی بچگانہ تفریح کو نظر انداز کرتے ہوئے میں یسوع مسیح کی طرف نظر کرتا ہوں اور اپنی جسمانی ساخت اور شباہت پاتا ہوں۔ وہ میرا جڑواں بھائی ہو سکتا تھا۔ اس کی جسمانی ساخت بالکل میری جیسی تھی اور اس کے پاس میرے ہی جیسا پانی کا برتن تھا، جو اُن دنوں صرف پانی دینے میں استعمال ہوتا تھا۔ وہ دنیا کو میری کوبالٹ جیسی نیلی 'برانسکی' آنکھ سے دیکھ رہا تھا، اور یہی وہ بات تھی جو مجھے ناپسند تھی۔ میرے ہاتھوں جیسے دو ہاتھ اُٹھے ہوئے تھے، اور ان کی مٹھیاں اس طرح بھنچی ہوئی تھیں گویا وہ چاہتے تھے ان میں کوئی شے داخل کر دی جائے، مثال کے طور پر میری چوبِ نقارہ۔ اگر مجسمہ ساز نے ایسا کر دیا ہوتا اور سرخ و سفید پلاسٹر کا بنا نقارہ اس کے ہاتھ میں تھما دیتا تو وہ میرا، یعنی آسکر کا اپنا وجود، ہو جاتا جو کنواری کے گھٹنوں پر بیٹھا ہوتا، اور دونوں مل کر نقارہ بازی کرتے ہوتے۔ دنیا میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو مقدس تو ہیں مگر

ان کو ان کے حال پر چھوڑا نہیں جا سکتا۔

قالین لگی تین سیڑھیاں سبز اور نقرئی لباس پہنے کنواری تک لے جاتی تھیں، 'جان' کی چاکلیٹ رنگ الجھے بالوں والی پوستین، اور ننھے یسوع مسیح تک، جن کا رنگ اُبلے ہوئے گوشت جیسا تھا۔ ان کے سامنے قربان گاہ تھی، جس پر انیمیا زدہ پیلے رنگ کی موم بتیاں تھیں اور ہر قسم کے پھول تھے۔ ان تینوں — سبز کنواری، بھورا جان اور گلابی یسوع مسیح — کے سروں کے پیچھے، ڈنر کی رکابیوں کی طرح کے نورانی ہالے بنے ہوئے تھے — قیمتی رکابیاں جنھیں سونے کی پتیوں سے مزین کیا گیا ہو۔

اگر قربان گاہ کا معاملہ نہ ہوتا تو میں کبھی اوپر نہ جاتا۔ قدمچے، دروازے کے ہینڈل، اور دکانوں کی مزین کھڑکیوں میں آسکر کو لبھانے والی طاقت تھی، اور اگرچہ آج اسے کسی شے کی ضرورت نہیں سوائے اسپتال کے ایک بستر کے، وہ اب بھی ان سے لاتعلق نہیں ہے۔ وہ ایک قدم سے دوسرے قدم، ان کو لبھانے دیتا ہے، مگر ہمیشہ اسی قالین پر۔ وہ اس گروہ کے اتنا قریب پہنچ گیا تھا کہ بدتمیزی اور احترام سے، ایک ساتھ دونوں طرح، ان کو اپنے انگلی کے جوڑوں سے کھٹکھٹا سکتا تھا۔ ان کو اپنی انگلیوں کے ناخنوں سے کھروچ سکتا تھا، اس طرح کہ پینٹ کے نیچے کا پلاسٹر ظاہر ہو جاتا۔ کنواری کے جسم کو ڈھانکنے والے پارچے کی تہوں کے پیچ کو، بادلوں کے لکے پر ٹکی انگشتِ پا تک دیکھا جا سکتا تھا۔ کنواری کی پنڈلیوں کی مختصر سی جھلک سے معلوم ہوتا تھا کہ مجسمہ ساز نے پہلے گوشت تخلیق کیا تھا، بعد میں اس کو پارچوں سے ڈھانپ دیا تھا۔ آسکر نے یسوع مسیح کو اکیلا چھوڑ دیا تھا، اس امید پر کہ یسوع مسیح اس کو بھی اکیلا چھوڑ دیں گے۔

میں نے اپنے سوئیٹر کے نیچے سے اپنا نقارہ نکالا، اسے اپنے گلے سے الگ کیا، احتیاط کے ساتھ، کہ یسوع مسیح کے ہالے پر کوئی نشان نہ پڑ جائے، اس کے گلے میں اپنا نقارہ ٹانگ دیا تھا۔ میرے چھوٹے قد کی وجہ سے اس کام میں کافی کوشش کرنی پڑی تھی۔ مجھے مجسمے پر چڑھنا، اور بادل کے لکے پر کھڑا ہونا پڑا تھا، جو چوکے کا کام دے رہا تھا۔

جنوری 1936 میں، آسکر کے بپتسمے کے بعد، کلیسا میں اس کی پہلی بار آمد پر ایسا

نہیں ہوا تھا، سوائے اس برس کے مقدس ہفتے کے۔ اس سردی کے موسم میں اس کی مما مشکل سے اپنے اور جان برانسکی کے درمیان معاملات یاد رکھ پاتی تھی، جن کو اعترافات میں شامل کرنا بھی ایک بڑا کام تھا۔ نتیجے میں، آسکر کو بہت سارے سنیچر مل گئے تھے، جن میں وہ اپنے منصوبوں کو پختہ کرتا، رد کرتا، ان میں تبدیلی کا جواز پیدا کرتا، ان کو ہر زاویے سے جانچتا، اور بالآخر، مقدس ہفتے کے دوشنبے کے دن صلیب کے مقامات کی مدد سے، پچھلی تمام تبدیلیوں کو مسترد کرتا، نئے منصوبے بناتا، اور ان کو تمام تر سادگی اور راست سے پورا کر سکتا تھا۔

چوں کہ مما چاہتی تھی کہ ایسٹر سے پہلے اعتراف ہو جائے تا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ انتہا کو پہنچ جائے، اس نے پیشی منڈے کے دن میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے 'لیبس ویگ' سے 'نیو مارکٹ' اور 'ایلیسن اشتراسے'، وہاں سے 'میرین اشتراسے' اور 'وو لگے مُتھز' کی قصائی کی دُکان، پھر 'کلائن ہامر پارک' اور اس سُرنگ نما سڑک سے، جہاں ہمیشہ پیلے رنگ کا غلیظ مادہ اُبلتا رہتا ہے، ریلوے کے پشتے کے اس پار 'سیکریڈ ہارٹ' کیلسا لے گئی تھی۔

ہم پہنچے تو دیر ہو چکی تھی۔ وہاں صرف دو بوڑھی عورتیں اور ایک خوف زدہ نوجوان مقامِ اعتراف کے باہر انتظار کر رہا تھا۔ مما انگوٹھے کو لعابِ دہن سے تر کرتی، دعاؤں کی کتاب کی ورق گردانی کرتی، اپنے ضمیر کا محاسبہ کر رہی تھی، گویا وہ اپنے ٹیکس کا گوشوارہ بھرنے کے لیے بہی کھاتے میں اعداد و شمار تلاش کر رہی ہو۔ میں وہاں سے کھسک گیا، اور کھلے دل والے یسوع مسیح کی اور صلیب کے کھلاڑی کی نظروں سے بچتا بائیں جانب کی قربان گاہ پہنچ گیا تھا۔

حالاں کہ مجھے تیزی سے نکل جانا چاہیے تھا، میں نے مناجات کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ میں نے نقارے کو اپنے گلے سے اتارا اور بادل کے ٹکڑے پر چڑھ گیا، نقارے کو یسوع مسیح پر ٹانگ دیا، اس احتیاط کے ساتھ کہ نور کے ہالے کو گزند نہ پہنچے۔ پھر بادل کے ٹکڑے سے اترا۔۔۔ گناہوں سے توبہ کی، معافی کی التجا کی۔۔۔ مگر پہلے میں نے یسوع مسیح کے ہاتھوں میں چوبِ نقارہ ٹھونس دیں، جو اُن کے لیے مناسب سائز کے تھے، اور پھر ایک قدم، دوسرا قدم، تیسرا قدم، اور میں نے بلندی کی طرف نظر کی، تھوڑا سا قالین، پھر بالآخر پرچم اور آسکر کے لیے دعا مانگنے کے اسٹول کی طرف، جس کے گدّے پر وہ

گھٹنوں کے بل جھکا اور اس نے اپنے نقارہ نواز ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا تھا؛ وہ اسی طرح ہاتھ باندھے یسوع مسیح اور اپنے نقارے کی طرف بڑھا، اور معجزے کا انتظار کرنے لگا تھا: کیا وہ اب نقارہ بجائے گا یا کیا وہ نقارہ بجا نہیں سکتا یا اس کو اس کی اجازت نہیں؟ یا تو وہ نقارہ بجاتا ہے، ورنہ وہ یسوع مسیح نہیں؛ اگر وہ ابھی نقارہ نہیں بجاتا، تو اُس کے مقابلے میں آسکر زیادہ اصلی یسوع مسیح ٹھہرتا ہے۔

اگر آپ معجزہ چاہتے ہیں، تو آپ کو جاننا چاہیے کہ انتظار کیسے کیا جاتا ہے۔لہٰذا میں نے انتظار کیا۔ پہلے تو میں نے صبر کے ساتھ انتظار کیا، حالاں کہ انتظار کافی نہیں تھا، اس لیے میں یہ الفاظ دہراتا رہا تھا: ''تمام آنکھیں تجھے ڈھونڈتی ہیں میرے آقا''—موقع کی مناسبت سے آنکھوں کی جگہ کان بھی رکھا جا سکتا ہے— دعا کرنے والے اسٹول پر گھٹنوں کے بل جھک کر آسکر زیادہ مایوس ہوگیا تھا۔اس نے آقا کو ہر ممکن موقع فراہم کیا تھا، اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اس خیال سے وہ چھوٹا آقا یسوع مسیح، اس خوف سے کہ اس کا پہلا قدم تکلیف وہ بھی ہو سکتا ہے، توقع ہے کہ بجانا شروع کر سکتا تھا۔اگر کوئی دیکھتا نہ ہو، مگر بالآخر تیسرا credo، باپ کے بعد، جنت کا اور زمین کا خالق، ہر شے، مرئی ہو یا غیر مرئی، اور صرف وہی پیدا شدہ بیٹا ہے، اصلی باپ کا اصلی بیٹا ہے، اس کی جانب سے، جو ہم انسانوں کے لیے اور ہماری نجات کے لیے، جنت سے زمین پر اُترا تھا، مجسم ہوگیا تھا، آدمی بنا دیا گیا تھا، دفن کیا گیا تھا، پھر جی اٹھا تھا، اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھا تھا، اور اپنے باپ کے ساتھ اس نے کہا تھا، بس ایک مقدس پر یقین رکھو— کیتھلک، اور ......

میری کیتھلکیت صرف میرے نتھنوں میں باقی بچی تھی۔ میرا عقیدہ تقریباً بہہ گیا تھا، مگر وہ کوئی باس نہیں تھی میں جس میں دل چسپی رکھتا۔میں کچھ اور چاہتا تھا: میں اپنے نقارے کو سننا چاہتا تھا، میں چاہتا تھا کہ میرے لیے یسوع مسیح کچھ بجائیں، مجھے ایک چھوٹے سے معجزے کی طلب تھی۔ مجھے کسی گرج دھمک کی طلب نہیں تھی جس کو سن کر ڈِکر رانیا' موقعے پر دوڑا جائے، اور 'فادر وینکے' اپنے جسم کی ساری چربی گھسیٹتے معجزہ دیکھنے پہنچے؛ میں کوئی بڑا معجزہ نہیں مانگتا تھا جو 'ایوا' کے Diocese میں شائع ہو، اور بشپ کو اس کا

ثبوت و عکس بھیجنا پڑے۔ نہیں! میں کوئی بوالہوس نہیں تھا۔ آسکر کو پادری بننے کی تمنا نہیں تھی۔ بس وہ ایک چھوٹا سا ذاتی معجزہ چاہتا تھا، ایسا کچھ، جسے وہ سن سکے اور دیکھ سکے، وہ کچھ جو اس پر ایک بار، ہمیشہ کے لیے واضح کر سکے کہ وہ کسی کے لیے یا کسی کے خلاف نقارہ نوازی کرے یا نہیں؛ بس اسے ایک اشارے کی طلب تھی کہ ان دونوں نیلی آنکھوں والے ہم شکل جڑواں میں سے کون مستقبل میں خود کو یسوع مسیح کہلوانے کا حق دار ہو گا۔

میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ مجھے تشویش شروع ہو گئی تھی: مما جائے اعتراف میں ہو گی؛ اب تک وہ چھٹے حکام خداوندی سے آگے نکل گئی ہو گی۔ وہ بزرگ آدمی جو کلیساؤں میں ہمیشہ لنگڑاتا پھرتا ہے، مرکزی قربان گاہ کے سامنے سے لنگڑاتا گزر گیا تھا، اس کے بعد بائیں قربان گاہ سے، بچوں سمیت کنواری کو سلام کرتا چلا گیا تھا۔ شاید اس نے میرا نقارہ دیکھا ہو گا، مگر سمجھ نہیں پایا ہو گا۔ وہ لنگڑاتا اور اس عمل میں، بوڑھا ہوتا چلا گیا۔

وقت گزرتا گیا، مگر یسوع مسیح نے نقارہ نہیں بجایا۔ میں نے ثنا خانے سے آتی آوازیں سنیں۔ کہیں کوئی کلیسائی آرگن بجانا شروع نہ کر دے، میں نے سوچا۔ اگر انھوں نے ایسٹر کے لیے مشق شروع کر دی تو آرگن کی آواز میں نقارے کی پہلے ہلکی تھاپیں غرق ہو جائیں گی۔

مگر کسی نے آرگن کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ کوئی معجزہ نہیں ہوا تھا۔ میں گدے سے اٹھا تو میرے گھٹنے بول اٹھے تھے۔ دل شکستہ اور زود رنج، میں قالین پر چلا، قدم بہ قدم خود کو گھسیٹتا جا رہا تھا، مگر درجہ بدرجہ ہونے والی تمام مناجاتوں کو نظر انداز کرتا گیا۔ میں کچھ درمیانہ درجے کی قیمت کے پھولوں کو بے ترتیب کرتا ہوا پلاسٹر سے بنے بادل پر چڑھا۔ بس مجھے اس خلافِ فطرت برہنہ بچے سے اپنا نقارہ واپس لینا تھا۔

مجھے اعتراف ہے اور ہمیشہ رہے گا کہ اس کو کچھ سکھانے کی کوشش کرنا غلطی تھی۔ معلوم نہیں، یہ خیال میرے ذہن میں آیا کیسے۔ بہر حال، جو ہوا سو ہوا، میں نے چوبِ نقارہ اس کے ہاتھ سے لے لیں مگر نقارہ اسی کے پاس چھوڑ دیا۔ پہلے نہایت نرمی سے، مگر پھر کسی بے صبرے استاد کی مانند، میں نے مصنوعی یسوع مسیح کو دکھانے کی کوشش کی تھی نقارہ کیسے بجایا جاتا ہے۔ اور بالآخر، چوبِ نقارہ اس کے ہاتھوں میں رکھتے ہوئے اب یہ

دکھانے کا موقع دیا کہ اس نے آسکر سے کیا سیکھا ہے۔

قبل اس کے کہ میں تمام شاگردوں میں سب زیادہ سرکش شاگرد ہے، اس کے سر کے اطراف بنے ہالے کی پروا کیے بغیر، نقارہ اور چوب نقارہ جھپٹ لیتا، 'فادر ویکنے' پیچھے کھڑا دیکھ رہا تھا — کہ پورے کلیسا کی لمبائی چوڑائی میں میری نقارہ نوازی سے سب واقف ہو چکے تھے — 'ڈکر رازیا' بھی میرے پیچھے موجود تھا۔ مما بھی تھی، اور وہ بزرگ آدمی بھی پیچھے کھڑا تھا۔ وکر نے مجھے پکڑ کر کھینچ لیا تھا۔ 'فادر ویکنے' نے میری کلائی پکڑی، مما مجھے دیکھ کر رونے لگی، 'فادر ویکنے' نے سرگوشی کی تھی، وکر تعظیم کے لیے خم ہوا، یسوع مسیح کے ہاتھوں سے چوب نقارہ لیں، اپنے ہاتھوں میں چوب نقارہ لیے پھر وہ تعظیم میں جھکا، اٹھا، چھوٹے آقا یسوع مسیح کے ہاتھ سے نقارہ لیا، اس کے ہالے کو شگافتہ کیا، اس کے پانی کے برتن کو چھیڑا، اس کوشش میں بادل کا ایک ٹکرا ٹوٹا، سیڑھیوں پر لڑکھڑایا، اور ایک بار پھر تعظیم کے لیے جھک گیا تھا۔ وہ مجھے نقارہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے پہلے سے زیادہ غصہ دلایا، مجھ کو 'فادر ویکنے' کو لاتیں مارنے پر اور مما کو شرمندہ کرنے پر اکسایا، جس کے پاس خود کو شرمندہ کرنے کے لیے پہلے ہی بہت کچھ تھا، جو میری اس تمام لات بازی، کاٹ کھانے، کھرونچنے اور 'فادر ویکنے' سے، وکر سے، اس بزرگ آدمی سے اور مما سے مجھے علاحدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس کے بعد میں، قربان گاہ کے سامنے سے، دوڑتا باہر چلا گیا، میرے ساتھ میرے اندر کا شیطان بھی اوپر نیچے اچھلتا کودتا چل رہا تھا، اور مجھ سے سرگوشی میں وہی کہہ رہا تھا جو اس نے بپتسمے کے دن کہا تھا: آسکر! ادھر اُدھر دیکھو! ہر طرف کھڑکی ہی کھڑکی، ہر طرف شیشہ ہی شیشہ!

صلیب پر آویزاں کھلاڑی کے سامنے سے گزرتے ہوئے، جو پُرسکون تھا، جس کے جسم کی ایک بافت میں بھی پھڑکن نہیں ہوئی تھی، میں نے، بارہ نبیوں کی نمائندہ، نیلے پس منظر میں بنی محرابی طاق، سرخ، زرد اور سبز دریچوں کی طرف منہ کرکے گانا گایا، مگر میرا ہدف نہ 'مارک' تھا اور نہ 'میتھیو'۔ میرا ہدف ان کے اوپر کی فاختہ تھی، جو سر کے بل کھڑی یومِ خمیس منا رہی تھی؛ میں نے مقدس روح کو نشانہ بنایا تھا۔ میرے گلے کی صوتی تانتوں میں لرزش ہوئی، میں اس پرندے سے اپنے ہیرے کے ساتھ ٹکرایا تھا۔ کیا یہ میری غلطی

تھی؟ کیا اس دلیر کھلاڑی نے مداخلت کی تھی؟ کیا وہ ایک معجزہ تھا، سب جس سے ناواقف تھے۔ان سب نے مجھے کانپتے، اور خاموشی سے محرابی طاق کے خلاف اپنی پوری طاقت سے کچھ اُبلتے دیکھا تھا، سوائے مما کے، جو سمجھ رہی تھی کہ میں دعا کر رہا ہوں، حالاں کہ میں کسی شے کے بارے میں دعا نہیں کر رہا تھا، سوائے کچھ ٹوٹے ہوئے شیشوں کے، مگر آسکر ناکام رہا، ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا۔ میں flagstones پر بیٹھ گیا اور رونے لگا تھا، اس لیے کہ وہ ناکام ہو گیا تھا، آسکر' ناکام ہو گیا تھا، اس لیے کہ 'وینگنے' اور 'رازیا' مجھے غلط سمجھے تھے، ان کے منہ سے ندامت کی نامعقولیات پھوٹ رہی تھیں۔صرف مما ہی ناکامیاب نہیں ہوئی تھی۔ وہ میرے آنسوؤں کو سمجھ رہی تھی، حالاں کہ وہ دل ہی دل میں خوش تھی کہ وہاں ٹوٹے ہوئے شیشے بکھرے نہیں تھے۔

مما نے مجھے گود میں اٹھالیا، وِکر سے نقارہ اور چوب نقارہ واپس لیں، اور فادر وینگنے' سے نقصان کا ازالہ کرنے کا وعدہ کیا، جس پر اس نے اعترافات کی دیر آید معافی عطا کی، اس لیے کہ میں اس کے اعترافات میں خلل انداز ہوا تھا: ننھے آسکر کو بھی کچھ برکات عطا ہوئیں، حالاں کہ ان کی ضرورت نہیں تھی۔

جب مما مجھے 'سیکریڈ ہارٹ' سے باہر لے جا رہی تھی، میں اپنی انگلیوں پر گن رہا تھا: آج دوشنبہ ہے، کل منگل ہوگا، پھر بدھ آئے گا، پھر مقدس جمعرات، پھر گڈ فرائیڈے اور اس کردار کے لیے سب کچھ ختم ہو جائے گا جو نقارہ تک بجا نہیں سکتا، جو مجھے تھوڑے سے ٹوٹے شیشوں کی خوشی بھی نہیں دے سکا تھا، جس میں میری شباہت تھی، مگر بناوٹی۔ وہ قبر میں چلا جائے گا، جب کہ میں نقارہ نوازی کرتا رہوں گا، مگر آئندہ کبھی کسی معجزے کی خواہش نہیں کروں گا۔

# گڈ فرائیڈے کا میلہ

مظہر تناقضات: پَیْشن منڈے اور گڈ فرائیڈے کے بارے میں اپنے احساسات کے بیان کے لیے میں یہی دو لفظ کہہ سکتا ہوں۔ ایک جانب تو میں اس پلاسٹر سے بنے لڑکے پر جھلایا ہوا تھا کہ اس نے نقارہ نہیں بجایا تھا؛ دوسری جانب، خوش تھا کہ اب یہ نقارہ صرف میرا ہے۔ حالاں کہ ایک طرف تو کلیسا کی کھڑکیوں پر حملے میں میری آواز ناکام ہو گئی تھی، دوسری جانب سالم رنگا رنگ شیشوں والی کھڑکیاں آسکر میں کیتھلک عقیدے کے آثار کو بچائے ہوئے تھیں، جن کے باعث ابھی تک وہ مایوسانہ کلمۂ کفر بک نہیں سکا تھا۔

اور اس میں کسی پیراڈاکس سے کہیں زیادہ کچھ تھا: ایک جانب تو میں، جب 'سیکریڈ ہارٹ' کلیسا سے اپنے گھر جا رہا تھا، ایک بالاخانے کی ایک کھڑکی کو ٹکڑے ٹکڑے کر چکا تھا، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا یہ سب ابھی تک میری قدرت میں ہے، مگر اس کے بعد، دوسری جانب الحادی قسم کے ہدف میں میری کامیابی نے مجھے مقدسات کے شعبے میں اپنی ناکامی سے آگاہ کر دیا تھا۔ پیراڈاکس، میں نے کہا تھا نا! اور وہ شگاف دیرپا تھا؛ میں کبھی اس کو دور نہیں کر سکا ہوں اور وہ اب بھی میرے ساتھ ہے، حالاں کہ آج نہ میں مقدس والوں میں ہوں نہ الحادیوں میں، بلکہ کنارے کنارے رہنے والا، ذہنی امراض کے اسپتال میں ہوں۔

مما نے بائیں جانب کی قربان گاہ کے نقصان کا ازالہ کر دیا تھا۔ ایسٹر کا کاروبار خوب تھا حالاں کہ ماتسیرات کے اصرار پر، جو پروٹسٹنٹ تھا، دکان کو گڈ فرائیڈے پر بند کرنا

پڑا تھا۔ مما نے، عام طور پر جس کی بات چلتی ہے، گڈ فرائیڈے کے معاملے پر ہتھیار ڈال دیے تھے، جس کے عوض اس نے کیتھلک میدان کو Corpus Christi پر بند کرنے کا مطالبہ کیا تھا، کہ کھڑکی میں رکھی 'جنجر بریڈ' کا ایک 'جنجر بریڈ' کنواری سے تبادلہ کر دیا جائے، جس پر بجلی کہ جھالریں لگائی جائیں اور اولیوا میں نکلنے والے جلوس کے مارچ میں بھی اس کو شامل کیا جائے۔

ہم نے ڈبّی سے بنے ایک تختے پر ''گڈ فرائیڈے پر بند رہے گی''، ایک طرف، اور دوسری طرف ''کارپس کرسٹی پر بند رہے گی'' لکھ کر تیار کر لیا تھا۔ گڈ فرائیڈے اور اس کے بعد نقارے اور شور شرابے سے ماورا دو شیشے کو ناشتے کے فوراً ہم ٹرام کار سے 'برینٹسن' کے لیے روانہ ہو گئے۔ میدان میں اپنی بات منوانے کے لیے 'لابس ویگ' کا منظر بھی ایک مظہرِ متناقضات جیسا نکلا۔ سارے پروٹسٹنٹ گرجا گھر گئے، کیتھلک لوگوں نے اپنی کھڑکیاں صاف کیں اور ہر چیز کو اپنے اپنے آنگن میں اس مبہم اور گونج دار انداز میں چیا کہ یہ تاثر ملتا تھا کہ ہزاروں نجات دہندوں کو ہزاروں صلیبوں پر ایک ساتھ کیلوں سے گاڑا جا رہا ہو۔

ہماری 'بھولی فیملی'۔۔۔ مما، ماتسیرات، 'جان برانسکی' اور آسکر قالین پیٹنے والوں کو چھوڑ ۹ نمبر کی ٹرام کار میں سوار، 'برینٹسن ویگ'، اس کے بعد ہوائی اڈے، پرانے کسرتی اور نئے کسرتی مشق کے میدانوں کی طرف چل پڑے تھے۔ ان کو 'ساپسے' قبرستان کے قریب سامنے سے نیو فار واسر'۔ 'برینٹسن' سے آنے والی ٹرام کار کو راستہ دینے کے لیے رُکنا پڑا تھا۔ مما نے اس انتظار کو ایک ملول موقع گردانا تھا، مگر ہلکے انداز میں اپنے کچھ مطالعات سے نوازا بھی تھا۔ مما کے خیال میں یہ ترک شدہ قبرستان، گرتے ہوئے کج لوح مزارات، قبروں پر قابو سے باہر اُگے سبزے اور مرجھاتے ہوئے کم قد صنوبروں سمیت خاصا رومانی اور دل موہ لینے والا لگتا تھا۔

''اگر اس وقت یہ جاری ہوتو میں یہیں لیٹنا پسند کروں گی'' اس نے پُر جوش انداز میں کہا تھا، مگر ماتسیرات کے خیال سے زمین زیادہ ریتیلی تھی، یہاں اُگے خاردار پودے اور جنگلی جئی کے کھیت اچھے نہیں لگتے تھے۔ جان برانسکی کا خیال تھا کہ ہوائی اڈے کے شور اور قریبی ٹرام کار کے جنکشن کی آواز، اس دل کش جگہ کی پُر کیف خاموشی میں خلل کا باعث ہو سکتی ہے۔

'نیو فار واسر'۔'ٹمروُسن' سے آنے والی ٹرام ہمارے اطراف سے گزری، ٹرام کے کنڈکٹر نے دوبارہ گھنٹی بجائی، ہم اس پر سوار ہو کے 'اپاسے' اور اس کے قبرستان کو چھوڑتے ہوئے ساحلی تفریح گاہ 'ٹمروُسن' کی طرف چلے، جو اس وقت، اپریل کے اختتام کے قریب، افسردہ حال لگی تھی: کھانے پینے کے اسٹال تختوں سے بند، قمار خانہ تالہ بند، ساحل کے کنارے کے راستے حفاظتی جھنڈوں سے محروم، خالی حماموں کی طویل قطار۔ جس جگہ موسم کا حال لکھا جاتا تھا، وہاں پچھلے برس کے موسم کے احوال لکھے ہوئے تھے: ہوا-۶۵؛ پانی -۶۰؛ ہوا کی سمت-شمال مشرق؛ امکانات -صاف سے ابر آلود تک۔

پہلے ہم سب نے 'گلِٹکاؤ' تک پیدل چلنے کا فیصلہ کیا، لیکن، حالاں کہ کسی نے کچھ نہیں کہا تھا، پھر بھی ہم اس کے مخالف سمت 'بریک واٹر' کی طرف چل پڑے۔ وسیع اور شست بحرِ بالٹک ساحل پر پھیلا ہوا تھا۔ جہاں تک بندرگاہ کے دہانے کا تعلق تھا، سفید لائٹ ہاؤس سے 'بریک واٹر' کی روشنی تک، ایک بھی ذی روح نظر نہیں آتا تھا۔ ہلکی بارش ریت پر اپنے نشانات چھوڑ گئی تھی؛ ان کو اپنے جوتوں کے نشانات سے بگاڑنا لطف انگیز تھا؛ مما نے اور میں نے بھی اپنے جوتے اور موزے اتار دیے تھے۔ ماتسیرات نے گلِڈن کے برابر اینٹوں کے چکنے اور گول ٹکڑے چنے اور ان کو سبزی مائل پانی پر تیرانے کے انداز میں پھینکنے لگا۔ کم ہنر مند جان برانسکی ان ٹکڑوں کے پھینکنے کے دوران عنبر بھی تلاش کر رہا تھا، بلکہ اسے کچھ ٹکڑے، اور چیری کی گٹھلی کے برابر ایک ڈلا مل بھی گیا تھا، جو اس نے مما کے حوالے کر دیا تھا، جو چلتے ہوئے پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھتی جاتی تھی گویا اس کو اپنے نقش سے محبت ہو گئی ہو۔ سورج کی روشنی پھیکی تھی۔ دن ٹھنڈا، مگر صاف اور پُرسکون تھا؛ آپ افق پر ایک پٹی سی دیکھ سکتے تھے جو دراصل جزیرہ نما 'ہیلا' تھا، اور ہواؤں میں گھلتی دھوئیں کی دو یا تین لکیریں: اور افق پر، وقتاً فوقتاً، کوئی دیوہیکل تجارتی بحری جہاز، ابھرتا، غائب ہوتا دکھائی دے جاتا تھا۔

علاحدہ علاحدہ چلتے ہوئے ہم لوگ 'بریک واٹر' کے سنگِ خارا کے بڑے بڑے گول پتھروں والے ساحل تک پہنچ گئے۔ ماتسیرات اور جان ایک پتھر سے دوسرے پتھر کودتے سمندر کی طرف روانہ ہو گئے، جب کہ مما جوتوں کے فیتے باندھنے میں میری مدد کر

رہی تھی۔ سمندری پشتے کی دیوار کی بنیاد کے درزوں میں سمندری کائی کے جھنڈ اُگے ہوئے تھے۔ آسکران میں کنگھی کرنا چاہ رہا تھا، مگر مما میرا ہاتھ پکڑ کر مردوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی، جو اسکول کے بچوں کی طرح اچھل کود کر رہے تھے۔ ہر قدم پر میرا نقارہ میرے گھٹنے سے ٹکرا جاتا تھا؛ اس جگہ بھی میں کسی کو اسے لے جانے نہیں دیتا تھا۔ مما کے پاس ایک ہلکے نیلے رنگ کا موسمِ بہار کا کوٹ تھا، جس پر رس بھری کے رنگ کی پٹی لگی ہوئی۔ اس کو سنگِ خارا کے پتھروں پر اونچی ایڑی کے جوتے پہن کر چلنا دشوار ہو رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح میں اتوار اور چھٹی کے دنوں میں اپنا ملاحوں والا کوٹ پہنتا تھا جس میں سنہرے لنگر جیسے بٹن تھے۔ میری ملاحوں والی ہیٹ پر لگی پٹی گریچن شیفلر کے S.M.S Seydlitz کے تھیلے سے آئی تھی، اور اگر ہوا ہوتی تو یہ پھڑپھڑاتی رہتی۔ ماتسیرات نے اپنے بھورے اوورکوٹ کے بٹن کھول دیے تھے۔ جان، فیشن کا پرستار، لمبا کوٹ پہنے ہوئے تھا جس میں کمر پر پیٹی بندھی ہوتی تھی، اور اس پر مخمل کا چمچماتا کالر لگا تھا۔

ہم 'بریک واٹر' کے آخر میں روشن مینار تک اچھلتے کودتے چلتے رہے۔ اس چھوٹے سے مینار کی بنیاد کے قریب ایک بوڑھا آدمی قلیوں کی ٹوپی اور صدری پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے پہلو میں آلو کا ایک بورا رکھا ہوا تھا جس میں کوئی شے بل کھاتی اور مچلتی معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ آدمی — میرے اندازے کے مطابق 'بریوسن' یا 'نیو فاروازر' کا تھا ایک سرے پر الگنی جیسی ڈور پکڑے ہوئے تھا۔ اس کا دوسرا سرا، سمندری کائی سے ڈھکا ہوا کھارے 'موٹلاؤ' پانی میں غائب تھا، جو اَب بھی کھلے سمندر سے الگ تھا، جس کا پانی 'بریک واٹر' کے پتھروں سے ٹکراتا تھا۔

ہم سب تجسس کے باعث یہ جاننا چاہتے تھے کہ قلیوں کی ٹوپی والا آدمی عام قسم کی الگنی کی ڈور سے مچھلی مارنا کیوں چاہتا تھا، اور ظاہر ہے کہ اس میں کوئی پھندنا بھی نہیں لگا تھا۔ مما نے اپنے خوش طبع اور چالاک لہجے میں اسے انکل کہا۔ انکل نے مسکرا کر اپنے تمباکو کے نشان والے ٹوٹے دانت نکال دیے؛ کچھ کہے بغیر، اس نے تمباکو کے رس کی لیس دار لمبی سے پیک ماری، جو سمندری دیوار کی بنیاد کے قریب پتھروں کے کونوں کے درمیان چکنے کیچڑ میں جا گری

جن پر کولتار اور تیل کی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ وہاں اس کی تھوکی ہوئی بلغم آمیز پیک اوپر نیچے ہوتی رہی، جب تک کہ ایک بحری چڑیا گھوم کر اور مہارت سے پتھروں سے بچتی ہوئی نیچے آئی اس ملغوبے کو لے کر واپس اڑ گئی، اور جاتے جاتے چیختی دوسری چڑیوں کو اطلاع دے گئی تھی۔

ہم جلد ہی جانے پر تیار ہو گئے تھے، اس لیے کہ سردی تھی اور سورج سے کوئی مدد نہیں مل رہی تھی، مگر عین اس وقت اس قلیوں کی ٹوپی والے نے، ایک کے بعد دوسرا ہاتھ بڑھا کر اپنی ڈور کھینچنی شروع کر دی تھی۔ مما واپس چلنے پر تیار تھی مگر ماتسیرات تیار نہیں تھا، اور جان نے، جو اصولی طور پر ہمیشہ مما کی ہر خواہش پر صاد کرتا تھا، اس موقعے پر اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ آسکر کو پروا نہیں تھی کہ ہم ٹھہرتے یا جاتے، مگر جب تک ہم ٹھہرے تھے وہ سب کچھ دیکھتا رہا تھا۔ جب وہ قلی ایک کے بعد دوسرے ہاتھ سے ڈور گھسیٹتا اور ہر بار اس پر لگی سمندری کائی کو صاف کرتا جاتا اور اس کو اپنے دونوں پیروں کے درمیان جمع کرتا جاتا تھا تو میں نے غور کیا تو پتا چلا کہ اُس تجارتی جہاز نے جو صرف آدھ گھنٹے قبل مشکل سے کبھی اپنا ڈھانچا دکھا جاتا تھا، اپنا راستہ تبدیل کر لیا تھا؛ وہ اب کم گہرے پانی میں تھا، اور اس کا رُخ بندرگاہ کی طرف تھا۔ یقیناً، وہ خام لوہا لے جانے والا کوئی سوئیڈ جہاز ہوگا جو اپنے ساتھ اتنا سارا پانی کھینچے لا رہا تھا، آسکر نے سوچا۔

آہستہ آہستہ جب وہ قلی اپنی جگہ سے اُٹھا تو میری توجہ سوئیڈ جہاز سے ہٹ گئی تھی۔ "اچھا، تو اب ہمیں دیکھنا چاہیے" اس وقت وہ ماتسیرات سے مخاطب تھا، جس کو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیا تھا، مگر اس نے ارادتاً اپنا سر ہلا دیا تھا۔ "اچھا، تو اب ہمیں دیکھنا چاہیے" قلی بار بار یہ جملہ دہراتا جاتا تھا، ساتھ ہی پانی میں سے ڈور کو گھسیٹتا جا رہا تھا، مگر اب اس کی کوشش تیز ہو گئی تھی۔ وہ مشکل سے پتھروں پر سے اترتا، دونوں ہاتھ بڑھائے سنگِ خارا کے پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے بن جانے والے جھاگ سے بھرے جوہڑ میں ڈور کے جانب بڑھ رہا تھا، اور پھر جھک کر اس نے کوئی شے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی — اور مما نے اپنی منھ دوسرے جانب پھیر لیا تھا، مگر تیزی سے نہیں — قلی کو کوئی شے مل گئی تھی، اس نے اپنی گرفت تبدیل کی، وہ شے اپنی جانب کھینچی اور اٹھائی، اور شاید جگہ

بنانے کے لیے ہم سب کی طرف دیکھ کر چیخا، اور کوئی بھاری سی چیز، جس سے پانی ٹپک رہا تھا، کوئی کثیر مقدار شے، ہمارے درمیان پھینک دی: یہ کسی گھوڑے کا کٹا ہوا سر تھا، اصلاً کسی سیاہ رنگ گھوڑے کا، عیال سمیت سر تھا، جو، بلا شبہ ایک دن قبل، یا اس سے پچھلے دن ضرور ہنہناتا رہا ہوگا؛ اس لیے کہ وہ ابھی سڑا گلا نہیں تھا، اس میں سے بدبو نہیں اٹھ رہی تھی، اگر تھی تو صرف 'ماٹلاؤ' کے پانی کی؛ مگر 'مریک واٹر' کی ہر شے پر اس کی بو پھیل گئی تھی۔

قلی کی ٹوپی والا آدمی — جس کی ٹوپی کھسک کر اس کی گردن کی پشت تک لٹک گئی تھی — گھوڑے کے گوشت کے ڈھیر پر مضبوتی سے اپنے پاؤں جما کر کھڑا ہو گیا تھا، جس میں سے ہلکے ہرے رنگ کی بام مچھلیاں تیزی سے ابھر رہی تھیں۔ وہ آدمی ان کو پکڑنے میں مشکل محسوس کر رہا تھا، اس لیے کہ بام مچھلیاں تیزی اور چالاکی سے حرکت کر رہی تھیں، بالخصوص تیلے پتھروں پر۔ بحری چڑیاں پہلے ہی سے اڑتی ہوئی چلا رہی تھیں۔ وہ نیچے کی طرف آتیں، ان میں سے دو یا تین کی چونچوں میں درمیانے سائز کی بام مچھلیاں ہوتیں۔ بھگائے جانے کے باوجود وہ جاتی نہیں تھیں، اس لیے کہ 'مریک واٹر' تو ان کی سلطنت تھا۔ پھر بھی وہ قلی، بحری پرندوں کے درمیان ہاتھا پائی اور چھینا جھپٹی کرتے ہوئے دو درجن کے قریب بام مچھلیاں اپنے بورے میں بند کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا، جسے پکڑنے میں ماتسیرات مدد کرنا چاہ رہا تھا، اور مدد کے لیے تیار بھی تھا۔ ماتسیرات اس کام میں اتنا مصروف تھا کہ اسے مما کی غیر ہوتی ہوئی حالت کا علم نہیں ہوا کہ پہلے اس کے ہاتھ پکڑتا، اس کے بعد اس کا سر، جو جان کے کاندھے پر اور اس کے مخملیں کالر پر ٹکا ہوا تھا۔

لیکن، جب چھوٹی اور درمیانی قامت کی بام مچھلیاں بورے میں ڈالی جا چکی تھیں، قلی، جس کی ٹوپی کام کے دوران سر سے گر گئی تھی، اس لاسر میں سے گہرے رنگ کی موٹی موٹی مچھلیاں کھینچ کھینچ کر نکال رہا تھا۔ مما کو بیٹھنا تھا۔ جان نے کوشش کی کہ اس کے سر کو دوسری جانب موڑ دے، مگر مما نہیں مانی؛ گائے کی جیسی بڑی بڑی آنکھوں سے قلی کی کارکردگی کو گھورتی رہی۔

''ذرا دیکھو'' قلی وقفے وقفے سے کراہتا جاتا تھا اور کہتا تھا، ''فرض کرو کہ ہم!''

اپنے ربڑ کے جوتوں کی مدد سے اس نے گھوڑے کے منہ کو کھولا اور جبڑوں کے درمیان اس طرح ایک ڈنڈا ٹھونس دیا کہ گھوڑے کے پیلے پیلے دانت ہنستے دکھائی دے رہے تھے۔ جب قلی نے —اب معلوم ہوا کہ اس کا سر گنجا، بالکل انڈے جیسا تھا— گھوڑے کے منہ میں اپنے دونوں ہاتھ ڈالے تھے تو ایک ساتھ دو مچھلیاں ہاتھ آئیں، دونوں اتنی موٹی تھیں جیسے کسی آدمی کا بازو۔ اب تو میری ماں کے جبڑے بھی کھل گئے تھے۔ اس نے ناشتے میں جو کچھ کھایا تھا سب 'مرِیک واٹز' کے پتھروں پر اُگل دیا تھا، انڈے کی سفیدی کے لوتھڑے جن میں انڈے کی زردی بھی ملی ہوئی تھی، ساتھ ہی دودھ والی کافی میں تر ڈبل روٹی کے ٹکڑے بھی۔ اس کے بعد مما کو پھر ابکائی آئی مگر اب پیٹ میں کچھ رہ ہی نہیں گیا تھا جو نکلتا، اس لیے کہ وہ موٹی تھی اور کسی قیمت پر بھی اپنا وزن کم کرنا چاہتی تھی، اور وہ ہر طرح کی خوراک کا تجربہ کرتی رہتی تھی، مگر ان پر پابندی سے عمل نہیں کرتی تھی۔ وہ چھپا چھپا کر کھایا کرتی تھی۔ اسے بس خواتین کی انجمن میں اپنی منگل کی جمناسٹک یاد رہتی تھی، مگر اس معاملے میں وہ پتھر کی طرح اٹل تھی، حالاں کہ جان، حتیٰ کہ ماتسیرات بھی اس پر ہنستے تھے جب وہ، ڈور کھینچ کر بند کیے جانے والے اپنے تھیلے میں تبدیل کرنے والے کپڑے لے کر اپنے مزاحیہ دوستوں کے ساتھ، نیلے چمک دار لباس میں، ہندوستانی مگدر چلانے جایا کرتی تھی پھر بھی وزن کم کرنے میں ناکام رہی تھی۔

اب بھی، مما آدھ پاؤنڈ سے زیادہ قے نہیں کر سکتی تھی، اگر چہ مزید ابکائیاں لے سکتی تھی، کہ وہ اپنے جسم سے بس اتنا ہی وزن کم کر سکتی ہے۔ سوائے سبز رنگ کے پتے کے کچھ بھی نہ نکلا تھا، پھر بھی بحری پرندے آگئے تھے۔ جب اس نے قے کرنا شروع کیا تھا پرندے آنا شروع ہو گئے تھے، وہ ہوا میں چکر لگا رہے تھے، اور فضا میں غوطہ لگانے لگے تھے؛ ان کو بھگایا نہیں جا رہا تھا— مگر وہاں تھا کون جو اُن کو بھگاتا، جان برانسکی تو بحری پرندوں سے خوف کھاتا تھا، اور اس نے اپنی خوب صورت آنکھیں اپنے ہاتھوں سے موند لی تھیں۔

کسی نے آسکر کی پروا نہیں کی، اس وقت بھی نہیں جب اس نے ان کے خلاف اپنے نقارے کو درج کرایا تھا، اس وقت بھی نہیں جب اس نے سفید پالش پر اپنے

چوب نقارہ کی مدد سے مقابلہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی نقارہ نوازی مدد نہیں کر سکی تھی؛ سوائے اس کے کہ بحری پرندے پہلے سے زیادہ مشتعل ہو گئے تھے۔ جہاں تک ماتسیرات کا سوال تھا، اسے مما کی بالکل فکر نہیں تھی۔ وہ تو قلی کی نقل اتارنے اور ٹھٹھا کرنے میں مشغول تھا؛ ہی ہی ہا۔۔۔ہا، بس یہی کچھ کر رہا تھا۔ قلی اپنا کام تقریباً ختم کر چکا تھا۔ جب اس نے گھوڑے کے کان سے آخری بام مچھلی نکالی تھی، اس کے بعد گھوڑے کے سر سے دماغ سے سفید دلیے جیسا ملغوبا نکالا تھا۔ ماتسیرات خود بھی بحری پرندوں سے پریشان ہو گیا تھا، مگر اب اس نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے قلی سے اوسط درجے کی دو مچھلیاں بے حد سستے دام خریدیں، مگر دام چکانے کے بعد بھی اس سے مول بھاؤ کرتا رہا۔

میں جان برانسکی سے بہت خوش تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ رو دے گا، پھر بھی اس نے مما کو اُٹھایا، اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سہارا دیا، اور اس کو لے کر چلا۔ یہ منظر بہت دل چسپ تھا کہ مما ایک پتھر سے دوسرے پتھر، اونچی ایڑی کے جوتوں میں اُچک اُچک کر چل رہی تھی۔ ہر قدم اس کا گھٹنا لوچ کھا رہا تھا، مگر کسی نہ کسی طرح، ٹخنے میں موچ کے بغیر وہ ساحل تک پہنچ گئی تھی۔

ماتسیرات کے ساتھ آسکر بھی قلی کے پاس ہی ٹھہر گیا تھا۔ قلی نے، جس نے ایک بار پھر اپنی ٹوپی پہن لی تھی، تفصیل بتانی شروع کی کہ آلو کا بورا پہاڑی نمک کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے کیوں بھرا ہوا تھا۔ بورے میں نمک اس لیے بھرا ہوا تھا کہ نمک میں چل چل کر بام مچھلیاں مر جائیں گی اور ان کی جلد سے اور اندرون سے نکلنے والا مادّہ نمک میں جذب ہو جائے گا۔ بام مچھلیاں جب نمک میں ہوں تو اس وقت تک تڑپتی رہتی ہیں جب تک مر نہ جائیں۔ جب آپ کو دھوئیں میں مچھلی پکانی ہو تب یہی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ پولیس کی طرف سے اس کی ممانعت ہے، مگر اس سے اس طریقے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر آپ اس طرح نہ کریں تو ان کا لیس دار مادّہ کیسے نکال سکیں گے؟ اس کے بعد مری ہوئی مچھلیوں کو خشک گھاس سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا جاتا ہے، اور دھوئیں کے سلنڈر میں لٹکا کر سفیدے کے درخت کی لکڑی کے دھوئیں میں پکایا جاتا ہے۔

ماتسیرات کے خیال میں مچھلی کو نمک میں تڑپنے دینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ تو گھوڑے کے سر میں بھی گھس جاتی ہیں؛ ہے نا؟ اور انسان کی لاشوں میں بھی، قلی نے لقمہ دیا۔ کہتے ہیں کہ Skagerrak کی جنگ کے بعد بام مچھلیاں بہت موٹی ہو گئی تھیں۔ یہ جنگ ڈنمارک کے سمندر میں لڑی گئی تھی، اور شاید قلی کا خیال تھا کہ بام مچھلیاں، جو مردہ خور ہوتی ہیں، مرنے والے سپاہیوں کو کھا کھا کر موٹی ہو گئی تھیں۔ چند دن ہوئے اسپتال کے ایک ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ ایک شادی شدہ عورت نے زندہ مچھلی کو جنسی تلذذ کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی تھی، مگر مچھلی کاٹتی ہوئی اندر داخل ہو گئی تھی اور نکلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اس عورت کو اسپتال لے جانا پڑا تھا، اور کہتے ہیں، کہ اس کے بعد وہ بچے جننے کے قابل نہیں رہی تھی۔

قلی نے نمک لگی مچھلیوں سے بھرے بورے کو اوپر سے باندھا، اور تیزی سے اپنے کندھے پر لاد لیا۔ انگلی کی لکڑی کو سمیٹ کر اپنے گلے میں ٹانگ لیا، اور جب تجارتی جہاز بندرگاہ میں داخل ہوا، تو 'نیوفارواسر' کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاز کا وزن اندازاً اٹھارہ سو ٹن تھا، اور یہ سویڈن کا نہیں رفسی لینڈ کا تھا، جس پر خام لوہا نہیں، تعمیراتی لکڑی لدی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جہاز پر قلی کے کچھ دوست بھی تھے، اس لیے کہ اس نے جہاز کے زنگ آلود ڈھانچے کے اس پار لوگوں کو ہاتھ ہلایا اور چلّا کر کچھ کہا تھا۔ جہاز کے رفسی باشندوں نے بھی جواب میں ہاتھ ہلائے، اور چلّا کر کچھ کہا۔ مگر میرے لیے عجیب بات یہ تھی کہ ماتسیرات نے ہاتھ کیوں ہلایا تھا اور جواب میں "Ship ahoy!" یا ایسی ہی کوئی فضول بات کیوں کہی تھی؟ رھائین لینڈ کا باشندہ ہونے کے باعث وہ جہازوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا، اور بلاشبہ وہ کسی رفسی باشندے کو نہیں جانتا تھا، مگر بس، وہ اسی قسم کا انسان تھا؛ کسی کو ہاتھ ہلاتا، چلّاتا، ہنستا اور تالیاں بجاتا دیکھتا تھا تو یہ خود بھی چلّانے، ہنسنے اور تالیاں بجانے لگتا تھا۔ اسی سے پتا چلتا ہے کہ نوعمری ہی میں یہ پارٹی میں کیوں شریک ہو گیا تھا، جب یہ ضروری نہیں ہوتا تھا، اس کو کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا، اور یہ اپنی اتوار کی صبحیں ضائع کرتا تھا۔

آسکر آہستہ آہستہ ماتسیرات کے، نیوفارواسر کے قلی اور وسعت سے زیادہ لدے

ہوئے رقص جہاز کو دیکھتا، پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میں کبھی کبھی مُڑ کر بھی دیکھ لیتا تھا، اس لیے کہ قلی نے روشنی کے مینار کی بنیاد کے قریب گھوڑے کے سر کو چھوڑ دیا تھا۔ اُس سر پر اب دیکھنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا، بحری پرندے اس پر چھائے ہوئے تھے۔ گہرے ہرے رنگ کے سمندر میں ایک تاباں سفید رنگ کا سوراخ، ایک تازہ دھلا ہوا بادل جو کسی وقت بھی ہوا میں بلند ہو سکتا تھا، گھوڑے کے اس سر کی چیخ کو چھپائے ہوئے جو ہنہنانے کے بجائے چیخا تھا۔

جب میں بہت پریشان ہو گیا تو بحری پرندوں اور ماتسیرات سے دور بھاگ گیا، نقارے پر ٹکے مارتے ہوئے، قلی کے پاس سے گزرتا جو، ایک چھوٹا سا پائپ پی رہا تھا، بریک واٹر کے آخری ساحل پر مما اور برانسکی کے پاس پہنچ گیا تھا۔ پہلے کی طرح جان مما کو سنبھالے ہوئے تھا مگر اب اس کا ایک ہاتھ مما کے کوٹ کے کالر کے نیچے غائب تھا، مگر ماتسیرات اسے دیکھ نہیں سکتا تھا، نہ جان کی پتلون کی جیب میں گھسے مما کے ہاتھ کو دیکھ سکتا تھا، اس لیے کہ وہ ہم سے بہت دور تھا، چار مچھلیوں کو، جن کو قلی نے پتھر مار کر بے ہوش کر دیا تھا، اخبار کے کاغذ میں لپیٹ رہا تھا جو اس کو بریک واٹر کے پتھروں کے درمیان مل گیا تھا۔

جب ماتسیرات ہم سے آن ملا تو مچھلیوں کے پیکٹ کو لہراتے ہوئے ڈینگ ماری، "اس نے ایک سو پچاس مانگے تھے، میں نے صرف ایک گلڈن دیا، بس۔"

مما اب بہتر لگ رہی تھی، اور اب اس کے دونوں ہاتھ دکھائی دے رہے تھے۔ "امید ہے کہ تم اب مجھ سے بام مچھلی کھانے کی توقع نہیں رکھو گے۔" مما نے کہا "اب میں زندگی بھر مچھلی کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی، بام مچھلی کو تو ہرگز نہیں۔"

ماتسیرات ہنس پڑا، "مت کھانا — بچی کہیں کی — تم ہمیشہ سے جانتی ہو کہ بام مچھلی کس طرح پکڑی جاتی ہے، اور تم نے بالکل اسی طرح کی ہمیشہ کھائی ہے۔ تازہ بھی کھائی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تمھارا اس مچھلی کے بارے میں کیا خیال ہوگا، جب تمھارا یہ خادم ان کو ٹھیک ٹھاک کر کے، سلاد کے ساتھ تمھاری خدمت میں پیش کر دے گا۔"

جان برانسکی، جس نے بہت پہلے مما کے کوٹ کے اندر سے اپنا ہاتھ نکال لیا تھا، کچھ نہیں بولا۔ میں تمام راستے 'برؤسن' تک نقارہ بجاتا گیا، اس لیے کسی نے پھر بام

مچھلی کی بات نہیں کی تھی۔ٹرام کا راسٹاپ پر اور کار میں بھی، میں نقارہ بجاتا گیا تھا، تا کہ یہ تینوں بالغ کوئی بات نہ کرنے پائیں۔ہام مچھلیاں بھی خاصی خاموش تھیں۔'ساپیے' میں ٹرام رکی نہیں اس لیے کہ وہاں ایک اور ٹرام رُکی ہوئی تھی۔ ہوائی اڈے سے ذرا بعد، میری نقارہ نوازی کے باوجود ماتسیرات نے ہم سب کو بتانا شروع کیا کہ وہ کتنا بھوکا تھا۔مما نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا، وہ تو ہم سے پرے کہیں اور دیکھتی رہی تھی، جب تک کہ جان نے اس کو ایک 'ریگاتا' پیش نہیں کر دی تھی ۔ جب جان مما کی سگریٹ جلا رہا تھا اور مما سگریٹ کے گولڈ ٹِپ کو اپنے لبوں سے تر کر رہی تھی، ماتسیرات کی طرف دیکھ کر مسکرائی، اس لیے کہ ماتسیرات عوامی جگہ پر اس کا سگریٹ پینا پسند نہیں کرتا تھا۔

'ماکس-ہالبے-پلاٹز' اسٹیشن پر ہم اتر گئے، اور اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود، مما نے ماتسیرات کا ہاتھ تھاما، جان کا نہیں، جیسی کہ مجھے توقع تھی۔ماتسیرات فلیٹ کا دروازہ کھول رہا تھا کہ مسز کاٹر، جو چوتھی منزل پر، ہنگل والے 'مین' کے بالکل برابر والے فلیٹ میں رہتی تھی، سیڑھیوں پر ملی۔اس کے کاندھے پر ایک گول لپیٹا ہوا، بھورے سے رنگ کا قالین لدا ہوا تھا، اور اس کے اُٹھے ہوئے بڑے بڑے گوشت کے جیسے سُرخ رنگ کے ہاتھ قالین کو سہارا دیے ہوئے تھے۔اس کی بغلوں سے الجھے، پسینے سے تر سنہرے رنگ کے بالوں کا گچھا نظر آ رہا تھا۔قالین اس کے آگے اور پیچھے دونوں جانب لٹک رہا تھا۔اس طرح تو وہ کسی نشے میں مدہوش آدمی کو بھی اپنے کاندھے پر لادے لے جا سکتی تھی، مگر اس کا شوہر زندہ نہیں تھا۔جب چربیوں کا یہ ڈھیر اپنی کالی چمک دار عبا میں ہمارے پاس سے گزر رہا تھا کہ اس کی خارج ہوتی ہوئی ریاح نے مجھے نشانہ بنایا: جیسے امونیا، اچار، کاربائیڈ— وہ ضرور حیض سے تھی!

کچھ دیر بعد احاطے سے بلند ہوتی قالین پٹائی کی آوازیں آنے لگیں۔ان کی وجہ سے میں فلیٹ میں بھاگتا پھر رہا تھا، کہ بالآخر میں اپنی کپڑوں کی الماری میں گھس گیا جہاں قبل از ایسٹر صفائی کا یہ ہنگامہ سردی کے موٹے موٹے اوورکوٹوں میں دب گیا تھا۔

مگر وہ صرف مسز کاٹر اور ان کی قالین کی پٹائی ہی نہیں تھی جس نے مجھے کپڑوں کی

الماری میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ قبل اس کے کہ مما، جان اور ماتسیرات اپنے کوٹ اتارتے، ان کے درمیان گڈ فرائیڈے ڈنر پر بحث شروع ہو گئی، مگر وہ صرف بام مچھلی پر ہی اڑے نہیں تھے۔ ہمیشہ کی طرح انھیں بحث کرنے کے لیے کوئی موضوع چاہیے ہوتا تھا، انھیں میرا مشہور تہہ خانے میں گرنا یاد تھا: "تمھارا قصور تھا، غلطی تمھاری تھی — اب میں بام مچھلی کا شوربا بنانے جا رہا ہوں — اب اپنی نازک مزاجی نہ بگھارنے لگنا — کچھ بھی بناؤ مگر بام مچھلی نہیں — تہہ خانے میں خدا کے بہت سے ٹمن رکھے ہوئے ہیں، کچھ مَشروم ہی اٹھا لاؤ، مگر سنو، ٹریپ دروازے کو بند کر دینا کہ پھر وہی، یا ویسا کوئی واقعہ نہ ہو جائے۔ میں تمھاری یہ تماشے بازی بہت برداشت کر چکا ہوں، ہم آج مچھلی ہی کھائیں گے بس دودھ، مسٹرڈ، پارسلے اور اُبلے ہوئے آلو کے ساتھ؛ اس میں ایک عدد تیز پات، ایک عدد لونگ — نہیں، نہیں، پلیز الفریڈ، بام مچھلی نہیں، اگر وہ نہیں کھانا چاہتی — تم چپ رہو جی — میں نے بام مچھلیاں پھینکنے کے لیے نہیں خریدی ہیں، ان کو اچھی طرح صاف کروں گا، دھوؤں گا — نہیں، نہیں، ہم دیکھیں گے جب وہ میز پر آئیں گی...... ہم دیکھیں گے، کون کھاتا ہے، کون نہیں کھاتا۔"

ماتسیرات نے بیٹھک کا دروازہ زور سے بند کیا اور باورچی خانے میں غائب ہو گیا۔ وہاں سے آتی ہوئی کھڑ کھڑ آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے مچھلیوں کی گردن کاٹ کر ان کا کام تمام کیا اور مما کو، جس کا ضرورت سے زیادہ تصوراتی ذہن کام کر رہا تھا، صوفے پر ہی بیٹھنا پڑا، مگر جلد ہی اس کے پیچھے جان برانسکی آ گیا تھا۔ ایک لمحے بعد وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے کشوبیائی لہجے میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ میں ابھی کپڑوں کی الماری میں نہیں گیا تھا۔ جب تین بالغ لوگ فلیٹ کو اس طرح آپس میں بانٹے ہوئے تھے، میں بیٹھک ہی میں بیٹھا رہا۔ ٹائل سے بنے آتش دان کے قریب بچوں کی ایک کرسی رکھی ہوئی تھی، میں اس پر بیٹھا اپنی لٹکی ہوئی دونوں ٹانگیں ہلا رہا تھا اور جان مجھے گھور رہا تھا؛ میں سب سمجھ رہا تھا کہ میں مخل ہو رہا ہوں، حالاں کہ وہ ویسے کچھ کر نہیں سکتے تھے، اس لیے کہ ماتسیرات قریب ہی تھا، ان کے لیے بظاہر خطرہ، مگر اس کے ہاتھ میں قریب المرگ بام مچھلیاں تھیں جنھیں وہ کوڑے کی طرح ہلا رہا تھا۔ ادھر وہ دونوں ایک

دوسرے کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، بیسوں انگلیوں سمیت۔ میرے لیے وہ آخری تنکا تھا۔ کیا سبز کالر کی قالین پٹائی کافی نہیں تھی؟ کیا اس کی آوازیں دیواروں سے ہو کر آ نہیں رہی تھیں، بڑھ تو نہیں رہی تھیں، مگر قریب تو آتی جا رہی تھیں؟

آسکر اپنی کرسی سے اتر کر، چند لمحے آتش دان کے قریب بیٹھا رہا، مبادا اس کا یہاں سے اچانک ہٹ جانا زیادہ واضح نہ ہو جائے، اور پھر وہ اپنے نقارے میں مشغول، ڈیوڑھی پار کرتا، خواب گاہ میں چلا گیا۔

میں نے اپنی خواب گاہ کا دروازہ آدھا کھلا چھوڑ دیا تھا اور مطمئن تھا کہ کسی نے مجھے واپس نہیں بلایا۔ میں تذبذب میں تھا کہ پلنگ کے نیچے پناہ لوں یا کپڑوں کی الماری میں۔ میں نے الماری کو ترجیح دی اس لیے کہ پلنگ کے نیچے چھپنے سے میرا اعلیٰ درجے کا نیلے رنگ کا ملاحوں والا سوٹ خراب ہو جائے گا۔ میں الماری تک پہنچ سکتا تھا۔ میں نے اس کے شیشوں والے دروازے کھولے، اور اپنے چوبِ نقارہ سے وہ تمام ہینگر ایک طرف کر دیے جن پر کوٹ اور سردی کے موسم کی دوسری چیزیں ٹنگی ہوئی تھیں۔ بھاری کوٹوں تک پہنچنے اور ان کو ایک طرف لگانے کے لیے مجھے اپنے نقارے پر کھڑا ہونا پڑا تھا۔ بالآخر، میں کپڑوں والی الماری کے درمیان جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا؛ حالاں کہ وہ اتنی فراخ نہیں تھی، پھر بھی اس میں آسکر کے لیے کافی جگہ تھی، اور وہ اس میں داخل ہو کر گھس گیا تھا۔ میں تھوڑی سی جد و جہد سے اس کے شیشے لگے دروازوں کو قریب لانے اور ان کے درمیان ایک شال پھنسا کر، جو الماری کے فرش پر ہی پڑی مل گئی تھی، ایک انگلی بھر درز بنانے میں کامیاب ہو گیا جس کے ذریعے اندر کچھ ہوا بھی آ سکتی تھی اور میں فوری ضرورت کے لیے باہر دیکھ بھی سکتا تھا۔ میں نے نقارے کو اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا تھا مگر اس پر ہلکے سے بھی کچھ بجایا نہیں۔ بس وہیں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ سردی کے موسم کے کوٹوں سے نکلنے والے بخارات مجھے گھیرے ہوئے اور مجھ میں سرایت بھی کر رہے تھے۔

کیا خوب کہ یہ الماری، اپنے تمام بھاری اونی کپڑوں سمیت اس جگہ مل گئی تھی جس میں بیٹھ کر میں اپنے تمام خیالات کو مجتمع کر سکتا تھا، ان کو بنڈل میں باندھ کر اپنے

خوابوں کی ملکہ کو بھیج سکتا تھا جواتنی متمول تھی کہ نا قابلِ حِس خوشی سے اس کوایک باعزت تحفے کے طور پر وصول کر سکتی تھی۔

حسبِ معمول جب بھی میں نے اپنے نفسیاتی عطیۂ خداوندی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے، میں نے خود کو برنشو فر ویگ، کے ڈاکٹر ہولائز، کے دفتر میں منتقل کیا ہے اور بدھ کے دن کی ملاقاتوں کے ایک حصے کا مزہ چکھا ہے، جس کی میں زیادہ پروا کرتا تھا۔میں ڈاکٹر سے ملاقات کے بارے میں کم فکر مند ہوتا تھا، جس کے معائنے اس کی مددگار مسٹر اِنگے کے مقابلے میں روز بروز ضرورت سے زیادہ محتاط ہوتے جاتے تھے۔ صرف مسٹر اِنگے ہی کو میرا لباس اتارنے اور پہنانے کی اجازت تھی؛ صرف وہی میرا قد ناپتی، میرا وزن کرتی، اور مختلف قسم کے تجربات کرتی تھی؛ مختصر یہ کہ وہ مسٹر اِنگے ہی تھی جو ذمے داری سے وہ سارے تجربات کرتی تھی، ڈاکٹر ہولائز جن کی ضرورت سمجھتا تھا۔ہر بار جب بھی مسٹر اِنگے بغیر کسی استہزا کے، کسی تجربے کی ناکامی کا اعلان کرتی تو ڈاکٹر ہولائز اس کی ''تجزوی کامیابی'' میں قلبِ ماہیت کر دیتا تھا۔میں مسٹر اِنگے کے چہرے کی طرف کم ہی دیکھتا تھا۔میری آنکھیں اور کبھی کبھی میرا نقارہ نواز دل اس کی نرسوں والی صاف ستھری اور کلف لگی وردی پر، اس کی تقریباً بے وزن جسمانی ساخت پر، سر پر لگائی ٹوپی اور سادہ سے صلیبِ احمر کے بروچ پر اٹک جایا کرتا تھا۔اس کی وردی کی تازہ تہوں کو دیکھنا کتنا خوش گوار محسوس ہوتا تھا۔کیا ان سب کے نیچے کوئی جسم بھی ہوتا تھا؟ اس کا بڑھتی ہوئی عمر کا چہرہ اور اس کے لاغر مگر نگہداشت شدہ ہاتھ دیکھ کر معلوم ہوجاتا تھا کہ مسٹر اِنگے بہر حال ایک عورت تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ، اس میں ایسی نسوانی خوش بو نہیں ہوتی تھی جیسی کہ میری مما سے نکلا کرتی تھی، جب کبھی میری آنکھوں کے سامنے جان، حتیٰ کہ ماتسیرات، اس کے جسم کو تلاش کیا کرتا تھا۔مسٹر اِنگے سے صابن اور نیم خوابیدہ کردینے والی دواؤں کی بو آتی تھی۔کتنی بار ایسا ہوا تھا کہ جب وہ میرے چھوٹے اور قیاساً علیل، جسم کے اندروں کی آوازوں کو سننے کی کوشش کررہی ہوتی تھی تو مجھ پر نیند کا غلبہ ہوجاتا تھا: سفید وردی کی نفیس تہوں کی پیدا کردہ نیند، کاربولک تیزاب کے غلاف میں ملفوف نیند، بغیر خوابوں کی نیند، سوائے اس کے کہ کبھی کبھی اس نیند میں اس کے سینے پر

آویزاں بہ وچ پھیل کر نہ جانے کیا بن جاتا تھا: لہراتے پرچموں کا سمندر، الپائن کی وَتمک، گُل لالہ کے کھیت، بغاوت کے لیے تیار، کس سے بغاوت، خدا ہی جانے: ہندوستانیوں سے، چیری سے، ناک سے بہتے لہو سے، مرغے کی کلغی سے، خون کے سُرخ ذرات سے، اس وقت تک جب تک کہ میرے میدانِ نظر کی سُرخی جوش کا وہ پس منظر پیدا نہیں کر دیتی تھی جو اس وقت بھی اسی طرح صاف ظاہر ہوتی تھی مگر اس کو کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا، اس لیے کہ ایک چھوٹا سا لفظ کچھ نہیں کہہ سکتا ہے، اور ناک سے بہنے والا خون کچھ نہیں کر سکتا ہے، اور جھنڈوں کے کپڑے بد رنگ ہو جاتے ہیں، اور اس کے باوجود بھی اگر میں کہوں کہ "سُرخ" تو سُرخی مجھے زرد کر دے گی، اپنے کوٹ کو سیاہ کر لے گی۔ سیاہی تو چڑیل ہوتی ہے، سیاہی کا خوف مجھے سبز کر دیتا ہے، سبزی ارغوان اُگاتی ہے مگر لے ویڈر کا نیلا رنگ، سچا نیلا ہوتا ہے، مگر میں اس پر بھروسا نہیں کرتا، مگر کیا آپ اس پر بھروسا کرتے ہیں؟ سبز رنگ امید کا استعارہ ہوتا ہے، سبز رنگ وہ تابوت ہوتا ہے میں جس میں گلگلے بانی کرتا ہوں، سبز رنگ مجھ کو ڈھانپ لیتا ہے، سبز رنگ مجھے دھو کر سفید کر دیتا ہے، سفیدی زردی پر دھبا ہوتی ہے، اور زردی مجھے نیلا کر دیتی ہے، مگر نیلا ہٹ مجھے نیلا نہیں کرتی، سبزی اور سُرخی پیدا کرتی ہے، اور سُرخی سسٹر اِنگے کا بہ وچ تھی: وہ صلیبِ احمر پہنے ہوتی تھی، دراصل، وہ اسے نرسوں کی اپنی وردی کے کالر پر لگاتی تھی: مگر شاذ و نادر ہی میں کپڑوں کی الماری میں تمام علامتوں کی یک رنگی کو اپنے ذہن پر طاری کر سکتا تھا۔

بیٹھک سے آتے ہوئے، تند و تیز ہنگامے نے جو اچانک میری کپڑوں کی الماری سے ٹکرایا اور مجھے سسٹر اِنگے کے طفیل ملنے والے نصف خواب راحت سے، جو شروع ہی ہوا تھا، جگا دیا تھا۔ میں سنجیدہ ہو کر بیٹھ گیا، میرا دل اچھل کر میرے حلق میں آنے ہی والا تھا، اپنے گھٹنوں پر نقارے کو سنبھالے، مختلف لمبائی کے سردی کے کوٹوں کے درمیان، جن میں سے ماتسیرات کی پارٹی کی وردی کی بو آتی تھی، مجھے تلوار کی پیٹی اور کندھے پر لگانے والے پٹے کا احساس ہوا، اور میں نرس کی وردی کی سفید رنگ کی تہوں کے خیال سے بھی نکل نہیں پایا تھا: فلالین اور وورسٹڈ (worsted) میرے پہلو میں آویزاں تھے، میرے اوپر پچھلے چار برس کے فیشن کی ہیٹ رکھی ہوئی تھیں، میرے پاؤں

کے قریب چھوٹے بڑے جوتے پڑے ہوئے تھے، پالش کی ہوئی چمڑے کی پٹیاں، اور گُل میخ لگی یا بے میخ ایڑیاں بھی تھیں۔ درز سے اندر آنے والی ہلکی سے روشنی نے پورا منظر پیش کردیا: آسکر شرمندہ تھا کہ اس نے شیشے کے دو دروازوں کے درمیان ایک جھری چھوڑ دی تھی۔ بیٹھک میں موجود یہ دونوں لوگ مجھے کیا پیش کر سکتے تھے؟ شاید ماتسیرات نے صوفے پر موجود ان دو افراد کو حیران کردیا تھا، مگر ایسا ممکن نہیں تھا اس لیے کی جان بہت محتاط آدمی تھا، صرف اس وقت ہی نہیں جب وہ skat کھیل رہا ہوتا تھا، ایسے وقت میں بھی۔ شاید جیسا میں نے سوچا تھا وہی ہوا۔ ماتسیرات نے اپنی بام مچھلیوں کو مار کر، ان کو کاٹا، صاف کیا، دھویا، پکایا، چکھا اور پھر شوربے کو اُبلے ہوئے آلوؤں کے ساتھ کھانے کی میز پر رکھ دیا تھا۔ جب ان میں سے کوئی آتا نظر نہیں آیا تو وہ اپنے پکائے ہوئے شوربے کی تعریفیں کرتا ہوا، سارے مصالحہ جات کی تفصیلات کو دعا کی طرح گاتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس کو سنتے ہی مما نے چلانا شروع کردیا۔ وہ کشوبیائی زبان میں چلا رہی تھی۔ ماتسیرات کے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، مگر وہ یہ سب کچھ سننے پر مجبور تھا اور اسے اندازہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ سوائے بام مچھلی کے وہ اور کس بات پر چلاتی؟ مگر ہمیشہ کی طرح ایسے موقعوں پر اس کی تان میرے تہہ خانے میں، گرنے پر ہی ٹوٹتی تھی۔

ماتسیرات نے اسی انداز میں جواب دیا۔ دونوں اپنے اپنے کردار سے خوب واقف تھے۔ ان کے بغیر یہاں کوئی تماشا نہیں ہوسکتا تھا۔ اب دوسرا تماشا ہوا: دھاڑ سے آواز آئی، وہ پیانو کا ڈھکنا تھا جو گرایا گیا تھا، بغیر کسی سُر کے، تینوں کی ایک ساتھ آواز آئی، مگران کی آوازیں الگ الگ تھیں، فرانسز شوبر کے Huntsmen's Chorus کی طرح What thing on earth resembles... ۔ اور شور کے درمیان، دھڑ سے پیانو کا ڈھکنا گرا تھا، ساتھ ہی پیانو کے ساتھ کا اسٹول بھی اُلٹ گیا تھا۔ اب مما خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ اس نے بہت سے آئینوں میں سے ایک آئینے پر نظر ڈالی۔ میں اندر سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ اس نے خود کو اپنے نیلی چھتری والے ازدواجی پلنگ پر گرا دیا اور اتنی ہی انگلیوں سے اپنے ہاتھ ملنے لگی جتنی کہ ازدواجی قلعے کے سرہانے سنہرے فریم میں لگی رنگین تصویر میں میری میگدالین کی تھیں۔

میں کافی دیر تک مما کے رونے کی آواز سن سکتا تھا، پلنگ کے چڑ چڑانے کی، اور بیٹھک سے آتی مدھم لہجے کی سرگوشی۔ جان، ماتسیرات کو منا رہا تھا۔اس کے بعد ماتسیرات نے جان سے کہا کہ وہ جا کر مما کو منائے۔سرگوشی ہلکی ہوتی گئی، جان خواب گاہ میں داخل ہوا۔اب تیسرا تماشا: وہ پلنگ کے کنارے کھڑا، کبھی مما کو دیکھتا اور کبھی میری میگدالین کو، پھر احتیاط سے پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گیا، مما کی پیٹھ اور پچھلا حصہ تھپتھپایا—وہ اوندھی لیٹی ہوئی تھی—اسے کشوبیائی زبان میں دلاسا دے رہا تھا اور آخر میں جب الفاظ سے کام نہیں چلا تو جان نے اپنا ہاتھ مما کے لہنگے میں داخل کردیا، اور اس وقت تک کیے رہا جب تک کہ اس کا رونا بند نہیں ہوگیا تھا اور اس نے کئی انگلیوں والی میگدالین پر سے نظریں ہٹا لی تھیں۔وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔کام ختم ہوا تو جان کھڑا ہوا، اپنے رومال سے انگلیاں پونچھیں اور آخری بار مما سے تیز آواز میں مخاطب ہوا۔اب وہ کشوبیائی نہیں بول رہا تھا اور باورچی خانے یا بیٹھک میں موجود ماتسیرات کو سنانے کی خاطر، مما سے تیز آواز میں کہہ رہا تھا ''بس کرو—اب اٹھو بھی—ایگنس—سب کچھ بھول جاؤ۔بہت دیر ہوئی الفریڈ نے ٹوائیلٹ میں مچھلی پھینک دی تھی۔اب ہم اچھا سا skat کا کھیل کھیلیں گے، ایک چوتھائی پینی کا، اگر تم چاہو اور جب ہم سب کچھ بھلا دیں گے اور صلح ہو جائے گی تو الفریڈ ہمارے لیے مشروم کے ساتھ پھینٹے ہوئے انڈے اور تلے ہوئے آلو تیار کرے گا۔''

مما نے کوئی جواب نہیں دیا، پلنگ سے اٹھی، بستر کی زرد رنگ کی چادر برابر کی، میرے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بال ٹھیک کیے اور جان کے پیچھے پیچھے خواب گاہ سے چلی گئی۔ میں نے درز سے آنکھ ہٹائی، جلد ہی ان لوگوں کی پتوں کے پھینٹنے کی آواز آنے لگی تھی۔میرا خیال ہے کہ جان، ماتسیرات کے خلاف بازی لگا رہا تھا، جو تئیس کی گنتی تک گیا۔اس کے بعد مما نے جان سے چھتیس کی بازی لگائی: اس پر وہ پیچھے ہٹ گیا، اور مما ایک ہزار سے کھیلی، اور ہار گئی۔اس کے بعد جان نے اینٹ کے اِکے کی بازی لگائی، اور مما نے تیسرا کھیل جیت لیا۔

اس یقین کے ساتھ کہ خاندان کا یہ کھیل، جو پھینٹے ہوئے انڈے، مش روم اور تلے ہوئے آلو کے باعث تھوڑی دیر کے لیے رُکا تھا، رات گئے تک جاری رہے گا، میں

تھوڑی دیر تک کھیل دیکھتا رہا، پھر بسستر اِنگے اور اس کی خواب آور سفید وردیوں کی تلاش کی کوشش میں واپس چلا گیا، مگر مجھے ڈاکٹر ہولائز کے دفتر سے وہ خوشی نہیں ملی، میں جس کی تلاش میں تھا۔ نہ صرف یہ کہ سبز، نیلے، زرد اور کالے رنگ صلیبِ احمر کی سُرخی میں شامل ہو رہے تھے، میرے ذہن پر صبح کے واقعات بھی یورش کر رہے تھے۔ جب بھی معائنے کے اور بسستر اِنگے کے کمرے کا دروازہ کھلتا، وہ نرس کی خالص اور ہوادار وردی نہیں ہوتی تھی جو آنکھوں کے سامنے پھرتی، بلکہ تھیو فار واٹر' کے 'مدیک واٹر' والے اس روشنی کے مینار کے نیچے کا قلی نظر آتا تھا، جو پانی ٹپکتے گھوڑے کے سر کو سمندر میں سے کھینچ رہا تھا اور اس میں سے بام مچھلیاں کھینچ کھینچ کر نکال رہا تھا، اور جس شے کو میں بسستر اِنگے کے تناظر میں دیکھ رہا تھا وہ بحری پرندوں کے پھڑپھڑاتے سفید رنگ کے پَر تھے جو مشکل سے چند دقیقوں کے لیے، بام مچھلی والے گھوڑے کے سر پر چھا رہے تھے، جب کہ میرا زخم ایک بار پھر کھل گیا تھا مگر اس کا خون سُرخ رنگ کا نہیں مگر کالے گھوڑے کے سر کی طرح سیاہ، سمندر کے پانی کی طرح گہرا سبز تھا، جس میں فن لینڈ کی تعمیراتی لکڑیاں لے جانے والا جہاز اپنے زنگ کا کچھ رنگ شامل کر رہا تھا، اور وہ بحری پرندے۔ فاختائیں تھیں جو قربانی پر بادل کی طرح نیچے آتے، پرواز میں ان کے پروں کے کونے پانی کی سطح سے لگتے جاتے تھے، اور وہ سسٹر اِنگے کی جانب بام مچھلیاں پھینکتے جاتے، وہ ان کو پکڑ لیتی، خوش ہو کر جشن مناتی اور ان کو بحری پرندوں میں تبدیل کر دیتی، فاختاؤں میں نہیں، مگر بہر حال مقدس روح میں، اور وہ بحری پرندوں کے روپ دھار لیتی، بادل کی طرح گوشت پر اترتی تھی Pentecost کی دعوت کے لیے۔

اس جد و جہد سے دل برداشتہ، میں نے الماری چھوڑ دی۔ غصے سے دروازہ کھولتے ہوئے میں باہر نکلا، اور خود کو آئینے کے سامنے ویسا ہی پایا پھر بھی میں خوش تھا کہ مسز کاٹر نے قالینوں کی پٹائی بند کر دی تھی۔ آسکر کے لیے تو گڈ فرائیڈے ختم ہو چکا تھا، بلکہ اب تو اس کے جنون نے ایسٹر کی ابتدا کر دی تھی۔

# مخروطی شکل کا تابوت

ممانے بھی وہی کیا۔ ہم ایسٹر کے اتوار نانی اور انکل وِنسنٹ سے ملنے 'پساؤ' پہ انسکی کے گھر گئے تھے۔ اس کے بعد سے ہی ہمارے دکھوں کی ابتدا ہوئی تھی — وہ دُکھ جسے مسکراتا ہوا موسمِ بہار بھی کم کرنے سے لاچار تھا۔

یہ صحیح نہیں ہے کہ ماتسیرات نے مما کو ایک بار پھر مچھلی کھانے پر مجبور کیا تھا۔ بالکل اپنی مرضی سے، کسی پُراسرار شیطان کے حلول ہو جانے کے باعث، ایسٹر کے پورے دو ہفتے بعد، اس نے، اپنے جسم کی ضرورت کے خلاف اس مقدار میں مچھلی کھانا شروع کر دی تھی کہ ماتسیرات کو کہنا پڑ گیا تھا، "خدا کے واسطے اس طرح مچھلی کھانا بند کرو، جیسے کوئی تم کو مجبور کر رہا ہو۔"

وہ ناشتے کے وقت ٹین کے ڈبوں والی 'سارڈین' سے شروعات کرتی، دو گھنٹے بعد، اگر دُکان پر گاہک موجود نہ ہو تو 'بان زاک' کی چھوٹی چھوٹی مچھلی، دوپہر کے کھانے کے وقت اس کو مسٹرڈ کی چٹنی کے ساتھ تلی ہوئی 'فلاؤنڈر' یا 'کاڈ' مچھلی کی طلب ہوتی، سہ پہر کے وقت پھر اس کے ہاتھوں میں ٹین کے ڈبے کھولنے والا اوزار ہوتا: جیلی میں محفوظ کی ہوئی چھوٹی چھوٹی بام مچھلیاں، مچھلی سے بنا اچار، تنور کی بھنی ہوئی 'ہیرنگ' مچھلی، اور اگر رات کے کھانے کے لیے ماتسیرات مچھلی تلنے یا اُبالنے سے انکار کر دیتا تو بحث میں وقت ضائع کرنے کے بجائے خاموشی سے میز سے اٹھ جاتی اور دکان سے دھویں میں پکی بام مچھلی کا بڑا سا ٹکڑا اُٹھا لاتی۔ اور پھر بقیہ لوگوں کی اشتہا کا قصہ تمام ہو جاتا، اس لیے کہ وہ چھری کی

مدد سے بام مچھلی کی جلد سے چربی کا آخری ذرہ تک نکال لیتی، اور تو اور، وہ مچھلی کو چاقو کی مدد سے کھاتی تھی۔ دن بھر ہوتے وقفے سے، اسے قے کے ذریعے اپنا معدہ خالی کرنا پڑتا تھا۔ مجبور اور پریشان ماتسیرات اکثر پوچھتا، "شاید تم حاملہ ہو گئی ہو، ورنہ تمھارا مسئلہ کیا ہے؟"

اگر اور کچھ نہ کہنا چاہتی تو مما کہتی، "مجھ سے فضول باتیں مت کیا کرو۔" ایک اتوار جب کھانے کی میز پر نئے آلوؤں کے ساتھ کریم کی چٹنی میں تیرتی ہوئی سبز بام مچھلی رکھی گئی تو نانی کو واچکی میز پر دوہتڑ مار کر چلائی تھی، "ایگنس، تمھارا مسئلہ کیا ہے؟ ہمیں بتاؤ تو سہی کہ تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ جب تمھارا معدہ قبول نہیں کرتا تو تم مچھلی کیوں کھاتی ہو، اور تم بتاتی بھی نہیں کہ ایسا کیوں کرتی ہو۔ تم پاگلوں کی سی حرکات کرنے لگی ہو۔" مما نے جواب میں صرف سر ہلا دیا، آلوؤں کو ایک طرف سرکایا، چٹنی میں سے ایک مچھلی نکالی اور پختہ عزم کے ساتھ کھانا شروع کر دیا تھا۔

ایک بار جب وہ دونوں صوفے پر تھے اور میں اچانک پہنچ گیا تھا، تو وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، اور ان کے لباس بے ترتیب تھے۔ مجھے جان کی آنسو بھری آنکھیں اور مما کی بے پروائی دیکھ کر ایک دھچکا سا لگا تھا مگر اچانک سب کچھ اس کے برخلاف ہو گیا۔ مما نے اچھل کر مجھے پکڑ لیا، بازوؤں میں بھر کر مجھے اٹھایا، جس سے اس کا ایک اتھاہ خلا آشکار ہو رہا تھا، جسے سوائے بڑی مقدار میں، تلی، ابلی، محفوظ کی ہوئی اور دھوئیں میں پکائی مچھلی ہی بھر سکتی تھی۔

چند دنوں بعد میں نے اسے باورچی خانے میں دیکھا کہ نہ صرف یہ کہ وہ بد ذات ہیرنگ مچھلی پر ٹوٹی پڑتی تھی، بلکہ اس نے مچھلی کے کئی ڈبوں میں بچ رہنے والے تیل کو ایک برتن میں جمع کر رکھا تھا اور اس کو گیس کے چولھے پر گرم کیا، اور غٹا غٹ پی گئی تھی۔ دروازے کے قریب کھڑا، میں اس قدر پریشان ہوا تھا کہ میرے ہاتھ سے میرا نقارہ گر پڑا تھا۔

اسی رات مما کو شہر کے اسپتال لے جایا گیا تھا۔ جب ہم ایمبولنس کے انتظار میں تھے، ماتسیرات بین کر کے رو رہا تھا، "تم کو وہ بچہ کیوں نہیں چاہیے؟ کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کس کا ہے؟ یا یہ سب کچھ اس نامعقول گھوڑے کے کٹے سر کا شاخسانہ ہے؟ کاش ہم وہاں

نہ گئے ہوتے؟ اینگنس، کیا تم اس کو بھول نہیں سکتیں؟ میں جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا۔"

ایمبولنس آئی اور مما کو اسپتال لے گئی۔ بچے بڑے سب فٹ پاتھ پر کھڑے تھے۔ جلد ہی واضح ہو گیا تھا کہ مما نہ یک واٹر کو بھولی تھی نہ گھوڑے کے اس سر کو، کہ وہ اس کی یادداشت میں نقش ہو گیا تھا — اس سے قطعِ نظر کہ اس کا نام 'بانس' تھا یا 'فریز'۔ مما کے جسم کے ہر عضو میں اُس گندفرائیڈے کی تفریح کی یادیں جم کر رہ گئی تھیں اور اس خوف سے کہ وہ سب کچھ دوبارہ نہ ہو جائے، اس کے جسم کا ہر حصہ، مما جس سے بالکل متفق تھی، چاہتا تھا کہ مما مر جائے۔

ڈاکٹر ہولائز نے یرقان اور مچھلی سے زہر آلودگی تشخیص کی تھی۔ اسپتال پہنچ کر پتا چلا تھا کہ مما تین ماہ کے حمل سے تھی، اور اس کو پرائیویٹ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ ان سب سے جنھیں اس سے ملنے کی اجازت تھی، مما درد اور متلی کی شکایت کرتی تھی؛ کبھی کبھی تو وہ متلی کے دوران مجھے دیکھ کر مسکراتی بھی تھی۔

حالاں کہ وہ اپنے ملاقاتیوں کو خوش رکھنا چاہتی تھی، جیسا کہ میں آج کل اپنے ملاقاتیوں سے مل کر خوش ہونے کی کوشش کرتا ہوں، وہ اپنے آہستہ آہستہ گھلتے بدن پر وقتاً فوقتاً طاری ہونے والی متلی کی کیفیت کو روک نہیں سکتی تھی، حالاں کہ اب متلی کے ذریعے نکلنے کے لیے اس کے جسم میں کچھ رہ نہیں گیا تھا، سوائے موت کی تصدیق کے سرکاری پروانے کے، جو ہم میں سے کسی کو کسی دن ملنے والا تھا۔

ہم سب کو کچھ سکون ہوا جب اس میں کچھ باقی نہیں رہا تھا جو متلی کی کیفیت کو اُکسا سکے، جس نے اس کے حسن کو برباد کر دیا تھا۔ جب اس کے مردہ جسم کو غسل و کفن دے کر لٹا دیا گیا تو اس کو اس کا آشنا اور ذہین چہرہ واپس مل گیا تھا۔ بڑی نرس نے مما کی آنکھیں بند کر دی تھیں اس لیے کہ ماتسیرات اور برانسکی آنسوؤں کے سیلاب سے اندھے ہو رہے تھے۔

مجھے رونا نہیں آ رہا تھا، اس لیے کہ دوسرے مرد اور نانی، ہیڈوگ برانسکی اور چودہ سالہ اسٹیفن، سب سے سب رو رہے تھے، مگر میری مما کی موت میرے لیے تعجب کی بات نہیں تھی۔ آسکر کو جو اس کے ساتھ ہر جمعرات کو شہر اور سیکریڈ ہارٹ چرچ جایا کرتا تھا،

ایسا محسوس ہوتا تھا گویا مرنے والی کئی برسوں سے اس تلاش میں تھی کہ کسی طرح اس سکون کو توڑ دیا جائے۔ ماتسیرات، شاید جس سے وہ نفرت کرتی تھی، اس سے آزاد ہو جائے اور جان برانسکی یعنی، اس کے اپنے جان کو، پولینڈ کے ڈاک خانے میں ان مستحکم خیالات کے ساتھ کام کرنے کی آزادی مل جائے: وہ میری خاطر موت کے منہ میں چلی گئی؛ وہ میرے راستے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہتی تھی، اس نے خود کو قربان کر دیا۔

اپنی ذہانت کے استعمال سے، کسی نہ کسی طرح، یہ دونوں، مما اور جان، اپنی محبت کے لیے کوئی نہ کوئی پُر سکون بستر تلاش کر لیا کرتے۔ اس کے باوجود دونوں میں رومانس کی بہت صلاحیتیں تھیں؛ اتنی کہ ان کو رومیو، جولیٹ یا شہزادے شہزادی جیسا سمجھنے کے لیے بہت زیادہ عقل کی ضرورت نہیں تھی، جو بے چارے اس لیے یک جا نہیں ہو پاتے تھے کہ ان کی محبت کے درمیان پانی بہت گہرا تھا۔

جب مما، اپنے آخری لمحات میں پادری کی دعاؤں کے درمیان، جس کے لیے خاصا وقت دیا گیا تھا، اطاعت شعاری، سکون اور کسی دخل اندازی سے معذور لیٹی ہوئی تھی، تو مجھے پتا چلا تھا کہ اسپتال کی زیادہ تر نرسیں پروٹسٹنٹ عقائد کی حامل تھیں۔ وہ اپنے ہاتھ کیتھلک افراد سے مختلف انداز میں باندھتی تھیں، اور زیادہ خود اعتمادی سے Our Father کہتی تھیں، جس کے الفاظ کیتھلک عقیدے کے اصل متن سے بہت مختلف تھے، اور وہ نانی اماں کو واچکی، برانسکی' خاندان کی طرح، بلکہ خود میری طرح، صلیب نہیں بناتی تھیں۔ میرا باپ بھی— اکثر میں اس کا نام اسی انداز میں لیتا ہوں، حالاں کہ میرے وجود میں اس کا کردار خالصتاً قیاسی رہا ہے— پروٹسٹنٹ عقیدے کے افراد سے مختلف انداز میں دعا کرتا تھا؛ سینے پر ہاتھ باندھنے کے بجائے، شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی انگلیاں ایک عقیدے سے دوسرے عقیدے کے درمیان کہیں، اس کے خفیہ اعضا کے درمیان، پگلائی پھرتی نظر آتی تھیں، اور ظاہر ہے کہ اس کا دعا کا یہ انداز باعثِ شرم ہوتا تھا۔ میری نانی، اپنے بھائی کے ساتھ، بسترِ مرگ کے قریب ہی گھٹنوں کے بل جھکی تھی؛ وہ جوشیلے انداز میں کشوبیائی زبان میں زور زور سے دعائیں کر رہی تھی، جب کہ 'وِنسنٹ' کے صرف لب

ہلتے دکھائی دیتے تھے، غالباً پولش زبان میں، حالاں کہ روحانی تجربات کے باعث اس کی آنکھیں وسیع دکھائی دیتی تھیں۔ مجھے نقارہ بجانا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام سرخ و سفید رنگوں والے نقاروں کے لیے مجھے اپنی ماں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ ماتسیرات کی خواہشات کے برعکس، ممانے اس وقت مجھ سے نقارے کا وعدہ کیا تھا جب میں پالنے میں ہوا کرتا تھا؛ اور وقتاً فوقتاً مما کا حسن میرا ماڈل میری نقارہ نوازی کا ہدف ہوتا تھا، خاص کر اس وقت جب وہ نازک اندام تھی اور اس کو جمناسٹک کی ضرورت نہیں تھی۔ بہر حال، ایک بار پھر میں اپنے آپ کو قابو نہیں کر پایا تھا، جب میں اپنی ماں کے بسترِ مرگ کے قریب تھا، اس وقت میں نے اپنے نقارے پر اس کی بھوری آنکھوں والے حسن کا نقش اتار لیا تھا۔ بڑی نرس نے احتجاج کیا تھا اور مجھے بہت حیرت ہوئی تھی جب ماتسیرات نے اس کی ناراضی رفع کرنے کی کوشش کی تھی اور سرگوشی کے انداز میں اس سے کہا تھا، ''کرنے دو— بسسٹر، جو کر رہا ہے کرنے دو— دونوں ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔''

مما خوش بھی ہو سکتی تھی، ہنگھر بھی ہو سکتی تھی۔ مما جلد بھول بھی جاتی تھی، اس کے باوجود کہ اس کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ مما مجھے نہانے کے ٹب کے پانی کے ساتھ پھینک بھی دیتی تھی، اس کے باوجود میرے ساتھ ٹب میں نہاتی بھی تھی۔ جب میں اپنے گانے سے کھڑکیوں کے شیشے ٹکڑے ٹکڑے کرتا تھا، تو مما ہی شیشے کو دوبارہ لگانے کا مادہ لیے میرے ہمراہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ خطرات میں کود پڑتی تھی، ایسے حالات میں بھی جو محفوظ محسوس ہوتے تھے۔ کبھی کبھی مما مجھ سے دور ہو جاتی تھی، مگر اس کو قریب لانے والا اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ جب مما کے سارے بٹن بند ہوتے، اس وقت بھی وہ میرے لیے ایک کھلی کتاب ہوتی تھی۔ وہ کھڑکیوں سے آنے والی نرم ہوا سے ڈرتی تھی، مگر طوفان کھڑا کرنے پر ہمیشہ تیار ہوتی تھی۔ وہ بہت خراج عورت تھی اور ٹیکس دینا پسند نہیں کرتی تھی۔ ہم دونوں ایک سکے کے مختلف دو رُخ تھے۔ جب بھی مما پان کا پتا پھینکتی تھی، ہمیشہ جیت جاتی تھی۔ مما کے انتقال کے بعد میرے نقارے کے خول کا سُرخ رنگ ہلاک ہو گیا تھا؛ مگر سفید رنگ ہمیشہ سے زیادہ سفید ہو گیا تھا، ایسی چکا چوند کر دینے والا کہ کبھی کبھی آسکر کو اپنی

آنکھیں بند کرنی پڑتی تھیں، مگر جیسا کہ اس نے کبھی کہا تھا، اس کے برعکس مما کو ’ساپسے‘ کے قبرستان میں نہیں، ’برنتاؤ‘ کے ایک چھوٹے سے پُرسکون قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ وہیں اس کا پاؤڈر بنانے والا سوتیلا باپ گریگر کوواچکی بھی دفن تھا جو 1917 میں انفلوئنزا میں انتقال کر گیا تھا۔ ایک کریانے کی دُکان دار کی حیثیت میں مما کی شہرت کے باعث اس کی موت پر بہت لوگ سوگوار تھے۔ روزانہ کے گاہکوں کے علاوہ بھی، تھوک فروش بھی، حتیٰ کے کاروبار میں مقابلے کرنے والے بھی، مثال کے طور پر Weinreich Fancy Groceries اور ’ہربا اسٹراسے‘ کی مسز پروبسٹ بھی دفن میں شریک تھی، حالاں کہ گرجا گھر میں اتنے لوگوں کی شرکت کی گنجائش نہیں تھی۔ وہاں پھولوں اور کافور کی گولیوں میں رکھے ہوئے کپڑوں کی بو بھری ہوئی تھی۔ کھلی تابوت میں لیٹی میری ماں کا زرد چہرہ اُجڑا اُجڑا سا لگ رہا تھا۔ اس طولانی تقریب کے دوران مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا بس کسی لمحے میری ماں اٹھ کر بیٹھ جائے گی، کہ مزید قے کرے گی کچھ اور نکالنے کے لیے، گویا اس کے اندر کچھ اور ہے جو باہر نکلنا چاہتا ہے: صرف وہ تین ماہ والا حمل ہی نہیں، جسے میری طرح علم نہیں کہ وہ اپنے وجود کے لیے کس باپ کی شکر گزاری کرے۔ نہیں، میں سوچ رہا تھا کہ شاید صرف وہی باہر نکلنا چاہتا ہو، اور آسکر کی طرح ایک نقارہ طلب کرے گا۔ نہیں، اس کے اندر اور مچھلی بھی ہے، سارڈین نہیں، فلاؤنڈر نہیں، شاید بام مچھلی کا ایک اور چھوٹا سا ٹکڑا ہے، بام مچھلی کے گوشت کے سفیدی آمیز سبز دھاگے ہیں Skagerrak کی لڑائی کے سمندر کی بام مچھلی ہے، ’نیوفارواسر‘ کے ’بریک واٹر‘ کی بام مچھلی ہے، گڈ فرائیڈے کی بام مچھلی ہے، گھوڑے کے سر والی بام مچھلی ہے، غالباً اس کے باپ کوواچکی کے جسم کی بام مچھلی بھی ہو گی جو بیڑے تختے کے نیچے چھپنے کے دوران ختم ہو گیا تھا، اور بام مچھلیوں کا نشانہ بنا ہو گا— بام مچھلی— تمھاری بام مچھلی— تم بام مچھلی کے لیے ہو اور پلٹ کر بام مچھلی میں ہی جانے والے ہو......

مگر مما نے قے نہیں کی۔ اس نے خود کو روکے رکھا، ظاہر ہے کہ وہ سب کچھ اپنے ساتھ زیرِ زمین لے جانا چاہتی تھی کہ بالآخر وہاں امن ہو جائے گا۔

تدفین کرنے والوں نے میری مما کے متلائے ہوئے مگر پُرعزم چہرے کو بند

کرنے کے لیے تابوت کا ڈھکنا اُٹھایا ہی تھی کہ اما کو واچکی آڑے آ گئی۔ تابوت کے اطراف پھیلے ہوئے پھولوں کو روندتی آگے بڑھ کر اس نے اپنے آپ کو اپنی بیٹی پر گرا دیا اور خوب روئی، قیمتی کفن کو پھاڑ دیا اور کشوبیائی زبان میں بین کرنے لگی تھی۔

بہت سے لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس نے میرے قیاسی باپ ماتسیرات کو بددعائیں دیں، اور اس کو اپنی بیٹی کا قاتل بھی کہا تھا۔ اس نے تہہ خانے میں میرے گرنے کی بات بھی اُٹھائی تھی۔ یہ قصہ اس نے مما سے لیا تھا اور اس نے ماتسیرات کو کبھی میری ظاہرہ بدقسمتی اور اس کی ظاہرہ ذمے داری کو بھلانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ یہ الزامات کبھی ختم نہیں ہوئے، حالاں کہ ماتسیرات سیاسی مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، بلکہ اپنی خواہشات کے خلاف، احترام کی حد تک اس کی عزت کرتا تھا اور جنگ کے برسوں میں اس کو چینی، مصنوعی شہد، کافی اور مٹی کا تیل فراہم کرتا تھا۔

سبزی فروش گریف اور جان برانسکی نے، جو نسوانی انداز میں رو رہا تھا، میری نانی کو تابوت سے علاحدہ کیا تھا۔ بالآخر تدفین کرنے والوں نے تابوت کا ڈھکنا بند کیا، اور اپنے چہروں پر وہ تاثرات پیدا کیے جو جنازہ بردار لوگ ہمیشہ کوئی تابوت اُٹھاتے وقت پیدا کرتے ہیں۔

'برنتاؤ' کے قبرستان کے دو میدانوں کے درمیان راستے پر، جن پر دو رویہ جنگلی درخت ہیں، جس میں مقامی ساخت کا ایک چھوٹا سا گرجا گھر بنا ہوا ہے، جس میں ایک کنواں بھی ہے اور جہاں پھدکتی ہوئی چڑیاں رہتی ہیں، ماتسیرات نے جنازے کے جلوس کی سربراہی کی، اور میں اس کے عقب میں چلا تھا۔ اُس وقت پہلی بار مجھے تابوت کی ساخت اچھی لگی تھی۔ اس کے بعد سے مجھے کئی بار آخری وقت کے لیے استعمال ہونے والی گہرے رنگ کی لکڑی پر غور کرنے کا موقع ملا تھا۔ میری مما کا تابوت سیاہ رنگ کا تھا۔ سر سے پاؤں کے آخر تک، اس کو اس نہایت خوب صورت طریقے سے مخروطی بنایا گیا تھا۔ کیا دنیا میں انسانی جسم کے تناسب کو اجاگر کرنے کا اس بہتر کوئی اور طریقہ ہے؟

کاش پلنگوں میں بھی پاؤں کے آخری حصوں تک اس طرح مخروطی تنگی بنائی جاتی! کاش ہماری اتفاقیہ جھوٹ بولنے کی عادت بھی اسی طرح مخروطی اور کم ہوتی جاتی۔ اس

لیے کہ وہ تمام ہالے جو ہم اپنے گرد بنا لیتے ہیں، ہمارے سر کے بڑے حصے، کاندھوں کے اور جسم کے حصے، پاؤں کی طرف جاتے ہوئے مخروطی ہوتے جاتے اور جسم کے پورے ڈھانچے کو اسی بنیاد پر انحصار کرنا پڑتا۔

ماتسیرات تابوت کے بالکل پیچھے چل رہا تھا۔ وہ اپنی ہیٹ اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھا، اور اس کے سوگ اور آہستہ آہستہ چلنے نے اس کے گھٹنوں کو اکڑا دیا تھا۔ اس کو پیچھے سے دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوتا تھا: کہ اس کے سر کا پیچھے کا نکلا ہوا حصہ اور اس کے کالر سے نکل کر سر کی طرف جاتی ہوئی دو پھڑکتی ہوئی شریانیں مجھے نظر آتی تھیں، مگر گریتچن شیفلر یا ہیڈوگ برانسکی کے بجائے مدرٹروزنسکی ہی کیوں میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھی؟ وہ ہمارے گھر کی دوسری منزل پر رہتی تھی، اور بظاہر اس کا کوئی پہلا نام نہیں صرف خاندانی نام تھا، اس لیے کہ ہر شخص اسے مدرٹروزنسکی ہی کہتا تھا۔

تابوت کے آگے فادر ویکنے اور گرجا کا ایک ملازم خوش بو اُڑاتا بخور دان لیے چل رہا تھا۔ میری نظریں ماتسیرات کی گردن سے پھسل کر جنازہ برداروں کے بالوں کے کھچے بھری گردنوں کی پشت پر پہنچ گئی تھیں۔ اب مجھے ایک جنونی خواہش سے جنگ کرنی پڑ رہی تھی، آسکر تابوت پر چڑھ جانا چاہتا تھا۔ اس پر بیٹھ کر نقارہ نوازی کرنا چاہتا تھا، مگر اپنے ٹین سے بنے نقارے پر نہیں، بلکہ وہ تو تابوت کے ڈھکنے پر اپنی چوب نقارہ سے حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ وہ جنازہ برداروں کی تھکی ہوئی چال کی تال پر لہراتا اوپر بیٹھنا چاہتا تھا۔ وہ ان سوگواروں کے لیے نقارہ نوازی کرنا چاہتا تھا جو فادر ویکنے کی دعاؤں کو دہراتے چل رہے تھے۔ اور جب وہ تابوت کو زمین پر رکھ رہے تھے تو وہ چاہتا تھا کہ تابوت کے ڈھکنے پر جم کر کھڑا رہے، اور خطبے کے دوران، گھنٹیوں کے بجنے کے دوران، بخور کی خوش بو اور مقدس پانی کے چھڑکاؤ کے دوران، اور جب وہ تابوت کو قبر میں اتار رہے ہوں تو تابوت کے ساتھ وہ بھی قبر میں اپنی لاطینی دھن بجاتا اتر جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے مما اور اس کے حمل کے ساتھ گڑھے میں اترنا چاہتا تھا۔ اور اس گڑھے میں اس وقت تک ٹھہرنا چاہتا تھا جب تک مرنے والے کے اعزہ مٹھی بھر مٹی ڈال رہے ہوں۔ نہیں، آسکر واپس اوپر نہیں آنا چاہتا

تھا؛ اس کا جی چاہتا تھا کہ تابوت کے مخروطی حصے پر جدھر پاؤں ہوتے ہیں، بیٹھ کر نقارہ نوازی کرتا، مٹی کے تلے بھی نقارہ نوازی کرتا، جب تک کہ چوب نقارہ مزگل گراس کے ہاتھوں سے گر نہ جاتیں، جب تک کہ اس کی مما اس کی خاطر، اور وہ اپنی مما کی خاطر مٹی میں مل نہ جاتا۔ وہ اپنے جسم کا گوشت زمین کو اور اس کے باسیوں کو دینا چاہتا تھا؛ اور آسکر اپنی انگلیوں کی ہڈیوں سے نقارہ نوازی کرتے رہنا چاہتا تھا، اگر اس کو اس بات کی اجازت ہوتی۔

تابوت پر کوئی نہیں بیٹھا۔ اسے elm اور weeping willow درختوں کے سایے میں جھولتا 'برنتاؤ' کے قبرستان میں اتار دیا گیا۔ گرجا گھر کے ملازمین نے قبروں کے درمیان کچھ مرغیاں دیکھی جو مٹی سے کیڑے چُن رہی تھیں؛ وہ فصل کاٹ رہی تھیں جو انھوں نے بوئی نہیں تھی۔ اس کے بعد صنوبر کے درختوں تلے، مدر ٹروزنسکی کے ہاتھ میں ہاتھ۔ میرے آگے ماتسیرات، اور میری عقب میں میری نانی اماں گریف اور جان کے بازوؤں کے سہارے؛ اس کے پیچھے وِنسنٹ برانسکی ہیڈوِگ کے بازو پکڑے، اس کے بعد ننھی مارگا اور اسٹیفن ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، اس کے بعد شیفلر میاں بیوی۔ اس کے بعد گھڑی ساز لاؤبشاڈ، پرانے دوست ہائیلانڈ، اور 'بگل باز مین'، مگر اپنے ساز کے بغیر اور خاصی سنجیدہ کیفیت میں۔

جب سب کچھ ہو چکا اور تعزیت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا، تو مجھے مارکس نظر آیا تھا۔ سیاہ پوش اور شرمندہ، وہ اس مجمعے میں شامل ہو گیا جو مجھ سے، میری نانی اماں سے اور برانسکی میاں بیوی سے ہاتھ ملانا چاہتا تھا اور منہ ہی منہ میں کچھ کہتا جا رہا تھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ الیگزانڈر کو شیفلر، مارکس سے کیا چاہیے تھا۔ وہ تو ایک دوسرے سے واقف بھی نہیں تھے، شاید اس نے اُن سے کبھی بات بھی نہیں کی تھی۔ اس کے بعد شیفلر کے ساتھ موسیقار 'مین' بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ سب کمر کے برابر اونچی اس سبز جھاڑی کے قریب کھڑے تھے، جس کو اگر آپ اپنی انگلیوں کی درمیان ملیں تو جلد کا رنگ بدل جاتا ہے، اس کا مزہ بھی کڑوا ہوتا ہے۔ مسز کاٹر اور اس کی بیٹی سوسی، جو اپنے رومال سے اپنے مسکراہٹ چھپائے ہوئے تھی اور کچھ زیادہ جلد ہی بڑی ہو گئی تھی، ماتسیرات سے تعزیت کر رہے تھے، فطری طور پر — وہ اس زیادہ اور کیا مدد کر سکتے تھے؟ صرف اس

دوران میرے سر پر ہاتھ پھیرتے جا رہے تھے، لیکن جھاڑی کی پیچھے ہونے والی گفتگو تند ہوتی جا رہی تھی، مگر قابلِ فہم نہیں تھی۔ بگُل باز 'مین' نے مارکس کے سیاہ لباس کی طرف اپنی انگلی اٹھائی اورا سے دھکا دیا؛ اس کے بعد اس نے مارکس کا ایک بازو پکڑا، اور دوسرا بازو شیفلر نے پکڑ لیا۔ دونوں بہت محتاط تھے کہ مارکس جو الٹے پاؤں چلتا جا رہا تھا کسی قبر سے ٹکرا کر گر نہ پڑے۔ اس طرح وہ مارکس کو مرکزی سڑک تک تقریباً ڈھکیلتے لے گئے، اور اس کو پھاٹک کا راستہ دکھا دیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مارکس نے راستہ بتانے پر ان کا شکریہ ادا کیا اور باہر کی طرف چل پڑا تھا؛ اپنی ریشمی ہیٹ پہنی، اور موسیقار مین اور بیکری والے کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا، جب کہ وہ اس کو نظر میں رکھے ہوئے تھے۔

نہ ماتسیرات نے اور نہ میری نانی نے، مجھے ان کے پاس سے اور تعزیت کے مجمع سے کھسک جاتے دیکھا تھا۔ اس قیاس پر کہ ایک چھوٹا سا بچہ جانا چاہتا ہے، آسکر بھی گورکن اور اس کے مددگار کے پاس سے کھسک گیا۔ تب، عشق پیچاں کی چڑھی ہوئی بیل کی پروا کیے بغیر، وہ elms کے درختوں کی طرف دوڑا، اور سکس مُنڈ مارکس کے باہر نکل جانے سے پہلے اس کے پاس پہنچ گیا۔

"ارے، یہ تو ننھا آسکر لگتا ہے!" مارکس نے حیرت سے کہا، "تم ہی کہو، وہ مارکس سے کیسا سلوک کر رہے ہیں؟ مارکس نے ان کے ساتھ ایسی کون سی برائی کی ہے کہ وہ اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کر رہے ہیں؟"

مجھے معلوم نہیں تھا کہ مارکس نے کیا کچھ کیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا، جو پسینے پسینے ہو رہا تھا، اور اسے لوہے سے بنے پھاٹک سے باہر لے گیا، اور اس کے باہر کھڑے ہو کر ہم دونوں، میرے نقارے کا رکھوالا مارکس اور میں نقارہ نواز، یا یوں کہیے کہ اس کے تمام نقارے بجانے والا مارکس، دونوں دوڑ کر 'لیو شوگر' کی طرف گئے، جو ہماری طرح جنت پر یقین رکھتا تھا۔

مارکس، لیو سے واقف تھا، پورا شہر ہی اس سے واقف تھا۔ میں نے اس کے بارے میں صرف سنا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک روشن دن، جب وہ مدرسے کی منزلوں میں

ہی تھا، دنیا، تبرکات، مذاہب، جنت اور دنیا، زندگی اور موت، سب کچھ اس کے ذہن میں اس طرح گتھ گئے تھے کہ ہمیشہ کے لیے اس کے تصورات، اگر چہ یہ اس کا پاگل پن تھا، تابندہ اور مکمل طور پر واضح ہو گئے تھے۔

لیوشوگر کا یہ پیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ کسی کو بتائے بغیر ہی جنازوں کے وقت پہنچ جاتا تھا — چمکتا ہوا سیاہ سوٹ پہنے، جو اس کے جسم سے بہت بڑا ہوتا تھا، اور ہاتھوں پر سفید دستانے چڑھائے سوگوار لوگوں کا انتظار کرتا تھا۔ مارکس اور میں، دونوں جانتے تھے کہ وہ اپنی پیشہ ورانہ حیثیت میں برنتاؤ قبرستان کے پھاٹک پر کھڑا، دل بہلانے والا چہرہ بنائے، رحم دلانہ دستانے پہنے، اور اپنی نم نیلی آنکھوں سمیت سوگواروں کے باہر آنے کا منتظر ہوتا تھا۔

وہ دن سورج کی کرنوں سے منور دن تھا۔ جھاڑیوں اور پیڑوں پر بے شمار پرندے چہچہا رہے تھے۔ اپنے عمل اور انڈوں کی علامت کے ذریعے اپنی بے حیائی کا اظہار کرتی ہوئی کڑکڑاتی مرغیاں، اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں۔ سَی سَی کرتی ہوا تھی۔ سبز قبا میں ملبوس، خاک سے مبرا، تنگ کوٹ اور بائیں ہاتھ میں دستانہ پہنے لیوشوگر نے، ایک رقاص جیسی ہلکی سی چال میں، اس لیے کہ قدرت اس پر مہربان تھی، مارکس اور میری جانب اپنی پانچوں پھپھوند لگی، دستانے میں ملبوس، انگلیاں بڑھا دی تھیں۔ وہ اس طرح ترچھا کھڑا ہوا تھا گویا اس کو ہوا کے جھونکے کا سامنا ہو، حالاں کہ اس وقت ہوا نہیں تھی، اس نے اپنے سر کو تھوڑا سا خم کیا، اپنے لعاب دہن کے دھاگوں کو بُنتا ہوا، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ مارکس نے پہلے تو کچھ تذبذب کیا، پھر اعتماد کے ساتھ اپنا برہنہ ہاتھ حرکت کرتے دستانے میں دے دیا۔ ''کیا خوب صورت دن ہے!'' لیو بڑبڑایا ''وہ پہلے ہی یہاں پہنچ گئی ہے، جہاں ہر شے بہت سستی ہو رہی ہے۔ تم نے آقا کو دیکھا؟ Habemus ad Dominun کو۔ وہ ابھی یہیں سے گزرا ہے، ذرا جلدی میں تھا۔ آمین!''

ہم نے بھی آمین کہا۔ مارکس نے دن کی خوب صورتی سے اتفاق کیا، بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ اس نے آقا کو دیکھا تھا۔

ہم نے سوگواروں کو قریب آتے دیکھا۔ مارکس نے لیو کے دستانے سے اپنا ہاتھ الگ کر لیا، اس کو کچھ بخشش دینے کے لیے وقت نکال لیا۔ لیو نے، میری اور مارکس کی

جانب، مہربان نظروں سے دیکھا اور تیزی سے ٹیکسی کی طرف بڑھا جو برنارڈ ڈاک خانے کے باہر اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

میری نظریں اب بھی اس غبار پر لگی ہوئی تھیں جس نے پیچھے آہستہ ہوتے ہوئے مارکس کو دھندلا کر دیا تھا، کہ ٹروزنسکی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ سب اِکا دُکا، اور گروہوں میں آرہے تھے۔ لیوشوگر سب سے تعزیت کر رہا تھا۔ سب کو دن کی خوب صورتی کی طرف متوجہ کر رہا تھا، ہر ایک سے پوچھ رہا تھا، اس نے آقا کو دیکھا ہے یا نہیں، اور رسم کے طور پر ہر ایک نے اپنی استعداد کے مطابق اس کو بخشش عطا کی۔ ماتسیرات اور جان برانسکی نے جنازہ برداروں کو، گورکن کو اور گرجا گھر کے ملازم کو اور فادر وینکے کو اُجرت دی، جس نے ایک گہرے سانس اور شرمندگی کے ساتھ لیوشوگر کو اپنے ہاتھ کو بوسہ دینے دیا، اور پھر اپنے بوسہ شدہ ہاتھوں سے جنازے کے بکھرتے ہوئے شرکا کی طرف دعائیں دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اس دوران ہم — میری نانی، اس کا بھائی وِنسینٹ، برانسکیان اپنے بچوں سمیت، گریف اپنی بیوی بغیر، اور گریچن شیفلر — بارٹرے کی دو عام گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ ہم کو 'گولڈ کرگ' سے گزر کر، جنگل کے بیچ سے، پولینڈ کی سرحد پار کرتے ہوئے 'بساؤ' کے کانوں کے قریب جنازے کے کھانے کے لیے لے جایا گیا تھا۔

وِنسینٹ برانسکی کا زرعی فارم بالکل خالی تھا۔ اس کے سامنے سفیدے کے درخت تھے جو آسمانی بجلی سے بچاؤ کے لیے لگائے گئے تھے۔ احاطے کا پھاٹک قلابوں سے اُتار کر میز پوشوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ قرب و جوار سے بھی کچھ لوگ آگئے تھے۔ جنازے کے کھانے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ کھانا احاطے کے پھاٹک کے باہر کھلایا گیا تھا۔ گریچن شیفلر مجھے اپنی گود میں بٹھائے ہوئے تھی۔ پہلے تو کچھ چربی والی چیزیں لائی گئیں، اس کے بعد کچھ میٹھا، اس بعد پھر چربی۔ کھانے میں آلو سے بنی شراب، بیئر، ایک بھنی ہوئی بطخ، ایک سالم بھنا ہوا سُور، ساتھ کے ساتھ کچھ کیک، کھٹا میٹھا شربت، پھلوں کی کھیر، اور اس کے ساتھ بالائی۔ شام ہوتے کھلے احاطے کی جانب سے ہلکی ہلکی ہوا آرہی تھی، چوہے اور برانسکی کے بچے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، جنھوں نے پڑوس کے شیطان بچوں کی معیت میں احاطے پر قبضہ کر رکھا تھا۔

مٹی کے تیل سے جلنے والے لیمپ اور skat کے لیے تاش کے پتے نکالے گئے۔آلو کی شراب وہیں چھوڑ دی گئی تھی۔گھر میں بنی ہوئی انڈوں کی برانڈی تھی، جس نے سب کو خوش کر دیا تھا۔گریف نے شراب نہیں پی، مگر اس نے گانے سنائے تھے۔کشوبیائی لوگوں نے بھی گانے سنائے۔ماتسیرات نے پہلی چال چل کر کھیل شروع کیا تھا۔جان کی چال دوسری، اور اینٹوں کے بھٹے کے فورمین کی چال تیسری تھی۔اس وقت مجھے مما کی غیر موجودگی کا زیادہ احساس ہوا تھا۔سب رات گئے تک کھیلتے رہے، مگر کوئی بھی پان کے پتے کی چال جیت نہیں سکا تھا۔جب بغیر کسی واضح وجہ کے جان برانسکی پان کے پتے کی چال ہار گیا تو میں نے اس کو ماتسیرات سے سرگوشی میں کہتے سُنا تھا: "ایگنس یہ چال ضرور جیت جاتی۔"

پھر میں گریٹچن کی گود سے اُتر گیا اور باہر نانی اماں اور اس کے بھائی کے پاس چلا گیا تھا۔وہ لوگ ایک چھکڑے کی بگی پر بیٹھے ہوئے تھے۔وِنسنٹ ستاروں سے پولش زبان میں باتیں کر رہا تھا۔میری نانی اماں مزید رو نہیں سکتی تھی، مگر اس نے مجھے اپنے لہنگے کے نیچے رینگ جانے دیا تھا۔

آج کون مجھے اپنے لہنگے کے نیچے لے گی۔کون مجھے دن کی اور رات کی روشنی سے بچائے گی۔کون مجھے پیلے رنگ کے پگھلے ہوئے، خفیف سے خراب مکھن کی خوشبو سے آشنا کرے گی جسے میری نانی اماں میرے لیے اپنے لہنگے کے نیچے جمع کرتی تھی اور میرا وزن بڑھانے کے لیے مجھے کھلایا کرتی تھی؟

میں اس کے چار لہنگوں کی نیچے سو گیا تھا، اُس جگہ سے بہت قریب جہاں سے میری ماں کی ابتدا ہوئی تھی، اور اس وقت بھی اگرچہ ہوا کی کوئی کمی نہیں ہے، وہ پاؤں کے قریب مخروطی شکل کے اپنے تابوت میں دراز ہے۔

# ہربرٹ ٹروزنسکی کی پشت

جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے، کوئی شے ماں کا نعم البدل نہیں ہو سکتی ہے۔ دفن کے فوراً بعد ہی سے مجھے اپنی بے چاری ماں کی یاد ستانے لگی تھی۔ اب کہاں وہ سکس ٹنڈ مارکس کی دکان کے منگل والے پھیرے، کہاں وہ سسٹر انگے کی سفید وردی! سنیچر کے زیادہ تر دن مجھے مما کی موت کا دکھ دینے لگے تھے۔ اب مما اعترافات کے لیے کلیسا بھی نہیں جاتی تھی۔

اس طرح میرے لیے نہ اب پرانا شہر تھا، نہ ڈاکٹر ہولاٹز کا دفتر، اور نہ سیکریڈ ہارٹ کلیسا کسی دل چسپی کا باعث رہ گیا تھا۔ مجھے اب مظاہروں میں بھی دل چسپی نہیں رہ گئی تھی۔ اب میں گزرنے والوں کو کس طرح دکانوں کی سجی کھڑکیوں کی طرف لبھاتا، کہ آکسانے کے کاروبار میں بھی آسکر کو دل چسپی نہیں رہ گئی تھی۔ اب مما کہاں تھی جو مجھ کو شہر کے تھیٹر میں، کرسمس کے کھیلوں میں یا 'کرونے' یا بُش سرکس لے جاتی۔ ذرے دار مگر زور رنج، پڑھائی میں مصروف، 'کلائن ہامر ویگ' تک جانے والی سڑکوں پر، افسردہ، مارا مارا پھرتا، گریچن شیفلر کی طرف جاتا، جس نے مجھے اس طاقت کے بارے میں بتلایا تھا جو آدھی رات کے سورج والی سرزمین پر تفریحی دوروں سے حاصل ہوتی ہے، جب کہ میں گوئٹے اور راسپوتین کا بدراوراست تقابل کرتا تھا، یا جب میں مستقل تبدیل ہوتی ہوئی روشنی اور اندھیروں سے اکتا جاتا تو تاریخ کے مطالعے میں پناہ لیتا تھا۔ عام طور پر میں اے کوبلر کے Naval History of the City of Danzigs ،A Struggle for Rome اور کیز رکی

Calendar کے مطالعے میں مصروف رہا کرتا تھا جو مجھے کم از کم نصف انسائیکلوپیڈیا جتنا علم فراہم کرتا تھا۔ میں اب بھی ان تمام بحری جہازوں کی تیاری، ان کی مہورت، ان کی بکتر بندی، ان کی تباہ کرنے کی طاقت، ملاحوں کی تعداد کے بارے میں آپ کو صحیح اعداد و شمار فراہم کر سکتا تھا، جنھوں نے Skagerrak کی بحری جنگ میں حصہ لیا تھا، جنھوں نے اس موقعے پر نقصان اُٹھایا تھا یا غرق ہو گئے تھے۔

میں تقریباً چودہ برس کا ہو گیا تھا، مجھے تنہائی اور چہل قدمی پسند تھی۔ میرا نقارہ میرے پاس ہوتا تھا مگر اس کو بہت کم استعمال کرتا تھا، اس لیے کہ مما کے چلے جانے کے بعد سے ٹین کے نقاروں کی بہ وقت فراہمی میں مسائل پیدا ہو گئے تھے۔

وہ 1937 کا خزاں کا موسم تھا یا شاید 1938 کے بہار کا موسم۔ بہر حال میں 'ہنڈن برگ ایلی' سے ہوتا ہوا شہر کی طرف جا رہا تھا۔ فوریسزن کیفے سے زیادہ دور نہیں تھا، پتے، گر رہے تھے یا کلیاں پھوٹ رہی تھیں، مگر فطرت کے کارخانے میں کچھ ہو رہا تھا، جب میری اپنے بونے دوست اور استاد بیرا سے ملاقات ہو گئی تھی، جو شہزادے ایوجین اور اس کے بھتیجے میں شاہ لوئی چہاردہم کا براہِ راست وارث تھا۔

ہم تین یا چار برس سے ایک دوسرے سے ملے نہیں تھے، پھر بھی ہم نے ایک دوسرے کو بیس قدم کے فاصلے سے پہچان لیا تھا۔ وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایک نازک جنوبی حسن بھی چلا آ رہا تھا۔ اس کا قد بیرا سے ایک انچ کم رہا ہوگا اور مجھ سے تین اُنگل بڑی رہی ہوگی۔ اس کا مجھ سے 'روزویدا ریگونا' کے نام سے تعارف کرایا گیا تھا، جو پورے اطالیہ میں سب سے مشہور 'خواب خرام' (نیند میں چلنے والی) عورت تھی۔

بیرا نے مجھے فوریسزن میں چائے کی دعوت دی تھی۔ ہم مچھلی گھر میں بیٹھے تھے، اور کافی پیش کرنے والے آپس میں سرگوشی میں کہہ رہے تھے: "ذرا دیکھو، —— وہ دیکھو بونے —— دیکھا تم نے؟ ضرور کرونے 'سرکس کے ہوں گے۔ آؤ چلو، دیکھتے ہیں۔"

بیرا، اپنی ہزاروں مگر غیر مرئی شکنیں دکھاتا ہوا، میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

ویٹر جو ہمارے لیے کافی لایا تھا، بہت قد آور آدمی تھا۔ جب سینورا روزویدا نے پیسٹری

منگائی اور ویٹر اس کے پاس کھڑا تھا، تو وہ شام کے لباس میں ایک مینار جیسا دکھائی دے رہا تھا۔

بیرا میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہوا بولا، "تمہارا شیشہ شکن دوست خوش نظر نہیں آتا۔ کیا بات ہے، میرے دوست؟ کیا اب شیشہ راضی نہیں ہوتا یا آواز کم زور پڑ گئی ہے؟"

اضطراری کیفیت والا نوجوان، جیسا کہ میں تھا، آسکر نے اپنے فن کا نمونہ پیش کرنا چاہا، جو اَب بھی اپنے اوج پر تھا۔ میں نے مطلب کا مال دیکھنے کے لیے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، اور میں مچھلی گھر کے سامنے کے بڑے سے شیشے کو تاڑ چکا تھا، جس میں خوب صورت مچھلیاں اور آبی پودے لگے ہوئے تھے، مگر قبل اس کے کہ میں گانا شروع کرتا، بیرا بولا، "نہیں، نہیں، میرے دوست۔ ہم جانتے ہیں۔ تباہی کی کوئی ضرورت نہیں، نہ سیلاب کی اور نہ مرتی مچھلیوں کی۔"

شرمندہ شرمندہ، میں نے معذرت کی، بالخصوص سینیورا روز ویدا سے، جس نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک ننھا سا پنکھا نکالا، اور پُر جوشی سے جھلنے لگی۔

"میری مما کا انتقال ہو گیا ہے۔" پھر میں نے تشریح کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ لوگ ہمیشہ کہتے رہتے ہیں، ماں ہر چیز پر نظر رکھتی ہے، ماں ہر غلطی معاف کر دیتی ہے۔ یہ سب 'یومِ مادر' کے ڈھکوسلے ہوتے ہیں۔ اس کے نزدیک میں بونے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ بونے سے نجات حاصل کر لیتی، مگر وہ مجھ سے چھٹکارا نہیں پا سکتی تھی، اس لیے کہ بچے، خواہ بونے ہی کیوں نہ ہوں، آپ کی دستاویزات میں تحریر ہوتے ہیں، اور آپ ان کو مٹا نہیں سکتے۔ اس لیے اور بھی کہ میں اس کا بونا تھا اور اس کو مٹانے کے لیے اسے اپنے جسم کے ایک حصے کو ختم کرنا پڑتا۔ وہ اپنے آپ سے کہتی تھی، یا تو میں رہوں گی، یا یہ بونا رہے گا اور بالآخر اس نے اپنے آپ کو ختم کر دیا۔ اس نے مچھلی کھانا شروع کر دیا، صرف مچھلی، صرف تازہ مچھلی ہی نہیں، اس نے اپنے عاشقوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا، اور اب وہ 'بر نتاؤ' میں لیٹی ہوئی ہے۔ سب کہتے ہیں، اس کے عاشق بھی یہی کہتے ہیں، ہمارے گاہک بھی یہی کہتے ہیں، بونے نے نقارہ بجا بجا کر اس کو قبر میں پہنچا کر ہی دم لیا

ہے۔ آسکر کی وجہ سے وہ مزید زندہ رہنا نہیں چاہتی تھی؛ آسکر نے اس کو مار ڈالا ہے۔''

میں کچھ زیادہ ہی مبالغہ کر رہا تھا۔ دراصل میں سینورا روزوِدا پر رعب جمانا چاہ رہا تھا۔ زیادہ تر لوگ تو ماتسیرات کو الزام دیتے ہیں، کچھ جان برانسکی کو مما کی موت کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔ بیرا بات کی تہہ کو پہنچ گیا تھا۔

''تم مبالغہ کر رہے ہو، میرے پیارے دوست۔ محض حسد کی بنا پر تم اپنی مَری ماں سے ناراض ہو۔ تم کو اپنی ذلّت کا احساس ہو رہا ہے، اس لیے کہ وہ تم نہیں تھے، بلکہ وہ اُکتا دینے والے عاشق تھے جنھوں نے اس کو قبر میں پہنچا دیا ہے۔ تم خالی خولی اور شریر انسان ہو، جیسا کہ ایک جینئس کو ہونا چاہیے۔''

پھر اس نے ایک لمبا سانس لیا اور ساتھ بیٹھی سینورا روزوِدا پر نظر کی، ''ہمارے قد کے لوگوں کے لیے جینا آسان نہیں ہوتا۔ ظاہرہ قد کے بغیر انسان رہنا، کتنا مشکل کام ہے، کتنی مشکل زندگی ہوتی ہے، میرے دوست!''

روزوِدا ریگونا، نیپلز کی خواب خرام، چکنی مگر بے شکن جلد والی کی عمر، میرے اندازے کے مطابق اٹھارہ گرمیوں کے موسم کے برابر تھی، مگر ایک ہی لمحے بعد وہ اسّی یا نوے کی عورت نظر آئی تھی۔ سینورا روزوِدا نے بیرا کے جدید ترین فیشن کے انگریزی سوٹ پر تھپکی دیتے ہوئے، اپنی چیری جیسی سیاہ بحیرۂ روم والی آنکھیں میری طرف کیں اور گمبھیر آواز میں بولی، جس نے مجھے برف میں تبدیل کر دیا تھا — ''بہت ہی پیارے آسکر! میں تمھارے غم کو اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ آؤ، ہمارے ساتھ چلو — ممیلان، 'پارِگی'، تولیڈو' کو نیمے مالا' چلو۔''

میرا سر چکرا گیا تھا۔ میں نے اس بچگانہ عمر کے تجربے کار ہاتھ کو گرفت میں لے لیا۔ بحیرۂ روم میرے ساحل سے ٹکرایا، زیتون کے درخت نے میرے کان میں سرگوشی کی، اب روزوِدا تمھاری مما ہوگی، روزوِدا تمھیں سمجھے گی، روزوِدا — دی — گریٹ، جو ہر شخص کے آر پار دیکھ سکتی ہے، جو ہر ایک کی اندرونی روح کو جانتی ہے، صرف خود کو ہی نہیں — مما میا — صرف خود کو ہی نہیں، خدایا!

غنیمت ہے کہ راگونا نے فوراً ہی میرے آر پار دیکھنا اور میری روح کو اپنی

خواب خرامی سے ایکسرے کرنا شروع نہیں کردیا تھا، اس نے اچانک اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔کیا میرے چودہ برس کے گرسنہ دل نے اس میں خوف بھر دیا تھا؟

کیا اس کو معلوم ہوگیا تھا کہ روزیدا میرے لیے، کنواری دوشیزہ تھی، جادوگرنی تھی یا،صرف روزیدا تھی؟اس نے نیپلز کے لہجے میں سرگوشی کی،تھرتھرائی،اپنے آپ کو بار بار دہرایا، گویا اس کے خوف کا کوئی انت نہیں تھا جواس نے میرے اندر پایا تھا،اور جو بغیر کچھ کہے اس کے پنکھے کے پیچھے غائب ہوگیا تھا۔

میں نے تشریح کا مطالبہ کرتے ہوئے بیرا سے کہا کہ وہ کچھ کہے۔مگر خود بیرا نے بھی،شہزادے یوجین سے اپنی براہِ راست وراثت کے باوجوداپنا جذبۂ حمایت کھو دیا تھا۔اس نے ہکلانا شروع کردیا اور میں اس سے صرف اتنا کہلوا سکا تھا،"میرے پیارے دوست تمھارا جینئس آسمانی ہوسکتا ہے،مگر اس میں کلام نہیں کہ تمھارے جینئس کے بے رحمانہ عناصر نے میری پیاری روزیدا کو الجھا دیا ہے،اور مجھے خود بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ تمھارے اندر بھی کچھ مخصوص قسم کی دھماکا خیزی پوشیدہ ہے،جو میرے لیے اجنبی ہے اگرچہ مکمل طور پر نا قابلِ فہم بھی نہیں،مگر تم اپنے کردار سے قطع نظر—" بیرا نے اپنے آپ کو بازوؤں میں جکڑتے ہوئے کہا،"ہمارے ساتھ آؤ، بیرا کے جادوگروں کے طائفے میں شامل ہو جاؤ۔تھوڑے سے ذاتی نظم وضبط سے تم ایسے سیاسی حالات میں بھی شائقین کو اپنی جانب کھینچ سکو گے۔"

میں فوراً سمجھ گیا۔بیرا خود بھی،جس نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ ہمیشہ شہ نشین پر رہو مگر اس کے سامنے کبھی نہیں،ایک معمولی سے کردار میں سُکڑ کر رہ گیا تھا،حالاں کہ وہ اب بھی سرکس میں شامل تھا۔اور واقعی اسے بالکل مایوسی نہیں ہوئی تھی جب میں نے بہت نرمی اور افسوس کے ساتھ اس کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔سینورا روزیدا نے قابلِ سماعت سکھ کا سانس لیا اور ایک بار پھر مجھے اپنی بحیرۂ روم والی آنکھیں دکھائیں۔ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔میں نے ویٹر سے ایک خالی گلاس لانے کے لیے کہا اور گا کر اس میں دل کی شکل کا ایک روزن بنا دیا۔اور روزن کے نیچے حلقے اور سجاوٹ سمیت ایک عبارت کندہ کردی تھی،"آسکر کی جانب سے روزیدا کے لیے۔" میں نے اس کو یہ گلاس پیش کردیا اور وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوگئی

تھی۔ ہیرا، نے، خاصی بڑی بخشش کے ساتھ بل ادا کیا اور ہم وہاں سے اُٹھ گئے۔

وہ اسپورٹس پیلس تک میرے ساتھ ساتھ رہے تھے۔ میں نے 'میوائزے' کے آخری کنارے پر موجود برہنہ شہ نشین کی طرف اپنی ایک چوب نقارہ سے اشارہ کیا تھا اور — اب مجھے یاد آرہا ہے کہ وہ 1938 کے بہار کا موسم تھا — میں نے اپنے استاد ہیرا کو شہ نشینوں کے نیچے نقارہ نوازی کے اپنے کیریئر کے بارے میں بتا دیا تھا۔

ہیرا شرمندگی کی ہنسی ہنسا تھا، جب کہ رینگوا کا چہرہ سخت ہو گیا تھا۔ سینورا ہم سے چند قدم دور ہٹ گئی تھی، اور ہیرا نے جانے کی اجازت لیتے ہوئے میرے کان میں سرگوشی کی تھی، "دوست، میں ہار گیا ہوں۔ اب میں تمھارا استاد کیسے ہو سکتا ہوں؟"

"سیاست — سیاست کس قدر گندی چیز ہوتی ہے!"

پھر اس نے میری پیشانی کا بوسہ لیا، جیسا کہ اس نے کئی برس پہلے کیا تھا، جب ہم سرکس کے ٹھیلوں کے درمیان ملے تھے۔ لیڈی روزویدا نے چینی کے برتن کے جیسا اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور میں اس پر نہایت شائستگی سے جھکا، جو ایک چودہ سالہ کے لیے بہت ماہرانہ انداز تھا، "بیٹے، ہم پھر ملیں گے۔" ہیرا نے کہا، "جب بھی وقت ملے گا، اس لیے کہ ہم جیسے لوگ ایک دوسرے کو فراموش نہیں کیا کرتے۔"

"اپنے آبا کو معاف کر دو۔" سینورا نے فہمائش کے انداز میں کہا، "خود کو اپنے وجود کا عادی کر لو، تاکہ تمھارے قلب کو سکون ملے اور ابلیس مغلوب ہو جائے۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا گویا سینوریتا نے دوسری بار میرا بپتسمہ کر دیا ہو، مگر ایک بار پھر بے کار۔ شیطان دور ہو جا، مگر شیطان کب جانے والا تھا۔ میں نے ان کی جانب دل گرفتگی سے دیکھا، اور جب وہ ٹیکسی میں سوار ہوتے ہی نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئے — کہ فورڈ گاڑیاں تو بالغ لوگوں کے لیے بنائی جاتی ہیں، اس لیے خالی دکھائی دی تھی گویا وہ کسی گاہک کو یا دوستوں کو لے جا رہی ہو۔

میں نے ماتسیرات کو اُکسانے کی بہت کوشش کی تھی کہ وہ مجھ کو کرونے سرکس لے جائے، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس نے خود کو بے چاری مما کے غم کے سپرد کر دیا

تھا، جو کبھی مکمل طور پر اس کی نہیں ہوئی تھی تو پھر وہ کس کی تھی؟ جان برانسکی کی بھی نہیں۔ اگر کوئی تھا تو وہ میں تھا، اس لیے کہ آسکر ہی اس کے غیاب میں ہمیشہ دکھی رہتا تھا، جو اس کی روز مرہ کی زندگی کو اُلٹ پلٹ دیتا تھا، اور اس کی زندگی کے لیے خطرہ بن جاتا تھا۔ مما نے مجھے بالکل بے آسرا کر دیا ہے۔ مجھے اپنے آبا سے کبھی کوئی توقع نہیں تھی۔ میرے استاد ببرا کو اپنے پروپیگنڈے کے لیے گوبلز کی شکل میں ایک استاد مل گیا تھا۔ گرچین شیفلر کو اپنے سردی کے موسم کے امدادی کاموں سے فرصت نہیں تھی۔ کہیں کوئی بھوکا نہ رہ جائے۔ کہیں کوئی سردی میں ٹھٹھر کر مر نہ جائے۔ میرے پاس سوائے اپنے نقارے کے، دل چسپی کا کوئی اور سامان نہیں رہ گیا تھا۔ میں اپنی تنہائی کو اسے بجانے سے دور کرتا تھا۔ شام کے وقت ماتسیرات اور ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ایک دوسرے کو تکا کرتے تھے۔ وہ اپنی پکوان کی کتابوں کی ورق گردانی کرتا، میں اپنے نقارے پر بین کرتا۔ کبھی کبھی ماتسیرات اپنی پکوان کی کتابوں میں منہ چھپا کر روتا بھی تھا۔ جان برانسکی کی آمد و رفت خال خال ہی ہوتی تھی۔ سیاسی حالات کے پیشِ نظر دونوں آدمی احتیاط برتتے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہوا کس طرف چلنے والی ہے۔ تاش کا کھیل کم اور کبھی کبھی ہوتا تھا؛ جب کبھی ہوتا تو رات گئے لالٹین کی روشنی میں اور ہماری بیٹھک میں ہوتا تھا۔ ہر قسم کی سیاسی بات سے احتراز کیا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میری نانی 'بِساؤ' سے ہمارے لیبس وگ والے گھر کا راستہ بھول گئی ہے۔ شاید وہ میری اور ماتسیرات کی وجہ سے نہیں آتی تھی: ایک بار میں نے اس کو کہتے سنا تھا، "میری ایگنس اس لیے مر گئی کہ وہ مزید نقارہ نوازی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔"

اپنے احساسِ جرم سے انکار کے باوجود بھی مجھے بے چاری مما کی موت کا بہت غم تھا۔ میں نقارے سے اور زیادہ چمٹ سا گیا تھا؛ اس لیے کہ ماں مرتی ہے تو اس کے ساتھ نقارہ مر نہیں جاتا، کہ آپ ایک اور خرید سکتے ہیں، یا آپ اس کی بائی لانڈ، یا گھڑی ساز لاؤبشاد سے مرمت کروا سکتے ہیں، جو مجھے سمجھتا تھا اور ہمیشہ میرے سوالوں کا صحیح جواب دیتا تھا، کہ نقارہ مجھ سے قریب تھا اور میں نقارے کے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔

اُن دنوں فلیٹ میرے لیے بہت چھوٹا ہو گیا تھا، مجھ چودہ برس والے کے لیے

گلیاں بہت لمبی یا بہت چھوٹی ہو گئی تھیں؛ دن کے وقت دُکان کی کھڑکیوں کے باہر کھیل کر غصہ نکالنے کا موقع نہیں ہوتا تھا، اور اکسانے کی اُکساہٹ اتنی شدید نہیں ہوتی تھی کہ رات کے اندھیرے میں دروازوں کے باہر گھات میں بیٹھنا ضروری ہوتا۔ میں اپنا نقارہ نوازی کا وقت اپنی عمارت کی چار منزل سیڑھیاں، بار بار چڑھنے اترنے میں صرف کردیا کرتا تھا؛ میں چڑھتے ہوئے ایک سو سولہ سیڑھیاں گنتا، ہر منزل پر رُک کر سانس لیتا اور سونگھتا، اس لیے کہ بوئیں بھی خود کو دو کمروں والے فلیٹ میں قید محسوس کرتیں اور ہر منزل پر پانچ دروازوں سے بہہ کر باہر نکل آتی تھیں۔

پہلے تو خوش قسمتی سے 'مین' بگل والے سے اکثر ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ میں اس کو نشے میں دھت، دو چھتی میں سوکھنے کے لیے ڈالی گئی چادروں پر پڑا پاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنا بگل اتنے احساسِ موسیقیت سے بجاتا تھا کہ میرے نقارے کے لیے حقیقی مسرت کا باعث ہوتا تھا۔ مئی 1938 میں اس نے مے نوشی سے توبہ کرلی تھی، اور ہر ملنے والے کو بتایا کرتا تھا کہ "میں اب نئی زندگی شروع کر رہا ہوں۔" وہ Mounted SA بینڈ کا رُکن بن گیا تھا۔ پتھر جیسا سنجیدہ، بوٹ پہنے، برجس میں ملبوس، پانچ قدم ایک ساتھ اٹھاتا تھا۔ اپنی چار بلیاں اب بھی رکھے ہوئے تھا، ان میں سے ایک کا نام بسمارک رکھا تھا، اس لیے کہ توقع کے مطابق، اکثر شراب اس پر سوار ہوتی تھی، اور موسیقی کی بےقراری بڑھ جاتی تھی۔ میں گھڑی ساز لاؤبشاڑ کا دروازہ شاید ہی کبھی کھٹکھٹاتا، کہ سیکڑوں گھڑیوں کے درمیان وہ ایک خاموش انسان تھا۔ وہ مجھے بڑے پیمانے کا تضیعِ اوقات کرنے والا سمجھتا تھا، اور میں مہینے بھر میں ایک بار سے زیادہ یہ عیاشی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔

بوڑھے ہائی لانڈ کی احاطے میں دُکان قائم تھی۔ اب بھی وہ ٹیڑھی کیلیں سیدھی کیا کرتا تھا۔ ہر طرف خرگوش اب بھی تھے اور پرانے زمانے کی طرح ان کے بچے بھی ہوتے تھے، مگر اب یہاں کے [انسان کے] بچے بدل گئے تھے۔ اب وہ اسکول کی وردی پہنتے تھے، کالی ٹائی لگاتے تھے اور اینٹوں کے آٹے کے شوربے نہیں بناتے تھے۔ وہ میرے قد کے دُگنے ہو گئے تھے، اور میں ان کو ان کے نام سے پہچان نہیں پاتا تھا۔ یہ تھی نئی نسل؛

میری نسل اسکول سے فارغ ہو چکی تھی اور تجارت سیکھ رہی تھی۔ٹونی آئیک بال بنانا سیکھ رہی تھی۔ایکمیل مشکے ھیٹاؤ کے شپ یارڈ میں ویلڈنگ کا کام کرنے والا تھا، سوی اسٹرن فلڈ اسٹور میں سیلز گرل ہونے والی تھی۔تین چار برسوں میں چیزیں کس طرح بدل جایا کرتی ہیں۔قالین کی پٹائی کا رنگ ابھی وہیں تھا اور منگل اور جمعے کے دنوں میں قالین کی پٹائی کی اب بھی اجازت تھی، مگر اب دھما دھم کم ہوتا تھا، اور کبھی کبھی ہونے والے دھماکے شرمندگی کا باعث ہوتے تھے: جب سے ہٹلر اقتدار میں آیا تھا، ویکیوم کلینر قالین کی صفائی کا کام سنبھال رہے تھے۔قالین کے رنگ گورتوں کے کام آرہے تھے۔

میرے لیے تو بس دو چھتی اور سیڑھیاں رہ گئی تھیں۔چھت کے کھپریلوں کے نیچے میں نے اپنے آپ کو مطالعے کے لیے وقف کردیا تھا؛ جب مجھے کسی انسانی رفاقت کی ضرورت ہوتی تو میں سیڑھیوں پر دوسری منزل کے بائیں جانب کے پہلے دروازے پر کھٹکا کرتا تھا، اور مدر ٹروزنسکی ہمیشہ دروازہ کھول دیتی تھی۔ جب سے اس نے برنتاؤ' کے قبرستان میں میرا ہاتھ پکڑا تھا اور مجھے میری بے چاری ماں کی قبر تک لے گئی تھی، اور جب وہ اپنے چوب نقارہ سے کھٹکا کرتا تھا تو وہ آسکر کے لیے دروازہ ضرور کھولتی تھی۔

اتنی زور سے نقارہ نہ بجایا کرو، آسکر! ہربرٹ ابھی سو رہا ہے، کل کی رات پھر مشکل گزری تھی، اس کو ایمبولینس میں گھر واپس لایا گیا تھا۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے فلیٹ کے اندر گھسیٹ لیا تھا، میرے لیے معمولی کافی، دودھ والی بنائی تھی، اور مجھے ایک ٹکڑا بھورے رنگ کی مٹھائی کا دے دیا تھا جو ڈور سے بندھا ہوا تھا، تا کہ اس کو کافی میں ڈبو کر چوسا جاسکے۔میں نے کافی پی تھی اور اپنے نقارے کو آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔

مدر ٹروزنسکی کا سر گول تھا، اس پر اتنے کم بال تھے، راکھ کے رنگ کے، کہ ان میں اس کا گلابی رنگ کا سر چمکتا تھا۔ان تھوڑے سے بالوں کو سر کے پیچھے اکٹھا کر کے وہ جوڑا بنا لیتی تھی جس کا حجم بلیئرڈ کے گیند سے کچھ کم ہوتا تھا، خواہ ان کو کتنا ہی کس کے گوندھا جائے۔ان کو یک جا رکھنے کے لیے وہ بُنائی کرنے والی سلائیوں کو استعمال کرتی تھی۔ ہر صبح مدر ٹروزنسکی اپنے گول رخسار پر مالش کرتی تھی، جو ہنسنے کے دوران ایسے لگتے

تھے گویا چہرے پر چپکا دیے گئے ہوں، اور اس عمل میں چکوری کے ڈبوں سے لیے گئے سرخ رنگ کے یا بد رنگ کاغذ استعمال کیے گئے ہوں۔ اس کا چہرہ بالکل چوہے جیسا نظر آتا تھا۔ اس کے ہربرٹ، گسیٹے، فرٹز اور ماریا نام کے چار بچے تھے۔

ماریا میرے عمر کی تھی۔ وہ اسکول کی تعلیم ختم کر کے 'ہینڈ لحز' میں سرکاری افسروں کے گھر والوں کے ساتھ رہ کر گھر کا کام کاج کرنا سیکھ رہی تھی۔ فرٹز ریلوے کی کوچ فیکٹری میں کام کرتا تھا، اور کم کم نظر آتا تھا۔ تین معشوق لڑکیاں اس کی دوست تھیں، جو باری باری اس کا بستر گرم کرتی تھیں، اور 'اوہرا' کے "Race Track" ہال میں رقص کرنے جاتی تھیں۔ اس نے احاطے میں "Vienna blues," خرگوش پال رکھے تھے مگر مدٹروزنسکی کو ان کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی، اس لیے کہ اس کو اپنی معشوق لڑکیوں ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ گسیٹے تیس برس کی خاموش طبع لڑکی تھی، مرکزی ریلوے اسٹیشن کے قریب ہوٹل ایڈن کے ڈائننگ ہال میں، دوسرے ملازموں کے ہمراہ، مہمانوں کو کھانا پیش کرتی تھی۔ ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی، اور ہوٹل کی اوپری منزل میں دوسرے ملازمین کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ موسیو فرٹز کبھی کبھی رات گزارنے گھر آجایا کرتے تھے۔ اس طرح سب سے بڑا لڑکا ہربرٹ ہی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ ہربرٹ نیو فار واسر' کی بندرگاہ کے مضافات میں ویٹر کا کام کرتا تھا۔ بے چاری مما کے انتقال کے بعد کچھ دن تک میری خوش گوار زندگی کا مقصد صرف ہربرٹ ٹروزنسکی ہی رہ گیا تھا: آج بھی میں اس کو اپنا دوست کہتا ہوں۔

ہربرٹ اسٹاربش کے لیے کام کرتا تھا۔ اسٹاربش سوئیڈن بار کا مالک تھا، جو Protestant Seamen's Church والی گلی کے اس پار واقع تھا: اس کے گاہکوں میں، جیسا کہ نام سے واضح ہوتا ہے، زیادہ تر اسکینڈے نیویائی بحری سپاہی ہوتے تھے، مگر ان میں روسی، فری پورٹ کے پولش، 'ہولم' بندرگاہ کے قلی، اور بندرگاہ پر لنگر انداز جرمن جنگی جہازوں کے سپاہی بھی ہوا کرتے تھے۔ ایسی بین الاقوامی جگہ پر ویٹر کا کام کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اوہرا کے، تیسرے درجے کے ڈانس ہال "Race Track" سے حاصل کیا ہوا تجربہ، جہاں ہربرٹ نے نیو فار واسر' جانے سے پہلے کام کیا تھا، اس کو Sweden

Bar کے لسانی آتش فشاں پر غلبہ حاصل کرنے کے کام آیا تھا، جہاں وہ مضافاتی Plattdeutsch لہجے میں انگریزی اور پولش ٹکڑے بھی شامل کر لیتا تھا۔اس کے باوجود مہینے میں ایک یا دو بار اس کو ایمبولنس میں، بلا معاوضہ، گھر پہنچایا جاتا تھا۔

ہربرٹ، پیٹ کے بل، گہرے سانسیں لیتا بستر پر پڑا رہتا تھا اس لیے کہ اس کا وزن دو سو پاؤنڈ سے زیادہ تھا۔ان دنوں مدر ٹروزنسکی اس کی نگہداشت کے ساتھ ساتھ اس کی شکایت بھی کرتی جاتی تھی۔پٹیاں تبدیل کرنے کے بعد، وہ اپنے جوڑے سے بُنائی کرنے والی ایک سلائی نکالتی اور اس سے، ہربرٹ کے بستر کے قریب دیوار پر لگی تصویر کے شیشے پر کھٹکھٹاتی تھی۔یہ مرمت کی ہوئی تصویر، مونچھوں والے اور سنجیدہ شکل کے کسی شخص کی تھی جس کی صورت میرے البم میں لگی مونچھوں والے افراد سے بہت ملتی تھی۔

یہ حضرت، جن کی تصویر پر مدر ٹروزنسکی بنائی کرنے والی سلائی سے اشارے کرتی تھی، میرے خاندان کے کسی شخص کی نہیں، ہربرٹ، گسٹے، فرٹز اور ماریا کے والد کی تھی۔

"کسی دن تمھارا حشر بھی اپنے باپ جیسا ہوگا" وہ کراہتے، واویلا کرتے ہربرٹ سے کہتی، مگر اس نے کبھی صاف صاف نہیں بتایا کہ کالے رنگ کی پالش والے فریم میں لگی تصویر والا آدمی کہاں اور کس کی تلاش میں گیا تھا اور کس طرح اپنے انجام کو پہنچا تھا۔

وہ بھورے چوہے کی صورت والی عورت، اپنے ہاتھ باندھے کھڑی بیٹے سے پوچھ رہی تھی، "اس بار کیا ہوا تھا؟"

"بالکل وہی، جیسا پہلے ہوتا آیا ہے۔سویڈن اور ناروے والے تھے۔" ہربرٹ نے پہلو بدلا تو بستر کراہ اُٹھا۔

"بالکل ویسا ہی، جیسا پہلے ہوتا آیا ہے، یہ کہہ رہا ہے۔مت کہو کہ یہ سب انھیں نے کیا ہے۔پچھلی بار تو تربیتی جہاز کے لوگ تھے، کیا کہتے ہیں ان کو، ذرا اونچا بولو، ٹھیک ہے، Schlageter، یہی تو میں کہہ رہی تھی، اور تم کہہ رہے تھے کہ سویڈن اور ناروے والے تھے۔"

ہربرٹ کا کان--- میں چہرہ نہیں دیکھ سکا--- سُرخ ہوگیا تھا، "خدا غارت کرے Heinies کو، ہمیشہ بکواس کرتے ہیں وہ"

"ان کو چھوڑو بھی، تمھیں ان سے کیا مطلب؟ مجھے تو وہ ذمے دار دکھائی دیتے ہیں، جب وہ چھٹی کے دن شہر میں ہوتے ہیں۔ تم نے پھر انھیں لیشن پر لیکچر دیا ہوگا، یا ہسپانیہ کی خانہ جنگی پر شروع ہو گئے ہو گے؟"

ہربرٹ خاموش ہو گیا اور مدر ژرزنسکی اپنی مصنوعی کافی کے لیے باورچی خانے چلی گئی۔

ہربرٹ کی پیٹھ ٹھیک ہو گئی تو مجھے اس کو دیکھنے کی اجازت مل گئی۔ وہ باورچی خانے میں بیٹھا ہوا تھا، اس کی گیلس اس کی نیلے رنگ کی پتلون میں چھپی ران پر لٹکی ہوئی تھی، اور آہستہ آہستہ، جیسے اس کے خیالات اسے روک رہے ہوں، اس نے اپنی اونی قمیص اتار دی تھی۔ اس کی ستواں پشت ہمیشہ حرکت میں ہوتی تھی۔ اس کے عضلات اوپر نیچے حرکت کر رہے تھے۔ پشت کا رنگ گلابی تھا جس پر دھبے پڑے ہوئے تھے۔ ریڑھ کی ہڈی کی چربی کی تہہ میں چھپی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں جانب گھنے بال تھے، جو شانے کی ہڈی سے نیچے کی طرف آتے ہوئے اونی زیر جامے میں چھپ گئے تھے، جو ہربرٹ گرمی کے موسم میں بھی پہنا کرتا تھا۔ گردن کے عضلات سے زیر جامے کے کنارے تک، ہربرٹ کی پشت زخم کے موٹے موٹے نشانات سے بھری ہوئی تھی، جن پر بال نہیں اگتے تھے، جو دھبوں کو چھپاتے جو کئی رنگوں پر مشتمل، نیلے اور کالے رنگ سے لے کر سبز آمیز سفید رنگ شکنیں ڈالتے تھے اور جب موسم بدلتا تھا تو ان میں کھجلی ہوتی تھی۔ مجھے ان نشانات کو چھونے کی اجازت تھی۔

میں جاننا چاہتا ہوں کہ میں نے، جو اس پلنگ پر لیٹا کھڑکی کے اس پار دیکھتا رہتا ہے، جو دماغ کے اس اسپتال کی بیرونی عمارتوں میں، اور اس کے پار جاتی نظروں سے، جن کے پیچھے 'اوبیراتھ' نامی جنگل واقع ہے، دیکھتا رہتا ہے، آج سے پہلے کوئی ایسی سخت، ایسی حساس شے چھوئی ہے جو ہربرٹ ٹروزنسکی کی پشت پر بنے نشانات سے زیادہ بد حواس کر دینے والی رہی ہو۔ اسی درجے پر میں، چند عورتوں اور جوان لڑکیوں کے اعضائے مخصوص کو بھی رکھنا چاہوں گا، اور خود اپنے چونچ مارنے والے عضو کو، پلاسٹر سے بنے لڑکے یسوع مسیح کے پانی دینے والے برتن کو، اور انگوٹھی پہننے والی اُس انگلی کو بھی، جسے مشکل سے دو برس قبل ایک کتا رائی کے کھیت سے اٹھا کر میرے پاس لایا تھا، جس کو ایک

برس قبل تک مجھے محفوظ کرنے والے مرتبان میں رکھنے کی، جہاں سے میں اسے نکال نہ سکوں، اجازت دی گئی تھی، جو پہلے دن کی طرح آج بھی اتنی مکمل ہے کہ میں اس کو محسوس کر سکتا ہوں، اور اس کے جوڑوں کو اپنے نقارے کی چوب سے گن سکتا ہوں۔ جب بھی میں نے ہربرٹ ٹروزنسکی کی پشت کو یاد کرنے کی کوشش کی ہے، میں نے اس محفوظ انگلی سے نقارہ نوازی کی ہے، اور اپنے نقارے کی مدد سے اپنی یادیں تازہ کی ہیں۔ جب بھی میں نے — جو ہمیشہ نہیں ہوا ہے — [اپنے خیالوں میں] کسی عورت کے جسم کو نئے سرے سے ترتیب دینے کی کوشش کی ہے، آسکر نے، عورتوں کے جسم کے ان نشانوں جیسے حصوں سے مناسب طور پر قائل نہ ہونے پر، ہربرٹ ٹروزنسکی کے نشانات ایجاد کیے ہیں۔ مگر اس کو میں ایک اور طرح سے کہنا چاہوں گا کہ میرے دوست کی وسیع پشت کے نشانات سے میری پہلی شناسائی کچھ ویسی ہی تھی جیسی کہ اگرچہ عارضی ہوتی ہے، کسی عورت کے جسم کے کچھ حصوں کی سختی سے ہوتی ہے، جو جنسی عمل کے لیے تیاری کا اشارہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہربرٹ کی پشت کی علامتوں نے انگوٹھی کی انگلی جیسے ابتدائی دعوے کیے تھے، اور قبل اس کے کہ ہربرٹ کے نشانات اشارے دیتے، وہ میری چوب، نقارہ تھیں جنھوں نے میری تیسری سالگرہ کے بعد سے ہی نشانات کے، عضویاتِ تناسل کے اور بالآخر انگوٹھی والی انگلی کے وعدے کیے تھے، مگر مجھے اس سے بہت پیچھے جانا پڑے گا — جب میں جنین کی منزل میں تھا، قبل اس کے کہ آسکر کو آسکر کہا جاتا، میری ناف نے، میں بیٹھا جس سے کھیلتا رہتا تھا، مجھ سے متواتر چوب نقارہ کا، ہربرٹ کے نشانات کا، وقتاً فوقتاً، جوان عورتوں کے نہیں، کم جوان عورتوں کے اُبلتے ہوئے گڑھوں کا، اور آخر میں انگوٹھی کی انگلی کا، اور ساتھ ساتھ لڑکے یسوع مسیح کے پانی دینے والے برتن کی متوازی نشوونما کے ساتھ میری اپنی جنسی کیفیت کا وعدہ کیا تھا جو میں اپنے ساتھ ہمیشہ لے جاتا ہوں — جو میری کوتاہیوں اور محدود امکانات کا نشان ہوتا ہے۔

آج میں اپنی چوب نقارہ کی طرف راغب ہو گیا ہوں اور جہاں تک نشانات، جسم کے نازک حصوں اور میرے اپنے آلات کا معاملہ ہے جو آج کل کبھی کبھار ہی قابلِ فخر ہوتا ہے، میں انھیں بالواسطہ، نقارے کے ذریعے یاد رکھتا ہوں۔ ایک بار پھر اپنی تیسری سالگرہ

منانے میں کامیابی کے لیے مجھے تیس برس کا ہونا پڑے گا۔ آپ ضرور سمجھ گئے ہوں گے، آسکر کا مقصد ناف کی منزل پر واپس جانا ہے؛ اور یہی وہ واحد مقصد ہے جس کے پیچھے ہربرٹ ٹروزنسکی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہتی ہے۔

قبل اس کے کہ میں اپنے دوست کے کام کا بیان شروع کروں اور اس کی تشریح کروں، کچھ تعارفی کلمات کہنے بھی مناسب ہوں گے۔ ٹھوڑی کی بائیں جانب 'دوہرا' کی ایک طوائف کے دانت کے نشان کے علاوہ اس کے طاقت ور جسم کے اگلے حصے پر کوئی نشانات نہیں تھے، کہ یہ نہایت شان دار ہدف ہوتا تھا۔ وہ لوگ صرف اس کے عقب سے ہی حملہ آور ہو پاتے تھے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر فن لینڈ اور پولینڈ والوں کے، 'اسپائیٹر انجل' کے قلیوں کی چھریوں کے اور تربیتی جہازوں کے زیر تربیت سپاہیوں کے چاقوؤں کے نشانات تھے۔

جب ہربرٹ ہفتے میں تین بار دوپہر کا کھانا کھانے جایا کرتا تھا — جہاں آلو سے بنے اتنے چلے پین کیک بنتے تھے جن سے پتلے کوئی بھی نہیں بنا سکتا تھا، چکنائی سے بالکل خالی، پھر بھی اتنے ہی کرکرے جیسے کہ اُس کی مدر ٹروزنسکی بنایا کرتی ہے — اور جب ہربرٹ نے اپنی پلیٹ ایک جانب کھسکا دی تھی، تو میں نے اس کو Neueste Nachrichten (تازہ خبریں نامی اخبار) پکڑا دیا تھا۔ اس نے اپنی گیلس اتاری، اپنی قمیص اتاری اور اخبار پڑھنے لگا تھا، تو مجھے اس کی پشت کے نشانوں کے بارے سوال کرنے کا موقع ملا تھا۔ ان سوالوں کے درمیان مدر ٹروزنسکی عام طور پر ہماری میزوں پر ہی بیٹھی رہتی تھی، وہ اپنے پرانے موزوں سے اون نکالا کرتی، اور منظور کرنے یا منظور کرنے والے اپنے خیالات کے لقمے دیتی رہتی تھی، اور اس انسان کی بھیانک موت کے بارے میں ایک آدھ الفاظ کہنے سے باز نہیں آتی تھی، فریم کے شیشے کے پیچھے جس کی درست کی گئی تصویر ہربرٹ کے پلنگ کے پاس آویزاں رہتی تھی۔

میں اپنے سوالات کسی ایک نشان پر انگلی رکھنے کے ساتھ شروع کرتا تھا یا کبھی کبھی، میں نشان کو اپنے نقارے کی چوب سے چھوتا تھا۔

"ایک بار پھر دباؤ بیٹا، مجھے پتا نہیں کس کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو۔ یہ تو

سویا ہوا معلوم ہوتا ہے۔" وہ کہتا، اور میں ایک بار پھر اس کو دباتا، ذرا زیادہ زور سے۔

"اوہ — اچھا — وہ والا — وہ کوئی یوکرین کا تھا۔ وہ گڈنکس کے ایک آدمی سے جھگڑا کر رہا تھا۔ پہلے تو دونوں ایک ہی میز پر بھائیوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پھر گڈنکس کے کردار نے اس کو روسکی کہا تھا۔ یوکرین والا کب برداشت کرتا۔ وہ کچھ بھی بن سکتا تھا، مگر روسکی نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ دریائے وِسٹولا میں لکڑی کے بڑے بڑے لٹھے بہایا کرتا تھا، اس سے پہلے اور دریاؤں میں بھی یہی کام کرتا تھا، اور اس کے جوتوں میں کرنسی نوٹ کی گڈیاں ہوتی تھیں۔ ان میں سے آدھی تو وہ پینے اور پلانے میں لٹا چکا تھا، جب اس کردار نے اس کو روسکی کہہ کر پکارا تھا۔ مجھے ان دونوں کو علاحدہ کرنا پڑا تھا، آرام سے اور طریقے سے، جیسا کہ میں ہمیشہ کرتا ہوں۔ اب تو ہربرٹ بھی اس مارا ماری میں شامل ہوگیا تھا۔ اس مرحلے پر یوکرین والے نے مجھے 'واٹر پولاک' کا طعنہ دیا۔ اور وہ پولاک جو اپنا سارا وقت دریا سے کیچڑ نکالنے والی کشتی پر کیچڑ ڈالنے میں نکالا کرتا تھا، اس نے مجھے کچھ کہا تھا جو مجھے ناٹسی جیسا سنائی دیا تھا۔ لو، بیٹا، دیکھو ہربرٹ ٹروزنسکی کیا شے ہے — ایک منٹ بعد ہی کیچڑ نکالنے والی کشتی کا آدمی، بد رنگ چہرے والا آدمی، جو بھٹی میں کوئلہ جھونکنے والا لگتا تھا، کوٹ روم کے پاس دہرا پڑا تھا۔ میں اس کو بتانا چاہ رہا تھا کہ ایک واٹر پولاک اور دانتسگ کے باشندے کے درمیان کیا فرق ہوتا ہے، جب کوئی اس پر پشت سے حملہ کرتا ہے — اور یہی وہ نشان ہے۔"

اور جب ہربرٹ کہتا "یہی وہ نشان ہے" تو اپنے الفاظ پر زور دینے کے لیے وہ اخبار کا صفحہ پلٹتا اور کافی کا ایک گھونٹ بھرتا تھا۔ تب مجھے دوسرے نشان کو دبانے کی اجازت ہوتی تھی، کبھی ایک بار اور کبھی دو بار۔

"اوہ! وہ والا۔ ارے وہ تو بس یوں ہی سا ہے۔ دو برس قبل 'پِلاؤ' سے آنے والا تارپیڈو کا ایک چھوٹا سا بیڑا یہاں لنگر انداز ہوا تھا۔ سوع میسح کی قسم، وہ لوگ کیسا اکڑ اکڑ کر چلتے تھے، ملاحوں کا کھیل کھیلتے اور بیچاری چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو پاگل بنا دیتے تھے۔ شوئیمل بحریہ میں کیسے بھرتی ہوگیا، یہ بات مجھے بہت پُر اسرار لگتی تھی۔ وہ ڈریسڈن کا رہنے والا تھا،

اس پر دھیان رہے، بیٹا آسکر، کہ وہ ڈریسڈن کا رہنے والا تھا۔ تمھیں علم نہیں، تمھیں اندازہ نہیں ہو سکتا کہ کسی بحری سپاہی کے لیے ڈریسڈن سے ہونا کیا معنی رکھتا تھا۔"

میرے خیال میں ہربرٹ کے خیالات اس اچھے شہر 'ایلبے' پر ضرورت سے زیادہ مرکوز رہے تھے۔ان کو 'نیو فار واہر' کی طرف واپس لانے کے لیے میں نے ایک اور نشان کو دبایا تھا، اس کے خیال میں جو زیادہ اہم نہیں تھا۔

"اچھا۔ جیسا کہ میں کہہ رہا تھا، وہ تارپیڈو کشتی پر دوسرے درجے کا سگنل مین تھا۔بڑی بڑی باتیں کرتا تھا۔اس کا خیال تھا کہ جس دوران اس کی کشتی ڈرائی ڈاک میں رہے گی، وہ کسی اسکاٹ لینڈ والے سے دوستی کرلے گا۔اس نے اسکاٹ مین سے چیمبر لین کی، چھتریوں کی اور ایسی ہی قسم کی باتیں کرنی شروع کردی تھیں۔میں نے اس کو، اپنی عادت کے مطابق، ایسی باتوں سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا، اس لیے اور بھی کہ اسکاٹ لینڈ والا اس کی باتوں کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں پاتا تھا، اور میز پر شراب رکھے تصویریں پینٹ کیا کرتا تھا۔اس لیے میں اس کو سمجھایا کرتا تھا کہ اس بے چارے کو اکیلا چھوڑ دو، کہ تم اپنے گھر میں نہیں ہو، میں اس سے کہتا، کہ تم لیگ آف نیشنز کے مہمان ہو۔اس مرحلے پر اس نے مجھے 'پارکٹ ٹنگ جرمن' کہنا شروع کردیا تھا، اور یہ سب وہ Saxon لہجے میں کہا کرتا تھا۔اور فوراً ہی میں اسے ایک دو ہلکے مکّے مارتا، جو اس کو خاموش کردیتے تھے۔آدھ گھنٹے بعد میں ایک سکّہ تلاش کرنے کے لیے جھکا، جو گر کر، میز کے نیچے چلا گیا تھا، اور مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ میز کے نیچے اندھیرا تھا، کہ اس saxon نے اپنا pickpic نکالا اور میری جانب کردیا تھا۔"

ہنستے ہوئے، ہربرٹ نے اخبار کا صفحہ پلٹا اور کہا "اور یہ اسی کا نشان ہے"، اور اخبار کو بڑبڑ کرتی مدر ٹروزنسکی کی طرف بڑھا دیا اور اٹھنے کی تیاری کرنے لگا تھا۔ہربرٹ تیزی سے میز سے اٹھا اور قبل اس کے کہ وہ چل پڑتا، مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کس طرف جانے والا تھا، اور میں نے ایک سیاہ اور بنفشی نشان کو دبایا، جو تاش کے پتے کے برابر چوڑا تھا۔آپ ابھی تک دیکھ سکتے تھے کہ ٹانکے کہاں کہاں لگے تھے۔

"بیٹا! اب ہربرٹ کو جانا ہے، بقیہ میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔" مگر میں نے ایک بار پھر زور سے ایک نشان کو دبایا، اور شور مچانے لگا، تین سالہ بچے کی طرح، جو ہمیشہ کام آ جاتا ہے۔

"اچھا اچھا، صرف تمھیں خاموش کرنے کے لیے، مگر میں اس کو بہت مختصر کروں گا۔" ہربرٹ ایک بار پھر بیٹھ گیا۔ "وہ 1930 کے کرسمس کے دن تھے۔ بندرگاہ میں کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ سڑک کے کناروں پر بے کار کھڑے قلی شرطیں لگا رہے تھے کہ کون سب سے زیادہ دور تک تھوک سکتا ہے۔ آدھی رات کے مذہبی اجتماع کے بعد —— ہم ابھی شربت بنانے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ سڑک کے اس پار واقع گرجا گھر سے سویڈن اور فن لینڈ والے دوڑتے ہوئے نکلے، اور ہماری طرف بڑھے۔ مجھے ان کے تیور کا اندازہ ہو گیا تھا، مگر میں دروازے قریب کھڑا رہا، ان کے مقدس چہروں کی طرف دیکھتا اور سوچتا کہ وہ اپنے لنگر نما بٹنوں سے اس طرح کیوں کھلواڑ کر رہے ہیں۔ اور پھر وہ ٹوٹ پڑے، لمبے لمبے چاقو تھے اور مختصر رات تھی۔ اوہ، یہ سویڈن اور فن لینڈ والے آپس میں ہمیشہ یہی کرتے ہیں۔ مگر بدمعاش لوگوں سے ہربرٹ ٹروزنسکی کیوں الجھ پڑتا ہے، اللہ ہی جانے کیوں۔ شاید اس کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہو گیا تھا، اس لیے کہ کچھ ہو رہا تھا، اور ہربرٹ کو اس میں ضرور شامل ہونا تھا۔ میں ایسے وقت میں ضرور آپے سے باہر جاتا ہوں۔ اسٹاربُش مجھے دیکھ کر چلّایا، "ہربرٹ، ذرا سنبھل کے!" مگر مجھے تو اپنا نیک کام کرنا تھا۔ میں پادری کی مدد کو جانا چاہتا تھا، بے چارہ، حال ہی میں مالمو کے مدرسے سے فارغ ہو کر آیا تھا، اور سویڈن، فن لینڈ والوں کے ساتھ یہ اس کا پہلا کرسمس تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ میں اس کو اپنی امان میں لے لوں کہ وہ اپنے گھر صحیح سلامت پہنچ جائے۔ میرا ہاتھ اس کے کوٹ تک پہنچا ہی تھا کہ مجھے اپنی پشت پر کوئی ٹھنڈی چیز محسوس ہوئی، اور میں نے خود سے 'نیا سال مبارک' کہا تھا، حالاں کہ ابھی تو کرسمس کے دن تھے۔ میں اندر لایا گیا تو بار پر لیٹا ہوا تھا، اور میرا سرخ لہو بیئر کے گلاسوں میں مفت جا رہا تھا، جب کہ اسٹاربُش وہیں، اپنے مرہم پٹی کرنے والے بکس کے ساتھ موجود تھا، اور مجھے فرسٹ ایڈ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔"

مدر ٹروزنسکی اپنے جوڑے سے بُنائی کی سلائی نکالتے ہوئے چلّائی، "تمھیں

اچانک اس پادری سے کیا دل چسپی ہو گئی ہے، جب کہ بچپن کے بعد سے تم نے گرجا گھر میں قدم نہیں رکھا ہے۔''

ہربرٹ نے ہاتھ ہلا کر نارضامندی کا اظہار کیا، اس کی قمیص اور گیلس لٹک رہی تھی، اور وہ واش روم جا رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال سنجیدہ تھی، اور آواز بھی سنجیدہ تھی جس میں اس نے کہا تھا، ''اور یہ تھا وہ نشان۔'' وہ اس طرح چلا، جیسے کہ وہ آخری بار، اور ہمیشہ کے لیے گرجا گھر اور اس سے متعلق لڑائی سے دور جا رہا ہو، گویا واش روم ہی وہ جگہ ہے جہاں انسان آرام سے سوچ سکتا ہے۔

چند ہفتوں بعد میں نے ہربرٹ کو بالکل خاموش پایا تھا، اور اپنے نشانوں کے بارے میں بالکل بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بہت بیزار دکھائی دے رہا تھا، مگر اس کی پشت پر پٹی نہیں بندھی تھی۔ دراصل میں نے اس کو اپنی بیٹھک میں صوفے پر لیٹا پایا تھا، بجائے اس کے کہ وہ اپنے بستر میں لیٹا اپنے زخموں کو آرام پہنچاتا، وہ بہت شدید زخمی معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اسے گہرا سانس لیتے، خدا سے، مارکس اور اینگلز سے التجا کرتے، اور ایک ہی سانس میں ان پر لعنت بھیجتے بھی سنا تھا۔ وہ ہوا میں اپنا مکا چلاتا، اور پھر اس کو اپنے سینے پر گرنے دیتا تھا؛ ایک لمحے بعد ہی اس کا دوسرا مکا چلتا، اور وہ اپنے سینے کی کسی کیتھولک کی طرح پٹائی کرتا—— میری ہی غلطی ہے—— میں ہی قصوروار ہوں—— میں ناکام ہو گیا ہوں——

ہربرٹ نے لیتھویا کے ایک بحری کپتان کو مار ڈالا تھا۔ عدالت میں اس کو اس بنا پر چھوڑ دیا تھا کہ اس نے اپنے دفاع میں حملہ کیا تھا، جیسا کہ اس کاروبار میں عام طور پر ہوا کرتا ہے، مگر رہائی کے بعد بھی وہ لیتھویائی کپتان مرا ہی رہا تھا، اور یہ بات اس کے ذہن پر ایک ٹن اینٹوں کے طرح گری تھی، حالاں کہ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ کپتان بے چارہ مخنی انسان تھا اور پیٹ کی بیماری میں مبتلا تھا۔

ہربرٹ کام پر واپس نہیں گیا۔ اس نے استعفیٰ بھیج دیا تھا۔ اس کا افسر اسٹاربُش کئی بار اس سے ملنے آیا۔ وہ ہربرٹ کے پاس صوفے پر یا باورچی خانے کی میز پر مدر ٹروزنسکی کے ساتھ بیٹھا رہتا تھا۔ اپنے بریف کیس سے ہربرٹ کے لیے Stobbe کی سو

فی صد خالص جن کی بوتل نکالتا اور، فری پورٹ سے مدرٹروزنسکی کے لیے آدھا پاؤنڈ، بغیر بھنی ہوئی اصلی کافی لاتا تھا۔ وہ مدرٹروزنسکی کو اپنے بیٹے کو کام میں الجھانے پر زور دیتا تھا۔ مگر ہربرٹ ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا — وہ اب ویٹر کا کام نہیں کرنا چاہتا تھا، خاص کر بحری سپاہیوں کے گرجا گھر کے سامنے 'نیو فاروااٹر' میں تو بالکل بھی نہیں۔

در اصل اب تو وہ ویٹر کا کام بالکل ہی چھوڑ دینا چاہتا تھا، اس لیے کہ ویٹر ہونے کا مطلب ہے، آپ میں چاقو مار دیے جاتے اور آپ کے اندر چاقو کے داخل ہونے کا مطلب ہوتا کسی روز ایک لیتھویائی کپتان کی موت، محض اس لیے کہ آپ اس کو اپنے آپ سے دور رکھنا چاہتے تھے، کہ آپ لیتھویائی چاقو سے تمام فن لینڈ اور سویڈن، پولش، فری سٹی، اور جرمنی والوں اور ہربرٹ کی پیٹھ کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ''میں نیو فار واٹر' میں ویٹری کرنے کے بجائے جلد ہی کسٹم کے محکمے میں کام کروں گا'' ہربرٹ نے کہا تھا، مگر وہ کسٹم کے محکمے بھی کام کرنے نہیں گیا۔

# نی او بے

1938 میں کسٹم محصول میں اضافہ کردیا گیا تھا اور پولینڈ اور فری سٹی کے درمیان سرحدیں عارضی طور پر بند کردی گئی تھیں۔ میری نانی اماں چھوٹی لائن ریلوے سے لانگ فور مارکٹ نہیں جا سکتی تھی، اس لیے اس نے اپنا اسٹال بند کردیا تھا۔ اور بقول شخصے، اس کو اپنے انڈوں پر بیٹھنا پڑ گیا تھا، حالاں کہ ان میں سے بچے نکالنے کی خواہش نہیں تھی۔ بندرگاہ میں مچھلیوں کا انبار آسمان تک پہنچ گیا تھا؛ دوسرا بہت سارا سامان بھی جمع ہوگیا تھا؛ مدبرین نے آپس میں ملاقاتیں کیں اور مصالحت ہوگئی۔ اس دوران میرا دوست ہربرٹ صوفے پر لیٹا، بے روزگار، اپنے آپ سے برافروختہ، اپنی مشکلات پر تفکر کرتا رہتا تھا۔

ان سب کے باوجود کسٹم کا محکمہ تنخواہیں اور روٹیاں پیش کر رہا تھا۔ اس نے سبز رنگ کی وردیاں بھی پیش کی تھیں اور ایک سرحد بھی جس پر نظر رکھنی تھی۔ ہربرٹ کسٹم کے محکمے والوں کے پاس نہیں گیا، نہ ہی وہ ایک بار پھر ویٹر بننا چاہ رہا تھا؛ وہ تو صرف صوفے پر لیٹا فکر کرنا چاہتا تھا۔

مگر آدمی کو کام تو کرنا چاہیے۔ اور صرف مدر ٹروزنسکی کا ہی یہ خیال نہیں تھا۔ حالاں کہ اس نے اِسٹاربُش کی درخواست مسترد کر دی تھی کہ وہ ہربرٹ کو 'سی ووز' کی میزوں پر ویٹر کا کام کرنے پر راضی کرے، مگر وہ اس کو صوفے سے ضرور ہٹانا چاہتی تھی۔ ہربرٹ خود بھی اس دو کمروں کے فلیٹ سے اُکتا چکا تھا، اس کی فکر خالص سطحی ہوچکی تھی اور اس نے ایک دن Neueste Nachrichten میں اور بادلِ ناخواستہ ناسی اخبار

Vorposten میں بھی "مدد درکار ہے" کے اشتہارات دیکھنے شروع کر دیے تھے۔

میں اس کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ تو کیا ہربرٹ جیسے آدمی کو بندرگاہ میں اپنے پیشے کے علاوہ بھی کوئی کام تلاش کرنا چاہیے؟ کیا اس کو جہاز پر مال چڑھانے اتارنے، سڑی مچھلیاں دفن کرنے کی پستی تک گر جانا چاہیے؟ میں ہربرٹ کو 'موٹلاؤ' کے پلوں پر کھڑا بحری چڑیوں کی طرف تھوکتا اور تمباکو چبانے والا دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ ہربرٹ اور میں ایک شراکت داری قائم کر سکتے ہیں، یعنی ہفتے میں ایک بار دو گھنٹے کا غور و فکر، اور ہم آدمی بن جائیں گے۔ اس کی ہیرے جیسی آواز کی مدد سے، آسکر کی ذہانت کی تیزی اور اس میدان میں اس کا تجربہ، دُکانوں کی تجی کھڑکیاں کھول سکتا تھا، اور ساتھ ہی ان کی حفاظت بھی کر سکتا تھا، جب کہ ہربرٹ اپنی انگلیوں کی پھرتی بھی دکھا سکتا تھا۔ ہمیں نہ ویلڈنگ کرنے والے شعلے کی، نہ ہر قفل کھولنے والی کنجی کی اور نہ اوزار کی ضرورت تھی۔ نہ انگلیوں پر چڑھا کر مارنے والی پیتل کی گانٹھیں چاہییں تھیں، نہ آہنی تیر۔ بلیک ماریا، اور ہماری شراکت داری— دو مختلف دنیائیں جن کو یک جا ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ عطارد، چوروں اور تجارت کا خدا، ہم پر برکتیں نازل کرنے والا تھا، اس لیے کہ میں سنبلہ کے زیرِاثر پیدا، اس کی مہر کا حامل تھا، جو میں اکثر سخت اشیا پر ثبت کر دیا کرتا تھا۔

اس واردات کو آگے بڑھانے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ میں اس کے بارے میں مختصراً بات کروں گا، مگر میرے الفاظ کو اعتراف نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ ہربرٹ کی بے روزگاری کے عرصے کے درمیان ہم دونوں نے کھانے پینے کی اشیا کی دُکانوں میں، اور ایک بڑی دل چسپ— سموری دُکان میں— اوسط درجے کی نقب زنی کی تھی۔ ہاتھ آنے والے مالِ غنیمت میں تین عدد نیلے بکس، دریائی بچھڑے کی ایک کھال، ایرانی میمنے کی کھال کا بنا دستانہ، اور ایک نہایت خوب صورت اور قیمتی پونی کوٹ شامل تھا۔ جس چیز نے ہمیں نقب زنی کے کاروبار سے ہاتھ اٹھا لینے پر راضی کیا تھا، وہ صرف بے محل احساسِ جُرم ہی نہیں، ہاتھ آئے ہوئے مال کی فروخت کی مشکل بھی تھی جو ہمیں وقتاً فوقتاً پریشان کرتی رہتی تھی۔ اس مال کا بوجھ اتارنے کے لیے ہربرٹ کو واپس 'نیو واسر' جانا پڑتا

تھا، اس لیے کہ وہ ایسے کام کے لیے نسبتاً بہتر جگہ تھی، مگر وہ علاقہ اس کو پیٹ کے مریض لیٹویائی بحری کپتان کی یاد دلاتا تھا، اور وہ کوشش کرتا تھا کہ مال کو کسی اور جگہ، 'شیشاؤ گاسے' کے آس پاس، 'نبر گروائیبسن' میں، مختصراً یہ کہ، ہر جگہ سوائے 'نیو واسر' کے، ٹھکانے لگایا جائے، جہاں تموری اشیا مکھن کی طرح فروخت ہو جاتی تھیں۔ مال کے ٹھکانے لگانے کا عمل اتنا آہستہ چلتا تھا کہ کھانے کی بیشتر اشیا مدرٹروزنسکی کے باورچی خانے میں جگہ پاتی تھیں، اس لیے انھوں نے مدرٹروزنسکی کو ایرانی میمنے کی کھال کا دستانہ دینے کی کوشش کی تھی۔

جب مدرٹروزنسکی نے دستانہ دیکھا تو یہ سب محض مذاق نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے اشیائے خوردونوش کو اس عوامی عقیدے کی بنا پر قبول کر لیا تھا کہ ان کی چوری جائز ہوتی ہے، مگر دستانے کا مطلب عیاشی، اور عیاشی کا مطلب بدمعاشی، اور بدمعاشی کا مطلب جیل ہوتا تھا۔ مدرٹروزنسکی کے خیالات ایسے سادہ اور اتنے سخت تھے کہ اس نے چوہے جیسی آنکھ بنا کر، اپنے بالوں کے جوڑے سے بُننے والی ایک سلائی نکالی، اور سلائی کو ہلاتے ہوئے کہا: "تمھارا حشر بھی اپنے باپ جیسا ہوگا۔" اس کے ساتھ ہی ہربرٹ کو Neueste Nachrichten یا Vorposten اخبار تھما دیا، جس کا مطلب تھا، اب جاؤ اور کوئی ملازمت کرو؛ میرا مطلب ہے کوئی باقاعدہ ملازمت کرو ورنہ میں تمھارے لیے کھانا بھی نہیں پکاؤں گی۔

ہربرٹ نے ایک اور ہفتہ اپنے فکری صوفے پر لیٹے گزار دیا، وہ اپنی پیٹھ کے نشانات پر سوال جواب کے لیے، یا کسی دُکان کی کھڑکیوں کی سیر کے لیے ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہا تھا، میں نے اس کو اپنی اذیت کی انتہا تک سمجھنے کے لیے چھوڑ دیا تھا اور اپنا زیادہ تر وقت گھڑی ساز لاؤبشاد اور اس کی وقت خور گھڑیوں کے ساتھ گزارنے لگا تھا۔ میں نے تو موسیقار 'مین' سے بھی رشتے استوار کر لیے تھے، مگر اس نے شراب نوشی چھوڑ دی تھی اور اس نے اپنا بگل خاص کر ایسے راگوں کے لیے وقف کر دیا تھا جو Mounted SA والوں کو پسند تھے، جو نفاست سے وردی پہنتے اور اپنا کاروبار تیزی سے انجام دیتے تھے، جب کہ اس کی مقدار سے کم غذا پانے والی چاروں بے چاری بلیاں، جو موسیقی کے ایک نہایت شان دار عہد کی یادگار بن چکی تھیں، آہستہ آہستہ کتوں کے کام

آ گئیں۔ دوسری جانب، میں اکثر رات دیر سے گھر پہنچتا تو ماتسیرات کو، جو مما کی زندگی میں صرف دوستوں کا ساتھ دینے کے لیے پیا کرتا تھا، شراب کے جاموں کی قطار کے پیچھے پتھرائی ہوئی آنکھوں میں پاتا تھا۔ وہ تصویروں کے البم کی ورق گردانی کرتا، اور جیسا کہ اب میں بھی کرنے لگا ہوں، مما کو چھوٹے چھوٹے مستطیل فریموں میں ناکامیابی سے زندہ کرنے کی کوشش کرتا؛ آدھی رات کے قریب ماتمی انداز میں رہتا، اور پھر ہٹلر اور بیتھووِن کے انداز میں جوشیلے خطاب کرنے لگتا، جواب بھی دیوار پر ٹنگے ایک دوسرے کو مایوسی سے گھورتے تھے۔ اس جینئس سے جو، یاد رہے کہ بعد میں بہرا ہو گیا تھا، اسے جواب ملتے محسوس ہونے لگتے تھے، جب کہ الکحل سے مکمل طور پر پرہیز کرنے والا فیوہرر خاموش رہتا تھا، اس لیے کہ ماتسیرات، ایک بلا نوش، Providence کسی تحریک کی رہنمائی کے قابل نہیں رہ گیا تھا۔

ایک منگل — اپنے نقارے کی طفیل میری یادداشت کتنی صحیح ہے — ہربرٹ نے بالآخر کچھ سوچ لیا تھا۔ اس نے اپنا نیلے رنگ کا بیل باٹم پتلون پہنا، ایک گلاس کولڈ کافی چڑھائی، اپنے اسپورٹس جوتے پہنے، لنگر کے بٹنوں والی جیکٹ زیبِ تن کی، فری پورٹ والے ریشمی اسکارف پر کولون خوش بو چھڑکی جو فری پورٹ کی ڈیوٹی فری دکان کے ڈھیر پر پڑی پڑی پختہ ہو چکی تھی، سر پر اپنی نیلے رنگ کی دھوپ کی ٹوپی جمائی، اور جانے کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا۔

"میں آج ملازمت کی تلاش میں جا رہا ہوں۔" ہربرٹ نے اپنی دھوپ والی ٹوپی کو ہلکا سا بے ادب خم دیتے ہوئے اعلان کیا۔ مدر ٹروزنسکی کے ہاتھ سے اخبار چھوٹ کر میز پر گر پڑا۔

دوسرے دن، ہربرٹ کو ملازمت اور وردی مل گئی تھی۔ یہ کسٹم والوں کی سبز نہیں بلکہ گہرے بھورے رنگ کی وردی تھی؛ کہ وہ بحری عجائب گھر کا چوکی دار بن گیا تھا۔

ہر اس شے کی طرح جسے اس شہر میں محفوظ رکھا جانا چاہیے تھا، بحری عجائب گھر میں وہ سارا خزانہ محفوظ کیا گیا تھا، جو کسی نواب کے محل میں واقع تھا جس میں پتھر کا ایک اونچا سایہ آمدہ بنا ہوا تھا، اور عمارت کا چہرہ نقش و نگار سے مزین تھا۔ اس کا اندرون، جس میں گہرے رنگ کی شاہ بلوط کی لکڑی سے بنی پیچ دار سیڑھیاں تھیں، ہمارے شہر کی احتیاط سے کیٹلاگ کی ہوئی تاریخ کے لیے وقف تھا، جو غریب ہم سایوں کے درمیان ہمیشہ ترقی

پانے والی متعفن عمارت کی یادگار تھی۔اُف! وہ قدیم لیوتانی، المانوی سورماؤں سے یا شاہانِ پولینڈ سے خریدی ہوئی، تفصیل سے بیان کی ہوئی، تفصیلی دستاویزی مراعات۔ دریائے 'وسٹولا' کے دہانے پر بنے قلعے سے شروع ہونے والی بے شمار عسکری چڑھائیوں کے وہ رنگین نقوش۔ وہیں، شہر کی دیواروں کے درمیان 'سٹینیس لا لیزنسکی' ایستادہ نظر آتا ہے، جرمن بادشاہ، جو مخالفین کو چھوڑ کر بھاگ آیا تھا۔ اس آئل پینٹنگ سے صاف نظر آتا ہے کہ وہ کتنا خوف زدہ تھا۔ 'پرائمیٹ پوٹوکی' اور فرانسیسی سفیر 'ڈی مونٹی' بھی خوف زدہ نظر آتے ہیں، اس لیے کہ جنرل لاسی کی کمان میں روسی فوج شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھی۔ ان تمام مناظر پر نہایت ورق کے ساتھ نشانات لگے ہوئے ہیں، اور fleur-de-lys جھنڈے کے نیچے فرانسیسی جہازوں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ تیر کا ایک نشان ایک واقعے کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس جہاز پر بادشاہ 'سٹینیس لا لیزنسکی'، 'لورین' بھاگ گیا تھا جب اگست کی تیسری تاریخ کو شہر نے ہتھیار ڈال دیے تھے، مگر زیادہ تر نمائشی اشیا میں وہ انعامات بھی تھے جو جنگ کے دوران جیتے گئے تھے، صرف اس لیے کہ ہاری ہوئی جنگیں عجائب گھروں کو انعامات فراہم نہیں کرتیں۔

اس کی سب سے اہم شے ایک نشان تھا جو فلورنس اطالیہ کے ایک بادبانی جہاز سے لایا گیا تھا، حالاں کہ اس کی اپنی بندرگاہ 'بروجس' میں تھی، مگر یہ فلورنس کے تاجروں 'پورٹناری' اور 'تانی' کی ملکیت تھا۔ اپریل 1473 میں ڈانسنگ شہر کے کپتانوں اور قزاقوں 'پال بینیکے' اور 'مارٹن باروے وِک' نے اس بادبانی جہاز کو نیوزی لینڈ کے ساحل کے قریب، جو 'سلوئس' سے زیادہ دور نہیں تھا، گرفتار کر لیا تھا۔ اس کے کپتان، افسران اور ملاحوں کو تہ تیغ کر دیا گیا اور جہاز کو ڈانسنگ لایا گیا تھا۔ 'میملنگ' کے ہاتھوں لکھا ہوا ''آخری فیصلہ'' اور سنہرے حروف میں لکھا ہوا پتسمہ، جسے 'کوتانی' نے فلورنس کے ایک کلیسا کے لیے لکھوایا تھا، 'مرین کرشتے' کے ایک گھر سے دریافت ہوا تھا؛ جہاں تک میں جانتا ہوں، آج یہ ''آخری فیصلہ'' پولینڈ کے کیتھولک افراد کی آنکھ کا تارہ ہے۔ یہ پتا نہیں چلا کہ جنگ کے بعد اس نشان کا کیا حال ہوا تھا، مگر میرے زمانے میں وہ بحری عجائب گھر میں موجود تھا۔

نہایت نفیس لکڑی سے بنی، ایک عورت، جوان اور برہنہ، اپنے بازو اٹھائے ہوئے، اور اس لاپروائی کے انداز میں اس طرح ہاتھ باندھے ہوئے کہ اس کی ہر ایک انگلی واضح ہو، اور اس کی اندر کو دھنسی ہوئی زردی مائل آنکھیں، آگے کو نکلی ہوئی چھاتیوں سے پرے گھورتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ یہ عورت، یہ نشان [جہاز کے لیے] تباہی لانے والی تھی۔ اس مجسمے کو تاجر 'بورنٹاری' نے ایک مجسمہ ساز سے بنوایا تھا جو اس قسم کے نشانات بنانے کے لیے مشہور تھا؛ اس کے لیے 'بورنٹاری' کی ایک خوب صورت قریبی دوست لڑکی ماڈل بنی تھی۔ اس لڑکی کے علاوہ خال خال ہی اس قسم کی جوان لڑکیوں کو بادبانی جہازوں کے مستول کے نیچے جگہ ملتی تھی، اور جیسا کہ رواج تھا، اس پر جادوگری کا مقدمہ چلا تھا۔ جلا دینے سے پہلے کیے جانے والے سوال جواب کے دوران اس نے اپنے مہربان، فلورنس کے تاجر کو، اور اس مجسمہ ساز کو جس نے اتنے ماہرانہ انداز میں اس کے جسم کی پیمائش کی تھی، موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آگ کے خوف سے 'بورنٹاری' نے گلے میں پھندا لگا کر خودکشی کر لی تھی، اور مجسمہ ساز کے دونوں ہنرمند ہاتھ اس لیے کاٹ دیے گئے تھے کہ وہ آئندہ کبھی جادوگرنیوں کی جہاز کی نشانیوں میں قلبِ ماہیت نہ کر سکے۔ ابھی 'ہروجس' میں مقدمہ چل ہی رہا تھا، جس سے خاصی ہلچل مچی ہوئی تھی، اس لیے کہ 'بورنٹاری' دولت مند آدمی تھا، کہ وہ جہاز جس پر یہ نشان لگایا گیا تھا 'پال بے نیکے' کے قزاقانہ ہاتھوں میں چلا گیا تھا۔ دوسرے تاجر 'تانی' صاحب ایک قزاق کے گنڈاسے کا شکار ہوئے۔ 'پال بے نیکے' دوسرا شکار بنا تھا؛ چند برس بعد اسے آبائی شہر کے شرفا کی ناراضی کے باعث 'سٹاک ٹرم' کے احاطے میں پانی میں ڈبو کر مار دیا گیا تھا۔ 'بے نیکے' کے انتقال کے بعد جن جہازوں میں یہ نشان لگایا جاتا تھا ان میں آگ بھڑک اٹھتی تھی، اور یہ آگ دوسرے جہازوں کو بھی لپیٹ میں لے لیتی تھی؛ ہر شے آگ میں بھسم ہو جاتی تھی سوائے اس نشان کے، جس پر آگ اثر نہیں کرتی تھی اور، اس کے کیسے دل رُبا خطوط تھے، کہ اسے ہمیشہ کوئی نہ کوئی جہاز کا مالک مل ہی جاتا تھا۔ اور جوں ہی یہ عورت کسی جہاز پر جگہ پاتی تھی، اس پر نافرمانی شروع ہو جاتی تھی، اور وہ ملاح جو ہمیشہ پُرامن ہوتے تھے، ایک دوسرے کو قتل کر دیتے تھے۔ بے حد

ہنرمند 'ہیبر بارڈ فربرز' کی سربراہی میں 1522 میں چلنے والی وائٹنگ کے بیڑے کی ناکامیاب ڈینش مہم فربرز کے زوال اور شہر میں خوں ریز شورش کا باعث ہوئی۔ یہ سچ ہے کہ تاریخی کتابیں مذہبی اتھل پتھل کی گواہی دیتی ہیں—1523 میں ایک پروٹسٹنٹ پادری نے، جس کا نام 'ہینگے' تھا، بُت شکنی کی مہم میں شہر کے سات 'پیرش' کلیساؤں پر چڑھائی کر دی تھی— مگر ہم لوگوں نے اس تباہی کی، جس کے اثرات آنے والے برسوں میں بھی محسوس کیے گئے تھے، ذمے داری اس نشان پر ڈال دی تھی: ہر واقعے کے بعد یہی کہا جاتا رہا ہے کہ یہ اسی سبز قدم عورت کی وجہ سے ہوا ہے جو 'فربرز' کے جہاز کی زینت بنی تھی۔

پچاس برس بعد جب اِسٹیفن باتوری' نے شہر کا بے مقصد محاصرہ کیا تھا، 'اولیوا' خانقاہ کے راہب نے اپنے استغفار کے خطابات میں سارا الزام اسی عورت کے سر دھر دیا تھا۔ پولینڈ کا بادشاہ، جس کو شہر نے اِس کا تحفہ دیا تھا، اس کو اپنے پڑاؤ میں لے گیا تھا اور اِس نے غلط مشورے دیے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ چوبی خاتون شہر کے خلاف سوئیڈن والوں کی مہمات پر کس حد تک اثر انداز ہوئی تھی، اور مذہبی تعصب پسند ڈاکٹر 'ایگی ڈی یُس استراؤخ' کی اسیری میں اس کا کیا کردار تھا جس نے سوئیڈن والوں سے مل کر سازش کی تھی کہ اِس سبز قدم عورت کو، جو اس دوران شہر میں داخل ہو گئی تھی، جلا دیا جائے۔ ایک اور مبہم سی خبر ملی ہے کہ 'اوپٹز' نام کے ایک شاعر کی، جسے چند برس کے لیے اس شہر میں پناہ دی گئی تھی، اپنے وقت سے پہلے ہی موت واقع ہو گئی تھی، اسے دو چھتی میں ایک خستہ حال چوبی مجسمہ ملا تھا، اور اس نے اس کے اعزاز میں ایک نظم لکھنے کی کوشش کی تھی۔

صرف اٹھارہویں صدی کے اختتام کے قریب، جب پولینڈ کے ٹکڑے کیے گئے تھے، اس کے خلاف مؤثر اقدامات کیے گئے تھے۔ پروشیائیوں نے، جنھوں نے اسلحے کے بل پر شہر پر قبضہ کر لیا تھا 'نی اوبے' چوبی مجسمے کے خلاف ایک شاہی پروشیائی فرمان جاری کیا تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ سرکاری دستاویز میں اس کا نام درج کیا گیا تھا، اور ساتھ ہی اس کو شہر بدر کر دیا گیا تھا، یا شاید، 'اِسٹاک ٹرم' کے احاطے میں، جہاں 'پال بے نیکے' کو پانی میں ڈبو کر مارا گیا تھا، جلا دیا گیا تھا۔ یہ وہی جگہ ہے میں نے جس کی گیلری میں سب سے

پہلے اپنے دور رس گانے کے اثرات آزمانے کی کوشش کی تھی۔ شاید، انسانی اختراع پسندی کے باعث، میں جس کے بارے میں بہت کچھ کہہ چکا ہوں (اس لیے کہ اس کو عقوبت خانے میں ڈال دیا گیا تھا)، انیسویں صدی کے دوران وہ اپنے کام میں مشغول رہی تھی۔

جب میں 1935 میں اِسٹاک ٹرم پر چڑھا تھا اور اپنی آواز سے میں اشٹاٹ تھیئٹر کی کھڑکیوں پر عذاب بن گیا تھا، اس وقت 'نی اوبے' "سبز قدم لُّی کی بچی" کے نام سے مشہور ہو چکی تھی، اور خدا کا شکر ہے کہ اس کے بعد سے، وہ مینار کے عقوبت خانے سے ہٹا دی گئی تھی۔ کون جانے کہ اس عمارت کے نیو کلاسکی چہرے پر میرا حملہ کامیاب ہوتا بھی یا نہیں؟

یہ کسی نادان عجائب گھر کے ڈائرکٹر کا کام رہا ہوگا، اس شہر کے لیے جو اجنبی تھا، جس نے 'نی اوبے' کو عقوبت خانے سے نکالا تھا، جہاں اس کی بُرائی قابو میں تھی اور فری سٹی کی بنیاد گزاری کے فوراً بعد ہی اسے بحری عجائب گھر میں سجا دیا گیا تھا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی اس غریب کی، خون میں زہر کی آمیزش سے موت ہو گئی تھی۔ شاید اس ضرورت سے زیادہ مذہبی متعصب کے، یہ لکھ کر لگا دینے سے کہ نمائش کے لیے رکھا ہوا نسوانی مجسمہ 'نی اوبے' کا نام لیے جانے پر جواب دیتا تھا، اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ اس کے بعد آنے والے ڈائرکٹر نے، جو شہر کی تاریخ سے واقف ایک محتاط آدمی تھا، اس مجسمے کو وہاں سے ہٹانا چاہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ 'لوبِک' نامی شہر کو یہ خطرناک چوبی لڑکی تحفے میں دے دے، اور چوں کہ اس شہر کے لوگوں نے اس تحفے کو لینے سے انکار کر دیا تھا، اسی لیے دریائے 'ٹریو' پر واقع یہ چھوٹا سا شہر، سوائے اینٹوں سے بنے گرجا گھروں کے، جنگ کے باعث ہوائی حملوں کی زد میں آیا تھا، تو اس کو خراش تک نہیں آئی تھی۔

اس طرح 'نی اوبے'، یا "سبز قدم لُّی کی بچی" بحری عجائب گھر ہی میں رہی اور، چودہ برس کے مختصر عرصے میں تین ڈائرکٹروں کی موت کی ذمے دار بنی — ان محتاط ڈائرکٹروں کے علاوہ جنھوں نے وہاں سے اپنے تبادلے کرا لیے تھے — کہ اس کے قدموں پر ایک بوڑھا پادری مر گیا تھا، انجینئرنگ اسکول کے دو طالب علم متشدد انجام پا چکے تھے، اور سینٹ پیٹرز اسکول کے دو گریجویٹ طالب علم بھی جو آخری امتحان سے فارغ

ہو چکے تھے؛ عجائب گھر کے چار دیانت دار ملازم ختم ہو گئے تھے، جن میں سے تین شادی شدہ تھے۔ سب کے، انجینئرنگ کے طالب علم سمیت، چہرے مسخ تھے اور ان کی سینوں میں ایسی نوکیلی اشیا پیوست تھیں جو عام طور پر بحری عجائب گھر میں پائی جاتی ہیں: ملاحوں کے چاقو، تختے لگانے والے آنکڑے، آبی نیزے، گولڈ کوسٹ کی بنی نیزے کی انی، بادبان سینے کے سوئے، ان میں سے آخری طالب علم کو جیبی چاقو اور اس کے بعد اسکول کے پرکار سہنے پڑے تھے، اس لیے اس کی موت کے ذرا پہلے عجائب گھر کی تمام نوکیلی اشیا کو یا تو زنجیر میں باندھ دیا گیا تھا یا شیشے کے پیچھے رکھ دیا گیا تھا۔

حالاں کہ ہر معاملے میں پولیس اور 'کاروزنر' نے بد قسمت خودکشی کی باتیں کی تھیں، شہر میں ایک افواہ یہ پھیلی ہوئی تھی، جس کی بازگشت اخباروں میں بھی سنائی دی تھی، کہ "سبز قدم ملّی یہ سب اپنے ہاتھوں سے کرتی ہے۔" 'نی اوبے' پر سنجیدگی سے شبہ کیا جا رہا تھا کہ اس نے اتنے آدمیوں کو اور لڑکوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ بحث کا کوئی انت نہیں تھا۔ اخبارات نے نی اوبے کے بارے میں اپنے قارئین کی رائے کے لیے کالم وقف کر دیے تھے۔ شہری حکومت نے غیر متوقع توہمات کی باتیں کی تھیں اور کہا تھا کہ جب تک کوئی ثبوت نہیں مل جاتا کہ اس میں واقعی کوئی بدی شامل رہی ہے، اس کی جانب سے کوئی قدم نہیں اٹھایا جائے گا۔

اس طرح وہ سبز قدم شے بحری عجائب گھر کی سب سے اہم شے بنی رہی، اس لیے اور بھی کہ 'اولیوا' کے عجائب گھر نے، 'فلائنز گاسے' کے شہری عجائب گھر نے، اور Artushof کی انتظامیہ نے اس کو اپنی چار دیواری کے اندر قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

عجائب گھر میں کام کرنے والوں کی کمی ہو گئی تھی اور اس میں کام کرنے والے اکیلے نہیں تھے جو اس چوبی لڑکی سے غیر متعلق رہنا چاہتے تھے۔ عجائب گھر دیکھنے آنے والے بھی زرد آنکھوں والی خاتون کے کمرے میں جانے سے گریزاں تھے۔ کافی دنوں تک ان کھڑکیوں کے پیچھے خاموشی رہی جو اس مجسمے کو عمودی روشنی فراہم کرتی تھیں۔ ہر طرف گرد جمع ہو گئی تھی۔ صفائی کرنے والی عورتوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔ فوٹو گرافروں میں سے بھی ایک کی، جو پہلے بہت بے باک ہوتے تھے، 'نی اوبے' کی تصویر اتارنے کے فوراً بعد موت

واقع ہو گئی تھی؛ اگر چہ موت فطری تھی، پھر بھی اس کے ساتھی دو اور دو چار ہی کر رہے تھے۔ انھوں نے فری سٹی کے اخباروں کو، پولینڈ، جرمنی، حتیٰ کہ فرانس والوں کو بھی اس قائم نشانی کی مشابہت فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور اپنے کاغذات سے 'نئی ادب' کے اندراج تک کو خارج کر دیا تھا۔ اس کے بعد سے ان کی تصویر سازی صدور، وزرائے اعظم، اور جلا وطن بادشاہوں کی آمد و رفت، قومی کانگریس پارٹی کے اجتماعات، موٹر کاروں کی دوڑ اور موسمِ بہار کے سیلابوں تک محدود ہو گئی تھی۔

کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی جب ہربرٹ ٹروزنسکی نے، جو مزید ویٹری نہیں کرنا چاہتا تھا، اور کسٹم کی نوکری کے سخت خلاف تھا، عجائب گھر کے کارکنوں کی چوہے جیسے بھورے رنگ کی وردی پہن کر اس کمرے کے دروازے کے باہر، چمڑے سے بنی گدے کی کرسی پر براجمان ہو گیا تھا جس کو ''ٹُلی کی بچی'' کا کمرہ کہا جاتا تھا۔

اس کی ملازمت کے پہلے دن میں اس کے پیچھے پیچھے ٹرام گاڑی کے 'میکس-ہالبے- پلاٹز' اسٹیشن تک گیا تھا۔ میں اس کے بارے میں سخت پریشان تھا۔

''آسکر بیٹا، گھر واپس جاؤ۔ میں تمھیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔'' مگر میں وہیں اپنے نقارے اور چوب نقارہ کے ساتھ اتنی ثابت قدمی سے کھڑا رہا کہ ہربرٹ نے ترس کھا کر کہا، ''اچھا، ٹھیک ہے، تم میرے ساتھ ہائی گیٹ تک آ سکتے ہو، مگر اس کے بعد تم ٹرام میں بیٹھ کر واپس چلے جاؤ گے، اچھے بچوں کی طرح۔'' ہائی گیٹ پہنچ کر میں نے پانچ نمبر ٹرام کار پر سوار ہونے سے انکار کر دیا، جو مجھے گھر واپس لے جاتی۔ ایک بار پھر، ہربرٹ نے نرمی دکھائی؛ کہ میں 'ہائیلیگے-گائیسٹ-گاسے' تک جا سکتا تھا۔ عجائب گھر کی سیڑھیوں تک اس نے مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش کی تھی۔ پھر ایک لمبا سانس لیتے ہوئے اس نے میری لیے بچوں کے داخلے والا ٹکٹ خرید لیا۔ یہ سچ ہے کہ میں چودہ برس کا ہو چکا تھا، اور داخلے کا پورا ٹکٹ لینا چاہیے تھا، مگر جو لوگ نہیں جانتے تھے ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

ہمارا دن بہت خوش گوار اور پُر سکون گزرا تھا۔ نہ دیکھنے والے تھے نہ انسپکٹر۔ اِدھر اُدھر میں تھوڑی دیر کے بعد نقارہ بجا لیتا؛ ہربرٹ تھوڑی دیر سو لیتا۔ 'نئی ادب' اپنی زردی مائل

آنکھوں سے دنیا کو دیکھ رہی تھی، اور ابھرے ہوئے سینے کے ساتھ ایسے ہدف کی طرف بڑھ رہی جو ہمارا ہدف نہیں تھا۔ ہم نے اس پر کوئی توجہ نہیں کی۔ ''وہ میرے مطلب کی نہیں'' ہربرٹ نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس پر چڑھی ہوئی چربی دیکھو، ذرا اس کی دہری ٹھوڑی دیکھو۔''

اس نے اپنا سر ذرا سا خم کیا اور سوچتے ہوئے کہا، ''اور ذرا اس کے، پورے گھر کی کپڑوں کی الماری جیسے، عقب پر نظر ڈالو۔ ہربرٹ کا ذوق نفیس و نازک، دل کو لبھانے والی خواتین کا تمنائی ہوتا ہے۔''

میں ہربرٹ کے ذوق کی تفصیل غور سے سن رہا تھا، جب وہ اپنے بیلچے جیسے ہاتھوں سے صنفِ نازک کی ایک لچک دار خوب صورت شخصیت کا نقشہ پیش کر رہا تھا، جو اس کے نزدیک نسوانیت کا معیار تھا۔

عجائب گھر میں ہماری موجودگی کے تیسرے دن، ہم نے دروازے کی قریب رکھی ہوئی کرسی سے ہٹ کر بھی دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ کمرے کی صفائی کے بہانے— جو واقعی بہت بُری حالت میں تھا— ہم خاک جھاڑتے، دیواروں پر لگے صنوبر کے تختوں پر سے مکڑی کے جالے ہٹاتے، اس سبز قدم چوبی جسم کی طرف بڑھ رہے تھے جو سورج کی کرنوں سے روشن ہو رہا تھا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ 'ٹی او بی' نے ہمارے جسم میں کسی قسم کی کپکپی پیدا کر دی تھی۔ اس کے کشش پیدا کرنے والے جسم کے حصے زیادہ بھاری نہیں تھے، نہ وہ ان کو آگے بڑھا کر پیش کرنے کے لیے پیچھے کی جانب جھکی ہوئی تھی، مگر ہم اس پر حریص نظریں نہیں ڈال رہے تھے، بلکہ ہم تو اس کا گہری نظر رکھنے والے کسی مبصر کی طرح جائزہ لے رہے تھے، جو ہر قسم کی تفصیل کا حساب رکھتا ہے۔ میں اور ہربرٹ دونوں جمال و سنجیدہ خصال پسند، اور تجریدی حسن کے متوالے تھے۔ ہم اس کے نسوانی خطوط کو اپنے معیارات سے جانچ رہے تھے۔ 'ٹی او بی' کی رانیں، اس کے قد کی دوسری پیمائشوں سے تناسب کے مقابلے میں قدرے چھوٹی تھیں۔ ورنہ اس کا پیڑو، کاندھے اور سینے کا ملندیزی اور یونانی معیار سے تقابل کیا جا سکتا تھا۔

ہربرٹ نے شرارتی انداز میں اپنا انگوٹھا جھکاتے ہوئے کہا، ''میرا بستر اور اُس

میں اس کی موجودگی، دیکھنے والا منظر ہوگا، مگر ہربرٹ 'اوہرا' اور 'فار واہر' میں بہت کشتیاں لڑ چکا ہے۔ اس کو عورت کی ایسے کام کے لیے ضرورت نہیں۔ ہربرٹ پہلے ہی بہت کچھ سیکھ چکا تھا۔ اوہ، اگر یہ ذرا دُبلی ہوتی، ایسی نازک جس کو ہاتھ لگانے سے دو ٹکڑے ہو جانے کا خدشہ ہو، تو ہربرٹ کے لیے کوئی مضائقہ نہیں ہوتا۔"

دراصل، سچ پوچھا جائے تو ہمیں 'نئی اوبے' یا اس کی پہلوانی ساخت سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ ہربرٹ اچھی طرح جانتا تھا کہ برہنہ یا نیم برہنہ خواتین کے جس درجے کے حالات و سکنات اسے پسند یا ناپسند تھے، وہ خوب صورت اور توانا، دُبلے پتلے جسم والیوں تک ہی محدود نہیں ہوتے؛ ایسی نازک، دبلی پتلی خواتین بھی ہوتی ہیں جو ایک لمحے کے لیے بھی سکون سے لیٹ نہیں سکتیں، اور کنستر جیسی موٹی عورتیں بھی ہوتی ہیں، جو خاموش بہتی ہوئی نہروں سے زیادہ لہریں پیدا نہیں کر سکتیں۔ ہم نے قصداً ہر شے کو آسان سمجھ کر مسئلے کو دونوں پہلوؤں سے دیکھ کر 'نئی اوبے' کی تضحیک کی تھی۔ ہم نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ ہربرٹ نے مجھ کو گود میں اُٹھا کر بلند بھی کیا تھا تاکہ میں اس کی چھاتیوں کو اپنی چوبِ نقارہ سے بجا سکوں، اور نقارہ نوازی کرتے ہوئے اس کو اس کی خاک دھول سے پاک کر سکوں جو اس کے جسم میں دیمک کے خالی سوراخوں سے نکل کر اس پر بیٹھ گئی تھی۔ اپنی نقارہ نوازی کے دوران ہم اس کی زردی مائل آنکھوں میں بھی جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ ان میں نہ کوئی لرزہ تھا نہ کوئی پھڑکن؛ آنسوؤں کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کی آنکھیں نفرت اگلتے ہوئے شگافوں کی صورت تنگ نہیں ہوئی تھی۔ پورا کمرہ، اور اس کی ہر شے، ان پالش کیے ہوئے سُرخی مائل، ذرا زیادہ زرد آنسو کے قطروں میں جھلک رہا تھا۔ زردی ہمیشہ گمراہ کن ہوتی ہے، یہ ہر کوئی جانتا ہے۔ ہم بھی زیباشی گوند کے ان معصومانہ طرز کے قطروں کی بے اعتباری سے واقف تھے۔ پھر بھی، اپنی مردانہ سخت و نرم نظروں کے میکانیکی انداز سے ہم 'نئی اوبے' کے بظاہر لاتعلق نسوانی انداز کو اپنے حساب سے دیکھ رہے تھے۔ ہم خود کو محفوظ سمجھ رہے تھے۔ نہایت ظالمانہ انداز میں ہربرٹ نے اس کے گھٹنے میں ایک کیل ٹھونک دی تھی۔ ہر ضرب پر مجھے اپنے گھٹنوں میں درد محسوس

ہوا تھا، مگر اس کی پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ اس کے سامنے ہم دونوں ہر قسم کی دھینگا مشتی میں مصروف رہے تھے۔ ہربرٹ نے برطانوی ایڈمرل کی وردی پہن لی، آنکھوں سے ایک spyglass لگالیا اور ایڈمرل کی ہیٹ لگا لی۔ سُرخ رنگ کی صدری، اور وِگ لگا کر میں نے ایڈمرل کے pageboy کا روپ بھر لیا۔ ہم نے ٹرافالگر جنگ کا کھیل شروع کردیا، کوپن ہیگن پر بمباری کی، Aboukir کے قریب نپولین کے بحری بیڑے کو تتر بتر کر دیا، کبھی اس راس کو، کبھی اُس راس کو گول بنا دیا، ہم کبھی تاریخی طرز اختیار کرتے اور کبھی عصری انداز۔ یہ سب کچھ 'نی اوبے' کی نظروں تلے ہو رہا تھا جو، کسی ولندیزی چڑیل کے، جسمانی تناسب میں بنائے ہوئے، چوبی نشان کی صورت، گھڑی گئی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ اگر وہ ہمیں دیکھ رہی تھی تو نہایت لاپروائی سے دیکھ رہی تھی۔

آج ہمیں معلوم ہوا تھا کہ ہر شے دیکھتی ہے، اور ایسی کوئی شے نہیں جو دیکھی نہ گئی ہو، حتیٰ کہ دیوار پر لگائے جانے والے کاغذ کی یادداشت بھی ہم سے اچھی ہوتی ہے۔ صرف خدا ہی اپنی جنت میں سب کچھ نہیں دیکھتا۔ باورچی خانے کی میز، کوٹ ہینگر، آدھا بھرا ہوا سگریٹ کا راکھ دان، یا 'نی اوبے' نامی عورت کی ہو بہو نقل بھی، ہماری ناقابلِ فراموش حرکات کی گواہی کی خدمات انجام دے سکتی ہے۔

ہم دو ہفتے یا اس سے کچھ زیادہ دن بحری عجائب گھر میں کام کرنے آئے تھے۔ ہربرٹ نے مجھے دوبارہ نقارہ خرید کر دیا اور دو ہفتے وار تنخواہ مدرڑ وِنسکی کو دی تھی، جس میں خطرے کے عالم میں کام کرنے کا بونس بھی شامل تھا۔ ایک بار منگل کے دن، عجائب گھر کے خازن نے بچوں کا ٹکٹ فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے کہ دوشنبے کے دن عجائب گھر بند تھا؛ بلکہ اس نے تو میرا داخلہ تک بند کر دیا تھا۔ ہربرٹ نے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ قدرے تُرش روئی سے، کسی قسم کی خیر خواہی کے بغیر، خازن نے ہمیں بتایا تھا کہ لوگوں نے شکایت کی ہے کہ عجائب گھر میں بچوں کا داخلہ بند کر دیا جانا چاہیے؛ ایک چھوٹے بچے کا والد اس فیصلے کے خلاف تھا؛ خازن کو ٹکٹ گھر کے پاس میرے انتظار کرنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، اس لیے کہ وہ رنڈوا تھا مگر کاروباری انسان ہونے کے

باعث اس کے پاس میری دیکھ بھال کے لیے وقت نہیں تھا، مگر وہ مجھے اس Kitten's Parlor میں مزید دیکھنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے کہ میں غیر ذمے دار تھا۔

ہربرٹ اس بات پر راضی ہو گیا تھا مگر میں اس کو پریشان کرتا رہا۔ ایک طرف تو اسے اتفاق تھا کہ خازن حق بجانب تھا، اور دوسری طرف اس کا کہنا تھا کہ میں اس کی بابرکت نشانی، اس کا محافظ فرشتہ تھا کہ میرا بچپنا اور معصومیت اس کی حفاظت کرے گا۔ مختصر یہ کہ ہربرٹ خازن کا دوست بن گیا تھا، اور "آخری بار"، میرے داخلے کی اجازت لینے میں کامیاب ہو گیا تھا، اور یہ بحری عجائب گھر والوں سے اس کا وعدہ تھا۔

ایک بار پھر میرا دوست، ہاتھ تھامے ہوئے مجھے عجائب گھر میں لے گیا، اور اس خوب صورت چکر دار سیڑھیوں سے ہوتا ہوا مجھے دوسری منزل تک لے گیا، جہاں 'ٹی او بے' کا قیام تھا۔ وہ صبح بہت پُر سکون، اور دوپہر اس سے بھی زیادہ پُر سکون تھی۔ ہربرٹ پیلے چمڑے کے گدے والی کرسی پر، جس میں پیلے رنگ کی گھنڈیاں لگی تھیں، اپنی نیم باز آنکھیں لیے بیٹھ گیا تھا۔ میں اس کے قدموں میں بیٹھا ہوا تھا۔ میرا نقارہ بھی خاموش تھا۔ ہم صنوبر کے تختے لگی چھت سے لٹکے تباہ کن بحری جہازوں، بادبانی جہازوں، توپ بردار جہازوں، تجارتی جہازوں یک مستولی جہازوں، ساحلوں سے قریب چلنے والی بادبانی کشتیوں کو موافق ہواؤں کا انتظار کرتے دیکھ رہے تھے۔ ہم بھی ایک ماڈل بیڑے کے قریب بیٹھے تازہ ہوا کا انتظار کر رہے تھے، اور پارلر کا خاموش مگر غالب ماحول ہمیں خوف زدہ کر رہا تھا۔ یہ سب ہم اس لیے کر رہے تھے کہ ہم 'ٹی او بے' کی جانب دیکھ دیکھ کر اسے خوف زدہ نہ کر دیں۔ ہم اس امر کی اجازت نہیں دینے والے تھے کہ اس سبز چوب کو اندر ہی اندر کیڑے کھا ڈالیں، کہ 'ٹی او بے' ضائع ہونے والی شے نہیں تھی، مگر ہمیں کسی کیڑے کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کا چوبی جسم کیڑوں سے مامون کر دیا گیا تھا، اور وہ لافانی تھا۔ اب ہمارے لیے صرف ایک ماڈل بحری بیڑا اور، موافق ہوا کی نامعقول خواہش رہ گئی تھی۔ ہم نے 'ٹی او بے' کے لیے خوف کو اپنا کھیل بنا لیا تھا۔ ہم نے اس کو نظر انداز کرنے کی، اس کو بھول جانے کی بہت خواہش کی تھی، اور شاید ہم کامیاب ہو بھی جاتے، اگر

اچانک دوپہر کے سورج کی کرنوں نے پوری قوت سے حملہ کر کے اس کی بائیں زرد آنکھ میں شعلے نہ بھڑکا دیے ہوتے۔ پھر بھی، اس شعلے باری کو ہمیں حیران کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم بھری عجائب گھر کی دوسری منزل کی سورج بھری دوپہروں کے عادی ہو چکے تھے، ہمیں معلوم تھا کہ دن کا کون سا وقت ہو چکا ہے، یا ہونے والا ہے، جب کہ روشنی کارنس کے نیچے تک پہنچ گئی تھی جس نے جہازوں کو روشن کردیا تھا۔گرجا گھروں نے بھی گھڑی کی مانند سورج کی کرنوں کی گرد اڑانے والی حرکات پیدا کرنے میں، اوراپنے تاریخی گھنٹوں کی آوازیں بھیج کر ہماری تاریخی اشیا کا ساتھ دیا تھا۔ یہ کم حیرت کی بات نہیں تھی کہ سورج بھی ایک تاریخی کردار ادا کررہا تھا: کہ وہ بھی ہمارے عجائب گھر کی شے بن گیا تھا، اور ہمیں تو نئی اوبۓ کی زرد آنکھوں کے خلاف اس کی سازش کا بھی شبہ ہونے لگا تھا۔

مگر اس دوپہر، جب ہم کھیل کھیلنے یا اکسانے والی حماقتوں سے صرف نظر کر رہے تھے، 'نئی اوبۓ' کی شعلہ بار زرد آنکھوں نے ہم پر دُوگنی قوت سے ضرب لگا دی تھی۔ہم رنجیدہ اور پریشان، بند ہونے کے وقت کے آدھ گھنٹے پہلے سے عجائب گھر کے بند ہونے کے انتظار میں تھے۔عجائب گھر ٹھیک پانچ بجے بند ہو گیا۔

دوسرے دن، ہربرٹ اکیلا ہی ڈیوٹی پر گیا تھا۔میں اس کے ساتھ عجائب گھر تک گیا تھا مگر ٹکٹ والی کھڑکی پر کھڑا انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا: اس کے سامنے ہی، سڑک کے اس پار مجھے ایک جگہ مل گئی تھی۔میں سنگِ خارا کے ایک بڑے سے گولے پر بیٹھ گیا تھا، جس کے دُم نکل آئی تھی، جس کو بالغ لوگ زینے کے banister کے طور پر استعمال کرتے تھے۔یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دوسری جانب بھی ایسا ہی سنگِ خارا کا، ڈھلے ہوئے لوہے کی دُم والا بڑا سا گولا سیڑھی کی چوکی داری کر رہا تھا۔میں کبھی کبھار نقارہ نوازی کرنے لگتا، مگر جان بوجھ کر زوردار آواز میں، گزرنے والوں کے خلاف احتجاج کے طور پر، جن میں زیادہ تر عورتیں ہی ہوتی تھیں، جو رُک کر مجھ سے بات کرنے لگتیں، میرا نام پوچھتیں، اپنے پسینہ آمیز ہاتھوں سے میرے بالوں میں کنگھی کرنے لگتیں، جو اگرچہ بہت چھوٹے اور گھونگھر والے اور پُرکشش تھے۔صبح گزر گئی۔بائی لیکے۔گالسٹ۔ گاسےُ کے آخر

میں، سینٹ میری کی سُرخ اور سیاہ رنگ کی اینٹوں سے بنی مرغی اس کے ضرورت سے زیادہ بڑے گھنٹا گھر کے نیچے بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ کونوں میں گھسے کبوتر ایک دوسرے کو ڈھکیل رہے تھے؛ مجھ سے بہت زیادہ دور نہیں، مگر آپس میں نہ جانے کس قسم کی احمقانہ باتیں کیا کرتے تھے؛ ان کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ مرغی اسی طرح کب تک اونگھا کرے گی، کہ اس کی اونگھ سے کچھ پیدا بھی ہوگا یا نہیں، یا ان تمام صدیوں کے دوران یہ اونگھ خود اپنا اختتام نہیں بن جائے گی۔

دوپہر کے وقت ہربرٹ دفتر سے باہر نکلا۔ اپنے لنچ بکس میں سے، جس میں مدرٹروزنسکی نے نہ جانے کیا کیا ٹھونس دیا تھا کہ وہ ٹھیک سے بند نہیں کیا جا سکتا تھا، ایک سینڈ وچ ڈھونڈ نکالی، جس کے ساتھ خون سے بنی انگلی جیسی موٹی سا سیج کی قاش بھی تھی، اور مجھے پیش کر دی۔ مجھے کھانے کی بالکل خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ ہربرٹ نے بالکل میکانیکی انداز میں ہمت افزائی کرنے والا اشارہ کیا۔ بالآخر میں نے وہ سینڈ وچ کھائی؛ ہربرٹ نے نہیں کھائی؛ وہ سگریٹ پینے لگا تھا۔ عجائب گھر واپس آنے سے پہلے وہ 'ہربرٹ بانکس' نامی ایک بار میں، دو تین جام جِن کے چڑھانے گیا؛ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ میں جام چڑھاتے وقت اس کے گلے کے کنٹھ کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ مجھے اس کی بلا نوشی اچھی نہیں لگی۔ چکر دار سیڑھی پر چڑھنے کے بہت دیر بعد تک اور میرے اس سنگِ خارا کے گولے پر واپسی تک بھی، آسکر اپنے دوست کے کنٹھ کو اوپر نیچے اچھلتا دیکھ رہا تھا۔

دوپہر آہستہ آہستہ عجائب گھر کی عمارت کے رنگا رنگ چہرے پر سے گزر رہی تھی۔ اس نے ایک کارنس سے دوسری کارنس جست لگائی، نہ جانے کتنی کنواریوں اور کتنی سینگوں پر سواری کی، پھولوں کے متلاشی فربہ فرشتوں کو ہڑپ کیا، دیہات کے کارنیوال کی بچوں بیچ پھٹ پڑی، آنکھ مچولی کا کھیل کھیلی، پھولوں سے سجے جھولے پر سوار ہوئی، تھیلے جیسی برجس پہنے کاروبار کی باتیں کرتے شہریوں کے گروہ کو معزز کیا، کُتوں کے خوف سے بھاگتے ہوئے بارہ سنگھوں پر روشنی ڈالی اور بالآخر دوسری منزل کی اس کھڑکی تک پہنچی جس میں سے، تھوڑی دیر کے لیے مگر ہمیشہ کے لیے، ایک زرد آنکھ کو روشن کرنے کے لیے سورج کی کرنیں اندر آ رہی تھیں۔

میں سنگِ خارا کے گولے سے پھسل کر نیچے آ گرا۔ میرا نقارہ پتھر سے زور سے ٹکرا

گیا۔اس کے خول کے کچھ سرخ و سفید ٹکڑے نکل کر پتھر سے بنی سیڑھیوں پر پھیل گئے تھے۔

ممکن ہے کہ میں نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا ہو، شاید میں نے دعا کی ہو، تھوڑی ہی دیر کے بعد عجائب گھر کے دروزے کے سامنے ایک ایمبولینس آکر کھڑی ہو گئی۔آس پاس سے گزرنے والے لوگ دروازے کے سامنے جمع ہو گئے۔آسکر چپکے سے ہنگامی حالات سے نمٹنے والوں کے درمیان شامل ہوگیا۔ان کے اوپر پہنچنے سے پہلے ہی میں سیڑھی سے ہوتا ہوا ان تک پہنچ گیا تھا، حالاں کہ اس وقت تک انھیں عجائب گھر کے راستوں سے واقفیت ہو گئی ہو گی۔

جب میری نظر ہربرٹ پر پڑی تو میں اپنی ہنسی ضبط نہیں کر سکا تھا۔اس نے کو کرنی اوبے پر سوار ہونے کی کوشش کی تھی اور اس وقت وہ اس سے بغل گیر تھا۔ ہربرٹ کا سر 'نی اوبے' کے سر کے بالکل سامنے تھا۔ ہربرٹ کے بازو مجسمے کے گرد حمائل تھے۔ ہربرٹ کا جسم کمر تک برہنہ تھا۔بعد میں اس کی قمیص پائی گئی تھی، جو قرینے سے تہہ کی ہوئی دروازے کے قریب والی چمڑے کی کرسی پر رکھی ہوئی تھی۔اس کے پشت کے سارے نشانات واضح تھے۔میں نے تحریر پڑھی اور اس کے الفاظ گنے۔ان میں سے ایک لفظ بھی غائب نہیں تھا،مگر ایسا نہیں تھا کہ نئی تحریر کی ابتدا قابلِ فہم نہیں تھی۔

ہنگامی حالات سے نمٹنے والوں کو، جو میرے عقب سے ہوتے ہوئے آئے تھے ہربرٹ کو'نی اوبے' سے الگ کرنے میں مشکل ہوئی۔اس نے جہاز میں لگی ایک دو دھاری کلھاڑی کو زنجیر توڑ کر الگ کر لیا تھا، اور شہوت کی بے چینی میں اس نے کلھاڑی سے 'نی اوبے' پر حملہ کیا تھا، اس طرح ایک طرف کی دھار 'نی اوبے' میں داخل ہو گئی تھی اور دوسری خود اس کے جسم میں۔اور پھر وہ مجسمے سے بغل گیر ہوگیا تھا،مگر'نی اوبے' کے نچلے حصے میں نیچے اس کو ایسی کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی جس میں وہ اپنا لنگر داخل کر سکتا، جواب بھی سختی اور پریشانی کے عالم میں اس کے پتلون سے بار بار لہرا رہا تھا۔

جب انھوں نے ہربرٹ پر وہ کمبل ڈالا جس پر "Municipal Emergency Service" لکھا ہوا تھا، تو ہمیشہ کی طرح آسکر پریشان ہو کر نقارے کی جانب واپس چلا گیا۔وہ

اس پر اپنے گھونسوں سے چوٹ لگا ہی رہا تھا کہ عجائب گھر کے چوکی دار اس کو "بلّی کی بچی" کے کمرے سے باہر لے گئے اور اس کو پولیس کی گاڑی میں ٹھونس دیا، جو اسے گھر واپس لے گئی۔

اب بھی، دماغ کے اسپتال میں بھی، جب اس کو لکڑی اور گوشت کے درمیان اختلاط کی وہ کوشش یاد آجاتی ہے، تو مجبوراً وہ مکے کے ذریعے ایک بار پھر، کسی کور چشم انسان کی طرح، اپنی انگلیوں سے ہربرٹ کی، رنگا رنگ ورم شدہ پشت کے، سخت اور حساس نشانات، کی بھول بھلیاں کو تلاش کرنے لگتا ہے، جو آئندہ کے تمام واقعات کا پیش خیمہ ہونے والی تھیں مگر اب، جب کہ ہربرٹ اس کے پاس نہیں ہوتا ہے، ماشپاتی جیسے سر والا اس کا محافظ برونو آموجود ہوتا ہے۔ بہت آہستگی سے وہ میری بھنچی ہوئی مٹھیوں کو نقارے سے پرے کرتا ہے، نقارے کو اٹھا کر میرے پلنگ کی بائیں جانب کے ستون پر ٹانگ دیتا ہے، اور میرے بستر کا کمبل برابر کر دیتا ہے۔

"کیوں، مسٹر ماتسیرات" وہ بہت نرمی سے سرزنش کرتے ہوئے کہتا ہے، "اگر تم اسی طرح زور زور سے نقارہ بجاتے رہے، تو کسی نہ کسی دن کوئی نہ کوئی ضرور سن لے گا، کہ کوئی زور زور سے نقارہ بجاتا رہتا ہے۔ تم ذرا آرام کیوں نہیں کر لیتے، یا پھر ذرا آہستگی سے نقارہ کیوں نہیں بجاتے؟"

"ہاں، برونو، میں کوشش کروں گا کہ آئندہ نقارہ آہستہ بجے، حالاں کہ میرا اگلا پروگرام وحشی لوگوں کے آرکسٹرا میں شامل ہونا ہے۔"

# یقین — اُمید — محبت

ایک تھا موسیقار، اس کا نام تھا 'مین' اور اس کی بگل نوازی کا جواب نہیں تھا۔ وہ فلیٹوں والی ایک عمارت کی پانچویں منزل پر رہتا تھا۔ اس نے چار بلیاں پال رکھی تھیں، جن میں سے ایک کا نام تھا 'بسمارک'۔ صبح سے رات تک اس کے منہ سے جن کی بو آتی رہتی تھی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا تھا جب تک ایک تباہ کن واقعے نے اس کی آنکھیں کھول نہیں دی تھیں۔

'آسکر' کو آج بھی پیشین گوئیوں پر یقین نہیں، مگر اس میں شک نہیں کہ اُن دنوں تباہیوں کی پیشین گوئیاں بہت ہوا کرتی تھیں۔ تباہیاں بڑے بڑے قدم اُٹھاتیں، بڑے بڑے بوٹ پہنے آیا کرتی تھیں۔ یہ اسی زمانے کی بات ہے جب میرا دوست 'ہربرٹ ٹرزنسکی' ایک چوبی لڑکی کے ہاتھوں سینے پر لگے زخم کے باعث موت کے گھاٹ اتر گیا تھا۔ وہ عورت نہیں مری۔ اس کو، اس کی اصل حالت میں واپس لانے کے لیے، یا یوں کہیے کہ اس کو محفوظ کرنے کے لیے عجائب گھر کے ایک تہ خانے میں محبوس کر دیا گیا تھا، مگر کسی تباہی کو تو تہ خانے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ تباہی تو گندے پانی کی نالیوں میں بہہ کر، گیس کے پائپ کے ذریعے، گیس میں مل کر گھر گھر پھیل جاتی ہے۔ مگر جو کوئی بھی شوربا بنانے والی پتیلی کو نیلے رنگ کے شعلوں پر چڑھاتا ہے، وہ یہی سمجھتا ہے کہ تباہی ہی اس کے شوربے کو اُبالتی ہے۔

جب 'ہربرٹ ٹرزنسکی' کو 'لانگ فوز' کے قبرستان میں دفن کیا جا رہا تھا، اس وقت

مجھے ایک بار پھر 'لیو شگر' نظر آیا تھا، جس سے میری ملاقات 'بُرنٹاؤ' میں ہوئی تھی۔ وہ پھپھوندی لگے سفید دستانے پہنے افسردہ لوگوں کا دل بہلانے اور تعزیت کرنے کے لیے ہاتھ پھیلاتا ہر جگہ پہنچ جاتا تھا، ایسی تعزیت جس میں افسردگی اور خوشی کے درمیان زیادہ فرق نہیں ہوتا ہے۔ سوگواروں میں 'مدر ٹروزنسکی'، 'گسیٹے'، 'فریز' اور 'ماریا ٹروزنسکی'، جسیم مسز کاٹز، بوڑھا آدمی 'ہائیلانڈ' جس نے 'مدر ٹروزنسکی' کے لیے تعطیل کے دنوں میں 'فریز' کے سارے خرگوش ذبح کر ڈالے تھے، میرا قیاسی والد 'ماتسیرات'، جو اکثر بہت فیاض ہو جاتا تھا، جس نے کفن دفن کا نصف خرچ برداشت کیا تھا، حتیٰ کہ 'جان برانسکی' بھی شامل تھا، جس کی شاید 'ہربرٹ' سے شناسائی بھی نہیں تھی، اور جو 'ماتسیرات' سے، اور شاید مجھ سے، قبرستان کی غیر جانب دار زمین پر ملاقات کے لیے آیا ہوا تھا۔

جب 'لیو شگر' نے ہوا میں پھڑ پھڑاتے دستانے موسیقار 'مین' کے آگے بڑھائے، جو نصف شہری، اور نصف SA وردی پہنے آیا تھا، تو ایک اور تباہی رونما ہوئی تھی۔

اچانک خوف زدہ 'لیو' کے ہلکے زرد رنگ کے دستانے ہوا میں اُڑ گئے، اور ان کے تعاقب میں 'لیو' قبریں پھلانگتا دوڑا جا رہا تھا۔ وہ چیخ رہا تھا اور اس کے منہ سے ایسے الفاظ کی بوچھاڑ نکل رہی تھی جن کا تعزیت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

موسیقار 'مین' کے پاس سے کوئی ہٹا نہیں۔ پھر بھی، 'لیو شگر' نے اس کو پہچان لیا تھا، مگر دفن کے انتظام کے دوران وہ ایک طرف اکیلا ہی کھڑا تھا۔ اس نے شرمندگی کے ساتھ اپنا بگل سنبھالا، جسے وہ ایک ذہن کے ساتھ لایا تھا، اور اس نے 'ہربرٹ' کی قبر پر شان دار مظاہرہ کیا۔ شان دار اس لیے کہ اس دن 'مین' نے جو کچھ کیا تھا اس سے پہلے کبھی نہیں کر سکا تھا۔ کہ وہ جِن کی بوتل کی طرف پھر راغب ہو گیا تھا، اس لیے کہ اس کی بھی وہی عمر تھی جتنی کہ 'ہربرٹ' کی تھی، کہ 'ہربرٹ' کی موت نے مجھے اور میرے نقارے کو بھی خاموش کر دیا تھا، اور وہ خود بھی بہت افسردہ ہو گیا تھا۔

ایک تھا موسیقار: اس کا نام تھا 'مین' اور اس کی بگل نوازی کا جواب نہیں تھا۔ وہ فلیٹوں والی ایک عمارت کی پانچویں منزل پر رہتا تھا۔ اس نے چار بلیاں پال رکھی تھیں، جن میں

سے ایک کا نام تھا 'بسمارک'۔ صبح سے رات تک اس کے منہ سے جن کی بوتل لگی رہتی تھی۔ یہ سلسلہ 1936 کے آخر اور 1937 تک چلتا رہا تھا، میرا خیال ہے کہ اس وقت تک جب اس نے Mounted SA بینڈ میں شمولیت اختیار نہیں کر لی تھی۔ بینڈ میں شامل بگل بجانے والے کی حیثیت میں اس نے بہت کم غلطیاں کی تھیں، مگر اس کی فن کاری کا جواب نہیں تھا، اس لیے کہ جب اس نے اپنی ان بدوضعوں کو پہننا شروع کر دیا تھا، جن میں بیٹھنے کے مقام پر چمڑا لگا ہوتا تھا، تو اس نے جن کی بوتل کو خیر باد کہہ دیا تھا، اور اس کے بعد سے اس کی فن کاری زور زور سے بگل بجانے اور سنجیدہ رہنے پر منحصر رہ گئی تھی، اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

جب بینڈ کے آدمی 'مین' کا ایک عرصے کا ساتھی 'ہربرٹ ٹروزنسکی' انتقال کر گیا، جس کے ساتھ مل کر اس نے کمیونسٹ یوتھ گروپ کے اپنے سارے واجبات ادا کر دیے تھے، اس کے بعد سوشلسٹ 'ریڈ فالکن' گروپ کے؛ اور جب اس کے دوست کو قبر میں لٹائے جانے کا وقت آیا تو، 'مین' نے اپنا بگل اور اپنی جن کی بوتل سنبھال لی تھی۔ اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ وہ سنجیدگی سے اور شان دار طریقے سے بگل بجائے؛ 'ماؤنٹڈ ایس اے' بینڈ میں شمولیت کے دوران اس کا موسیقی کا شوق ختم نہیں ہوا تھا۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی اس نے آخری بار جن کی بوتل سے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا تھا، اور بگل بجاتے وقت وہ اپنی بینڈ کی وردی کے اوپر اپنا عام دنوں والا کوٹ چڑھائے ہوئے تھا، حالاں کہ اس نے ٹوپی پہنے بغیر، خاکی رنگ کے کوٹ میں ملبوس، بگل بجانے کا منصوبہ بنایا تھا۔

ایک بار پھر، ہمارے سامنے، ایک آدمی تھا جو ضرورت سے زیادہ جن پی کر، اور خوب صورت انداز میں بگل بجاتے وقت بینڈ کی وردی کے اوپر اپنا اوور کوٹ چڑھائے ہوئے تھا۔ جب 'لیوشگر' جیسا آدمی جو ایسے موقعوں پر تمام قبرستانوں میں موجود ہوتا تھا، تعزیت کے لیے آگے بڑھا، تو اپنے حصے کی تعزیت کے حصول کے لیے ہر شخص آگے بڑھا تھا۔ صرف بینڈ کے آدمی کو 'لیو' کے سفید دستانے والے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا حق نہیں ملا تھا، اس لیے کہ بینڈ کے آدمی کو دیکھتے ہی 'لیو' خوف سے چیخ پڑا تھا اور اس نے تعزیت اور دستانے دونوں کو روک لیا تھا۔ بینڈ والا آدمی، بغیر تعزیت کے، اپنا ٹھنڈا بگل لیے ہی، اپنے

گھر واپس چلا گیا تھا اور ہماری فلیٹوں کی عمارت کے اپنے فلیٹ کی چھت کے عین نیچے اس کو اس کی چاروں بلیاں مل گئی تھیں۔

ایک تھا بینڈ والا آدمی اور اس کا نام تھا 'مین'۔ جب وہ سارا سارا دن جن پیا کرتا تھا اور شان دار انداز میں بگل بجایا کرتا تھا، اس وقت بھی 'مین' کے پاس چار عدد بلیاں تھیں اور ان میں سے ایک کا نام تھا 'بسمارک'۔ ایک دن جب وہ بینڈ والا آدمی اپنے پرانے دوست 'ہربرٹ ٹروزنسکی' کے دفن کے بعد افسردہ اور سنجیدہ اپنے گھر واپس آیا تھا، اس لیے کہ کسی شخص نے اس سے تعزیت نہیں کی تھی، تو وہ اپنے گھر میں اپنی چار بلیوں سمیت بالکل اکیلا تھا۔ اور جب بلّیاں سواری کے وقت پہنے جانے والے اس کے بوٹوں سے اپنے جسم رگڑ رہی تھیں، تو 'مین' نے ان کو مچھلیوں کے [کٹے ہوئے] سروں سے بھرا ایک اخبار دیا تھا۔ تب کہیں جا کر ان بلیوں نے اس کے بوٹ کی جان چھوڑی تھی۔ اس دن فلیٹ میں ان چار بلیوں سے بہت خراب بد بو آ رہی تھی، جو دراصل بلّے تھے، اور ان میں سے ایک کا نام 'بسمارک' تھا، جو سیاہ رنگ کا تھا اور اس کے پنجے سفید رنگ کے تھے۔ مگر اس دن 'مین' کے پاس جن کی بوتل نہیں تھی، جس کی وجہ سے اس کو بلّوں کی بد بو ناگوار گزر رہی تھی۔ وہ ہماری دُکان سے جن خرید سکتا تھا اگر اس کا فلیٹ، عین چھت کے نیچے، پانچویں منزل پر نہ ہوتا، مگر اس کو سیڑھیوں سے، بلکہ ان سے زیادہ تو اُسے پڑوسیوں سے خوف آ رہا تھا، جن کی موجودگی میں اس نے کئی بار قسمیں کھائی تھیں کہ اب موسیقار کے ہونٹوں کے اس پار جن کا ایک قطرہ بھی نہیں جا سکے گا، کہ اس نے محنت کوش اور سنجیدہ زندگی کا آغاز کر دیا تھا، کہ اس دن کے بعد سے اس کی زندگی کا مقصد، بے مقصد نوجوانوں کی بگڑی ہوئی زندگی سے پرے ہو گا۔

ایک تھا آدمی، جس کا نام تھا 'مین'۔ ایک دن اس نے خود کو اپنے فلیٹ کی چھت کے نیچے اپنے چار بلّوں کے ساتھ تنہا پایا؛ ان میں سے ایک کا نام تھا 'بسمارک'، اور آج فلیٹ سے آنے والی بو اس کو بہت ناگوار لگ رہی تھی، اس لیے کہ آج کے دن اس کو ایک نہایت ناگوار تجربہ ہوا تھا، اس لیے اور بھی کہ آج اس کے ہاتھ میں جن کی بوتل نہیں

تھی۔ جب اس کی جھن کی پیاس، اور بد مزگی انتہا کو پہنچ گئی، ساتھ ہی بلوں کی بو بھی ایک حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی تو، 'مین' نے، جو پیشے کے اعتبار سے موسیقار تھا، اپنے ٹھنڈے چولھے کے قریب رکھا ہوا آگ کریدنے کا چھڑ اُٹھایا اور اس سے بلوں کو پیٹنا شروع کر دیا، اور اس وقت تک پیٹتا رہا تھا جب تک اسے یہی یقین نہیں ہو گیا تھا، حالاں کہ فلیٹ کی بدبو ختم نہیں ہوئی تھی، کہ وہ تمام بلّے، جن میں سے ایک کا نام 'بسمارک' تھا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم نہیں ہو گئے تھے۔

ایک تھا گھڑی ساز، جس کا نام تھا 'لاؤبتاؤ'، جو ہماری فلیٹوں کی عمارت میں دو کمرے والے فلیٹ میں رہا کرتا تھا، جن کی کھڑکیاں صحن کی طرف کھلتی تھیں۔ گھڑی ساز، 'لاؤبتاؤ' غیر شادی شدہ تھا، اور SPCA کے علاوہ وہ National Socialist Welfare Organization کا رُکن بھی تھا۔ وہ بہت مہربان انسان تھا، جو تمام تھکے ہوئے انسانوں، بیمار جانوروں اور ٹوٹی پھوٹی گھڑیوں کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے میں ان کی مدد کیا کرتا تھا۔ ایک دوپہر، جب وہ گھڑی ساز اپنی کھڑکی کے پاس اداس بیٹھا تھا، اس لیے کہ وہ اس صبح اپنے ایک ہمسایے کے دفن سے واپس آیا تھا، اس نے موسیقار 'مین' کو دیکھا، جو اسی عمارت کی پانچویں منزل پر رہتا تھا، جو آلو رکھنے والا آدھا بھرا ہوا بورا لے جا رہا تھا، جس میں سے کچھ ٹپک رہا تھا اور اس کا نیچے کا حصہ گیلا تھا، اور اس نے بورے کو کوڑا پھینکنے کے لیے مخصوص کوڑے دانوں میں سے ایک میں ڈال دیا تھا، مگر چوں کہ کوڑا دان تین چوتھائی سے زیادہ کوڑے سے بھرا ہوا تھا، اس لیے اس کو اس کا ڈھکنا بند کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چار عدد بلّے تھے، جن میں سے ایک کا نام تھا 'بسمارک'۔ یہ بلّے 'مین' نامی ایک موسیقار کی ملکیت تھے۔ چوں کی ان بلوں کو کوئی بلّی نصیب نہیں تھی، ان سے بہت شدید اور ناقابل برداشت بو آتی تھی، موسیقار نے ایک دن ان کو آگ کریدنے والے چھڑ سے پیٹ ڈالا تھا اس لیے کہ اس کو وہ بو بہت ناگوار لگتی تھی، اور ان کے جسموں کو آلو کے بورے میں ڈال کر چار منزل سیڑھیوں سے اترتا ہوا نیچے لے گیا تھا، اور اسے ان کے جسموں کو جلدی سے اس کوڑے دان میں پھینکنا تھا جو قالین پیٹنے والے

racks کے پاس رکھا ہوتا تھا، اور چوں کہ بورا پٹ سن کا بنا ہوا تھا، اس لیے نہ وہ واٹر پروف تھا نہ خون پروف، اور ابھی موسیقار آدھی سیڑھیاں اترا تھا کہ اس بورے میں سے کچھ ٹپکنا شروع ہو گیا تھا۔ اور چوں کہ کوڑے دان تقریباً بھرا ہوا تھا، اس لیے موسیقار کو اس کا ڈھکنا بند کرنے کے لیے زور لگانا پڑا تھا۔ ابھی وہ آنگن سے ہوتا ہوا ہو سڑک کی جانب گیا ہی تھا — اس لیے کہ اس کو اپنے فلیٹ واپس جانے کی خواہش نہیں رہ گئی تھی اس لیے کہ بلّوں کے بغیر بھی بو کم نہیں ہوئی تھی، کہ کوڑے دان کا ڈھکنا خود بہ خود اُٹھنا شروع ہو گیا تھا، اور اس کے ساتھ ہی وہ بورا بھی اُٹھنے لگا تھا۔

ایک تھا موسیقار، اس نے اپنے چار بلّوں کو مار ڈالا تھا، انھیں ایک کوڑے دان میں دبا دیا تھا، اور اپنے دوستوں سے ملاقات کے لیے گھر سے باہر چلا گیا تھا۔

ایک تھا گھڑی ساز، جو اپنی کھڑکی کے قریب افسردگی کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا، اور دیکھ رہا تھا کہ موسیقار 'مین' نے جلدی سے ایک بورا، نصف بھرے کوڑے دان میں ٹھونس دیا تھا، اور خود عمارت کے آنگن سے باہر چلا گیا تھا۔ 'مین' کے چلے جانے کے چند لمحوں بعد اس نے دیکھا کہ کوڑے دان کا ڈھکنا اٹھنا شروع ہوا، اور اُٹھتا ہی چلا گیا تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چار عدد بلّے تھے: اور چوں کہ ایک دن ان میں سے بہت شدید قسم کی بو آ رہی تھی، ان کو مار ڈالا گیا تھا، اور ایک بورے میں بند کر کے ان کو کوڑے دان میں دفن کر دیا گیا تھا، مگر وہ بلّے، جن میں سے ایک کا نام 'بسمارک' تھا، پوری طرح مرے نہیں تھے؛ کہ وہ سخت جان تھے، جیسے کہ عموماً بلّے ہوا کرتے ہیں۔ انھوں نے بورے میں حرکت کی اور کوڑے دان کے ڈھکنے کو متحرک کر دیا تھا، اور 'لاؤبیٹا' گھڑی ساز کو، جو اس وقت بھی کھڑکی کے پاس اُداس بیٹھا ہوا تھا، اس سوال کے ساتھ، کہ موسیقار کے پھینکے ہوئے بورے میں کیا ہو سکتا ہے؟

ایک تھا گھڑی ساز جو لاپروائی سے دیکھ نہیں سکتا تھا کہ کوڑے دان میں کوئی شے حرکت کر رہی ہے۔ وہ دوسری منزل کے اپنے فلیٹ سے باہر نکلا، عمارت کے آنگن میں گیا، کوڑے دان کا ڈھکنا اُٹھایا، اس کے اندر پڑے بورے کو کھولا اور اُن میں سے بُری

طرح زخمی، مگر حرکت کرتے ہوئے چار بلوں کو نکال کر اپنے ساتھ لے گیا اور ان کی تیمار داری کی تھی۔ مگر دوسرے دن ہی گھڑی ساز کے سامنے سب بلّے مر گئے تھے۔ گھڑی ساز کے پاس سوائے اس امر کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ SPCA کے ہاں شکایت درج کرا دیتا، وہ جس کا رُکن بھی تھا، اور جانوروں پر ظلم کرنے کے خلاف اپنی پارٹی میں بھی شکایت درج کرا دیتا اس لیے کہ اس سے پارٹی کی ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔

ایک تھا بینڈ والا جس نے آگ کریدنے والے چمٹے سے چار بلوں کی پٹائی کر دی تھی، مگر چوں کہ وہ سارے بلّے مرے نہیں تھے، انھیں کوڑے دان میں پھینک دیا تھا اور گھڑی ساز نے اس کی شکایت کر دی تھی۔ اس پر مقدمہ چلا تھا اور بینڈ والے کو جرمانہ ادا کرنا پڑا تھا۔ پھر بھی، وہ معاملہ بینڈ کی انتظامیہ کے زیرِ بحث آیا، اور بینڈ والے کو بُری عادتوں کے باعث بینڈ سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی آٹھ نومبر کی رات والی مشہور کارکردگی، جس کو بعد میں Crystal Night کا نام دیا گیا تھا، جس میں اس نے 'مائیکلس وگ' کے 'لانگ فوز' کے synagogue میں آگ لگانے میں مدد فراہم کی تھی، اور اس کی دوسرے دن کی قابلِ قدر سرگرمی بھی، جس کا کافی دنوں قبل انتظام کیا گیا تھا، جب قومی بھلائی کے لیے کئی دُکانیں بند کر دی گئی تھیں، بینڈ سے اس کے اخراج کو روک نہیں سکی تھی۔ جانوروں سے غیر انسانی سلوک کے باعث اس کو رُکنیت سے خارج کر دیا گیا تھا۔ اس کے ایک برس بعد تک اس کو ہوم گارڈ میں بھی داخلہ نہیں مل سکا تھا جس کا بعد میں Waffen SS میں قیام عمل میں آیا تھا۔

ایک تھا کریانے کی دُکان والا جس نے نومبر کے مہینے میں ایک دن اپنی دُکان بند کر دی تھی، اس لیے کہ شہر میں کچھ ہو رہا تھا اور وہ اپنے بیٹے 'آسکر' کا ہاتھ تھامے پانچ نمبر کی ٹرام گاڑی میں سوار ہو گیا اور 'لانگ گاسر' تک گیا تھا، اس لیے کہ وہاں 'زوپوٹ' اور 'لانگ فوز' کی طرح ایک synagogue میں آگ لگی ہوئی تھی۔ synagogue تقریباً جل کر بھسم ہو گیا تھا اور آگ بجھانے والے کھڑے صرف اس بات کا خیال رکھے ہوئے تھے کہ آگ دوسری عمارتوں کو لپیٹ میں نہ لے لے۔ خاکستر synagogue کے باہر وردی اور

شہری لباس میں ملبوس لوگوں نے کتابوں، رسمی اشیا اور عجیب قسم کے کپڑوں کا انبار لگا دیا تھا۔ پھر اس ڈھیر میں آگ لگا دی گئی تھی، اور اس کریانے کی دکان والے نے وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس عوامی آگ سے اپنے ہاتھ تاپے تھے، مگر اس کا بیٹا 'آسکر' اپنے باپ کو مصروف اور غصے میں بھرا دیکھ کر وہاں سے کھسک گیا اور فوراً ہی 'آرسنل پہنچ' کی طرف چل پڑا تھا، اس لیے کہ اس کو ٹین سے بنے اپنے سُرخ سفید پالش شدہ نقارے کی فکر تھی۔

ایک تھا کھلونوں کی دُکان کا مالک جس کا نام تھا 'سِگس مُنڈ مارکس'، جو بہت سی اشیا کے علاوہ سرخ اور سفید پالش والے نقارے فروخت کرتا تھا۔ 'آسکر'، جس کا اوپر نام لیا جا چکا ہے، ان نقاروں کا سب سے بڑا خریدار تھا، اس لیے کہ اس کا پیشہ نقارہ نوازی تھا، اور وہ نقارے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ جلتے ہوئے synagogue سے "آرسنل پہنچ" کی طرف چل پڑا تھا، اس لیے کہ وہاں اس کے نقاروں کا رکھوالا رہتا تھا؛ مگر وہ شخص اس حالت میں ملا تھا کہ اس کے لیے ہمیشہ کے لیے اس دنیا میں نقارہ فروخت کرنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔

وہ، یعنی وہی آگ لگانے والے جنھیں میں، یعنی 'آسکر'، سمجھا تھا کہ بھاگ گئے تھے، میرے پہنچنے سے پہلے ہی مارکس کے پاس پہنچ چکے تھے؛ اور انھوں نے پینٹ میں ڈوبے برش سے اس کی دُکان کی کھڑکی پر Sütterlin رسم الخط میں لکھ دیا تھا "یہودی نطفہ"؛ پھر شاید اپنی تحریر سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے کھڑکی پر اپنے جوتوں کی ایڑی سے اس طرح ٹھوکریں ماری تھیں کہ جو دشنام انھوں نے لکھ دیے تھے، پڑھے نہ جا سکیں۔ دروازے سے اندر جانے کو توہین آمیز سمجھتے ہوئے وہ دُکان کی شکستہ کھڑکی کے ذریعے اندر داخل ہوئے، اور کھلونوں سے اپنا دل بہلانے لگے تھے۔

میں بھی دُکان میں کھڑکی کے ذریعے ہی داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کھلونوں سے کھیل میں مصروف تھے۔ کچھ نے اپنی پتلونیں اتار دی تھیں اور بھورے رنگ کے ساسیج جیسے ان کے فضلے، جن میں نصف ہضم شدہ سبز مٹر کے دانے دیکھے جا سکتے تھے، بادبانی کشتیوں، شریر بندروں، اور نقاروں پر جمع تھے۔ وہ سب کے سب موسیقار 'مَیں' جیسے

دکھائی دیتے تھے اور وہ 'مین' کے بینڈ کی وردیوں میں ملبوس تھے، مگر 'مین' وہاں موجود نہیں تھا۔ جیسے لوگ وہاں تھے، ویسے کہیں اور نظر نہیں آتے تھے۔ ایک اپنا خنجر نکالے ہوئے تھا۔ وہ گڑیوں کو کاٹ کاٹ کر کھول رہا تھا، اور اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہو رہی تھی کہ ان کے ہاتھوں پیروں اور جسموں سے سوائے لکڑی کے بُرادے کے اور کچھ نہیں نکل رہا تھا۔

میں اپنے نقاروں کے لیے فکر مند تھا۔ انھیں نقارے پسند نہیں تھے۔ میرا اپنا نقارہ ان کے غصے کو برداشت نہیں کر سکا تھا؛ وہ کر بھی کیا سکتا تھا سوائے خاموش رہنے کے، مگر 'مارکس' ان کے غصے سے بچ رہا تھا۔ وہ اس کو ڈھونڈتے اس کے دفتر میں پہنچے؛ انھوں نے دروازے پر کھٹکا نہیں کیا، دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو گئے تھے، حالاں کہ دروازہ مقفّل نہیں تھا۔

کھلونے بیچنے والا اپنی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ گہرے بھورے رنگ کی روزمرہ کے استعمال کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا جس کی آستینوں پر حفاظتی ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ کاندھوں پر سر کی خشکی کے نشان بتاتے تھے کہ اس کے کاسۂ سر کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ بینڈ کا ایک آدمی جو اپنے ہاتھوں میں کچھ پتلی نما دستانے پہنے ہوئے تھا، اسے اپنی انگلیوں سے کونچنے لگا مگر 'مارکس' نے زبان نہیں کھولی، نہ ہی اس کو خجالت محسوس ہوئی۔ اس کے سامنے کی میز پر پانی رکھنے کا شیشے کا ایک خالی برتن رکھا ہوا تھا؛ شاید اس کی دُکان کی کھڑکی کے شیشے ٹوٹنے کی آواز نے اس کو پیاسا کر دیا ہوگا۔

کسی زمانے میں ایک نقارہ نواز ہوا کرتا تھا، اس کا نام تھا 'آسکر'۔ جب وہ لوگ اس کھلونے فروش کو اپنے ساتھ لے گئے، اور اس کی دکان کو تہس نہس کر دیا، تو اسے شبہ ہو گیا تھا کہ اس بونے جیسے نقارہ نوازوں کے لیے مشکل کے دن آ رہے ہیں۔ سو دُکان چھوڑتے وقت اس نے دُکان کے کھنڈر میں سے ایک دو مکمل نقارے نکال لیے، جن کو نقصان نہیں پہنچا تھا، اور ان کو اپنے گلے میں لٹکا لیا، اور 'آرسنل پیسج' سے نکل کر 'کوبلس مارکٹ' کی طرف اپنے باپ کی تلاش میں چل پڑا تھا، جو خود بھی شاید اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ باہر نومبر کی ایک خنک صبح تھی۔ اشتاٹ تھیئٹر کے علاوہ ٹرام گاڑی کے اسٹاپ کے قریب، کچھ نیکو کار عورتیں، اور بدصورت عورتیں مذہبی کتابچے تقسیم کر رہی تھیں، اور اپنے بکسوں میں رقم جمع کر

رہی تھیں اور دو کھمبوں کے درمیان ایک جھنڈا لگائے ہوئے تھیں جس پر Corinthian t می مذہبی صحیفے کے الفاظ ''یقین......امید......محبت'' لکھے ہوئے تھے۔ ''آسکر ان لفظوں کو پڑھ کر اس طرح کھیل کرنے لگا جیسے شعبدے باز شیشے کی بوتلوں کے ذریعے شعبدے بازی کرتے ہیں: faith healer, Old Faithful, faithless hope, hope chest, Cape of Good Hope, hopeless love, Love's Labour's Lost, six love وغیرہ وغیرہ۔

ایک پوری خوش اعتقاد قوم کو یقین تھا کہ آپ کو سانتا کلاز پر یقین کرنا چاہیے، مگر سانتا کلاز تو حقیقی طور پر ایک گیس والا تھا۔ میرے یقین کے مطابق — اور میرا یقین ایسا ہے کہ — سانتا کلاز سے اخروٹ اور بادام کی مہک آتی ہے۔ مگر اس میں سے تو گیس کی بو آنے لگی تھی۔ اور پھر فوراً وہ کہنے لگے تھے، ''وہ Advent کا پہلا اتوار ہو گا، اور Advent کے پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے اتوار گیس کے چولھے گھنڈیوں کی طرح کھول دیے گئے تھے، جن میں سے اخروٹ اور بادام کی اصل خوش بو آنے لگی تھی، اور جو لوگ جوز (nuts) توڑنا چاہتے ہیں انھیں اطمینان ہو جائے اور یقین کرنے لگیں کہ:

وہ آرہا ہے: وہ آرہا ہے: کون آرہا ہے؟ طفل یسوع مسیح، نجات دہندہ؟ یا پھر، وہ کوئی آسمانی گیس والا ہے، جس کے بغل میں گیس کا میٹر دبا ہوا ہوتا ہے، جو ہمیشہ ٹِک ٹِک کرتا رہتا ہے؟ اور اس نے کہا تھا، میں اس دنیا کا نجات دہندہ ہوں، میرے بغیر تم کچھ پکا بھی نہیں سکتے۔ اور وہ زیادہ کا طلب گار نہیں تھا، اس نے خاص نرخ پیش کیے تھے، تازہ تازہ پالش کی ہوئی گھنڈیاں گھمائیں اور مقدس روح نے گیس کے نلکے کھول دیے تھے تاکہ اس پر فاختائیں، یا کبوتر کے بچوں کو پکایا جا سکے۔ اور اس نے اخروٹ اور بادام تقسیم کیے جن کو فوراً توڑ لیا گیا اور ان سے بھی اسپرٹ اور گیس فراہم ہوئی تھی۔ گویا، گہری نیلی فضا کے درمیان یہ مشکل نہیں تھا، کہ بھولے بھالے لوگ دکانوں کے باہر کے گیس والوں کو سانتا کلاز، اور ہر قیمت اور ہر سائز کے یسوع مسیح اطفال سمجھنے لگیں۔ وہ تو صرف گیس بچانے والی کمپنی کے تحفظ میں یقین رکھتے تھے جو گیس میٹروں کی بڑھتی گرتی قیمتوں کو مقدر کی علامت سمجھتے ہیں، اور سستے داموں Advent کا ڈراما کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ اس Advent

کرسمس کی پُر جوش تعطیل سے بچ رہنے والے بھی وہی ہوں گے جن کے لیے نہ بادام تھے اور نہ اخروٹ، حالاں کہ ہر ایک کا خیال تھا کہ یہ سب کے لیے وافر مقدار میں موجود ہوں گے۔

مگر جب سانتا کلاز پر عقیدہ گیس والا پُر عقیدہ نکلا تھا، اور Corinthians کے حکم کے خلاف، یہ بڑے پیار سے کیا گیا تھا تو انھوں نے کہا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں، ان سب نے کہا تھا، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔تو کیا تم بھی اپنے آپ سے محبت کرتے ہو؟ کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو، کہو کہ کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟ میں اپنے آپ سے بھی محبت کرتا ہوں۔اور محض محبت ہی کی بنا پر وہ ایک دوسرے کو شلجم کہہ کر پکارتے تھے، وہ شلجم کو پسند کرتے تھے، ایک دوسرے کو کاٹتے تھے، محض محبت کی بنا پر، ایک شلجم دوسرے کے شلجم کو کاٹ رہا تھا۔اور وہ ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے تھے، خوب صورت آسمانی محبت کی کہانیاں، زمینی محبت کی کہانیاں بھی، شلجموں کے درمیان کی کہانیاں بھی، اور کاٹنے سے قبل کی کہانیاں بھی، ایک دوسرے سے سرگوشی میں، بھوک کی تیز اور تازہ سرگوشی میں کہتے، شلجم بتا کیا تو مجھ سے محبت کرتا ہے؟ میں تو اپنے آپ سے بھی محبت کرتا ہوں۔

مگر جب انھوں نے محبت میں ایک دوسرے کے شلجم کاٹ لیے تھے، اور جب گیس والے کا عقیدہ ریاست کا عقیدہ بن گیا تھا تو عقیدے اور اس سے متوقع محبت کے بعد صرف تیسرا سفید ہاتھی رہ گیا تھا، یعنی، Corinthians کے نام لکھا گیا مراسلہ: امید۔ اور جب ان کے پاس کتر کتر کر کھانے کے لیے شلجم، اخروٹ اور بادام باقی تھے تو انھوں نے امید کرنی شروع کردی تھی کہ یہ سب بہت جلد ختم ہو جائے گا، اس لیے انھیں پھر سے ابتدا کردینی چاہیے، یا اسی کو جاری رکھنا چاہیے، اختتام کے دوران بھی، کہ یہ سب جلد ہی ختم ہو جائے گا، مگر کس شئے کا اختتام؟ اس وقت بھی انھیں معلوم نہیں تھا۔انھیں صرف اس بات کی امید تھی کہ یہ سب جلد ہی ختم ہو جائے گا، آج نہیں تو کل؛ کہ اگر اختتام کا مرحلہ اچانک آ جائے، تو انھیں کیا کرنا ہوگا؟ اور پھر جب اختتام کا وقت آگیا تو انھوں نے فوراً اس کو ایک پُر امید ابتدا میں بدل دیا تھا؛ اس لیے کہ ہمارے ملک میں اختتام ہمیشہ کسی شے کی ابتدا ہوتا ہے اور امید آخر آخر لمحے تک باقی رہتی ہے۔اس لیے بھی لکھا ہوتا ہے:

جب تک آدمی امید قائم رکھتا ہے، وہ امید افزا اختتامات پیدا کرتا رہتا ہے۔

جہاں تک میرے جاننے کا سوال ہے، تو میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ مثال کے طور پر مجھے نہیں معلوم کہ آج کل سانتا کلاز کی ڈاڑھی کے پیچھے کون چھپا ہوتا ہے، سانتا کلاز کے تھیلے میں کیا ہوتا ہے؛ مجھے نہیں معلوم کہ گیس کی گھنڈیاں کس طرح کھولی اور بند کی جاتی ہیں؛ اس لیے کہ Advent، نجات دہندے کے انتظار کا وقت، ایک بار پھر شروع ہو جاتا ہے، یا شروع رہتا ہے، مجھے اس کا علم نہیں۔ ایک اور بات جس کا مجھے علم نہیں: کیا میں یقین کروں، جیسا کہ مجھے امید ہے کہ، وہ گیس کی گھنڈیوں کو بہت پیار سے چمکاتے رہتے ہیں تا کہ وہ بتاتی رہیں کہ وہ کون سی صبح ہے، اور وہ کون سی شام ہے، جو مجھے معلوم نہیں؛ نہ مجھے اس بات کا علم ہے کہ دن کا کون سا وقت کام کا ہوتا ہے؛ اس لیے کہ محبت کا کوئی وقت نہیں ہوتا، اور امید کبھی ختم نہیں ہوتی، اور عقیدے کی کوئی حد نہیں ہوتی، کہ علم کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار وقت اور حدود کا پابند ہوتا ہے، اور یہ حدود ڈاڑھی، تھیلے، بادام سے پہلے ختم ہو جاتی ہیں، تا کہ میں ایک بار پھر کہہ سکوں: میں نہیں جانتا، ارے بھائی، میں نہیں جانتا۔ مثال کے طور پر کہ ساسیج کے خول میں کیا بھرا جاتا ہے، کس کی آنتیں بھری جاتی ہیں، نہ مجھے اس کا علم ہے، اگر چہ بھری جانے والی تمام اشیا کی قیمتیں، وہ مہین ہوں یا موٹی، واضح طور پر لکھی ہوتی ہیں، پھر بھی مجھے علم نہیں کہ اس قیمت میں کیا کیا شامل ہوتا ہے، کہ ان میں بھری جانے والی اشیا کے نام کس کس لغت سے نکالے جاتے ہیں۔ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ لغات اور ساسیج کے خول کہاں سے بھرے جاتے ہیں، نہ میں جانتا کہ کون سا گوشت بھرا جاتا ہے، نہ میں جانتا ہوں کہ لغت میں کس زبان کا لفظ داخل کیا جاتا ہے: لفظ بتاتے ہیں، قصائی نہیں بتاتے، میں ساسیج کے قتلے بناتا ہوں اور تم کتابیں کھولتے ہو۔ میں وہی کچھ پڑھتا ہوں جو مجھے اچھا لگتا ہے، مگر تمھیں کیا اچھا لگتا ہے؟ ساسیج کے قتلے اور ساسیج کے خول یا کتابوں کے اقوال — اور ہمیں کبھی معلوم نہیں ہو گا کہ ساسیج بھرنے سے پہلے کسے خاموش کرنا پڑتا ہے، اور قبل اس کے کہ کتابیں بول سکیں، ان کو چھپائی سے بھر دیا جاتا ہے، مجھے علم تو نہیں مگر میں گمان کر سکتا ہوں: کہ یہ وہی قصائی ہوتے ہیں جو لغات اور ساسیج کے خول زبان سے اور ساسیج کی

بھرائی سے بھرتے ہیں، وہاں کوئی 'پال' نہیں ہوتا، اس آدمی کا نام 'سال' (Saul) تھا اور وہ ایک 'سال' تھا، اور وہ 'سال' ہی تھا جس نے Corinth کے لوگوں کو کچھ قیمتی سائیوں کے بارے میں کچھ بتایا تھا، جنھیں وہ 'عقیدہ'، 'امید' اور 'محبت' کہتا ہے، جس کو اس نے آسانی سے ہضم ہو جانے والی شے مشتہر کیا تھا، اور جو آج کے دن تک، اگرچہ 'سال' ہمیشہ اپنا پیکر بدلتا رہتا ہے، انسانیت کو کچھ نہ کچھ دیتا رہتا ہے۔

اور جہاں تک میرا سوال ہے، وہ میرا کھلونے والا لے گئے، اس امید پر کہ اس کے ساتھ وہ تمام کھلونوں کو دنیا سے جلا وطن کر دیں گے۔

ایک تھا موسیقار، اس کا نام تھا 'مین' اور اس کی بگل نوازی کا کوئی جواب نہیں تھا۔
ایک تھا کھلونے والا، اس کا نام تھا 'مارکس'، اور وہ ٹین سے بنے نقارے فروخت کرتا تھا۔
ایک تھا موسیقار، اس کا نام تھا 'مین'، اور اس کے چار عدد بلّے تھے، ایک کا نام تھا 'بسمارک'۔
ایک تھا نقارہ نواز، اس کا نام تھا 'آسکر'، اور اسے کھلونے والے کی ضرورت رہتی تھی۔
ایک تھا موسیقار، اس کا نام تھا 'مین'، اور اس نے آگ کریدنے کے چمٹے سے چار بلّے مار ڈالے تھے۔
ایک تھا گھڑی ساز، اس کا نام تھا 'لاؤبشاڈ'، اور وہ SPCA کا رکن تھا۔
ایک تھا نقارہ نواز، اس نام تھا 'آسکر'، اور وہ اس کے کھلونے فروش کو اٹھا لے گئے تھے
ایک تھا کھلونے والا، اس کا نام تھا 'مارکس'، اور وہ دنیا کے تمام کھلونے، دنیا سے باہر لے گیا تھا۔
ایک تھا موسیقار، اس کا نام تھا 'مین'، اگر وہ مرا نہیں، زندہ ہے تو اس کے بگل بجانے کا اب بھی جواب نہیں۔

# کاٹھ کباڑ کا ڈھیر

ملاقات کا دن ہے، 'ماریا' میرے لیے ایک نیا نقارہ لائی ہے۔ میرے پلنگ کے گرد لگے جنگلوں کے اوپر سے مجھے نقارہ تھماتے ہوئے، اس نے دُکان کی رسید بھی دینی چاہی تھی، مگر میں نے لینے سے انکار کر دیا، اور سرھانے لگے گھنٹی کے بٹن کو اس وقت تک دبائے رکھا جب تک کہ میرا نگہبان 'برونو' آنہیں گیا تھا اور جب بھی 'ماریا' میرے لیے نیا نقارہ لاتی ہے، اس نے وہی کچھ کیا ہے، جو وہ ہمیشہ کرتا رہا ہے۔ اس نے ڈبے پر بندھا فیتا کھولا، نیلے کاغذ کو خود بہ خود کھل جانے دیا جو نقارے کے گرد لپیٹا گیا تھا، نقارے کو بہت احترام سے باہر نکالا اور نیلے کاغذ کو احتیاط سے تہہ کیا۔ اس کے بعد وہ چلا— اور جب میں چلا کہوں تو اس کا مطلب آگے بڑھنا ہوتا ہے— واش بیسن کی طرف، اس نے گرم پانی کی ٹونٹی کھولی اور اس احتیاط سے کہ نقارے پر لگی ہوئی سرخ و سفید رنگ کی پالش پر نشان نہ پڑ جائے، نقارے پر چسپاں قیمت کی پرچی کو الگ کر دیا۔

جب ایک مختصر ملاقات کے بعد، جس میں اسے زیادہ تکلیف نہیں اٹھانی پڑی تھی، ماریا نے جانے کی تیاری کی تو پرانے نقارے کو اٹھایا، جس کو میں، 'ہربرٹ ٹروزنسکی' کی پشت کی داستان کے بیان، بحری جہاز کے چوبی نشان کی کہانیوں، اور Corinthians کے لیے لکھے جانے والے مراسلوں کی اپنی من مانی تشریح کے دوران تقریباً اچھی طرح تباہ کر چکا تھا۔ وہ اس نقارے کو گھر لے جا کر تہہ خانے میں ایک ساتھ اُن تمام تباہ شدہ نقاروں

کے ساتھ جن کے ذریعے میں اپنے نجی اور پیشہ ورانہ مقاصد پورے کر چکا تھا محفوظ کر دینے والی تھی۔ ''تہہ خانے میں تو اب زیادہ جگہ باقی نہیں رہی ہے۔'' اس نے ایک آہِ سرد کھینچتے ہوئے کہا، ''اب میں موسمِ سرما کے لیے اپنے آلو کس جگہ رکھوں گی؟''

میں، ماریا کے اندر پوشیدہ گھر والی کی شکایت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس طرح مسکرایا گویا میں نے کچھ سُنا ہی نہیں اور اس کو کچھ ہدایات دیں: استعمال شدہ نقاروں کو سیاہ روشنائی سے نمبر لگائے جانے چاہئیں اور اُن مختصر تفصیلات کو جو میں ہر نقارے کے کردار کے بارے میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر لکھ چکا ہوں، میری ڈائری میں منتقل کیا جانا چاہیے جو ایک عرصے سے تہہ خانے کے دروازے کی اندرونی جانب ٹنگی ہوئی ہے اور 1949 سے ہر نقارے کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔

ماریا نے دست برداری کے انداز میں اپنا سر ہلایا اور مجھے الوداعی بوسہ دیا۔ وہ کبھی میرے اس انداز کو سمجھ نہیں سکی ہے؛ بلکہ وہ تو اس کو تقریباً پاگل پن سمجھتی ہے۔ اب آسکر دیکھ سکتا ہے کہ ماریا کو کیا محسوس ہوتا ہے، کہ وہ خود بھی تباہ شدہ نقاروں کو جمع کرنے کے اپنے اس تفاخر کو سمجھ نہیں پایا ہے۔ اس کا سب سے تعجب خیز حصہ یہ ہے کہ وہ زندگی بھر آلو رکھنے کے تہہ خانے میں جمع اس کاٹھ کباڑ کے ڈھیر کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ وہ تجربے کے باعث جانتا ہے کہ بچے اپنے باپ کی جمع شدہ اشیا کی پروا نہیں کیا کرتے، کہ اس کا اپنا بیٹا 'کُرٹ' بھی ان قابلِ افسوس نقاروں پر اسی قسم کی نظر ڈالے گا جب یہ اس کو وراثت میں ملیں گے۔

تو پھر، ہر تین ہفتے بعد میں 'ماریا' کو کیوں یہ ہدایات دیتا رہتا ہوں، جن پر اگر عمل کیا جاتا رہا تو ایک دن ہمارے تہہ خانے میں بالکل جگہ نہیں رہ جائے گی، اور آلوؤں کو وہاں سے نکال باہر کرنا ہوگا؟

یہ خیال، جو اکثر و بیشتر میرے ذہن میں سر اُبھارتا ہے حالاں کہ اب اس میں کمی آتی جا رہی ہے کہ کسی دن کوئی عجائب گھر میرے ان از کار رفتہ نقاروں میں دل چسپی لے گا، اس وقت آیا تھا جب کئی درجن نقارے تہہ خانے میں جمع ہو چکے تھے؛ گویا یہ خیال میرے جمع کرنے کے جنون کی بنیاد میں نہیں ہو سکتا۔ میں جتنا زیادہ اس بارے میں سوچتا

ہوں اتنا ہی میرا خیال مجھے ایک سادہ سے مفروضے کی طرف لے جاتا ہے — خوف! کس کا خوف! یہ خوف کہ کسی دن نقاروں پر پابندی لگا دی جائے گی، کہ ان کے موجودہ ذخیرے تباہ کیے جا سکتے ہیں۔ ایک دن آسکر کو مجبوراً چند نقاروں کو نکال کر ان کی مرمت کرانی پڑے گی تا کہ اس خوف ناک عارضی عرصۂ بے نقارگی میں بھی میرا کام چلتا رہے۔

دماغ کے اسپتال کے ڈاکٹر بھی اس قسم کی تشریح پیش کرتے ہیں، مگر وہ اس کو مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ڈاکٹر (مس) 'ہارن سٹر' کو وہ تاریخ معلوم کرنے کا تجسس تھا، جس دن سے میری یہ پیچیدگی شروع ہوئی تھی۔ میں نے فوراً ہی اس کو بتا دیا تھا: نومبر 1938 کی نویں تاریخ، اس لیے کہ اسی دن 'مارکس سگسمنڈ' مجھ سے جدا ہو گیا تھا، جو مجھے نقارے فراہم کیا کرتا تھا۔ میری ماں کے انتقال کے بعد سے ضرورت کے وقت میرے لیے نقاروں کا حصول مشکل ہو گیا تھا؛ اس لیے کہ پھر وہ جمعراتیں نہیں آتی تھیں جب ہم 'آرسینل پیسج' جایا کرتے تھے، 'ماٹسیرات' مجھے بہت بے دلی سے نقارے فراہم کرتا تھا، اور 'جان برانسکی' کی مجھ سے ملاقاتیں بھی خال خال ہی ہوتی تھیں۔ اب، جب کہ کھلونوں کی دکان تباہ ہو گئی تھی، میری حالت واقعی دگر گوں ہو گئی تھی۔ 'مارکس' کے خالی میز پر بیٹھے رہنے سے مجھ پر صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ اب 'مارکس' مجھے نقارے فراہم نہیں کر سکے گا؛ کہ اب وہ کھلونے فروخت نہیں کرے گا؛ کہ اب خوب صورت سرخ وسفید نقارے بنانے والوں سے اس کے تعلقات ختم ہو چکے ہیں۔

مگر اس وقت میں یہ ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا کہ 'مارکس' کی موت کے ساتھ ہی میرے نسبتاً پُرسکون کھیل کود کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ کھلونوں کی تباہ شدہ دکان سے میں نے ایک ثابت نقارہ، اور دو کنارے پر جزوی نقصان شدہ نقارے منتخب کیے، اور اپنے خزانے سمیت گھر جاتے ہوئے میں اس تصور میں تھا کہ مشکل کے دنوں کے خلاف میرا تحفظ ہو گیا ہے۔

میں اپنے نقاروں کے بارے میں بہت محتاط ہو گیا تھا؛ میں اشد ضرورت کے وقت ہی نقارہ بجاتا تھا؛ میں نے پوری پوری شاموں کی اور ناشتے کے وقت کی نقارہ نوازی بھی ختم کر دی تھی، جو اب میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی۔ آسکر کا طرزِ اب فقیرانہ

ہو گیا تھا؛اس کا وزن کم ہونے لگا تھا، اور اسے ڈاکٹر 'ہولائز' اور اس کی معاون 'مسٹر اِنگی' کے پاس لے جایا گیا تھا، جو خود بھی رفتہ رفتہ بڑی چڑا ہوتی جا رہی تھی۔انھوں نے مجھے میٹھی، کھٹی، کڑوی اور کسیلی دوائیں دی تھیں اور میرے غدود کو موردِ الزام ٹھہرایا تھا، ڈاکٹر 'ہولائز' کے خیال کے مطابق، جنھوں نے کم تیز اور زیادہ تیز حرکات کے باعث میری جسمانی ساخت کو نقصان پہنچایا تھا۔

ڈاکٹر ہولائز کے چنگل سے رہائی پانے کے لیے آسکر نے اپنے طرزِ فقیرانہ میں اعتدال پیدا کیا، اور اپنا وزن بڑھا لیا تھا۔1939 کے موسمِ گرما تک وہ اپنی تین برس پُرانی حالت میں واپس آ چکا تھا، مگر اپنے گال کو متناسب بنانے کی کوشش کے دوران 'مارکس' کے نقارے کو ناقابلِ مرمت حد تک تباہ کر لیا تھا۔ وہ شے جو اس کے پیٹ پر لٹکی ہوتی تھی وہ ایک قابلِ رحم کھنڈر، زنگ آلودہ اور سوراخوں والی تھی؛ اس کا سُرخ و سفید رنگ تقریباً ختم ہو چکا تھا اور اس میں سے آواز بھی رنجیدہ سی نکلتی تھی۔

'ماتسیرات' سے امداد کی طلب فضول تھی، حالاں کہ وہ مددگار اور اپنے طرز میں ایک مہربان انسان تھا۔میری بیچاری ماں کی موت سے قبل، اس کو سوائے اپنے پارٹی کی مصروفیات کے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا؛ اور جب اُسے اپنے ذہن کو کسی اور طرف لگانے کی ضرورت ہوتی تو وہ اپنے یونٹ کے پارٹی لیڈروں سے گفت و شنید کرتا تھا۔یا آدھی رات کے قریب، جب خاصی مقدار میں شراب پی چکا ہوتا تھا، تو وہ زور زور سے، سیاہ فریم میں لگی ہٹلر اور بیتھوون کی شبیہوں سے خفیہ گفتگو کرتا، جب کہ وہ جینئس اس سے مقدر کی اور فیوہرر دوراندیشی کی باتیں کرتا تھا۔

میں چندہ جمع کرنے والے اتوار کے دنوں کی بات نہیں کرنا چاہتا۔ان میں سے ایک دن تھا جب میں نے ایک نیا نقارہ حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔'ماتسیرات' جس نے 'ہاؤپت اسٹراسے' اور 'اسٹرن فیلڈ اسٹور' کے قریبی آرٹ سینما کے باہر چندہ جمع کرتے صبح گزاردی تھی، دوپہر کے قریب گھر واپس آیا اور ہمارے دوپہر کے کھانے کے لیے کچھ کوفتے گرم کیے۔ کھانے کے بعد — مجھے اب بھی یاد ہے کہ کوفتے بہت مزے دار تھے — تھکا ماندہ چندہ جمع

کرنے والا صوفے پر کچھ دیر آرام کے لیے دراز ہو گیا۔ جوں ہی اس کے سانس سے گہری نیند کا پتا چلا، میں نے پیانو پر رکھے چندے سے بھرے بکس کو اُٹھایا اور دُکان میں غائب ہو گیا۔ کاؤنٹر کے نیچے چھپ کر میں نے اپنی توجہ ٹین کے ڈبوں کے سب سے بیہودہ اس ٹین کے ڈبے پر توجہ کی، اس لیے نہیں کہ اس میں سے میں ایک پینی بھی نکالتا۔ میرا نامعقول ارادہ اس کو نقارے کی طرح استعمال کرنے کا تھا، مگر میں کسی طرح بھی اس کو بجاتا، کسی طرح بھی چوبی چھڑیوں کا استعمال کرتا، مگر اس میں سے بس ایک قسم کی صدا آتی تھی: ''جاڑے کے موسم کے لیے مدد کیجیے''، ''کسی کو ٹھنڈا اور بھوکا نہیں رہنا چاہیے''، ''سردی کے موسم کے لیے مدد کیجیے۔''

آدھے گھنٹے کوشش کے بعد میں نے ہار مان لی؛ میں نے دُکان کے نقدی کے ڈبے سے پانچ پینی نکالی اور سردی کے موسم کی اپیل کے جواب میں ڈبے میں چندے کے طور پر ڈال دی، اور چندے کے ڈبے کو واپس لے جا کر پیانو پر رکھ دیا تاکہ ماتسیرات اتوار کا بقیہ دن اس کو ٹھنڈے اور بھوکے لوگوں کی امداد کے لیے بلاتے گزار دے۔

اس ناکام کوشش نے مجھے ایک سبق سکھا دیا تھا۔ اس کے بعد سے میں نے کبھی کسی ٹین کے ڈبے کو، کسی اُلٹی بالٹی کو یا واش بیسن کے پیندے کو نقارے کی مانند بجانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر کبھی اس قسم کی کوشش کی بھی تھی تو میں نے ان بیہودہ واقعات کو یاد رکھنے سے پرہیز کیا تھا اور کسی کاغذ کو ان کے تذکرے سے ضائع کرنا نہیں چاہا۔ ایک معمولی ٹین کا ڈبا نقارہ نہیں بن سکتا؛ بالٹی محض بالٹی ہوتی ہے اور واش بیسن منہ یا موزے دھونے کے کام آتا ہے۔ ایسی کوئی شے نہیں جو نقارے کا نعم البدل بن سکے؛ سفید رنگ کی سطح پر بنے شعلوں سے مزین ٹین کا نقارہ اپنا جواب آپ ہوتا ہے، اس کے لیے کوئی اور بول نہیں سکتا۔

آسکر یکہ و تنہا تھا، اس کے ساتھ دغا کی گئی تھی۔ آخر کس طرح وہ اپنا تین برس پرانا حلیہ برقرار رکھتا، جب اس کے پاس اپنا نقارہ نہیں تھا، جو اس کی بھلائی کے لیے ضروری تھا۔ اپنی ساری خرابیاں، میں برسوں جن کی مشق کیا کرتا تھا، یعنی کبھی کبھی بستر میں پیشاب کرنا، شام ڈھلے کی دعاؤں میں بچوں کی مانند غوں غاں کرنا، سانتا کلاز سے خوف کھانا، جس کا اصل نام 'گریف' تھا، میرا کبھی نہ تھکنے والا مسخرہ پن، تین برس کے بچوں جیسا سوال کرنا کہ کار میں پہیے

کیوں لگے ہوتے ہیں؟ یہ تمام فضولیات، بالغ لوگ جن کی مجھ سے توقع رکھتے، اب مجھے نقارے کے بغیر ہی کرنی پڑ رہی تھیں۔ جلد ہی یہ سب مجھے چھوڑنی پڑی تھیں۔ اپنی مایوسی کے دوران اب مجھے اس آدمی کی تلاش ہو گئی تھی جو میرا باپ نہ ہو، مگر شاید اسی نے میری بنیاد رکھی ہو۔ آسکر، ڈینگ استراسے پر بنے پولش محلّے سے قریب ہی 'جان برانسکی' کا انتظار کر رہا تھا۔

میری مما کے انتقال سے 'ماتسیرات' اور میرے انکل کے درمیان، اس دوران جو ڈاک خانے کے سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہو گیا تھا، رشتے منقطع ہو گئے تھے، وہ رشتے جو کبھی دوستی کے برابر ہوا کرتے تھے۔ اس میں اچانک کوئی رخنہ نہیں پڑا تھا، مگر ان تمام یادوں کے باوجود جو اُن میں مشترک تھیں، سیاسی بحرانات میں اضافے نے رفتہ رفتہ ان کو ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا۔ میری مما کے نازک وجود کے غائب ہو جانے سے ان دونوں آدمیوں کے درمیان کی دوستی کی وجہ بھی بکھر گئی تھی، جو اس کے وجود میں برابر برابر اپنے عکس دیکھتے تھے، اور اس کے جسم سے استفادہ کرتے تھے۔ اس غذائیت اور محدّب آئینے سے محروم، ان دو افراد کے درمیان ملاقات کی کوئی وجہ باقی نہیں رہ گئی تھی، جو متحارب سیاسی تصورات کے پیرو تھے، حالاں کہ وہ ایک ہی قسم کا تمباکو پیتے تھے، مگر نہ پولینڈ کا ڈاک خانہ، نہ صرف قمیصوں میں ملبوس پارٹی کے رہنماؤں سے ملاقاتیں ایک خوب صورت اور نرم دل خاتون کا نعم البدل ہو سکتی تھیں۔ باوجود شدید حقارت کے — 'ماتسیرات' کو اپنے گاہکوں کے اور اپنی پارٹی کے بارے میں دس بار سوچنا پڑتا تھا، اور 'جان' کو پولش ڈاک خانے کی انتظامیہ کا لحاظ رکھنا پڑتا تھا — میرے دونوں قیاسی باپ میری مما کے انتقال اور 'ہینگس منڈ مارگس' کے ختم ہونے کے عرصے کے دوران کئی بار مل چکے تھے۔

مہینے میں دو یا تین بار، آدھی رات کے قریب، ہماری بیٹھک کی کھڑکی کے شیشے پر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دیتی۔ 'ماتسیرات' پردے کو ایک طرف ہٹا کر جھانکتا تو دونوں ہی بے حد شرمندہ ہو جاتے، جب تک کہ ان میں سے کوئی شرمندگی مٹانے کے لیے skat کے آدھی رات کے کھیل کا خیال پیش نہیں کر دیتا تھا۔ پھر وہ 'گریف' کو اس کو سبزی کی دُکان سے طلب کرتے، یا اگر وہ راضی نہ ہوتا، جو اکثر 'جان' کی وجہ سے ہوتا تھا، اس لیے کہ سابقہ

اسکاؤٹ لیڈر ہونے کی وجہ سے ۔۔۔ اس دوران اس نے اپنے اسکاؤٹ گروپ کو توڑ دیا تھا ۔۔۔ اسے محتاط ہونا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ نہایت خراب کھلاڑی بھی تھا اور skat کے کھیل میں اسے زیادہ دل چسپی نہیں ہوتی تھی، تو وہ بیکری کے مالک 'الیکزانڈر شیفلر' کو، تیسرے کھلاڑی کے طور پر بلا لیا کرتے تھے۔ خود 'شیفلر' بھی زیادہ پُر جوش کھلاڑی نہیں تھا مگر مما سے خاص ربط کے باعث، وراثت کے طور پر اس کی دل چسپی بڑھ گئی تھی، اور کریانہ فروخت ہونے کے ناتے ان کا ایک ساتھ ہونے کا عہد بھی تھا، جو چھوٹی ٹانگوں والا' کلائن ہامر-وِیگ سے ماتسیرات کے فون کے جواب میں ہماری بیٹھک میں اپنی جگہ سنبھالنے کے لیے فوراً چل پڑتا تھا، وہ کیڑوں کے کاٹے ہوئے اپنے زرد اور آٹے کے رنگ کے ہاتھ سے تاش کے پتے پھینٹتا اور ان کو بھوکے لوگوں کو روٹی کی طرح کھلاڑیوں میں بانٹتا تھا۔

چوں کہ اس قسم کے ممنوع کھیل اصولی طور پر آدھی رات سے پہلے شروع نہیں کیے جاتے تھے، تا کہ تین بجے رات تک ختم ہو جائیں، جس وقت 'شیفلر' کی بیکری میں موجودگی ضروری ہوتی تھی؛ اور ایسا شاذ ہی ہوتا تھا کہ میں اپنے بستر سے اُٹھ کر نظر آئے بغیر، کسی قسم کی آواز کیے بغیر، اور اپنا نقارہ لیے بغیر کونے پر رکھی میز کے سایے میں روپوش ہو جاتا۔

بلا شبہ، اب تک آپ نے محسوس کر لیا ہوگا کہ مجھے، میزوں کے نیچے ہمیشہ غور و فکر کے آسان ترین مواقع ملتے تھے؛ اب میں وہیں موازنہ کیا کرتا تھا کہ میری مما کی موت کے بعد حالات کتنے بدل گئے تھے۔ 'جان برانسکی'، جو کبھی میز کے اوپر محتاط ہونے کے باوجود کھیل پر کھیل ہارتا جاتا تھا، مگر میز کے نیچے وہ بے باک جوتے کے بغیر موزے پہنے پیروں سے مما کی رانوں کے درمیان مہمات سر کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ اب، محبت تو کجا، skat کی میز پر سے جنس بھی غائب ہو گئی تھی۔ پتلونوں میں ملبوس چھ عدد مذکر ٹانگیں مختلف انداز میں مچھلی کے کانٹوں کے نمونے میں نیچے رکھی نظر آتی تھیں، جن میں سے کچھ برہنہ اور کچھ ٹخنوں تک بال سے محروم۔ نیچے ساری چھ ٹانگیں ایک دوسرے سے ہلکے سے مَس سے بھی محتاط، پھر بھی خوش قسمت، مگر میز کے اوپر ان کے تجاوزات ۔۔۔ بدن، سر، بازو ۔۔۔ خود کو ایسے کھیل میں مصروف رکھے ہوئے تھے جس کو سیاسی بنیادوں پر ممنوع ہونا چاہیے تھا، اس لیے

کہ ہر بار یا جیت ایسے غصیلے یا فاتحانہ انداز پیش کرتی تھی جیسے کہ پولینڈ کو بڑی شکست ہوئی ہے یا آزاد شہر ڈانٹسگ نے ایک اینٹوں والا ہاتھ جرمن رائخ سے جیت لیا ہے۔

یہ پیش بینی ہرگز ناممکن نہیں تھی کہ ایک دن جب یہ سارے جنگی کھیل، قلب ماہیت کے ساتھ ختم ہو جائیں گے اور، جیسا کہ جنگی کھیلوں میں ہوتا ہے، سب کٹھن حقیقتوں میں بدل جائیں گے۔

1939 کے موسم گرما کی ابتدا میں یہ واضح ہو گیا تھا کہ ماتسیرات کو اس کی پارٹی کی ہفتہ وار کانفرنسوں کے دوران پولینڈ کے ڈاک خانے کے افسران اور سابق اسکاؤٹ رہنماؤں کے مقابلے میں کم رعایت کرنے والے skat کے ساتھی مل گئے ہیں۔ جان برانسکی کو وہ کیمپ یاد تھا، بلکہ اسے یاد کرنے پر مجبور کیا گیا تھا، جس میں اس کا مقدر اسے لے گیا تھا؛ اس نے اپنے ڈاک خانے کے ساتھیوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے کی کوشش کی تھی؛ مثال کے طور پر، Marszalek Pilsudski میں اپنی خدمات کے زمانے سے معذور دربان 'کوبیلا' کی ایک ٹانگ ایک انچ یا اس سے کچھ زیادہ چھوٹی تھی۔ اس کے لنگ کے باوجود 'کوبیلا' لاجواب دربان تھا، ساتھ ہی ایک ہنرمند مرمت کرنے والا بھی، جو، مجھے محسوس ہوا تھا کہ میرے بیمار نقارے کو شفایاب بھی کر سکتا تھا۔ کوبیلا کی جانب جانے والا راستہ جان برانسکی سے ہو کر جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے شام چھ بجے کے بعد پولینڈ والوں کی آبادی کے قریب جان کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگست کی دم گھونٹنے والی گرمی میں بھی میں نے انتظار کیا، مگر جان، جو عام طور پر کام ختم ہونے کے بعد بڑی پابندی سے گھر کی طرف چل پڑتا تھا، نظر نہیں آیا۔ اپنے آپ سے یہ سوال کیے بغیر کہ تمھارا قیاسی باپ کام ختم ہونے کے بعد کیا کرتا ہے، میں اکثر سات یا ساڑھے سات بجے تک اس کا انتظار کرتا تھا۔ میں آنٹی 'ہیڈوگ' کے پاس چلا گیا ہوتا۔ شاید جان بیمار تھا؛ ہو سکتا ہے کہ اس کو بخار رہا ہو یا اس کا پاؤں ٹوٹ گیا ہو اور اس پر پلاسٹر چڑھا رہا ہو۔ آسکر وہیں ٹھہرا رہا اور کبھی کبھی ڈاک خانے کے سیکریٹری کے فلیٹ اور کھڑکیوں پر لگے پردوں کی جانب دیکھنے پر اکتفا کر لیتا تھا۔ آسکر کو آنٹی ہیڈوگ سے ملنے کے بارے میں حیرت انگیز ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی جس کی مادرانہ، گائے کی سی آنکھ نے اس کو افسردہ

کردیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے ہم نسلی کے بچوں، یعنی اس کے قیاسی بھائی بہن سے زیادہ رغبت نہیں تھی۔ وہ لوگ اس کے ساتھ کھلونے کی طرح پیش آتے تھے۔ اور اس کھلونے سے کھیلنا چاہتے تھے۔ اسٹیفنی کو کیا حق تھا جو صرف پندرہ برس کا تھا، کہ وہ اس پر باپ جیسی یا اسکول ماسٹر جیسی کرم فرمائی کرتا؟ اور چوٹیوں اور موٹے گول مٹول چہرے والی دس برس کی مارگا کو کس نے حق دیا تھا کہ وہ آسکر کو ایک پتلے کی مانند دیکھتی، اس کو کپڑے پہناتی، کنگھی کرتی، برش سے سنوارتی اور اس کو ہر گھنٹے لیکچر دیا کرتی؟ ان دونوں کے لیے میں پریشان خیالی اور ایک رقت انگیز ہونے سے زیادہ نہیں تھا، جب کہ وہ لوگ عام جسم کے بڑے مستقبل والے تھے۔ وہ تو نانی اماں کو واچکی کے پسندیدہ بھی تھے، مگر مجھے یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ میں نے ان کے لیے مشکلیں کھڑی کردی تھیں۔ مجھے پری کہانیوں اور تصویری کتابوں میں زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ مجھے اپنی نانی سے صرف اتنی توقع تھی کہ آج میں خوب صورت تفصیل والے جتنے خواب دیکھتا ہوں، وہ بہت سادہ بھی ہیں اور صاف بھی، اور اسی وجہ سے ان کا حصول مشکل ہے: جوں ہی اس نے نانی کو دیکھا، تو آسکر نے اپنے نانا کو واچکی کی تقلید کرنے اور اس کے لہنگے کے نیچے پناہ لینے کی کوشش کی تھی اور اگر ممکن ہوتا تو وہ کبھی اس کے حفاظتی شامیانے کے باہر سانس بھی نہ لیتا۔

میں اس خیمے میں داخل ہونے کی کوشش میں کس حد تک گیا تھا۔ مجھے یقین نہیں کہ وہ اس کے نیچے آسکر کے بیٹھنے کو ناپسند کرتی، مگر اسے کچھ تامل تھا اور ہمیشہ کی طرح اس نے انکار کردیا تھا؛ میرا خیال ہے کہ وہ کسی بھی شخص کو جس میں کو واچکی کی نصف شباہت بھی آتی ہو، اجازت دے دیتی؛ جب کہ میں تھا جس سے نہ اس کی جسامت ملتی تھی اور نہ دیا سلائی سمیت اس کے آگ لگانے والے ہاتھ ملتے تھے، جو اس کی جیسی گھات لگا سکتے تھے۔

میں تصور کرسکتا ہوں کہ تین برس کا آسکر ربڑ کی گیند سے کھیل رہا ہے، اور اتفاق سے گیند لڑھکتی ہوئی اس کے لہنگے کے نیچے چلی جاتی ہے، اور قبل اس کے کہ نانی اماں اس کی چالاکی کو سمجھتے ہوئے اسے گیند واپس کردیتی، گیند کی تلاش کے بہانے آسکر اس کے نیچے چلا جاتا۔ جب بالغ لوگ موجود ہوتے، تو میری نانی اماں کبھی دیر تک مجھے اپنے لہنگوں کے نیچے

رہنے نہیں دیتی۔ اس لیے کہ بالغ لوگ اکثر بہت بیہودے انداز میں اس کا مذاق اڑاتے اور آلو کے کھیت میں اسے اپنی شادی کی اس وقت تک یاد دلاتے رہتے، جب تک کہ میری نانی اماں، جو فطری طور پر زرد چہرے والی نہیں تھی، شرم سے سرخ نہ ہو جاتی، کہ اس قسم کی لجاوٹ اس کے تقریباً سفید بالوں پر — کہ وہ ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھی — سجتی نہیں تھی۔

مگر جب میری نانی اماں بالکل اکیلی ہوتی — جیسا کہ کبھی کبھار ہی ہوتا تھا، کہ میں اپنی ماں کے انتقال کے بعد سے بتدریج اس کے پاس کم جانے لگا تھا، اس لیے اور بھی کہ اس نے لانگ فوز کے ہفتہ وار بازار میں اپنا اسٹال لگانا چھوڑ دیا تھا — وہ مجھے اپنی آلو کے رنگ کے لہنگوں کے نیچے پناہ لینے اور اس کے نیچے زیادہ دیر تک ٹھہرنے دینے پر زیادہ مائل نظر آتی تھی۔ ایسے میں تو مجھے ربڑ کی گیند کی احمقانہ چالاکی کی بھی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ اپنے نقارے کے ساتھ فرش پر پھسلتے ہوئے، ایک پاؤں پر زور دیتے ہوئے فرنیچر کے سہارے، میں نانی اماں کے پہاڑ نما لہنگوں کے خیمے کی طرف چلا جاتا؛ اور اس کے پاؤں کے قریب پہنچ کر میں اپنے چوب نقارہ سے چار پرتوں والی نقاب اٹھاتا، اور ایک بار نیچے چلا جاتا تو، ان کو فوراً ہی گر جانے دیتا۔ اور ایک لمحے کے لیے ساکت بیٹھا، میں ایسے مکھن کی بو سونگھتا رہتا جو کئی موسم گزر جانے کے بعد بھی زیادہ خراب نہیں ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد آ سکر اپنی نقارہ نوازی شروع کر دیتا۔ یہ جانتے ہوئے کہ اس کی نانی اماں کیا سننا پسند کرتی ہے، میں اپنے نقارے سے اکتوبر کی بارش کی آواز نکالتا، ویسی ہی آواز جو اس نے سلگتے ہوئے آلو کے پودوں کے پاس بیٹھے سنی ہوگی، جب کوواچکی، کسی آگ لگانے والے شخص جیسی بو دیتا ہوا اس کے پاس پناہ کے لیے آیا تھا۔ پھر میں نقارے سے بارش کی آڑی گرتی ہوئی بوندوں کی آواز اس وقت تک نکالتا رہتا جب تک کہ میرے اوپر سے بے چین سانسوں اور صوفیوں کے ناموں کی آوازیں آنے نہیں لگتیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ بے چین آہوں اور صوفیوں کے ناموں سے آپ کیا مطلب نکالتے ہیں، جو 1899 میں لیے گئے تھے، جب میری نانی تو بھیگی بارش میں بھیگ رہی تھی اور اس خیمے کے نیچے کوواچکی پاک صاف بیٹھا ہوا تھا۔

جب میں پولش آبادی کے باہر، 1939 میں جان برانسکی کا انتظار کرتا، تو مجھے

اکثر اپنی نانی اماں یاد آجاتی تھی۔شاید اس وقت وہ آنٹی ہیڈ وگ کے پاس گئی ہوئی ہوتی تھی، مگر اس کے لہنگے کے نیچے بیٹھنے اور بو دیتے مکھن کی بو سونگھنے کی رغبت کے باعث بھی نہ میں دو منزل سیڑھیاں چڑھا، نہ میں نے جان برانسکی کے نام کی تختی کے نیچے لگے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ آسکر کے پاس اپنی نانی کو دینے کے لیے تھا ہی کیا؟ اس کا نقارہ ٹوٹا ہوا تھا، اس سے موسیقی کی آواز نہیں نکلتی تھی، اس کو بارش کی آواز بھی یاد نہیں رہی تھی، وہ بارش جو آلوؤں کے پودوں کے جلتے ہوئے ڈھیر پر آڑی ترچھی گرتی تھی۔اور چوں کہ خزاں کی یہی آوازیں اس کی نانی کو متوجہ کرنے کا طریقہ تھیں، وہ 'رنگ استراسے' سے دور ہی رہتا، پانچ نمبر ٹرام گاڑی کو دیکھتا، جب وہ 'میرے ساتھ' آتے جاتے اپنی گھنٹیاں بجاتی تھیں۔

تو کیا میں اب بھی جان کے انتظار میں تھا؟ کیا میں نے اس سے ملنے کا ارادہ ترک نہیں کر دیا تھا؟ میں اس وقت بھی اسی مقام پر کھڑا تھا؛ کیا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ابھی تک میں نے جانے کے کسی قابلِ قبول طریقے کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا؟ کبھی کبھی دیر تک ٹھہرنا تعلیماتی بھی ہو سکتا ہے، مگر طویل انتظار انسان کو آنے والے مقابلے کے ایسے سحر میں بھی مبتلا کر دیتا جو خوش آئند حیرتوں کے امکانات کو تباہ کر دیتا ہے۔پھر بھی، جان نے مجھ کو حیران کر دیا تھا۔ میں تو اس کو اچانک دھر پکڑنے، اور اپنے بچے کھچے نقارے سے نغمہ باری کرنے کے لیے چوب نقارہ تیار کیے کھڑا تھا۔ اگر میرے نقارے کی کراہیں اور چیخیں ہی میری ناامیدی کی کیفیات کا اظہار کر سکتیں، تو بیزار کن حد تک طویل تشریحات کی ضرورت نہیں ہوتی۔پانچ مزید ٹرام گاڑیاں— میں خود سے کہہ رہا تھا— مزید تین، صرف یہ والی؛ اور میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی، جب میں تصور کر رہا تھا کہ جان کی درخواست پر برانسکی خاندان کا 'ماڈلن، یا 'وارسا' تبادلہ ہو رہا ہے۔اور میں تصور ہی میں جان کو رام برگ یا تھارن کا پوسٹ ماسٹر دیکھ رہا تھا۔پھر اپنے آپ سے کیے وعدوں کے خلاف، میں نے ایک اور ٹرام گاڑی کا انتظار کیا، اور گھر واپس جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ آسکر کو کسی نے عقب سے پکڑ لیا۔ایک بالغ شخص نے اپنے ہاتھوں سے آسکر کی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

مجھے قیمتی صابن کی خوش بو میں بسا نرم ہاتھ محسوس ہوا، دل پذیر، خشک مردانہ

ہاتھ — وہ جان بمانسکی ہی تھا۔

جب میں اس کی گرفت سے آزاد ہوا اور اس نے قہقہہ مار کر مجھے اپنے اطراف گھمایا تو نقارے کے ذریعے اپنے دگر گوں احوال کا مظاہرہ کرنے میں دیر ہو چکی تھی۔ لہٰذا میں نے نقارے بجانے والی دونوں چوب اپنی گندی نیکر، جس کے دونوں جیب پھٹے ہوئے تھے، کہ ان دنوں میرا خیال کرنے والا کوئی نہیں تھا، سنبھالنے والی گیلس میں اڑس لیے تھے۔ اس طرح میرے دونوں ہاتھ نقارہ اٹھانے کے لیے آزاد ہو گئے تھے، ان اعتراضات سے بھی بلند جو فادر 'وینکے' نے مقدس اجتماع کے دوران لگائے تھے، میں بھی جن کے جواب میں کہہ سکتا تھا، یہ میرا جسم ہے۔ یہ میرا خون ہے، مگر میں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ میں صرف اپنا خستہ نقارہ بلند کیے ہوئے تھا۔ مجھے کسی قسم کی بنیادی یا معجزانہ قلب ماہیت کی خواہش بھی نہیں تھی: مجھے تو صرف اپنے نقارے کی مرمت کی فکر تھی، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

جان کا قہقہہ محض جذباتی عمل تھا۔ اس کو اپنا یہ عمل نا وقت معلوم ہوا ہوگا، اسی لیے وہ اک دم رُک گیا تھا۔ اس نے میرا نقارہ دیکھا مگر وہ میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا، مگر اس نے فوراً ہی نقارے سے نظریں ہٹا کر میری چمک دار، تین برس والی آنکھوں کی طرف دیکھا جس سے اس وقت بھی راست بازی جھلک رہی تھی۔ پہلے تو اسے اور کچھ نظر نہیں آیا تھا سوائے نیلی پتلیوں کے، جو جھلک اور انعکاس نور سے لبریز تھیں، کہ یہ مختصر آنکھیں ہر قسم کی کمی سے ماورا تھیں، پھر وہ یہ قبول کرنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ میری آنکھوں کے انعکاس کی صلاحیت کسی اعلیٰ درجے کی چھوٹی سی جھیل کے مقابلے میں نہ کم تھی نہ زیادہ، اس نے اپنی تمام تر خوش اخلاقی جمع کی، اپنی یادداشت کو مرتکز کیا اور میرے کاسۂ چشم میں میری مما کی حسین آنکھوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی جو کئی برس تک، اس کے لیے، خیر خواہی سے لے کر جوش اور ولولے تک کے جذبات منعکس کرتی رہی تھیں۔ شاید وہ میری آنکھوں میں اپنی پرچھائیں پا کر مضطرب ہو گیا تھا، مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ جان ہی میرا باپ تھا یا میں صحیح معنوں میں اسی کا نطفہ تھا۔ اس لیے کہ اس کی آنکھوں، مما کی آنکھوں اور میری آنکھوں میں وہی ذی شعور بھولپن، وہی نورانی پن، وہی بے محل حسن موجود تھا جو تمام

بہ انسکیوں میں، اشٹفنن میں، مارگا میں کم و بیش پایا جاتا ہے، سب سے زیادہ میری نانی اور اس کے بہادر وِنسلٹ میں۔ پھر بھی میری نیلی آنکھوں اور سیاہ پلکوں کے باوجود مجھ میں کوواچکی کے آتش زن خون کی ہلکی سے بھی جھلک نہیں ملتی — تو میں اپنے گانے کے ذریعے شیشے توڑنے پر خوشی کا کیا جواز پیش کروں؟ جب کہ اس میں رھائیت (Rhenish) اور ماتسیراتی خصوصیات کی تمیز کرنا میرے لیے بہت مشکل کام ہوگا۔

اُس موقعے پر، جب میں نے اپنا نقارہ اٹھایا اور اپنے کام پر نظریں مرکوز کیں، خود جان کو بھی، جو ایسے سوالات نظر انداز کرنا چاہتا تھا، اعتراف کرنا پڑے گا، اگر اس سے براہِ راست پوچھا جائے، کیا یہ اس کی ماں ایگنس ہے جو میری طرف دیکھ رہی ہے؟ یا شاید میں خود ہی اپنی جانب دیکھ رہا ہوں۔ اس کی ماں اور میرے درمیان بہت کچھ مشترک تھا، مگر ایک بار پھر، وہ میرا انکل کوواچکی ہو سکتا ہے جو یا تو امریکا میں ہے، یا سمندر کی تہہ میں، مگر وہ ماتسیرات ہرگز نہیں جو میری طرف دیکھ رہا ہے، اور یہی صحیح ہے۔

جان نے میرا نقارہ لیا، اس کو گھما پھرا کر، ٹھونک بجا کر دیکھا۔ اس بے عمل، پتلی پتلی انگلیوں والے نے، جو ٹھیک سے ایک پنسل بھی تراش نہیں سکتا، اپنے اطراف ایسے شخص کا ہالا بنا لیا جیسے کہ نقاروں کی مرمت کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہو۔ ظاہری طور پر، فیصلہ کرتے ہوئے جس سے اس کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، میری حیرت کی انتہا نہیں رہی، جب اس نے میرا ہاتھ تھاما، اس لیے کہ مجھے اس سے اس سُرعت کی توقع نہیں تھی، اور وہ مجھ کو 'رنگ استراسے' سے 'ہیری سینگر' کے ٹرام اسٹاپ تک لے گیا۔ اور جب ٹرام کار آئی تو وہ مجھ کو اس ٹریلر کے اندر کھینچ لے گیا جس میں تمباکو نوشی کی اجازت تھی۔

جیسا کہ آسکر کو شبہ ہوا تھا، ہم لوگ شہر کی طرف جا رہے تھے، ہو،لیس پلاٹز کے پولش ڈاک خانے کی طرف، دربان 'کوبیلا' سے ملنے، جس کے پاس اوزار تھے اور وہ ہنر بھی، جو آسکر کے نقارے کی اشد ضرورت تھا۔

اس ۵ نمبر ٹرام کار کا جھن جھن کرتا مختصر سفر نہایت پُرسکون تفریح کا سفر ہوتا، اگر ہمارا یہ سفر یکم ستمبر 1939 سے قبل ہوا ہوتا۔ اس دن 'میکس-ہالبے-پلاٹز' کے اسٹاپ پر

ٹرام کار تھکے ماندے شور مچاتے 'بروُسن' کے نہانے والوں سے بھر گئی تھی۔ وہ گرمی کے موسم کی کتنی سہانی شام ہوتی، کیفے 'وانٹزکے' میں نقارہ جمع کرنے کے بعد سوڈا پینے کا کیا لطف ہوتا اگر لڑاکا بحری جہاز Schleswig اور Schleswig Holstein بندرگاہ کے دہانے پر اپنا لنگر ڈالے، خوف ناک آہنی بازوؤں، دہری نالوں والی توپیں اور مورچے نما بندوقیں تانے کھڑے نہ ہوتے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر پولش ڈاک خانے کے دربان کو بیلا کے گھر کے باہر گھنٹی بجا کر ایک معصوم بچے کے نقارے کو مرمت کے لیے چھوڑا جا سکتا، اگر پچھلے چند ماہ کے اندر ڈاک خانے میں آہنی پلیٹیں نہ لگا دی گئی ہوتیں اور اس کو قلعے میں تبدیل نہ کر دیا گیا ہوتا جس میں، اس سے قبل تک معصوم، امن سے محبت کرنے والے افسران، کلرک اور ڈاکیے کام کیا کرتے تھے، جو اپنے ہفتے وار چھٹی کے دن Gdingen اور Oxhoft کے کیمپوں میں تربیت میں گزارتے تھے۔

ہم 'اولیوا' گیٹ پہنچنے ہی والے تھے۔ جان برانسکی پسینے میں شرابور تھا، اس کی نظریں ہنڈن برگ ایلی کے دھول بھرے سبز پیڑوں پر جمی ہوئی تھیں، اور وہ سنہرے ٹپ والی سگریٹ پر سگریٹ داغے جا رہا تھا، جو اس کے معاشی بجٹ کے خلاف تھا۔ آسکر نے کبھی اپنے قیاسی باپ کو اس قدر پسینہ آتے نہیں دیکھا تھا، سوائے دو یا تین مواقع کے، جب وہ اس کی مما کے ساتھ صوفے پر نظر آیا تھا۔

مگر میری بیچاری مما کو مرے کافی دن ہو گئے تھے۔ اب جان برانسکی کو پسینہ کیوں آ رہا تھا؟ جب میں نے دیکھا کہ وہ ہر اسٹاپ پر ٹرام سے اترنے کی تیاری کرتا، مگر ہر بار بالکل آخری وقت اس کو میری موجودگی یاد آ جاتی، اور جب مجھے احساس ہوا کہ اگر اسے واپس کرسی پر بیٹھنا پڑتا تھا تو وہ میری اور میرے نقارے کی وجہ سے ہوتا تھا، تب مجھے معلوم ہوا کہ اس کو پسینہ کیوں آ رہا تھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایک افسر ہونے کی حیثیت میں پولش ڈاک خانے کی حفاظت اس کی ذمے داری تھی۔ وہ اس کام کے لیے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا، مگر اس کی 'رنگ اسٹراسے' اور 'ہیرے ساگر کے کونے پر مجھ سے اور میرے نقارے سے ٹکر ہو گئی تھی، مگر اس نے اپنا فرض نبھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے

مجھ کو ٹرام میں گھسیٹا؛ میں نہ کوئی افسر تھا اور نہ ڈاک خانے کے تحفظ کے قابل، اور اب وہ ٹرام کار میں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اور پسینہ بہا رہا تھا۔ وہ ٹرام سے اُتر کیوں نہیں گیا؟ یقیناً، میں اس کو روکتا تو نہیں۔ اب بھی وہ اپنی زندگی کے عروج پر تھا، پینتالیس برس کا بھی نہیں ہوا تھا، آنکھیں نیلی اور بال بھورے تھے۔ اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ سلیقے سے سنوارے ہوئے تھے، اور اگر وہ اتنی بُری طرح پسینے میں شرابور نہ ہوتا تو جب آسکر اپنے قیاسی باپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا تو اس کے نتھنوں میں پسینے کی نہیں کولون کی خوشبو آ رہی ہوتی۔

'ہولٹز مارکٹ' کے قریب پہنچ کر ہم ٹرام کار سے اتر گئے اور 'آلشٹیڈ ٹشر' تک پیدل چلے۔ گرمیوں کے موسم کی خاموش رات تھی۔ گھنٹیوں کی کڑک دار آواز آسمانوں کی طرف جا رہی تھی، جیسا کہ ہمیشہ آٹھ بجے ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی کبوتروں کا بادل سا فضا میں بلند ہو گیا۔ گھنٹیاں "Be True and Upright to the Grave" گا رہی تھیں۔ اس قدر خوب صورتی سے کہ سُن کر رونا آ جائے، مگر ہمارے لیے صرف قہقہے تھے۔ عورتیں اور سورج کی کرنوں کے سنولائے ہوئے بچے، ساحل کی سوتی قبائیں، تیز رنگوں کے بڑے بڑے گیند اور بادبانوں کی کشتیاں، 'گلیٹکاؤ' اور 'ہیوبوڈے' کے ساحلوں سے تازہ تازہ نہائی ہوئی حسین لڑکیاں۔ سورج میں پکی ہوئی رس بھری کے برف جیسے ٹھنڈے شربت کے نشے میں مست لڑکیاں۔ ایک پندرہ برس والی کی آئس کریم گر گئی، اس کو اُٹھانے ہی والی تھی، مگر وہ ہچکچائی اور پھر اس نے ارادہ بدل دیا، اور تیزی سے پگھلتی ہوئی اس لذت کو پیدل چلنے والے پتھروں اور گزرنے والے جوتوں کے تلووں کے لیے چھوڑ دیا: جلد ہی وہ بالغ ہو جائے گی اور سڑک پر آئس کریم کھانا چھوڑ دے گی۔

'شنائیدر موہلن گاسے' پہنچ کر ہم بائیں جانب مڑ گئے۔ 'ہے ویلیئس پلاٹز' کو، جہاں تک یہ چھوٹی سی گلی جاتی تھی، SS Home Guards نے بند کر دیا تھا اور وہ گروہوں میں جا بجا کھڑے ہوئے تھے: نوجوان اور عمر رسیدہ لوگ، بازوؤں پر پٹیاں باندھے اور پولیس کی رائفلیں لیے ہوئے تھے۔ اس محاصرے سے بچتے ہوئے کسی اور طرف سے نکل کر 'رَحم' سے ڈاک خانے تک جانا آسان ہو سکتا تھا، مگر جان برانسکی جان بوجھ کر سیدھا

SS والوں کے پاس گیا۔ اس کا مقصد واضح تھا: وہ چاہتا تھا کہ اپنے بڑے افسروں کی نظروں میں، جو بے ڈیلیکس پلازہ پر یقیناً نگاہ رکھے ہوئے ہوں گے، اس کو روک دیا جائے، اور واپس بھیج دیا جائے، اس کو امید تھی کہ اس طرح وہ ایک نسبتاً محترم اور پسپا کی ہوئی شخصیت بن کر اسی پانچ نمبر ٹرام سے گھر واپس لوٹ جائے گا، جس پر سوار ہو کر یہاں تک آیا تھا۔

ہوم گارڈ والوں نے ہم کو چلا جانے دیا؛ شاید ان کو اس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ مہذب لباس میں ملبوس ایک شریف انسان، جس کے ساتھ ایک تین برس کا بچہ بھی ہے، ڈاک خانے جانا چاہتا ہے۔ انھوں نے نہایت شائستگی سے ہمیں محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور جب تک ہم بیرونی پھاٹک سے باہر نکل نہیں گئے تھے جو مرکزی دروازے تک لے جاتا تھا، انھوں نے "ٹھہرو" کی آواز نہیں لگائی۔ جان لاپروائی سے ایک طرف مڑ گیا۔ بھاری دروازہ تھوڑا سا کھلا اور ہم کو اندر گھسیٹ لیا گیا۔ اب ہم خوش گوار ٹھنڈک اور ایک نصف روشن مرکزی ہال میں تھے۔

جان برانسکی کے ساتھیوں نے اسے دوستانہ انداز میں خوش آمدید نہیں کہا۔ انھیں جان پر اعتبار نہیں رہ گیا تھا، وہ شاید اس سے ہاتھ دھو چکے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے صاف صاف کہا تھا، وہ سب جان پر شبہ کر رہے تھے کہ یہ ڈاک خانے کے محکمے کا سیکریٹری اپنے فرائض سے پہلو تہی کرے گا۔ جان کو اپنی صفائی پیش کرنے میں مشکل ہو رہی تھی۔ کسی نے اس کی بات نہیں سُنی۔ اس کو آدمیوں کی ایک قطار میں دھکیل دیا گیا تھا جو تہ خانے سے ریت بھری بوریاں لا رہے تھے۔ ریت بھری بوریاں اور دوسری غیر متعلق چیزیں شیشے والی کھڑکیوں کے پیچھے جمع کی جا رہی تھیں؛ فائل رکھنے والی الماریاں اور دوسرے بھاری فرنیچر کو مرکزی دروازے کے قریب لے جایا جا رہا تھا، تا کہ ہنگامی حالات میں اس کی ناکہ بندی کی جا سکے۔

کسی نے آگے بڑھ کر میرے بارے میں سوال کیا کہ میں کون ہوں، مگر ان کے پاس جان کے جواب کے انتظار کرنے کا وقت نہیں تھا۔ لوگ بہت گھبرائے ہوئے تھے؛ ایک دوسرے پر غصہ کر رہے تھے، اچانک ضرورت سے زیادہ محتاط ہو جاتے اور سرگوشی کرنے لگتے۔ میرا نقارہ اور اس کی مشکل بھلا دی گئی تھی۔ کوبیلا دربان، جس پر میں بھروسا کر رہا تھا،

میں نے جس سے توقع رکھی تھی کہ وہ میرے گلے میں لٹکنے اس کباڑ کے ڈھیر کو بحال کر دے گا، کہیں نظر نہیں آیا؛ وہ شاید اس عمارت کی تیسری یا چوتھی منزل پر تھا، اور ہمارے اطراف کے کلرکوں، ڈاکیوں کی طرح بخار زدہ کیفیت میں ریت بھری بوریاں جمع کر رہا ہوگا، جن کا مقصد بندوق کی گولیوں کو روکنا تھا۔ اُس جگہ آسکر کی موجودگی یرانسکی کے لیے واقعی پریشانی کا باعث تھی۔جوں ہی ایک شخص، جس کو لوگ ڈاکٹر 'می شون' کے نام سے پکار رہے تھے، جان کو احکام دینے بڑھا، میں وہاں سے کھسک گیا تھا۔نہایت احتیاط سے، اس ڈاکٹر می شون، سے بچتا بچاتا، جو لوہے کی بنی پولش ہیٹ پہنے ہوئے تھا اور بظاہر پوسٹ ماسٹر لگتا تھا، میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور مجھے دوسری منزل لے جانے والی سیڑھی نظر آ گئی۔دوسری منزل کی راہداری کے آخر میں، مجھے ایک درمیانہ درجے اور بغیر کھڑکیوں کا کمرہ نظر آ گیا جہاں کوئی نہ اسلحے کی پیٹیاں تھیں اور نہ کوئی ریت بھری بوریاں جمع کر رہا تھا۔دراصل یہ کمرہ ویران تھا۔

رولروں پر رکھی گئی جھابیاں ڈھکیل کر ایک جگہ کھڑی کر دی گئی تھیں؛ وہ ڈاک کے رنگا رنگ ٹکٹ لگے خطوں سے بھری ہوئی تھیں۔اس کمرے کی چھت بہت نیچی تھی اور اس کی دیواروں پر سُرخ رنگ کا کاغذ چڑھا ہوا تھا۔مجھے ربڑ کی ہلکی سی بو محسوس ہوئی۔ چھت سے بجلی کا ایک بلب لٹک رہا تھا جس پر کوئی شیڈ نہیں لگا تھا۔آسکر تکان کے باعث بجلی کا بٹن تک ڈھونڈنے کے قابل نہیں تھا۔اور پھر دور سے سینٹ میری، سینٹ کیتھرین، سینٹ جان، سینٹ برجیٹ، سینٹ باربرا، ٹرنٹی اور کارپس کرسٹی کی گھنٹیوں نے اعلان کیا— نو بج گئے ہیں۔اب تمھیں سو جانا چاہیے، آسکر اور میں ڈاک کے بکسوں میں سے ایک میں لیٹ گیا، اپنے نقارے کو بھی اپنے پہلو میں لٹا دیا، جو اتنا ہی تھکا ہوا تھا جتنا کہ میں اور ہم پر نیند غالب آ گئی۔

# پولش ڈاک خانہ

میں 'لوڈز'، 'کوبلس'، 'لمبرگ'، 'تھارن'، 'کراکاؤ' اور 'شتشوشاؤ' سے بھیجے ہوئے اور 'لوڈز'، 'لگلس'، 'تورن'، 'کراکو' اور 'زیستوکوا' جانے والے خطوط سے بھرے لانڈری کی تھیلے میں سویا تھا، مگر مجھے خواب میں نہ 'بڑکا بوسکا' اور نہ 'زیستوکوا' نظر آئے، نہ ہی 'بلیک میڈونا'۔ میں نے اپنے خوابوں میں نہ Marszalek Pilsudski کو گترا، جو 'کراکو' میں محفوظ ہے، نہ ہی اورک کی ڈبل روٹیوں کو، جن سے 'تھارن' نامی شہر اس قدر مشہور ہے۔ مجھے تو ابھی تک اپنا غیر مرمت شدہ نقارہ بھی خواب میں نظر نہیں آیا ہے۔ بغیر خوابوں کے رولر پر رکھی لانڈری کے تھیلے میں لیٹے آسکر کو وہ سرگوشیاں، چوں چوں کی آوازیں اور نہ بک بک سنائی دی جو فضا کو بھر دیتی ہیں، جب بہت سے خط ڈھیر کی صورت پڑے ہوں۔ میرے نزدیک تو ان خطوں نے ایک حرف بھر سانس بھی نہیں لی، مجھے کسی ڈاک کی توقع نہیں تھی، اور کسی بھی شخص کو مجھے مکتوب الیہ کے طور سمجھنے کا ذرا بھی احساس نہیں تھا، فریسندہ کا تو ذکر ہی کیا۔ خوابوں کی صورت اور خود کفیل میں ڈاک کے پہاڑ پر اپنا ڈھانچہ سمیٹے سو رہا تھا، وہ پہاڑ جو دنیا بھی ہو سکتا تھا۔

لہٰذا مجھے اس خط نے نہیں جگایا تھا جو 'وارسا' کے کسی شیخ میلیو یک' نے 'واشنگ' میں اپنی بھتیجی شینڈلز کے نام لکھا تھا، ایک خط جو اتنا نظر انگیز تھا کہ ایک ہزار سالہ کچھوے کو بھی جگا دیتا؛ جن آوازوں نے مجھے جگایا تھا وہ یا تو مشین گن سے نکلنے والی گولیوں کی

تھی، یا ایک ساتھ کئی توپوں کے گولے داغنے کی دور سے آنے والی گرج، جو بحری جہازوں کی توپوں سے فری پورٹ پر پھینکے جا رہے تھے۔

یہ لکھ دینا کس قدر آسان ہوتا ہے: مشین گنیں، دہری نالیں۔ یہ تو فوارہ، ژالہ باری اور گرمی کے آخری دنوں کا وہ طوفان بھی ہو سکتا تھا، جیسا طوفان میری پیدائش کے ساتھ آیا تھا۔ میں بہت غنودہ ہو رہا تھا، اس قسم کی قیاس آرائی میرا اندازِ تحریر نہیں۔ ان آوازوں کے ساتھ جو ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھیں، مجھے صحیح اندازہ ہو گیا تھا، اور ان تمام سونے والوں کی طرح میں بھی یہ کہہ کر سو رہا: ارے، یہ وہی لوگ ہیں جو گولیاں چلا رہے ہیں۔

آسکر، لانڈری کی جھابی سے نکل پڑا اور اپنے وحن جیسے پتلے پتلے پیروں پر لرز رہا تھا۔ سب سے پہلے تو اس کو اپنے نقارے کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے خطوں کے ڈھیر میں ایک بڑا سا سوراخ بنایا، مگر اس معاملے میں وہ وحشی نہیں ہو رہا تھا؛ حالاں کہ وہ ڈھیر ڈھیلا ڈھالا تھا، اکثر خط فاختہ کی دُم جیسی شکل کے تھے، مگر اس نے نہ کسی خط کو پھاڑا، نہ موڑا، اور نہ خراب کیا، نہیں، بہت احتیاط سے میں نے کچھ خط اٹھائے، ہر انفرادی لفافے، بلکہ پوسٹ کارڈوں پر بھی توجہ دی جن پر "پولش پوسٹ" کی مہر لگی ہوئی تھی— ان میں سے زیادہ تر بنفشئی رنگ کے تھے۔ میں نے اس امر کا خیال رکھا تھا کہ کوئی بھی خط کھل نہ جائے، اس لیے کہ موجودہ حالات اس نوعیت کے لحاظ کے مترادف ہیں جو دنیا کا نقشہ بدل دیا کرتے ہیں، کہ خطوں کی رازداری کا احترام قائم رہنا چاہیے۔

مشین گن کی گولیوں کی بوچھاڑ کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ، لانڈری کی جھابے کا سوراخ بھی گہرا ہو گیا۔ بالآخر میں اکیلا ہی بڑھا، اپنے قریب المرگ زخمی نقارے کو تازہ کھودی ہوئی خطوں کی قبر میں دفن کیا، اور اس کو اچھی طرح سے ڈھک دیا، دس، بلکہ شاید تیس لفافوں کی تہہ سے، جو ایک دوسرے پر رکھے ہوئے تھے، اسی طرح جیسے کوئی معمار اینٹوں کو جما کر ایک ٹھوس اور مضبوط دیوار تیار کرتا ہے۔

ابھی میں احتیاطی تدابیر سے فارغ ہوا تھا، جس کے ذریعے میں اپنے نقارے کو

بندوق کی گولیوں اور بم کے ٹکڑوں سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، کہ فوراً ہی 'بے ویلکس پلاٹز' کی جانب والی ڈاک خانے کی عمارت کی دیوار پر ایک ٹینک توڑ توپ کا گولا پھٹا۔

پولش ڈاک خانہ، ایک بڑی سی عمارت میں واقع تھا جو اس قسم کے کئی حملے برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ ہوم گارڈ والے ایسا شگاف بنا لیں گے جس کے ذریعے وہ سامنے سے حملہ کر سکیں گے، جس کی وہ اکثر مشق کرتے رہتے تھے۔

میں نے اپنا بغیر کھڑکی کا محفوظ کمرہ، جو تین دفتروں اور ایک راہداری سے گھرا ہوا تھا، چھوڑا، تا کہ میں جان برانسکی کی خیریت معلوم کر سکوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے اپنے قیاسی باپ کی تلاش کے درمیان، معذور دربان کوبیلا سے ملاقات کی بھی شدید خواہش تھی۔ میں کل شام بھوکا کیوں تھا؟ میں نے 'بے ویلکس پلاٹز' جانے والی ٹرام کار کیوں لی تھی؟ اور سپاہیانہ انداز میں ڈاک خانے کی عمارت میں کیوں داخل ہوا تھا جس میں عام حالات میں داخل ہونا بھی مشکل ہوتا تھا؟ صرف اس لیے کہ میں اپنے نقارے کی مرمت کرا سکوں۔ اب اگر جلد ہی مجھے کوبیلا مل نہیں جاتا، یعنی بھرپور حملے سے پہلے، جو یقینی طور پر ہونے والا ہے، تو شاید ہی میرا بیمار نقارہ کبھی ماہرانہ علاج سے مستفید ہو سکے گا۔

اس طرح آسکر سوچ رہا تھا کوبیلا کے بارے میں اور تلاش جان کو کر رہا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھے، طویل ٹائل لگی راہداری میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلتے، اسے سوائے تنہائی کے اور کچھ نصیب نہیں تھا۔ ہوم گارڈ کی مسلسل گولہ باری کے جواب میں، جس کو وافر نہیں کہا جا سکتا، اکا دکا گولیاں چلتی سنائی دیتی تھیں، جو، اندازے کے مطابق اندر سے ہی چلائی گئی ہوں گی، مگر کفایت شعار محافظین اپنے دفتروں کے اندر ہی ٹھہرے رہے، اپنی ربڑ سے بنی مہروں کا ان اشیا سے تبادلہ کر رہے تھے جو کبھی مہروں کا کام بھی دے سکتی تھیں۔ راہداری میں، جوابی حملے کرنے کے انتظار میں نہ کوئی کھڑا تھا، نہ بیٹھا اور نہ لیٹا تھا۔ اکیلا آسکر ہی گشت کر رہا تھا؛ بغیر نقارے کے، بالکل نہتا، اور اسے سامنا تھا اس تاریخ ساز پہلے سوراخ کا جس سے، سوائے نہیں وافر مقدار میں صرف سیسہ ہی داخل ہو سکتا تھا۔

آنگن کی جانب کے دفتر بھی اتنے ہی خالی پڑے تھے۔ بڑے لاپروا لوگ ہیں

یہ لوگ، میں نے سوچا۔اس طرف سے بھی عمارت کا دفاع کیا جانا چاہیے تھا، اس لیے کہ وہاں صرف لکڑی سے بنی ایک باڑ تھی، 'شنائیدرموہلن گاسے' پر واقع پولیس کی عمارت کو، ڈاک خانے کے آنگن سے اور سامان لادنے کے ramp سے جو علاحدہ کرتی تھی۔ حملہ کرنے والوں کے لیے یہ نقشہ بہت عمدہ تھا۔ میں زور زور سے باتیں کرتا جا رہا تھا، دفتر میں، رجسٹرد خطوں کے کمرے میں، منی آرڈر کے کمرے میں، تنخواہ بانٹنے والے کمرے میں اور ٹیلی گراف کے کمرے میں۔اور وہیں، وہ لیٹے ہوئے تھے ریت بھرے تھیلوں کے، اور بکتر بند لوہے کی چادروں کے پیچھے، الٹے کیے ہوئے دفتری فرنیچر کے پیچھے، اور وقفے وقفے سے گولیاں چلا رہے تھے۔

زیادہ تر کمروں کی کھڑکیوں پر ہوم گارڈ والوں کی مشین گن سے چلائی گئی گولیاں لگ چکی تھیں۔میں نے نقصان پر اُچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اس کا موازنہ کھڑکیوں کے اُن نقصانات سے کیا جو گہری سانسوں والے امن کے خاموش زمانے میں میری الماس جیسی کاٹ کرنے والی آواز کے زیرِ اثر ہوا کرتے تھے۔اچھا، میں نے خود سے کہا، اگر وہ مجھ سے پولش ڈاک خانے کے دفاع میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے کہیں گے، اور وہ تارجیبا چتلا ڈاکٹر می شون اگر مجھ سے، پوسٹ ماسٹر کی حیثیت میں نہیں، بلکہ ڈاک خانے کی عمارت کے فوجی کمانڈر کی حیثیت میں درخواست کرتا ہے؛ اگر وہ پولینڈ کی فوج میں مجھے بھرتی کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو میری آواز اپنا فرض ادا کرے گی۔پولینڈ کے لیے اور پولینڈ کی غیر تکمیل شدہ مگر ثمر بار معیشت کے لیے، اپنی دور مار تکنیک کو نئی بلندیوں پر لے جاتے ہوئے، میں خوشی سے، 'ہے ویلیس پلاٹز' کے اس پار کے تمام مکانات کی، 'رَم' کے تمام مکانات کے شفاف اگلے حصے اور پولیس ہیڈ کوارٹر سمیت شنائیدرموہلن گاسے کی تمام کھڑکیوں کو تباہ کر دیتا، اور میں Altstädtischer Graben اور رِیٹر گاسے کی کھڑکیوں کے شفاف شیشوں کی، سیاہ رنگ کے سرد ی بڑھا دینے والے سوراخوں میں، قلبِ ماہیت کر دیتا۔اس طرح ہوم گارڈ میں اور دیکھنے والوں میں بھی ایک ہلچل پیدا ہو جاتی۔میرے کام کے اثرات کئی مشین گنوں کے کے برابر ہوتے اور جنگ کی شروعات کے وقت ہی، خفیہ

ہتھیاروں کی باتیں شروع ہو جاتیں، لیکن یہ ڈاک خانے کو بچا نہیں سکتے۔

افسوس کہ آسکر کی صلاحیتوں کو پرکھا نہیں گیا۔ فولاد کی پولش ہیٹ اور ڈائریکٹرانہ حمایت والے اس ڈاکٹر می شون نے مجھے بھرتی نہیں کیا: اس کے بجائے، سیڑھی سے اتر کر جب میں مرکزی ہال کمرے میں پہنچا تو میں اس کے، تار جیسے پیروں میں الجھ گیا تھا، اور اس نے میرے کان بند کر دیے تھے اور اس کے فوراً بعد با آواز بلند پولش زبان میں میرے لیے بد دعا کرتے ہوئے اس نے اپنی فوجی ڈیوٹی شروع کر دی تھی۔ مجھے اپنی خفگی کو پی جانا پڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب لوگ، اور سب سے زیادہ تو ڈاکٹر می شون، جس پر ساری ذمے داری تھی، بہت پُر جوش اور خوف زدہ تھا: مجھے ان سب کو معاف کر دینا پڑا تھا۔

مرکزی ہال کمرے کی گھڑی نے مجھے بتایا کہ چار بج کر بیس منٹ ہو چکے ہیں، جب کہ چار بج کر اکیس منٹ ہوئے تھے۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ابتدائی جارحانہ کارروائیوں سے گھڑی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ گھڑی چل رہی تھی اور میں حیران تھا کہ وقت کے معاملے میں اس طمانیت کو اچھا شگون سمجھا جائے یا بُرا۔

بہرحال میں اس وقت مرکزی ہال میں ٹھہرا رہا اور ڈاکٹر می شون سے بچتا ہوا، جان کے ساتھ کو بیلا کا بھی انتظار کرتا رہا۔ مجھے نہ میرا انکل ملا اور نہ وہ دربان۔ میں نے شیشے کی کھڑکیوں اور مرکزی دروازے کے پاس پلاسٹر میں ہونے والے سوراخوں کا معائنہ کیا، اور مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا تھا کہ جب پہلے دو زخمی اندر لائے گئے تھے تو میں وہاں موجود تھا۔ ان میں سے ایک بزرگ شخص تھا، جس کے بالوں میں نفاست سے کنگھی کی گئی تھی اور وہ بغیر رُکے ہوئے جذباتی انداز میں بولتا جا رہا تھا، جب اس کے زخم کی مرہم پٹی کی جا رہی تھی — جو بندوق کی گولی کے چھو جانے سے، اس کی کہنی کے نیچے آیا تھا۔ جوں ہی اس کا ہاتھ سفید پٹی سے بندھ چکا، وہ اچھل کر کھڑا ہوا، اپنی رائفل اٹھائی اور ریت بھری بوریوں سے بنے پشتے کی طرف چلا، جو میرے اندازے کے مطابق صحیح معنوں میں محفوظ پشتہ نہیں تھا۔ کتنی خوش قسمتی کی بات تھی کہ خون کے بہہ جانے سے ہونے والی ہلکی سی بے ہوشی نے اس بزرگ شخص کو آرام کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور بقیہ وقت ایک اور زخمی پر صرف کیا گیا تھا جس کو تھوڑی دیر قبل

ہی زخم لگا تھا۔ مزید یہ کہ وہ تار جیسی ٹانگوں والا پچاس سالہ، جو آہنی ہیٹ پہنے ہوئے تھا، مگر جس کے سینے پر بنے جیب سے ریشمی رومال کا کونا جھانک رہا تھا، یعنی وہی ڈاکٹر می شون، جس نے پچھلی شام بہت سختی سے جان برانسکی کا محاسبہ کیا تھا، اس بوڑھے زخمی شخص کو پولینڈ کی خاطر خاموش رہنے کا حکم دے رہا تھا۔ ایک اور زخمی شخص تنکوں سے بنی چٹائی پر لیٹا گہری سانسیں لے رہا تھا اور اسے ریت بھری بوریوں کی مزید خواہش نہیں رہ گئی تھی۔ وہ وقفے وقفے سے، بڑی بے شرمی سے زور زور چلاتا تھا: اس کے پیٹ میں گولی لگی تھی۔

آسکر ابھی ریت بھری بوریوں کے آڑ میں بیٹھے آدمیوں کی قطار کا معائنہ کرنے ہی والا تھا کہ ایک ساتھ دو گولے مرکزی دروازے کے قریب آ کر لگے اور ہال میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ صندوق جو دروازے کے قریب اڑا دیے گئے تھے پھٹ گئے اور ان میں سے جلد بند دستاویزات کا ڈھیر نکل پڑا، بکھرا، اڑا اور ٹائل لگے فرش پر پھیل گیا تھا، جہاں پہلے سے کاغذ کے بہت سے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے جس کا ان سے کبھی واسطہ نہیں ہونے والا تھا۔ شاید یہ بتانا ضروری نہ ہو کہ کھڑکی کا بقیہ شیشہ بھی ٹوٹ کر فرش پر بکھر گیا تھا، جب کہ پلاسٹر کے چھوٹے بڑے ٹکڑے چھت اور دیواروں سے نکل نکل کر فرش پر گر رہے تھے۔ ایک اور زخمی شخص کو پلاسٹر اور ریت کے اٹھتے ہوئے بادل میں سے ہال کمرے کے درمیان لایا گیا، مگر اس لوہے کی ہیٹ پہنے ڈاکٹر می شون کے حکم کے مطابق اس کو پہلی منزل پر لے جایا گیا۔

ڈاک خانے کا وہ زخمی کلرک ہر قدم کراہ رہا تھا۔ آسکر، اس کے اور اس کو لے جانے والوں کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کو کسی نے نہیں روکا، نہ کسی نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے یا جیسا کہ تھوڑی دیر قبل ڈاکٹر می شون نے کیا تھا، اس نے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نے خود کو ڈاک خانے کی حفاظت کرنے والوں سے دور رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔

جب میں ان دو آہستہ رو لے جانے والوں کے پیچھے پیچھے دوسری منزل پر پہنچا تو میرا شبہ یقین میں بدل گیا: زخمی شخص کو اس بے کھڑکی اور سامان رکھنے والے کمرے میں لے جایا جا رہا تھا جس کو میں نے اپنے لیے مختص کر رکھا تھا۔ وہاں گدے نہیں تھے، پھر بھی یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ڈاک

رکھنے والے ٹوکروں کو، جو اگر چہ چھوٹے تھے، زخمیوں کے آرام کے لیے استعمال کیا جائے گا۔

میں تو لانڈری کے ان متحرک جھابوں میں، جو نا قابلِ ترسیل ڈاک سے بھرے ہوئے تھے، اپنے نقارے کو سہلا کر پچھتا رہا تھا۔ کیا ان ٹکڑے ٹکڑے اور سوراخ شدہ ڈاکیوں کا خون کاغذ کی دس یا بیس تہوں سے سرایت کرتا ہوا میرے نقارے کو وہ رنگ عطا کرے گا جو ابھی تک صرف نام چینی کے رنگ سے واقف تھا؟ میرے نقارے اور پولینڈ کے خون میں کیا شے مشترک تھی؟ ان کو اپنی دستاویزات اور سیاہی چوس کاغذ کو اپنی زندگی کے عرق سے رنگ لینے دیا جائے۔ ان کو اپنی دواتوں سے نیل کو انڈیل لینے اور ان کو ایک بار پھر سرخی سے بھر لینے دیا جائے۔ ان کو اپنی کلف لگی قمیصوں اور رومالوں کو آدھا سُرخ رنگ کر پولینڈ کا پرچم بنا لینے دیا جائے۔ کیوں نہ ہو، وہ صرف پولینڈ سے متعلق ہیں، میرے نقارے سے نہیں۔ اگر ان کا اصرار ہے کہ پولینڈ کو، اگر چہ وہ ہار گیا ہے، سفید اور سُرخ ہی رہنا چاہیے اور کیا ایسی کوئی وجہ ہے کہ میرے نقارے کو بھی، جو تازہ رنگ کی وجہ سے مشتبہ ہو جائے گا، ہار جانا چاہیے؟

رفتہ رفتہ یہ خیال مجھ میں جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ یہ لوگ پولینڈ کے بارے میں فکرمند نہیں، ان کا ہدف میرا نقارہ ہے۔ جان مجھے ورغلا کر ڈاک خانے میں لے آیا ہے تا کہ ان کے ساتھیوں کو اکٹھا ہونے کے لیے پولینڈ کے علاوہ کوئی معقول جواز یا اُکسانے والا کوئی نعرہ میسر ہو جائے۔ اس رات جب میں رولر پر رکھے ہوئے لانڈری کے جھابے میں سو رہا تھا، حالاں کہ نہ میں لڑھک رہا تھا اور نہ خواب دیکھ رہا تھا، ڈاک خانے کے جاگتے ہوئے کلرک ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں کہہ رہے تھے کہ ایک قریب المرگ نقارے نے ہم سے پناہ چاہی ہے۔ ہم پولینڈ کے لوگ ہیں، ہمیں اس کو بچانا چاہیے، خصوصاً اس لیے کہ انگلستان اور فرانس دونوں میثاق کے مطابق ہمارا دفاع کرنے کے پابند ہیں۔ جس وقت اس قسم کے بے مقصد اور تجریدی مراقبوں نے غیر منتظم ڈاک سے بھرے نصف کھلے کمروں کے باہر میری آمد و رفت کی آزادی سلب کر لی تھی، تب آنگن کی جانب سے پہلی بار مشین گن کی آوازیں بلند ہوئی تھیں۔ جیسی کہ میں پیش بندی کر چکا ہوں، ہوم گارڈ والے

شنائیدر موولس گاسے پر واقع پولیس ہیڈ کوارٹر کی عمارت سے اپنا پہلا حملہ کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم سب زمین پر رینگ رہے تھے۔ ہوم گارڈ والوں نے سامان لادنے والی ڈھلان کے اوپر کے پیکیج روم کا دروازہ تباہ کر دیا تھا۔ دوسرے منٹ وہ پیکیج روم میں پہنچ گئے تھے، اور جلد ہی مرکزی ہال میں جانے والا دروازہ کھل گیا تھا۔

وہ لوگ زخمی آدمی کو اوپر لے جا کر ڈاک کے چھابوں میں لٹا کر، جس میں میرا نقارہ لیٹا ہوا تھا، جلدی سے چلے گئے تھے، دوسرے ان کے پیچھے پیچھے چلے گئے۔ آواز کے ذریعے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ مرکزی منزل کی راہداری میں، اس کے بعد پیکیج روم میں لڑ رہے تھے۔ ہوم گارڈ والوں کو پسپا ہونے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔

پہلے تذبذب میں، اس کے بعد اعتماد کے ساتھ، آسکر سامان رکھنے والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ زخمی شخص کا چہرہ زردی مائل بھورے رنگ کا ہو رہا تھا؛ اس نے اپنے دانت دکھائے، جب کہ اس کی آنکھ کے ڈھیلے بند پلکوں کے پیچھے کام کر رہے تھے۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا، مگر چوں کہ اس کا سر ڈاک کے چھابے کے کنارے کے اوپر لٹک رہا تھا، خطوں کے خراب ہونے کا خطرہ کم تھا۔ آسکر کو چھابے کے اندر پہنچنے کے لیے پنجوں کے بل کھڑا ہونا پڑا تھا۔ اس آدمی کے بیٹھنے کی جگہ اس جگہ پر تھی جہاں آسکر کا نقارہ خطوں کے ڈھیر کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ پہلے تو آسکر اس کو بہت احتیاط سے کھینچ رہا تھا، اس طرح کہ نہ اس ڈاک خانے کے زخمی کلرک کو اور نہ خطوں کو نقصان پہنچے، مگر بعد میں اس نے بھونڈی سے کھینچا۔ آخر کار، غصہ ور چیر پھاڑ کے ساتھ، وہ کراہتے ہوئے آدمی کے نیچے سے کئی درجن خط ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔

آج مجھے یہ بات بتانے پر خوشی ہے کہ جب طوفانی انداز میں آدمی سیڑھیوں پر اور نیچے راہداری میں داخل ہو رہے تھے، اس وقت میری انگلیاں پہلے ہی نقارے کے کناروں تک پہنچ چکی تھیں۔ وہ لوگ واپس آ رہے تھے، انھوں نے ہوم گارڈ والوں کو پیکیج روم سے پسپا کر دیا تھا؛ اور تھوڑی دیر کے لیے وہ فتح یاب ہو گئے تھے، اور میں نے ان کو ہنستے ہوئے سنا تھا۔

ڈاک کے چھابوں میں سے ایک کے پیچھے چھپا، میں دروازے کے قریب انتظار

کر رہا تھا، اس وقت تک کہ ان سب نے اس زخمی آدمی کو گھر لیا تھا۔ پہلے تو وہ چلّائے پھر اشارے کیے، اس کے بعد نرمی سے بُرا بھلا کہتے ہوئے، انھوں نے اس کی مرہم پٹی کر دی۔

دو ٹینک شکن گولے عمارت کی زمینی منزل کے چہرے کی دیوار پر لگے، اس کے بعد دو اور لگے، پھر خاموشی ہو گئی۔ فری پورٹ میں لنگر انداز لڑاکا جہازوں کے دو گولے سامنے لڑھکتے ہوئے آئے اور فاصلے پر رُک گئے، پھر ایسی خوش خلق بڑبڑاہٹ ہوئی، ہم جس کے عادی ہو چکے تھے۔

مرہم پٹی کرنے والوں کی نظروں سے بچتے ہوئے، نقارے کو جھکا چھوڑ کر، میں سامان رکھنے والے کمرے میں کھسک گیا، تا کہ اپنے قیاسی باپ اور انکل جان اور دربان کوبیلا کو تلاش کروں۔

تیسری منزل پر چیف پولیٹکل لیڈر کی قیام گاہ تھی، جس نے اپنے اہلِ خانہ کو بروقت ٹرام برگ' یا 'وارسا' بھیج دیا تھا۔ پہلے میں نے چند سامان رکھنے والے کمروں کی تلاشی لی، پھر میں نے جان اور کوبیلا کو لیڈر کی قیام گاہ کے بچے خانے سے ڈھونڈ نکالا۔

یہ ایک روشن، دوستانہ ماحول والا کمرہ تھا، جس میں دل خوش کن دیواری کاغذ لگے ہوئے تھے، بدقسمتی سے جن پر یہاں وہاں بندوق کی بھٹکی گولیوں سے گھاؤ لگ گئے تھے۔ پرامن دنوں میں ان کھڑکیوں سے 'ہے ویلیئس پلاز' کی طرف دیکھنے میں خاصا لطف آتا رہا ہوگا۔ جھولنے والا ایک لکڑی کا گھوڑا جس کو نقصان نہیں پہنچا تھا، مختلف سائز کے گیند، قرونِ وسطیٰ کا ایک قلعہ جس میں پریشان ٹین کے سپاہی، پیدل بھی اور گھڑ سوار بھی، دفتی کا ایک ڈبا، ریل کی پٹریوں اور سامان لے جانے والے چھوٹے چھوٹے ریل کے ڈبوں سے بھرا، بہت ساری پھٹی ٹوٹی گڑیاں، اندر سے تہس نہس گڑیوں کے مکان: مختصر یہ کہ کھلونوں کی بہتات بتاتی تھی کہ چیف پولیٹکل لیڈر دو بہت خراب کیے ہوئے بچوں، ایک لڑکی اور ایک لڑکے کا باپ رہا ہوگا۔ کتنا اچھا ہوا کہ شریر بچے وارسا بھیج دیے گئے تھے، کہ مجھے ایسے جوڑے بچوں سے ملاقات نہیں کرنی پڑی، جیسے برانسکیوں میں بھی پائے جاتے تھے، میں جن سے واقف تھا۔ یک گونہ ایذا پسندانہ خوشی کے ساتھ میں نے سوچا کہ وہ چھوٹا سا بچہ اپنے ٹین کے بنے

سپاہیوں کو چھوڑ کر کتنا افسردہ ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے ٹین کے بنے چند uhlan [پولش سپاہی] اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیے ہوں تا کہ بعد میں 'ماڈلن' کے قلعے کے لیے ہونے والی جنگ میں پولش فوجوں کی مدد کو ان کی خدمات کو موجود ہوں۔

آسکر ٹین کے سپاہیوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی سوچ رہا تھا: سچ تو یہ ہے کہ اس کو ایک اعتراف کرنا ہے، اور شاید وہ کرنا شروع بھی کر دے۔ اس بچے خانے میں کھلونوں، تصویری کتابوں اور کھیلوں کے سامان سے بھری ایک قسم کی کتابوں کی الماری رکھی ہوئی تھی: اس کے سب سے اوپر والے تختے کو ننھے ننھے موسیقی کے آلات نے گھیر رکھا تھا۔ شہد جیسے پیلے رنگ کے ایک خاموش بگل کے ساتھ ہی جھنکار پیدا کرنے والی گھنٹیوں کا ایک سیٹ بھی رکھا ہوا تھا جو ہونے والے لڑائی پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا، یعنی، جب بھی کوئی گولا پھٹتا تو وہ سب مل کر جھن جھن کرنے لگتی تھیں۔ اور ایک طرف شوخ رنگ میں پینٹ کیا ہوا ایک اکارڈین بھی لٹکا ہوا تھا۔ وہ والدین شاید کچھ پاگل سے تھے جنھوں نے اپنے بچوں کو چار اصلی تاروں والا ایک سازینہ بھی فراہم کر دیا تھا۔ اس سازینے کے ساتھ ہی، اپنا سفید رنگ دکھلاتا، صحیح و سالم گولائی والا، چند بلڈنگ بلاکوں پر رکھا ہوا، تا کہ وہ لڑھک کر تختے سے گر نہ جائے — آپ کو یقین نہیں آئے گا — ایک کھلونا نقارہ بھی تھا جس پر سفید اور سرخ رنگ کی وارنش کی گئی تھی۔

میں نے خود اپنے وسائل سے اس تختے پر رکھے ہوئے نقارے کو اتارنے کی کوشش نہیں کی۔ آسکر کو اپنی محدود پہنچ کا اچھی طرح احساس تھا اور جہاں اس کے بونے پن کی مجبوریاں آڑے آتیں وہاں وہ بالغ لوگوں سے مدد مانگنے میں ہچکچاتا نہیں تھا۔

جان برانسکی اور کوبیلا ریت بھری بوریوں کے پشتے کے پیچھے لیٹے ہوئے تھے جو فرش سے شروع ہو کر کھڑکیوں کی تین چوتھائی بلندیوں تک جاتا تھا۔ جان بائیں کھڑکی کے قریب تھا۔ کوبیلا کی ڈیوٹی دائیں جانب کی کھڑکی پر تھی۔ مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا تھا کہ کوبیلا کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ خون تھوکتے زخمی ڈاک خانے کے دفاع کرنے والے کے نیچے دبے اور کچلے ہوئے نقارے کو مرمت کے لیے نکال سکتا۔ کوبیلا بہت مصروف تھا،

وقفے وقفے سے وہ ریت بھرے بوروں کے پشتے میں بنے روشن دان سے 'بے ویلکس پلاژا' کی دوسری طرف لگائی ہوئی ٹینک شکن توپوں پر رائفل سے گولیاں چلاتا جو 'شائیدر مولس گاسے' اور 'راوا ونٹے' پل سے زیادہ دور نہیں تھیں۔

جان اپنا سر چھپائے الٹا سیدھا لیٹا تھا اور کانپ رہا تھا۔ میں اس کو صرف اس کے فیشن ایبل گہرے بھورے رنگ کے سوٹ سے پہچان سکتا تھا، حالاں کہ اب وہ ریت اور پلاسٹر سے بری طرح ڈھکا ہوا تھا۔ اس سوٹ کے رنگ سے ملتے رنگ کے دائیں بھورے جوتے کا فیتا کھل گیا تھا۔ میں نے جھک کر بو ٹائی کی طرح اس کا فیتا باندھ دیا۔ جوں ہی میں نے بو ٹائی جیسے فیتے کو کسا تو جان کسمسایا، اپنی نیلی آنکھیں اپنی آستین سے اوپر اٹھائیں اور میری طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔ آسکر نے دیکھ لیا تھا کہ جان زخمی نہیں تھا، مگر وہ چپکے چپکے رو ضرور رہا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا۔ اس نے اس کے بسورنے کو نظر انداز کرتے ہوئے لیڈر کے بچوں کے نقارے کی طرف اشارہ کیا اور شفاف اشاروں ہی اشاروں میں اس کو احتیاط سے، اور بچے خانے کے بے رونق کونے کا سہارا لیتے ہوئے کتابوں کی الماری پر چڑھ کر میرا نقارہ اتارنے کے لیے کہا۔ میرا انکل مجھے سمجھ نہیں پایا۔ میرا قیاسی باپ سمجھ نہیں سکا کہ میں کیا چاہ رہا تھا۔ میری مما کا عاشق اپنے خوف میں اس قدر گرفتار تھا کہ سوائے خوف کو مزید بڑھانے کے، میری عذر دارانہ درخواست کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ آسکر اس پر چیخنا چاہتا تھا، مگر اس کو خوف تھا کو بیلا کی توجہ اپنی رائفل کی طرف سے ہٹ جائے گی۔

اور پھر میں بھی جان کے ساتھ ریت بھری بوریوں پر لیٹ کے اس کے قریب ہو گیا، اس امید پر کہ میں اپنے بد قسمت قیاسی باپ میں اپنے عادی تحمل کا کچھ حصہ داخل کر سکوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ کچھ پُر سکون نظر آنے لگا تھا۔ میں نے ذرا مبالغہ آمیز تواتر سے سانس لیتے ہوئے اس کی نبض کو عام سطح پر آنے پر مائل کر لیا تھا، مگر مجھے اعتراف ہے کہ یہ کچھ زیادہ ہی جلد ہو رہا تھا کہ میں نے ایک بار اس کی توجہ لیڈر کے بچوں کے نقارے کی طرف مبذول کرانے اور آہستہ آہستہ کتابوں کی الماری کی جانب اس کی گردن موڑنے کی کوشش کی تھی، مگر وہ

سمجھ نہیں سکا کہ میں کیا چاہتا تھا۔خوف اس کے پیروں کی جانب سے بڑھتا ہوا مکمل طور پر اس پر غالب ہو گیا، اس کے بعد واپس ہونے لگا تھا، مگر اس کا باہر نکلنا شاید اس لیے ممکن نہیں تھا کہ جان ہمیشہ اندرونی تلّے استعمال کرتا تھا، اور وہ اس کے پیٹ، اس کی تلّی، اس کے جگر سے ٹکراتا ہوا اس کے سر تک پہنچا اور اتنی طاقت سے پھیلا تھا کہ اس کی نیلی آنکھیں خانۂ چشم سے باہر ابلتی محسوس ہو رہی تھیں، اور ان کے سفید ڈھیلوں کے اندر پھیلا خون کی رگوں کا جال تک نظر آنے لگا تھا، آسکر نے جسے اپنے انکل کی آنکھوں میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اپنے انکل کی آنکھ کو اس کی جگہ واپس پہنچانے، اور اس کے دل کو ذرا ٹھکانے پر لانے کی کوشش اور اس میں لگنے والا وقت مجھے بہت مہنگا پڑا تھا، مگر میری تمام جمالیاتی کوششیں رائگاں گئیں، جب ہوم گارڈ نے اپنی چھوٹی نالوں والی توپوں سے بڑے بڑے گولے اس طرح پھینکنے شروع کیے، جو اُن کی اعلیٰ درجے کی تربیت کے گواہ تھے اور عمارت کے سامنے اینٹوں سے بنے ایک کے بعد دوسرے کھمبے کو تباہ کرنا شروع کر دیا اور اس کے نتیجے میں آہنی جنگلے کو بھی مسمار کر دیا جو اُن کھمبوں میں لنگر انداز تھا۔وہ تقریباً پندرہ سے بیس کھمبے رہے ہوں گے، اور ہر کھمبے کی تباہی پر جان کا دل دکھتا تھا، گویا وہ کھمبے نہیں، تصوراتی خداؤں کی تصوراتی مورتیاں تھیں، جنھیں ریزہ ریزہ کیا جا رہا تھا، میرا انکل جن سے اچھی طرح واقف تھا، جو اس کے وجود کے لیے ضروری تھے۔

یہ صرف میرے خیالات تھے جن کی مدد سے میں اس چیخ کا حساب رکھ سکتا تھا، جان جس کے ذریعے ہر گولے کے دھماکے کا اندراج کرتا تھا، وہ چیخ جو اتنی تیز اور ایسی سرایت کرنے والی ہوتی تھی کہ اگر اس کی شعوری طور پر ترتیب کی جاتی اور اس سے نشانہ لگایا جاتا تو، میری اپنی شیشہ شکن تخلیقات کی طرح واقعتاً اس میں بھی شیشہ تراش ہیرا بننے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی۔جان کی چیخ میں جذبہ ہوتا تھا مگر کوئی منصوبہ یا کوئی نظام نہیں ہوتا تھا؛ اس سے محض کوبیلا کی توجہ مبذول کرنا مقصود تھا؛ اس ہڈیوں والے، معذور دربان کی توجہ، جو ہماری طرف رینگتا، اپنا مردہ جیسا، بغیر پلکوں والا چڑیا جیسا سر اُٹھاتا اور آنسو بھری بھورے رنگ کی گول آنکھوں سے ہمارے سماج کا معائنہ کرتا تھا۔اس نے جان کو ہلایا۔جان منہ

بسورنے لگا۔اس نے جان کا گریبان کھولا اور زخم کی تلاش میں تیزی سے اس کے بدن پر اپنا ہاتھ پھیرا، جسے دیکھ کر میں مشکل سے اپنی ہنسی روک سکا تھا۔ معمولی سی خراش بھی پانے میں ناکامی پر، اس نے جان کو اس کی پشت پر لٹا دیا، اس کے جبڑوں کو پکڑا، اور ان کو اس وقت تک ہلاتا رہا جب تک کہ اس کے جوڑوں سے آواز نہیں آئی تھی، بے رحمی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا، پولش زبان میں اس کو گالی دی، اور اس عمل کے دوران اس کے لعاب دہن کی چھینٹیں اُڑیں، اور بالآخر اس کی جانب وہ رائفل پھینک دی، جو اس کے اپنے نجی روشن دان سے فراہم کی گئی تھی، مگر اس نے ابھی تک اس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا تھا؛ دراصل ابھی تک اس کی سیفٹی بھی تک لگی ہوئی تھی۔یہ بھاری شے دھڑ سے اس کے گھٹنوں پر جا کر لگی تھی، اور اس وقتی درد کا، اس کا پہلا جسمانی درد، جو اتنی ذہنی اذیت کے بعد محسوس ہوا تھا، اچھا اثر ہوا، اس لیے کہ اس نے رائفل پکڑی، اپنی انگلیوں میں پکڑے دھات کے ان ٹھنڈے ٹکڑوں کا خوف محسوس کیا جو ایک لمحے بعد اس کے خون میں سرایت کر گیا تھا، مگر پھر کوبیلا کے ہمت دلانے سے، یکے بعد دیگرے کوستا اور بہلاوا دیتا اپنی پوسٹ کی جانب رینگ گیا تھا۔

اپنے فراواں زنانہ تصورات کے باعث میرے قیاسی باپ پر جنگ کا ایسا حقیقی تصور چھا گیا تھا کہ مشکل، بلکہ دراصل ناممکن، ہو گیا تھا کہ وہ بہادری کا مظاہرہ کر سکے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے روشن دان سے نظر آنے والے علاقے کا معائنہ کرتا اور کسی کارآمد ہدف کا تعین کرتا، اس نے اپنی رائفل اس طرح جھکائی کہ اس کی نال ڈُبے ویلیکس پلاٹز کے گھروں کی چھتوں کے اوپر کی طرف ہو گئی تھی، اور اس نے آنکھ بند کر کے رائفل کی میگزین خالی کر دی، اور ایک بار پھر خالی ہاتھ وہ ریت بھری بوریوں کے پیچھے رینگ گیا۔ ان شرمندہ نظروں کو دیکھ کر، جن سے اس نے دربان سے معافی طلب کی تھی، مجھے کسی اسکول کے بچے کا خیال آ گیا تھا جو اعتراف کرنے لگا ہو کہ اس نے اپنا ہوم ورک نہیں کیا ہے۔کوبیلا نے غصے میں اپنے دانت پیسے؛ اور وہ کافی ہو گیا، تو وہ اس طرح زور زور سے ہنسنے لگا جیسے کہ وہ ہمیشہ ہنستا ہی جائے گا۔پھر کسی خوف ناک اچانک پن سے اس کا قہقہہ رُک گیا، اور اس نے برانسکی کی پنڈلی کے اگلے حصے پر زور سے ٹھوکر ماری، جو ڈاک کے

محکمے کا سیکریٹری اور اس کا اعلیٰ افسر تھا۔ ابھی اس کا بے ڈھنگا پیر پسلیوں میں ٹھوکر مارنے کے لیے پیچھے لے جایا ہی گیا تھا کہ، اچانک مشین گن نے گولیاں اگلنی شروع کر دی تھیں اور کھڑکیوں کا اوپری حصہ اور چھت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی۔ اس کا orthopaedic بوٹ پیچھے رگڑ گیا؛ اس نے خود کو اپنی رائفل کے پیچھے گرا دیا اور شدید غصے کے عالم میں گولیاں چلانی شروع کر دیں، گویا وہ اس وقت کا ازالہ کر رہا تھا جو جان پر خراب کیا گیا تھا۔ ان تمام واقعات میں جو گولا بارود استعمال کیا گیا تھا وہ اس تمام کے مقابلے میں عشرِ عشیر بھی نہیں تھا جو دوسری عالمی جنگ میں جھونکا گیا تھا۔

کیا وہ دربان مجھے بھول گیا تھا؟ جنگ میں معذور ہو جانے والوں کی طرح وہ بھی سخت مزاج اور چڑ چڑا آدمی تھا۔ وہ کسی کو اپنے آپ سے دور رکھنے کا طریقہ جانتا تھا۔ کیوں، میں نے سوچا کہ، وہ اس سرد ہواؤں والے کمرے میں میرا وجود برداشت کر رہا تھا۔ کیا کوبیلا سوچ سکتا تھا کہ یہ بہر حال بچہ خانہ ہے، اس لیے، کیوں نہ آ کر اس میں رہے اور لڑائی کے وقفے کے دوران کھلونوں سے اپنا دل بہلائے؟

مجھے پتا نہیں کہ ہم لوگ کب تک سیدھے لیٹے رہے، میں جان اور کمرے کی بائیں دیوار کے درمیان، اور ہم دونوں ریت بھری بوریوں کے پیچھے، کوبیلا اپنی رائفل کے پیچھے، دونوں کے لیے بندوق چلا رہا تھا۔ اس وقت دس بجے ہوں گے جب گولیاں چلنی بند ہو گئی تھیں۔ ایسی خاموشی ہو گئی تھی کہ میں مکھیوں کے اُڑنے کی آوازیں بھی سن سکتا تھا؛ مجھے 'ہے ولیئس پلاٹز' کی جانب سے آنے والے فوجی احکامات بھی سنائی دے رہے تھے، اور کبھی کبھی مجھے بندرگاہ سے آنے والی بحری توپوں کی بھی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ ستمبر کا ایک ستھرا اور جزوی طور پر ابر آلود دن تھا، سورج اپنا سونا بکھیر رہا تھا، ہوا ہلکی چل رہی تھی مگر سنائی نہیں دیتی تھی۔ اگلے چند دنوں میں میری پندرہویں سالگرہ آنے والی تھی اور ہر سال کے ستمبر کی طرح، مجھے ایک نقارے کی خواہش تھی، کسی اور شے کی نہیں؛ دنیا کا تمام خزانہ ایک طرف، مگر میرا کبھی منحرف نہ ہونے والا ذہن سفید اور سُرخ پالش والے نقارے سے ہٹنے والا نہیں تھا۔

جان نے حرکت نہیں کی۔ کوبیلا کا سانس اتنا ہموار چل رہا تھا کہ آسکر سمجھا وہ سو گیا

ہے، کہ وہ لڑائی میں وقفے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہلکی سے جھپکی لے رہا تھا، کہ تمام مرد، حتیٰ کہ ہیرو لوگوں کو بھی کبھی کبھی تازہ دم کر دینے والی جھپکیوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اکیلا میں جاگ رہا تھا اور برسوں کے اپنے تمام تر لپک وار ارتکاز کے ساتھ میری آنکھیں اس نقارے پر گڑی ہوئی تھیں۔ یہ نہیں سوچ لینا چاہیے کہ اس لمحے میرا ذہن لیڈر کے بیٹے کے نقارے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ارے نہیں! جنگ کے دوران بھی، شور غوغا کے عالم میں بھی، آسکر کی نظریں اس نقارے سے ہٹی نہیں تھیں، مگر یہی وہ سنہرا موقع تھا، میرے جسم کا ہر ریشہ جس کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

دھیرے دھیرے آسکر اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹوٹے ہوئے شیشوں سے بچتا ہوا کھلونوں سے بھری کتابوں کی الماری کی طرف چلا: ابھی میں منصوبہ بنا ہی رہا تھا کہ میں کس طرح بچوں کی چھوٹی سی کرسی پر بلڈنگ بلاک لگا کر، ایک ٹھوس اور بلند چبوترا بناؤں گا، تاکہ میں ایک بالکل نئے نقارے کا مالک بن جاؤں، کہ کوبیلا کی آواز اور اس کے سینگوں جیسے ہاتھوں نے میرا راستہ روک لیا۔ میں نے بے چینی سے نقارے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کتنا قریب تھا۔ کوبیلا نے مجھے پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچا۔ میں نے نقارے کی جانب دونوں ہاتھ بڑھائے۔ دربان کم زور ہوتا جا رہا تھا: میرے ہاتھ میں خوشیاں آنے ہی والی تھیں کہ مشین گن سے گولیوں کے بوچھاڑ بچے خانے پر پڑی، اور دروازے کے قریب کئی ٹینک شکن گولے پھٹے: کوبیلا نے مجھے دھکا دے کر جان برانسکی کے ساتھ ایک کونے میں کر دیا اور رائفل کے پیچھے پہنچ کر اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ میں ابھی نقارے کی جانب دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے اپنی دوسری میگزین استعمال کرنی شروع کر دی۔

ادھر آسکر لیٹا ہوا تھا اور جان برانسکی، میرے پیارے نیلی آنکھوں والے انکل، نے اپنی ناک تک نہیں اٹھائی تھی، جب پیدائشی ٹیڑھے پاؤں والے، بغیر پلکوں کی نیلی آنکھوں والے چڑیوں جیسے سر نے میرے ہدف سے پہلے، سختی سے مجھے پکڑ لیا اور ریت بھری بوریوں کے پیچھے ایک کونے ڈھکیل دیا تھا۔

موٹی موٹی، نیلگوں سفید رنگ کی، بغیر آنکھوں والی سنڈیاں، کلبلاتی، کھانے کے

قاش کسی لاش کی تلاش میں تھیں۔ پولینڈ میں میرا کیا رکھا ہے؟ میرا مطلب ہے پولینڈ والوں سے مجھے کیا لینا ہے؟ کیا ان کے پاس گھڑ سوار فوج نہیں تھی؟ اب بھگتتے وہ انھیں۔ وہ ہمیشہ خواتین کے ہاتھوں کو بوسے دیتے نہیں تھکتے تھے، انھیں کبھی خبر بھی نہیں ہوتی تھی کہ جسے وہ بوسہ دے رہے تھے وہ کسی خاتون کی خمیدہ انگلیاں نہیں کسی چھوٹی میدانی توپ کی بغیر غازہ لگی نال تھی۔ اور پھر کرپ کی بیٹیاں [Krupp خاندان جرمنی کا بڑا اسلحہ بنانے والی کمپنی کا مالک تھا، جو آج بھی مختلف نام سے اسلحہ سازی کر رہا ہے — یہاں اس کا نام مجازی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ مترجم] اپنے احساسات کا اظہار کرنے نکل پڑیں۔ انھوں نے للچائی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا، جنگی آوازوں کی نقل کی، بالکل ویسی ہی جیسی کہ نیوز ریل میں دکھائی جاتی ہیں۔ ڈاک خانے کے دروازے پر گولیاں داغیں، دروازہ توڑ کر مرکزی ہال میں داخل ہو گئیں، اوپر جانے والے چوبی زینے کو کاٹنا چاہا تا کہ کوئی اوپر نیچے آ جا نہ سکے۔ پھر ان کے خدام آئے: مشین گنیں اور دو عدد بکتر بند جاسوس گاڑیاں، جن پر ان کے نام پینٹ کیے ہوئے تھے، اور کتنے خوب صورت نام تھے وہ: Ostmark اور Sudetenland۔ کتنا لطف آ رہا تھا انھیں! کبھی آگے، کبھی پیچھے، کبھی اپنے بکتر کے پیچھے سے تڑتڑاتی، ہر طرف نظریں ڈالتی: دو جوان عورتیں، تہذیب کو تباہ کرنے پر آمادہ، قلعے کے اندر آنے کے لیے بے چین، مگر قلعہ بند۔ ایسی برباد جوانیاں جو داخلے کا انتظار بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ بے صبرے پن کی ماری، بھورے سیسے کے رنگ کی نظریں [گولی کی طرح] گھستی چلی آتی تھیں، سب ایک ہی قطر کی، قلعے کے ہر نظر آنے والے کمرے میں، ہر شے کو قلعہ داروں کے لیے گرم، سرد اور بے آرام بناتی ہوئی۔

جاسوس گاڑیوں میں سے ایک — میرا خیال ہے کہ اس کا نام تھا Ostmark — 'زرز گاسے' سے ہماری طرف اُلٹی چلی آ رہی تھی جب، میرے انکل جان نے، جو بہت دیر سے بالکل ساکت تھا، روشن دان کی طرف اپنا داہنا پیر بڑھایا، جہاں سے اس کو گولیاں چلائی تھیں اور فضا میں بلند کیا، بلاشبہ اس امید پر کہ کوئی نہ کوئی اسے دیکھ لے گا اور اس پر گولی چلا دے گا یا پھر کوئی آوارہ گولی اس پر رحم کھا کر اس کی پنڈلی یا ایڑی کو خراش لگا

دے گی، ایسا مبارک زخم جو سپاہی کو لنگڑا کر دیتا ہے، اور کیسا لنگڑا پن— جو میدانِ جنگ سے باہر کر دے۔

ایک مشکل کیفیت جو زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ وقتاً فوقتاً جان کو آرام کرنا ہوتا تھا، مگر پھر اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کر لی تھی۔ اپنی پشت کے بل لیٹے ہوئے اور دونوں ہاتھوں سے اپنا پیر بلند کیے، وہ اپنی پنڈلی اور ایڑی کی کافی دیر تک نمائش کر سکتا تھا اور کسی نشانے باز کی یا آوارہ گولی سے زخمی ہو جانے کے امکانات بڑھ جاتے تھے۔

میرے دل میں جان کے لیے بہت ہمدردی تھی، اور اب بھی ہے۔ میں آسانی سے سمجھ سکتا ہوں کہ ڈاک کے محکمے کا سیکریٹری اور اس کا اعلیٰ افسر ہوتے ہوئے، ان مشکل حالات میں، بلکہ مضحکہ خیز صورت میں کوبیلا کو غصہ آ گیا تھا۔ دربان اچھل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا، دوسری جست میں وہ ہمارے سر پر تھا۔ اس نے جان کی جیکٹ پکڑ لی، جان جس کے اندر موجود تھا، کوبیلا اس بنڈل نما شے کو اٹھا کر اوپر نیچے، اوپر نیچے پٹختا رہا؛ پھر ہمیشہ کے لیے گرا دینے کی کوشش میں اس نے دائیں جانب سے اٹھا کر پٹخا، پھر بائیں جانب سے اٹھا کر پٹخا؛ پھر بھی اطمینان نہیں ہوا تو اس کے دونوں ہاتھ کے پنجے یک جا ہو کر ایک بڑے سے مکے کی شکل میں بھنچے ہوئے، فضا میں بلند ہوئے جو میرے قیاسی باپ کو کچل ڈالنا چاہتے تھے کہ اچانک ایک پھڑ پھڑاتی ہوئی آواز آئی، جیسے کسی فرشتے کا پر ہو، ایک نغمہ ہو، جیسے کسی ریڈیو سے آتا ہوا نغمہ ہو۔ اس پَر نے برانسکی کو ضرب نہیں لگائی، جی نہیں، اس نے کوبیلا کو ضرب لگائی، خدایا، اس متحرک شے کا بھی کیسا احساسِ مزاح ہے۔ اینٹیں ہنس کر ٹکڑے بنیں، اور ٹکڑے ہنس کر خاک، پلاسٹر بن گئے۔ آٹا اور لکڑی بن گئیں، پورا بچہ خانہ لنگڑا لنگڑا چلنے لگا، کیتھی کروز کی گڑیاں پھٹ گئیں، جھولنے والا گھوڑا دوڑا— کتنا خوش ہوتا یہ گھوڑا اگر گرانے کو اس کی پشت پر کوئی ہوتا— پولینڈ کے اٹھہی اچانک کمرے کے چاروں کونوں پر قابض ہو گئے اور بالآخر، کھلونوں کی الماری زمیں بوس ہو گئی: گھنٹیاں ایسٹر گانے لگیں، اکارڈین کے منہ سے چیخ نکل گئی، بگل نہ جانے کیا پھونکنے لگا، پورے آرکسٹرا نے ایک ساتھ پورا نغمہ بجا دیا، گویا خود کو ہم آہنگ کر رہا ہو چیخا، پھٹا، ہنہنایا، گھنٹی

بجائی، رگڑا، منمنایا، اونچی چیخوں میں، مگر اس دوران وہ اپنی کھوکھلی بنیادوں کو خود ہی کھود رہا تھا۔اور میں جو تھا، تین سالہ جیسا موزوں بچہ، سب سے محفوظ کونے پر، کھڑکی کے بالکل نیچے، جب کوئی گولا ٹکرا کر میری گود میں آ کر گرا تھا وہ وہی نقارہ تھا، مگر اس میں کوئی سوراخ نہیں تھا، صرف پالش میں دراڑ پڑ گئی تھی۔ آسکر کا نیا نقارہ اس کے ہاتھوں میں تھا۔

جب میں نے اپنی نئی ملکیت سے پرے نظر کی، تو میں نے دیکھا کہ مجھے اپنے انکل کی مدد کرنی ہوگی، جو محض اپنے وسائل سے اس گراں بار دربان کے نیچے سے نکل نہیں سکے گا۔ پہلے تو میں سمجھا تھا کہ خود جان کو بھی ضرب لگی ہے، اس لیے کہ وہ واقعتاً منہ بسور رہا تھا۔ بالآخر جب اس نے کوبیلا کو ایک طرف لڑھکا دیا، جو خود بھی واقعتاً کراہ رہا تھا، تو ثابت ہوا کہ جان کے زخم نظر انداز کیے جا سکتے تھے۔ اس کے داہنے رخسار پر اور ایک ہاتھ کی پشت پر ٹوٹے ہوئے شیشے سے خراشیں آ گئی تھیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا تھا۔ ایک سریع تقابل سے پتا چلا کہ میرے قیاسی باپ کا خون دربان کے خون کے مقابلے میں ہلکے رنگ کا تھا، مگر گاڑھا لیس دار، جو اس کے پتلون میں ملبوس پیر سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ وہ کوبیلا تھا یا دھماکا تھا جس نے جان کی بھورے رنگ کی جیکٹ کو چیتھڑوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ جیکٹ چیتھڑوں کی صورت اس کے کاندھوں سے لہرا رہی تھی، اس کا استر آزاد ہو گیا تھا، بٹن فرار ہو گئے تھے، سیون علاحدہ ہو گئی تھی اور جیبیں خالی ہو کر باہر لٹک گئی تھیں۔

میرے بےچارے انکل پر زیادہ ظلم نہ کرو، جو میری مدد سے کوبیلا کو بچے خانے سے نکال باہر کرنے سے پہلے اپنے مال و متاع کو یک جا کرنے پر اصرار کر رہا تھا۔ اس کو اپنا کنگھا، اس کے چہیتوں کی تصویریں مل گئی تھیں، جن میں بیچاری میری مما کی تصویر بھی شامل تھی؛ اس کا بٹوہ کھلا بھی نہیں تھا۔ اس کے لیے وہ وقت بہت سخت تھا، اس لیے کہ پشتے سے بنی دیوار جزوی طور پر ڈھے گئی تھی، skat کے پتے پورے کمرے میں بکھر گئے تھے؛ وہ سارے، بتیس پتوں کو اکٹھا کر رہا تھا؛ اور وہ بہت بد دل ہوا جب اس کو بتیسواں پتا نہیں مل سکا تھا۔ جب آسکر کو وہ پتا دو تباہ شدہ گڑیوں کے گھروں کے درمیان ملا تو جان کے

حوالے کر دیا، جان مسکرایا، حالاں کہ وہ پتا حکم کا تکّا تھا۔

ہم کو بیلا کو گھسیٹ کر بچے خانے سے باہر لے گئے اور اس کو راہداری ہی میں چھوڑ دیا، دربان میں اتنی تاب آ گئی کہ وہ کچھ الفاظ کہہ سکتا تھا۔ جان بدانسکی کے مطابق اس نے پوچھا تھا، کیا سب کچھ موجود ہے؟۔ جان نے کو بیلا کی پتلون میں ہاتھ ڈالا، اور اس کی ٹانگوں کے درمیان، اس کے ہاتھوں میں کچھ آ گیا تھا اور اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

ہم سب خوش تھے۔ کو بیلا کی آبرو رہ گئی تھی، جان بدانسکی کو، حکم کے تکے سمیت اس کے skat کے پتے مل گئے تھے اور آسکر کو ایک نیا نقارہ مل گیا تھا جسے اس کے گھٹنے قدم قدم بجاتے جاتے تھے، جب کہ جان اور ایک آدمی جس کا نام وکٹر تھا، دربان کو، جو خون بہہ جانے کی وجہ سے کمزور ہو گیا تھا، اٹھا کر نیچے ناقابلِ تقسیم خطوط کے کمرے میں لے گئے۔

# تاش کے پتّوں کا مکان

۱

حالاں کہ اس کا خون مستقل بہہ رہا تھا، دربان رفتہ رفتہ بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ وِکٹر ویلہون نے اس کو لے جانے میں مدد دی تھی۔ وِکٹر کی دور کی نظر کم زور تھی، مگر اس وقت وہ عینک لگائے ہوئے تھا اور وہ لڑکھڑائے بغیر آسانی سے سیڑھیاں چڑھ اُتر سکتا تھا۔ وِکٹر کا پیشہ— جس کی دور کی نظر کم زور ہو اس کے لیے تعجب کا باعث ہوگا— منی آرڈر کے ذریعے آنے والی رقوم کو پہنچانا تھا۔ آج کل، جب بھی وِکٹر کا نام آتا ہے میں اس کو بیچارہ وِکٹر کہتا ہوں، بالکل اسی طرح جیسے بُریک واٹر بندرگاہ کی تفریح کے بعد سے میری مما بیچاری مما بن گئی تھی، وِکٹر بھی اپنی عینک گم ہو جانے کے بعد سے بیچارہ وِکٹر ہو گیا تھا۔ حالاں کہ اس میں دوسری وجوہ نے بھی کردار ادا کیا تھا۔

''کیا تم کبھی بیچارے وِکٹر سے ملے ہو؟'' میں ملاقات کے دنوں میں اپنے دوست وِٹلر سے پوچھتا ہوں، مگر 'اولیوا' سے 'گیری شائم' تک کے ٹرام کار میں سفر کے بعد سے— میں جس پر پھر کبھی بات کروں گا— وِکٹر ویلہون ہم سے جدا ہو گیا تھا۔ اس کی امید ہی کی جا سکتی ہے کہ اس کا پیچھا کرنے والے بھی اس کو تلاش نہیں کر سکتے، کہ اس کو اس کی عینک مل گئی ہے یا ایک اور مناسب عینک مل گئی ہوگی، اور اگر مزید پوچھنا بار نہ ہو تو، کیا وہ اب بھی رقوم لے جاتا ہے، اگر پولش ڈاک خانے کی نہیں— جو ہو نہیں سکتا— تو وفاقی جمہوریہ کے ڈاک خانے کی اور کیا وہ کم زور نظر، مگر عینک والا اب بھی رنگا رنگ

بینک نوٹوں اور سکوں کی صورت میں خوشیاں بانٹتا پھرتا ہے۔

"کتنی بُری بات ہے" جان نے کوبیلا کو ایک جانب سے سنبھالتے اور بوجھ کے باعث ہانپتے ہوئے کہا تھا، "اور خدا ہی جانے یہ سب کیسے ختم ہوگا۔" وکٹر نے کہا، جو اس کو دوسری جانب سے سنبھالے ہوئے تھا "اگر انگریز اور فرانسیسی نہیں آتے۔"

"وہ ضرور آئیں گے۔ کل ہی تو 'رز ا سمگلی' نے ریڈیو پر کہا تھا 'یہ ہمارا وعدہ ہے'۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر جنگ ہوتی ہے تو پورا فرانس ایک ہو کر کھڑا ہوگا۔" جان کو اپنا وعدہ پورا کرنے میں دقت ہو رہی تھی، اس لیے کہ اگر چہ اس کے اپنے ہاتھ کی پشت پر اس کے اپنے خون کا نظر آتا فرانسیسی/پولش باہمی دفاع کے میثاق پر شبہ نہیں پیدا کر رہا تھا، مگر اس میں خطرہ تھا کہ قبل اس کے کہ فرانس کھڑا ہو جائے، اپنا وعدہ پورا کرے اور Siegfried Line کو مسمار کرے، وہ خون بہہ جانے سے مر چکا ہوگا۔

"اب وہ راستے میں ہوں گے۔ اس وقت برطانوی بحری بیڑا بالٹک میں حرکت کر رہا ہوگا۔" وکٹر وینابون سخت، بلند آہنگ طرزِ بیان پسند کرتا تھا۔ اس نے زینے پر ایک لمحہ توقف کیا، اس کا داہنا ہاتھ زخمی دربان کے بوجھ نے بے حرکت کر رکھا تھا، مگر اس نے اپنے بائیں ہاتھ کو بلند کر کے، اپنی پانچوں انگلیوں سے اپنے نجات دہندوں کو خوش آمدید کہا "آؤ، غیور برطانیہ والو!"

جس دم یہ دونوں، آہستہ آہستہ، مستعدی سے پولینڈ اور اس کے مغربی اتحادیوں کے درمیان تعلقات کا اندازہ لگا رہے تھے، کوبیلا کو ہنگامی حالت کے اسپتال لے جایا جا رہا تھا، آسکر کے خیالات متعلقہ متن کی تلاش میں 'گرتچین شیفلر' کی کتابوں کے ورق الٹ رہے تھے۔ 'کیزز' کی ڈانسِگ شہر کی تاریخ: "1870 کی جرمنی اور فرانس کے درمیان جنگ کے دوران 21 اگست 1870 کو چار فرانسیسی جنگی جہاز خلیجِ ڈانسِگ میں داخل ہوئے، ساحل سمندر سے دور جہاں جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں گشت کی اور ان کی توپیں شہر کی بندرگاہ کی جانب رُخ کیے ہوئے تھیں، مگر اس کے بعد کی رات Nymph نامی چھوٹے جنگی جہاز نے جو کیپٹن وتھمان کی کمان میں تھا، بحری بیڑے کو واپس جانے کا حکم دیا تھا۔" تھوڑی

دیر کے بعد، قبل اس کے کہ ہم نا قابلِ تقسیم ڈاک کے اسٹور روم پہنچتے، میں نے رائے قائم کی تھی، جس کی بعد میں تصدیق ہو گئی تھی کہ پولش ڈاک خانے کے، اور پورے پولینڈ کے ان مشکل وقتوں میں، ملکی بیڑا، بڑے آرام سے شمالی اسکاٹ لینڈ میں کسی دریا کے دہانے میں پناہ لیے ہوگا، اور جہاں تک فرانسیسی فوج کا سوال ہے، وہ اس وقت لنچ کھا رہی ہوگی، اس یقین کے ساتھ کہ Maginot Line کے علاقے میں چند جاسوس گاڑیوں کے گشت سے فرانسیسی/پولش میثاق کے تحت معاملات طے ہو گئے ہوں گے۔

اسٹور روم کے اور ہنگامی حالات کے اسپتال کے باہر، ڈاکٹر می شون سے ہماری مڈبھیڑ ہو گئی؛ اس کے سر پر اس وقت بھی لوہے کی ہلمٹ تھی اور اس کا ریشمی رومال اس وقت بھی اس کے سینے کی بائیں جیب سے جھانک رہا تھا؛ اس وقت وہ کانزاؤ نامی وارسا سے بھیجے ہوئے افسرِ رابطہ سے گفتگو میں مشغول تھا۔ تعاون قسم کی وحشت گردی کے الزام کے بعد جان نے واضح کر دیا تھا کہ وہ شدید زخمی تھا۔ وکٹر ویلہون جو زخمی نہیں تھا، اور جب تک اس کی عینک اس کے پاس موجود تھی، اس سے رائفل کے ذریعے اپنا کام کر سکتا تھا۔ اس کو مرکزی ہال کمرے میں بھیج دیا گیا تھا۔ مجھے اور جان کو بغیر کھڑکی کے کمرے میں داخل کر دیا گیا تھا، جس میں چربی سے بنی موم بتیوں سے ہلکی سی روشنی کی جاتی تھی، اس لیے کہ شہری بجلی گھر نے اعلان اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا کہ پولش ڈاک خانے کو فی الحال بجلی نہیں دی جا سکتی۔ ڈاکٹر می شون کو جان کے زخموں کا علم نہیں تھا، اس کے علاوہ اس کو جان کی فوجی ہنرمندی پر شبہات بھی تھے۔ ڈاک خانے کے سیکریٹری اور سابقہ رائفل بردار کو اب نرس بنا کر زخمی لوگوں کی دیکھ بھال کرنے پر تعینات کر دیا گیا تھا، اور اس مرحلے پر پوسٹ ماسٹر اور کمان دار نے ایک خلاصے کے ساتھ مجھے اعزاز دیا، اور مجھے ایسا لگا گویا یہ میرے سر پر ایک ہلکی سی تھپکی تھی، تا کہ مجھ پر نظر رکھی جائے، ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بے چارہ بچہ الجھن میں آ کے ان سے ہی نہ لڑنے لگ جائے۔

چھوٹی توپ کا ایک گولا نیچے آ کر لگا۔ ہم سب ہل سے گئے۔ می شون اپنی ہلمٹ میں، وارسا کا افسرِ رابطہ کانزاؤ، اور ویلہون، سب بھاگ کر اپنے مورچوں میں چلے گئے۔

جان اور میں دونوں نے خود کو بند کمرے میں، جس میں لڑائی کی گھٹی گھٹی آوازیں آتی تھیں ،ساتھ یا آٹھ مرے ہوئے لوگوں کے ساتھ پایا جب گھر پر گولے گر رہے تھے تو موم بتی کی لو تک نہیں ہلی تھی۔ ہمارے اطراف کی کراہوں کے باوجود خاصی خاموشی تھی۔ بدسلیقہ جان نے جلدی سے بستر کی چادروں سے پھاڑ کر پٹیاں بنائیں اور کوبیلا کی رانوں کو کس کر باندھ دیا؛ اس کے بعد اس نے اپنے زخموں کے علاج کی تیاری کی، مگر اس کے رخسار اور ہاتھ کی پشت کے زخموں سے خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ اس کے زخم اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتے تھے، پھر بھی ان سے درد ہوتا رہا ہوگا جو اس کی وحشت میں اضافہ کر رہا تھا، پھر بھی یہ نیچی چھت اور دم گھٹنے والا بند کمرہ اس کے درد میں اضافہ کرتا رہا ہوگا جس کے اظہار کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ مضطربانہ انداز میں جب اس نے اپنے جیبوں کی تلاشی لی تو اس کو تاش کے پتوں کا پورا بنڈل ہاتھ آ گیا۔ اس کے بعد سے ہم skat کھیلتے رہے۔

بتیس کارڈ پھینٹے، کاٹے، بانٹے اور کھیلے گئے۔ چوں کہ ڈاک کے سارے جھابے زخمی لوگوں سے بھرے ہوئے تھے، ہم نے کوبیلا کو ایک جھابے سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا تھا۔ جب وہ بار بار اوندھا گرنے لگا تو ہم نے ایک زخمی شخص کی گیلس نکال کر اس کو اسی حالت میں باندھ دیا۔ ہم نے اس کو سیدھا بیٹھنے پر مجبور کیا اور کارڈ گرانے سے منع کیا، اس لیے کہ ہمیں کوبیلا کی ضرورت تھی۔ تیسرے آدمی کے بغیر ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ ڈاک کے جھابوں والے لوگ تو سُرخ و سیاہ کا فرق تک بتا سکتے نہیں تھے، اب ان میں skat کھیلنے کی خواہش نہیں رہی تھی۔ حالاں کہ دراصل کوبیلا کو بھی اس طرح کا کوئی احساس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو گر جانا پسند کرتا۔ بس حالات کو اپنا راستہ اختیار کرنے دو؛ کوبیلا بس اتنا ہی چاہتا تھا۔ وہ صرف دیکھتے رہنا چاہتا تھا؛ اس کے دربانی ہاتھ زندگی میں پہلی بار بے کار ہوئے تھے؛ اپنی ڈھلکی ہوئی پلکوں کے ذریعے وہ انہدام کے کام کو مکمل ہوتے دیکھ رہا تھا، مگر ہم اس قسم کے مقسوم پر راضی نہیں تھے، ہم نے اس کو کس کر باندھ دیا اور تیسرا ہاتھ کھیلنے پر مجبور کر دیا تھا، جب کہ آسکر دوسرا ہاتھ کھیلا تھا اور کوئی یہ دیکھ کر ذرا بھی حیران نہیں ہوا تھا کہ 'نام تھمب' بھی skat کھیل سکتا ہے۔

جب پہلی بار میں نے آہستہ سے اپنی بالغ آواز میں کہا، "اٹھارہ۔" سچ جانو، جان نے اپنے پتّوں سے سر نکالا، میری طرف ناقابلِ تصور تیلی نظر کی، اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ "بیس؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ جان نے کسی تامّل کے بغیر "ہاں—ہاں" کہا۔ اور پھر میں نے کہا، "دو؟ تین؟ چوبیس؟" تمہیں جان غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کہا "پاس۔" اور کوبیلا؟ کیلس سے باندھے جانے کے بعد بھی ایک بار پھر وہ گرا پڑ رہا تھا۔ ہم نے اس کو اٹھا کر بٹھایا اور کھیل کے کمرے سے دور کہیں گرنے والے گولے کے دھماکے کی آواز کے ختم ہونے تک انتظار کیا۔ تب جان نے اچانک ابھرنے والی خاموشی میں کہا، "چوبیس، کوبیلا! کیا تم نے اس لڑکے کی بولی سنی نہیں؟"

کسے خبر کس غار جیسی گہرائی سے کوبیلا جاگا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آہستگی سے، مگر زور دے کر اس نے اپنی پلکیں اٹھائیں۔ اس کی آبی نظروں نے دس پتّوں کی طرف دیکھا جن کو جان نے ہوشیاری سے چھپا رکھا تھا، اور شعوری طور پر ان کی طرف دیکھنے سے پرہیز کر رہا تھا۔

"پاس" کوبیلا نے کہا یا شاید ہم نے اس کے ہونٹوں کی جنبش سے ہی پڑھ لیا تھا، جو خشک ہو کر کلام کے قابل نہیں رہے تھے۔

میں نے پھول کا ایک پتا پھینکا۔ پہلی چال اکی پر جان کو، جو منفی کھیل رہا تھا، کوبیلا پر دہاڑنا پڑا تھا اور دل لگی میں اس کی پسلیوں میں اپنی انگلی کو چبھی بھی تھی، قبل اس کے کہ وہ ہوش میں آ کر اپنا کھیل کھیلنا یاد رکھ سکتا۔ میں نے ان کے سارے ترپ کے پتے نکلوانے شروع کیے۔ میں نے اپنے پھول کے بادشاہ کی قربانی دے دی تھی، جس کو جان نے حکم کے غلام سے کاٹ دیا تھا، مگر اینٹ کے پتے نہ ہونے کی وجہ سے میں نے جان کے اینٹ کے اکے پر ترپ کا پتا لگا دیا تھا اور اس کے پان کے ڈبلے کو اپنے پان کے غلام سے کاٹ دیا تھا۔ کوبیلا نے اینٹ کا نہلا پھینک دیا، اور اب میرے پاس پان کا پورا سیٹ موجود تھا۔ پہلا ہاتھ کھیلا، دوسرا ہاتھ منفی، تیسرا شنائیدر کا تھا، چار بار پھول برابر ہے اڑتالیس یا برابر ہے اڑتالیس پینی کے۔ دوسری بازی کے بعد میں نے دو کے بجائے ایک ضرورت سے زیادہ بڑی چال چلنے کی کوشش کی تھی جس کو دیکھ کر کوبیلا بے چین ہونے لگا تھا۔ کوبیلا جس کے پاس دونوں غلام

موجود تھے صرف تینتیس تک چال چلا تھا، اور اس نے میرا اینٹ کا اور پھول کا غلام جیت لیا۔اس کے بعد، اس کی چالاکی نے اس کو بحال کردیا تھا، اس نے اینٹ کے اِکّے کی چال چلی اور مجھے بھی ویسی ہی چال چلنی پڑی ۔جان نے ایک دہلا پھینکا، کوبیلا اس کی چال سمجھ گیا اور بادشاہ کی چال چلا۔ میں نے اس کو لے لیا ہوتا مگر نہیں لیا، اس کے بدلے میں نے اپنا پھول کا اٹھا پھینکا، جان نے وہی پھینکا جو وہ پھینک سکتا تھا، بلکہ ایک بار تو وہ حکم کے دہلے سے آگے بڑھا، میں اس سے بہتر کھیلا اور ڈھیر پر حکم کا غلام ڈال دیا، مجھے تو اس کو پھینکنا ہی تھا، جان نے کچھ اور چال چلی، اس کے بعد سب چال میری تھی، مگر بہت دیر ہو چکی تھی: جان نے مجھے دو گلڈن ادھار دیے، جو میں نے بعد میں واپس کر دیے تھے، مگر اس کے باوجود وہ بازی جیت گیا، کوبیلا ایک بار پھر گر گیا۔اس نے اپنی جیتی رقم اٹھائی نہیں تھی، حتیٰ کہ پہلے ٹینک شکن گولے کا سیڑھی پر پھٹنا بھی بے چارے دربان کے کچھ کام نہیں آسکا تھا، حالاں کہ وہی سیڑھیاں تھیں، جن کی برسوں سے وہ صفائی اور پالش کرتا تھا۔

جان اس وقت پھر خوف زدہ ہوگیا، جب ڈاک کے کمرے کا دروازہ کھڑکھڑایا اور ہماری چربی سے بنی موم بتیوں کو بھی پتا نہیں تھا کہ ان پر کیا گزر گئی ہے، یا ان کو کس طرف گرنا ہے۔پھر سیڑھیوں پر نسبتاً سکوت طاری ہوگیا تھا، کہ عمارت کے چہرے سے کافی دور ایک اور ٹینک شکن گولا پھٹا۔پھر بھی جان برانسکی نے وحشت کے عالم میں دو بار پتے غلط بانٹ دیے تھے، مگر میں نے ان کو جانے دیا۔جب تک گولیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی، جان کچھ بھی سننے والا نہیں تھا، اس نے میری طرح چال چلنے کو نظر انداز کردیا تھا، بلکہ کھیل ختم کرنا بھی بھول گیا تھا، اور کبھی کبھی بالکل بے حرکت بیٹھا رہتا تھا؛ اس کے حساس کان باہر کی دنیا سے ہم آہنگ ہو گئے تھے، جب کہ ہم انتظار کر رہے تھے کہ وہ کھیل جاری رکھے۔پھر بھی جب کہ جان کا کھیل زیادہ پریشان کن ہوتا جا رہا تھا، کوبیلا کا ذہن کھیل پر اچھی طرح لگا ہوا تھا، حالاں کہ کبھی کبھی اس کو مستعد رہنے کے لیے پسلیوں میں ٹہوکے کی ضرورت پڑتی تھی ۔اس کا کھیل اس کی حالت کے پیشِ نظر اتنا خراب نہیں تھا۔ وہ صرف اسی وقت گرتا جب کوئی بازی جیت جاتا یا کھیل کو میرے یا جان کے لیے

خراب کر دیتا تھا۔ اس کو بالکل پروا نہیں تھی کہ وہ کھیل جیتتا ہے یا ہار جاتا ہے۔ صرف کھیل ہی اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کیے رکھتا تھا۔ جب ہم اس کے اسکور کا حساب کر رہے تھے، وہ مانگی ہوئی گیلس پر ڈھے گیا تھا، اور اس میں سوائے اس کے نرخرے میں تشنج کے، کوئی اور آثارِ زندگی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

تاش کا یہ کھیل آسکر کے لیے بھی بہت دباؤ کا باعث تھا۔ اس لیے نہیں کہ محاصرے یا ڈاک خانے کے دفاع سے متعلق آوازیں بالخصوص اس کو پریشان کر رہی تھیں۔ میرے لیے اعصاب تباہ کر دینے والی بات یہ تھی، اور یہ پہلی بار ہوا تھا، کہ میں نے اچانک بھیس بدلنا ترک کر دیا تھا، اگرچہ دیر تک کے لیے نہیں۔ اس وقت تک میں اپنے، بغیر وارنش، اصل میں صرف ماسٹر بیبرا اور اس کی خواب میں چلنے والی لیڈی روزویٹا کے لیے تھا، اور اب میں، جیسا کہ میرے پیدائش کے سرٹیفکیٹ میں لکھا ہوا تھا، پندرہ برس والا، نہ صرف اپنے انکل اور قیاسی باپ کے لیے، بلکہ معذور دربان کے لیے (جن میں سے کوئی بھی مستقبل کا کسی قسم کا گواہ نہیں ہو سکتا ہے) بالکل اصل میں تھا، جو اپنی کوتاہ قدی کے باوجود قدرے اُجڈ مگر ہنرمندی سے skat کھیل رہا تھا۔ میرے ارادے بلند تھے مگر میری کوششیں میرے بونے جیسے تناسبِ جسمانی کے لیے بہت زیادہ تھیں۔ ہمیں skat کھیلتے ہوئے مشکل سے ایک گھنٹا گزرا ہوگا کہ میرے بازوؤں، ٹانگوں اور سر میں بُری طرح درد ہونے لگا تھا۔ آسکر اپنا ارادہ ترک کرنے ہی والا تھا؛ ایک کے بعد ایک دوسرے، گولوں کی مار کے درمیان جو عمارت کو لرزائے دے رہے تھے وہ وہاں سے غائب ہو سکتا تھا، اگر اس کے اندر اس قسم کی ذمے داری عود نہ کر آئی ہوتی جس کا اسے پہلے تجربہ نہیں ہوا تھا، مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا اور اپنے قیاسی باپ پر طاری دہشت کا مقابلہ ایک بہت پُر اثر طریقے سے کیا تھا، skat کے کھیل سے۔

اور ہم کھیلتے رہے — اور ہم کو بیلا کو مرنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ وہ کچھ کر نہیں پا رہا تھا، اس لیے میں نے ضروری جانا کہ پتوں کی چال میں رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ جب زینے پر ایک دھماکے کے بعد شمعیں زمیں بوس ہو گئیں اور ان کے شعلے بجھ گئے تو وہ میں ہی تھا

جس کی حاضر دماغی نے وہی کیا جو کرنا چاہیے تھا، کہ جان کی جیب سے دیا سلائی نکالی، ساتھ ہی اس کے سنہرے کنارے والے سگریٹ بھی نکالے، اور وہ میں ہی تھا جس نے دنیا کی روشنی بحال کر دی تھی، جان کو سکون پہنچانے کے لیے ایک مشعل سی روشن کر دی تھی، اور رات کی ظلمتوں میں ایک شعلے کے بعد دوسرا شعلہ روشن کرتا گیا قبل اس کے کہ اندھیرے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کوبیلا وہاں سے بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتا۔

آسکر نے اپنے نقارے پر دو شمعیں چسپاں کر دیں اور سگریٹ کو اپنے پہنچ تک رکھا۔ اسے خود سگریٹ کی ضرورت نہیں تھی، مگر اس لیے کہ وہ وقفے وقفے سے جان کو سگریٹ پہنچاتا رہتا اور ایک عدد سگریٹ کوبیلا کے بگڑے ہوئے لبوں کے درمیان بھی لگا دیتا۔ اس سے بہت مدد ملی تھی: تمباکو نے ہمت بڑھائی اور تسلی دی، حالاں کہ یہ جان برانسکی کو ایک کے بعد دوسری بازی ہارنے سے مانع نہیں کر سکا تھا۔ جان کو پسینہ آنے لگا تھا اور جیسا کہ ہمیشہ ہوتا تھا جب وہ دل لگا کر کھیل کھیلتا تو اپنے اوپری ہونٹ کو اپنی زبان کی نوک سے گدگدا رہا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس قدر جذباتی ہو جاتا کہ مجھ کو الفریڈ یا ماتسیرات کے نام سے پکارنے لگتا، اور کوبیلا کو میری بیچاری مما سمجھنے لگتا تھا۔ جب باہر راہداری میں کسی نے چیخ کر کہا، ''انھوں نے کانزاڈ کو پکڑ لیا ہے'' اس نے سرزنش کے انداز میں میری جانب دیکھا اور کہا ''خدا کے لیے الفریڈ ریڈیو تو بند کر دو۔ ایسے میں نہ کوئی کچھ سوچ سکتا ہے نہ سُن سکتا ہے۔''

جان اس وقت واقعی جھنجلا گیا تھا، جب دروازہ توڑ کر بے جان کانزاڈ کو گھسیٹ کر اندر لایا گیا تھا۔

دروازہ بند کرو۔ کمرے میں ٹھنڈی ہوا آ رہی ہے، اس نے احتجاج کیا۔ اور واقعی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ شمعیں بھڑک کر بجھ جانے والی تھیں، مگر اپنے آپے میں آ گئیں جب کانزاڈ کو ایک کونے میں ڈال کر لوگوں نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

کتنا تعجب خیز مثلث تھا ہم تینوں کا۔ شمعوں کی روشنی میں ہم لوگ جادوگر جیسے لگ رہے تھے۔ کوبیلا نے اپنے پان کے پتے چلے: دو، ستائیس، تیس، اس نے کہا، یا گئے

سے غر غر کی آواز نکالی۔اس کی آنکھیں ایک خاص انداز میں اوپر نیچے ہوتی تھیں اور ایسا لگتا تھا گویا کوئی شے تھی جو اس کے دائیں کاندھے سے باہر نکلنا چاہتی تھی، جو کلبلاتی اور پاگلوں کی طرح اچھلتی رہتی ہے۔بالآخر وہ رُک گئی، مگر کوبیلا ایک بار پھر آگے کی طرف جھک گیا، اور ڈاک کے اس جھابے پر جو اس سے بندھا ہوا تھا، جس پر ایک مردہ شخص پڑا ہوا تھا لڑھکنے لگا تھا۔اپنی ایک ٹھوکر سے جس میں اس نے اپنی پوری قوت صرف کر دی تھی، جان نے کوبیلا اور لانڈری کے جھابے کو ساکت کر دیا تھا، جس کے باعث کوبیلا ایک بار پھر چپکے سے بھاگ جانے سے روک دیا گیا تھا، بالآخر اس نے پان کے پتے پھینک دیے۔ جان نے نفرت سے contra کیا اور کوبیلا نے Double contra کہہ دیا۔ اس مرحلے پر آسکر کو یقین ہو گیا کہ پولش ڈاک خانے کا دفاع کامیاب ہو گیا تھا اور یہ بھی کہ حملہ آور، جو جنگ شروع کرنے سے پہلے ہی ہار چکے تھے، خواہ وہ اس قابل ہوتے کہ الاسکا ،تبت، جزائر ایسٹر اور یروشلم پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔

اس کا سب سے خراب حصہ یہ تھا کہ جان اپنے حصے کی بہترین چال، جو چال شنائیدر شوارز کے اعلان کے ساتھ ہوئی تھی، نہیں کھیل سکا۔

اس نے پھول کے پتے سے پہل کی اور اب وہ مجھے ایگنس کہہ کر پکار رہا تھا جب کہ،کوبیلا اس کا رقیب ماتسیرات ہو گیا تھا۔جھوٹی معصومیت کے ساتھ اس نے اینٹ کا غلام کھیلا—میں ماتسیرات بننے کے بجائے بے چاری مما بننے پر خوش تھا—اور اس کے بعد پان کا غلام—مجھے ماتسیرات بننا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔جان نے بے صبری سے ماتسیرات کا انتظار کیا، جو کھیل میں درحقیقت معذور دربان کوبیلا تھا؛ اور اس میں کچھ وقت لگا مگر پھر جان نے پان کا اکا مارا اور وہ یہ سمجھنے سے انکار کر رہا تھا، سچ تو یہ ہے کہ وہ کبھی سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ وہ ہمیشہ سے ایک پسندیدہ شخص کے علاوہ کچھ اور نہیں تھا، جس سے کولون کی خوش بو آتی تھی اور جو بہت سی باتیں سمجھنے سے قاصر تھا، اور اسی لیے وہ یہ بالکل سمجھ نہیں پایا تھا کہ کوبیلا نے اچانک سارے پتے کیوں پھینک دیے تھے، لانڈری کے جھابے کو کیوں کھینچنے لگا تھا، جس میں خط بھرے ہوئے تھے اور خطوں کے ڈھیر پر ایک لاش

رکھی ہوئی تھی اور جب تک کہ پہلے وہ مرا آدمی، اس کے بعد خطوں کا ڈھیر اور بالآخر پورا خوب صورتی سے بنایا ہوا جھابا الٹ جاتا، اور خطوں کی ایک اس طرح لہر چل پڑتی گویا یہ تمام خط ہمارے ہی نام تھے، گویا ہمارے کرنے کا کام یہ تھا کہ ہم اپنے تاش کے پتے ایک طرف رکھ دیتے اور اپنے سارے خطوط پڑھنے لگتے اور ان پر لگے ٹکٹ جمع کرنے لگتے، مگر جان نہ انھیں پڑھنے پر راضی تھا نہ ہی ٹکٹ جمع کرنے پر، کہ وہ بچپنے میں بہت ٹکٹ جمع کر چکا تھا، اب وہ کھیلنا چاہتا تھا، اب وہ اپنا سب سے بڑا کھیل آخر تک کھیلنا چاہتا تھا، اور وہ جیتنا چاہتا تھا، تا کہ معلوم ہو کہ جان جیت گیا ہے۔ اس نے کو بیلا کو اٹھایا، جھابے کو واپس پہیوں پر رکھا، مگر لاش اسی پر پڑی رہنے دی، اور خطوں کو جھابے میں واپس نہیں رکھا۔ کوئی بھی دیکھ سکتا تھا کہ جھابا بہت ہلکا تھا، پھر بھی جان نے بے حد حیرت کا مظاہرہ کیا جب کو بیلا نے جھابے کو نا پائیدار کر دیا تھا، بلکہ وہ تو سیدھا بیٹھ بھی نہیں رہا تھا، اور نیچے جھکتا چلا جا رہا تھا۔ بالآخر، جان نے چیخ کر اس سے کہا، ''الفریڈ، خدا کے واسطے کھیل برباد نہ کرو۔ بس ایک چھوٹی سے بازی اور، اور پھر ہم اپنے اپنے گھر چلے جائیں گے۔ الفریڈ! سنا تم نے؟''

آسکر اپنے سر اور ٹانگوں میں ہونے والے درد کی پروا کیے بغیر بیزاری سے اُٹھا، اپنے تاروں جیسے نقارہ نواز ہاتھ جان برانسکی کے کاندھوں پر رکھے، اور اپنے آپ کو بولنے پر مجبور کرتے ہوئے، مگر رعب دار آواز میں کہا، ''اس کو چھوڑیے، پاپا! وہ مزید کھیل نہیں سکتا ہے۔ وہ بالکل مر چکا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم sixty-six کھیل سکتے ہیں۔

جان نے، جس کو ابھی ابھی میں نے باپ کہہ کر مخاطب کیا تھا، دربان کا فانی غلاف اتار پھینکا۔ میری طرف نیل سے چھلکتی آنکھوں سے گھور کر دیکھا، اور رو پڑا— نہیں، نہیں، نہیں— میں نے اس کے کاندھے تھپتھپاتے ہوئے کہا، پھر بھی اس نے انکار کر دیا۔ میں نے معنی خیزی سے اس کا بوسہ لیا، مگر اس وقت بھی وہ اپنے معطل کھیل کو بھولا نہیں تھا۔

''میں نے یہ بازی جیت لی ہوتی، ایگنس، یہ بالکل یقینی بات تھی۔'' سو، مما کی جگہ وہ مجھ سے لپٹ کر رونے لگا اور میں— یعنی اس کے بیٹے نے— خود کو اس کردار میں پیش بھی کر دیا۔ ہاں، وہ بالکل صحیح کہہ رہا تھا، میں نے کہا، اور میں نے قسم کھائی کہ اس نے

بازی جیت لی ہوتی؛ ہر معنوں میں وہ واقعی بازی جیت چکا تھا، کہ جو کچھ اس کی ایگنس کہہ رہی تھی، اسے اس پر یقین کر لینا چاہیے۔ مگر جان نے یقین نہیں کیا؛ نہ اسے مجھ پر اور نہ میری مما پر یقین تھا۔ کچھ دیر تک تو وہ با آوازِ بلند اور برجستہ انداز میں روتا رہا؛ اس کے بعد اس کی شکایت بغیر زیر و بم کی ریں ریں میں تبدیل ہو گئی، ساتھ ہی اس نے پہاڑ جیسے گوبیلا کے نیچے سے skat کے پتے نکالنے شروع کیے؛ کچھ تو اس کی ٹانگوں کے درمیان سے نکالے، اور کچھ خطوں کے ڈھیر کے نیچے ملے تھے۔ جان نے اس وقت تک ہار نہیں مانی جب تک کہ سارے بتیس پتے نکال نہیں لیے تھے۔ ایک ایک کر کے، اس نے ان پر سے چپکتا ہوا خون صاف کیا۔ جب یہ کام ہو چکا تو اس نے پتے پھینٹنے اور بانٹنے کی تیاری کی۔ تب ہی اس کے قرینے سے بنے ہوئے ماتھے نے — ان کو دھنسا ہوا کہنا ناانصافی ہوتی، حالاں کہ وہ قدرے مسطح تھے — اعتراف کیا تھا کہ اس دنیا میں تیسرا skat کھیلنے والا باقی نہیں رہا تھا۔

ناقابلِ تقسیم ڈاک رکھنے والے کمرے میں خاموشی تھی۔ باہر بھی، ایک طویل منٹ کی خاموشی، دنیا کے آخری skat کھیلنے والے کی یاد کے لیے وقف کر دی گئی تھی۔ اور ایسا محسوس ہوا کہ آہستہ آہستہ آسکر کے لیے دروازہ کھل رہا تھا۔ پلٹ کر دیکھتے ہوئے، خدا جانے، وہ کس قسم کے مافوق الفطرت بھوت پریت کی آمد کی توقع کر رہا تھا، کہ اسے وکٹر ویلہون کا حیرت انگیز طور پر نابینا جیسا چہرہ نظر آ گیا۔ ''جان، میری عینک گم ہو گئی ہے۔ کیا تم اب بھی یہیں موجود ہو؟ ہمیں اس کے لیے فوراً جانا چاہیے۔ فرانسیسی نہیں آ رہے ہیں، اور اگر آ بھی رہے ہیں تو بہت دیر ہو چکی ہے۔ جان، میرے ساتھ چلو۔ میری رہنمائی کرو، میں اپنی عینک گم کر بیٹھا ہوں۔'' وکٹر نے شاید سوچا ہو کہ وہ کسی غلط کمرے میں پہنچ گیا ہے۔ اس لیے کہ جب اس کو کوئی جواب یا کوئی رہنما ہاتھ نہیں ملا تو اس نے اپنا بغیر عینک کا چہرہ پیچھے کیا اور دروازہ بند کر لیا۔ مجھے ابھی تک وکٹر کے پہلے چند قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی، جس نے کہرے میں ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھتے ہوئے اپنا فرار شروع کر دیا تھا۔

خدا جانے، جان کے چھوٹے سے دماغ میں کیسے کیسے مضحکہ خیز خیالات صادر ہو گئے کہ اس نے ہنسنا شروع کر دیا تھا، پہلے تو ہلکے اور سادگی سے، اس کے بعد زور شور

ہے، اور اس کی تازہ گلابی رنگ کی زبان کسی گھنٹی بجانے والے کے ہاتھ کی طرح تھرتھرانے لگی تھی۔ اس نے تاش کے پتے ہوا میں اچھال دیے، انھیں پکڑا، اور بالآخر ایک پُرسکون اتوار کے دن خاموش آدمیوں اور خاموش حروف کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوا، اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے اور رُکی رُکی سی سانسوں کے ساتھ ان پتوں سے نہایت نازک گھر بنانے لگا تھا۔ حکم کا یکا اور پھول کی ملکہ سے بنیاد بنی۔ ان کے اوپر اینٹ کا بادشاہ رکھ دیا گیا۔ پان کے نہلے اور حکم کے اِکے پر پھول کے اٹھے کی چھت سے دوسری عمارت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کے بعد دونوں گھروں کے دہلوں اور غلاموں کو ان کے کناروں پر کھڑا کر دیا گیا، جن پر ملکائیں اور اِکے اس طرح کی آڑی شہتیریں بنے تھے کہ ایک عمارت دوسری عمارت کو سہارا دے رہی تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کیا کہ دوسری منزل پر تیسری منزل بھی بنائی جائے اور یہ کام بھی اس نے اپنے حیران کن ہاتھوں سے کیا۔ میری ماں شاید دوسری رسوم کے سلسلوں کے ذریعے اس کے اس ہنر کو جانتی رہی ہوگی۔ اور جب اس نے پان کی ملکہ کو پان کے سُرخ دل والے بادشاہ کے ساتھ ٹکایا تو عمارت گری نہیں: نہیں، خوش باشانہ انداز میں قائم رہی، آہستہ آہستہ، نزاکت سے سانس لیتی ہوئی اسی کمرے میں رہی جہاں کے مُردے سانس نہیں لے رہے تھے، اور زندہ لوگوں نے اپنے سانس کھینچ رکھے تھے۔ تاش کے پتوں سے بنے اس گھر نے یہ ممکن بنا دیا تھا کہ ہم اپنے ہاتھ باندھے بیٹھے رہیں، بلکہ شبہات سے پُر آسکر کو بھی، جو کارڈ سے بنائے جانے والے گھروں سے متعلق بنائے جانے والے قوانین سے اچھی طرح واقف تھا، دروازے کے درزوں سے داخل ہو جانے والے تلخ دھوئیں اور بو کو نظر انداز کر دینے کے قابل بنا دیا گیا تھا، تاکہ ایسا محسوس ہو جیسے کہ پتوں کے مکان کے چھوٹے چھوٹے کمرے جہنم کی دیوار سے ملے ہوئے ہوں۔

وہ شعلے برسانے والے اوزار بھی لائے تھے: سامنے حملہ کرنے کے خوف سے، انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ دفاع کرنے والے آخری آدمی کو بھی دھوئیں کی مدد سے نکال باہر کریں گے۔ یہ عمل اتنا کامیاب ہوا تھا کہ ڈاکٹر مِی شون نے ہتھیار ڈالنے اور ڈاک خانے کو ان کے حوالے کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اپنی ہیلمٹ کو اتار کر اس نے بستر کی ایک

چادر اٹھائی اور اس کو جھنڈے کی طرح لہرانے لگا؛ اور جب اس سے بھی اسے اطمینان نہیں ہوا تو اس نے اپنا ریشمی رومال نکالا اور دوسرے ہاتھ سے اس کو بھی لہرانے لگا۔

تقریباً تیس جھلسے ہوئے، اور نصف ناہینا آدمی ہاتھ اٹھائے جو ان کی گردنوں کے پیچھے بندھے ہوئے تھے، اس عمارت کے بائیں دروازے سے باہر نکلے، احاطے کے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے، اور آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ہوم گارڈ کا انتظار کرتے رہے۔ بعد میں جو کہانی مشہور ہوئی اس کے مطابق جب ہوم گارڈ والے ان کی جانب بڑھ رہے تھے، ان میں تین یا چار فرار ہو گئے تھے: ڈاک خانے کے گیراج اور اس سے ملحق پولیس کے گیراج کے راستے وہ نکل بھاگے اور 'رِم' کے علاقے میں واقع ایک خالی مکان کی طرف گئے تھے، جہاں ان کو، پارٹی کے نشان والے کچھ کپڑے مل گئے تھے۔ نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر اور ایک ایک کر کے وہ اس طرح غائب ہوئے کہ پھر ان کا سراغ نہیں ملا۔ کہانی کے مطابق ان میں سے ایک Altstadtischer Graben پر واقع عینک کی دکان پر بھی گیا تھا۔ اس نے عینک بھی بنوائی تھی، کہ اس کی عینک ڈاک خانے کی جنگ میں کہیں گم ہو گئی تھی۔ نئی عینک لگائے، وکٹر ویلوون کو، کہ اسی کا چشمہ گم ہوا تھا، ہولز مارکٹ میں بیئر پینے کا بھی موقع مل گیا تھا، اور اس کے ساتھ ایک اور بھی تھا، جس کو شعلہ برسانے والوں نے پیاسا کر دیا تھا۔ اپنے نئے چشمے کے ساتھ اس آدمی نے، جو فضا کی پھوار کو کسی حد تک صاف کر سکتا تھا، مگر اس قدر نہیں جیسی کہ اس کی پرانی عینک کر سکتی تھی، اس نے اپنا فرار شروع کر دیا، جو — اس کے پیچھا کرنے والے بھی کتنے ثابت قدم لوگ ہیں — کہ اب بھی جاری ہے۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، دوسرے تقریباً تیس آدمی تھے جو یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ وہ فرار ہو جائیں، اس لیے کہ وہ اسی دیوار کے سامنے والی دیوار سے لگے کھڑے تھے جہاں جان نے پان کی ملکہ کو بادشاہ کے سہارے کھڑا کر دیا تھا اور خوشی سے مگن، اس سے اپنا ہاتھ ہٹا بھی لیا گیا۔

میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں؟ انھوں نے ہمیں تلاش کر لیا تھا۔ انھوں

نے اچانک دروازہ کھول دیا اور چلّا کر کہا تھا، ''باہر نکلو۔'' فضا میں ارتعاش پیدا کیا اور تاش کے پتوں سے بنا گھر زمیں بوس ہو گیا تھا۔ انھیں اس قسم کی تعمیر سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ ان کی تعمیر کا ذریعہ صرف کانکریٹ تھی۔ وہ ابد تک کے لیے تعمیر کرتے تھے۔ انھیں ڈاک کے محکمے کے سکریٹری برانسکی کے زخموں کی پریشانی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ انھوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہاں سے نکلنے سے پہلے جان نے تاش کے پتوں کے ڈھیر میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا تھا یا یہ کہ آسکر نے میرے نئے حاصل کردہ نقارے پر جمے ہوئے موم بتیوں کے سروں کو صاف کیا تھا، نقارہ لے لیا تھا، مگر موم بتیوں کے سروں کو پھینک دیا تھا، اس لیے کہ ہماری آنکھوں میں چمکتی ہوئی فلیش لائٹ کی روشنی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ انھوں نے تو یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ ان کی فلیش لائٹ نے ہماری آنکھوں کو تقریباً اندھا کر دیا تھا اور ہمیں دروازہ تلاش کرنے میں بھی مشکل ہو رہی تھی۔ فلیش لائٹ اور رائفلوں کے عقب سے انھوں نے چلّا کر کہا، ''باہر نکلو'' اور وہ مسلسل ''باہر نکلو، باہر نکلو'' کی صدا لگا رہے تھے، جب کہ میں اور جان راہداری تک پہنچ چکے تھے۔ یہ ''باہر نکلو'' کی صدائیں دراصل کوبیلا سے، وارسا کے کازاڈ سے اور بوبک سے اور وشنیوسکی سے مخاطب تھیں، جس نے زندگی بھر تار گھر کی کھڑکی پر کام کیا تھا۔ حملہ کرنے والے ان لوگوں کی حکم عدولی سے ناخوش تھے۔ جب بھی ہوم گارڈ ''باہر نکلو'' کا حکم دیتے تو میں زور سے قہقہہ لگاتا اور تھوڑی دیر کے بعد انھیں محسوس ہو جاتا کہ وہ خود اپنے آپ کو بیوقوف بنا رہے ہیں اس لیے انھوں نے چیخنا بند کر دیا اور کہا، ''اوہ!'' پھر وہ ہم کو احاطے میں تین افراد کے پاس لے گئے جن کے ہاتھ اُٹھے ہوئے اور گردن میں حمائل تھے، جو پیاسے تھے اور نیوز ریل والوں کے لیے اپنی فلمیں بنوا رہے تھے۔ کیمرہ موٹر گاڑی پر نصب کیا گیا تھا اور جب ہم بغلی دروازے سے باہر لے جائے گئے تو فوٹو گرافر گھوم کر ہماری جانب متوجہ ہو گئے اور انھوں نے وہ چھوٹی سی پٹی بنائی جسے بعد میں تمام سینما گھروں میں دکھایا گیا تھا۔

مجھے دیوار سے لگے تین دفاع کرنے والوں سے علاحدہ کر دیا گیا تھا۔ ایسے موقع پر آسکر کو اپنی بونے جیسی ساخت یاد آ گئی اور اسے یہ بھی یاد تھا کہ ایک تین برس کا

بچہ اپنے آنے جانے کا ذمے دار نہیں ہوتا ہے۔ اسے ایک بار پھر اپنے سر میں اور جسم میں درد محسوس ہوا تھا؛ وہ اپنے نقارے کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا، کوٹ پیٹ شروع کر دی تھی، اور اس پر دورہ پڑ گیا تھا، جو نصف تو حقیقی تھا اور نصف بناوٹی تھا، مگر اس حالت میں بھی وہ نقارے سے چمٹا رہا تھا۔ انھوں نے اس کو گرفتار کر لیا اور ہوم گارڈ کی سرکاری کار میں ڈال دیا جو ہوم گارڈ کے استعمال میں تھی۔ جوں ہی کار اس کو لے کر سٹی اسپتال گئی، تو آسکر جان کو، بے چارے جان کو، احمقانہ طور پر اور ہوا میں شادمانی سے مسکراتے دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے اُٹھے ہوئے ہاتھوں میں skat کے چند پتّے لیے ہوئے تھا، جب کہ دوسرے ہاتھ میں پان کی ملکہ اٹھائے ہوئے تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ آسکر، یعنی اپنے بچھڑتے ہوئے بیٹے کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

# وہ جو 'ساپسے' میں دراز ہے

میں نے آخری پیراگراف اب پڑھا ہے۔ میں زیادہ مطمئن نہیں، مگر آسکر کے قلم کو کھری اور جامع باتیں لکھنے کے لیے مطمئن ہونا چاہیے، اور اس نے اتنے کھرے اور اتنے جامع حالات لکھنے، اور، جھوٹ نہ بولنے کی، مگر کم از کم بڑھا چڑھا کر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ سچائی سے منسلک رہتے ہوئے، میں آسکر کے قلم کو دھوکا دیتے اور کچھ غلطیوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کروں گا۔ سب سے پہلے تو جان کی آخری بازی، جس کو بدقسمتی سے کھیلنے اور جیتنے سے روک دیا گیا تھا، بڑی بازی نہیں تھی مگر قیمتی ضرور تھی دو افراد کے بغیر: جس میں دوسرا فرد آسکر تھا، جس نے، جب کمرہ چھوڑا تو جاتے جاتے نیا نقارہ اٹھایا اور ساتھ ہی پرانا از کار رفتہ نقارہ بھی اٹھالیا تھا، جو لانڈری کے جھابے سے گر پڑا تھا جس میں بغیر گیلس کا ایک مرا ہوا آدمی بھی تھا، اور خطوط بھی تھے۔ مزید یہ کہ ایک معمولی سی غلطی ہے جس کو درست کیا جانا چاہیے۔ جان کے جانے کے فوراً بعد میں نے بھی ہوم گارڈ کے "باہر نکلو، باہر نکلو" ان کی فلیش لائٹوں اور ان کی رائفلوں کے حکم پر اور آسکر کے آرام اور اس حفاظت کے خیال سے ناقابلِ تقسیم ڈاک کے اسٹور روم کو چھوڑ دیا تھا اور دو ہوم گارڈوں کے پاس گیا جو اس کو اچھی عادتوں والے انکل جیسا انسان سمجھتے تھے، اور اپنے چہرے پر مصنوعی اور مکاری کے آنسو سجائے، انھوں نے جان کی طرف اشارہ کیا، ایسے الزامات کے اظہار کے ساتھ، جس نے اس بے چارے کی ایک بدمعاش انسان میں قلبِ ماہیت کر دی تھی، جو ایک معصوم بچے کو ڈاک خانے میں اپنے

ساتھ گھسیٹے گھسیٹے پھرا تھا اور اس کو عام طور پر پولش سنگ دلی سے، خود کو گولیوں سے بچانے کے لیے، ڈھال کے طور پر استعمال کیا تھا۔ آسکر اپنے دونوں نقاروں کی بنیاد پر کچھ رعایت کی توقع کر رہا تھا، اور اس کی توقعات کو مایوسی نہیں ہوئی۔ ہوم گارڈ والوں نے جان کی پشت پر ٹھوکریں لگائیں، اور رائفل کے دستوں سے مارا، مگر مجھے اور میرے دونوں نقاروں کو چھوڑ دیا تھا، اور ایک درمیانہ عمر کے افکار اور خاندانی سربراہ ہونے کے باعث پڑنے والی جھریوں والے ہوم گارڈ نے میرے رخسار پر پیار سے تھپکیاں بھی دی تھیں، جب کہ ایک اور سنہرے بالوں والے شخص نے، جو ہمہ وقت زور زور سے ہنستا رہتا، اور ہنسنے کے باعث اس کی آنکھیں بگڑ کر ایسی ہو جاتی تھیں کہ آپ ان کو دیکھ نہیں سکتے تھے، مجھ کو اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا، جو آسکر کو بہت مکروہ لگا اور شرمندگی کا باعث ہوا تھا۔

آج بھی اس واقعے کو یاد کر کے مجھے شرمندگی ہوتی ہے، مگر میں خود کو اس خیال سے تسلی دے لیتا ہوں کہ جان نے وہ سب نہیں دیکھا تھا، اس لیے کہ اس وقت بھی وہ اپنے تاش کے پتوں میں مصروف تھا، اور آخر تک اس طرح مصروف رہا تھا کہ کوئی بھی شے اسے اپنی جانب متوجہ نہیں کر سکتی تھی، حتیٰ کہ ہوم گارڈ کی شیطان صفت شرارتیں بھی تاش کے پتوں سے اس کی توجہ ہٹا نہیں سکی تھیں۔ جان تو پہلے ہی تاش کے پتوں کے مکان کے ابدی تصورات میں، اور ہسپانیہ کے قلعوں میں پہنچ گیا تھا جہاں لوگ مسرتوں پر یقین رکھتے تھے، جب کہ ہوم گارڈ اور میں — کہ اس وقت آسکر خود کو ہوم گارڈ ہی تصور کر رہا تھا — اینٹوں سے بنی دیواروں، تنگ راہداریوں، پلاسٹر سے بنی کارنس والی چھتوں کے نیچے کھڑے تھے، جو نفاست سے، دیواروں اور علاحدہ کرنے والی رکاوٹوں سے منسلک کی گئی تھیں اور اس سوچ میں تھے کہ وہ دن بدترین دن ہوگا جب حالات کے پیشِ نظر یا کسی اور وجہ سے یہ سارا تعمیراتی کام اپنا اتصال کھو دے گا۔

بلاشبہ یہ بعد از وقت ادراک مجھے مطمئن نہیں کر سکتا، بالخصوص جب یہ دیکھا گیا ہے کہ میں کبھی کسی زیرِ تعمیر عمارت کو اس وقت تک دیکھ نہیں سکا ہوں، جب تک ایسی ہی کسی عمارت کو مسمار ہونے کے عمل میں دیکھ نہ لیا ہو، اور یہ بھی کہ میں نے ہمیشہ صرف تاش کے

پتوں کے مکانوں کو ہی انسانیت کے لیے قابلِ رہائش سمجھا ہے۔ اس کے علاوہ ایک الزام لگانے والا عنصر بھی ہوتا ہے۔اس شام مجھے پورا یقین تھا کہ جان برانسکی محض انکل یا قیاسی باپ نہیں، بلکہ میرا حقیقی باپ تھا۔جس کی وجہ سے اُسے اس وقت اور ہمیشہ کے لیے ماتسیرات پر فوقیت ہو گئی تھی، اس لیے کہ ماتسیرات یا تو میرا باپ تھا یا کچھ بھی نہیں تھا۔

یکم ستمبر 1939 — میں فرض کر لیتا ہوں کہ آپ نے بھی اس بد قسمت شام تاش کے پتوں سے مکان بنانے والے مسرور برانسکی کو میرے باپ کے طور پر سمجھا تھا — کہ یہ تاریخ میرے دوسرے بڑے وزنی احساسِ جرم کی ابتدا تھی۔ اس وقت بھی جب مجھے اپنے آپ پر زیادہ افسوس ہوتا ہے، میں اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ میرا نقارہ تھا، جی نہیں، وہ میں خود تھا، نقارہ نواز آسکر، جس نے پہلے اپنی بے چاری مما کو، اس کے بعد اپنے انکل اور باپ کو ان کی قبروں کی طرف روانہ کیا تھا۔

مگر ان دنوں جب ایک اِصرار آمیز احساسِ جرم، جسے کوئی شے دور نہیں کر سکتی، میرے اسپتال کے پلنگ کے تکیوں پر بیٹھا ہوتا ہے تو، ہر ایک کی طرح، میں بھی اپنی جہالت کے باعث اپنے آپ کو چھوٹ دینے لگتا ہوں — وہ جہالت جو اُن دنوں کا طرزِ زندگی بن گئی تھی، جسے اب بھی ہمارے بہت سے ہم وطن لاپروا زندہ دلی سے 'اوہ' کہہ کر ہیٹ کی مانند پہن لیتے ہیں۔

پولش بربریت کا معصوم شکار، نادان آسکر، دماغی بخار کے باعث سٹی اسپتال لے جایا گیا۔ ماتسیرات کو اطلاع دے دی گئی تھی۔ اس نے ایک رات قبل میرے غائب ہونے کی اطلاع دے دی تھی، حالاں کہ یہ کبھی ثابت نہیں ہو سکا کہ میں اس کی ملکیت ہوں۔

ان تیس افراد کے ساتھ، جو ہاتھ اٹھائے تھے اور گردنوں کے پیچھے جن کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، جان کی نیوز ریل کے لیے فلم بنانے کے بعد، پہلے تو خالی کرائے گئے وکٹوریا اسکول اور اس کے بعد 'شیس تانگے' قید خانے لے جایا گیا۔ آخر میں، اکتوبر کے شروع میں ساسپے کے متروک قبرستان کی دیوار کے پیچھے انھیں مسام وارریت کے حوالے کر دیا گیا۔

آسکر کو یہ سب کس طرح معلوم ہوا تھا؟ مجھے اس کی خبر لیوشگر سے ملی تھی۔ اس

لیے کہ ہمیں طلاع دینے کے لیے کوئی سرکاری اعلان نہیں کیا گیا تھا کہ کس دیوار کے قریب ان کو گولی ماری گئی تھی، اور ان پر کون سی ریت ڈالی گئی تھی۔ پہلے ہیڈ وگ برانسکی کو ایک رقعہ ملا تھا کہ وہ 'رِنگ اشتراسے' کا فلیٹ خالی کردے، جو 'لفطوا فے' [جرمن ایئر فورس] کے ایک اعلیٰ افسر کے اہلِ خانہ کو دیا جائے گا۔ جب وہ 'رامکاؤ' منتقل ہونے کی تیاری کر رہی تھی — جہاں اس کا ایک مکان اور چند ایکڑ جنگل اور کھیت کی زمینیں تھیں — اس کو ایک رُقعہ ملا تھا جس نے اس کو بیوہ بنادیا تھا۔ اس نے رُقعے کو گھور کر دیکھا، اس کا عکس تو نظر آیا تھا مگر اس میں پوشیدہ عالمِ افسردگی اس کی آنکھوں میں سما نہیں سکا تھا، یہ آہستہ آہستہ اس کے بیٹے اِسٹیفن کے ذریعے اس پر آشکار ہوا، جب ہی اسے اس کا پورا ادراک ہوا تھا۔ اس کو ملنے والا مراسلہ مندرجہ ذیل ہے:

Court-Martial, Eberhardt St. L. Group 41/39

Zoppot, 6 Oct. 1939

Mrs. Hedwig Bronski,

You are hereby informed that Bronski, Jan, has been sentenced to death for irregular military activity and executed.

Zelewski

(Inspector of Courts-Martial)

آپ نے دیکھا، اس میں 'ساپے' کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا تھا۔ ان لوگوں کے اعزہ کی تشویش کے باعث جو اتنی بڑی اجتماعی قبر کے انتظام اور گل پاشی کے بوجھ تلے مالی طور پر کچلے جاتے، اربابِ اختیار نے ان کی دیکھ بھال کرنے حتیٰ کہ ان پر پودے وغیرہ لگانے کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ انھوں نے اس ریتیلی زمین کو برابر کرایا اور وہاں سے کارتوس کے خول ہٹوائے، سوائے ایک خول کے — کہ ہمیشہ ایک نہ ایک رہ ہی جاتا ہے — اس لیے کہ کسی بھی مہذب قبرستان میں پڑے استعمال شدہ کارتوس کے خول اچھے نہیں لگا کرتے، خواہ وہ انجانے میں ہی پڑے رہ گئے ہوں۔

کارتوس کا وہ خول، جو ہمیشہ رہ ہی جایا کرتا ہے، ہم جس کے بارے میں بات کر رہے ہیں، لیو شگر کو ملا تھا، جس سے کوئی بھی کتنی ہی پردہ پوشی سے دفن کیوں نہ کیا گیا ہو،

خفیہ نہیں رہ سکتا۔وہ مجھے بے چاری مما کے اور میرے نشانات سے بھرے جسم والے دوست ہربرٹ ٹروزنسکی کے دفن کے وقت سے جانتا تھا۔وہ یقیناً یہ بھی جانتا رہا ہوگا کہ ہنگس مُنڈ مارکس کہاں دفن کیا گیا ہے—حالاں کہ میں نے اس کے بارے میں کبھی نہیں پوچھا—اور وہ یہ جان کر بہت خوش ہوا کہ مجھے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا ہے، کہ اب اس کو موقع مل گیا تھا کہ وہ مجھ سے کارتوس کے ڈبے کے بارے میں چغل خوری کر سکے گا۔

مگر قبل اس کے میں آپ کو لیوشگر کے تذکرے کے بعد اس معمولی سطح کے زنگ آلودہ کارتوس کے خول والے سایے قبرستان لے چلوں، شاید جس کے اندر کی گولی جان کے مقدر میں لکھی ہوئی تھی، میں آپ سے اسپتال کے دو پلنگوں کا موازنہ کرنے کے لیے کہوں گا، اس کا، جس پر میں واشنگ سٹی اسپتال کے بچوں کے وارڈ میں لیٹا کرتا تھا، اس سے جس پر میں اب لیٹا ہوا ہوں۔دونوں ہی دھات سے بنے ہوئے ہیں؛ دونوں سفید تام چینی سے رنگے ہیں، پھر بھی ان کے درمیان ایک فرق ہے۔بچوں کے وارڈ والا پلنگ چھوٹا تھا،مگر آپ ان کے اطراف لگی ہوئی رکاوٹوں کی پیائش کریں، تو دیکھیں گے کہ وہ نسبتاً چھوٹی تھیں۔ اگر چہ میں 1939 کے چھوٹے مگر بلند جنگلے ہی کو ترجیح دیتا ہوں؛اس وقت میرے پلنگ میں لگا جنگلا مجھے بہت سکون دیتا تھا، جو دراصل بالغ لوگ اور پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ہوتا تھا جو زیادہ مین میخ نہیں نکالتے۔کئی ماہ قبل میں نے اونچے پلنگ کے لیے درخواست دی تھی، حالاں کہ میں دھات اور تام چینی سے بہت مطمئن ہوں۔اس کا فیصلہ میں نے انتظامیہ پر چھوڑ دیا ہے، وہ منظور کریں یا رد کر دیں۔میں نتیجے کا سکونِ قلب سے منتظر ہوں۔

آج میں ملاقات کرنے آنے والوں کے سامنے خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہوں: اس زمانے میں جب میں بچوں کے حصے میں ہوتا تھا ایک اونچی باڑ مجھے ملاقات کے لیے آنے والے ماتسیرات سے، مسٹر اور مسز گریف سے، مسٹر اور مسز شیفلر سے الگ رکھتی تھی۔اور اسپتال میں میرے قیام کے آخر تک، میری باڑ میں لگی رکاوٹوں نے چار لہنگوں والے پہاڑ کو پریشان اور زور زور سے سانس لینے والوں کے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا جو میری نانی اماں انا کو واچکی کے نام سے موسوم تھا۔وہ آئی، سرد آہ کھینچی، اپنی چٹی چٹی گلابی ہتھیلیوں کا

مظاہرہ کرتے ہوئے، اپنے رنگ بدگئے ہاتھ بلند کیے، اور اپنے ہاتھوں اور ہتھیلیوں کو قنوطیت کے سمندر میں غرق ہو جانے دیا۔ اس کی قنوطیت اتنی شدید تھی کہ اس کے ہاتھ اس کے زانوؤں پر ضرب لگاتے تھے، اور آج بھی میں اس ضرب کی آواز سنتا رہتا ہوں، حالاں کہ میں اپنے نقارے پر اس کی صرف نہایت کھردرے انداز میں نقل کر سکتا ہوں۔

اپنی پہلی ہی ملاقات پر وہ اپنے ساتھ اپنے بھائی وِنسنٹ برانسکی کو لائی تھی، جو میرے پلنگ کی باڑ کو مٹھی سے پکڑ کر بات کرتا یا دھیمے انداز میں گاتا تھا، مگر کنواری مریم، پولینڈ کی ملکہ کے بارے میں دیر تک گاتا رہتا تھا۔ آسکر خوش ہوتا جب کوئی نرس قریب ہوتی تھی۔ چوں کہ یہ دونوں مجھے بچانے والے تھے، انھوں نے اپنی بے داغ آنکھیں میری جانب کیں، کہ مجھے دماغ کے بخار کے باعث وقت کا بھی اندازہ نہیں تھا، جو مجھے اس وقت سے لگا تھا جب میں ڈاک خانے میں skat کھیل رہا تھا۔ وہ دونوں مجھ سے جان کے تاش کے پتوں سے بنے مکانات اور وحشت کے درمیان کے آخری لمحات کے بارے میں تعزیت کے چند لفظ کی توقع کر رہے تھے۔ دراصل، وہ مجھ سے اعتراف کرانا چاہتے تھے، جسے وہ جان کی صفائی کے طور پر پیش کر سکیں؛ گویا جان کی صفائی میرے ہاتھوں میں تھی، گویا میری گواہی میں کوئی وزن بھی ہوگا۔

فرض کیجیے کہ میں نے Eberhardt Group کے کورٹ مارشل کو حلفیہ بیان بھیج دیا ہوتا تو میں نے اس میں کیا کہا ہوتا؟ من کہ آسکر ماتسیرات، حلفیہ اعلان کرتا ہوں کہ 31 اگست کی اس شام میں جان کے گھر کے باہر اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا، اور میں، اس بنیاد پر کہ میرے نقارے کو مرمت کی ضرورت تھی، اس کو پولش ڈاک خانے واپس لے گیا تھا، جسے جان برانسکی چھوڑ چکا تھا اس لیے کہ وہ اس کا دفاع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آسکر نے ایسا کوئی اعتراف نہیں کیا؛ اس نے اپنے قیاسی باپ کو بَری کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ جب بھی وہ بزرگ افراد سے بات کرنے کا فیصلہ کرتا، تو اس پر تشنج کے ایسے دورے پڑ جاتے کہ ہیڈ نرس کے حکم پر اس کے ملاقات کے وقت میں کمی کر دی جاتی، اور اس کی نانی اماں انا اور اس کے ماموں وِنسنٹ کی ملاقاتیں ممنوع کر دی جاتی تھیں۔

'بساؤ' سے آنے والے دو بوڑھے افراد جو میرے لیے سیب لائے تھے، بچوں کے وارڈ سے، چوکس دیہاتی رفتار میں، شہر چلے گئے تھے۔ میری نانی اماں کے جا رلہنگوں اور اس کے بھائی کے اتوار والے سیاہ سوٹ، جن سے گائے کے گوبر کی بو آتی تھی، اور واپس جانے والے قدموں کی آواز میرے احساسِ جرم کو اور اس کے بار کو بے حد بڑھا رہی تھی۔

ایک بار ایسا ہوا۔ جب ماتسیرات، گریف، شیفلر وغیرہ میرے پلنگ کے اطراف فروٹ کیک لیے جمع تھے، جب کہ میری نانی اماں اور انکل ونسنٹ، 'گولڈ کروگ' کے راستے 'بساؤ' سے آئے تھے، اس لیے کہ 'کارت ہاؤس' سے لانگ فور تک ریلوے لائن کھلی نہیں تھی، جب کہ نرسیں اپنے بے ہوش کر دینے والے سفید لباس میں اسپتال کی باتیں کر رہی تھیں اور بچوں کے وارڈ میں وہ فرشتوں کا متبادل بنی ہوئی تھیں، پولینڈ ہاتھ سے گیا نہیں تھا، یا تقریباً جا چکا تھا اور بالآخر مشہور اٹھارہ دنوں بعد پولینڈ ہاتھ سے چلا گیا تھا، حالاں کہ جلد ہی پتا چلا تھا کہ پولینڈ ابھی تک گیا نہیں ہے؛ جیسا کہ آج ہوا ہے، سیلیسیائیوں اور مشرقی پروشیائیوں کی محبِ وطن سوسائیٹیوں کی کوششوں سے پولینڈ ابھی تک ہاتھ سے گیا نہیں ہے۔

او پاگل گھڑسوار سپاہیو! گھوڑوں پر سوار ہو کر تم بلیو بیری توڑ رہے ہو۔ سرخ اور سفید تکونے پرچموں سے مزین برچھے اُٹھائے۔ افسردگی کے دستے اور روایات کے دستے۔ تصویری کتابوں کے الزامات۔ 'لوڈز' اور 'کٹنو' کے میدانوں میں گھوڑوں کی دوڑ۔ اُف، کتنی شان دار ہے ان کی سرپٹ دوڑ! ہمیشہ غروبِ آفتاب کے انتظار میں رہتے ہیں۔ سامنے کا میدان اور عقب کا میدان دونوں کو گھڑسواروں کے حملے سے پہلے تیار ہونا چاہیے، اس لیے کہ جنگوں کو تصویر کشی کے لیے بنایا گیا تھا اور موت کو پینٹ کرنے کے لیے، نصف دوڑ کے لیے تیار، اس کے بعد گرنا، بلیو بیری کتر کتر کر کھانا، سرخ خوش بودار پھولوں کا مرتعش ہو کر بے چینی پیدا کرنا، کہ بے چینی بغیر گھڑسوار کو دیں گے نہیں۔ اُدھر اُلہن [پولش] لوگ بھی ہیں، ان کو پھر بے چینی ہو رہی ہے، پیال کے ڈھیر کے درمیان — تمھارے لیے بنانے کا ایک اور تصویر کا موقع ہے — اپنے گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے، وہ ایک آدمی کو گھیر لیتے ہیں، اس کو ہسپانیہ میں Don Quixote کہتے ہیں، مگر یہاں وہ

Pan Kichot کہلاتا ہے، ایک خالص خون والا پولش، ایک امیر زادہ، غم کی تصویر، جس نے اپنے اُلہن لوگوں کو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھی خواتین کے ہاتھوں کا بوسہ لینا سکھایا ہے، اوہ، کیسے ضبطِ نفس سے وہ موت کے ہاتھوں کا بوسہ لیں گے، جیسے موت کوئی خاتون ہو؛ جب غروب ہوتا آفتاب عقب میں ہو تو پہلے وہ جمع ہوتے ہیں — اس لیے کہ رنگ اور رومانس ان کا اندوختہ ہوتا ہے — اور ان کے آگے جرمن ٹینک ہوتے ہیں، کروپس اور ہالباخ کے اصطبل کے سیاہ گھوڑے [یعنی فولادی ٹینک]، دنیا میں جن سے بہتر نسل نہیں ملتی، مگر Pan Kichot، کج رو جنگجو موت سے محبت کرنے والا، ہنر مند، بہت ہنر مند جنگجو، نصف ہسپانوی، نصف پولش، اپنے سُرخ اور سیاہ بگولے پرچموں سے مزین نیزوں کو خم کرتا ہے، اور اپنے آدمیوں کو خاتون کے ہاتھوں کا بوسہ دینے کا حکم دیتا ہے۔ سارس، سُرخ و سفید، چھتوں کے اوپر قیں قیں کرتے ہیں، اور جب غروب آفتاب سُرخی تھوکنے لگتا ہے، تو وہ اپنے گھڑ سواروں سے چیخ کر کہتا ہے، ''او پولینڈ کے گھڑ سوار شرفا! یہ فولاد کے ٹینک نہیں ہیں، یہ تو محض پَون چکیاں ہیں یا بھیڑیں ہیں، میں تم کو خاتون کے ہاتھوں کا بوسہ لینے کا حکم دیتا ہوں۔''

لہٰذا دستے غروب آفتاب کے لعابِ دہن میں مزید سُرخی کا اضافہ کرتے ہوئے، اپنے فولادی دشمنوں کی جانب بڑھے۔ آسکر امید کرتا ہے کہ اس شاعرانہ اندازِ کلام پر اسے معاف کر دیا جائے گا۔ بہتر ہوتا کہ پولش گھڑ سوار فوج کے جانی نقصانات کے بیان کے لیے اعداد و شمار کا سہارا لیا جاتا، جن کے ذریعے نام نہاد پولش منظم کوشش کو خشک مگر خوش گفتار اعداد و شمار سے یاد کیا جاتا۔ ایک اور متبادل یہ ہو سکتا تھا کہ نظم کو اعداد و شمار کے سہارے ایستادہ کیا جا سکتا۔

ستمبر 1920 تک، میں اسپتال میں اپنے بستر پر لیٹا 'جیشکیتال' اور 'اولیوا' کی بلندیوں سے دہاڑتی توپوں کی گولا باری سن سکتا تھا۔ اس کے بعد، جزیرہ نما 'ہیلا' سے ہونے والے مزاحمت کے آخری دستے نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ آزاد دانسنگ اپنی گوتھک اینٹوں والے 'آنشلوس' [12 مارچ 1938 میں آسٹریا کا ہٹلر کے جرمنی میں انضمام] کا جشن منا رہا تھا اور مسرت سے چانسلر اور فیوہرر ہٹلر اپنی نیلی آنکھوں سے (جو

عورتوں کے معاملے میں) جو فیوہرر اور چانسلر تھا، اپنی سیاہ رنگ کی مرسیڈیز کار میں کھڑا لوگوں میں اپنی مخصوص مستطیل سلامی بانٹ رہا تھا۔

اکتوبر کے وسط میں آسکر کو سٹی اسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ مجھ پر نرسوں کی جدائی شاق تھی۔ جب ان میں سے ایک نے— میرے خیال میں اس کا نام برنی یا شاید ارنی تھا— بہرطور ارنی یا برنی نے مجھے دو نقارے دیے تھے، ان میں سے ایک نے، جو خستہ تھا، مجھے شرمندہ کیا تھا، اور جو سالم تھا، جسے میں نے پولش ڈاک خانے کی جنگ میں فتح کیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ کئی ہفتوں سے میں نے نقاروں کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا کہ [''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' کے مصداق] نرسوں کو ہنسانے کے لیے نقاروں کے سوا دنیا میں اور بھی بہت کچھ تھا۔

ماتسیرات میرا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔ میں اب بھی، تین برس کے بچّوں جیسے پیروں پر لرز رہا تھا، جب میں اپنے ساز و سامان اور نئی معلومات کے ساتھ 'لیبس وِگ' کے فلیٹ جانے کے لیے سٹی اسپتال سے رخصت ہو رہا تھا، جہاں مجھے جنگ کے پہلے برس کے مشکل دن، بالخصوص، مشکل اتوار گزارنے تھے۔

نومبر کے مہینے کے آخر میں، کئی ہفتوں کی صحت یابی کے بعد، ایک منگل مجھے باہر جانے کی اجازت دی گئی تھی۔ جب میں افسردگی کے ساتھ نقارہ نوازی کرتا، برفیلی بارش پر توجہ دیے بغیر، گلیوں سے گزر رہا ہوتا، تو سوائے، لیوشگر کے بھلا کون ہو سکتا ہے جس سے آسکر کی 'میکس ہالبے پلاٹز' اور 'بریڈسٹر وِیگ' کے کونے پر ملاقات ہو سکتی تھی۔

ہم تھوڑی دیر شرمندگی آلودہ مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے کھڑے رہے، اور جب تک کہ لیو نے اپنے صبح والے کوٹ کی جیب سے زردی مائل سفید رنگ کے دستانے نہیں نکالے، جن میں انگلیوں اور ہتھیلی پر کھال جیسی کوئی شے سلی ہوئی تھی، مجھے احساس نہیں ہوا تھا کہ میں کس سے مل رہا تھا اور یہ ملاقات کس بات کا پیش خیمہ ہوگی، آسکر خوف زدہ تھا۔

تھوڑی دیر تک تو ہم قیصر کی کریانے کی دکان کی کھڑکیوں کا معائنہ کرتے رہے، سڑک پر گزرتی ہوئی پانچ اور نو نمبر کی ٹرام گاڑیوں کی طرف دیکھتے رہے جو میکس

ہالبے پلاٹز' سے گزر رہی تھیں؛ پھر 'مروئسٹر وگیٔ' پر ایک جیسے بنے ہوئے مکانوں کے گرد ہوتے ہوئے ہم نے ایک اشتہاری ستون کے گرد کئی چکر لگائے، ایک اشتہار کے بیان کو پڑھا جو بتا رہا تھا کہ وانتسنگ کے گلڈن [سکّے] کو رائج کے مارک میں کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے، پرسل صابن کے پاؤڈر کے اشتہار کو کھرونچا تو ہمیں نیلے اور سفید رنگ کے نیچے تھوڑی سی سُرخی بھی نظر آئی تھی مگر ہم نے اس کو یوں ہی رہنے دیا۔ ابھی ہم 'میکس ہالبے پلاٹز' کی طرف چلے ہی تھے کہ لیوشگر نے اچانک آسکر کو اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک دروازے کی جانب ڈھکیل دیا، اس کے کوٹ کے نیچے دستانے سمیت اپنا بایاں ہاتھ لے جا کر اس کی پتلون کے جیب میں ڈال دیے اور کج انگلیوں سے تلاشی لی۔ اسے جو کچھ ملا، اس کو ایک لمحے ٹٹول کر دیکھتا رہا، پھر جو کچھ ملا تھا اس سے مطمئن ہو کر اپنے ہاتھ کو بند مٹھی کی صورت اس کی جیب سے باہر نکال لیا۔ اپنے بند ہاتھ کو آہستہ آہستہ آگے بڑھایا، اور آسکر کو دروازے کے قریب کی دیوار پر ڈھکیلا؛ اس کا بازو لمبا ہوتا جا رہا تھا، مگر دیوار پسپا نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اس کے بازو کی گول ہڈی اپنے ساکٹ سے باہر نکل پڑے گی، کہ اس کا بازو میرے سینے میں سوراخ کرتا، میرے شانے کی ہڈیوں کے درمیان سے ہوتا ہوا دروازے کی پھپھوندی لگی دیوار میں داخل ہو جائے گا۔ میں ڈر رہا تھا کہ جو کچھ اس کی مٹھی میں بند ہے آسکر کو کبھی نظر نہیں آئے گا کہ اس کو زیادہ سے زیادہ دروازے کی عمارت کے قوانین معلوم ہو جائیں گے، جو 'لیس وگیٔ' کی اس عمارت جیسے ہیں جس میں آسکر کا گھر تھا۔ اور پھر پانچ نلکیوں والی چلد کھل گئی۔

میرے ملاحوں والے کوٹ کے لنگر نما بٹنوں پر زور ڈالتے ہوئے، لیو نے اتنی تیزی سے اپنی مٹھی کھولی تھی کہ میں نے اس کی انگلیوں کے جوڑوں کے چٹخنے کی آواز سُن لی تھی۔ اور لیجیے، اس کھلی ہوئی مٹھی کے تحت چمک دار چمڑے سے ڈھکی ہتھیلی پر چلے ہوئے کارتوس کا ایک خول رکھا ہوا تھا۔

جب لیو نے اپنی مٹھی دوبارہ بند کی تو میں اس کے ساتھ چلنے پر تیار تھا۔ دھات کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا مجھ سے براہِ راست بات کر چکا تھا۔ ہم برابر برابر 'مروئسٹر وگیٔ' پر چلے؛

اس بار کھڑکی کی سجی دکانوں کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں تھا، کسی اشتہاری ستون نے بھی ہم کو نہیں روکا۔ ہم نے 'مُیگدے بُرگراستراسے' کو پار کیا، اپنے پیچھے 'مُونسٹر وِیگ' کی بکس نما عمارتوں کی دو دیواریں چھوڑیں، خطرے سے خبردار کرنے والی ان روشنیوں کے قریب رُکے، جو ہوائی جہازوں کے اُڑنے یا اترنے کا اشارہ کر رہی تھیں، تھوڑی دور تک ہوائی اڈے کی باڑ کے ساتھ ساتھ چلے، پھر کولتار سے بنی ہوئی گیلی سڑک پر آگئے اور پانچ نمبر ٹرام کار کی پٹریوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے، جو 'بُروُسن' کی طرف لے جاتی تھیں۔

ہم ایک لفظ بھی نہیں بولے، مگر کارتوس کا خول لیو کے دستانے میں ہی رہنے دیا تھا۔ موسم بہت خراب اور ٹھنڈا تھا اور جب میں نے ہاتھ ہلایا اور واپس جانے کے بارے میں سوچا، تو اس نے اپنی مٹھی کھول دی، اس چھوٹے دھات کے ٹکڑے کو اپنی ہتھیلی ہی پر اوپر نیچے اچھالا اور مجھے چلنے پر آمادہ کیا، سو قدم، پھر مزید سو قدم، ساتھ ہی موسیقی بھی استعمال کی۔ جب 'ساپیے' شہر سے ذرا پہلے میں نے سنجیدگی سے واپسی کا فیصلہ کر لیا تو وہ ایڑیوں کے بَل مُڑا، کارتوس کے خول کے کھلے ہوئے حصے کو اوپر کی جانب کر کے، بانسری کی طرح اس کو اپنے ہونٹوں تک لے گیا، جس سے ایک نیا سُر نکالا، جو کبھی چیخ، کبھی اس طرح کی آواز تھی جیسے کہرے نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو اور وہ بارش کی خواہش کر رہا ہو۔ آسکر کانپ گیا۔ وہ صرف موسیقی ہی نہیں تھی جس نے اس پر کپکپی طاری کر دی تھی۔ یہ اس منحوس موسم کی کارستانی تھی جو، معلوم ہوتا تھا کہ موقعے کے مطابق بدل دیا گیا تھا، جس نے حال زیادہ خراب کر دیا تھا۔ میری حالت اتنی خراب تھی کہ میں اپنی کپکپی کو مشکل ہی سے چھپا سکتا۔

کون سی شے تھی جس نے مجھے 'بُروُسن' کی طرف جانے پر راغب کیا تھا؟ لیو، متنوع بانسری بجانے والا، کارتوس کے خول سے بانسری بجا رہا تھا، مگر معاملہ اس سے بھی کچھ زیادہ تھا۔ لنگر اندازی کے لیے بنے ساحل سے، اور 'نیوفارواہر' سے، نومبر کے مہینے کے کہر کے عقب سے، بحری جہازوں کی سیٹیوں اور کسی تارپیڈو کشتی کی بھوکی گڑگڑاہٹ کی آوازیں آ رہی تھیں جو 'شات لینڈ'، 'شیلمول' اور 'رواخ شولوئی' سے گزر کر یا تو بندرگاہ کے اندر یا باہر جا رہی تھی۔ تاروں سے لگائی گئی باڑ سے زیادہ دور نہیں، جو 'پیلونکن' کی طرف

مڑتی تھی، اور ہوائی اڈے کو تربیت کے نئے میدان سے الگ کرتی تھی، لیوشنگر کھڑا ہوگیا اور کافی دیر تک کھڑا رہا تھا، اس کا سر ایک جانب کو جھکا ہوا تھا، کارتوس کے خول سے اس کا لعاب دہن بہہ رہا تھا اور وہ میرے چھوٹے سے کپکپاتے جسم کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے کارتوس کے خول کو چوسا، اس کو اپنے اوپری ہونٹ سے دبائے رکھا اور پھر کسی اچانک خیال کے آتے ہی تیزی سے اپنے بازو پھیلائے، اپنی صبح کا ٹیل کوٹ اتارا، اور اس بھاری سے کپڑے کو جو گیلی مٹی کی بو دے رہا تھا، میرے سر اور شانے پر ڈال دیا۔

ہم ایک بار پھر چل پڑے۔ مجھے خبر نہیں کہ آسکر کی سردی کم ہوگئی تھی یا نہیں۔ لیو کبھی پانچ قدم تیز تیز چلتا اور رُک جاتا: اور جب وہ اپنی شکنوں سے پُر مگر خوف ناک قمیص میں کھڑا ہوجاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قرونِ وسطیٰ کے کسی عقوبت خانے، شاید 'اسٹاک حرم' سے نکل کر سیدھا آ کھڑا ہوا ہے، گویا وہ ''دیوانے کیا پہنیں گے'' نامی کسی مضمون کی تفصیل پیش کر رہا ہو۔

جب بھی لیو مجھے زمین پر جھاڑو دیتے ہوئے اپنے لانبے کوٹ میں ملبوس لڑکھڑاتا چلتا ہوا دیکھتا تو زور زور سے ہنسنا شروع کر دیتا اور کسی پہاڑی کوے کی مانند اپنے بازو کو پَروں کی طرح پھڑ پھڑانے لگتا۔ میں اسے ضرور کوئی مضحک پرندے، کسی کوے جیسا دکھائی دیتا ہوں گا، خاص کر اس وقت جب میں اپنی کوٹ کی دُم [coattails] کے پروں کو کولتار سے بنی کسی وسیع شاہراہ پر اس طرح گھسیٹتا ہوا چلتا رہا جیسے کوئی ریل گاڑی یا کسی طویل بڑی سی جاروب نما جھاڑی یا بڑے سے پونچھے کو اس طرح گھسیٹا جائے کہ اس سے ایک وسیع اور شاہانہ راستہ بنتا جاتا ہو۔ آسکر کا سر فخر سے اونچا ہوجاتا تھا جب وہ پلٹ کر اپنے ماضی کی طرف دیکھتا، اور پیش بینی کرنے لگتا، کہ اس کا مقسوم ابھی تک پوری طرح نافذ العمل نہیں ہوا ہے۔

'میکس ہالبے پلاٹز' چھوڑنے سے پہلے ہی مجھے شبہ ہوگیا تھا کہ لیو مجھے 'برُوسی' یونیو فاروا سر' لے جانے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ ابتدا ہی سے یہ صاف ظاہر ہوگیا تھا کہ ہم دونوں 'ساپیے' کی طرف جا رہے ہیں، جس کے نزدیک پولیس کے لیے ایک جدید نوعیت کی رائفل کی چاند ماری بنائی گئی ہے۔

ستمبر سے اپریل تک، ساحل تک لے جانے والی ٹرام گاڑیاں ہر پینتیس منٹ پر چلا کرتی تھیں۔ ہم ابھی 'لانگ فوز' کے مضافات سے نکل ہی رہے تھے کہ 'مُدوِسَن' کی طرف سے آنے والی ایک ٹرام گاڑی ہمارے سامنے سے گزری، جس سے کوئی ٹریلر نہیں لگا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ٹرام گاڑی جو 'مگدے برگر اسٹراسے' کی بغلی لائن پر رُکی انتظار کر رہی تھی ہمارے پیچھے سے آئی اور گزر گئی۔ ابھی ہم قبرستان تک پہنچ بھی نہیں تھے، جس کے قریب ہی ٹرام کاروں کے لیے ایک اور بغلی لائن بنائی گئی تھی، کہ کھڑ کھڑ کرتی گھنٹی بجاتی ایک اور ٹرام گاڑی ہمارے پیچھے سے آئی، اور جلد ہی کہر اور نمی کے باعث چمکتی ایک اور گاڑی میں جنبش ہوئی، اور وہ بھی ہمارے سامنے سے گزر گئی۔

ٹرام چلانے والے کا سپاٹ اور روکھا چہرہ آسکر کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔ لیو شگر اس کو کولتار سے بنی سڑک پر لے کر چلا جس پر ریت پھیلی ہوئی تھی جو ساحل کے قریب کے ٹیلوں کی ریت سے مختلف نہیں تھی۔ قبرستان ایک مربع تھا اور اس کے اطراف ایک دیوار بنی ہوئی تھی۔ ہم جنوب کی جانب سے، ایک چھوٹے سے زیبائشی زنگ لگے پھاٹک سے داخل ہوئے جسے بند ہونا چاہیے تھا۔ قبروں کے زیادہ تر نشانات سویڈن کے سیاہ سنگِ خارا یا آتش فشاں چٹان کے پتھروں سے بنائے گئے تھے، پیچھے اور پہلوؤں پر کھردرے اور سامنے سے چمک دار پالش کیے ہوئے تھے۔ کچھ خطرناک حد تک جھکے ہوئے تھے، اور کچھ تو گر بھی گئے تھے۔ بدقسمتی سے، لیو نے مجھے ان کو پڑھنے کا موقع نہیں دیا۔ اس جگہ پیڑوں کی کمی تھی: پانچ یا چھ عدد، کرم خوردہ اور کٹے پھٹے صنوبر کے درختوں کے علاوہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ مما نے اپنی زندگی میں اسی اجڑے قبرستان کی تعریف کی تھی؛ جیسا کہ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ تمام آخری آرام گاہوں میں یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی، مگر اب وہ 'برنتاؤ' میں لیٹی ہوئی تھی۔ وہاں کی زمین زیادہ زرخیز تھی، جس میں دیودار اور چنار کے درخت تھے۔

قبل اس کے کہ میں اپنے خیالات کو رومانوی بوسیدگی سے ہم آہنگ کر سکتا، شمالی دیوار میں نصب، کھلے ہوئے پھاٹک سے، جو اپنی جالیوں سے محروم ہو چکا تھا، لیو مجھے قبرستان سے باہر لے گیا۔ دیوار سے قریب کی زمین سپاٹ اور ریتیلی تھی۔ بھاپ جیسے کہر

کے درمیان، جاروب نما جھاڑیوں، کھردرے صنوبر اور سُرخ رنگ کے پھول مشرق کی جانب پھیلے ہوئے تھے۔ اور جب میں نے پلٹ کر قبرستان پر نظر کی تو مجھے فوراً ہی نظر آ گیا تھا کہ شمالی دیوار کے ایک حصے پر تازہ تازہ چونا کلی کی گئی تھی۔ دیوار کے اس حصے سے قریب، جو اتنی ہی دردانگیزی سے نئی لگتی ہے جیسی کہ لیو کی شکنوں بھری سفید قمیص، لیو نے بہت سرگرمی دکھائی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا اور ان کو بلند آواز میں گنتا بھی جا رہا تھا؛ ہر موقعے پر وہ بلند آواز میں ہی گنتا تھا، اور آج بھی آسکر کو یقین ہے کہ وہ لاطینی زبان میں گنتی گنا کرتا تھا۔ جیسی بھی دعا کیوں نہ ہو، وہ ترنم میں پڑھتا تھا جو بلاشبہ اس نے مدرسے میں سیکھا ہو گا۔ لیو نے دیوار کے چونا کلی کیے ہوئے حصے سے، جہاں شاید دیوار کی مرمت کی گئی تھی، تقریباً دس گز کے فاصلے پر ایک نشان لگایا، اس جگہ پر لکڑی کا ایک ٹکڑا بھی گاڑ دیا۔ یہ سارے کام اس نے بائیں ہاتھ سے کیے تھے اس لیے کہ دائیں ہاتھ میں کارتوس کا خول تھا۔ بالآخر کبھی نہ ختم ہونے والی تلاش اور نشان دہی کے بعد، لکڑی کے اس ٹکڑے کے قریب جھک کر اس نے دھات کے، اندر سے خالی خول کو دفن کر دیا، جو ایک سرے پر مخروطی شکل کا تھا اپنے اندر رکھے ہوئے سیسے کے مغز [یعنی گولی] کو خول سے نکالنے، اور اس کو موت دینے والے سفر پر روانہ کرنے کے لیے کسی قسم کی ہوئی انگلی سے زور لگانا پڑتا تھا۔

ہم وہیں کھڑے رہے۔ لیو شگر کے دہن سے رال بہہ بہہ کر ڈور کے انداز میں لٹک رہی تھی۔ اپنے دستانے سمیت ہاتھ ملتے ہوئے وہ کچھ دیر تک لاطینی زبان میں ترنم سے کچھ پڑھ رہا تھا، مگر تھوڑی دیر کے بعد رُک گیا، اس لیے کہ وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا جس سے اس کا ردِعمل معلوم کیا جا سکتا۔ وقفے وقفے سے وہ پلٹتا اور شاہراہ کی طرف والی دیوار پر تیز نظریں ڈالتا، بالخصوص اس وقت جب ٹرام گاڑیاں جن کا بیشتر حصہ خالی ہوتا، راستہ بدلنے والی جگہ پر رُکتیں، اور مخالف سمت جاتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے گھنٹی بجاتیں۔ لیو شاید سوگ کرنے والوں کے انتظار میں تھا، مگر نہ پا پیادہ، نہ کار میں، کوئی بھی اس جگہ نہیں آیا، جن کے سامنے تعزیت کے لیے وہ اپنے دستانے والا ہاتھ بڑھا سکتا۔

ایک بار ہمارے اوپر سے کچھ ہوائی جہاز دہاڑتے ہوئے گزرے۔ ہم نے سر

اٹھا کران کی طرف نہیں دیکھا، اور اس کی بات کی پروا کے بغیر کہ Ju-52 قسم کے تین ہوائی جہاز، جن کے پَروں کی نوک پر روشنیاں جل بجھ رہی تھیں، زمین پر اترنے کی تیاری کر رہے تھے، ہم بس ان کی آواز سنتے رہے۔

ٹرام گاڑیوں کے چلے جانے کے بعد — خاموشی اتنی ہی تکلیف دہ تھی جیسی کہ ہمارے سامنے کی سفید دیوار — لیو شگر نے اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا۔ ایک لمحے کے بعد وہ میرے برابر کھڑا تھا۔ اپنے کوے جیسے سیاہ لباس کو آسکر کے کاندھوں سے رگڑتا ہوا، وہ تیر کی طرح ساحل کی طرف، سُرخ پھولوں والی جھاڑیوں، سخت کھردرے صنوبروں کی طرف بھاگا، اور جاتے ہوئے اس نے اس حساب سے کوئی شے گرادی گویا وہ چاہتا تھا کہ اس شے کو پایا جائے۔

جب تھوڑی دیر پیش منظر میں بھوت پریت کی طرح حرکت کرتا دکھائی دینے کے بعد لیو دودھ جیسے نظر آنے والے، شبنمی دھند زدہ تالابوں کی آڑ میں غائب ہو گیا، اور میں بارش میں اکیلا رہ گیا تھا، تب میں نے اس شے کو ریت پر سے اٹھایا: وہ skat کے کھیل کا ایک پتا تھا، حکم کا ستا۔

'ساپسے' نامی قبرستان میں ملاقات کے چند دنوں بعد، آسکر کی اپنی نانی اماں انا کوواچکی سے لانگ فور کے ہفتہ وار بازار میں ملاقات ہوئی۔ اب، جب کہ 'بساؤ' کے قریب کوئی سرحدی نشان نہیں تھا، ایک بار پھر وہ بازار میں اپنے گرم گلے، انڈے، مکھن اور سردی کے موسم کے سیب لے کر آ گئی تھی۔ لوگ وافر مقدار میں خریداری کر رہے تھے اور سامان جمع کرنا شروع کر دیا تھا، اس لیے کہ خوراک پر پابندی شروع ہونے والی تھی۔ جس طرح آسکر اپنی نانی کو اپنے مال کے پیچھے بیٹھی دیکھ رہا تھا، وہ skat کے پتے کو اپنی جلد پر، اپنے کوٹ کے نیچے، سوئٹر اور زیر جامے کے نیچے محسوس کر رہا تھا۔ پہلے تو 'ساپسے' سے 'میکس ہالبے پلاٹز' تک سواری کے درمیان، جب ٹرام کے ایک کنڈکٹر نے مجھے مفت سفر کی دعوت دی تھی، میں حکم کے ستے کو پھاڑ کے پھینک دینے والا تھا، مگر آسکر نے اس کو پھاڑا نہیں، اپنی نانی اماں کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جب اس نے آسکر کو دیکھا تو وہ اپنے

گرم گلوں کے پیچھے خوف زدہ دکھائی دی تھی ۔ ہو سکتا ہے کہ اسے خیال آیا ہو کہ آسکر کی موجودگی خوش آئند نہ ہو، مگر پھر اس نے اپنے اس تین سالہ شیطان کو مچھلی کے جھابوں کے پیچھے نصف روپوش دیکھا تو اس کو اپنی جانب آنے کے لیے کہا۔ آسکر نے کچھ توقف کیا: پہلے اس نے تقریباً ایک گز لمبی کاڈ مچھلی کا معائنہ کیا جو گیلی سمندری گھاس پر پڑی ہوئی تھی، پھر کچھ کیکڑوں کو دیکھا جو جھابے کے اندر رینگ رہے تھے: اور آخر میں، اس نے خود ایک کیکڑے کا روپ دھارا اور ملاحوں کے کوٹ میں ملبوس، کبھی کبھی اپنے لنگر جیسے بٹن دکھانے کے لیے مڑ کر دیکھتا ہوا، وہ اپنی نانی اماں کے اسٹال کی طرف اُلٹے پاؤں چلا، اور راستے میں آنے والی آرے کی گھوڑی کو ایک طرف دھکیل دیا، جس کہ وجہ سے سیب لڑھکنے لگے تھے

'شووَرڈ فیگر' اخبار کے کاغذ میں لپٹی اپنی گرم اینٹوں سمیت آیا، ان کو میری نانی اماں کے لہنگوں کے نیچے دھکیلا، raker سے ٹھنڈی اینٹیں واپس نکالیں، جیسا کہ مجھے یاد ہے وہ کیا کرتا تھا، اپنی تختی پر جو اس کے گلے میں لٹکی ہوئی تھی، ایک نشان بنایا اور دوسرے اسٹال کی طرف چلا، جب کہ نانی اماں نے مجھے چمکتا ہوا ایک سیب کھانے کو دیا۔ اس نے سیب دیا تھا تو بدلے میں آسکر اسے کیا دے سکتا تھا؟ پہلے تو اس نے skat کا پتا دیا، پھر کارتوس کا خول دیا، اس لیے اس نے خول کو 'ساپہے' میں بھی نہیں چھوڑا تھا۔ تھوڑی دیر تک انا کو واجکی ان دو نا قابلِ تصور چیزوں کو گھور کر دیکھتی رہی جو ایک دوسرے سے کتنی مختلف تھیں۔ پھر آسکر اس کے عمر رسیدہ کُرکُری ہڈی والے کانوں کی طرف بڑھا جو اس کے سرپوش رومال کے نیچے چھپے ہوئے تھے، اور احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے، میں نے سرگوشی میں، جان کے جیسے گلابی، چھوٹے مگر بھرے بھرے، اور لمبی lobes والے متوازن کانوں میں "وہ ساپہے میں آرامیدہ ہے" کہا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا، اور جاتے ہوئے اس کے گرم گلوں کا ایک جھابا الٹ گیا تھا۔

# ماریا

تاریخ اپنے پھیپھڑوں کی انتہائی طاقت سے گرجتے ہوئے خاص نوعیت کے اعلانات کرتی ہوئی، خوب گریس لگی خاکی و آبی سواری پر، جو یورپ کی سڑکوں اور آبی راستوں، بلکہ ہوائی راستوں پر بھی چلتی ہوئی، راستے میں آنے والی ہر شے کو فتح کرتی ہوئی دوڑ رہی تھی، جس میں میرے معاملات بھی شامل تھے، جو پالش کیے ہوئے کھلونے نقارے تک محدود تھے، بہت خراب ہو رہے تھے۔ جب تاریخ ساز لوگ دونوں ہاتھوں سے بیش قیمت دھاتیں ضائع کر رہے تھے، میں ایک بار پھر نقاروں کی قلت کا شکار ہو رہا تھا۔ جی ہاں! آسکر پولش ڈاک خانے سے ایک بالکل نیا نقارہ بچا لانے میں کامیاب ہو گیا تھا، جس میں ایک بھی نشان نہیں لگا تھا۔ اس طرح ڈاک خانے کے دفاع کو کچھ اہمیت دی تھی مگر لیڈر کے بچوں کا نقارہ، میرے، یعنی آسکر کے لیے کیا معنی رکھ سکتا تھا، جس نے اپنے تکلیف دہ دنوں کے مشکل سے آٹھ ہفتوں میں ایک نقارے کو کباڑ میں تبدیل کر دیا تھا۔ نئی اسپتال سے فارغ ہوتے ہی میں نے نرسوں کی جدائی کے جنون میں غصے سے بھر پور انداز میں نقارہ بجانا شروع کر دیا تھا۔ 'ساپیے' کی بارشوں والی شام میری نقارہ نوازی کو کم نہیں کر سکی تھی؛ اس کے برعکس، آسکر نے ہوم گارڈ کے ساتھ ہونے والی اپنی باعثِ شرم کارکردگی کے آخری گواہ، یعنی نقارے کو تباہ کرنے کی دہری کوشش بھی کی تھی۔

مگر نقارہ میرے وار سہہ گیا؛ جتنی بار میں نے اس پر حملہ کیا، اس نے بھی الزام

کے ساتھ واپس حملہ کر دیا۔ اس کا سب سے حیرت انگیز حصہ یہ ہے کہ اس کی دھا چوکڑی، جس کا واحد مقصد ماضی کے ایک واضح حصے کو مٹانا تھا، سرمایہ رکھنے والے وِکٹر ویلہون کا میرے ذہن میں بار بار خیال اُبھر رہا تھا، حالاں کہ اس کی قریب کی نظر بھی اتنی ہی خراب تھی جتنی کہ میری اور میرے خلاف اس کی گواہی اتنی اہم نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی، کیا وہ اپنی نظر کی خرابی کے باعث فرار نہیں ہو گیا تھا؟ کیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن کی نظر قریب کی اشیا دیکھنے تک محدود ہوتی ہے وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ دیکھ سکتے ہیں، کہ ویلہون، نے جس کو میں عام طور پر بے چارہ وِکٹر کہتا ہوں، میری تمام حرکات کو یک رُخے سیاہ تصویری خاکے پر دیکھ لیا تھا، یعنی وہ میری غداری کو دیکھ چکا تھا، اور اب اپنی پرواز پر وہ آسکر کے خفیہ رازوں کو اور آسکر کی شرمندگی کو اپنے ساتھ پوری دنیا میں لے جائے گا؟

یہ دسمبر کے درمیان ہوا تھا کہ میری گردن کے اطراف وندانے دار سفید و سُرخ الزامات کا بار کم ہو گیا تھا۔ پالش میں دراڑ پڑ گئی تھی، اس کے چھلکے اترنے لگے تھے اور ٹین پتلا اور کم زور ہوتا جا رہا تھا۔ اس موت کے ذہنی کرب کو دیکھنے پر مجبور ہو کر، ایسے معاملات میں ہمیشہ کی طرح میری خواہش بڑھ گئی تھی کہ جاں بہ لب لوگوں کے دکھوں کو کم کیا جائے، کہ اختتام میں جلدی کی جائے۔ Advent کے آخری ہفتوں کے درمیان آسکر نے اتنا زیادہ کام کیا تھا کی ماتسیرات اور اس کے پڑوسیوں کے سر فخر سے اونچے ہو گئے تھے، اس لیے وہ کرسمس کی چاند رات تک اس کا حساب بے باق کرنے پر تلے ہوئے تھے؛ میں پُر اعتماد تھا کہ کرسمس پر، مجھے ایک نیا اور بے داغ نقارہ ملنا چاہیے۔

میں نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ دسمبر کی چوبیسویں تاریخ کو میں اپنے زنگ آلودہ، پراگندہ، بے ہنگم روح اور جسم سے، جو کسی برباد شدہ کار جیسا ہو گیا تھا، آزاد ہو جانا چاہتا تھا: مجھے امید ہو گئی تھی کہ اس کو چھوڑ دینے سے میں پولش ڈاک خانے کے دفاع کو ہمیشہ کے لیے بھلا دوں گا۔

پہلے کبھی کسی انسان کو — اگر آپ مجھے انسان سمجھنے پر راضی ہوں تو — آسکر سے زیادہ مایوس کن کرسمس نصیب نہیں ہوا ہو گا، جسے کرسمس کے درخت کے نیچے ہر وہ

شے [تحفے کے طور پر] مل گئی تھی جس کا تصور کیا جا سکتا تھا، سوائے نقارے کے۔

ان میں ایک سیٹ بلڈنگ بلاکوں کا تھا جسے میں نے کھولا تک نہیں ۔ جھولا جھولنے والا ایک راج ہنس تھا، جو بڑوں کے نزدیک سب سے زیادہ سنسنی خیز تحفہ تھا، جو مجھے لوہن گرِن کے کردار میں [ تیرھویں صدی کے جرمن ادب کا ایک دلیر کردار، شاہ Percival کا بیٹا ،جوایک یک نفری کشتی میں کسی حسینہ کو بچانے گیا تھا جسے راج ہنس کھینچتے تھے۔ مترجم] میں تبدیل کر دیتا۔ بلاشبہ مجھے محض دق کرنے کے لیے، ان میں اتنی ہمت آ گئی تھی کہ انھوں نے تحائف کی میز پر تصاویر کی تین یا چار کتابیں بھی رکھ دی تھیں ۔ ان میں سے جو تحفہ میرے لیے حیران کن تھا وہ دستانوں کا ایک جوڑا، جوتوں کا ایک جوڑا، سُرخ رنگ کا ایک سوئٹر جس کو گریشن شیفلر نے بُنا تھا۔حیرانی کے عالم میں آسکر نے بلڈنگ بلاکس سے راج ہنس تک سب کچھ دیکھا اور تصویروں کی ایک کتاب کی ایک تصویر کو گھور کر دیکھنے لگا، جس میں کئی قسم کے ٹیڈی بھالو تھے جو صحیح معنوں میں زیادہ دل چسپ تو نہیں تھے مگر جس بات نے مجھے بد مزہ کر دیا تھا وہ یہ تھی کہ وہ سب اپنے اپنے پنجوں میں کوئی نہ کوئی آلاتِ موسیقی پکڑے ہوئے تھے۔ان خوب صورت وحشیوں میں سے ایک کے ہاتھ میں تو نقارہ بھی تھا؛ اور ایسا لگتا تھا گویا وہ نقارنوازی بھی کر سکتا تھا، گویا بس کسی آن وہ تنہا ہی نقارہ بجایا چاہتا ہے؛ اور جہاں تک میرا معاملہ ہے ،تو میرے پاس بھی ایک راج ہنس آ گیا تھا، مگر نقارہ نہیں تھا، اور شاید ہزاروں قسم کے بلڈنگ بلاکس بھی تھے مگر ایک بھی نقارہ نہیں تھا، میرے پاس سخت سردی کی راتوں کے لیے ایسے دستانے بھی تھے جن میں انگلیوں کے خول نہیں ہوتے، مگر میری دستانہ پوش مٹھیوں میں کوئی گول سی، چکنی پالش والی، دھات سے بنی ، برف جیسی ٹھنڈی شے نہیں تھی جس کو میں سردی کی راتوں کے برف جیسے دلوں کو گرمانے کے لیے استعمال کر سکتا۔

آسکر نے سوچنا شروع کیا — ماتسیرات نے نقارے کو چھپا لیا ہے، یا گریشن شیفلر، جو اپنے روٹی فروش دوست کو ہماری کرسمس کی بطخ کو پکانے میں مدد کرنے لائی ہے، اسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ یہ سب میرے اصل خزانے کو اُگلنے سے پہلے ہی لطف اُٹھانے پر

تلے ہوئے ہیں، راج ہنس سے، بلڈنگ بلاکس سے اور تصویری کتابوں سے۔ پھر میں نے ہتھیار ڈال دیے: میں نے پاگلوں کی طرح تصویری کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دی، اُچھل کر راج ہنس پر بیٹھ گیا، اور صبح کے وقت کی اپنی طبیعت کی بڑھتی ہوئی ناگواری کے باوجود، کم از کم، آدھ گھنٹے تک اس پر جھولا جھولتا رہا۔ ضرورت سے زیادہ گرم کیے ہوئے فلیٹ میں بھی میں نے ان لوگوں کو سوئٹر کو پہن کر دیکھنے کی اجازت دی؛ اور گریچن شیفلر کی مدد سے میں نے جوتے بھی چڑھا لیے تھے۔ گریف، میاں بیوی کے آنے سے پہلے، کرسمس کی بطخ کو چھ بجے کھانے کا منصوبہ بنایا گیا تھا، اور بطخ کے بعد، جس کو ماتسیرات نے بڑی مہارت سے انواع واقسام کے میووں سے بھرا تھا اور جسے کھا کر ختم کر دیا گیا تھا، میٹھا کھانے کے دوران، جس میں دم پخت آلوچے اور ناشپاتیاں شامل تھیں، میں ایک تصویری کتاب پکڑے ہوئے تھا، جسے گریف نے میری چار تصویری کتابوں میں شامل کر دیا تھا؛ شوربے کے بعد، بطخ، سُرخ گرم کلا، اُبلے آلو، آلوچے، اور ناشپاتیاں، ٹانگوں سے بنے چولھے کی گرم سانسوں میں، جس کے پاس ایک بھی فالتو سانس نہیں تھی، ہم سب نے گانا شروع کیا، آسکر بھی جس میں شامل تھا، کرسمس کا گیت جس میں ایک مزید بند شامل کر دیا تھا:

آ کہ منائیں ہم خوشی/ اے میرے عید کے درخت
اے میرے عید کے درخت/ سبز ہیں تیری گھنٹیاں
چھن، چھنا چھن، چھنن چھنن/ بجتی رہی ہیں سال سال

میں ٹھیک تو تھا مگر ان تمام باتوں سے بیزار ہو رہا تھا؛ باہر گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئی تھیں، اور مجھے اپنا نقارہ چاہیے تھا؛ اور وہ شرابی بینڈ، جس میں پہلے کبھی موسیقار 'مین' شامل تھا، ایسا بجا کہ کھڑکیوں پر برف جمنے لگی تھی مگر مجھے تو اپنا نقارہ چاہیے تھا، اور وہ نقارہ نکالنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ آسکر چاہتا تھا، دوسرے لوگ نہیں چاہتے تھے جس کے بعد میں چیخا۔ مجھے چیخے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ اور ایک طویل عرصے کے آرام کے بعد میری آواز پھر ایک تیز، شیشہ شکن اوزار بن گئی تھی: میں نے گُلدان نہیں توڑے: بیئر کے گلاس نہیں توڑے؛ نہ ہی بجلی کے بلب توڑے، میں نے کوئی شوکیس بھی نہیں کھولا تھا، نہ کسی عینک

کے شیشے کو اس کی دیکھنے کی طاقت سے محروم کیا تھا، نہیں، میری صوتی دشمنی کا نشانہ ہر قسم کے گولے تھے، گھنٹیاں تھیں، روشنی منعکس کرنے والے صابن کے چمک دار بلبلے تھے جو کرسمس کے درخت کو رونق بخش رہے تھے؛ جھن ...... جھنا جھن ...... جھنن جھنن ...... ہوئی، اور کرسمس کے درخت کی ساری سجاوٹ ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اگر چہ یہ بالکل غیر ضروری تھا مگر کئی خاک دان، جن میں صنوبر کے درخت کے پتوں کی سوئیاں بھری ہوئی تھی، بکھر گئے تھے، مگر موم بتیاں جلتی رہی تھیں، خاموشی سے، احترام کے ساتھ، مگر ان سب کے باوجود، آسکر کے پاس نقارہ نہیں تھا۔ ماتسیرات کے پاس کسی قسم کا کوئی تصور نہیں تھا۔ مجھے خبر نہیں کہ وہ مجھے میرے موسیقی کے آلے سے دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا اسے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اُسے مجھ کو وافر مقدار میں اور پابندی سے نقارے فراہم کرنا چاہییں۔ میں تباہی کے دہانے پر تھا اور یہ حسنِ اتفاق ہی تھا کہ عین اُسی وقت ہماری دُکان کی بڑھتی ہوئی بے ترتیبی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، جس کے باعث ہمیں مدد ملی تھی مگر میرے لیے بھی اور دُکان کے لیے بھی، بہت دیر ہو چکی تھی۔

چوں کہ نہ آسکر اتنا بڑا تھا اور نہ خواہش مند تھا کہ دُکان کے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہو کر وہ پھانکے، مارجرین، اور مصنوعی شہد فروخت کرے، ماتسیرات نے، جس کو میں محض آسانی کی خاطر ایک بار پھر اپنا باپ کہوں گا، میرے بے چارے دوست ہربرٹ کی سب سے چھوٹی بہن ماریا ٹروزنسکی کو دُکان میں کام کے لیے رکھ لیا تھا۔

اس کو محض ماریا کہا ہی نہیں جاتا تھا؛ وہ تھی بھی ماریا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے، صرف چند ہفتوں کے اندر ہی، دُکان کو سنبھال لیا تھا، اس نے دُکان کی ساکھ بھی بحال کر دی تھی۔ اپنے سخت مگر دوستانہ انداز سے کاروبار کرنے کی صلاحیت کے ذریعے، جس کو ماتسیرات بھی مان گیا تھا، اس نے میرے حالات کو سمجھ لینے کے اشارے فراہم کیے تھے۔

دُکان میں کاؤنٹر کے پیچھے اپنی جگہ سنبھالنے سے پہلے ہی اس نے مجھے کئی بار اپنا پرانا واش بیسن، دھات کے اس کباڑ کے عوض پیش کیا تھا جس کو میں نے اپنی عمارت کے کم از کم ایک سو زینے چڑھتے اترتے وقت استعمال کیا تھا، مگر آسکر کوئی متبادل نہیں چاہتا

تھا۔ اس نے واش بیسن کے پیندے کو نقارے کے طور پر استعمال کرنے سے انکار کر دیا،
مگر جوں ہی ماریا کو دُکان میں پاؤں رکھنے کی جگہ ملی، ماتسیرات سے قطع نظر، وہ میری
ضروریات پوری کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس امر کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ آسکر کو
کھلونوں کی کسی دکان میں داخل ہونے کے لیے کہا نہیں جا سکتا تھا۔ ان بازاروں میں سے
ایک کے اندر رنگ برنگے سامان سے بھری دکانوں کا، سگس منڈ مارکس کی تباہ شدہ دُکان
سے دِل دُکھانے والا تقابل ضرور کیا جا سکتا تھا۔ سراپا مہربان، ماریا مجھے باہر ہی انتظار کرنے
کے لیے کھڑا کر دیتی اور تنہا خریداری کرتی، اور ہر چار یا پانچ ہفتوں بعد میرے لیے ایک
نیا نقارہ لے آتی۔ جنگ کے آخری برسوں کے دوران، جب کھلونا نقارے کم ہو گئے تھے
اور ان کے راشن ہونے کی نوبت آ گئی تھی، تو وہ مبالغہ کرنے پر اُتر آئی تھی؛ دُکان داروں
کو چینی یا ایک پاؤنڈ کافی کا سولھواں حصہ دے کر بدلے میں خفیہ طور پر میرے لیے نقارہ
لے آیا کرتی تھی۔ اور وہ یہ سب آہ سر دکھینچے بغیر، یا سیٹ میں سر ہلائے بغیر، آسمان کی
طرف نظر کیے بغیر ہی کرتی تھی، ایسی سنجیدگی اور اتنی احتیاط سے گویا وہ مجھے تازہ دھلے
ہوئے کپڑے، باقاعدہ مرمت کیے ہوئے زیر جامے، موزے اور اسکول کے گاؤن پہنا
رہی ہو۔ حالاں کہ بعد میں آنے والے برسوں میں ماریا اور میں مسلسل ایک بہاؤ کی
صورت بہے جاتے تھے، جو آج تک پوری طرح اعتدال میں نہیں آیا ہے، جس طریقے
سے وہ مجھے نقارہ دیتی تھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، حالاں کہ 1940 کے بعد
سے قیمتیں خاصی بڑھ گئی ہیں۔ آج ماریا باقاعدگی سے فیشن کا رسالہ منگواتی ہے۔ آنے
والے ہر نئے دن کے ساتھ اس کا فیشن بڑھتا جا رہا ہے۔

کیا ماریا خوب صورت عورت تھی؟ اس کا چہرہ گول، دُھلا دُھلا سا تھا اور اس کی
کسی قدر بہت نمایاں آنکھیں، جن کی پلکیں چھوٹی مگر گھنی تھیں، اور ان کے اوپر گہرے
رنگ کی بھنویں تنی تھیں جو ناک کے اوپر پہنچ کر ملتی تھیں، اچھی لگتی تھیں۔ رخسار کی ابھری
ہوئی ہڈیاں — جب بہت ٹھنڈ ہوتو، اس پر کی جلد تن کر نیلگوں ہو جاتی اور تڑخ کر درد
کرنے لگتی تھی — اس سطح کو، جس سے اس کا چہرہ بنا ہوا تھا، ایک اطمینان بخش توازن دیتی

تھی، جس میں اس کی چھوٹی، مگر نہ بدصورت اور نہ مزاحیہ قسم کی مگر ستواں ناک خلل انداز نہیں ہوتی تھی۔ اس کا ماتھا چھوٹا اور بیضوی تھا، جس کے وسط میں افکار کی لکیریں ذرا جلد ہی بن گئی تھیں۔ کنپٹی پر اُگنے والے بادامی رنگ کے، ہلکے گھنگھریالے بال، جن میں اب بھی درختوں کے بھیگے تنوں کی سی چمک موجود ہے، اس کے گول سر پر محراب کی صورت بجے ہوتے ہیں، جن کے باعث مدر ٹروزنسکی کی طرح اس کی گدی ذرا بھی دکھائی نہیں دیتی۔ جب ماریا نے اپنا سفید رنگ کا بالا پوش پہن کر ہماری دُکان کے کاؤنٹر کے پیچھے اپنی جگہ سنبھالی تھی، اس وقت بھی اس کے تمتماتے ہوئے سُرخ وصحت مند پھول جیسے کانوں کے پیچھے اس کی چوٹیاں لہراتی تھیں، مگر بدقسمتی سے کان کی لویں آزاد، لٹکی ہوئی نہیں تھیں، براہِ راست اس کے نچلے جبڑے کے گوشت سے اُگی نظر آتی تھیں، مگر ان میں بدنما شکنیں نہیں تھیں، پھر بھی ان کا فاسد اثر ماریا کے کردار کی غماضی کرتا تھا۔ بعد میں ماتسیرات نے اس کو مستقل ملازمت دینے کی بات کی تو اس کے کان چھپ گئے تھے۔ آج اچھے فیشن کے مطابق، چھوٹے کٹے ہوئے بالوں کے نیچے ماریا کے کان کی صرف لویں نظر آتی ہیں؛ مگر وہ اپنے حسن کے نقص کو، بڑی بڑی کلپوں کے نیچے چھپائے رکھتی ہے۔

اپنے چھوٹے سر اور بھرے بھرے رخسار، ابھری ہوئی رخسار کی ہڈیاں اور اس کی تقریباً ناقابلِ توجہ ناک کی دونوں جانب بڑی بڑی آنکھوں کی طرح، ماریا کا جسم، جو واضح طور چھوٹا تھا، ایسے شانے پیش کرتا تھا جو خاصے بڑے تھے، اور بھری بھری چھاتیاں جو اس کی بغلوں سے اوپر کی جانب اُٹھی ہوئی تھیں، اور کشادہ پیڑو اور عقب کا حصہ جس کو اس کے پتلے نازک مگر خاصے توانا پاؤں سنبھالے ہوئے تھے، جن کے درمیان اس کے زیرِ ناف بال دیکھے جا سکتے ہیں۔

ممکن ہے کہ ان دنوں ماریا کے پاؤں گھٹنوں کے پاس، معمولی سے اندر کے طرف مڑے رہے ہوں۔ مزید یہ کہ مجھے محسوس ہوتا تھا اس کے جسم کے تقابل میں، جو کسی پوری طرح بالغ عورت کا نہیں معلوم ہوتا تھا اس کے ہاتھ بچوں جیسے سرخ تھے اور اس کی انگلیاں ساسیج کی یاد دلاتی تھیں۔ آج بھی اس کے پنجے بچوں کے جیسے لگتے ہیں۔ اس کے

پاؤں دوڑنے والے جوتوں میں بندھے ہوتے تھے، اور بعد میں میری مما کے نازک اور فیشن ایبل، پرانی اونچی ایڑیوں کے جوتوں میں، جو اس پر مشکل سے جچتے تھے: ناموزوں پرانے جوتوں کے باعث رفتہ رفتہ اپنی بچکانہ سُرخی کھو چکے تھے، اور اُس کو مجبوراً جدید فیشن کے جرمن، بلکہ اطالوی جوتے پہننے پڑ رہے تھے۔

ماریا زیادہ بات نہیں کرتی تھی، مگر اس وقت گانا پسند کرتی تھی جب برتن دھو رہی ہوتی یا چینی کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بھر رہی ہوتی تھی۔ جب دُکان بند ہو جاتی اور ماتسیرات حساب کتاب میں مصروف ہو جاتا یا اتوار کے دن، جب اس کے آرام کا وقت ہوتا تھا، ماریا ہارمونیم بجاتی جو اس کے بھائی فرِٹز نے دیا تھا جب اس کی فوج میں جبری بھرتی ہو گئی تھی اور اس کو Gross-Boschpol بھیج دیا گیا تھا۔

ماریا اپنے ہارمونیم پر سب کچھ بجا لیتی تھی۔ اسکاؤٹوں کے ترانے جو اس نے لیگ آف جرمن گرلز کے اجتماعات میں سیکھے تھے، اوپیرا کے نغمے، اور مقبول ہونے والے گانے جو اس نے ریڈیو پر سنے ہوتے تھے، یا اپنے بھائی فرِٹز سے سیکھے تھے جو 1940 کے ایسٹر میں چند دنوں کے لیے سرکاری کام سے وِلنسِنگ آیا تھا، مگر ماریا نے کبھی کام کے اوقات میں اپنا "Hohner" نہیں نکالا تھا۔ اس وقت بھی جب گاہک نہیں ہوتے تھے، وہ موسیقی سے پرہیز کرتی تھی اور اپنے بچکانہ ہاتھوں سے فہرست اور قیمت کی پرچیاں بناتی تھی۔

حالاں کہ یہ سب پر واضح تھا کہ وہ ماریا ہی تھی جو دُکان چلا رہی تھی اور اس نے ان گاہکوں کو واپس لگا لیا تھا جو میری بے چاری مما کے انتقال کے بعد اس دُکان کو چھوڑ کر مخالفین کے پاس چلے گئے تھے۔ ماتسیرات سے وہ ہمیشہ احترام سے، بلکہ خدمت گار کی طرح پیش آتی تھی؛ مگر اس سے ماتسیرات کو شرمندگی نہیں ہوتی تھی، اس لیے کہ اس کی خود میں کوئی وقعت نہیں تھی۔

بہرحال اس نے سبزی فروش گریف اور گریچن شیفلر سے کہا، جب وہ دونوں اس کو چھیڑنے کی کوشش کر رہے تھے، "اس لڑکی کو میں نے ملازم رکھا ہے اور کاروبار سکھایا ہے۔" اتنے سادہ تھے اس شخص کے خیالات جو ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا چاہیے کہ بہت

دیتھے، زیادہ حساس، اور زیادہ دل چسپ ہو جاتے تھے جب اس سے اس کے پسندیدہ شغل، باورچی گیری کے بارے میں بات کی جاتی تھی۔ مگر آسکر اُس کو اُس کا حق دینا چاہتا تھا: اس کی پکائے ہوئے، سؤر کے گوشت کے مختلف کھانوں، سرسوں کی چٹنی میں پکائے گئے سور کے گردے، اور سب سے زیادہ تو کارپ مچھلی جو وہ کریم اور horse radish ملا کر پکاتا تھا، جس کو دیکھ کر اور جس کی خوش بو سے ہی انسان کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ دُکان کے معاملے میں ایسا کچھ نہیں تھا جو وہ ماریا کو سکھا سکتا، اس لیے کہ اس لڑکی کو مقامی کاروبار کا اچھا خاصا شعور تھا، جب کہ ماتسیرات کو دُکان میں کھڑے ہو کر بیچنے کا سلیقہ نہیں تھا، حالاں کہ اس میں تھوک فروشوں سے معاملہ کرنے کی قدرتی صلاحیت تھی، مگر اس نے ماریا کو باورچی خانے میں اُبالنا، روسٹ کرنا، اور اِسٹیو پکانا سکھا دیا تھا: اس لیے کہ ماریا نے اگر چہ سرکاری افسر شدلٹز کے گھر میں دو برس تک خدمت گاری کی تھی، جب وہ ہمارے پاس کام کرنے آئی تھی تو اُسے پانی اُبالنا بھی اچھی طرح نہیں آتا تھا۔

جلد ہی، ماتسیرات وہی کچھ کرنے لگا تھا جو وہ بے چاری مما کی زندگی میں کیا کرتا تھا— باورچی خانے میں اب بھی اسی کا راج رہتا تھا، ایک اتوار سے دوسرے اتوار تک روسٹ تیار کرنا، اور گھنٹوں برتن دھونا۔ اس کے علاوہ، جو دوسرے کام وہ کر سکتا تھا، ان میں سامان خریدنا، ان کے آرڈر دینا، تھوک فروشوں کا حساب کتاب کرنا، سرکاری محکموں کے کام کی دیکھ بھال کرنا جو جنگ کے طویل ہونے کے ساتھ ساتھ پیچیدہ ہوتے جا رہے تھے، اربابِ اقتدار سے مالی معاملات میں خط کتابت کرنا جس کے لیے خاصی چالاکی چاہیے ہوتی تھی، تخیلاتی اور باذوق انداز سے دُکان کا شوکیس سجانا۔ ان کاموں کے علاوہ وہ اپنی نام نہاد پارٹی کے فرائض بھی انجام دیتا تھا، یعنی وہ اپنے آپ کو ہر طرح سے مشغول رکھتا تھا، جب کہ بغیر کسی پریشانی کے ماریا دُکان کے کاؤنٹر کے پیچھے موجود ہوتی تھی۔

آپ یقیناً سوال کریں گے کہ اس تمہید سے میری مراد کیا ہے: کیوں میں ایک نوجوان لڑکی کے رخسار کی ہڈیوں، امرودوں، کان کی لَوؤں، ہاتھوں اور پیروں کے بارے میں اتنی تفصیل سے باتیں کر رہا ہوں؟ میں آپ سے پوری طرح اتفاق کروں گا کہ میں خود بھی اس

قسم کے تذکرے کے خلاف ہوں۔ آسکر اچھی طرح جانتا ہے کہ اس نے آپ کے ذہن میں ماریا کے تصور کو خراب کرنے کی کوشش کی ہے، شاید ہمیشہ کے لیے۔ اس وجہ سے میں یہاں ایک اور جملے کا اضافہ کروں گا، جس سے ہر بات صاف ہو جائے گی: اگر ہم ان تمام بے نام نرسوں کو ایک طرف رکھ دیں، تو ماریا اس کی پہلی محبت تھی۔ مجھے ان حالات کا اس دن اندازہ ہوا، جیسا کہ شاید ہی کبھی ہوتا تھا، جب میں نے اس کی نقارہ نوازی کو غور سے سُنا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے سُروں میں ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا تھا، باوجود تمام تر احتیاط کے، جو وہ نقارے تک پہنچا رہا تھا۔ ماریا اس کی نقارہ نوزی کو عام انداز میں لیتی تھی، مگر میں یہ دیکھ کر خوش نہیں ہوا تھا، جب اس لڑکی نے، غیر دلکش انداز میں، تیوری چڑھائے ہوئے، اپنے بارمونیم کو چوم کر چھوڑ دیا تھا، اور میری صحبت کی ضرورت محسوس کی تھی۔ حالاں کہ اکثر جب وہ موزے رفو کر رہی ہوتی یا چینی کی تھیلیاں بھر رہی ہوتی تو اس کی خاموش آنکھیں اشتیاق اور توجہ سے مجھے اور میری چوب نقارہ کو دیکھتیں، اور اپنا کام شروع کرنے سے پہلے، وہ میرے چھوٹے، کٹے ہوئے بالوں میں آہستگی اور خوابیدہ انداز میں کنگھی کی طرح اپنی انگلیاں چلاتی تھی۔

آسکر نے، جو عام طور پر اس قسم کے ہلکے سے لمس کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا خواہ وہ خلوص کے باعث ہی کیوں نہ ہو، ماریا کے ہاتھ کو قبول کر لیا تھا اور اس کے دُلار کا ایسا عادی ہو گیا تھا کہ وہ، اکثر شعوری طور پر، گھنٹوں ان سُروں میں نقارہ نوازی کرتا رہتا تھا جو اس کیفیت کو ابھارتے، ماریا کا ہاتھ اس کا حکم مانتا اور اس کو سکون پہنچاتا۔

کچھ دنوں بعد ماریا نے مجھ کو میرے بستر میں سُلانا بھی شروع کر دیا۔ وہ میرا لباس اُتارتی، مجھے نہلاتی، مجھے شب خوابی کا لباس پہناتی، مجھے مشورہ دیتی کہ میں سونے سے پہلے اپنے مثانے کو خالی کر دیا کروں، میرے ساتھ دعائیں پڑھتی— "میرے آسمانی باپ/کنواری مریم کو تین سلام" کہ وہ پروٹسٹنٹ عقیدے والی تھی مگر کبھی کبھی "اے مرے آسمانی باپ/میرے یسوع اور مسیح / جینا مرا، ترے لیے/مرنا مرا، ترے لیے" پڑھتی اور آخر میں دوستانہ انداز اور غنودہ کرنے والے چہرے کے ساتھ وہ مجھے بستر میں لٹا دیتی۔

روشنی بجھنے سے قبل کے پُرمسرت لمحات کے بعد رفتہ رفتہ میں نے "اے مرے

آسمانی باپ/میرے یسوع اور مسیح / جینا مرا، ترے لیے/مرنا مرا، ترے لیے" والی دعا کا، اس نرم اور کنایہ آمیز دعا "سمندروں کے ستارے/مرے عظیم آقا/ مرے لہو میں، تری محبتوں کے انوکھے چراغ روشن ہیں" سے تبادلہ کر لیا تھا۔ سونے کی یہ تیاریاں مجھے شرمندہ کرنے لگی تھیں۔ انھوں نے میرے ضبطِ نفس کو تقریباً تباہ کر کے رکھ دیا تھا، اور آسکر کو، جو ہمیشہ اپنی خصوصیات پر فخر کرتا تھا اور چمکیلی آنکھوں والی لڑکیوں کی شرمیلی اداؤں اور ان کے گھائل نوجوانوں جیسی کیفیات کا سامنا تھا۔ آسکر کو اعتراف کرنا چاہیے کہ ہر بار جب ماریا مجھے برہنہ کرتی، مجھے جست کے ٹب میں بٹھاتی، میرے جسم سے دن بھر کی نقارہ نوازی کی گرد صاف کرتی، کنگھی کرتی اور صابن لگاتی، مجھے ہر بار یہ احساس دلاتی تھی میں تقریباً سولہ برس کا ہو گیا ہوں، مادر زاد برہنہ کھڑا یا بیٹھا ایک لڑکی کے سامنے ہوں جو مجھ سے عمر میں قدرے بڑی ہے۔ میں دیر تک واضح طور پر شرماتا رہتا۔ مگر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ماریا کو میرے بدلتے ہوئے رنگ کی فکر نہیں ہوتی تھی۔ کیا وہ کبھی سوچتی بھی تھی کہ نہانے کا تولیا اور کنگھی میرے رخسار کی شرمندگی کا باعث ہوئی ہو گی؟ یا ماریا اتنی باحیا اور ہوشیار تھی کہ وہ میری روز بہ روز بڑھتی ہوئی چمک کو دیکھ سکتی تھی مگر نظر انداز کر دیتی تھی؟

مجھ پر اب بھی اسی قسم کی شرمندگی کا غلبہ ہوتا ہے، جس کو چھپانا مشکل ہوتا ہے، جو کم از کم پانچ منٹ یا اس سے بھی زیادہ عرصے تک طاری رہتا ہے۔ میرے ناتا، آتش زن کولیاچیکی کی طرح، جو لال بھبھوکا ہو جاتا تھا جب اس کی سماعت میں دیا سلائی کا لفظ پڑ جاتا تھا میرے سر میں بھی دورانِ خون تیز ہو جاتا ہے جب کبھی کوئی، خواہ وہ اجنبی ہی کیوں نہ ہو، میری موجودگی میں، سونے کی غرض سے بستر میں لے جانے سے پہلے بچوں کو ٹب میں نہلانے، اور اس کے جسم کے ملنے کا ذکر کر دیتا ہے۔ آسکر مجھے کسی انڈین کے مانند لگتا ہے؛ میرے اطراف کے لوگ مجھے برا نہیں تو کج رو ضرور کہتے ہیں؛ کہ ان کے نزدیک "چھوٹے بچوں کو صابن لگانا چاہیے، ان کے جسم کو ملنا چاہیے، اور ان کے جسم کے خفیہ ترین حصوں کو تولیے سے صاف کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ" کہ ان کے لیے نہ جانے کیا معنی ہوتے ہیں؟

اس کے علاوہ، ماریا ایک فطری بچی تھی، وہ بغیر کسی شرمندگی کے بڑی دلیری کے

کام کر بیٹھتی تھی۔ بیٹھک یا خواب گاہ کا فرش صاف کرنے سے پہلے وہ لہنگے کو اپنے زانو کے اوپر تک اٹھا دیتی تھی، اپنے موزے اتار دیتی تھی اس لیے کہ خراب نہ ہو جائیں، کہ وہ ماتسیرات کا تحفہ تھے۔ایک سنیچر جب دُکان بند ہو گئی — ماتسیرات پارٹی کے مقامی دفتر میں کسی کام سے گیا ہوا تھا -- ماریا نے اپنا لہنگا اور بلاؤز اُتار دیا تھا، اور قابلِ افسوس مگر صاف ستھرے نیچی کوٹ میں میرے برابر کھڑی ہو گئی، اور گیسولین کی مدد سے اپنے لہنگے اور مصنوعی ریشمی بلاؤز سے کچھ دھبے مٹانے شروع کر دیے تھے۔ایسی کیا بات تھی کہ جب بھی ماریا اپنا بیرونی لباس اتارتی اور جوں ہی گیسولین کی بو ختم ہو جاتی تو اس سے ونیلا کی سحر آمیز خوش بو آنے لگتی تھی۔کیا وہ اپنے جسم یا کپڑوں پر اس قسم کا کوئی ست مل لیتی تھی؟ کیا اس قسم کی خوش بو کم قیمت میں دستیاب ہو گئی ہے؟ یا یہ خوش بو اس سے مخصوص ہے، مثال کے طور پر مسز کلاٹر کے لیے اموینیا کی خوش بو، یا میری نانی کے لہنگے کے لیے اترے ہوئے مکھن کی مہک؟ آسکر نے، جو چیزوں کی تہہ میں اتر جانا چاہتا ہے، ونیلا پر تحقیق کی تھی: ماریا کسی شے کا مسح نہیں کرتی تھی۔ ماریا کی اپنی خوش بو ہی اس قسم کی تھی۔ جی ہاں! میں اب بھی اس بات کا قائل ہوں کہ خود اسے بھی خبر نہیں تھی کہ کس قسم کی خوش بو اس سے لپٹی ہوئی ہے؛ اس لیے کہ اتوار کے دن، جب بچھڑے کے گوشت کا روسٹ اور مکھن میں تلے، چھلے ہوئے اُبلے آلو اور گوبھی، سمیت میز پر رکھی ہوئی ونیلا پڈنگ للچا رہی تھی، اس لیے کہ میں میز کے پاؤں سے مسلسل اپنے پاؤں ٹکرا رہا تھا، ماریا نے، جو دوسرے اقسام کی پڈنگ کی دیوانی تھی، اس کو کھایا تھا مگر کم، بلکہ بدمزگی سے، جب کہ آسکر آج بھی اس سادہ ترین اور ہر جگہ مل جانے والی پڈنگ کا رسیا ہے۔

جولائی 1940 میں فرانسیسی چڑھائی کی تیز کامیابی کے اعلان کے فوراً بعد بحرِ بالٹک میں نہانے کے موسم کی ابتدا ہوئی تھی۔ جب ماریا کا بھائی فرِٹز، جو اَب فوج میں کارپورل ہے، پیرس سے پہلا تصویری پوسٹ کارڈ بھیج رہا تھا، ماتسیرات اور ماریا نے فیصلہ کیا تھا کہ آسکر کو ساحل پر ضرور جانا چاہیے کہ سمندری ہوا یقیناً اس کے لیے اچھی ہو گی۔ یہ طے ہوا کہ دو پہر کے وقت — دُکان ایک سے تین بجے تک بند ہوتی تھی — ماریا مجھے بروسن کے ساحل پر لے جائے گی، اور اگر وہ چار بجے تک وہیں ٹھہرتی ہے تو ماتسیرات نے کہا تھا کہ کوئی مضائقہ

نہیں ہوگا: کہ وہ خود دُکان پر موجود ہوگا اور گاہکوں کا سامنا کرے گا۔

نیلے رنگ کا نہانے کا سوٹ، جس پر ایک لنگر سلا ہوا تھا آسکر کے لیے خریدا گیا تھا۔ماریا کے پاس پہلے سے سبز رنگ کا ایک سوٹ موجود تھا جس پر سُرخ رنگ کی گوٹ لگی ہوئی تھی، جو اس کی بہن گسٹے نے تحفے میں دیا تھا۔مما کے زمانے کے ساحلی تھیلے میں ایک اونی بالا پوش اور بالکل غیر ضروری، چھوٹی سی بالٹی اور بیلچا اور ریت کے کچھ بنانے کے سانچے ہوتے تھے۔ماریا نے تھیلا اُٹھایا اور میں نے اپنا نقارہ۔

آسکر کو 'ساپیے' کے پاس سے گزرتی ہوئی ٹرام کا سفر خائف کر رہا تھا۔کیا یہ خوف نہیں تھا کہ یہ خاموش مگر کلام کرتی ہوئی جگہ اس کے نہانے کے جوش میں شکنیں ڈال دے گی، جو ابھی شروع ہی ہونے والا تھا؟ آسکر نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا کہ جان برانسکی کا بھوت اپنے قاتل سے کیا سلوک کرے گا، جب گرم موسم کے لباس میں ملبوس وہ اس کی قبر کے پاس سے جھن جھن کرتا گزرے گا؟

نو نمبر کی ٹرام گاڑی آکر رُکی۔ کنڈکٹر نے 'ساپیے' کا اعلان کیا۔ میں نے غور سے ماریا سے پرے برونسی کی جانب دیکھا، جس طرف سے ٹرام رینگتی اور بڑی ہوتی ہوئی ہماری جانب آئی تھی۔مجھے اپنی آنکھوں کو آزادی سے گھومنے نہیں دینا چاہیے۔مگر وہاں دیکھنے کے لیے ہے بھی کیا؟ کھردرے تنوں والے صنوبر کے درخت، زنگ آلود لوہے کی اشیا، گرتی ہوئی لوحِ قبر کی بھول بھلیاں، جن پر کندہ متن کو صرف گوکھرو کے اور جنگلی جو کے پودے ہی پڑھ سکتے تھے۔ایسے حالات میں بہتر تھا کہ کسی کھلی کھڑکی سے آسمان کی بلندی کی طرف دیکھا جائے: وہاں وہ گنگنا رہے تھے، وہی موٹے JU-52 ، اس لیے کہ صرف تین پنکھوں والے ہوائی جہاز اور بڑی مکھیاں ہی جولائی کے بغیر بادل کے آسمان میں گنگنا سکتی ہیں۔

ہم گھنٹیوں کی بلند جھنکار کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے کہ دوسری ٹرام گاڑی نے ہمارے منظر کو اوجھل کر دیا۔جوں ہی ہم ٹریلر سے گزر گئے ،میرا سر خود بخود مڑ گیا اور پورا الٹا پلٹا قبرستان ہمارے سامنے تھا، اور اس کا کچھ شمالی حصہ بھی: وہ سفید رنگ کا پیوند، سایے میں تھا، جواب بھی قابلِ رحم سفید رنگ کا تھا—

قبرستان گزر گیا، ہم بدوئسن کی طرف بڑھ رہے تھے، اور میں نے ایک بار پھر ماریا کی طرف دیکھا۔وہ گرمی کے دنوں کے ہلکے سے لباس میں تھی جس پر پھولوں کے نقش بنے ہوئے تھے۔اس کی گول گردن جس کی جلد ہلکی تابندگی لیے ہوئے تھی، اپنی قرینے سے آراستہ ہنسلی کی ہڈی پر وہ چوبی چیریوں کا نکلیس پہنے ہوئے تھی، جو سب ایک ہی ناپ کی تھیں اور جوش آور پختگی کے باعث پھٹنا چاہتی تھیں۔کیا یہ صرف میرا تصور تھا یا میں واقعی ان کی خوش بو سونگھ رہا تھا۔ماریا اپنے ساتھ ونیلا خوش بو لیے بالٹک کی طرف رواں تھی۔آسکر ذرا آگے بڑھ کر جھکا، اس کی مہک اپنے اندر کھینچی اور ایک لمحے میں مٹی میں بکھرتا ہوا جان برانسکی غائب ہوگیا۔ اس کے دفاع کرنے والوں کی ہڈیوں سے گوشت کے جدا ہونے سے پہلے ہی پولش ڈاک خانے کا دفاع تاریخ کا ورق بن چکا تھا۔بچ رہنے والے آسکر کے نتھنوں میں، اس کے قیاسی باپ کے مقابلے میں، جو اتنی شان دار شخصیت تھا اور اب خاک ہوگیا ہے، زیادہ مختلف بوئیں تھیں۔

بدوئسن پہنچ کر ماریا نے ایک پاؤنڈ چیری خریدی، میرا ہاتھ پکڑا—وہ جانتی تھی کہ صرف اسے ہی اس بات کی اجازت تھی—اور مجھ کو صنوبر کے جنگل سے ہوتے ہوئے حمام میں لے گئی۔حالاں کہ میں سولہ برس کے لگ بھگ عمر کا تھا—وہاں کے خدمت گار کو ان باتوں کی بالکل پروا نہیں تھی— اور مجھے خواتین کے حصے میں لے جایا گیا تھا۔وہاں لگے ہوئے تختۂ سیاہ پر لکھا ہوا تھا 'پانی -65 '؛'ہوا - 80، تیز اور مشرقی؛'پیشین گوئی—خوش گوار'۔تختۂ سیاہ کے پہلو میں ایک پوسٹر ٹنگا ہوا تھا، جو مصنوعی تنفس کے بارے میں تھا۔سارے مریض پٹری دار نہانے کے لباس میں تھے، ڈوبنے سے بچانے والوں کے مونچھیں تھیں ناقابلِ اعتبار اور مواج پانیوں پر تنکے کی بنی ٹوپیاں تیر رہی تھیں۔

ننگے پاؤں خاتون خدمات گار نے ابتدا کی۔کسی توبہ کرنے والے گنہگار کی طرح اس کی کمر میں ایک رسی بندھی ہوئی تھی جس میں ایک بڑی سی کنجی لٹک رہی تھی جس سے کیبن کے دروازے کھلتے تھے۔لکڑی کے تختوں پر بنے راستے تھے۔باڑ کے جنگلے تھے۔کیبن کے ساتھ ہی ناریل کے ریشوں سے بنی تنگ اور طویل راستے جیسی دری بچھی ہوئی تھی۔ہمارے کیبن کا

نمبر 53 تھا۔کیبن کی لکڑی گرم، خشک اور قدرتی نیلگوں سفید فام تھی جس کو بلائنڈ کہنا چاہیے۔ کھڑکی کے برابر ایک آئینہ ٹنگا ہوا تھا جس نے نہ جانے کب سے سنجیدہ رہنا چھوڑ دیا تھا۔

آسکر کو اپنا لباس اتارنا تھا۔ یہ کام میں نے دیوار کی طرف منہ کر کے کیا، اورنہایت بے دلی سے میں نے ماریا کو اپنی مدد کرنے کی اجازت دی تھی۔پھر ماریا نے اپنے زور آور اور جذبات سے عاری انداز میں مجھے اپنی جانب گھمایا، میری طرف نہانے کا سوٹ بڑھایا اور مجھے سختی سے تنگ اونی لباس میں ٹھونس دیا۔ابھی میں نے اپنے بٹن بند کیے ہی تھے کہ اس نے مجھے کیبن کی دیوار سے لگی لکڑی کی بنچ پر بٹھا دیا، میرا نقارہ اور چوب نقارہ میری گود میں رکھ دیا، اور تیز و توانا حرکات سے اپنا لباس اُتارنا شروع کیا۔

پہلے تو تھوڑی دیر تک میں نقارہ بجاتا اور فرش پر لگے تختوں کی گانٹھوں کے سوراخ گنتا رہا۔پھر میں نے سوراخ شماری اور نقارہ نوازی روک دی۔میں بالکل سمجھ نہیں پایا تھا کہ جوتے اتارتے وقت ماریا اپنے ہوئے جیسے ہونٹوں سے سیٹی کیوں بجا رہی تھی، کبھی دو اونچے سُروں میں، اور کبھی دو نیچے سُروں میں، اور اس وقت بھی جب وہ اپنے موزے اُتار رہی تھی ۔بیئر لے جانے والے ٹرک ڈرائیور کی طرح سیٹی بجاتے ہوئے اس نے اپنا پھول دار لباس اُتارا، سیٹی بجاتے ہوئے اس نے اپنے پیٹی کوٹ کو اپنے لباس پر ٹانگ دیا، اپنی چولی زمین پر گرا دی، اور اب بھی بغیر کسی سُر کے اُس نے سیٹی بجاتے ہوئے اپنی جانگھیہ کھولی، جو واقعی بہت چھوٹی تھی، اسے گھٹنوں تک اُتارا، اور اس میں سے نکل کر، جانگھیہ کو ایک پیر سے کونے کی طرف پھینک دیا۔

ماریا نے اپنے زیرِ ناف بالوں کے مثلث سے آسکر کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ بلاشبہ اپنی مما بے چاری سے اس نے سُن رکھا تھا کہ عورتیں اس جگہ پر گنجی نہیں ہوتیں، مگر اس کے نزدیک مما ان معنوں میں عورت نہیں تھی کہ اس نے اپنے آپ کو دکھا دیا تھا کہ ماتسیرات یا جان برانسکی سے اپنے معاملات میں وہ عورت تھی ۔

اور میں نے فوراً اس کو پہچان لیا تھا۔طیش، شرم، مایوسی اور نہانے کے سوٹ کے اندر میرے پانی کے برتن کی، ایک نئی نصف مضحکہ خیز، نصف درد انگیز سختی نے اور اس نئی

ڈنڈی کے بڑھنے کے طفیل میں اپنے نقارے اور چوب نقارہ کو بالکل بھول گیا۔

آسکر اُچھلا اور خود کو ماریا پر گرا دیا۔ ماریا نے اس کو اپنے بالوں سے جکڑ لیا۔ آسکر نے اپنا چہرہ اس کے بالوں میں دفن کر دیا۔ بال اس کے منہ سے اُگنے لگے تھے۔ ماریا ہنسی اور اس کو ہٹانے کی کوشش کی۔ میں ونیلا کی مہک کے ماخذ کی تلاش میں اس کو اپنی جانب کھینچتا جاتا تھا۔ ماریا اب بھی ہنس رہی تھی اور پھر اس نے مجھے اپنے ونیلا کے لیے چھوڑ دیا، کہ اسے لُطف آنے لگا تھا، اس لیے کہ اس کی ہنسی رُک نہیں رہی تھی۔ صرف اس وقت، جب میرا پیر پھسلا اور اس کو تکلیف ہوئی— اس لیے میں نے اس کے بال نہیں چھوڑے تھے یا شاید اس کے بال مجھے چھوڑ نہیں رہے تھے— صرف اس وقت جب ونیلا میری آنکھوں میں آنسو لے آئی، صرف اس وقت جب مجھے مش روم اور کچھ سڑے ہوئے مصالحے جیسا مزہ آنا شروع ہوا تھا، مگر وہ چیز ونیلا نہیں تھی۔ اس وقت، جب وہ زمینی مہک جسے ماریا نے ونیلا کے پیچھے چھپا رکھا تھا مجھے زمین پر واپس لے آئی جہاں جان برانسکی لیٹا بکھر رہا تھا، اور اس نے مجھے ہمیشہ کے لیے فنا پذیری کی مہک سے آلودہ کر دیا، تب میں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

آسکر حمام کے کیبن کے تختوں پر پھسل کر گر پڑا تھا، اور ابھی رو ہی رہا تھا کہ ماریا جو ایک بار پھر ہنسنے لگی تھی، اس کو اٹھایا، اس کو سہلایا، اور چوبی چیریوں کے ہار پر، کہ اس وقت وہ صرف وہی پہنے ہوئے تھی، اس کا سر رکھ لیا۔

اپنا سر جھٹکتے ہوئے، اس نے میرے ہونٹوں سے اپنے بال نکالے اور حیرت بھرے لہجے میں کہا، ''تم کتنے بد معاش ہو! تم شروع کرتے ہو، مگر تم نہیں جانتے کہ کیا چیز کیا ہے، اور پھر خود ہی رونے لگتے ہو۔''

# فِز پاؤڈر

کیا یہ تمھارے کسی کام کا ہے بھی؟ پہلے تو تم سال میں کسی وقت بھی اس کو چھوٹی چھوٹی چپٹی تھیلیوں میں خرید سکتے تھے۔ ہماری دُکان میں میری مما چھوٹی چھوٹی سبز رنگ کی تھیلیوں میں بلبلے چھوڑنے والا ایک نباتی سفوف (فِز پاؤڈر) فروخت کرتی تھی۔ ایک اور سے تھیلے میں جس کا رنگ ایسی نارنگیوں جیسا ہوتا تھا جو پوری طرح پکی نہ ہوں، دعوے کے مطابق نارنگی کی خوش بو والا تھا۔ ایک رس بھری کی خوش بو والا بھی تھا، اس کی ایک اور قسم بھی تھی جس پر اگر آپ تازہ پانی ڈالیں تو اس میں سے ہلکی سی سی کی آواز پیدا ہوتی تھی، بلبلے اُٹھتے تھے اور اس میں اُبال کی سی صورت ہوتی تھی، اور قبل اس کے کہ یہ ساکت ہو جائے اگر آپ اس کو نوش کریں تو اس کا مزہ تقریباً لیموں جیسا ہوتا تھا، اور شیشے کے گلاس میں یہ لیموں کے رنگ کا نظر آتا تھا، مگر ذرا زیادہ: ایک مصنوعی زرد رنگ کا، جیسے کوئی زہر۔

خوش بو اور مزے کے علاوہ اس تھیلی میں اور کیا ہوتا تھا؟ قدرتی پیداوار، اس پر لکھا ہوتا تھا۔ پیٹنٹ کیا ہوا۔ نمی سے بچایئے اور نقطوں کی ایک لکیر بنی ہوتی تھی، اس نیچے لکھا ہوتا تھا 'اس جگہ سے تراشیے'۔

یہ فِز پاؤڈر اور کہاں سے خریدا جا سکتا تھا؟ نہ صرف یہ مما کی دُکان پر فروخت ہوتا تھا، بلکہ ہر کریانے کی دُکان پر، سوائے قیصر کی دُکان، اور امداد باہمی کی دُکانوں کے۔ دُکانوں میں اور تمام فرحت بخش اشیا بیچنے والے اسٹالوں پر، اس کی قیمت تین پنی ہوا کرتی تھی۔

ماریا کو اور مجھے یہ مفت مل جایا کرتا تھا۔ اگر گھر پہنچنے تک انتظار نہیں کر سکتے تھے تو ہمیں کسی کریانے کی دُکان پر یا کسی شربت کے اسٹال پر تین پفنی یا کبھی چھ پفنی میں مل جاتا تھا، اس لیے کہ اکثر ایک تھیلی کافی نہیں ہوتی تھی، تو ہم دو تھیلیاں لیتے تھے۔

یہ فز پاؤڈر کس نے شروع کیا تھا؟ وہی محبت کرنے والوں کی پرانی بحث — میں کہتا، ماریا نے شروع کیا تھا۔ ماریا کبھی دعویٰ نہیں کرتی تھی کہ آسکر نے شروع کیا تھا۔ وہ اس سوال کو کھلا چھوڑ دیتی اور اگر زیادہ دباؤ ہوتا تو کہہ دیتی، "اسے فز پاؤڈر نے شروع کیا تھا۔"

بلاشبہ سب ماریا ہی سے اتفاق کریں گے۔ صرف آسکر اس کا فیصلہ نہیں مانتا تھا۔ میں نے اس بات کو کبھی قبول نہیں کیا ہوتا کہ آسکر کو فز پاؤڈر کی ایک چھوٹی سی تین پفنی کی تھیلی سے گرمایا گیا تھا۔ میری عمر سولہ برس کی تھی، اگر ضرورت پڑتی تو میں خود کو یا ماریا کو قصوروار ٹھہراتا، مگر بلاشبہ کسی پاؤڈر کو نہیں جس کو نمی سے بچانا پڑتا تھا۔

اس کی ابتدا میری یومِ پیدائش کے چند دنوں بعد ہوئی تھی۔ کیلنڈر کے حساب سے غسل کا موسم ختم ہو رہا تھا، مگر ستمبر کی کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ بارانی اگست کے بعد، گرمی کے موسم نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا؛ اس کی 'دیر آید' کامیابیوں کی تفصیل مصنوعی تنفّس کے اعلان نامے (پوسٹر) کے برابر اعلانات کے تختے (بلیٹن بورڈ) پر پڑھی جا سکتی تھی:

فضا: 84 - پانی: 68 - ہوا کی سمت: جنوب/مغربی - پیشین گوئی: عام طور پر خوش گوار۔

جن دنوں فرِٹز ٹروزنسکی، جو ہوائی فوج میں کارپورل تھا، پیرس، کوپن ہیگن، اوسلو اور برسلز سے پوسٹ کارڈ بھیجتا تھا — وہ ہمیشہ سرکاری کام پر ہوتا تھا — ماریا اور میں، خاصے سنولا گئے تھے۔ جولائی کے مہینے میں ہمیں خاندانوں کے لیے مخصوص ساحل پر جگہ مل گئی تھی، مگر اس جگہ ماریا کو کانراڈینم (Conradinum) اسکول کے کچھ نوجوانوں کی ناموزوں جنسی دھینگا مشتی اور پیٹری (Petri) اسکول کے ایک طالبِ علم کے کبھی نہ ختم ہونے والے اعلاناتِ محبت کا سامنا رہتا تھا؛ تو وسط اگست میں ہم اُس ساحل پر منتقل ہو گئے جو خواتین کے لیے مخصوص تھا، جہاں ہمیں پانی کے قریب ہی ایک پُرسکون جگہ مل گئی تھی۔ موٹی اور بڑی بڑی چھاتیوں والی خواتین، پھولی ہوئی رگوں والے پاؤں گھٹنوں تک

ریت میں دبائے اور برہنہ، لمبے لمبے سانس لیتیں، شریر لڑکے قسمت آزمائی کرتے، یعنی ریت کے محل بناتے جو گرتے جاتے تھے۔

خواتین کا ساحل: جب عورتیں تنہا ہوں اور سمجھ رہی ہوں کوئی انھیں دیکھ نہیں رہا ہے، ایک نوجوان آدمی— آسکر اچھی طرح جانتا تھا اس کے جنتہ میں ایک جوان مَرد چھپا ہوا ہے— یہی کرے گا کہ وہ اپنی آنکھیں بند کر لے، بجائے اس کے کہ وہ بے ارادہ ہی سہی ان کی بے محابا نسوانیت کا گواہ بنے۔

ہم ریت میں لیٹے ہوئے تھے، ماریا اپنے سبز رنگ کے لباسِ غسل میں تھی جس میں سُرخ رنگ کی گوٹ لگی ہوئی تھی اور میں نیلے رنگ میں تھا۔ ریت خواب میں تھی، سمندر خواب میں تھا، سیپیاں پکلی ہوئی تھیں اور سن نہیں رہی تھیں۔ عنبر، کہتے ہیں کہ یہ آپ کو نیند سے دور رکھتا ہے، نہ جانے کہاں تھا؛ ہوا بھی، جو بلیٹن بورڈ کے مطابق جنوب مشرق سے آ رہی تھی، رفتہ رفتہ خوابیدہ ہو گئی تھی؛ پورا وسیع آسمان، جو یقینی طور پر خود کو زیادہ مصروف رکھے ہوئے تھا، جماہی لینے کے علاوہ کچھ اور نہیں کر رہا تھا؛ ماریا اور میں، دونوں کچھ تھکے ہوئے سے تھے۔ ہم نہا چکے تھے، ہم نے کچھ کھایا بھی تھا، غسل سے پہلے نہیں، بعد میں۔ ہماری چیریاں، جو گھل کر نرم گٹھلیوں جیسی ہو گئی تھیں، پچھلے بدن کے ڈھلے ہوئے چیری کے گڑھوں کی ریت میں پڑی تھی۔

اتنی عارضیت کے عالم میں بھی، آسکر تازہ چیری کی گٹھلیوں ملی ریت اور سال بھر یا ہزار سال پرانی دوسری اشیا اُٹھاتا اور ان کو اپنے نقارے پر چھانتا؛ گویا اس نے ریت گھڑی کی نقل بنائی تھی، ساتھ ہی ہڈیوں سے کھیلنے کے ساتھ اس نے موت کا کردار بھی ادا کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں ماریا کے گرم اور خواب آلودہ گوشت کے نیچے اس کے یقینی طور پر جاگتے ہوئے استخوانی ڈھانچے کا تصور کر رہا تھا؛ میں نے کلائی کی دو ہڈیوں radius اور ulna کے درمیان کے منظر کو سوچ کر اور لُطف اندوز ہو کر، اس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کو گننے کا کھیل کیا، اور پھر اس کے کولھے کے علاقے سے ہوتا ہوا اس کے سینے کی ہڈی سے چھیڑ چھاڑ کی۔

اپنی ریت گھڑی اور اپنے استخوانی ڈھانچے کے ساتھ موت کا کردار ادا کرنے کی اس تمام دل لگی کے باوجود ماریا نے حرکت کی۔ بغیر دیکھے، کلی طور پر اپنی انگلیوں پر بھروسا کرتے ہوئے، وہ اپنے ساحلی تھیلے کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کرنے لگی تھی، جب کہ میں نے نقارے پر بچی کچھی ریت اور چیری کی گٹھلیاں ڈال دی تھیں، جو اُس کے باعث تقریباً آدھا دفن ہو گیا تھا۔ جب وہ جس شے کی تلاش میں تھی اور اس میں ناکام ہوئی، جو غالباً ہارمونیم تھا، تو ماریا نے تھیلے کو بالکل الٹ دیا؛ اور ایک لمحے بعد ساحلی تولیے پر کوئی شے پڑی ہوئی تھی؛ مگر یہ ہارمونیم نہیں تھا؛ یہ وہی نباتی فِزپاؤڈر کی تھیلی تھی۔

ماریا نے بناوٹی حیرت کی یا واقعی وہ حیرت زدہ تھی۔ جہاں تک میرا تعلق تھا، میری حیرت اصلی تھی: میں نے بار بار اپنے آپ سے سوال کیا، جیسے کہ میں آج بھی خود سے سوال کرتا ہوں: یہ بیہودہ فِزپاؤڈر کی تھیلی، جو صرف بندرگاہ کے مزدوروں اور بے روزگار لوگوں کے بچے خریدتے ہیں، اس لیے کہ ان کے پاس اصلی مال خریدنے کے لیے مال نہیں ہوتا، تو یہ ناقابلِ فروخت شے اس ساحلی تھیلے میں کیسے آ گئی؟

آسکر اپنی سوچ میں غرق تھا کہ ماریا کو پیاس لگی۔ اپنے مراقبے ترک کرتے ہوئے، مجھے بھی اپنی مرضی کے خلاف ناقابلِ مزاحمت پیاس کا اعتراف کرنا پڑا۔ ہمارے پاس پیالے نہیں تھے، اس کے علاوہ اگر ماریا جاتی بھی تو پینے کے پانی تک پہنچنے کے لیے پینتیس قدم کا فاصلہ طے کرنا تھا، جب کہ پچاس قدم، اگر میں جاتا۔ خدمت گار سے پیالا اُدھار لینے اور حمام کے نلکے کو استعمال کرنے کے لیے جلتی ریت پر لیٹے نیویا آئل سے چمکتے ہوئے گوشت کے پہاڑوں کے درمیان سے گزرنا پڑتا؛ جن میں سے کچھ پیٹھ کے بل لیٹے ہوئے تھے اور کچھ اپنے پیٹوں کے بل۔

ہم دونوں دوڑ بھاگ کے دوران تولیے پر پڑی تھیلی کے بارے میں پریشان ہو رہے تھے۔ قبل اس کے کہ ماریا اس کو اٹھانے کا ارادہ ظاہر کرتی، میں نے تھیلی کو اُٹھا لیا، مگر آسکر نے اس کو واپس تولیے پر اس لیے رکھ دیا تھا کہ شاید ماریا اس کے لیے ہاتھ بڑھاتی۔ ماریا نے کوئی کوشش نہیں کی۔ اس لیے میں نے اٹھا کر ماریا کو دے دیا۔ ماریا نے

واپس آسکر کو پکڑا دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تحفے کے طور پر اسے پیش کر دیا، مگر وہ تو آسکر سے کوئی تحفہ نہیں چاہتی تھی۔ مجھے اس کو واپس تولیے پر رکھنا پڑا۔ اور بغیر حرکت کے کافی دیر تک تھیلی وہیں پڑی رہی۔

آسکر واضح کردینا چاہتا ہے کہ وہ ماریا تھی جس نے ایک جبری وقفے کے بعد تھیلی کو دوبارہ اُٹھایا تھا۔ بس یہی نہیں: اس نے تھیلی کو اس نقطے دار لکیر کے پاس سے پھاڑا جہاں لکھا ہوا تھا کہ یہاں سے پھاڑیے۔ تب اس نے کھلی ہوئی تھیلی مجھے پکڑا دی۔ اس بار آسکر نے شکریے کے ساتھ واپس کردی۔ ماریا نے ناراضگی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے بڑے استقلال سے کھلی تھیلی تولیے پر رکھ دی۔ قبل اس لیے کہ تھیلی میں ریت داخل ہو جاتی میرے پاس سوائے تھیلی کو اٹھالینے اور ماریا کو پیش کردینے کے کوئی چارہ نہیں تھا۔

آسکر واضح کردینا چاہتا ہے کہ وہ ماریا تھی جس نے تھیلی کے سوراخ میں ایک انگلی داخل کی تھی، جس نے انگلی کو واپس نکال لینے کا ڈھکوسلا کیا تھا اور معائنے کے لیے اسے عمودی حالت میں بلند کردیا تھا: کوئی نیلگوں سفید سا مادہ، یعنی فِزپاؤڈر، انگلیوں کے سرے پر دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے وہ انگلی مجھے پیش کردی۔ ظاہر ہے کہ میں نے انگلی لے لی تھی۔ حالاں کہ میری ناک میں سوزش ہونے لگی تھی، مگر میرا چہرہ اپنے لُطف کا اظہار کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ ماریا تھی جس نے میری جانب اپنا کھوکھلا ہاتھ بڑھایا تھا۔ آسکر اس گلابی رنگ کے پیالے میں فِزپاؤڈر کی کچھ مقدار کیسے ڈال سکتا تھا۔ ماریا پاؤڈر کے اس معمولی سے ڈھیر کو لے کر کیا کرے گی، اسے معلوم نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ کے پیالے کے اندر پاؤڈر کا یہ چھوٹا سا ڈھیر بالکل نئی سی چیز تھا، بہت حیرت انگیز۔ اس مرحلے پر میں آگے بڑھا، اپنے منہ میں سارا لعابِ دہن جمع کیا اور اس کو پاؤڈر کی طرف پھینک دیا: میں یہ عمل اس وقت تک دہراتا، اور واپس ہوتا رہا، جب تک کہ میرا لعابِ دہن پوری طرح ختم نہیں ہوگیا تھا۔

ماریا کے ہاتھ میں سی سی ہورہا تھا اور بلبلے اٹھنے لگے تھے۔ وہ نباتی سفوف آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑا تھا، کسی پُراسرار سبزی مائل قوم کے ناتجربے کار جوش کی طرح ابلنے لگا تھا۔ کچھ عجیب سے کیفیت ہونے لگی تھی، ماریا جس سے نہ کبھی آشنا ہوئی، نہ جسے کبھی

محسوس کیا تھا، اس لیے کہ اس کا ہاتھ کانپا اور اُڑ جانے کی کوشش کرنے لگا، اس لیے کہ وہ نباتی سفوف اسے کاٹ رہا تھا، نباتی سفوف اس کی جلد میں داخل ہو گیا تھا، نباتی سفوف نے اس میں ہیجان بپا کر دیا تھا، اسے ایک قسم کا احساس، احساس، احساس، احــسـاس ......ہونے لگا......

وہ سبزہ مزید سبز ہوتا چلا گیا، مگر ماریا سرخ ہو گئی، اپنے ہاتھ کو منہ تک لے گئی، اور اپنی ہتھیلی کو لمبی سی زبان سے چاٹنے لگی۔ یہ عمل اس نے کئی بار کیا، اتنی بے چینی سے کہ آسکر یہ قیاس کرنے کے قریب ہو گیا تھا کہ اس کی زبان سفوف کے احساس کو تسکین دینے کے بجائے، اس کو ایک حد تک بڑھانا چاہتی ہے، شاید حد سے بھی پرے، یعنی وہ ہر قسم کے احساس [ تجربے ] کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

پھر وہ احساس مر گیا۔ ماریا کھکھلائی، اس خیال سے چاروں طرف دیکھا مبادا کوئی گواہ نہ ہو جائے، اور جب اس نے دیکھا کہ سانس لیتی سمندری گائیں جو غسل کے لباس میں بے حرکت، لاپروا اور ٹیوبا کی سنولائی ہوئی تھیں وہ تولیے پر دراز ہو گئی: سفید پس منظر کے مقابل، آہستہ آہستہ اس کی حیا کی سرخی کم ہوتی چلی گئی۔

شاید اس دوپہر کی سمندری ہوا نے آسکر پر نیند غالب کر دی ہوتی، اگر ماریا صرف چند منٹ بعد ہی ایک بار پھر اُٹھ کر بیٹھ نہ گئی ہوتی اور اس تھیلی کو تلاش نہ کرنے لگتی، جو ابھی نصف بھری ہوئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کہ باقی پاؤڈر اپنی ہتھیلی پر انڈیلنے سے قبل اسے اپنے آپ سے کتنی جد و جہد کرنی پڑی تھی، جس کے لیے اس نباتی مادّے کے اثرات اجنبی نہیں رہ گئے تھے۔ اس لیے کہ کسی آدمی کو اپنی عینک صاف کرنے کے لیے جتنا عرصہ درکار ہوتا ہے، اتنی ہی دیر تک وہ تھیلی کو بائیں اور پیالے کو دائیں ہاتھ میں بے حرکت اور حریفانہ انداز میں تھامے رہی تھی۔ یہی نہیں کہ اس نے اپنی نظریں تھیلی پر یا کھوکھلے ہاتھوں کی سمت کی ہوئی تھیں یا وہ آگے پیچھے پلٹ کر نصف بھری اور نصف خالی تھیلی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نہیں، ماریا نے اپنی نظر ہتھیلی اور ہاتھ کے درمیان بے رحم تیوری چڑھا کر کی تھی، مگر جلد ہی نصف بھری تھیلی کے مقابلے میں اس کی بے رحمی کم زور ثابت ہونے والی تھی۔ تھیلی کھوکھلے ہاتھ کی طرف بڑھی، کھوکھلا ہاتھ تھیلی سے ملنے کے لیے آگے بڑھا، نظر

نے تھوڑی سے اُداسی کے چھڑکاؤ کے ساتھ اپنی بے رحمی کھودی، متجسس ہو گئی اور پھر صاف طور پر حریص ہو گئی تھی۔سخت، مکارانہ لاپروائی کے ساتھ، ماریا نے اپنی نرم ہتھیلی پر بقیہ نباتی فِز پاؤڈر ڈھیر کر دیا، جو گرمی کے باوجود خشک تھی، ہتھیلی لاپروائی سے پرے پھینک دی، بھرے ہوئے ہاتھ کو خالی ہاتھ کے اوپر کیا، کچھ دیر کے لیے اپنی بھوری آنکھ کو پاؤڈر پر مرتکز رکھا، پھر میری طرف دیکھا، مجھ پر بھی اپنی بھوری نظر ڈالی، اور اس کی بھوری آنکھیں مجھ سے کچھ طلب کر رہی تھیں۔وہ میرا لعاب دہن طلب کر رہی تھی، اس نے خود اپنا لعاب دہن کیوں نہیں لیا، آسکر کے پاس تو باقی ہی نہیں رہا تھا، اس کے پاس یقیناً بہت زیادہ تھا، لعاب دہن اتنی جلد تو پورا نہیں ہو جاتا، مہربانی کر کے اس کو اپنا لعاب ہی لینا چاہیے تھا، اگر بہتر نہیں تو وہ بھی اتنا ہی اچھا تھا، پھر بھی، اس کے پاس مجھ سے زیادہ تھا، اس لیے کہ میں اتنی جلدی بنا نہیں سکتا تھا، اس لیے اور بھی کہ وہ جسامت کے اعتبار سے آسکر سے بڑی تھی۔

ماریا میرا لعاب دہن چاہتی تھی۔ابتدا سے ہی صاف نظر آتا تھا کہ صرف میرے تھوک پر ہی غور کیا جائے گا۔اس نے وہ طلب گار نگاہیں میری طرف سے ہٹائی نہیں، میں اس کی ظالمانہ خودرائی کا ذمے دار اس کے کان کی لووں کو ٹھہرا رہا تھا جو، آزاد لٹکنے کے بجائے سیدھے اس کے جبڑوں میں جاتی تھیں۔آسکر اس کو بالکل پی گیا؛ وہ ایسی چیزوں کے بارے میں سوچنے لگا جو عام طور اس کے منہ میں پانی بھر دیتی تھیں، مگر—یہ سمندری ہوا کی خرابی تھی، بلاشبہ نمکین ہوا کی—میرے لعاب دہن پیدا کرنے والے غدود ہڑتال پر تھے۔ماریا کی آنکھوں کے اُکساوے نے مجھے اٹھنے اور اپنے کام کے لیے چلنے پر مجبور کر دیا۔میرا کام تھا جلتی ہوئی ریت کی طرف پچاس سے زیادہ قدم اُٹھانا، دائیں بائیں نہ دیکھنا، حمام کی طرف مزید جلتے قدم اُٹھانا، نلکا کھولنا، اپنے سر کو موڑ کر اپنا منہ اس کے نیچے کرنا، کُلّی کرنا، پانی پینا، تاکہ آسکر کے لعاب دہن کی کمی پوری ہو جائے۔

جب میں نے، اتنا لامتناہی، اور ایسے خطرناک مناظر کے ساتھ، حمام سے اپنے سفید تولیے تک اپنا سفر مکمل کر لیا، تو میں نے ماریا کو اپنے پیٹ کے بل لیٹے پایا، اس کا سر اس کے بازوؤں سے بنے گھونسلے کے اندر تھا۔اس کی چوٹی اس کی گول پشت پر پڑی ہوئی تھی۔

میں نے اسے اپنی انگلی سے کونچا، اس لیے کہ اب آسکر کے پاس لعاب دہن تھا، مگر وہ بلی بھی نہیں۔ میں نے ایک بار پھر کونچا۔ کچھ نہیں ہوا۔ میں نے احتیاط سے اس کا بایاں ہاتھ کھولا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی: ہاتھ خالی تھا، گویا اس میں وہ نباتی سفوف کبھی تھا ہی نہیں۔ میں نے اس کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں سیدھی کیں: ہتھیلی گلابی تھی، نم لکیروں سمیت، گرم اور خالی۔

تو کیا ماریا نے اپنا لعاب دہن استعمال کر لیا تھا؟ کیا وہ انتظار نہیں کر سکتی تھی؟ یا کیا اس نے احساس کرنے کے احساس سے پہلے ہی وہ نباتی سفوف ہوا میں اُڑا دیا تھا؛ کیا وہ اپنا ہاتھ تولیے سے اس وقت تک رگڑتی رہی تھی جب تک کہ ماریا کا مانوس چھوٹا سا پنجہ، اپنی ہتھیلی کے معمولی سے وہمی چاند کے اُبھار، اپنے موٹے سے عطارد، اور اپنی ٹھوس گدی دار چپٹی والی زُہرہ سمیت دوبارہ ظاہر نہیں ہو گیا تھا۔

اس کے تھوڑی دیر بعد ہم گھر چلے گئے۔ آسکر کو بھی معلوم نہیں ہو گا کہ ماریا نے اسی دن دوسری بار فزپاؤڈر کو فز کرنے بھی دیا تھا یا نہیں، یا چند دن بعد ہوا تھا کہ میرے تھوک اور فزپاؤڈر کا ملغوبہ بار بار دہرانے سے اس کی اور میری دونوں کی خرابی کا باعث ہوا تھا۔

اتفاق سے یا آپ اتفاق کو اپنی خواہش کے مطابق لچک دار ہونے دیں تو، یہ سب کچھ غسل کی اس شام ہوا تھا جس کا ابھی تذکرہ کیا جا چکا ہے——ہم بلیو بیری کا شوربا کھا رہے تھے [انگریزی زبان میں شوربا پیا نہیں جاتا، کھایا جاتا ہے۔ مترجم]، جس کے بعد آلو کی کٹلٹ آنے والی تھی——ماتسیرات نے، ہمیشہ کی طرح کی ہوشیاری سے، ماریا اور مجھ کو بتایا کہ وہ ایک چھوٹے سے skat کلب میں شامل ہو گیا ہے جو اس کے پارٹی کے ارکان پر مشتمل ہے، کہ وہ اپنے نئے skat کے ساتھیوں سے ملاقات کرے گا، جو سب یونٹ لیڈر ہیں، ہر ہفتے دو بار شام کو 'سپرنگرز' ریستوران میں، جہاں نیا گروپ لیڈر 'سیلکے' بھی وقتاً فوقتاً آیا کرے گا، جس کا بدقسمتی سے یہ مطلب ہوا کہ ہم اکیلے ہوں گے۔ ماتسیرات کے خیال میں بہترین انتظام یہ ہو گا کہ skat کی راتوں کو آسکر مدر ٹروزنسکی کے گھر سوئے گا۔

مدر ٹروزنسکی راضی ہو گئی، اس لیے اور بھی کہ اسے یہ حل اس مشورے کے مقابلے میں زیادہ اپیل کیا تھا جو ماتسیرات نے ایک دن قبل، ماریا سے مشورہ کیے بغیر دے

دیا تھا، کہ بجائے اس کے کہ میں مدر ٹروزنسکی کے ہاں رات بسر کروں، ماریا دو رات ہمارے صوفے پر سو جایا کرے گی۔

اس وقت تک ماریا اس وسیع خواب گاہ میں سوتی تھی جہاں میرا دوست ہربرٹ ماضی میں اپنی پیٹھ کے نشان لیے سویا کرتا تھا۔ یہ غیر معمولی بھاری فرنیچر ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں کھڑا کر دیا گیا تھا۔ مدر ٹروزنسکی کا بستر بیٹھک میں تھا۔ گسبے ٹروزنسکی، جو اب بھی ہوٹل ایڈن کے بار میں ویٹر کا کام کرتی تھی، ہوٹل میں ہی رہتی تھی۔ اپنی چھٹی کے دنوں میں وہ کبھی کبھی آیا کرتی تھی، رات شاید ہی کبھی بسر کرتی تھی، اور جب رکتی تھی تو صوفے پر سوتی تھی۔ جب فریڑ ٹروزنسکی، دور دراز سے، تحائف سے لدا پھندا گھر آتا تو وہ ہربرٹ کے کمرے میں سوتا تھا، ماریا مدر ٹروزنسکی کا بستر لیتی تھی اور بوڑھی عورت صوفے پر ڈیرا جماتی تھی۔

یہ انتظام میرے مطالبے پر بدلا گیا تھا۔ ابتدا میں مجھے صوفے پر سونا تھا۔ اس منصوبے کو میں نے پہلے ہی رد کر دیا تھا۔ پھر مدر ٹروزنسکی نے مجھے اپنا بستر دینے اور خود صوفے پر جانے کی پیش کش کر دی۔ اس پر ماریا نے اعتراض کیا کہ اس کی ماں کو نیند کی ضرورت ہے، کہ اس کے ماں کو بے آرام نہیں کیا جانا چاہیے۔ سادہ سی بات یہ تھی کہ ماریا نے براہِ راست ہربرٹ کے ساتھ بستر کو میرے ساتھ استعمال کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ ''میں اس بستر میں آرام سے رہوں گی۔'' اس نے کہا، ''وہ تو اس کے آٹھویں حصے کے برابر ہے۔'' اس طرح دو دن بعد سے ماریا ہفتے میں دو بار میرے شب خوابی کے کپڑے، ہماری زمینی منزل کے فلیٹ سے ٹروزنسکی رہائش گاہ کی دوسری منزل تک لے جایا کرتی تھی، اور اس نے میری شب بسری کا اور اپنے بستر کی بائیں جانب میرے نقارے کا انتظام کر دیا۔ ماتسیرات کی پہلی skat کی رات کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہربرٹ کا بستر میرے لیے بھیانک حد تک بڑا تھا۔ میں پہلے لیٹ گیا، ماریا بعد میں آئی۔ اس نے باورچی خانے میں اپنی صفائی ستھرائی کر لی تھی اور خواب گاہ میں نہایت پرانے انداز کے بیہودہ طویل اور بیہودگی سے کلف کیا ہوا نائٹ گاؤن پہنے ہوئے وارد ہوئی۔ آسکر کو توقع تھی کہ وہ برہنہ اور بال دار ہو گی۔ پہلے تو وہ مایوس ہوا، مگر فوراً ہی وہ بالکل خوش و خرم ہو گیا، اس لیے کہ

وراثتی نائٹ گاؤن نے خوش گوار رشتے بنا رکھے تھے، جس نے اس کو تربیت یافتہ نرسوں اور ان کے سفید کپڑوں کی دُکان کی یاد دلا دی تھی۔

واش اسٹینڈ کے قریب کھڑی ماریا اپنی چوٹی کھولتی اور سیٹی بجاتی جا رہی تھی۔ ماریا لباس پہنتے اور لباس اُتارتے وقت، چوٹی گوندھتے اور چوٹی کھولتے وقت سیٹی بجایا کرتی تھی۔ بالوں میں کنگھی کرتے وقت بھی وہ بغیر کوئی دُھن بنائے ہوئے اپنے بٹوے جیسے ہونٹوں سے وہ دو سُر نکالتے نہیں تھکتی تھی۔

جوں ہی ماریا نے کنگھی ایک طرف رکھی، سیٹی بجنی بند ہو گئی۔ وہ مُڑی، ایک بار پھر اپنے بال ہلائے اور واش اسٹینڈ کو قرینے سے صاف ستھرا کر دیا۔ اس قرینے نے اس کو شوخ کر دیا: اس نے آبنوس کے فریم میں اپنے مونچھوں والی، ٹھیک کی ہوئی، باپ کی تصویر کی جانب ایک بوسہ اچھال دیا، پھر مبالغہ آمیز جوش کے ساتھ بستر میں کود پڑی اور کئی بار اُچھلی۔ آخری اچھال پر اس نے نرم پَروں والا لحاف کھینچا اور اس پہاڑ کے نیچے اپنی ٹھوڑی تک غائب ہو گئی۔ میں اپنی رضائی کے نیچے لیٹا رہا اور اس نے مجھے چھوا بھی نہیں؛ اس نے لحاف کے نیچے سے اپنا خوب صورت ہاتھ نکالا، سر کے اوپر لٹکتی ہوئی بلب جلانے والی ڈور تلاش کی، اور روشنی گُل کر دی۔ جب بالکل اندھیرا ہو گیا تب اس نے، بہت اونچی آواز میں کہا، "شب بخیر۔"

جلد ہی ماریا برابری سے سانس لینے لگی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ بن نہیں رہی تھی؛ بہت ممکن ہے کہ وہ فوراً ہی سو گئی ہو، اس لیے کہ جس معیار کے کام وہ ہر روز کرتی تھی وہ متبادل مقدار کی نیند کے طالب ہوتے تھے۔ کافی دیر تک آسکر کی آنکھوں کے سامنے سے جاذبِ نظر اور نیند دور کر دینے والے نقوش گزرتے رہے۔ اس لیے کہ دور کی دیواروں اور سیاہ کی ہوئی کھڑکیوں کے درمیان کی اس تمام گھری تاریکی میں سنہرے بالوں والی نرسیں ہربرٹ کی زخم کے نشانوں والی پیٹھ کا معائنہ کرنے کے لیے جھکیں، لیو شگر کے سفید شکنوں بھری قمیص سے کچھ اُبھرا — آپ اس سے اور کیا توقع کر سکتے ہیں؟ — وہ ایک سمندری پرندہ تھا، جو اس وقت تک اُڑتا رہا جب تک کہ قبرستان کی دیوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو گیا تھا، جس نے فوراً ہی تازہ سفیدی کی ہوئی شکل اختیار نہیں کر لی تھی وغیرہ وغیرہ۔ صرف اس وقت جب

باقاعدہ طور پر چڑھتی، غنودہ کرتی ہوئی ونیلا کی خوش بو نے اس کی آنکھوں کے سامنے چلتی ہوئی فلم کو لرزا دیا تھا، آسکر ماریا کی طرح ویسی ہی پُرسکون کیفیت میں ہمواری سے سانس لینے لگا تھا، ماریا جس میں خدا جانے کب سے ہمواری سے سانس لے رہی تھی۔

تین دن بعد مجھ سے پھر مجھ سے وہی بستر-میں-جاؤ جیسا سلوک کیا گیا۔ وہ اپنا نائٹ گاؤن پہنے، چوٹی کھولتے سیٹی بجاتی رہی، بالوں میں کنگھی کرتے سیٹی بجاتی رہی، کنگھی رکھی اور سیٹی بند ہو گئی، واش اسٹینڈ کو قرینے سے صاف ستھرا کیا، تصویر کی طرف ایک بوسہ اُچھالا، اپنی وحشی چھلانگ لگائی، نرم پروں والا لحاف کھینچا اور— میں اس کی واپسی کا تصور کر ہی رہا تھا— اس چھوٹی سی تھیلی پر نظر کی اور— میں اس کے پیارے پیارے لمبے بالوں کی تعریف کر رہا تھا— اس کی رضائی پر کوئی سبز چیز دیکھی— میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں— اس وقت تک انتظار کرنے کا فیصلہ کیا جب تک کہ وہ فِز پاؤڈر کے دیکھنے کی عادی نہیں ہو جاتی۔ پیچھے کی طرف لڑھکتی ہوئی ماریا کے بوجھ تلے بستر کی اسپرنگ چیخ اُٹھی، مجھے ایک بٹن کی آواز سنائی دی، اور جب میں نے آواز کی وجہ سے آنکھ کھولی تو آسکر نے اس کی تصدیق کی جو اسے پہلے سے معلوم تھا: ماریا نے روشنی گُل کر دی تھی اور تاریکی میں بے ترتیبی سے سانس لے رہی تھی: وہ اپنے آپ کو فِز پاؤڈر کا خوگر نہیں بنا سکی تھی۔ پھر بھی، یہ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی قائم کی ہوئی تاریکی نے فِز پاؤڈر کو ایک کڑا اور حساس وجود عطا کر دیا ہے، جو نباتی سفوف کو گل فشانی پر لاتا ہے اور سوڈے کے بلبلوں کی رات کے ساتھ آمیزش کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ تاریکی آسکر کے ساتھ تھی۔ اس لیے کہ چند منٹ بعد— اگر آپ گہرے اندھیرے کمرے میں منٹوں کی بات کر سکتے ہیں— مجھے بستر کے سرہانے کی جنبشوں کی وجہ معلوم ہو گئی تھی؛ ماریا بلب جلانے والی ڈور کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی، ڈور کے سرے کو، اور ایک لمحے بعد ایک بار پھر میں پیارے پیارے لمبے بالوں کے ماریا کے گاؤن پر گرنے کی تعریف کر رہا تھا۔ کتنے قائم مزاج ہیں وہ زرد روشنی والے بلب جو چنٹوں والے لیمپ شیڈ کے پیچھے سے روشن تھے۔ نرم پروں والا لحاف بستر کی پائنتی کی

جانب بغیر چھوئے ہوئے پھولا ہوا تھا۔ اس پہاڑ کے اوپر رکھی ہوئی تھیلی نے روشنی میں بٹنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ ماریا کا وراثتی نائٹ گاؤن سرسرایا، ایک آستین، اپنے اندر کے ہاتھ سمیت، اوپر اٹھی اور آسکر نے اپنے منہ میں لعابِ دہن اکٹھا کیا۔

آنے والے ہفتوں کے دوران ہم دونوں نے ایک درجن سے زیادہ فزپاؤڈر کی تھیلیاں خالی کر دی تھیں، جن میں زیادہ تر woodruff خوش بو والی تھیں، پھر جب woodruff ختم ہو گیا، تو لیموں یا رس بھری والی اسی طرح میرے لعابِ دہن سے عمل کر فز کرتی تھیں، اور اس طرح اکسانے والی سنسنی ماریا کے نزدیک بہت قابلِ قدر تھی۔ میں نے لعابِ دہن اکٹھا کرنے کا ایک خاص قسم کا ہنر سیکھ لیا، اور کچھ ترکیبیں وضع کیں جن کی مدد سے میرے منہ میں تیزی سے پانی جمع ہونے لگا اور جلد ہی، ایک تھیلی کی مقدار کی مدد سے ماریا کی پسندیدہ سنسنی مسلسل تین بار دے سکتا تھا۔

ماریا آسکر سے بہت خوش تھی؛ کبھی کبھی فزپاؤڈر کی رنگ رلیوں کے بعد، وہ آسکر سے لپٹ کر دو تین بار، اس کے چہرے کے کسی حصے کا بوسہ لینے لگتی تھی۔ اس کے بعد ایک لمحے تاریکی میں کھلکھلاتی اور فوراً سو جاتی تھی۔

اب میرے لیے سونا مشکل تر ہوتا جاتا تھا۔ میں سولہ برس کی عمر کا تھا؛ میں ایک نہایت متحرک ذہن کا مالک تھا اور مجھے نیند کو بھگانے کی ضرورت تھی تا کہ میں اپنے پیار کو دوسرے زیادہ حیرت انگیز امکانات کے ساتھ ماریا سے ملا سکتا بجائے ان کے جو فزپاؤڈر میں بے حرکت پڑے رہتے تھے اور میرے لعابِ دہن سے جگانے کے بعد اسی قسم کی سنسنی کو اکساتے تھے۔

آسکر کے مراقبے روشنی کے گل ہونے کے بعد تک ہی محدود نہیں ہوتے تھے۔ سارا سارا دن میں اپنے نقارے کے پیچھے بیٹھا غور کرتا رہتا تھا، راسپوتین کے اقتباسات کی ورق گردانی کرتا، گریٹشن شیفلر اور بے چاری مما کے درمیان کی تعلیمی رنگ رلیوں کو یاد کرتا رہتا، گوئٹے سے استفادہ کرتا، جس کی Elective Affinities نامی کتاب کے اقتباسات میرے پاس تھے جو راسپوتین جیسے تھے؛ میں نے دعا تعویذ کے ذریعے علاج کرنے والے

سے کچھ ابتدائی طریقے سیکھے، ان کو عظیم شاعر کے دنیا بھر کے قدرتی احساسات میں خلط ملط کیا؛ کبھی کبھی تو میں ماریا کو زارینہ نظر آتا، یا گرانڈ ڈچز 'اَنستاسیا' کے خد و خال میں نظر آتا، جو راسپوتین کی پیرو شرفا کی خواتین میں سے تھیں؛ مگر جلد ہی اس ضرورت سے زیادہ حیوانی جذبے سے کراہت کے باعث میں ماریا کو 'اوٹیلی' یا 'شارلوٹ' کی آسمانی شفافیت میں دیکھتا۔ آسکر خود کو کبھی راسپوتین کی شخصیت میں، قاتل کی صورت، کپتان کی صورت، اور گاہے گاہے شارلوٹ کے جھومتے لہراتے شوہر کی صورت میں دیکھتا، اور ایک بار — مجھے اعتراف ہے کہ — میں ایک جینئس کی طرح گوئٹے کی مشہور صورت میں سوتی ہوئی ماریا پر منڈلا رہا تھا۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ میں اصل، خالص زندگی کے مقابلے میں ادب سے زیادہ القا کی توقع کرتا تھا۔ جان برانسکی، جس کو میں اکثر اپنی ماں کے جسم کو مسلتے دیکھتا تھا، مجھے اس سے زیادہ نہیں سکھا سکتا تھا۔ حالاں کہ میں جانتا تھا کہ یہ پیچ، جس میں باری باری مما اور جان، یا ماتسیرات اور مما الجھے ہوئے تھے، یہ گرہ جو کبھی سکھ کا سانس ہوتی، کبھی خود زور لگاتی، کبھی تھکن سے کراہتی اور بالآخر ملتے ہوئے بھی ختم ہو جاتی، محبت تھی، آسکر اب بھی ماننے پر تیار نہیں تھا کہ محبت واقعی محبت ہوتی ہے؛ خود محبت نے ہی اس کو کسی اور محبت کے لیے ڈھالا تھا، اس کے بعد بھی وہ بار بار پیچیدہ محبت کی طرف لوٹا تھا، جس سے اس نے اس دن تک نفرت کی تھی جب اس نے محبت کر کے اس کی مشق کی تھی؛ تب صرف اس کو اپنے تئیں محبت سمجھ کر اس کا دفاع کرنا پڑا تھا۔

ماریا نے پیٹھ کے بل لیٹے ہوئے فِز پاؤڈر لیا۔ جوں ہی اس میں بلبلے پیدا ہوئے، اس کے پاؤں تھرتھرانے لگے اور جیسا کہ کبھی کبھی سنسنی کی حالت میں ہوتا تھا، اس کا نائٹ گاؤن سرک کر اس کی رانوں تک چلا گیا اور دوسرے فِز پر، حسبِ معمول اس کے پیٹ پر سے سرکتا اس کی چھاتیوں کے نیچے ڈھیر کی صورت جمع ہو گیا تھا۔ ایک رات، جب کہ میں ہفتوں اس کی بائیں ہتھیلی کو بھرتا رہا تھا، میں نے بالکل بے ساختگی سے — کہ اس وقت پہلے گوئٹے یا راسپوتین سے مشورے کا موقع نہیں تھا — رس بھری مزے والی ہتھیلی کا بقیہ پاؤڈر اس کی ناف کے سوراخ میں ڈال دیا اور قبل اس کے وہ احتجاج کر پاتی، اس پر

اپنا لعاب دہن بھی ڈال دیا۔ جوں ہی وہ آتش فشاں کا دہانہ جھاگ اُبلنے لگا، ماریا احتجاج کو سہارا دینے والے تمام ضروری دلائل بھول گئی۔ ہتھیلی کے مقابلے میں جھاگ اُٹھاتی ناف کو بہت سہولتیں تھیں۔ یہ وہی فزیاڈر تھا، اور میرا تھوک بھی میرا تھوک ہی تھا، اور بلا شبہ سنسنی بھی مختلف نہیں تھی، مگر زیادہ شدید تھی، بلکہ بہت زیادہ شدید تھی۔ سنسنی اس درجے پر پہنچ گئی کہ ماریا کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئی۔ وہ اُٹھ کر آگے کی طرف جھکی، گویا وہ اپنی ناف میں بلبلاتی رس بھریوں کو اپنی زبان سے چاٹ لینا چاہتی تھی، جس طرح اس نے اپنی ہتھیلی کے گڑھے کے نباتی سفوف کو چاٹ لیا تھا، مگر اس کی زبان اتنی لمبی نہیں تھی؛ اس کی ناف تو افریقا یا Tierra del Fuego سے بھی زیادہ فاصلے پر تھی۔ میں بہرحال ماریا کی ناف سے زیادہ قریب تھا؛ میں نے، رس بھریوں کی تلاش میں اس سوراخ میں اپنی زبان ڈال دی اور اس میں تو مجھے اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار ملی؛ میں دور دور پھرا، اور ایسی جگہوں پر پہنچا جہاں کوئی جنگلوں کا محافظ بھی نہیں تھا جو مجھ سے رس بھریاں چکھنے کا اجازت نامہ طلب کرتا؛ میں نے آخری بیری تک کو چن لینے کی ضرورت محسوس کی، میری نظروں میں اس وقت سوائے رس بھری کے اور کچھ نہیں تھا، میرا دماغ، میرا دل، میرے کان، بلکہ دنیا بھر میں سوائے رس بھری کی خوش بو کے کچھ بھی نہیں تھا، اور میں رس بھری کا اتنا آرزومند ہو رہا تھا کہ آسکر نے یوں ہی چلتے چلتے خود سے کہا تھا، ماریا تمھارے جذبۂ انہماک سے خوش ہے۔ اسی وجہ سے اس نے روشنی گُل کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنے اعتماد سے نیند کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہے، اور تم کو رس بھریاں چکھنے کی اجازت دیتی ہے؛ کہ ماریا رس بھریوں کی دولت سے مالا مال ہے۔

اور جب مجھ کو کچھ نہیں ملا، مگر شاید اتفاق سے دوسری جگہوں پر مشروم مل گیا۔ اور چوں کہ وہ ماس (یعنی نم گھاس پھوس، یا کوڑے کرکٹ) کے نیچے ہوتے ہیں اس لیے میری زبان نے ہتھیار ڈال دیے اور میرے ہاتھ میں گیارہویں انگلی نکل آئی، اس لیے کہ میری دس انگلیاں اس مقصد کے لیے ناکافی تھیں۔ اس طرح آسکر کو تیسری چوب نقارہ مل گئی — کیوں نہ ہو اب وہ بڑا ہو گیا ہے اور ٹین کا نقارہ بجانے کے بجائے میں ماس پر نقارہ بجانے لگا۔ اب

مجھے یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ بجایا کس نے تھا، کہ وہ ماریا تھی، یا وہ اس کا ماس تھا یا میرا ماس تھا۔ کیا یہ ماس اور گیارہویں انگلی کسی اور کی ملکیت ہیں اور میری ملکیت صرف مش روم ہیں؟ اور چھوٹے صاحب جو وہاں بیٹھے ہوئے ہیں، کیا ان کے پاس اپنا دماغ ہے اور ان کی اپنی خواہش بھی ہوتی ہے؟ اب تک یہ سب کچھ کون کر رہا تھا — وہ آسکر تھا، یا میں؟

اور ماریا، جو اوپر سوتی تھی اور نیچے جاگتی تھی، جو اوپر معصوم ونیلا کی طرح مہکتی تھی اور ماس کے نیچے تیز بو والے مشروم کی طرح، جس کو فزپاؤڈر کی طلب ہوتی تھی، ان چھوٹے حضرت کی نہیں، جنھیں میں بھی نہیں چاہتا، جنھوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا ہے، جو بس وہی کرتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں، جنھوں نے وہی کیا ہے جو میں نے نہیں سکھایا ہے، جو کھڑے ہو جاتے ہیں، جب میں لیٹتا ہوں، جن کے خواب میرے خوابوں سے مختلف ہوتے ہیں، جو نہ لکھ سکتے ہیں نہ پڑھ سکتے ہیں، پھر بھی میری طرف سے دستخط کر دیتے ہیں، جو آج تک سب کچھ اپنے طریقے سے ہی کرتے ہیں، جو مجھ سے اسی دن الگ ہو گئے تھے جب پہلی بار میں نے ان کو دیکھا تھا، جو میرے دشمن ہیں جن کے ساتھ میں قید ہوں، جو بار بار میرے اتحادی بننا چاہتے ہیں، جو مجھ سے غداری کرتے ہیں اور مجھے تنہا چھوڑ دیتے ہیں، جن کو میں نیلام کر دینا چاہتا ہوں، جو میرے لیے باعثِ شرم ہیں، جو مجھ سے تنگ آچکے ہیں، جنھیں میں نہلاتا ہوں، جو مجھے خراب کر دیتے ہیں، جو دیکھتے کچھ نہیں ہیں اور ہر چیز کا دعویٰ کرتے ہیں، وہ میرے لیے اتنے ہی اجنبی ہیں کہ مجھے ان کو جناب کہنا چاہیے، جن کی یادداشت آسکر سے مختلف ہے: اس لیے کہ آج جب ماریا میرے کمرے میں آئی تو یہ دونو خاموشی سے برآمدے میں چلا گیا تھا، وہ اب ماریا کو پہچانتے بھی نہیں، وہ پہچان نہیں سکتے، وہ پہچانیں گے بھی نہیں، وہ پاؤں پسار کر بیٹھ جاتے ہیں جب کہ آسکر کا دھڑکتا ہوا دل میری زبان کو ہکلانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سنو ماریا، کچھ نازک مشورے ہیں۔ میں ایک پرکار خرید کر اپنے اطراف ایک دائرہ کھینچوں گا: اسی پرکار سے تمھاری گردن کے خم کے زاویے کی پیمائش کروں گا جب تم پڑھ رہی ہو، سلائی کر رہی ہو، آج کی طرح، میرے دستی ریڈیو کے بٹنوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہو۔ شاید میں اپنی

آنکھوں میں ٹیکا لگوا لوں اور ایک بار پھر آنسو تلاش کر لوں۔ قریبی قصائی کی دُکان پر آ کر اپنا دِل قیمہ بنانے والے مشین میں ڈال دے گا، اگر تم اپنے روح کے ساتھ بھی ویسا ہی کرو۔ ہم اپنے درمیان کوئی خاموش شے رکھنے کے لیے ایک بجّس بھرا جانور خرید سکتے ہیں۔ اگر ہمارے پاس کیڑے ہوتے اور تمھارے پاس صبر ہوتا، تو ہم مچھلی کا شکار کرنے جاتے اور خوش رہتے۔ یا ان دنوں کا فزپاؤڈر؟ یاد ہے کہ نہیں؟ تم مجھے woodruff, کہو، میں فز ہونے لگوں گی، اگر تم مزید چاہو تو میں بقیہ بھی دے دوں گا......ماریا ...... کچھ نازک مشورے ہیں۔

تم ہمیشہ ریڈیو کی گھنڈیوں سے کیوں کھیلتی رہتی ہو، آج کل تمھیں بس ریڈیو کا خیال رہتا ہے، گویا تم پر خاص اعلانات کی دیوانگی سوار ہو گئی ہے!

# خصوصی اعلانات

میرے نقارے کی سفید ڈسک پر تجربہ کرنا مشکل کام ہے۔ مجھے اس کا علم ہونا چاہیے تھا۔ میرا نقارہ ہمیشہ ایک ہی قسم کی لکڑی چاہتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ اس سے چوب نقارہ کے ذریعے سوال کیا جائے اور اس پر تھاپ لگا کر جواب نکالنے کے لیے یا آسان مکالماتی انداز میں، سوالات اور جوابات کھلے چھوڑ دیے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ میرا نقارہ نہ کوئی فرائنگ پین ہے، جو مصنوعی طور پر گرم کیا جائے تو کچے گوشت کو پکا کر کرکرا بنا دے نہ یہ ایسے جوڑوں کے لیے کوئی رقص کی جگہ ہے جن کو یہ فکر بھی نہیں ہوتی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں بھی یا نہیں۔ نتیجے کے طور پر، سب سے زیادہ تنہائی کے عالم میں بھی آسکر نے نہ کبھی اپنے نقارے پر فز پاؤڈر چھڑکا ہے، نہ اس میں اپنا لعاب دہن ملایا ہے، نہ اس کو نمائش کے لیے رکھا ہے، برسوں سے جسے تم نہیں دیکھا ہے، اور یہ بھی کہ میں اسے بہت یاد کرتا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ آسکر مذکورہ پاؤڈر سے تجربہ کرنے پر مجبور تھا، مگر وہ زیادہ راستی سے آگے بڑھا تھا اور نقارے کو اس سے الگ رکھا تھا: اور اس عمل کے دوران، میں نے خود کو افشا کر دیا، اس لیے کہ اپنے نقارے کے بغیر میں ہمیشہ افشا اور لاچار رہا ہوں۔

فز پاؤڈر کا حاصل کرنا مشکل کام تھا۔ میں نے برونو کو کریانے کی تقریباً ہر دکان پر بھیجا: میں نے اس کو ٹرام گاڑی سے "گریشائم" تک بھیجا۔ میں نے اس سے کہا کہ شہر سے لانے کی کوشش کرو، مگر عام شربت کی دکان پر بھی جو عام طور پر ٹرام گاڑی کے اڈوں کے

آخر میں ہوتی ہیں، بروفو کو فز پاؤڈر دستیاب نہیں ہوا۔دُکانوں پر کام کرنے والی نوجوان لڑکیوں نے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا،عمر رسیدہ دُکان داروں کوصرف باتیں کرنے کی حد تک یاد تھا؛ سوچتے ہوئے— جیسا کہ بروفو نے بتایا تھا— وہ اپنا ماتھا رگڑتے ہوئے پوچھتے تھے "تمھیں کون سی چیز چاہیے؟ اچھا، فز پاؤڈر چاہیے؟ ارے بھائی! وہ تو بہت زمانے کی بات ہے۔ولہلم کے قدیم زمانے کے لوگ بیچا کرتے تھے اورایڈولف کے دور کی تو محض ابھی ابتدا ہوئی ہے۔کیا سنہرے دن تھے وہ بھی۔ تمھیں، کوئی سوڈے یا کوک کی بوتل چاہیے؟

جو میں چاہتا تھا اس کو حاصل کیے بغیر ہی، میرا نگہبان میرے خرچ پر سوڈے یا کوک کی کئی بوتلیں پی چکا تھا،مگر بالآخر،آسکر کو فز پاؤڈر مل ہی گیا؛ ابھی کل ہی بروفو نے مجھے ایک چھوٹی سی، بغیر لیبل کی، سفید رنگ کی تھیلی لاکر دی ہے؛ ہمارے دماغی اسپتال کی تجربہ گاہ کی ماہرِ فن، کوئی مِس کلاٹن نام کی خاتون ہیں جو، از راہِ مہربانی، اپنی میز کی درازیں، دوا کی شیشیاں اور حوالے کی کتابیں کھولنے پر راضی ہوئیں؛ اوراس شے کے چند گرام،اوراس شئے کے چند گرام، لینے اور کئی کوششوں کے بعدان سب کو ملا کر انھوں نے ایک فز پاؤڈر بنایا جو، بروفو کے مطابق، فز کر سکتا ہے، کانٹے دار مزہ دے سکتا ہے، سبز ہو سکتا ہے؛ اور تقریباً ووڈرَف کا woodruff مزہ دے سکتا ہے۔

اور آج ملاقات کا دن تھا۔ماریا آئی تھی، مگر پہلے کلیپ آیا تھا۔ہم پون گھنٹے تک ہنسی مذاق کرتے رہے، کسی ایسی شئے کے لیے جو بھلا دینے کے قابل تھی۔ مجھے کلیپ کا خیال تھا، اور میں نے اس کے لینن کے اشتراکی خیالات کو نظر انداز کیا، حالیہ دنوں کے حالات کو نظر انداز کیا، اسٹالن کی موت کے خاص اعلان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جو میرے چھوٹے سے دستی ریڈیو پر نشر ہوئے تھے، جو چند ہفتے پہلے، مجھے ماریا نے لا کر دیا تھا، مگر کلیپ جانتا تھا، اس لیے کہ اس کے بھورے رنگ کے چار خانے والے اوورکوٹ کی آستین سے نامکمل طور پر ایک کریپ کا ٹکڑا سلا ہوا تھا۔ابھی کلیپ اُٹھ ہی رہا تھا کہ وِٹلر آ گیا ۔ وِٹلر نے ہنس کرکلیپ کو خوش آمدید کہااوراس سے اُلجھ پڑا "صبح کے وقت جب میں شیو کر رہا تھا، اسٹالن کی موت نے مجھے حیران کر دیا تھا۔" اس نے بناوٹی انداز میں کہا، اورکلیپ کوکوٹ پہننے میں مدد دی۔اس کے

طباق سے چہرے پر پارسائی کی ملائم سی تہہ چڑھی ہوئی تھی۔کلیپ نے اپنے آستین کے سیاہ رنگ کے کپڑے کو بلند کیا، ”اسی وجہ سے میں سوگ میں ہوں۔“ اس نے ایک سرد آہ بھری اور آرم اسٹرانگ کے بگل کی نقل اُتارتے ہوئے ویسی کارروائی شروع کردی، جیسی کہ امریکا کی ریاست ’نیو آرلینز‘[ میں جنازہ لے جانے کی ابتدا ] میں میت کے جنازے پر [ بگل بجا کر] کی جاتی ہے: ٹرا!!!.....ٹراڈاپا.....ٹرا!!!.....ڈاڈا.....ڈاڈاڈا—گرتا ہوا وہ دروازے سے باہر چلا گیا۔

ڈنگر ٹھہرا رہا؛ وہ بیٹھنا نہیں چاہتا تھا، مگر اُچک کر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور چند منٹ تک ہم آپس میں مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے رہے، جن کا اسٹالن کی موت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

مجھے خبر نہیں کہ میں ڈنگر سے سرگوشی کرنا یا اس کو بھگانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کو قریب آنے کا اشارہ کیا، میری طرف ایک کان پیش کرنے کے لیے کہا، اور سرگوشی میں اس کے بڑی لووں والے بیچھے میں کہا: ”فز پاوڈر! اس کا کیا مطلب ہوتا ہے، گاٹ فریڈ؟“ ایک خوف زدہ چھلانگ—اور ڈنگر کود کر میرے پنجرے جیسے پلنگ سے دور جا کھڑا ہوا؛ اس نے اپنی اُنگلی آگے بڑھائی اور تھیٹر کے جذبے میں، جو اسے آسان لگا، خطیبانہ کہا:

”کیا— تو مجھے— فز پاوڈر کے نام سے— ورغلانا چاہتا ہے؟— اور شیطان— ؟ کیا— تو جانتا نہیں— کہ میں— فرشتہ ہوں؟“

اور پھر، فرشتے کی طرح ہی، ڈنگر، واش بیسن پر لگے آئینے کی طرف آخری بار دیکھے بغیر ہی پرواز کر گیا۔ یہ دماغی اسپتال کے باہر والے نوجوان لوگ بھی عجیب اور بناوٹی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد ماریا آپہنچی۔وہ ایک نیا، درزی کے ہاتھ کا سلا ہوا، موسمِ بہار کا سوٹ پہنے ہوئی تھی، جس کے ساتھ بھورے رنگ کی ہیٹ بھی تھی، جس میں پیال کے رنگ کی پتلی سی گوٹ لگی ہوئی تھی۔میرے کمرے میں بھی وہ یہ فن کاری کا نمونہ اپنے سر سے نہیں اُتارتی۔اس نے سرسری انداز میں سلام کیا، بوسے کے لیے اپنا رخسار پیش کیا، اور فوراً ہی دستی ریڈیو کھول دیا جو دراصل اس کی جانب سے میرے لیے تحفہ تھا، مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس نے اسے اپنے استعمال کے لیے خریدا تھا کہ اس قابلِ نفرت پلاسٹک کے ڈبے کا کام ملاقات کے دن کی گفتگو میں دخل اندازی کرنا رہ گیا تھا۔

"تم نے آج صبح کی خبر سنی؟ سننی خیز ہے کہ نہیں؟ یا سنی ہی نہیں؟"

"ہاں، ماریا!" میں نے بڑے صبر سے جواب دیا۔ "انھوں نے اِسٹالن کی موت کو مجھ سے نہیں چھپایا، مگر پلیز، ریڈیو بند کر دو۔"

ماریا نے ایک لفظ بھی نہیں کہا، ریڈیو بند کر دیا، بیٹھ گئی، اب بھی ہیٹ پہنے ہوئے تھی، اور ہمیشہ کی طرح کرٹ کے بارے میں بات شروع کر دی۔

"ذرا تصور تو کرو آسکر، وہ بدمعاش لمبے موزے نہیں پہننا چاہتا، جب کہ ابھی تو مارچ کا مہینہ ہے، اور زیادہ سرد موسم آنے والا ہے، انھوں نے ریڈیو پر کہا ہے......"

میں نے موسم کا حال نظر انداز کر دیا مگر لمبے موزے کے بارے میں کرٹ کی طرف داری کی۔ "ابھی تو وہ بارہ برس کا بچہ ہے ماریا، اسے اونی موزے پہن کر اسکول جاتے شرم آتی ہے، دوست اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔"

"اچھا...... جہاں تک میرا معاملہ ہے، اس کی صحت سب سے اہم ہے؛ اب وہ ایسٹر تک موزے ضرور پہنے گا"

اتنے صریح انداز میں تاریخ کا تعیّن کر دیا گیا تھا کہ میں نے پینترا بدلا۔

"تم اس کے لیے ski کی پتلونیں کیوں نہیں خرید دیتیں؟ وہ لمبے اونی موازے واقعی بدصورت ہیں۔ ذرا اس وقت کو یاد کرو، جب تم اس عمر کی تھیں۔ 'لیبس ویگ' کے ہمارے احاطے کا شارٹی یاد ہے تمھیں؟ وہ ہمیشہ ایسٹر تک لمبے موزے پہنا کرتا تھا۔ کیا تمھیں یاد نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ نوشی آہیک، 'کریٹ' میں قتل کر دی گئی تھی، ایکسِل مشکے، جنگ ختم ہونے سے ذرا پہلے ہالینڈ میں اپنے انجام کو پہنچا، اور ہیری شلا گر! انھوں نے شارٹی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ انھوں نے اس کے موزے کولتار میں سان دیے تھے اور وہ اس کی جلد سے چپک گئے تھے اور شارٹی کو اسپتال لے جانا پڑا تھا۔"

"اس میں موزے کا تو قصور نہیں تھا، سوی کاٹر کا قصور تھا۔" ماریا نے غصے میں چیخ کر کہا۔

حالاں کہ جنگ کی ابتدا کے وقت ہی سوی ہلپٹر گرلز میں شامل ہو چکی تھی اور افواہ تھی کہ بعد میں 'باویریا' میں اس کی شادی ہو چکی تھی، ماریا نے سوی کا ناطقہ بند کر دیا تھا، وہ

اس سے کئی سال سینئر تھی، ایک دائمی بغض تھا اس سے، جیسا کہ عورتیں اور صرف عورتیں، بچپنے سے پکی عمر تک اپنے دل میں لیے پھرتی ہیں۔ اس کے باوجود، شارلی کے کولتار بھرے موزے کی طرف میرے اشارے کا کچھ اثر ہوا تھا۔ ماریا نے وعدہ کیا کہ وہ کرٹ کے لیے ski کے پتلون خرید دے گی۔ پھر ہم کسی اور موضوع پر بات کرنے لگے۔ کرٹ کے بارے ایک اچھی خبر تھی۔ اسکول کے پرنسپل نے والدین اور اساتذہ کی ملاقات کے دوران اس کی تعریف کی تھی۔

''ذرا سوچو۔ اپنی کلاس میں وہ دوسرے درجے پر ہے۔ وہ دُکان میں بھی میری مدد کرتا ہے۔ میں بتا نہیں سکتی کہ میرے لیے اس مدد کی کیا اہمیت ہے۔''

میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا اور سنتا رہا، کہ حال ہی میں اس نے کھانوں کی دُکان کے لیے کیا خریداری کی تھی۔ میں نے اُس کی 'اوبر کارسل' میں ایک شاخ قائم کرنے کی ہمت افزائی کی۔

''حالات ہمارے موافق ہیں۔'' میں نے کہا، ''خوش حالی کی لہر جاری رہے گی''۔۔۔ میں نے یہ بات حال ہی میں ریڈیو پر سُنی تھی اور پھر میں نے فیصلہ کیا کہ برونو کو بلانے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ آیا اور اس نے فِز پاؤڈر کی سفید رنگ کی تھیلی پکڑا دی۔ آسکر نے اس منصوبے پر کام کیا تھا۔ بغیر وضاحت کے میں نے ماریا کا بایاں ہاتھ طلب کیا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھانا شروع کیا تھا، مگر پھر خود ہی درست کر لیا۔ سر ہلاتے اور چنتے ہوئے، اس نے اپنا بایاں ہاتھ پیش کیا، اس توقع میں کہ میں اس پر بوسہ دوں گا۔ اس نے اس وقت تک کسی قسم کی حیرت کا مظاہرہ نہیں کیا، جب تک میں نے اس کی ہتھیلی کو اوپر کی جانب کر کے چاند اور مشتری کے اُبھار کے درمیان تھیلی میں سے پاؤڈر انڈیل نہیں دیا تھا، مگر اس کے بعد بھی اس نے احتجاج نہیں کیا۔ اسے اس وقت خوف آیا تھا، جب آسکر نے اس کی ہتھیلی کی جانب جھک کر فِز پاؤڈر کے ڈھیر پر پوری طرح تھوک دیا تھا۔

''ارے! یہ کیا کر رہے ہو؟'' وہ طیش میں آ کر چلائی، جتنی دور تک ممکن ہوا، اپنا ہاتھ ہٹایا اور خوف کے عالم میں اُبلتے ہوئے سبز جھاگ کی طرف دیکھا۔ ماریا ماتھے سے نیچے تک تمام سُرخ ہو گئی تھی۔ مجھے امید ہونے لگی تھی، جب تین تیز قدم اسے واش بیسن کی

طرف لے گئے۔اس نے پانی کو،نفرت انگیز پانی کو، پہلے ٹھنڈے اور پھر گرم پانی کو، فِز پاؤڈر پر بہنے دیا۔پھر اس نے صابن سے اپنا ہاتھ دھولیا۔

"آسکر،تم واقعی بہت مشکل آدمی ہو۔تم کیا توقع کرتے ہو، مسٹر مٹسنر بدگ ہم دونوں کے بارے میں کیا سوچیں گے؟" وہ بدذنو کی جانب مڑی، جو میرے تجربے کے دوران کھسک کر میرے پلنگ کے پائنتی چلا گیا تھا، گویا وہ اپنے آپ سے میرے پاگل پنے کو نظر انداز کرنے کی استدعا کر رہا ہو۔ماریا کو مزید شرمندگی سے بچانے کے لیے میں نے اپنے نگہبان کو کمرے سے باہر بھیج دیا اور جوں ہی اس نے دروازہ بند کیا، میں نے ماریا کو اپنے پلنگ کے پاس واپس بلایا۔

"کیا تمھیں یاد نہیں؟پلیز یاد کرو۔فِز پاؤڈر!— تین پینی فی تھیلی— ذرا ماضی کو کھنگالو تو!— ووڈرف،— رس بھری— کتنی خوب صورتی سے یہ جھاگ بنتا تھا، اور بلبلے دیتا تھا— اور وہ سنسنی، ماریا!— اس سے تمھیں کیسی سنسنی محسوس ہوتی تھی۔"

ماریا کو کچھ یاد نہیں تھا۔اسے میری دیوانگی سے خوف آنے لگا تھا، اس نے اپنا بایاں ہاتھ پیچھے چھپا لیا، اور پریشانی کے عالم میں گفتگو کے لیے کوئی موضوع تلاش کرنے لگی تھی۔ اس نے ایک بار پھر مجھے اسکول میں کرٹ کے اچھے کام کے بارے میں بتایا، اِسالن کی موت کے بارے میں بتایا، ماتسیرات کی کھانے کی دُکان کے آئس باکس کے بارے میں بتایا،'اوور کا سل' کی نئی مجوزہ شاخ کے بارے میں بات کی، مگر میں فِز پاؤڈر کا وفادار رہا ......

فِز پاؤڈر...... میں نے کہا...... وہ کھڑی ہو گئی...... میں نے التجا کی ...... فِز پاؤڈر ...... اس نے جلدی سے خدا حافظ کہا...... اپنی ہیٹ پکڑی...... ابھی وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ ٹھہرے یا چلی جائے...... اس نے ریڈیو کھول دیا...... جس نے چیخنا شروع کر دیا تھا مگر میں نے اس کی آواز سے بھی بلند آواز میں...... چیخ کر کہا "فِز پاؤڈر...... ماریا...... یاد کرو!"

پھر، وہ کچھ دیر دروازے کے باہر کھڑی روتی رہی، نفی میں اپنا سر ہلایا اور مجھ کو چیختے ہوئے ریڈیو، سیٹی بجاتے ریڈیو کے ساتھ تنہا چھوڑ کر اس آہستگی سے دروازہ بند کرتی چلی گئی، گویا وہ مجھے بسترِ مرگ پر چھوڑ کر جا رہی ہو۔

گویا اب ماریا کو فِز پاؤڈر یاد نہیں آتا۔ پھر بھی جب تک میں سانس لے سکتا ہوں، نقارہ نوازی کر سکتا ہوں، وہ فِز پاؤڈر کبھی فِز کرنا اور جھاگ اُٹھانا بند نہیں کرے گا؛ اس لیے کہ وہ میرا تھوک تھا جس نے 1940 کے موسم گرما میں woodruff اور رس بھری کو بیدار کیا تھا، جس نے احساسات کو جگایا تھا، جس نے میرے گوشت کو تلاش میں بھیج دیا تھا، جس نے مجھے کھمبیوں سنہرے رنگ کے chanterelle [ نامی مش روم] اور دوسرے خوردنی مشروم جن کا مجھے علم نہیں، جمع کرنے والا بنا دیا، جنھوں نے مجھے ایک باپ بنا دیا، جی ہاں، بلا شبہ، جوان، جیسا کہ میں تھا، ایک باپ، تھوک سے باپ تک، احساسات کو جگانے والا، جمع کرنے والا، جنم دینے والا، ایک باپ بنا دیا تھا؛ اس لیے کہ نومبر کے شروع میں، شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی، کہ ماریا حمل سے تھی، ماریا دوسرے مہینے میں تھی اور میں، آسکر، اس حمل کا باپ تھا۔

آج بھی مجھے اس بات کا یقین ہے کہ اس کا ماتسیرات کے ساتھ معاملہ بعد میں ہوا تھا؛ دو ہفتے، نہیں دس دن بعد، جب میں نے ماریا کو حاملہ کر دیا تھا، جو پیٹھ پر نشانات والے اپنے بھائی ہربرٹ کے بستر میں تھی، ان پوسٹ کارڈوں کے سادہ مناظر کے سامنے، جو کارپورل بھائی بھیجا کرتا تھا۔ اس کے بعد اندھیرے میں، دیواروں اور بلیک آؤٹ کے لیے لگے کاغذوں کے درمیان مجھے نظر آئی تھی، مگر اس بار وہ سو نہیں رہی تھی، ہمارے صوفے پر بھی، واقعی وہ ہوا کے لیے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی؛ وہ ماتسیرات کے نیچے تھی اور ماتسیرات اس پر سوار تھا۔

آسکر جو دو چھتی میں مراقبہ کر رہا تھا، اپنے نقارے کے ساتھ راہداری سے ہوتا ہوا آیا اور بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ ان دونوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ ان کے سر ٹائل سے بنے آتش دان کی طرف تھے۔ انھوں نے باقاعدہ کپڑے بھی نہیں اُتارے تھے۔ ماتسیرات کی جانگھیا گھٹنوں تک آئی ہوئی تھی۔ اس کا پتلون قالین پر ڈھیر تھا۔ ماریا کی قمیص اور پیٹی کوٹ اس کی چولی پر بغلوں تک لپٹی ہوئی تھی، اس کی چڈھی ایک پیر میں تھی جو صوفے سے نیچے لٹک رہا تھا۔ اس کا دوسرا پیر پیچھے کی طرف، پلنگ کے سرھانے کی طرف مڑا ہوا تھا، گویا اس کو اس عمل سے کوئی

دلچسپی نہیں تھی ۔ماریا کے پیروں کے درمیان ماتسیرات تھا۔اپنے دائیں ہاتھ سے اس نے اس کے سر کو ایک جانب کر دیا تھا، اور دوسرا ہاتھ راستے پر اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ماتسیرات کی پھیلی ہوئی انگلیوں کے درمیان سے ماریا قالین کو دیکھ رہی تھی اور میز کے نیچے بنے نقوش پر عمل کر رہی تھی۔ ماتسیرات نے اپنے دانت مخمل کے غلاف والے ایک تکیے میں گاڑ دیے تھے، اور وہ مخمل کو اسی وقت چھوڑتا تھا جب وہ آپس باتیں کرتے تھے۔وقتاً فوقتاً وہ باتیں کرتے تھے، مگر اپنی محنتوں میں مخل ہوئے بغیر۔ صرف جب دیواری گھڑی نے تین چوتھائی گھنٹے کا اشارہ بجانا شروع کیا تھا تو ان دونوں نے تیسرے اشارے کے اعلان تک توقف کیا تھا، اور پھر، اپنی کوششیں شروع کرتے ہوئے ماتسیرات نے کہا تھا، "یہ تو ایک چوتھائی ہوا ہے" اور ماریا سے پوچھا تھا کہ جس طرح وہ کر رہا ہے، اس پسند ہے یا نہیں۔ ماریا نے کئی بار ہاں کہا تھا، اور اس سے احتیاط کرنے کے لیے بھی کہا۔ماتسیرات نے وعدہ کیا۔ماریا نے حکم، نہیں، التجا کی کہ وہ خاص کر بہت احتیاط کرے۔ماتسیرات نے پوچھا، کیا وقت آ گیا ہے۔ماریا نے کہا، ہاں، بہت جلد۔ اس وقت اس کے پیر میں اکڑن ہونے لگی ہوگی، جو صوفے سے نیچے لٹک رہا تھا، اس لیے اس نے اس نے ٹھوکر مارنے کے انداز میں اسے ہوا میں بلند کیا تھا، مگر اس کی چڈھی اس میں لٹک رہی تھی۔ماتسیرات نے پھر مخمل کے غلاف میں اپنے دانت گاڑ دیے اور وہ چلائی: ہٹو، اور وہ ہٹ جانا چاہتا تھا مگر ہٹ نہیں سکا اس لیے کہ ہٹنے سے پہلے آسکر اس کے اوپر سوار ہو گیا تھا، اس لیے کہ میں نے اپنے نقارے سے اس کی کمر کے نچلے حصے میں مارا تھا، اور اس پر چوب نقارہ سے ضرب لگا رہا تھا؛ اس لیے میں مزید "ہٹو، ہٹو" نہیں سننا چاہتا تھا، اس لیے کہ میرے نقارے کی آواز ان کی "ہٹو" سے زیادہ تیز تھی، اس لیے کہ میں اس کو ہٹنے کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا، جیسے کہ جان ہمیشہ میری ماں سے ہٹ جاتا تھا؛ کہ مما بھی ہمیشہ جان کو "ہٹو" اور ماتسیرات کو "ہٹو" اور "ہٹو ہٹو" کہتی رہتی تھی۔اور پھر یہ دونوں الگ ہو گئے مگر میں ان کو دیکھنا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں بہر حال اس وقت ہٹا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں باپ ہوں، ماتسیرات نہیں کہ وہ آخر وقت تک قیاس کرتا تھا کہ وہ میرا باپ تھا، مگر میرا باپ جان برانسکی تھا۔ جان وہاں ماتسیرات سے پہلے پہنچ گیا تھا اور ہٹا نہیں، وہ آخر

وقت تک وہیں ڈٹا رہا جہاں اس نے اپنا سب کچھ جمع کر دیا تھا، جو اس کے پاس تھا؛ میں نے جان بہ آنسکی سے ہی ماتسیرات سے آگے ہونے اور وہیں ڈٹے رہنے کی خاصیت ورثے میں پائی ہے۔اور جو کچھ اس سے نکلا ہے وہ میرا بیٹا ہے، اُس کا بیٹا نہیں ہے۔اس کے کبھی کوئی بیٹا ہوا ہی نہیں۔وہ اصلی باپ نہیں ہو سکتا، اگر اس نے بے چاری مما سے دس بار بھی شادی کی ہوتی، اور اگر وہ ماریا سے بھی شادی کر لیتا ہے تو اس لیے کہ وہ حاملہ ہے۔وہ جانتا تھا کہ پڑوس والے بھی یہی سوچتے ہوں گے۔بلا شبہ وہ سوچتے ہوں گے کہ ماتسیرات نے ماریا کو پچھاڑ دیا ہے، اسی وجہ سے وہ ماریا سے شادی کر رہا ہے حالاں کہ وہ صرف سترہ برس کی ہے جب کہ یہ پینتالیس کا ہونے والا ہے، مگر اپنی عمر کے حساب سے وہ بہت اچھی کام کرنے والی ہے، اور جہاں تک آسکر کا معاملہ ہے، تو وہ ایسی سوتیلی ماں پا کر بہت خوش ہوگا، اس لیے کہ ماریا بے چارے بچے سے سوتیلی ماں کا نہیں اصلی ماں کا سا سلوک کرتی ہے، اس کے باوجود کہ آسکر کا دماغ صحیح نہیں ہے، اور وہ 'سِلبر ہامَر' یا 'تاپیاؤ' کے پاگل خانے میں رہتا ہے۔

گریچن شیفلر کے مشورے پر، ماتسیرات نے میری معشوقہ سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔اگر ہم میرے قیاسی باپ کو میرا باپ سمجھتے ہیں تو اس سے لامحالہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میرے باپ نے میری ہونے والی بیوی سے شادی رچا لی ہے، میرے بیٹے کُرٹ کو اپنا بیٹا کہتا ہے، اور مجھ سے توقع کرتا ہے کہ میں اس کے پوتے کو اپنا نصف برادر سمجھوں، کہ میں ونیلا کی خوش بو والی اپنی ڈارلنگ کو اپنی سوتیلی ماں سمجھوں، اور ماتسیرات کے بستر میں اس کی موجودگی کو برداشت کر لوں، جس میں سے مچھلی کے انڈوں کی بساند آتی ہے، لیکن اگر سچائی سے زیادہ مطابقت کے ساتھ یہ کہوں کہ: ماتسیرات تو تمھارا قیاسی باپ بھی نہیں، تمھارے لیے تو وہ مکمل طور پر اجنبی ہے، جو پسند یا ناپسند کا بھی حق دار نہیں، جو اچھا باورچی ہے، جو اچھے پکانے کی صلاحیت کے باعث اب تک کچھ معنوں میں تمھارا باپ بنا رہا ہے، اس لیے کہ تمھاری بے چاری مما نے اس کو تمھارے حوالے کیا تھا، جس نے آج سب کے سامنے سب سے اچھی عورت کو تم سے چھین لیا ہے، جو تم کو اس کی شادی کا گواہ بننے پر مجبور کر رہا ہے، اور پانچ ماہ بعد دو خاندانوں کی جانب سے ایک بپتسمے کی تقریب میں تمھیں مہمان کا کردار ادا کرنا

ہوگا، جب کہ سچ پوچھا جائے تو تمھیں میزبان ہونا چاہیے، اس لیے کہ تمھیں ماریا کو نئی بال لے جانا چاہیے، کہ تم نے ہی بچے کے گاڈ فادر اور گاڈ مدر چُنے۔ جب میں اس المیے کے کرداروں کے غلط انتخاب پر غور کرتا ہوں تو مجھے تھیٹر سے مایوس ہونا پڑتا ہے، کہ آسکر، اصل ہیرو کو ایکسٹرا کے کردار میں پیش کیا گیا ہے، جسے بہتر تھا کہ الگ کر دیا جاتا۔

مگر قبل اس کے کہ میں اپنے بیٹے کو گریٹ کا نام دوں، پہلے اسے نام نہیں دیا گیا تھا، اس لیے کہ اسے نام نہیں دیا جانا چاہیے تھا — اس لیے کہ میں اس کو اس کے پردادا ونسنٹ برانسکی کا نام دینا چاہتا تھا — قبل اس کے کہ میں خود کو گریٹ سے الگ کرلوں، آسکر آپ کو بتانا اپنی ذمے داری سمجھتا ہے کہ اس نے کس طرح ماریا کے حمل کے دوران اس متوقع واقعے کے خلاف اپنا دفاع کیا تھا۔

عین اسی دن شام کو۔ جب میں نے دونوں کو صوفے پر حیران کر دیا تھا، اس دن جب میں ماتسیرات کی پسینے میں نہائی ہوئی پیٹھ پر بیٹھا نقارہ نوازی کر رہا تھا اور ماریا کی طلب کردہ احتیاط کو باطل کر دیا تھا، میں نے اپنی معشوق کو واپس جیت لینے کی جان توڑ کوشش کی تھی۔

جب بہت دیر ہوگئی تو ماتسیرات مجھے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں، اس نے مجھے مارا بھی تھا۔ ماریا نے آسکر کو اپنی پناہ میں لے لیا تھا اور ماتسیرات کو اس کا خیال نہ رکھنے پر ملامت بھی کی تھی۔ ماتسیرات نے ایک بوڑھے آدمی کی طرح اپنا دفاع کیا تھا۔ اس نے احتجاج کیا تھا، کہ یہ ماریا کی غلطی تھی، کہ اسے ایک بار میں ہی مطمئن ہو جانا چاہیے تھا، مگر اس کے لیے تو یہ بھی کافی نہیں ہوا تھا ماریا روئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ اس کے ساتھ، اندر باہر، چیزیں زیادہ تیزی سے نہیں ہوئیں ہیں، اور قبل اس کے کہ آپ کچھ کہیں، ماتسیرات کو کسی اور کو لینا چاہیے تھا، جی ہاں، ماریا نے اقرار کیا تھا کہ وہ نا تجربے کار تھی، مگر اس کی بہن گسٹے جو 'ایڈن' میں رہتی تھی، جانتی تھی کہ کیا ہوتا ہے اور کیسے ہوتا ہے اور اس نے سمجھایا تھا کہ اتنی جلدی نہ کرو، ماریا احتیاط کرو، کچھ مرد تو محض اپنی ریزش نکالنا چاہتے ہیں، کہ یہ عمل جتنی جلد ختم ہو اتنا ہی بہتر ہوتا ہے، اور ایسا دکھائی دیتا ہے کہ ماتسیرات اسی قسم کا آدمی تھا، مگر اب کے بعد وہ ماریا پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا، کہ پچھلی دفعہ کی طرح ماریا کی گھنٹی کو بھی تو بجنا چاہیے تھا۔ مگر اسی طرح ماتسیرات کو بھی

محتاط ہونا چاہیے تھا، کہ اس کی بھی کچھ ذمے داری تھی۔ پھر جب ماریا زیادہ رونے لگی اور صوفے پر ہی بیٹھی رہی اور ابھی ماتسیرات اپنے زیر جامے میں ہی تھا، وہ چلانے لگا تھا کہ وہ اس کے رونے دھونے کی مزید پروا نہیں کر سکتا: پھر اس نے معذرت کی تھی کہ اس کو غصہ آ گیا تھا اور ایک بار پھر غلطی ہو گئی تھی، اس نے اس کے برہنہ عقب کو اس کے لباس کے اندر ہی تھپتھپانے کی کوشش کی تھی، اور اس بات نے تو ماریا کو اور بھی غصہ دلا دیا تھا۔

آسکر نے اس کو کبھی اس کیفیت میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کے پورے چہرے پر سُرخ دھبے پڑ گئے تھے اور اس کی بھوری آنکھوں کا رنگ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ اس نے ماتسیرات کو زنخا ہونے کا طعنہ دیا تھا، جس پر اس نے اپنا پتلون اُٹھایا، پہنا اور بٹن بند کر لیے۔ وہ اپنی پوری قوت سے چیخی تھی۔ وہ ہر بات کی صفائی پیش کر سکتا تھا، وہ سارے کے سارے جلد پچکاری مارنے گروہ میں یعنی اپنے یونٹ کے رہنماؤں میں، شامل ہو سکتا تھا۔ ماتسیرات نے اپنا کوٹ اُٹھایا دروازے کے ہینڈل پر گرفت مضبوط کی، تبدیلیاں ہوں گی، اس نے ماریا کو یقین دلایا کہ اس کے لیے عورتوں کی کمی نہیں: اور اگر وہ اتنی گرم ہے تو اس نے کسی غیر ملکی مزدور سے اپنی کُپیا کیوں نہیں پھنسا لی تھی، فرانس والے جو بیئر لاتے تھے، یقینی طور پر بہتر کر سکتے تھے۔ ماتسیرات کے نزدیک محبت کا مطلب تھا، خود غرضی سے بھی کچھ زیادہ، وہ skat کھیلنے چلا، skat کے کھیل میں، کم از کم آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس سے کیا توقع کی جا سکتی تھی۔

اور پھر میں ماریا کے ساتھ بیٹھک میں تنہا رہ گیا۔ اس نے رونا بند کر دیا تھا اور غور و فکر کرتے ہوئے اپنی چڈھی چڑھاتے ہوئے سیٹی بجائی مگر بہت کفایت شعاری سے۔ بڑی دیر تک وہ اپنے کپڑوں کی شکنیں درست کرتی رہی جو صوفے پر پڑے رہے تھے۔ پھر اس نے ریڈیو کھول دیا اور 'وِستولا' اور 'نوگاٹ' کے پانیوں کی سطح کے بارے میں اعلانات سننے کی کوشش کی۔ جب پانی کی سطح کے اعلان کے بعد، بولنے والے نے والز بجانے کا وعدہ کیا، اور اس کا وعدہ فوراً ہی پورا ہو گیا تو اس نے اچانک پھر اپنی چڈھی اُتار دی، باورچی خانے میں گئی، بیسن کا نلکا کھولا: میں نے گیس کے بھڑکنے آواز سن کر اندازہ لگایا تھا کہ ماریا ٹب میں بیٹھ کر نہانا چاہتی ہے۔

اس نا گوار تصور کو زائل کرنے کی غرض سے آسکر نے والز کی دھن پر غور شروع کر دیا۔ اگر میرا حافظہ غلط نہیں، تو میں نے اِسٹراؤس کے کچھ نغمے بجا کر لطف لیا تھا۔ پھر ایک خاص اعلان کے لیے والز کو روک دیا گیا۔ آسکر نے اٹلانٹک سے آنے والی خبروں پر شرط لگائی تھی اور وہ غلط نہیں تھا۔ کئی یو بوٹ آئرلینڈ کے مغربی ساحل پر نہ جانے کتنے ہزار ٹن کے سات یا آٹھ جہاز ڈبونے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ آبدوز کشتیوں کے ایک گروہ نے تقریباً اتنے ہی ٹن سمندر کی تہوں میں پہنچا دیے تھے۔ وہ لیفٹیننٹ شیپکے تھا یا شاید لیفٹیننٹ کریشمر یا کوئی تیسرا کسی آبدوز کشتی کا انتاہی مشہور کپتان، جس کی کمان میں ایک یو بوٹ نے نہ صرف بہت سارے ٹن ڈبو دیے تھے، بلکہ برطانیہ کا XY درجے کا ایک جنگی جہاز بھی ڈبو دیا تھا۔

جب میرے نقارے نے کہیں سے "Sailing against England" اُٹھا لیا تھا اور اس کو تقریباً بالکل والز میں تبدیل کر دیا، تو ماریا اپنے بغل میں ایک فرکش ناول دبائے بیٹھک میں داخل ہوئی۔ اس نے مدھم آواز میں کہا "تم نے سُنا، آسکر، ایک اور خاص اعلان۔ اگر یہ اسی طرح کرتے رہے تو......"

آسکر کو بتائے بغیر کہ اگر یہ لوگ اسی طرح کرتے رہے تو کیا ہوگا، ماریا اس کرسی پر بیٹھ گئی جس پر ماتسیرات عموماً اپنی جیکٹ ٹانگا کرتا تھا۔ اس نے بھیگے ہوئے تولیے کو مروڑ کر سا سیج کی صورت بنایا اور ریڈیو کے ساتھ ساتھ اپنی سیٹی پر "Sailing against England" دھن بجانے لگی۔ اس کی دھن زیادہ اونچی آواز میں تھی۔ ریڈیو بند ہو جانے کے بعد اس نے آخری کورس کو ایک بار پھر سیٹی پر بجایا۔ اس نے سا سیج بنائی ہوئی تولیے کو میز پر چھوڑ دیا، بیٹھ گئی اور اپنے پیارے ہاتھوں کو اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔

ہماری بیٹھک میں گہرا سناٹا چھا گیا تھا، صرف گرانڈ فادر کلاک تیز اور تیز تر بول رہی تھی اور ایسا لگتا تھا گویا ماریا یہ سوچ رہی تھی کہ یہ بہتر نہیں ہوگا کہ دوبارہ ریڈیو کھول دیا جائے، مگر پھر اس نے ایک اور فیصلہ کیا۔ اس نے میز پر رکھی سا سیج تولیے پر اپنا چہرہ رکھ دیا، اپنے ہاتھوں کو گھٹنوں کے درمیان، قالین کی طرف، لٹکنے دیا اور آہستہ آہستہ خاموشی سے رونا شروع کر دیا۔

آسکر سوچنے لگا کہ شاید ماریا گھبرا دینے والے حالات کے باعث، جن میں وہ

پائی گئی تھی، شرمندہ ہو رہی ہے۔ میں نے اس کی ہمت بندھانے کا فیصلہ کیا؛ میں کمرے سے اندھیری دُکان میں پہنچا، موٹی کاغذ اور پڈنگ کی تھیلیوں کے قریب ہی مجھے ایک شے مل گئی جو راہداری کی روشنی میں ووڈ رَف کے مزے اور خوش بو کے فِز پاوڈر کی تھیلی نکلی۔ آسکر اپنی اندھی پسند پر بہت خوش ہوا، اس لیے کہ اس وقت مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ماریا تمام خوش بوؤں کے مقابلے میں ووڈ رَف کو ترجیح دے گی۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو ماریا کا داہنا رخسار اس موڑے ہوئے تولیے پر تھا۔ اس کے بازو اب بھی زانوؤں کے درمیان لٹک رہے تھے۔ آسکر بائیں جانب سے اس کے قریب گیا اور اس کو یہ دیکھ کر کہ اس کے آنکھیں بند اور خشک تھیں، مایوسی ہوئی۔ میں اس وقت تک صبر سے انتظار کرتا رہا جب تک اس کی چپکنے والی پلکیں کھل نہیں گئیں، اور پھر اس کو تھیلی پیش کی، مگر اس کو ووڈ رَف نہیں نظر آیا۔ اس وقت وہ تھیلی اور آسکر دونوں کے پار دیکھ رہی تھی۔ آنسوؤں نے اس کو اندھا کر دیا ہوگا، میں نے سوچا، اس لیے میں اُسے معاف کر دینا چاہتا تھا، مگر ایک لمحے کے غور و خوض کے بعد میں نے براہِ راست اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ آسکر میز کے نیچے رینگ گیا اور ماریا کے پیروں سے لپٹ گیا -- اس کا انگوٹھا ذرا سا اندر کی طرف مُڑا ہوا تھا — اس کا لٹکا ہوا ایک ہاتھ پکڑا، اس کو اُس وقت تک موڑتا رہا کہ اس کی ہتھیلی سامنے آ گئی، اپنے دانتوں سے تھیلی پھاڑی اور، اس کے اندر کے سامان کی آدھی مقدار اس کی ہتھیلی کے پیالے میں ڈال دی، اور اس میں اپنا لعابِ دہن ملا دیا۔ جوں ہی پاوڈر نے جھاگ کی صورت اختیار کرنی شروع کی، میرے سینے میں ایک تیز ٹھوکر لگی اور آسکر میز کے نیچے پیٹ کے بل گر پڑا۔

درد کے باوجود، ایک لمحے کے اندر ہی میں میز کے نیچے سے نکل کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا تھا۔ ماریا بھی کھڑی ہو گئی؛ ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے، لمبی لمبی سانسیں لے رہے تھے۔ ماریا نے تولیا اُٹھایا، اپنے ہاتھ صاف کیے اور تولیے کو میرے قدموں میں ڈال دیا؛ اس نے مجھے منحوس سؤر اور چال باز بونا کہا، جس کو پاگل خانے بھیج دیا جانا چاہیے۔ اس نے مجھے پکڑ لیا، میرے سر کے پچھلے حصے پر ایک تڑی لگائی، میری بے چارگی

مما کو مجھ جیسے لونڈے کو جنم دینے پر لعنت ملامت بھی کی ۔ میں بیٹھک کی، بلکہ پوری دنیا کے تمام شیشے کی اشیا کے خلاف جنگ کے لیے چیخنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اس نے میرے منہ میں پورا تولیا ٹھونس دیا۔ میں نے دانت کاٹا تو وہ تولیا تو اُبلے ہوئے گائے کے سخت گوشت سے بھی زیادہ سخت نکلا۔ جب آسکر نے خود کو نیلا اور سرخ کرنا شروع کیا تب ہی اس نے میری جان چھوڑی تھی ۔ میں بہت آسانی سے چیخ مار کر کمرے کی تمام شیشے کی اشیا اور کھڑکیوں کے شیشوں کو توڑ سکتا تھا اور اپنے بچپنے کے حملے کو گرانڈ فادر کلاک کے ڈائل کے شیشے پر آزما سکتا تھا، مگر میں چیخا نہیں۔ میں نے اپنے دل کے پھاٹک کو ایسی گہری بیٹھ جانے والی نفرت کے لیے کھول دیا ہے، کہ جب بھی ماریا کمرے میں داخل ہوتی ہے تو میں اس نفرت کو تولیے کی مانند اپنے دانتوں میں وہی محسوس کرنے لگتا ہوں۔

بڑی موجی لڑکی ہے ماریا بھی! اس نے سارا غصہ بھلا دیا ۔ وہ بہت محبت کے انداز میں ہنسی اور اک دم پھر ریڈیو کھول دیا۔ ریڈیو کے والٹز کی دھن کی سیٹی بجاتی میری طرف آئی، دوبارہ دوستی استوار کرنے کے لیے اور میرے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

آسکر نے اس کو بہت قریب آنے دیا، پھر اس نے اپنے دونوں تلوں سے بالکل اسی جگہ پر وار کیا جہاں اس نے ماتسیرات کا مکا سہا تھا۔ قبل اس کے کہ میں ایک بار پھر وار کرتا، اس نے میری مٹھیاں پکڑ لیں، جس کے بعد میں نے اسی منحوس جگہ پر اپنے دانت گاڑ دیے اور اس سے چمٹا ہوا، ماریا کے ساتھ صوفے پر گر گیا۔ ریڈیو ایک اور خاص اعلان کر رہا تھا، مگر آسکر کو سننے کی کوئی خواہش نہیں تھی: لہٰذا، وہ آپ کو بتا نہیں سکتا کہ کس نے کیا داخل کیا تھا، اور کتنا، اس لیے کہ آنسوؤں کے دورے نے میرے جبڑوں کو ڈھیلا کر دیا تھا، اور میں ماریا پر بے سدھ پڑا تھا؛ وہ درد سے کراہ رہی تھی، جب کہ آسکر نفرت اور محبت دونوں کیفیات کے ساتھ رو رہا تھا جو سخت مجبوری میں تبدیل ہو گئی تھی، مگر مر نہیں سکی۔

# آسکر کی محتاجی اور مسز گریف

گریف کبھی مجھے اچھا نہیں لگا۔ گریف بھی مجھے پسند نہیں کرتا تھا۔ بعد میں بھی، جب گریف نے میرے لیے نقارہ نوازی کی مشین بنا دی تھی، وہ مجھے پسند نہیں تھا۔ دیر پا نفرتوں کو تحمل کی ضرورت ہوا کرتی ہے، آسکر جس سے بالکل خالی تھا، پھر بھی میں گریف کی زیادہ پروا نہیں کرتا: اب بھی جب گریف کا وجود باقی نہیں رہا۔

گریف کی سبزی کی دُکان تھی، مگر آپ دھوکے میں نہ آیئے گا۔ وہ نہ آلوؤں پر یقین رکھتا تھا نہ کرم کلے پر، اس کے باوجود وہ سبزی اُگانے کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا اور وہ خود کو باغبان، فطرت کا دوست اور سبزی خور سمجھتا تھا۔ وہ گوشت بالکل نہیں کھاتا تھا، پھر بھی تصدیق شدہ سبزی فروش نہیں تھا۔ اس کے لیے سبزی کے بارے میں سبزی بن کر بات کرنا ممکن نہیں تھا۔ ''مہربانی کر کے ذرا اس غیر معمولی آلو پر نظر ڈالیے'' میں اُسے اکثر گاہک سے اس قسم کی بات کہتے سنتا تھا ''پھولتا، پھٹتا سبزی کا یہ اندرون ہمیشہ نیا روپ بھرتا ہے پھر بھی پاک دامن رہتا ہے۔ میں آلو سے اس لیے پیار کرتا ہوں کہ یہ مجھ سے باتیں کرتا ہے۔'' ظاہر ہے کوئی بھی سبزی فروش اس قسم کی باتوں سے اپنے گاہک کو پریشان نہیں کرنا چاہے گا۔ آلو کی بہترین فصل کے برسوں میں بھی، میری نانی اماں انا کولیاچکی نے، جس کی عمر آلو اُگانے میں گزری ہے، ان الفاظ سے زیادہ کبھی نہیں کہے گی: ''جی ہاں! پچھلے برس کے مقابلے میں اس برس کے آلو ذرا بڑے ہیں۔'' اس کے باوجود انا کولیاچکی

اور اس کا بھائی وِنسِنٹ برانسکی ، گریف کے مقابلے میں آلو کی فصل پر زیادہ انحصار کرتے تھے، اس لیے کہ ان کے کاروبار میں ایک برس کی اچھی فصل کسی خراب برس کی فصل کے نقصان کو پورا کردیتی تھی۔

گریف ہر چیز میں زیادتی کرتا تھا۔کیا اس کے لیے دُکان میں سبز رنگ کا ایپرن پہننا ضروری تھا؟ بس، اُس میں ایک طرح کا انسانی ظن تھا۔وہ پالک کے رنگ کے چیتھڑے کو "خدائی سبزی فروش کا ایپرن" کہہ کر اس کی تشریح کے لیے اپنے لبوں پر نہایت عالمانہ تبسم سجا لیتا تھا۔بدترین بات یہ تھی کہ وہ بوائے اسکاؤٹنگ ترک کرنے پر راضی نہیں تھا۔

1938 میں اس کو اپنے گروپ کو توڑنا پڑا تھا—اس کے اسکاؤٹ لڑکوں کو کھتئی رنگ کی قمیص یا چمک دار سیاہ رنگ کی موسمِ سرما کی وردی پہننی پڑتی تھی--مگر سابق اسکاؤٹ اپنے سابق اسکاؤٹ لیڈر سے ملنے ، عام لباس میں یا اپنی نئی وردی میں، صبح کے گیت، شام کے گیت، پہاڑ چڑھائی کے گیت، فوجی گیت، فصلی گیت، کنواری کے حمدیہ گیت، عوامی گیت، مقامی گیت اور غیر ملکی گیت گانے باقاعدہ آیا کرتے تھے۔چوں کہ گریف نیشنل موٹرسٹ کور میں شامل ہو گیا تھا ، جب کہ اس کو بہت دیر ہو چکی تھی، اور 1941 سے اس نے خود کو نہ صرف سبزی فروش بلکہ ایئر وارڈن بھی تصور کر لیا تھا، اس کے بعد سے ،اسے دو سابق اسکاؤٹوں کی حمایت بھی حاصل ہو گئی تھی؛انھوں نے اس دوران اپنے لیے ہٹلر یوتھ میں عہدے بھی بنا لیے تھے، ایک اسکواڈ لیڈر بن گیا تھا، دوسرا پلاٹون لیڈر؛گریف کے آلوؤں کے تہہ خانے میں گیتوں کی دعوتیں بھی برداشت کر لی گئی تھیں، اگر چہ پارٹی کے ضلعی دفاتر سے ان کی منظوری نہیں تھی۔ضلعی تربیت کے سربراہ،لوبزاک نے گریف کو جینکاؤ کے قلعے میں تربیت کے دوران گیتوں کے میلے منعقد کرنے کے لیے بھی کہا تھا۔1940 کی ابتدا میں، گریف کو اور کسی ایک اور استاد کو مغربی پروشیا کے ضلع دانشِگ کے نوجوانوں کے لیے گیتوں کی کتاب کی تالیف کی ذمے داری دی گئی تھی جس کا عنوان تھا، ''آؤ ہم سب مل کر گائیں۔'' یہ کتاب بہت کامیاب ہوئی تھی۔سبزی فروش کو برلن سے، رائخ یوتھ لیڈر کا دستخط شدہ ایک خط بھی ملا تھا اور اس کو برلن میں گیتوں کے

لیڈروں کے اجتماع میں شرکت کی دعوت بھی دی گئی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ گریف میں صلاحیت تھی۔اس کو تمام گیتوں کی ہر سطر یاد تھی؛ وہ خیمے گاڑ سکتا تھا، وہ جنگل میں آگ لگائے بغیر، کیمپ فائر شروع کر سکتا تھا، بجھا سکتا تھا اور قطب نما کی مدد سے جنگل میں راستے بھی تلاش کر سکتا تھا، اس کو نظر آنے والے تمام ستاروں کے نام معلوم تھے؛ وہ تفریحی اور جذبے ابھارنے والی کہانیاں شروع کر سکتا تھا جو کبھی ختم نہیں ہوتی تھیں؛ اسے 'دستولا' کے اساتیر کا علم تھا؛ اس نے "Danzig and the Hanseatic League." پر لیکچر بھی دیے تھے۔وہ Teutonic Knights کے تمام گرانڈ ماسٹروں کی، مع تاریخ، فہرست بنا سکتا تھا؛ اس نے محض اسی پر اکتفا نہیں کی تھی؛ وہ جرمن مہمات پر گھنٹوں لیکچر دے سکتا تھا، اور ایسا شاذ ہی ہوتا تھا کہ اس کے لیکچروں میں آنے والے بوائے اسکاؤٹوں کے بارے میں اس کی زبان پر کوئی سخت کلمہ آئے۔

گریف نوجوانوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ وہ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کو پسند کرتا تھا۔ دراصل وہ لڑکیوں کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا، اسے صرف لڑکوں ہی میں دل چسپی تھی۔شاید اس کی وجہ مسز گریف تھی، ایک بے سلیقہ عورت، جس کی چولی چکنائی بھری اور جس کی چڈھی میں سوراخ ہوتے تھے، جنھوں نے گریف کو زیادہ خالص محبت کی طرف راغب کر دیا تھا جو اس کو دُبلے پتلے، صاف ستھرے لڑکوں میں ملتی تھی۔اس کے برعکس اس شجر کی ایک اور جڑ تھی جس کی شاخوں پر مسز گریف کی گندی چڈھیاں سال کے ہر موسم میں پھول دیتی رہتی تھیں، یعنی شاید مسز گریف اس لیے بد سلیقہ ہو گئی تھی کہ سبزی فروش اور ایرواروڈن شوہر میں اس کے لاپروا اور احمقانہ موٹاپے کے لیے قدر دانی کا احساس نہیں رہ گیا تھا۔گریف کو وہ چیز پسند ہوتی تھی جو سخت، تنی ہوئی اور پٹھے دار ہو۔ جب وہ لفظ ''فطری'' کہتا تھا تو اس کی مراد تقوی یا پرہیزگاری ہوتی تھی۔ جب وہ تقوی کہتا تھا تو اس مراد ایک خاص قسم کی جسمانی تہذیب یا کاشت ہوتی تھی۔گریف اپنے جسم کے موضوع کا ماہر تھا۔وہ اس کا تفصیل سے خیال رکھتا تھا، یعنی اس کو حرارت سے دوچار کرتا اور خاص قسم کی ایجاد سے ٹھنڈک پہنچاتا۔جب کہ آسکر آس پاس کے شیشوں کو گانے کے ذریعے ٹکڑے

کر دیتا، کبھی کبھی کھڑکیوں کے شیشوں پر جمے پالے سے بنے پھول جیسے نقش کو پگھلا دیتا، چھتوں سے لٹکی برف سے بنی قلموں کو اُن کی جڑ کے پاس سے پگھلا کر زمین پر گرا دیتا، جب کہ سبزی فروش برف پر قریب سے اور دستی اوزار کے ذریعے حملہ کرتا تھا۔ گریف برف میں سوراخ کرتا تھا۔ دسمبر، جنوری، فروری میں، وہ کلھاڑے سے سوراخ بناتا تھا۔ طلوعِ فجر سے بہت پہلے وہ تہہ خانے سے اپنی بائیسکل نکالتا اور برف کاٹنے والے کلھاڑے کو پیاز کے خالی بورے میں لپیٹ لیتا تھا۔ تب وہ بائیسکل پر سوار ہو کر، 'ساسپے' سے ہوتا ہوا 'برُوسن' اور 'گلیٹکاؤ' جاتا، جہاں سے برف سے ڈھکی ساحلی تفریحی سڑک سے 'گلیٹکاؤ' کا رُخ کرتا۔ 'برُوسن' اور 'گلیٹکاؤ' کے درمیان وہ بائیسکل سے اُتر جاتا اور جب آہستہ آہستہ سویرا ہوتا تو وہ اپنی بائیسکل برفیلے ساحل پر دھکیلتا ہوا، دو یا تین سو گز دور تک، برف سے جمے ہوئے بحرِ بالٹک پر چلا جاتا۔ وہاں کا منظر ساحلی کہرے میں ڈوبا ہوا ہوتا۔ ساحل سے کوئی بھی گریف کو دیکھ نہیں سکتا تھا، جب وہ اپنی بائیسکل ایک طرف لٹا کر، پیاز کے بورے میں لپٹے ہوئے کلھاڑے کو نکالتا، چند لمحے عقیدت بھری خاموشی اختیار کرتا، سمندری راستوں میں پھنسے ہوئے مال بردار جہازوں کے کہر میں بجائے جانے والے بھونپو کی آوازیں سنتا۔ پھر اپنا فرغل اُتار پھینکتا، مختصر سی ورزش کرتا اور آخر میں، منجمد بحرِ بالٹک کی برف میں دائرہ نما سوراخ بنانے کے لیے آہستہ آہستہ مگر طاقت ور ضرب لگانا شروع کر دیتا۔

اس سوراخ کو بنانے میں گریف کو پون گھنٹا لگتا تھا۔ پلیز، مجھ سے یہ نہ پوچھیے کہ میں یہ سب کس طرح جان لیتا تھا۔ ان دنوں آسکر کو ہر بات کی خبر ہوتی تھی، جس میں اس وقت کی طوالت بھی شامل ہوتی تھی جو سوراخ بنانے میں صرف ہوتا تھا۔ اس کی اونچی، غیر ہموار پیشانی پر نمک کے پسینے کے قطرے بنتے اور ہوا میں اُڑ کر برف پر گر جاتے تھے۔ وہ کلھاڑا چلانا اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی ضربیں دائرے نما نشانات بناتیں۔ اور جب پورا دائرہ بن جاتا تو اس کا بغیر دستانے کا ہاتھ، دائرہ کٹنے کے باعث بن جانے والی ڈسک کو، جو شاید چھ یا سات انچ موٹی ہوتی تھی، لامتناہی برف چادر سے نکال لیتا تھا، جس کا پھیلاؤ، اگر سویڈن تک نہیں تو 'ہیلا' تک ضرور پہنچتا تھا۔ اس دائرے کے اندر کا پانی پُرانا اور بھورے

رنگ کا ہوتا تھا، جو برف میں پھینکے گئے ریتیلے نمک کی وجہ سے ہو جاتا تھا۔ اس میں سے ہلکی سی بھاپ سی نکلتی، مگر وہ کسی گرم چشمے کی وجہ سے نہیں ہوتی تھی۔ یہ سوراخ مچھلیوں کی دلچسپی کا باعث ہوتا تھا۔ کہتے ہیں کہ برف میں سوراخ کے اطراف مچھلیاں جمع ہونے لگتی ہیں۔ گریف lamprey یا بیس پاؤنڈ کی cod پکڑ سکتا تھا، مگر اس نے کبھی مچھلی نہیں ماری۔ وہ اپنا لباس اتارتا اور جلد ہی مادرزاد ننگا ہو جاتا، کہ گریف کی برہنگی ہمیشہ مکمل ہوتی تھی۔

آسکر آپ کی ریڑھ کی ہڈی میں موسم سرما کی تھرتھری دوڑانا نہیں چاہتا۔ موسم کے پیشِ نظر وہ ایک طویل قصے کو مختصر کر رہا ہے: سرما کے مہینوں میں، ہفتے میں دو بار گریف سبزی فروش بالٹک میں نہاتا تھا۔ ہر چہار شنبے کو وہ طلوعِ فجر کے وقت اکیلا نہاتا تھا۔ وہ صبح کے چھ بجے گھر سے چل پڑتا، آدھے گھنٹے بعد منزلِ مقصود پر پہنچتا، ساڑھے سات بجے تک سوراخ بناتا تھا۔ تب وہ تیز اور مسلسل حرکات سے اپنے کپڑے پھاڑتا، اپنے جسم پر برف ملتا، برف کے سوراخ میں کود جاتا، اور جب اس میں پہنچتا تو چلانا شروع کر دیتا تھا۔ یا ہم کبھی اس کو "جنگلی بطیں رات بھر اُڑتی ہیں" یا "اف! ہم طوفان سے کتنی محبت کرتے ہیں......" گانا گاتے سنتے، جنھیں وہ دو منٹ، یا زیادہ سے زیادہ تین منٹ تک گاتا، چلاتا اور نہاتا رہتا تھا۔ پھر ایک چھلانگ اور وہ برف پر کھڑا، سفید برف میں کھڑا خوف زدہ کر دینے والا وجود، بھاپ اُڑاتا، جھینگے نما گوشت کا ڈھیر، سوراخ کے اطراف دوڑتا، دمکتا، مگر چلاتا رہتا۔ آخر میں، ایک بار پھر لباس پہن لیتا اور اپنی بائیسکل پر واپس روانہ ہو جاتا۔ آٹھ بجے صبح سے کچھ پہلے وہ 'لیبس ویگ' پہنچ جاتا اور بالکل بر وقت اپنی دُکان کھول دیتا تھا۔

گریف کا دوسرا ہفتہ وار اشنان اتوار کے دن، کئی لڑکوں، نوجوانوں یا جوان مردوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ آسکر نے اس کو نہ کبھی دیکھا ہے اور نہ دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے، مگر ایسی باتوں کی اطلاع پہنچ ہی جاتی ہے۔ موسیقار 'مین' کو سبزی فروش کی ساری کہانیاں معلوم تھیں اور وہ سارے محلے میں اس کا بگل بجاتا پھرتا تھا۔ بگل بجائی کہانیوں میں سے ایک کہانی یہ تھی کہ سرما کے مہینوں میں ہر اتوار، خوف ناک ترین موسم کے باوجود گریف کئی لڑکوں کی صحبت میں نہاتا ہے، مگر 'مین' نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ گریف اپنی طرح لڑکوں کو

برف کے سوراخ میں ننگا کودنے کے لیے کہتا ہے۔وہ بے حد مطمئن ہوگا اگر، کم زور اور طاقت ور، دونوں اس کے ساتھ نیم برہنہ یا مکمل برہنہ، برف پر اچھلتے اور ایک دوسرے پر برف ملتے رہیں۔ یہ نوجوان لڑکے برف میں اس کو اتنے پسند آتے تھے کہ اشنان کے پہلے اور بعد میں بھی، کبھی کبھی، وہ بھی اچھل کود کرنے لگتا اور آپس میں ایک دوسرے پر برف ملنے میں معاونت کرتا۔ یا پورے گروہ کو اجازت دیتا کہ وہ سب مل کر اس کے جسم پر برف ملتے۔موسیقار 'مین' دعویٰ کرتا ہے کہ باوجود دائمی کہر کے، اس نے ایک بار یہ سب، 'گلٹکاؤ' کے ساحل کی تفریح گاہ سے دیکھا تھا؛ اتنے خوف ناک انداز میں برہنہ، گاتے، چلّاتے ہوئے گریف اپنے برہنہ شاگردوں میں سے دو، برہنہ بالائے برہنہ، کو اٹھائے ہوئے دہاڑتا، عالمِ اضطراب میں منجمد بالٹک کی سطح پر دوڑ رہا تھا۔

یہ قیاس کر لینا بہت آسان ہے کہ گریف کسی مچھیرے کا بیٹا نہیں، حالاں کہ 'برؤیسن' اور 'نیو فار واٹر' میں گریف نام کے بہت سے مچھیرے رہتے تھے۔گریف سبزی فروش کا تعلق 'ٹیگن ہوف' سے تھا مگر لینا گریف-بارٹش سے اس کی ملاقات 'پراؤسٹ' میں ہوئی تھی۔ وہاں، ان دونوں نے ایک مہم جو پادری کی، زیرِ تربیت ملازمین کا کلب چلانے میں مدد کی تھی، اسی پادری کی خاطر 'لینا' ہر سنیچر کے دن پیرش ہاؤس جاتی تھی۔ کسی سرسری لی جانے والی تصویر میں، جو لینا ہی نے مجھے دی ہوگی، جو اَب بھی میرے البم میں موجود ہے، لینا، بیس برس کی عمر میں، خاصی توانا، بھرے بھرے جسم کی اور کھوئی کھوئی سی لڑکی نظر آتی تھی۔اس کا باپ، سینٹ البریخت کے ایک چھوٹے سے باغیچے میں پھل اور ترکاریاں کاشت کرتا تھا۔ جیسا کہ بعد میں ہر ممکن موقعوں پر اس نے بتایا تھا کہ وہ بالکل ناتجربے کار تھی جب صرف تیئیس برس کی عمر میں اس نے، پادری کے مشورے پر، گریف سے شادی کر لی تھی۔اس کے باپ کے سرمایے سے انھوں نے 'لانگ فوز' میں سبزی کی ایک دُکان کھول لی تھی۔چوں کہ لینا کا باپ اس کی دُکان کی بیشتر سبزی اور تمام پھل کم قیمت پر فراہم کرتا تھا، ان کا کاروبار فی الواقع اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا تھا اور گریف اس کو کم نقصان پہنچا سکتا تھا۔گریف میں بچکانہ میکانکی اختراعات کرنے کا ذہنی جھکاؤ نہ ہوتا تو

اس دُکان کو سونے کی کان بنا دیا ہوتا، ایسے اچھے علاقے میں، جہاں کوئی کاروباری رقابت نہ ہوتی اور وہ کسی مضافاتی علاقے میں ڈھیر سارے بچوں سمیت زندگی گزار رہے ہوتے۔ مگر جب سرکاری افسران نے تیسری یا چوتھی بار ان کی ترازو کا معائنہ کیا، ان کے باٹ ضبط کر لیے اور ان پر طرح طرح کے جرمانے کیے، تو گریف کے کچھ گاہک ان کی دُکان چھوڑ کر بازار سے خریداری کرنے لگے۔ گریف کی سبزیوں کے معیار میں کوئی خرابی نہیں تھی، انھوں نے کہا تھا، اور ان کی قیمتیں بھی بہت زیادہ نہیں تھیں، مگر ایک بار پھر انسپکٹر آن آدھمکے، کہ ضرور کچھ گڑبڑ کی جا رہی ہے۔

اب بھی مجھے یقین ہے کہ گریف کسی سے دھوکے بازی نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر پھر کچھ یوں ہوا، گریف کی آلو تولنے والی بڑی ترازو میں کچھ تبدیلیوں کے بعد ان کی ترازو کم تولنے کے بجائے زیادہ تولنے لگی تھی۔ اس کے نتیجے میں، جنگ کے شروع ہونے سے ذرا پہلے، اس نے اپنی ترازو میں ایسے سُریلے آلے لگا دیے تھے جو ہر تول کے بعد پائے جانے والے وزن کے مطابق گیت گانے لگتے تھے: ایک گاہک نے بیس پاؤنڈ آلو خریدا تو اضافے کے طور پر ترازو نے اس کو "On the Sunny Shores of the Saale" گا کر سنا دیا؛ پچاس پاؤنڈ آلو پر ترازو آپ سے کہتی تھی "Be True and Upright to the Grave"، اور اگر کوئی سردی کے زمانے کے کا ایک من آلو خریدتا تو ترازو معصومانہ اور دل فریب انداز میں Anne of Tharau کا مشہور نغمہ بجا دیتی تھی۔

حالاں کہ میں آسانی سے دیکھ سکتا تھا کہ یہ موسیقی محکمے کو پسند نہ آتی ہوگی، پھر بھی آسکر اس سبزی فروش کے چھوٹے چھوٹے شغل کے حق میں تھا۔ لینا گریف بھی اپنے شوہر کے سنکی پن میں شریک تھی، اس لیے کہ گریف کی شادی کا نچوڑ اور مال مسالا ایک دوسرے کی کم زوری کو برداشت کرنا تھا۔ ان معنوں میں گریف کی شادی ایک کامیاب شادی کہی جا سکتی تھی۔ گریف بیوی کو مارتا نہیں تھا، کبھی کسی عورت کے باعث اپنی بیوی سے بے وفائی نہیں کی، نہ وہ شراب پیتا تھا اور نہ بدکار تھا۔ وہ اچھے ذوق کا آدمی تھا، اچھے کپڑے پہنتا تھا اور اپنی ملنساری اور مددگاری کے باعث نہ صرف نوجوانوں، نوخیز لڑکوں میں، بلکہ اپنے ان

گاہکوں میں بھی پسند کیا جاتا تھا جو اس کے آلوؤں کی موسیقی کو برداشت کرتے تھے۔

اس طرح گریف بڑے صبر اور شفقت سے زندگی گزار رہا تھا، جب کہ سال بہ سال اس کی لینا بدسلیقہ اور بدبودار ہوتی جاتی تھی۔ مجھے گریف کا وہ مسکرانا اچھی طرح یاد ہے جب اس کے ہم درد دوست لینا کو بدسلیقہ کہتے، جب وہ لینا کو، اپنے ہم درد دوستوں کو بدسلیقہ کہتے سنتا تھا۔ اپنے ہاتھوں میں پھونک مار کر ملتے ہوئے، جو آلوؤں کے باوجود بھی اچھی حالت میں ہوتے تھے۔ وہ کبھی کبھی، میری سماعت کے مطابق، ماتسیرات سے کہتا تھا، جو ہمیشہ اپنی بیوی کو ملامت کرتا رہتا تھا، "تم بالکل صحیح کہتے ہو الفریڈ، ہماری پیاری لینا کبھی کبھی زیادتی کر جاتی ہے، مگر کیا ہم سب میں خامیاں نہیں ہوتیں؟" اگر ماتسیرات بات کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا تو گریف گفتگو کو سخت مگر دوستانہ انداز میں ختم کرتے ہوئے کہتا، "کچھ معاملات میں تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، مگر لینا اچھے دل کی عورت ہے، میں لینا کو جانتا ہوں۔"

ہوسکتا ہے کہ وہ جانتا رہا ہو، مگر لینا اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ پڑوسیوں اور گاہکوں کی طرح، اس نے بھی گریف کے، نوخیز ملاقاتیوں سے تعلقات میں سوائے دوستی اور نوجوانوں کو اچھی باتیں بتانے کے، کوئی غیر پیشہ ورانہ بات نہیں دیکھی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ گریف نہ مجھے کچھ سکھا سکتا ہے نہ مجھ میں ولولے کی آگ روشن کر سکتا ہے۔ دراصل آسکر اس کے مزاج کا آدمی نہیں۔ اگر میں اپنی نشو و نما چاہتا تو اس کے مزاج کا بن سکتا تھا، اس لیے کہ میرا دُبلا پتلا بیٹا کُرٹ بالکل گرایف کی تجسیم ہے، حالاں کہ اس میں ماریا کا اثر زیادہ ہے، مجھ سے کچھ شباہت ہے، مگر ماتسیرات سے تو بالکل نہیں۔

ماریا ٹروزنسکی اور الفریڈ ماتسیرات کی شادی کا ایک گواہ گریف تھا؛ دوسرا فرِٹز ٹروزنسکی تھا، جو لمبی چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا۔ چوں کہ دولھا کی طرح ماریا بھی پروٹسٹنٹ تھی، انھوں نے صرف قانونی شادی کی تھی۔ یہ واقعہ دسمبر میں ہوا تھا۔ ماتسیرات نے اپنی پارٹی کی وردی میں "ہاں" کہا تھا۔ اس وقت ماریا حمل کے تیسرے ماہ میں تھی۔ میری معشوقہ جتنی جفاکش ہوتی جاتی تھی، اتنی ہی آسکر کی نفرت بڑھتی گئی۔ مجھے اس کے حاملہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر اس بات نے، کہ میرا لگایا ہوا پھل ایک دن ماتسیرات کے نام سے مشہور

ہو، اپنے آنے والے بیٹے اور وارث سے پیدا ہونے والی میری مسرتیں چھین لی تھیں۔

ماریا کا حمل پانچویں مہینے میں تھا جب میں نے اسقاط کرنے کی پہلی کوشش کی تھی، جب واقعی بہت دیر ہو چکی تھی۔وہ میلے ٹھیلے کا موسم تھا۔ماریا دُکان کے کاؤنٹر کے اوپر کچھ کاغذی جھنڈے اور ناک پر آلو جیسی مسخروں کی نقاب چسپاں کر رہی تھی، جہاں پنکھے اور سانچے وغیرہ بھی ٹنگے ہوئے تھے۔عام طور پر سیڑھی کو شیلف کو سہارے لگایا جاتا تھا؛ اس بار کاؤنٹر کی سطح پر رکھ کر سیڑھی لگائی گئی تھی۔ ماریا ہاتھوں میں ڈھیر سارے جھنڈے لیے سیڑھی پر چڑھی ہوئی تھی، جب کہ آسکر بہت نیچے، سیڑھی کے پاؤں کے قریب تھا۔اپنی چوب نقارہ کو لیور کے طور پر استعمال کرتے ہوئے، جس میں میرے کاندھے اور ہمت بھی شامل تھی، میں نے سیڑھی کا ایک پیر ذرا سا اُٹھا کر، اس کو، جھنڈوں اور نقابوں کے ڈھیر کی طرف ڈھکیلا۔ماریا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔سیڑھی لڑکھڑائی، آسکر اچھل کر ایک طرف ہو گیا اور ماریا، اپنے ڈرائنگ کے رنگین کاغذوں، سانچوں اور نقابوں سمیت میرے قریب ہی آگری تھی۔

یہ تو کچھ زیادہ ہی بُرا ہوا کہ صرف اس کے صرف ٹخنے میں موچ آئی، کوئی خاص چوٹ نہیں لگی تھی۔اس کے جسم کی شکل بدلتی جا رہی تھی اور اس نے ماتسیرات کو بھی نہیں بتایا تھا کہ ٹخنے کی موچ کا اصل ذمے دار کون تھا۔

اگلے برس کے مئی میں، ولادت کی تاریخ سے تقریباً تین مہینے قبل، میں نے ایک اور کوشش کی کہ ماریا اپنے شوہر ماتسیرات سے بات کرے، حالاں کہ ماریا نے اس کو بھی پوری بات نہیں بتائی تھی۔میز پر، بالکل میرے سامنے اس نے کہا، ''آسکر، آج کل بہت ناہموار ہو رہا ہے۔کبھی کبھی وہ میرے پیٹ میں لات مارنے لگتا ہے۔کیوں نہ ہم اس کو میری ماں کے پاس بھیج، جب تک کہ ولادت نہیں ہو جاتی۔اس کے پاس کافی جگہ ہے۔''

ماتسیرات نے سنا اور یقین کر لیا۔دراصل مجھ پر قاتلانہ دورہ سا پڑ گیا تھا جس کی وجہ سے میرے اور ماریا کے درمیان کچھ اختلاف پیدا ہو گیا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ماریا صوفے پر لیٹ گئی۔ ماتسیرات برتن دھونا ختم کرنے کے بعد دُکان کی کھڑکی سجا رہا تھا۔بیٹھک میں خاموشی تھی۔مکھی کی بھنبھناہٹ،

حسبِ معمول کھڑکی کی ٹِک ٹِک، ریڈیو پر 'کریت' کے جزیرے پر فوجیوں کی چڑھائی کی آتی ہوئی خبروں کی آواز کم کر دی گئی تھی۔ میں نے اپنے کان اس طرف لگا دیے جب انھوں 'میکس اشمیلنگ' مکّے باز کو پیش کیا۔ جہاں تک مجھ علم ہے، 'کریٹ' کی پتھریلی زمین پر، گر کر اس کا عالمی چیمپئین مختصر زخمی ہو گیا تھا، اور اسے آرام کی خاطر لیٹنا پڑ گیا تھا؛ بالکل ماریا کی طرح، جسے سیڑھی سے گرنے کے بعد لیٹنا پڑ گیا تھا۔ 'اشمیلنگ' دھیمے انکسار کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور آسکر نے سننا بند کر دیا تھا: اب ہر طرف خاموشی تھی، شاید مکھی کی بھنبھناہٹ، گھڑی کی دائمی ٹِک ٹِک ہمیشہ کی طرح تھی، ریڈیو کی آواز بہت کم ہو گئی تھی۔

میں کھڑکی کے قریب اپنی چھوٹی سی بنچ پر بیٹھا ماریا کا پیٹ دیکھ رہا تھا جو صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی، اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وقتاً فوقتاً، چڑچڑے پن سے، میں نقارہ بجا لیتا۔ اس نے جنبش نہیں کی مگر اس نے اسی کمرے میں اپنے پیٹ سمیت مجھے سانس لینے دیا۔ گھڑی اسی جگہ تھی اور مکھی کھڑکی کے شیشے اور پردے کے درمیان، اور پس منظر میں ریڈیو 'کریٹ' جزیرے کی خبریں سنا رہا تھا، مگر فوراً ہی یہ سب کچھ غرق ہو گیا: اب میں صرف وہ پیٹ دیکھ سکتا تھا: مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ ابھرتا ہوا پیٹ کس کمرے میں واقع ہے، نہ ہی یہ معلوم تھا کہ وہ کس کی ملکیت تھا، مجھے تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اسے کس نے اتنا بڑا بنا دیا تھا۔ بس میں اتنا جانتا تھا کہ میں اسے برداشت نہیں کر پا رہا تھا: اس کو تو دبانا ہی پڑے گا، یہ ایک غلطی ہے، یہ تم کو منظر سے دور کر رہا ہے، تمھیں اب کھڑا ہونا اور اس کے بارے میں کچھ کرنا پڑے گا۔ لہٰذا میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ تمھیں تفتیش کرنی پڑے گی، یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا میں پیٹ کی جانب بڑھا اور میرے پاس کوئی شے تھی۔ یہ ایک مہلک اُبھار ہے، اس کو ختم کرنا ہوگا۔ میں نے وہ شے اُٹھائی جو میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور ماریا کے ہاتھوں کے درمیان ایک جگہ کا تعین کیا جو اس کے پیٹ پر تھی۔ یہی وقت ہے، آسکر، ورنہ ماریا اپنی آنکھیں کھول دے گی اور مجھے احساس ہو چلا تھا کہ مجھ پر کسی کی نظر ہے، مگر میں کھڑا ماریا کے لرزتے بائیں ہاتھ کو دیکھ رہا تھا، اگرچہ میں نے اس کے دائیں ہاتھ کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اور دیکھا تھا کہ وہ کوئی منصوبہ بنا

رہی تھی، مجھے اس وقت کوئی حیرت نہیں ہوئی جب ماریا نے اچانک اپنے دائیں ہاتھ سے آسکر کی مٹھی سے قینچی کو مروڑ کر نکال لیا تھا۔ میں وہاں چند مزید سیکنڈ خالی ہاتھ بلند کیے، گھڑی کی ، ٹکھی کی آواز سنتا، ریڈیو کے اعلان کرنے والے کا 'کریٹ' کے اختتام کے بارے میں اعلان سنتا، کھڑا رہ سکتا تھا، مگر میں گھوم گیا اور قبل اس کے کہ دوسرا پروگرام ہلکی موسیقی کا، جو دو سے تین بجے تک شروع ہونے والا تھا، سنتا، اپنی بیٹھک کو چھوڑ دیا، جو اس جگہ کو اپنے پھولے ہوئے پیٹ سے بھر دینے والی عورت کی نظر میں میرے لیے بہت چھوٹی ہو گئی تھی۔

دو دن بعد ماریا نے میرے لیے ایک نیا نقارہ خریدا اور تیسری منزل کے فلیٹ پر مدر ٹروزنسکی کے پاس لے گئی، جہاں مصنوعی تلے ہوئے آلوؤں کی مہک بھری ہوئی تھی۔ پہلے تو میں صوفے پر سویا؛ ونیلا کی لہراتی ہوئی خوش بو کے باعث آسکر نے ہربرٹ کے پرانے بستر میں سونے سے انکار کردیا۔ ایک ہفتے بعد ہائیلانڈ میرا چوبی پالنا اوپر لے گیا۔ میں نے اس کو اجازت دے دی کہ اس کو اُس پلنگ کے ساتھ لگا دیا جائے جس نے، ماریا، مجھے اور فز پاؤڈر کو برداشت کیا تھا۔

مدر ٹروزنسکی کے گھر آسکر پُرسکون اور زیادہ لاپروا ہو گیا۔ مجھے پیٹ کے نقارے سے پناہ مل گئی، اس لیے کہ ماریا کو سیڑھی چڑھنے سے خوف آتا تھا۔ میں اپنے فلیٹ، دُکان، سڑک، حتیٰ کہ باغیچے سے بھی پرہیز کرنے لگا تھا، جہاں غذا کے لیے خرگوش پالے جاتے تھے اس لیے کہ غذا کی قلت ہو گئی تھی۔

آسکر اپنا زیادہ وقت پوسٹ کارڈ دیکھتے گزارتا جو سارجنٹ فرٹز ڈاک سے بھیجا کرتا تھا یا اپنے ساتھ پیرس سے لاتا تھا۔ پیرس شہر کے بارے میں میرے اپنے خیالات تھے اور جب مدر ٹروزنسکی نے مجھے آئیفل ٹاور کا پوسٹ کارڈ دیا تو میں نے اس سے اشارہ لیا اور پیرس پر نقارہ نوازی کی اور پھر فرانسیسی مین پر نقارہ نوازی کرنے لگا حالاں کہ میں نے اس کے بارے میں سنا بھی نہیں تھا۔

12 جون کو، میرے حساب کے مطابق دو ہفتے قبل، جوزا کے بُرج میں، سرطان کے بُرج میں نہیں، میرا بیٹا کرٹ پیدا ہوا۔ باپ عطارد کے سال میں اور بیٹا زہرہ کے

سال میں! باپ چھٹے بُرج، یعنی سنبلہ میں جس پر عطارد حاوی تھا جس کا مطلب ہے تشکیک اور ہُنر مندی؛ اسی طرح بیٹا عطارد کے اثر میں مگر بُرج جوزا میں، جس کا مطلب سرد مہری اور بلند حوصلہ ذہانت۔ جو مجھ میں میزان کے زہرہ نے چڑھتے ہوئے گھر میں ہلکا کیا تھا وہ اسی گھر میں برج حمل نے سنگین کردیا ہے؛ مجھے مریخ سے مشکل پیش آنے والی تھی۔

موشی بے قراری یا جوش میں، مدر ٹروزنسکی نے مجھے خبر دی، "ذرا سوچو تو آسکر! سارس تمھارے لیے ایک چھوٹا سا بھائی لایا ہے۔ میں ڈر رہی تھی کہ کہیں یہ لڑکی نہ ہو، کہ بعد میں تم پریشان ہو۔" میں نے بڑی مشکل سے آئیفل ٹاور اور باپ آزادی کی نقارہ نوازی روکی، جو اس دوران میرے سامنے آگیا تھا۔ نانی اماں ٹروزنسکی کے بھیس میں بھی مدر ٹروزنسکی کو مجھ سے مبارک باد کی توقع نہیں تھی۔ حالاں کہ وہ اتوار کا دن تھا، اس نے کچھ رنگ لگانے کا فیصلہ کیا، چکوری لپیٹنے کے کاغذ سے اس نے اپنے رخسار رگڑے، تازہ رنگ لگایا، اور کام میں، میرے مبیّنہ والد، ماتسیرات کا ہاتھ بنانے کے لیے نیچے چلی گئی۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، یہ جون کا مہینہ تھا۔ ایک گمراہ کن مہینہ! ہر محاذ پر فتح --- اگر آپ بڑی شرط لگانا چاہیں تو --- جس کا مطلب تھا بلقان میں فتح --- مگر مشرقی محاذ پر اس سے زیادہ کامیابی نظر آ رہی تھی۔ ایک بڑی فوج آگے بڑھ رہی تھی۔ ریلوے مصروف رکھی جا رہی تھی۔ فرِیز ٹروزنسکی کو بھی، جو اب تک پیرس میں مزے کر رہا تھا، مشرق کی طرف کوچ کرنا پڑا تھا جو بہت طویل ہونے والا تھا، جس کو گھر جانے کی طویل چھٹی کی مانند نہیں سمجھا جانا چاہیے، مگر آسکر خاموشی سے بیٹھا چمک دار پوسٹ کارڈ دیکھ رہا تھا، اور ہلکے انداز میں "Trois jeunes tambours" نقارہ نوازی بھی کرتا جا رہا تھا، جب کہ اس کا قابض فوج سے کوئی تعلق نہیں تھا، مگر اس کو ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ اسے خوف ہو کہ کوئی اتحادی اس کو دریائے 'سین' کے پُل سے نیچے پھینک نہ دے۔ نہیں! وہ تو شہریوں کے لباس میں تھا، جب میں اپنے نقارے سمیت آئیفل ٹاور پر چڑھ گیا اور شہر کے منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اور جیسی کی توقع کی جا سکتی تھی، مجھے مزہ آ رہا تھا اور اُکسانے والی بلندیوں کے باوجود جو خودکشی کے کھٹے میٹھے خیالات سے آزاد تھیں، مجھے صرف اُترنا ہی تھا، میں آئیفل ٹاور

کے قدموں میں، تین فٹ بلند کھڑا تھا، اپنے بیٹے کی پیدائش کو یاد کر رہا تھا۔

واہ! میں نے بیٹے کے بارے میں ہی سوچا تھا کہ جب وہ تین برس کا ہوگا تو اس کو ٹین کا ایک نقارہ ملے گا۔ ہم دیکھیں، کہ یہاں باپ کون ہے، مسٹر ماتسیرات ہیں یا میں، یعنی آسکر برانسکی!

اگست کی گرمی کے دن تھے — شاید ایک اور محاصرے کی لڑائی، 'اسمولنسک' کے کامیاب اختتام کا اعلان ہو چکا تھا — جب میرے بیٹے کُرٹ کا بپتسمہ ہوا تھا، مگر میری نانی اماں انا کولیاچیکی اور اُس کے بھائی وِنسنٹ برانسکی کو دعوت کس طرح مل گئی؟ بلا شبہ، اگر آپ مانیں تو، جیسے کہ میں نے مان لیا ہے، جان برانسکی کی روایت کے مطابق، جان برانسکی میرا باپ اور وہ خاموش انسان برانسکی میرا دادا تھا: اسی وجہ سے ان دونوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ آخر میرے دادا دادی، میرے بیٹے کُرٹ کے بھی تو دادا دادی تھے، مگر یہ کہنا لاحاصل نہیں کہ یہ دلیل ماتسیرات کے ذہن میں نہیں آئی ہوگی، جس نے دعوت نامے بھیجے تھے۔ اس کے اپنے مشکل ترین شبہات کے اوقات میں بھی، skat کی بازی بُری طرح ہار جانے کے بعد بھی، وہ خود کو دُہرا مورث، والد اور پالنے والا سمجھتا تھا۔ کچھ اور بھی وجوہ تھیں جنھوں نے آسکر کو اپنے دادا دادی سے ملنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ان بزرگوں کو جرمن بنا دیا گیا تھا۔ اب وہ پولش نہیں رہے تھے، اب تو وہ اپنے خوابوں میں بھی صرف کشوبیائی زبان بولتے تھے۔ ان کو تیسرے درجے کا جرمن کہا جاتا تھا۔ مزید یہ کہ جان کی بیوہ، ہیڈوِگ برانسکی نے ایک بالٹک جرمن سے شادی کر لی تھی جو 'رامکاؤ' کا مقامی کسان رہنما تھا۔ درخواستیں داخل کر دی گئی تھیں، جو اگر منظور ہو گئیں تو مارگا اور اِسٹیفن برانسکی کو اپنے سوتیلے باپ 'ایلرز' کا نام اختیار کرنے کی اجازت مل جائے گی۔ سترہ سالہ اِسٹیفن نے رضاکارانہ فوجی کی پیش کش کر دی تھی، اب وہ 'گراس-بوشپول' کے اِنفنٹری ٹریننگ کیمپ میں تھا اور یورپ کے جنگی محاذوں پر بھیجے جانے کے بہت امکانات تھے، جب کہ آسکر، جو جلد ہی فوجی کی عمر کو پہنچ جائے گا، اس وقت تک اپنے نقارے کے پیچھے بیٹھنے پر مجبور ہوگا جب تک کہ زمینی، بحری یا بری فوج میں، بلکہ ایئر کور میں بھی، تین سالہ قد کے نقارہ نواز کی آسامی نہیں نکلتی۔

وہ مقامی کسان رہنما ایلرز تھا جس نے پہلا قدم اُٹھایا تھا۔ مجسمے سے دو ہفتے قبل وہ اپنی گاڑی میں 'ولیبس وگ' گیا تھا۔ اس کے ساتھ، برابر والی نشست پر ہیڈ وِگ بیٹھی ہوئی تھی۔ جان برانسکی کی طرح اس کو بھی پاؤں اور معدے کی تکلیف تھی۔ اس کا قد جان کے مقابلے میں بہت کم تھا۔ وہ ہماری بیٹھک میں گائے جیسی آنکھوں والی ہیڈ وِگ کے ساتھ ہی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آدمی مجھے کچھ عجیب سا لگا، ماتسیرات کو بھی! بات شروع نہیں ہو سکی۔ وہ موسم کی باتیں کرتے رہے، مشرق میں کیا ہو رہا ہے، اس پر غور ہوتا رہا۔ ہماری فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں، 1915 کے مقابلے میں کہیں زیادہ تیزی سے، جیسا کہ ماتسیرات نے یاد دلایا، کہ وہ 1915 میں وہیں تھا۔ ہر ایک جان برانسکی کے بارے میں بات سے پرہیز کر رہا تھا، مگر میں آسکر کے انکل جان برانسکی کو یاد کر کے بچکانہ منہ بنا کر، ایک نہیں دوبارہ زور سے رو پڑا تھا۔ ماتسیرات نے خود کو جھنجھوڑا، کچھ محبت بھری باتیں کیں، جس کے بعد اپنے سابق دوست اور رقیب کے بارے میں کچھ خیالات کا اظہار کیا۔ ایلرز نے بھی جوش وخروش سے شرکت کی حالاں کہ اس نے تو اپنے پیش رو کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ ہیڈ وِگ نے تو کچھ مصدقہ آنسو بھی پیش کر دیے، جو آہستہ آہستہ اس کے رخسار پر بہنے لگے تھے، اور بالآخر اس نے کچھ الفاظ کہے جن پر جان کا موضوع ختم ہو گیا: ''بہت اچھا انسان تھا۔ وہ تو کسی کو بھی اذیت نہیں دیتا تھا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ اس کا ایسا انجام ہوگا، ایک خوف زدہ سا جیسا آدمی، جو اپنے سایے سے بھی خوف کھاتا تھا۔''

ان الفاظ کے بعد، ماتسیرات نے ماریا سے، جو اس کے عقب میں تھی بیئر کی بوتلیں لانے کے لیے کہا اور ایلرز سے پوچھا کہ وہ skat کھیلتا ہے یا نہیں۔ نہیں! ایلرز نے افسوس کے ساتھ کہا کہ وہ نہیں کھیلتا، مگر ماتسیرات نے خندہ پیشانی سے اس کسان رہنما کو اس معمولی سی کوتاہی پر معاف کر دیا۔ اس نے تو ایلرز کے کاندھے کو تھپتھپایا بھی اور، بیئر کے گلاسوں کے بھرے جانے کے بعد، اسے یقین بھی دلایا کہ اگر وہ skat کھیلنا نہیں جانتا تب بھی کوئی مضائقہ نہیں، اس کے باوجود دونوں دوست رہ سکتے ہیں۔

اس طرح ہیڈ وِگ برانسکی، ہیڈ وِگ ایلرز کے بھیس میں ہمارے فلیٹ واپس

پہنچی اور میرے بیٹے کُرٹ کے بپتسمے کی رسم میں شرکت کے لیے اپنے ساتھ نہ صرف اپنے مقامی کسان رہنما بلکہ اپنے سابق خسر وینسنٹ برانسکی اور اس کی بہن انا کو بھی ساتھ لیتی آئی۔ ماتسیرات نے اپنے پرانے ساتھیوں کو پڑوسی کی کھڑکی کے نیچے کی سڑک پر زور دار اور دوستانہ خوش آمدید کہا، اور جب بیٹھک میں میری نانی نے اپنے چاروں لہنگوں کے نیچے ہاتھ ڈال کر بپتسمے کا تحفہ نکالا، جو ایک اچھی موٹی سی بطخ تھی، تو اس نے کہا تھا، ''نانی اماں، اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے زیادہ خوشی ہوتی اگر آپ تحفہ نہ لائی ہوتیں۔'' مگر میری نانی اماں کے ساتھ ذرا زیادتی ہو رہی تھی، اس لیے کہ وہ بطخ کی تعریف سننا چاہتی تھی۔ اس شریف بطخ کو اپنے ہاتھ کی ہتھیلی سے تھپتھپاتے ہوئے اس نے احتجاجاً کہا، ''فضول باتیں مت کیا کرو الفریڈ۔ یہ کشوبیائی بطخ نہیں، یہ جرمن قومی پرندہ ہے اور اس کا مزہ اب بھی وہی ہے جو جنگ سے پہلے تھا۔''

جب قومیت کے سارے معاملات حل ہو گئے اور ہر کام سلیقے سے ہو گیا، اور بچے کے بپتسمے کا وقت آیا تو آسکر نے پروٹسٹنٹ چرچ میں قدم رکھنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے ٹیکسی سے میرا نقارہ نکالا اور اس کے ساتھ مجھے اندر لے جانے کی کوشش کی، اس یقین کے ساتھ کہ پروٹسٹنٹ کلیساؤں میں ایک بار نہیں کئی بار نقاروں کو لے جانے کی اجازت دی گئی ہے۔ میں نے سیاہ ترین کیتھولک جذبے میں اصرار کیا: اس وقت پروٹسٹنٹ بپتسمے کا خطبہ سننے کے بجائے میں نے فادر ویکنے کے کان میں مکمل اور تفصیلی اعتراف کر لیا ہوتا۔ ماتسیرات نے میری آواز [کے خطرات] اور نقصانات کے دعوے کے خوف سے ہتھیار ڈال دیے۔ جب میرے بیٹے کا بپتسمہ کیا جا رہا تھا، میں ٹیکسی میں بیٹھا ڈرائیور کے سر کے عقب کو گھور رہا تھا اور پیچھے کی طرف دیکھنے والے آئینے میں آسکر کے خد و خال کا تجزیہ کر رہا تھا، اپنے بپتسمے کا تصور کرتے ہوئے، جس کو کافی عرصہ گزر گیا تھا، اور فادر ویکنے کی، نوزائیدہ آسکر میں سے شیطان کو بھگانے کی بہادرانہ کوشش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس کے بعد ہم نے کھانا کھایا۔ دو میزیں ملا کر ایک ساتھ رکھ دی گئی تھیں۔ پہلے تو کچھوے کا مزاحیہ شوربا آیا۔ دیہاتیوں نے چاٹا۔ گریف نے اپنی چھنگلیا ٹیڑھی کر لی۔

گرٹیچن شفلر نے شوربے کو دانت سے کاٹنے کی کوشش کی۔ گسیٹی چمچے پر منہ پھیلا کر مسکرائی۔ ایلرز منہ میں چمچہ رکھے ہوئے بولا۔ وِنسینٹ کا ہاتھ ہلنے لگا، جب وہ کسی چیز کو دیکھ رہا تھا جو اس کے چمچے میں آ نہیں رہی تھی۔ صرف بوڑھی عورتیں، نانی اماں انا اور مدر ٹروزنسکی دل و جان سے چمچے سے وفاداری کر رہی تھیں۔ آسکر نے اپنا چمچہ گرا دیا اور وہاں سے کھسک گیا۔ جب دوسرے لوگ چمچے بازی کر رہے تھے، وہ خواب گاہ میں اپنے بیٹے کا پالنا تلاش کر رہا تھا، اس لیے کہ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں غور کرنا چاہتا تھا، جب کہ دوسرے، اپنے اپنے چمچوں کے پیچھے، بے اعتنائی اور دیے گئے خالی پن میں سوکھ رہے تھے، حالاں کہ شوربا ان کے اندر چمچے سے ڈالا جا رہا تھا، نکالا نہیں جا رہا تھا۔

پہیے لگے پالنے کے اوپر آسمانی رنگ کے [ریشمی] جال کا چتر لگا ہوا تھا [جو خواتین کے نقاب میں استعمال ہوتا ہے]۔ پالنے کے کنارے بہت اونچے تھے، اور سب سے پہلے مجھے چکنا، تنا ہوا، سُرخی مائل نیلے پن کا چھوٹا سا سر دکھائی دیا۔ نقارے کو فرش پر رکھ کر اور اس پر چڑھ کر میں اپنے سوتے ہوئے بیٹے کو دیکھ سکا تھا جس میں کبھی کبھی سوتے میں اعصابی پھڑکن ہو جاتی تھی۔ اے آبائی فخر! ہمیشہ شان دار لفظ تلاش کیا کر! اپنے نوزائیدہ بیٹے کو گھور کر دیکھتے ہوئے، ایک چھوٹے سے جملے کے سوا مجھے اور کچھ نہیں سوجھا: جب وہ تین برس کا ہوگا تو اس کے پاس ایک نقارہ ہوگا۔ میرے بیٹے نے اپنی شعوری کیفیت میں میری معمولی سی بھی دراندازی کی اجازت نہیں دی اور میں صرف امید ہی کر سکتا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ وہ میری ہی طرح، باطنی سمعیت رکھنے والی نسل کے نوزائیدہ بچوں جیسا ہوگا۔ میں نے الجھن کی سی کیفیت میں اس کی تیسری سال گرہ پر نقارہ دیے جانے کا وعدہ دہرایا، اپنے نقارے سے اُترا اور ایک بار پھر بیٹھک میں جا کر بیٹھے لوگوں سے معاملہ کرنے کی کوشش کی۔

وہ لوگ کچھوے کا مزاحیہ شوربا ختم ہی کر رہے تھے۔ ماریا ٹین کے ڈبے کی سبز مٹر پر پگھلا ہوا مکھن ڈال کر لائی۔ ماتسیرات نے جو سؤر کے روسٹ کا ذمے دار تھا خود ہی تھال سجایا: اس نے اپنی ٹوپی اُتار دی اور کوٹ بغیر قمیص میں کھڑا روسٹ کے ورق کے بعد ورق کاٹ رہا تھا، اس کے خد و خال، نرم و پُرلطف گوشت کے اوپر، اتنی بے شرم نرمی سے

پُر تھے کہ مجھے اپنی نظریں ہٹانی پڑ گئی تھیں۔

گریف کو الگ کھانا دیا گیا تھا: ٹین کے ڈبوں کا asparagus، اُبلے ہوئے انڈے اور کریم کے ساتھ سیاہ رنگ کی مولی، اس لیے کہ سبزی خور لوگ گوشت نہیں کھاتے۔ دوسروں کی طرح، اس نے آلو کا بُھرتا بھی لے لیا اور اس کو گوشت کے شوربے سے نہیں مکھن سے پتلا کیا، جو ہوشیار ماریا باورچی خانے سے چھن چھن کرتے ہوئے فرائنگ پین میں لائی تھی۔ سب بیئر پی رہے تھے، اس نے سیب کا عرق پیا۔ 'کیو' کا محاصرہ زیرِ بحث تھا، قیدی بنائے جانے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ ہٹلر نے جو بالنک کا رہنے والا تھا، روسی قیدیوں کا شمار کرنے کی خوب صلاحیت دکھائی: ہر ایک لاکھ قیدی کے بعد اس کی ایک انگلی اُٹھ جاتی۔ جب اس کے دونوں ہاتھ مل کر ایک ملین شمار مکمل کر چکے تو اس نے اُٹھی انگلیوں کو یکے بعد دیگرے گرا کر قیدی شمار کرنے شروع کر دیے تھے۔ جب قیدیوں کا موضوع، جن کی بڑھتی ہوئی تعداد رفتہ رفتہ غیر دل چسپ اور تھکا دینے والی ہو گئی تو 'شیر' نے 'گوشن ہافن' کی یوبوٹ کی بات شروع کر دی اور ماتسیرات نے میری نانی اماں کے کان میں سرگوشی کی کہ وہ ہر ہفتے 'شیشاؤ' کے پانیوں میں دو آبدوزیں اُتاریں گے۔ اس پر گریف نے تمام موجود لوگوں کو تفصیل سے بتایا کہ آبدوزوں کو سامنے سے اُتارنے کے بجائے پہلو کی طرف سے کیوں اتارا جاتا ہے۔ وہ ہر بات کو صاف اور قابلِ دید بنانے پر تلا ہوا تھا: اس لیے کہ ہر عمل کے لیے اس کے پاس ایک جذبۂ اظہار تھا جس کی ان تمام مہمانوں نے، جو یوبوٹ سے مسحور تھے ہوشیاری سے اور بھونڈے پن سے نقل بنائی تھی۔ غوطہ لگانے والی آبدوز کی شکل کو بیان کرنے کے دوران ونسینٹ برانسکی کا ہاتھ بیئر کے اپنے گلاس سے ٹکرا گیا۔ میری نانی اماں نے اس کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا، مگر ماریا نے یہ کہہ کر اُسے ٹھنڈا کیا کہ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، یہ میز پوش تو ویسے بھی لانڈری بھیجا جانے ہی والا تھا، اور یہ بھی کہ ایسے موقعوں پر دھبّے پڑ ہی جایا کرتے ہیں۔ مدر ٹروزنسکی ایک کپڑا لائی اور بیئر کے جوہڑ کو صاف کیا اور اپنے بائیں ہاتھ میں وہ ہمارا بلّور کا بڑا والا پیالہ لے گئی، جو چاکلیٹ پڈنگ اور کچلے ہوئے بادام سے بھرا ہوا تھا۔

ثمت ہے مجھ پر، اگر اس چاکلیٹ پڈنگ میں کوئی ساس تھا یا کوئی بھی ساس نہیں تھا۔ مگر اس کو ونیلا ساس، گاڑھا، زرد اور لیس دار ہوتا تھا: ونیلا ساس! شاید اس دنیا میں کوئی شے نہ اتنی خوش گوار ہے نہ افسردہ کرنے والی۔ اور دھیرے دھیرے ونیلا کی خوش بو چاروں طرف پھیلنے لگی، جو مجھ پر اور ماریا پر چھائی جا رہی تھی، اس حد تک کہ میں اس کو اور تمام ونیلا کی بنیاد اور اس کے ماخذ کو دیکھنا برداشت نہیں کر پا رہا تھا، جو ماتسیرات کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

آسکر اپنی بچگانہ کرسی سے کھسکا اور لینا کے لہنگے کو پکڑ کر لٹک گیا، اس کے قدموں پر گر پڑا جس نے اوپر پیچھے کو تلوار کی طرح نکال لیا تھا۔ پہلی بار، میں نے لینا کی باہر نکلنے والی مخصوص سانس میں سانس لی، جس نے اِک دم ونیلا کو خاموش کر دیا، اپنے حصار میں لے لیا اور مار دیا تھا۔

یہ بو میرے نتھنوں کے لیے بہت تیز تھی، میں اس خوش بو سے اس وقت تک چمٹا رہا جب تک کہ ونیلا سے منسلک تمام یادیں دھندلاتی ہوئی محسوس نہ ہونے لگیں۔ آہستہ آہستہ، بغیر کسی آواز یا اینٹھن کے، مجھ پر متلی کا غلبہ ہو گیا۔ جب کچھوے کا مصنوعی شوربا، روسٹ سور کے ٹکڑے، ٹین کے ڈبے کے تقریباً ثابت سبز مٹر، اور چند پیچھے ونیلا ساس اور چاکلیٹ جو میں نے کھائے تھے، نے مجھ کو بچا لیا، اور میں اپنی محتاجی سے پوری طرح آگاہ ہو گیا، تو میں اپنی محتاجی کے کیچڑ میں لوٹنے لگا۔ آسکر کی محتاجی لینا گریف کے قدموں تلے پھیل گئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس وقت کے بعد سے روزانہ میں اپنی محتاجی لینا گریف کے پاس لے جایا کروں گا۔

# ایک سو پینسٹھ پاؤنڈ

ویازما اور بریانسک [کی لڑائیاں]؛ اور پھر بیچ میں کیچڑ آ گیا۔ 1941 کے اکتوبر کے درمیان، آسکر نے بھی شدت سے کیچڑ میں لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ امید ہے کہ مجھے آرمی گروپ سنٹر کی کیچڑ سے لت پت کامیابیوں کا، مسز لینا گریف کے اتنی ہی ناقابل گزر گندے علاقے سے موازنہ کرنے پر معاف کر دیا جائے گا۔ جس طرح ٹینک اور مال بردار ٹرک ماسکو جانے والے راستوں میں پھنس گئے تھے، اسی طرح میں بھی اس علاقے میں پھنس گیا تھا؛ جیسے گھومتے ہوئے پہیے روسی کیچڑ کو متھ رہے تھے، اسی طرح میں بھی اپنی کوششوں میں لگا ہوا تھا — میں یہ کہنے میں خود کو حق بجانب محسوس کرتا ہوں کہ میں نے گریفی کیچڑ کو جھاگ میں تبدیل کر دیا تھا، مگر نہ ماسکو کے راستوں پر کوئی کامیابی ہوئی تھی اور نہ گریف کی خواب گاہ میں۔

میں اپنے فوجی استعارے کو چھوڑ دینے پر بالکل تیار نہیں، جس طرح مستقبل کی حکمتِ عملی تیار کرنے والے لوگ کیچڑ میں کی جانے والی ان ناکامیاب جنگوں سے نتیجہ نکالیں گے، اسی طرح میں بھی لینا گریف نامی مظہرِ قدرت سے اپنے نتائج اخذ کروں گا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران ہماری گھریلو کوششوں کو حقیر نہیں سمجھا جانا چاہیے۔ آسکر صرف سترہ برس کا تھا، اس کی کچی عمر کے باوجود لینا گریف کے ساتھ لامتناہی اور باطنی دراندازی کے عمل نے، اُسے پورا مرد بنا دیا تھا، مگر ہم فوجی مشابہتوں کو ایک جانب رکھے دیتے ہیں۔ آیئے ہم فنی اعتبار سے آسکر کی ترقی کی پیمائش کرتے ہیں۔ اگر ماریا نے اپنے

مسحور کن معصومانہ و نیلائی غبار کے ذریعے مجھ کو چھوٹی اور نازک اشیا کی قدر دانی سکھائی ہے؛
اگر اس نے مجھے رفر پاؤڈر اور مش روم چھنے کی غنائیت سے آشنا کیا ہے، تو یہ بھی کہا جا سکتا
ہے کہ مسز گریف کے گونا گوں، تیز و تلخ بد بو کے مرکب غبارات نے مجھے وہ وسیع رزمیہ
وسعت دی ہے جس کے باعث میں آج ایک ہی سانس میں فوجی فتوحات کی اور خواب گاہ
کی کامیابی کی باتیں کرنے کے قابل ہوا ہوں۔ اور موسیقی! ماریا کے بچکانہ، جذباتی، اس کے
با وجود اتنے پیارے ہارمونیم سے، بغیر عبوری تربیت کے بھی، مجھے کنسرٹ ہال میں بھیج دیا
گیا تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ میں کنڈکٹر بنا دیا گیا تھا؛ اس لیے کہ لینا نے مجھے ایک
آرکسٹرا کی پیش کش کی تھی، جو اپنی گہرائی اور چوڑائی میں اتنا فاضل تھا کہ آپ کو اس کا ہمسر
بیروت یا سالسبرگ میں بھی مشکل سے ملے گا۔ وہاں میں نے پیتل کے اور پھونک سے،
تار کے، کھال کے، اور دبا کر بجانے والے سازوں پر مہارت حاصل کی تھی؛ میں نے ہارمونی
اور کاؤنٹر پوائنٹ، کلاسیکی اور آٹھ سُرا، داخلے کی طویل دورانیے والی؛ خاص چال کی اور دھیمی
چال کی موسیقی کی مہارت حاصل کی؛ میری ضرب سخت اور ٹھیک ٹھیک یا نرم اور سیال ہو سکتی
ہے۔ آسکر کو اپنے ساز، یعنی مسز گریف سے، زیادہ سے زیادہ حاصل ہوا، اس کے با وجود،
جیسا کہ صحیح فن کار کو زیب دیتا ہے، وہ نا مطمئن نہیں تو کم مطمئن ضرور رہا ہے۔

گریف کی سبزی کی دُکان ہماری دُکان سے چند قدم کے فاصلے پر سڑک کے
اُس پار تھی۔ بہت سہولت کی جگہ پر، اور الیگزانڈر، بیکری والے کے کوارٹر کے مقابلے میں
خاصی نزدیک، 'کلائن ہامر ویگ' پر تھی۔ شاید کہ سہولت کی جگہ ہی اصل وجہ تھی کہ میں نے
گوئٹے اور راسپوتین کا مطالعہ کرنے کے مقابلے میں نسوانی اعضا کے علم میں زیادہ ترقی کی
تھی، مگر شاید میری تعلیم کے اس نقص کی جو آج بھی آشکار ہے، تشریح کی جا سکتی ہے اور
دو استادوں کے درمیان فرق کا جزوی طور پر جواز پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ لینا نے مجھے
کچھ سکھانے کی دانستہ کوشش نہیں کی تھی، مگر اپنا سارا خزانہ میرے لیے کھول کر رکھ دیا تھا
تا کہ میں اس کا معائنہ کر سکوں اور تجربات کر سکوں۔ گویا گریٹچن شیفلر نے تعلیمِ اطفال کا
پیشہ کچھ زیادہ سنجیدگی سے اختیار کر لیا تھا۔ لینا نتیجہ دیکھنا چاہتی تھی، مجھے با آواز بلند بولتے

دیکھنا چاہتی تھی، میری نقارہ نواز انگلی کو قلم کے استعمال میں مشغول دیکھنا چاہتی تھی، مجھے قواعد سیکھنے کی طرف بذاتِ خود راغب دیکھنا چاہتی تھی۔ جب آسکر نے ترقی کے قابلِ دید آثار دکھانے سے انکار کردیا، تو گریچن شفلر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تھا؛ اس کا اعتراف کیا جانا چاہیے کہ میری مما کے انتقال تھوڑے ہی دنوں بعد — اس وقت تک مجھے پڑھاتے سات برس ہو چکے تھے — وہ اپنے کڑھائی بنائی کے مشغلے کی طرف واپس لوٹ گئی تھی۔ اس کے بعد سے مجھ میں اس کی دل چسپی کا اظہار صرف ہاتھ بنے ہوئے سویٹروں، موزوں اور بے انگلی کے دستانوں کے تحفے دینے تک محدود رہ گیا تھا۔ اس کی بانجھ شادی کا بیشتر حصہ تفریحی سفر تک محدود رہ گیا تھا۔ ہم گوئٹے یا راسپوتین کو نہ پڑھتے تھے اور نہ ان کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ ہم اپنے دونوں استادوں کے کام کے اقتباسات کو مختلف جگہوں پر، زیادہ تر اپنے فلیٹ کی عمارت کی دو چھتی میں، چھپا کر رکھتے اور آسکر کی تعلیم کا یہ حصہ مکمل طور پر بھلایا نہیں گیا تھا؛ میں اپنے آپ کو خود تعلیم دیتا تھا اور اپنی رائے خود قائم کرتا تھا۔

بستر تک محدود، بیمار لینا گریف نہ بھاگ سکتی تھی نہ مجھے چھوڑ سکتی تھی، اس لیے کہ اس کا عارضہ اگرچہ پرانا تھا، اتنا تشویش ناک نہیں تھا کہ لینا میری معلّم لینا، کو قبل از وقت مجھ سے چھین لیتا۔ مگر چوں کہ اس کرّے پر کوئی شے ہمیشہ باقی رہنے والی نہیں، وہ آسکر تھا، جو اس بستر تک محدود اپنی استانی کو اس وقت چھوڑ کر چلا گیا، جب اسے محسوس ہوا کہ اس کی تعلیم مکمل ہوگئی ہے۔

آپ کہیں گے کہ کتنی محدود ہے یہ دنیا ہے جس میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اس نوجوان آدمی کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک کریانے کی دُکان، ایک بیکری اور ایک سبزی کی دُکان حد بندیاں تھیں اس میدان کی جس کے درمیان اس کو بلوغت کی زندگی گزارنے کے لیے اپنے آلے کو تیار کرنا تھا۔ جی ہاں! مجھے اعتراف ہے کہ آسکر نے پہلے، سارے اہم سبق اسی بہت بدبو دار بوڑھا گرد و پیش میں سیکھے تھے، مگر میرے پاس ایک تیسرا سکھانے والا بھی تھا۔ وہ یہی شخص تھا جس نے آسکر پر اس دنیا کو وا کیا تھا اور اس کو وہ کچھ بنایا تھا، جو وہ آج ہے، ایک فرد، ایک بہتر صفت لیے، میں جسے صرف ایک شہری ہی کہہ سکتا ہوں۔

میری مراد ہے—جیسا کہ آپ میں سب سے ہوشیار نے دیکھ لیا ہوگا—میرا اُستاد ہیرا، شہزادہ ایوجینِن کا براہِ راست وارث، اور لوئی چہاردہم کے شجرۂ نسب کا ایک انکھوا، یعنی بونا موسیقار مسخرہ! اور جب میں ہیرا کہتا ہوں تو اس کے ساتھ میرے ذہن میں ایک عورت، روز ویدا ریگونا، بھی ہوتی ہے، وہی مشہور طالوی نیند میں چلنے والی اور ابدی حسن والی، جسے میں اس وقت پھر یاد کرنے لگا تھا جب ماتسیرات نے مجھ سے میری ماریا چھین لی تھی۔ سینیورا اب کتنی عمر کی ہوگی؟ میں نے سوچا تھا۔ کیا اب بھی وہ انیس بیس برس کی جوان لڑکی ہوگی؟ یا وہ وہی نازک اندام، نناوے برس کی دل رُبا خاتون ہے، جو مزید سو برس بعد بھی ابدی جوانی کی ایک لازوال ساخت ہوگی۔

اگر میرا حافظہ میرا ساتھ دے رہا ہے تو میں ان دونوں سے مما کے انتقال کے کچھ دنوں بعد ملا تھا اور جو میرے نزدیک، جذبے اور پیشے کے اعتبار سے میرے رشتے دار بن گئے تھے۔ اور پھر ہم نے ایک ساتھ فور سیزن ریستوران میں 'موکا' پی تھی، اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ہمارے درمیان چھوٹے موٹے سیاسی اختلافات تھے مگر ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا: بیرا [مسخرکی] رائج پروپیگنڈا مشینری سے وابستہ تھا اور جیسا کہ میں نے اس کے یہاں وہاں دیے گئے اشاروں سے اخذ کر لیا تھا، وہ 'گوئبلز' اور 'گورنگ' کا راز داں تھا، میرے سامنے جن کی وہ ہر طرح سے تشریح اور، ہر طرح کا جواز پیش کیا کرتا تھا۔ وہ قرونِ وسطیٰ کے درباری مسخروں کے اثر و رسوخ کی باتیں بھی کیا کرتا تھا، اور مجھ کو ہسپانوی پینٹنگز کی نقلیں بھی دکھایا کرتا تھا، جن میں فلپ یا کارلوس کا جاہ وحشم والا جلوس ہوتا تھا: اور ان نازیبا، خود پسند اجتماعات کے درمیان ریش بُو، پُھندنے والی قمیصیں اور تھیلے جیسے پتلون میں ملبوس، ہیرا، بلکہ آسکر، کے قد والے جیسے بیوقوف بھی دیکھے جا سکتے تھے۔ مجھے وہ تصویریں پسند تھیں — اس لیے کہ بغیر کسی مبالغے کے، میں خود کو 'ڈیگو ویلاس کوئیز' کا پُرجوش شیدائی سمجھتا تھا، مگر اسی وجہ سے میں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا، اور کچھ دیر بعد وہ ہسپانیہ کے فلپ چہارم کے دربار کے مسخرے کی حیثیت اور رھائی چیچھورے جوزف گوئبلز کے قافلے میں اپنی حیثیت کے درمیان تقابل کرنا چھوڑ دیتا تھا۔ پھر وہ کم زوروں کی بڑے وقتوں کی باتیں شروع کر دیتا جن کو عارضی طور پر اس

مزاحمت پر غور کرنا چاہیے جو رازداری کے حالات میں پھلتی پھولتی ہے، مختصراً یہ کہ "اندرونی ترک وطن" کا لفظ بیچ میں آ گیا اور آسکر کے نزدیک ہماری راہیں الگ الگ ہو گئیں۔

یہ نہیں کہ میرے دل میں اس ماسٹر بیرا کے لیے حسد پیدا ہو گیا تھا۔ میں بعد کے برسوں میں نوٹنکی اور سرکس کے اشتہار تلاش کرتا رہا تھا جن میں بیرا کا نام موجود ہو۔ دو بار مجھے ایسے اشتہار ملے تھے، جن میں سینیورا ارگونا کا بھی نام تھا، پھر بھی میں نے ایسا کوئی قدم نہیں اُٹھایا جو میری دوستوں سے ملاقات کا باعث ہو سکتا تھا۔

میں نے اس کو اتفاق پر چھوڑ دیا تھا، مگر اتفاق نے مدد سے انکار کر دیا، اس لیے کہ اگر میرے اور بیرا کے راستے 1942 میں مل گئے ہوتے تو آسکر نے کبھی لینا شیفلر کی شاگردی اختیار نہ کی ہوتی، بلکہ وہ ماسٹر بیرا کا پیرو بن گیا ہوتا۔ ایسا ہے کہ، میں روزانہ ہی لبیس وئے پار کرتا ہوں، کبھی علی الصباح سبزی کی دُکان میں داخل ہوتا ہوں، مالکانہ حقوق کی بنیاد پر سبزی فروش کے جوار میں نصف گھنٹا صرف کرتا ہوں، جو روز بہ روز اکھڑ ہوتا جا رہا ہے، اور اپنا زیادہ وقت اپنی ایجادوں پر صرف کرنے لگا ہے۔ میں اس کی انوکھی، جھن جھن کرتی، چیختی اور جب کوئی گاہک داخل ہوتا تو مالک کو انتباہ کرنے والی اختراعات کو دیکھ رہا تھا؛ اس لیے کہ گریگ اپنے اطراف کی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا تھا۔ آخر کیا ہو گیا ہے اس کو؟ کون سی ایسی شے ہے جس نے اتنے خوش مزاج مالی اور نوجوانوں کے دوست کو اتنا خاموش بنا دیا ہے؟ ایسی کیا شئے ہے جس نے اس کی ایک تنہا، کج رو، پریشان بوڑھے شخص میں قلب ماہیت کر دی ہے؟

جوان لوگوں نے اب اس سے ملاقات کرنا چھوڑ دیا ہے۔ نئی نسل اس کو جانتی ہی نہیں۔ بوائے اسکاوٹ کے زمانے کی دوستیاں جنگ کے باعث ختم ہو گئی ہیں۔ جنگ کے مختلف محاذ سے خط آیا کرتے تھے، پھر صرف پوسٹ کارڈ آنے لگے، اور ایک دن گریف کو بالواسطہ خبر ملی کہ اس کے پسندیدہ اسکاوٹ ہورسٹ ڈوناتھ کو، جو اُس وقت اسکواڈ لیڈر تھا، بعد میں فوج میں لیفٹیننٹ بن گیا تھا [یوکرین] کے علاقے کے لوگوں نے قتل کر دیا۔

اس دن کے بعد سے گریف پر بڑھاپا طاری ہونے لگا، اس نے اپنی شکل و صورت کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا، اپنے آپ کو اس وقت تک کے لیے صرف اختراعات پر

وقف کر دیا، جب تک کہ اس کی دُکان میں آلو اور کریم کلکے کے مقابلے میں مزید اختراعی مشینیں نظر نہیں آنے لگی تھیں۔ بلاشبہ اس کا باعث عام غذائی قلت تھی؛ دُکان میں اشیا کی فراہمی کم اور دیر میں ہونے لگی تھی، اور گریف، ماتسیرات جیسا اچھا خریدار بھی نہیں تھا جس کے تھوک بازار والوں سے اچھے تعلقات ہوتے۔

دُکان کو دیکھیں تو افسوس ہوتا تھا، اور یہ سب گریف کی شور مچانے والی احمقانہ مشینوں کے طفیل ہوا تھا جن سے اس کی دُکان فضولیات سے، مگر خوب صورتی سے، بھی ہوئی تھیں۔ گریف کے ذہن کی بڑھتی ہوئی دھندلاہٹ کے کرشمے مجھے اچھے لگتے تھے۔ آج بھی جب میں اپنے نگہبان برونو کی گرہوں والے دھاگوں سے بنے آسیب جیسے پُتلے دیکھتا ہوں تو مجھے گریف کی اختراعی پیش کشیں یاد آ جاتی ہیں۔ اور جس طرح برونو کی فن کارانہ بہلاوے کی اشیا کو دیکھ کر میری سنجیدہ مسکراہٹ پر برونو خوش ہو جاتا ہے، اسی طرح گریف، اپنے مخبوط الحواس انداز میں خوش ہو گیا تھا جب میں نے اس کی موسیقی پیدا کرنے والی مشینوں میں سے ایک پر اپنی لُطف اندوزی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ جس نے برسوں سے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی، بظاہر بہت مایوس ہوا، جب نصف گھنٹے کے بعد ہی میں اس کی سبزی اور کارخانے جیسی دُکان کو چھوڑ کر اس کی بیوی لینا گریف سے ملاقات کے لیے چلا گیا تھا۔

میں آپ کو بستر پر پڑی اس عورت سے اپنی ملاقاتوں کے بارے میں کیا بتاؤں، جو عام طور پر دو سے ڈھائی گھنٹوں پر مشتمل ہوتی تھی؟ جوں ہی آسکر داخل ہوا، اس نے بستر ہی سے اس کی جانب اشارہ کیا: "اوہ اچھا، یہ تم ہو آسکر۔ اِدھر آ جاؤ، چاہو تو میرے لحاف کے اندر ہی گھس جاؤ، کافی ٹھنڈ ہے، اور گریف نے تو ٹھیک سے آگ بھی نہیں جلائی ہے۔" اس طرح میں اس کے پَروں والے بستر میں گھس گیا؛ اپنے نقارے کو اور دونوں چھڑیوں کو، جنھیں باہر استعمال کر رہا تھا، چھوڑ دیا اور لینا سے ملاقات کے لیے صرف تیسری، دُبلی سوکھی چھڑی اپنے ساتھ رکھی۔

یہ قیاس نہ کر لیا جائے کہ لینا کے بستر میں داخل ہونے سے قبل میں نے اپنے کپڑے اتار دیے تھے۔ میں اون، مخمل اور چمڑے میں گھس گیا تھا اور اپنی محنتوں سے پیدا

ہوا نے والی گرمی کے با وجود، میں چند گھنٹے بعد شکن آلود پڑوں سے، اسی لباس میں، باہر آ گیا جس میں برائے نام بے ترتیبی ہوئی تھی۔

تب لینا کے بستر سے تازہ دم نکلنے کے بعد، اس کی بد بو دار ہوا سمیت، میں گریف کے پاس جاتا۔ جب ایسا کئی بار ہو چکا تو گریف نے ایک نئی رسم ایجاد کی، جس پر عمل کرنے میں مجھے خوشی محسوس ہوتی تھی۔ قبل اس کے کہ میں اس ایوانِ ازدواج سے برآمد ہوتا، گریف گرما گرم پانی سے بھرا ایک لگن لیے کمرے میں داخل ہوتا، اس کو تپائی پر رکھ دیتا۔ اس کے قریب ہی صابن اور تولیا رکھ کر، ایک لفظ کہے یا بستر کی جانب اشارے سے بھی کچھ کہے بغیر وہ چلا جاتا۔

فوراً ہی، آسکر اس آرام دہ گھونسلے سے باہر نکلتا، بچوں کی چال چلتا، اس لگن کی جانب جاتا، خود کو اور بستر کے وقت کی چھڑی کو، اچھی طرح صاف کرتا؛ میں جانتا تھا کہ گریف اپنی بیوی کی بالواسطہ آنے والی بو کو بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

موجد سبزی فروش، تازہ دم آسکر کو خوش آمدید کہتا۔ اپنی مشینوں اور ان کی مختلف نوعیت کی آوازوں کا مظاہرہ کرتا، اور آج بھی میرے لیے یہ بہت حیرت انگیز بات ہے کہ آسکر اور گریف کے درمیان اس دیر آید قربت اور دوستی کے باوجود، گریف میرے لیے اجنبی تھا۔ بلا شبہ بڑھتی ہوئی دل چسپی تو تھی، مگر ہم دردی کبھی نہیں ہوئی۔

یہ ستمبر 1942 کا واقعہ ہے — میری اٹھارویں سالگرہ بغیر کسی جشن و تقریب کے گزر گئی تھی، ریڈیو پر اعلان کے مطابق فوج نے اسٹالن گراڈ پر قبضہ کر لیا تھا — کہ گریف نے ایک نقارہ نوازی کی مشین بنائی۔ لکڑی سے بنا ایک ڈھانچا تھا، جس کے اندر ایک ترازو تھی، جسے دونوں پلڑوں پر آلو رکھ کر متوازن کیا گیا تھا؛ جوں ہی اس کے کسی ایک پلڑے پر سے ایک بھی آلو اٹھا لیا جاتا، ترازو کا توازن بگڑ جاتا، ایک لیور آزاد ہو جاتا جو ڈھانچے کے اوپر نقارہ نوازی کی مشین کو متحرک کر دیتا تھا۔ اس کے بعد پیالہ نما ڈھول کی آواز پیدا ہوتی، دھم دھم، جھن جھن، گھڑیال گھنٹے کی آوازیں، اور ان سب کے بعد ایک عارضی ٹن ٹن اور پھر دھماکے جیسی ملی جلی موسیقی پر، جو عموماً کسی اختتام پر بجائی جاتی ہے، اختتام ہو جاتا۔

یہ مشین مجھے پسند آئی۔بار بار میں گریف سے اس کے مظاہرے کے لیے کہتا۔ اس لیے کہ آسکر کے خیال میں سبزی فروش نے یہ مشین اُس کے لیے ایجاد اور تیار کی ہے۔ جلد ہی میری غلط فہمی دور کر دی گئی۔گریف نے ایک آدھ بار خیالات مجھ سے لیے ہوں گے،مگر یہ مشین اس کے اپنے لیے تھی؛ اس لیے کہ مشین کا اختتام خود اس کا اپنا اختتام تھا۔

وہ اکتوبر کی ایک شفاف صبح تھی، ویسی ہی جیسی کہ شمال مغرب کی ہوائیں مفت فراہم کرتی رہتی ہیں۔میں مدر ٹروزنسکی کے فلیٹ سے سویرے ہی نکل پڑا تھا؛ ماتسیرات ابھی اپنی دُکان کے سامنے کا سرکنے والا شٹر اُٹھا ہی رہا تھا کہ میں سڑک پر آگیا تھا۔میں اس کے ساتھ ہی کھڑا تھا جب شٹر کی اوپر جاتی ہوئی سبز رنگ کی پٹیاں کھڑکھڑا رہی تھیں؛ کریانے کی رات سے بند کی دُکان کی بو کا ایک بھبکا آیا؛ ماتسیرات نے صبح کا میرا بوسہ لیا۔قبل اس کے کہ ماریا آتی، کنارے پڑے ہوئے گول پتھروں پر مغرب کی جانب اپنا سایہ ڈالتا ہوا میں ’لیبس ویگ‘ پار چلا گیا: میری دائیں جانب ’میکس ہالبے پلاز‘ کی طرف سے سورج اپنی پوری توانائی سمیت بلند ہو رہا تھا؛ میں نے اس وقت وہی ترکیب آزمائی تھی جیسی کہ ’بیرن مونش ہاؤزن‘ نے دلدل سے چھٹکارا پانے کے لیے اپنی چھوٹی سی، سؤر کی جیسی، مصنوعی دُم استعمال کی تھی۔

کسی بھی شخص کو، جو گریف سبزی فروش سے واقف تھا، اور مجھے بھی یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی، جب اس وقت دُکان کی نمائشی کھڑکی بند تھی اور اس پر اندر سے پردہ پڑا ہوا تھا۔یہ سچ ہے کہ پچھلے برسوں نے گریف کو زیادہ خبطی بنا دیا تھا۔پھر بھی دُکان ہمیشہ وقت پر کھلا کرتی تھی۔ہو سکتا ہے کہ وہ بیمار ہو، آسکر نے سوچا، مگر فوراً ہی یہ خیال دل سے نکال دیا۔اس لیے کہ یہ وہی فطرت کا شیدائی گریف تھا جو ابھی پچھلے برس ہی سردی کے موسم میں، اتنی پابندی سے نہیں جیسی کہ پہلے کیا کرتا تھا، بالٹک کی منجمد سطح پر گول سوراخ بنا کر اس میں نہایا کرتا تھا، کس طرح اچانک بوڑھا ہونے اور آئے دن بیمار رہنے لگا ہے؟ بستر میں لیٹے رہنے کا حق تو اس کی بیوی کے لیے مخصوص تھا، جس میں دو افراد آسانی سے سو سکتے تھے؛ مزید یہ کہ میں جانتا تھا کہ گریف کو بستر کے نرم گدوں سے نفرت ہے، اور وہ لکڑی کے تختوں پر سونا پسند کرتا ہے۔اس سبزی فروش کو ایسی کوئی بیماری نہیں تھی جو اس کو بستر سے لگا دیتی۔

میں بند دُکان کے سامنے کھڑا تھا اور پلٹ کر اپنی دُکان کی طرف دیکھا، اور یہ معلوم کر لیا کہ ماتسیرات اندر ہے؛ اس کے بعد ہی میں نے اپنے نقارے پر ایک دو ضربیں لگائیں، اس امید پر کہ مسز گریف کے حساس کان میری طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ ابھی ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی تھی کہ دُکان کی دائیں جانب کی کھڑکی کھل گئی۔ لینا گریف اپنے شب خوابی کے بالا پوش میں، بالوں میں لگے ہوئے گرگر سمیت، تکیے سے اپنی چھاتیاں ڈھانکے ہوئے، کھڑکی پر جمی ہوئی برف کے پیچھے سے نظر آئی۔ "کیا بات ہے آسکر، اندر آجاؤ، اندر آجاؤ۔ کس بات کا انتظار کر رہے ہو، باہر کتنی سردی ہو رہی ہے۔"

میں نے اپنے چوبِ نقارہ کی ایک چھڑی سے دُکان کی نمائشی کھڑکی کے آہنی پردے پر دستک دی۔

"البریخت!" وہ چلّائی، "البریخت! کہاں ہو تم؟ کیا بات ہے؟"

اپنے شوہر کو پکارتی ہوئی وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ دروازہ بند ہو گیا، میں اس کو دُکان میں چلتے سن رہا تھا اور پھر اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ وہ تہہ خانے میں چلّائی، مگر میں دیکھ نہیں سکا کہ وہ کیوں چیخ رہی تھی، اس لیے کہ تہہ خانے کا وہ جھروکا بھی بند تھا جس کے ذریعے جنگ کے زمانے میں آلو کی رسد پہنچائی جاتی تھی۔ جھروکے کو بند کرنے والے کولتار لگے تختوں کی جھری میں سے جھانک کر میں نے دیکھا؛ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ میں تہہ خانے کی کھڑکیوں سے اوپر کے زینے دیکھ سکتا تھا، ان میں ایک پر کچھ سفید سی شے پڑی ہوئی تھی؛ شاید مسز گریف کے تکیے کا غلاف ہو گا۔

اس نے زینے پر تکیہ گرا دیا ہوگا، اس لیے کہ اب وہ تہہ خانے میں نہیں تھی، مگر ایک بار پھر دُکان میں، اور بعد میں خواب گاہ میں چیخنے لگی تھی۔ اس نے فون اُٹھایا، چیخی، اور ٹیلی فون پر نمبر ملایا؛ ٹیلی فون میں چیخی؛ مگر آسکر کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا ہے، بس جتنا سن سکا تھا وہ اتنا تھا "ایکسیڈنٹ" اور گھر کا پتا، "لیبس وِیگ 24" جو اُس نے کئی بار چیخ کر کہا تھا۔ پھر اس نے فون بند کر دیا اور کچھ لمحوں بعد، اپنا بالا پوش پہنے، بغیر تکیے کے، مگر بالوں میں گرگر لگے ہوئے تھے، وہ اپنے وسیع، دوجڑی بُنٹے سمیت،

جس سے میں خوب آشنا تھا، جمی برف پر کھڑی تھی۔ وہ اوپر کی طرف دیکھ کر اس قدر چیخی کہ سڑک تنگ ہو گئی، اور آسکر کو ایسا محسوس ہوا گویا شیشے کے ٹکڑے اڑنے شروع ہونے والے ہیں، مگر ایک بھی کھڑکی نہیں ٹوٹی۔ بہت سی کھڑکیاں کھل ضرور گئیں، پڑوسیوں نے جھانکا، عورتوں نے سوال کیے، مرد دوڑتے ہوئے آئے، لاوبشاد گھڑی ساز، اپنی جیکٹ پہنتا ہوا، بوڑھا بائی لانڈ، مسٹر رائس برگ، لمبی شوبکی درزی، اور مسٹر اِش، قریب ترین مکانات کے دروازوں سے نکلے، حتیٰ کہ پروست، حجام نہیں، کوئلہ فروش بھی اپنے بیٹے کے ساتھ باہر نکلا۔ ماتسیرات اپنے سفید رنگ کا بچوں جیسا لبادہ اُڑاتا اور ماریا گرٹ کو گود میں اُٹھائے، دونوں ہماری دُکان کے دروازے کے پاس کھڑے ہو گئے تھے۔

مجھے ان پریشان بالغ لوگوں کے مجمعے میں گھل مل جانے میں اور ماتسیرات کو نظر انداز کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی، جو میری تلاش میں تھا۔ وہ اور گھڑی ساز لاوبشاد پہلے آدمی تھے جو حرکت میں آئے تھے۔ انھوں نے گریف کے گھر میں کھڑکی کے ذریعے داخل ہونے کی کوشش کی تھی، مگر مسز گریف نے کسی کو داخل ہونا تو در کنار، اوپر چڑھنے کی بھی اجازت نہیں دی۔ کھرونچتے، روتے پیٹتے اور کاٹتے ہوئے بھی اسے زیادہ زور سے چیخنے کا وقت مل گیا تھا، جس کا کچھ حصہ تو سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا۔ ایمبولینس والے گھر میں داخل ہونے والے پہلے لوگ ہونے چاہئیں: اس نے کافی دیر ہوئی فون کر دیا تھا، دوبارہ فون کرنے کی ضرورت نہیں تھی، اس کو معلوم تھا کہ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیے۔ اور اِن تمام لوگوں کو اپنے کام کاج میں مشغول ہو جانا چاہیے کہ بغیر مداخلت بھی حالات کافی خراب تھے۔ تجسس، تجسس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ آپ دیکھ سکیں کہ جب مشکل پڑی تو آپ کے دوست کون لوگ تھے۔ اپنے رونے کے درمیان، اس نے مجھے کھڑکی کے باہر ضرور دیکھا ہوگا، اس لیے کہ اس نے مجھے پکارا تھا، اور آدمیوں کو بھگا دینے کے بعد میری طرف ہاتھ بڑھائے تھے اور کسی نے — آسکر اب بھی کہتا ہے کہ وہ لاوبشاد تھا — ماتسیرات کے اختلاف کے باوجود — مجھے اندر پہنچانے کے لیے اُٹھایا تھا۔ کھڑکی کے قریب پہنچنے سے پہلے ماتسیرات نے مجھے تقریباً پکڑ لیا تھا، مگر لینا نے ہاتھ بڑھا کر مجھے لے لیا، اپنے بالاپوش سے چمٹا لیا اور چیخنا بند کر دیا تھا۔

اس کے بعد وہ مصنوعی رُلائی اور رُلائی کے درمیان لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔

ایک لمحہ قبل مسز گریف کی چیخوں نے پڑوسیوں کو بے شرمی سے اشاروں سے بات کرنے پر مجبور کر دیا تھا؛ اب اس کی مسلسل ہلکی ریں ریں نے ان کو کھڑکی کے قریب خاموش، شرمندہ اور تقریباً خوف زدہ مجمعے میں تبدیل کر دیا تھا، جو اس کے رونے سے تقریباً خوف زدہ ہو گیا تھا، جس کی امیدیں، تجسس اور ہم دردیاں اس لمحے پر مرتکز ہو گئی تھی جس میں ایمبولینس کو پہنچ جانا چاہیے تھا۔

آسکر کو بھی مسز گریف کی ریں ریں ناگوار گزر رہی تھی۔ میں ذرا اور نیچے کہیں کھسک جانا چاہتا تھا، جہاں میں اس کے بین سے زیادہ قریب نہ رہوں۔ میں اس کی گردن پر اپنی گرفت چھوڑ کر جزوی طور پر کھڑکی پر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا، مگر آسکر کو جلدی احساس ہو گیا تھا کہ اس پر نظر رکھی جا رہی ہے: ماریا اپنے بچے کو گود میں لیے، دُکان کے دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ میں نے ایک بار پھر حرکت کرنے کی کوشش کی، اس لیے کہ میں اپنی حالت کی ناموزونیت سے اچھی طرف واقف تھا، مگر میں صرف ماریا کے بارے میں سوچ رہا تھا: مجھے پڑوسیوں کی ناپسندیدگی کی بالکل پروا نہیں تھی۔ میں گریفیائی ساحل سے نکل بھاگا، جو میرے مزاج کے لیے بہت نامناسب ہو رہا تھا، اور مجھے بستر کی یاد دلا رہا تھا۔

لینا گریف کو میری پرواز کی خبر نہیں تھی یا اس میں ایک چھوٹے سے جسم کو روک لینے طاقت نہیں رہی تھی جو اتنی دیر سے اس کو متوازن کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یا شاید اسے شبہ ہوا تھا کہ آسکر ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو جانا چاہتا ہے، کہ اس کی چیخوں سے ایسی آواز پیدا ہو گئی ہے جو ایک جانب تو دیوار بن جائے گی، بستر سے لگی عورت اور نقارہ نواز کے درمیان سدِ صوت (sound barrier) بن جائے گی اور دوسری جانب اس دیوار کو ریزہ ریزہ کر دے گی جو ماریا اور میرے درمیان کھڑی ہو گئی ہے۔

میں گریف کی خواب گاہ میں کھڑا تھا۔ میرا نقارہ آڑا ترچھا اور غیر محفوظ حالات میں لٹک رہا تھا۔ آسکر کمرے سے اچھی طرح واقف تھا، وہ اس زردی مائل سبز دیواری کاغذ کے لکھے کو کہیں بھی زبانی سنا سکتا تھا۔ واش بیسن صابن، کل کے جھاگ سمیت، اپنی

جگہ پر تھا۔ ہر شے اپنی جگہ پر تھی اور بیٹھنے، لیٹنے اور دھکے لگنے کے باوجود مجھے سارا فرنیچر ستھرا لگ رہا تھا، یا کم از صاف کیا ہوا لگ رہا تھا، گویا ان تمام چیزوں کو جوا پنے چار پیروں پر سختی سے جمی دیوار سے لگی تھیں، چیزوں کی اور اس کے بعد خوف دلانے والی خنک تابندگی کے لیے لینا گریف کی مصنوعی ریں ریں کی ضرورت تھی۔

دُکان کو ملانے والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اپنی مرضی کے خلاف آسکر اس کمرے میں گیا جو مٹی اور پیاز کی بو سے بسا ہوا تھا۔ شٹر کی درزوں سے آتی ہوئی دھوپ نے فضا میں چمکتے ہوئے مٹی کے ذرّوں سے دھاریاں سی بنا دی تھیں۔ گریف کی آواز اور موسیقی کی مشینیں نصف اندھیرے میں چھپی ہوئی تھیں، روشنی صرف چند چیزوں پر پڑ رہی تھی: ایک چھوٹی سی گھنٹی پر، ایک چوبی ستون پر، نقارہ نوازی کی مشین کے ایک حصے پر اور ترازو پر رکھے ہوئے آلوؤں پر۔

ہماری دُکان کے تہہ خانے والے دروازے جیسا دروازہ، جو تہہ خانے میں لے جاتا تھا، کھلا ہوا تھا۔ مسز گریف چیخ کی عجلت میں تختے سے بنے ڈھکنے کو ٹیک لگانا بھول گئی تھی۔ نہ ہی اس نے کاؤنٹر سے لگے آنکڑے کو اس کے سوراخ میں لگایا تھا۔ ہلکے سے دھکے سے آسکر نیچے گر سکتا تھا اور دروازہ بند ہو سکتا تھا۔

ان تختوں کے پیچھے میں ساکت کھڑا ان کی دھول اور پھپھوند کی بو میں سانس لے رہا تھا اور اس تیز روشن مستطیل حصے کو غور سے دیکھ رہا تھا جس کے اندر زینے کا اور کنکریٹ کے فرش ایک حصہ تھا۔ اس مستطیل کے داہنی جانب اوپر کی طرف ایک پلیٹ فارم بنا ہوا تھا، جو ظاہر ہے کہ گریف نے حال میں حاصل کیا تھا، اس لیے کہ پہلے میں نے تہہ خانے میں جاتے ہوئے اسے نہیں دیکھا تھا، مگر آسکر ایک پلیٹ فارم کو اتنی مشغولیت سے دیکھنے کی خاطر اتنی دیر تک تہہ خانے میں ٹھہر نہیں سکتا تھا؛ جس شے نے اس کی وجہ اپنی طرف مبذول کرائی تھی وہ دو عدد اونی موزے تھے، اور دو کالے فیتوں والے جوتے تھے جو داہنے کونے میں رکھے ہوئے تھے۔ اگرچہ میں ان کے تلے نہیں دیکھ سکا تھا، پھر بھی فوراً سمجھ گیا تھا کہ یہ گریف کے پہاڑ چڑھنے والے جوتے ہیں۔ میں نے سوچا، ایسا ہو نہیں سکتا کہ گریف تہہ خانے میں بالکل تیار پہاڑ پر چڑھنے کے ارادے سے کھڑا ہو اور

جوتے تیار نہ ہوں، بلکہ پلیٹ فارم کے بالکل اوپر، ہوا میں لٹک رہے ہوں، مگر یہ ممکن ہے کہ جوتوں کی نوک نیچے کی طرف ہو، بہت زیادہ نہیں، مگر تختوں سے بالکل لگی ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے، میرے خیالوں میں، گریف جوتے کی نوک کے بل، مزاحیہ، مخنثی کسرت کرنے کے انداز میں کھڑا ہوا تھا، جس کی اس جیسے کسرتی اور فطرت کے شیدائی سے توقع کی جا سکتی تھی۔

اس مفروضے کی تفتیش کرنے کے لیے، یعنی اگر اس کی تصدیق ہوجاتی تو، ہم سبزی فروش پر کچھ دیر کے لیے ہنس لیتے؛ میں احتیاط سے عمودی ڈھلوان والے زینوں سے اترتا، اور مجھے اچھی طرح یاد ہے، کسی قسم کی کوئی شے بنانے اور خوف دور کرنے کے لیے نقارے پر "— کہاں ہے وہ بھتنی ...... کلوٹی سی بھتنی" — بجاتا چلا گیا۔

صرف اس وقت جب آسکر کانکریٹ کے فرش پر پیر جما کر کھڑا ہوا تب اس نے تفتیش شروع کی — پیاز کے خالی بوروں کے ذریعے، پھل کی خالی پیٹیوں کے ذریعے — اور کرتا گیا، جب تک کہ اس کی آنکھیں اس جگہ تک پہنچ نہیں گئی تھیں جہاں گریف کے جوتے لٹکے یا اپنی نوک پر کھڑے رہے ہوں گے۔

بلا شبہ میں جانتا تھا کہ گریف لٹکا ہوا تھا۔ جوتے بھی لٹکے تھے، لہٰذا بھدی بُنائی والے ہرے رنگ کے موزے بھی لٹکے ہوں گے۔ میرا تصور دیکھ رہا تھا...... موزوں کے کناروں کے اوپر بالغوں کے برہنہ گھٹنے، پتلونوں کے کناروں تک بالوں بھری جانگھیں؛...... اور اس موقعے پر میرے اعضائے تناسل سے آہستہ آہستہ ایک طرح کی کاٹ، ایک حساس چبھن شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ میرے سُرین سے ہوتی ہوئی پشت تک پہنچ گئی، جو اچانک سن ہو گئی، میرے حرام مغز پر چڑھتی، گردن کے عقب میں جا کر بیٹھ گئی، جو مجھ کو ٹھنڈا گرم کرنے لگی تھی، مگر ایک بار پھر میری ٹانگوں کے درمیان دوڑ گئی، میرے فوطے سکڑنے لگے، حتیٰ کہ اتنے چھوٹے ہو گئے کہ نہ ہونے کے برابر ہو گئے، ایک بار پھر چبھن اوپر کی طرف اُچھلی، میری پشت پر، میری گردن پر چلی اور پھر کم ہو گئی — آج بھی آسکر کو وہی بہ زور منہ بند کیے جانے کا احساس ہوتا ہے، اور جب کوئی اس کی موجودگی میں کسی کو لٹکانے (پھانسی) کی بات کرتا ہے، خواہ وہ دھلے کپڑے لٹکانے کی بات ہی کیوں نہ ہو تو اُسے اسی طرح چاقو کا آرپار

ہوا یاد آنے لگتا ہے۔ وہ صرف گریف کے پہاڑ چڑھنے والے جوتے کی، اس کے موزوں کی، اور گھٹنوں کی، دھڑ کی کی جو لٹک رہا تھا، بات نہیں تھی؛ پورا گریف گردن سے لٹکا ہوا تھا، اور اس کے چہرے پر تناؤ کے تاثرات تھیٹری بناوٹ سے مبرّا نہیں تھے۔ حیرت انگیز طور پر تمام کاٹ اور چبھن کی سنسنی جلد ہی ختم ہو گئی۔ اب میں گریف کو اس کیفیت میں دیکھنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا؛ اس لیے کہ کسی لٹکے ہوئے آدمی کا انداز ویسی ہی عام کیفیت کا ہوتا جیسا کہ ہاتھوں کے بل چلتے ہوئے آدمی کا، سر کے بل کھڑے آدمی کا، یا کسی انسان کا جو سواری کے لیے چار پیروں کے گھوڑے پر سوار ہونے کی واقعی بدقسمت کیفیت میں ہوتا ہے۔

اور پھر منظر کی ترتیب بھی تو ہوتی ہے۔ صرف اب آسکر کو پتا چل رہا تھا کہ گریف کن مشکلات سے گزرا ہو گا۔ اس کیفیت اور اس منظر کا جس میں گریف لٹکا تھا، غیر ضروری حد تک مطالعہ کیا گیا تھا۔ سبزی فروش نے اپنی موت کی نوعیت کا خود تعین کیا تھا جو اس کے نزدیک موزوں تھی: ایک متوازن موت! جس کو اپنے دورِ حیات میں مشکلات کا سامنا تھا، جسے اوزان کے محکمے سے ناگوار خط کتابت کرنی پڑتی تھی، جس کے باٹ کئی بار قبضے میں لے لیے گئے تھے، جس پر پھل اور ترکاریوں کے وزن میں سقم پر جرمانے عائد کیے گئے تھے، اور اب، اس نے اپنے آپ کو آلو کے آخری اونس سے تول لیا تھا۔

ہلکی سی چمک دار رسّی، میرے خیال میں جس پر صابن لگایا گیا تھا، اس بَلّی کے سہارے دو شہتیروں پر لگائی گئی تھی جسے، اپنی زندگی کے آخری دن گریف نے ایک مچان بنا لیا جس کا واحد مقصد اس کا آخری مچان کی خدمت انجام دینا تھا۔

بلا شبہ سبزی فروش نے کنجوسی نہیں کی تھی، اس نے بہترین لکڑی استعمال کی تھی۔ جنگ کے دنوں میں تعمیراتی مال کی کس قدر کمی تھی، وہ تختے اور شہتیریں بڑی مشکل سے ہاتھ لگے ہوں گے۔ گریف نے لکڑی کے بدلے میں پھل دیے ہوں گے۔ مچان میں آراستہ کرنے والی اشیا کی کمی نہیں تھی۔ پلیٹ فارم پر پہنچنے کے لیے زینے پر سے بھی — آسکر نے دکان سے اس کا ایک کونا دیکھا تھا۔ ایسا معیار کا خیال رکھا گیا تھا کہ پوری تعمیر رفعت پذیری کی حدود میں داخل ہو گئی تھی۔

نقارہ نواز مشین کی طرح، موجد نے جسے ماڈل کی طور پر استعمال کیا ہوگا، گریف اور اس کا پائننگ، دونوں مچان کے فریم کے اندر لٹکے ہوئے ملے تھے۔ چار سفیدی شدہ آڑی شہتیروں کے تقاطع میں، اس کے اور پائننگ آلوؤں کے درمیان ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ ذہانت سے لگائی گئی گرہ سے، جس کا ہنر اسکاؤٹ ہی جانتے ہیں، اس نے آلو کے جھابے کو مرکزی رسی سے باندھا دیا تھا۔ چوں کہ مچان کے اندرون کو روشن کرنے کے لیے جسے سفید پینٹ کیا تھا، بجلی کے چار بلب استعمال کیے گئے تھے، پورا علاقہ دمک رہا تھا۔ اپنی موجودگی سے پلیٹ فارم کی بے حرمتی کیے بغیر، آسکر آلو کے جھابے کے اوپر تار سے بندھے ہوئے وفتی کے ایک ٹکڑے پر لکھی عبارت پڑھنے میں کامیاب ہو گیا تھا ...... "تین اونس کم 165 پاؤنڈ" ......

گریف بوائے اسکاؤٹ کی وردی میں لٹکا تھا۔ اپنے آخری دنوں میں اس نے جنگ کے پہلے کے برسوں کی وردی پہننی شروع کردی تھی، مگر یہ وردی اس پر تنگ تھی۔ وہ سب سے اوپر والا بٹن بند نہیں کر سکا تھا اور بیلٹ بھی نہیں باندھ سکا تھا، جو قرینے سے تراشی گئی وردی کے منہ پر تمانچا تھا۔ اسکاؤٹ رسم کے مطابق گریف نے [خوش قسمتی کے نشان کے طور پر] اپنے بائیں ہاتھ کی دوسری انگلی پہلی انگلی پر چڑھائی تھی۔ لٹکنے سے قبل اپنی اسکاؤٹ ہیٹ دائیں ہاتھ سے باندھ لی تھی۔ گردن کے رومال سے پرہیز کرنا پڑا تھا۔ اپنی قمیص کا کالر بھی بند نہیں کر سکا تھا، اور اس کے سینے کے گھنگھریالے بالوں کا ایک گچھا گریبان سے جھانک رہا تھا۔

پلیٹ فارم کے زینوں پر چند تارا پھول پڑے ہوئے تھے، جس کے ساتھ نامناسب طور پر، سبز پارسلے کے کچھ ڈنٹھل بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ زینوں پر بکھیرنے کے لیے پھول کم پڑ گئے ہوں گے، اس لیے اس نے زیادہ تر تارا پھول اور چند گلاب ان چار چھوٹی چھوٹی تصویروں پر ہار کے طور پر، استعمال کیے تھے جو مچان کے چار ستونوں پر ٹانگی گئی تھیں۔ بائیں جانب آگے کی طرف، شیشے کے فریم میں بوائے اسکاؤٹ کا بنیاد گزار بادن۔ پاول لٹکا ہوا تھا۔ بائیں جانب عقب میں، بغیر فریم کے سینٹ جارج۔ دائیں جانب اگلے ستون پر، شیشے والے فریم میں ایک نہایت خوب صورت لڑکے کی تصویر، جس کی عمر

سولہ سال رہی ہوگی؛ ایک اور تصویر تھی اس کے پسندیدہ ہورسٹ ڈوناتھ کی جو بعد میں لیفٹیننٹ ڈوناتھ بن گیا تھا، جو ڈونٹوں (Donets) کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

شاید مجھے چند لفظ کاغذ کے ان پھٹے ہوئے ٹکڑوں کے بارے میں بھی کہنے چاہئیں جو تارا پھول اور پارسلے کے درمیان پڑے ہوئے تھے۔ ان کو اس طرح پھاڑا گیا تھا کہ آسانی سے جوڑے جا سکتے تھے۔ آسکر نے ان کو یکجا کیا تو وہ عدالت کا سمن تھا، جو اخلاقی الزامات کی جواب دہی کے لیے عدالت میں حاضری کے لیے بھیجا گیا تھا۔

ایمبولینس کی آواز نے مجھے سبزی فروش کی موت کے بارے میں مراقبے سے چونکا دیا۔ ایک لمحے بعد تہہ خانے کے زینوں پر دھم دھم کرتے کچھ لوگ وارد ہوئے، پلیٹ فارم کے زینوں پر چڑھے اور لٹکے ہوئے گریف کو تھام لیا۔ جوں ہی انھوں نے لٹکے ہوئے گریف کو اوپر کی طرف اٹھایا، پاسنگ بنا آلو کا جھابا دھڑام سے نیچے گرا اور اسی قسم کی میکانزم سے بنی نقارہ نوازی کی مشین چل پڑی جسے پلائی ووڈ میں بند کر کے مچان کے اوپر نصب کیا گیا تھا۔ جب کہ نیچے کی جانب پلیٹ فارم پر آلو لڑھکنے لگے تھے، کچھ کانکریٹ کے فرش پر بکھر گئے تھے اور اوپر لکڑی، براس اور شیشے سے بنی مشین کا آرکسٹرا بجنے لگا تھا: یہ البریخت کا عظیم الشان اختتامیہ تھا۔

آلو کے سیلاب اور گریف کی نقارہ نواز مشین کے شور وغوغا کی گونج کو نقارے کے ذریعے پیش کرنا آسکر کے بس میں نہیں — کچھ ایمبولینس والوں کے لیے یہ ایک بار آور وہ کے مترادف تھا۔ اس کے باوجود شاید اس لیے کہ میرا نقارہ گریف کی موت سے متعلق واقعات کے ایک بڑے حصے کا گواہ تھا، میں اکثر و بیش تر گریف کی موت پر ایک مخلص تمر — گریف کی موت کی نظم — بجالیتا ہوں۔ جب ملاقات کے دن آنے والا میرا کوئی دوست یا میرا نگہبان برونو، مجھ سے پوچھتا ہے کہ اس تمر یا نظم کا نام کیا ہے تو میں اس کا عنوان بتا دیتا ہوں:

"165 پاؤنڈ"

# بِبرا کا تھیٹر، محاذِ جنگ پر

1942 جون کے درمیان میرا بیٹا کُرٹ ایک برس کا ہو گیا تھا۔اس کے باپ آسکر کے نزدیک اس سالگرہ کی زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ مزید دو برس، آسکر نے اپنے بارے میں سوچا۔ اکتوبر 1942 میں گریف سبزی فروش نے ایسی ذہانت سے بنائے ہوئے پھانسی گھاٹ پر گلے میں پھندا لگا کر خودکشی کر لی تھی کہ اس کے بعد سے میں، آسکر، اس کی موت کو ایک شریفانہ موت کی صورت دیکھتا ہوں۔ جنوری 1943 میں اسٹالن گراڈ کے بارے میں بہت سی باتیں ہوئی ہیں، مگر جب سے ماتسیرات نے اس شہر کا نام اس انداز میں لیا تھا جیسے کہ پہلے 'پرل ہاربر'، 'طبرق' اور 'ڈنکرک' کے نام لیے جاتے تھے اور شہروں میں ہونے والے واقعات کے مقابلے میں، خاص اعلانات کے ذریعے جن کے نام سے میں واقف ہوا تھا، وہاں ہونے والے واقعات پر میں نے مزید توجہ نہیں دی تھی، اس لیے کہ 'وہیر ماخت' کے اعلانات اور پھیلائی ہوئی خبریں آسکر کی جغرافیہ کا اسکول بن چکی تھیں۔ بھلا اور کس طرح مجھے 'کوبان'، 'میوس' اور 'ڈان' کے دریاؤں کے حالات کا علم ہوتا؛ ریڈیو پر کیے جانے والے تذکروں کے علاوہ کون مجھے مشرق کے جزائر 'ایلیوشیئن'، 'اَتو'، 'کِسکا' اور 'اَدَک' میں ہونے والے واقعات بتاتا؟ لہٰذا جنوری 1943 میں مجھے پتا چلا تھا کہ 'اسٹالن گراڈ' دریائے 'وولگا' پر واقع ہے؛ مگر مجھے ماریا کے مقابلے میں Sixth Army کے حال میں کم دلچسپی تھی؛ جس پر اس وقت 'گرِپے' [انفلوئنزا] کا ہلکا سا حملہ ہو چکا تھا۔

ماریا کا 'مگر پنے' ختم ہوا اور جغرافیہ کا سبق جاری رہا: آسکر، آج بھی سوویت روس کے کسی نقشے سے، آنکھیں بند کر کے بھی، Rzev اور 'ویمیا نسک' کو فوراً تلاش کر سکتا ہے۔ ماریا ابھی شفایاب ہوئی تھی کہ گرٹ کو کالی کھانسی ہو گئی۔ جب میں تیونس کے کچھ شدت سے متنازعہ نخلستانوں کے مشکل نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا، افریقا میں جرمنی کی فوجی مہم کے ساتھ ہی ساتھ گرٹ کی کالی کھانسی رفع ہو گئی تھی۔

اوہ، خوشی کا مہینہ مئی: ماریا، ماتسیرات، اور گریتچن شیفلر نے گرٹ کی سالگرہ کی تیاریاں کیں۔ آسکر نے بھی ہونے والی تقریبات میں خاصی دل چسپی دکھائی: اس لیے کہ 12 جون کے بعد یہ مختصر سال ہوگا۔ اگر میں موجود ہوتا تو اس کی دوسری سالگرہ پر اپنے بیٹے کے کان میں سرگوشی میں کہتا، ''بس انتظار کرو، جلد ہی تم بھی نقارہ نوازی کرو گے۔'' مگر ایسا ہوا کہ 1943 کے جون کی 12 کے بعد آسکر' واتشیک'، 'لانگ فور' میں نہیں رومیوں کے بسائے ہوئے قدیم شہر میتز ' میں ہوگا۔ میری غیر موجودگی واقعی اتنی طویل ہو گئی تھی کہ آسکر کو 12 جون 1944 تک، ہوائی حملوں اور گرٹ کی تیسری سالگرہ سے پہلے، اپنے مولد واپس پہنچنے میں بہت مشکل پیش آئی تھی۔

کون سی مصروفیت مجھے بدیس لے گئی تھی؟ اس پر میں اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا: 'پیستالوسی' اسکول کے باہر، جس کو ہوائی فوج کی بیرک بنا دیا گیا ہے، میری ملاقات ماسٹر بیرا سے ہوئی تھی مگر وہ از خود تو مجھے باہر جانے پر راغب نہیں کر سکتا تھا۔ بیرا کے بازو پر رگونا لٹکی ہوئی تھی، سینورا روز ویدا، وہی مشہور اطالوی خواب خرام۔

آسکر' کلائن ہامر ویگ' سے آ رہا تھا۔ وہ گریتچن شیفلر سے ملنے گیا تھا اور روم کی جد و جہد کی ورق گردانی کر چکا تھا۔ پھر بھی، اسے پتا چلا تھا کہ 'بیلی ساریئس' کے زمانے میں بھی تاریخ میں اونچ نیچ ہوتی رہتی تھی، اس کے باوجود فتوحات و شکست پر دریا پار اور شہروں میں، جغرافیائی سطح پر جشن منائے جاتے تھے یا تأسف کیا جاتا تھا۔

میں 'فروبیل ویڑے' سے گزر کر آیا تھا، جو پچھلے چند برسوں کے دوران Organization Todt کے لیے گودام میں تبدیل کر دیا گیا تھا: میں 'ھینگی نے' کے

بارے میں سوچ رہا تھا—جہاں 552 میں نارسیس نے توتیلا کو شکست دی تھی— مگر وہ فتح نہیں تھی جس نے میرے خیالات کو عظیم آرمینیائی نارسیس کی طرف راغب کیا تھا؛ نہیں، جس چیز نے مجھے اس کی جانب راغب کیا تھا وہ اس کا جثہ تھا۔ نارسیس کوزہ پشت تھا، نارسیس قد میں اپنی عمر سے چھوٹا، بدشکل، بونا، ٹھگنا تھا۔ میرے خیال میں وہ آسکر سے کسی بچے کے سر برابر ہی بڑا تھا۔ اس وقت تک میں پیستالوتسی اسکول کے باہر کھڑا تھا۔ میں نے مماثلت کے شوق میں کسی ہوائی فوج کے نشان کی طرف دیکھا جو بہت کم وقت میں بڑی ہوگئی تھی۔ یقینی طور پر میں نے اپنے آپ سے کہا تھا، نارسیس نے کبھی کوئی نشان نہیں لگایا تھا، اس کو ضرورت ہی نہیں تھی۔ اور وہیں اسکول کے صدر داخلے میں وہ عظیم جنرل بذاتِ خود مجھے کھڑا ملا؛ اس کے بازو میں ہاتھ ڈالے ایک خاتون کھڑی ہوئی تھی—نارسیس کیوں اپنے ساتھ کوئی خاتون نہ رکھے؟ جوں ہی انھوں نے میری طرف قدم بڑھائے وہ ہوائی فوج کے بڑے افسران کے سامنے بونے لگنے لگے تھے، اس کے باوجود وہ ناف تھے وہ مرکز تھے، ان کے اطراف تاریخ اور روایت کا ہالا بنا ہوا تھا، وہ ہوا کے ناتجربے کار سورماؤں کے درمیان پہاڑیوں کی مانند بوڑھے تھے—یہ توتیلاؤں اور تیجاؤں سے بھری بیرکیں کیا چیز تھیں، مستول کے قد کے یہ Ostrogoths ایک آرمینیائی بونے کے سامنے کیا حیثیت رکھتے تھے جس کا نام نارسیس تھا؟ نپے تلے قدموں سے نارسیس آسکر کی طرف بڑھا؛ اس نے اشارہ کیا اور اس کے بازو میں ہاتھ ڈالے خاتون نے بھی اشارہ کیا۔ احترام کے ساتھ ہوائی فوج ہمارے راستے سے ہٹ گئی، جب بیرا اور رگونا نے مجھے خوش آمدید کہا۔ میں اپنے لب بیرا کے کان تک لے گیا اور سرگوشی میں کہا، ''پیارے ماسٹر میں تو آپ کو عظیم جنرل نارسیس سمجھا تھا؛ میں کھلاڑی بیلی ساریئس کے مقابلے میں اس کا زیادہ احترام کرتا ہوں۔''

بیرا نے بڑے احترام سے میری تعریف رد کر دی، مگر رگونا تقابل سے خوش ہوئی تھی۔ کتنی خوب صورتی سے اس کے لب ہلے تھے جب اس نے کہا تھا، ''ہمارا نوجوان دوست بیرا اتنی غلطی پر کیوں ہے؟ کیا تمھاری رگوں میں شہزادے ایوجین کا خون رواں نہیں؟ یا وہ تمھارا جد نہیں؟

ہیرا نے میرا بازو تھاما اور ایک طرف لے گیا، اس لیے کہ ہوائی فوج والے مسلسل ہماری تعریف کر رہے تھے اور اپنی چھیدتی نگاہوں سے ہمیں پریشان کر رہے تھے۔ جب ایک لیفٹیننٹ نے، اور ایک لمحے بعد دو سارجنٹوں نے ہیرا کو سیلوٹ کیا — جو ماسٹر کیپٹن کے دو فیتے لگائے ہوئے تھا اور آستین پر ایک روایتی پٹی "پروپیگنڈا کمپنی" کی لگی ہوئی تھی — تو ہوابازوں نے ریگوٹا سے آٹوگراف کی درخواست کی، اور حاصل بھی کر لیا، ہیرا نے اپنی سرکاری کار کے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور ہم کار میں داخل ہو گئے۔ جب ہم چلنے لگے تو ہوائی فوج والوں نے خوب تالیاں بجائیں۔

ہم 'پیتا لوسی اشتراسے'، 'ماگڈے برگر اشتراسے'، 'میرے سانگر' کی طرف گئے۔ ہیرا ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہم 'ماگڈے برگر اشتراسے' پر تھے کہ ریگوٹا نے میرے نقارے کے بہانے سے اپنا کام شروع کر دیا، "تم اب بھی اپنے نقارے کے وفادار ہو، پیارے دوست؟" اس نے بحیرۂ روم کے لہجے میں سرگوشی کی، جو میں نے بہت عرصے سے نہیں سنی تھی۔ "اور عام طور پر تم کتنے وفادار رہے ہو؟" آسکر نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ اپنی پیچیدہ جنسی زندگی کا ذکر کیا، مگر مسکراتے ہوئے اس خواب خرام کو پہلے اپنے نقارے کو سہلانے دیا، پھر اپنے ہاتھوں کو، جو نقارہ پکڑے ہوئے تھے، جنوب کے انداز میں زیادہ، اور زیادہ سہلانے دیا۔

ہم 'میرے سانگر' کی طرف مڑے اور پانچ نمبر ٹرام کی پٹڑیوں پر چلتے رہے، اور میں نے اس کا ردِعمل بھی ظاہر کیا، میں نے اس کے بائیں ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے تھپتھپایا، جب کہ اس کے دائیں ہاتھ نے میرے بائیں ہاتھ کو نرم دباؤ کا تحفہ دیا۔ ہم 'میکس ہالبے پلاٹز' سے گزر گئے، آسکر کو اترنے میں دیر ہو گئی تھی، جب میں نے عقب میں دیکھنے والے آئینے میں دیکھا کہ ہیرا کی چالاک، ہلکے بھورے رنگ کی، عمر رسیدہ آنکھیں ہمارے ہاتھ پھیرنے کی عمل کو دیکھ رہی تھیں، مگر ریگوٹا میرا ہاتھ پکڑے رہی، جسے اپنے دوست اور ماسٹر کی خاطر میں واپس لے لینا پسند کرتا۔ ہیرا عقبی آئینے میں مسکرایا، پھر اپنی نظریں پھیر لیں اور ڈرائیور سے باتیں کرنے لگا، جب کہ روزویٹا براہِ راست میرے ہاتھوں کو پُرجوشی سے سہلاتی اور دباتی رہی، اور میرے دل سے رقیق، سُریلے الفاظ سے بحیرۂ روم کے لہجے میں باتیں

کرتی رہی، اور ایک مختصر سی عملی تبدیلی کے بعد سے زیادہ وہ مہربان ہوتی گئی اور میری معقولیت اور خیالات کی پرواز کو مفلوج کر دیا۔ ہم 'ریحنس کولونی' پر تھے اور خواتین کی کلینک کے طرف بڑھ رہے تھے، جب رینگونا نے اقرار کیا کہ ان تمام برسوں کے دوران وہ مسلسل میرے بارے میں سوچتی رہی تھی، کہ اس کے پاس آج بھی فور سیزن ریستوران کا وہ گلاس موجود ہے جس پر میں نے اپنے گانے سے کچھ نشان بنائے تھے، کہ ہیرا لا جواب دوست اور ہمارے پیشے کا ساتھی ہے، مگر شادی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا: ہیرا کو اکیلے ہی رہنا پڑے گا۔ رینگونا نے یہ بات میرے ایک سوال کے جواب میں کہی تھی: اس نے ہیرا کو پوری آزادی دے رکھی تھی، اور وہ بھی اگرچہ نہایت رقیبانہ فطرت کا انسان ہے مگر وہ ان برسوں کے دوران سمجھ گیا ہے کہ رینگونا کا پلو اس سے نہیں بندھ سکتا، اور بہر حال محاذ کے تھیٹر کے ڈائریکٹر کی حیثیت میں اس کے پاس ازدواجی ذمے داریوں کے لیے وقت بھی نہیں ہوگا، اور جہاں تک طائفے کا سوال ہے تو وہ اوّل درجے پر ہے، امن کے زمانے میں وہ بہت آرام سے 'اسکالا' یا 'ونٹر گارڈن' میں کھیل پیش کر سکتا ہے۔ کیا میں، آسکر، اپنی تمام خداداد صلاحیتوں کو ضائع کر دینا چاہتا ہوں، میں [روزویتا کے ساتھ] ایک آزمائشی برس کے تعلقات میں دل چسپی رکھتا ہوں، میری عمر یقینی طور پر ایک برس کی [جنسی] آزمائش کے لیے مناسب ہے، اور وہ مجھے یقین دلا رہی تھی کہ میں اس انتظام کو پسند کروں گا، مگر شاید میری، آسکر، کی کچھ اور ذمے داریاں بھی ہو سکتی ہیں، کیا یہ سچ ہے؟ اچھا ہے کہ وہ لوگ آج جانے والے ہیں، انھوں نے مغربی پروشیا کے شہر وائنسبرگ میں اپنا آخری کھیل پیش کیا ہے اور وہ فرانس جا رہے ہیں، فی الوقت ان کو مشرقی محاذ پر بھیجے جانے کا خطرہ نہیں، جس کا بہت امکان تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں، آسکر خوش ہے کہ مشرق گزر گیا ہے، کہ میں پیرس جانے والا ہوں، جی ہاں، وہ یقیناً پیرس جانے والے تھے، کیا میں، آسکر، کبھی پیرس گیا ہوں؟ اچھا تو دوستو، رینگونا تمھارے سخت دل نقارہ نواز کو لبھا نہیں سکی ہے تو پیرس تم کو لبھائے گا، جاؤ!

جب وہ خواب خرام لڑکی یہ آخری الفاظ ادا کر چکی تو کار رُک گئی۔ پروشیائی وقفے وقفے سے 'ہنڈن برگ ایلی' کے پیڑ سبز ہوتے گئے تھے۔ ہم کار سے باہر نکلے اور

ڈرائیور سے انتظار کے لیے کہا۔فور سیزن ریستوران میں جانے کا جی نہیں چاہ رہا تھا، مجھے چکر آ رہے تھے اور تازہ ہوا کی ضرورت تھی۔ہم 'سینٹینس پارک' میں سیر کو چلے گئے، ہیرا میری دائیں جانب اور روزیودا بائیں جانب۔ہیرا نے پروپیگنڈا کمپنی کی نوعیت اور مقاصد کی تشریح کی۔ہیرا جنگی فن کاروں، جنگی نامہ نگاروں اور اپنے تھیٹر کی باتیں کرتا رہا۔روزیودا کے بجیرۂ رومی لب دور دراز کے شہروں کے نام اُگلنے لگے، جن کے نام میں نے ریڈیو پر سنے تھے۔ہیرا نے کہا کوپن ہیگن، روزیودا نے چپکے سے 'پالرمو' کہا۔ہیرا نے گا کر بلغراد کہا؛ روزیودا نے المیہ کردار کرنے والی کے لہجے میں رو کر کہا، ایتھنز۔ پیرس کے نام پر دونوں گرجے؛ اگر میں دوسرے شہروں کو نہیں دیکھ پایا تھا تب بھی، انھوں نے مجھے اطمینان دلایا کہ پیرس میرے نقصان کی تلافی کر دے گا۔اور آخر میں ہیرا مجھ سے محاذ کے تھیٹر کے ڈائریکٹر اور کپتان کے لہجے میں مخاطب ہوا جو کسی پیش کش کی طرح محسوس ہوا: ''ہمارے ساتھ آ جاؤ نوجوان! نقارہ نوازی کرو، گانے سے بیئر کے گلاس اور بجلی کے بلب توڑو۔ خوب صورت فرانس پر، ابدی جوان پیرس پر قابض جرمن فوج تمھارا شکریہ ادا کرے گی اور تمھاری تحسین کرے گی۔''

آسکر نے محض رسمی طور پر سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا۔تقریباً آدھ گھنٹے تک میں موسم بہار کے گل بوٹوں کے درمیان، ریگنا کے بغیر، ہیرا کے بغیر جو میرا دوست اور استاد ہے، تفریح کرتا رہا۔میں سوچتا رہا، اپنی پیشانی رگڑتا رہا، پیڑوں پر بیٹھی چھوٹی چھوٹی چڑیوں کو سنتا رہا، جیسا کہ میں نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا: ایک سیاہ چڑی نے مجھے بتایا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اچانک کوئی پر دار مخلوق تمام چڑیوں سے زیادہ زور سے بولتی سنائی دی، اور پھر میں نے کہا، ''میرے محترم استاد! فطرت اپنی دانائی اور فیض رسائی سے مجھے مشورہ دے رہی ہے کہ میں تمھاری پیش کش قبول کر لوں۔اب، اور اسی وقت سے، تم مجھے اپنے طائفے کا حصہ سمجھ سکتے ہو۔''

پھر، بالآخر، ہم فور سیزن رستوران میں داخل ہو گئے انیمیا کی ماری 'موکا' پی، اور میرے فرار کی تفصیلات پر باتیں ہوئیں، مگر میں نے اس کو فرار نہیں کہا، ہم نے اس کو رخصتی کا نام دیا تھا۔

ریستوران کے باہر ہم نے اپنے منصوبے کا خلاصہ طے کیا۔ تب میں نے رنگوا اور پروپیگنڈا کمپنی کے کپتان بیرا سے رخصت چاہی، جس نے سرکاری گاڑی کو میرے سپرد کرنے پر اصرار کیا۔ جب وہ دونوں شہر جانے کے لیے خراماں خراماں ڈھنڈن برگ ایلی' کی طرف چل پڑے تو کپتان کی گاڑی کا ڈرائیور، جو درمیانہ عمر کا ایک کارپورل تھا، مجھ کو 'لانگ فوز' لے گیا۔ اس نے مجھے 'میکس ہالبے پلاٹز' پر چھوڑ دیا؛ آسکر جیسے شخص کا، سرکاری حفاظتی گاڑی میں 'ولیبس ویگ' میں داخل ہونا لوگوں کے لیے ضرورت سے زیادہ توجہ کا باعث ہوا ہی تھا۔

میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ ماتسیرات اور ماریا سے ایک الوداعی ملاقات کے لیے گیا۔ ایک لمحے میں اپنے بیٹے کرٹ کے پالنے کی قریب کھڑا رہا؛ اور اگر میرا حافظہ ساتھ دے تو میرے ذہن میں کچھ پدرانہ خیالات بھی آئے اور میں نے سنہرے بالوں والے اس شریر پر ہاتھ پھیرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ ننھے کرٹ نے میرے اس عمل کو روکنے کی کوشش کی تھی، جب کہ ماریا نے کوئی پروا نہیں کی۔ کچھ حیرتوں کے ساتھ ماریا نے میری پیش دستی قبول کر لی، جو برسوں بعد میری پہلی کوشش تھی، اور محبت سے ان کا جواب بھی دیا تھا۔ ماتسیرات سے رخصت لینا مجھے حیرت انگیز حد تک مشکل لگا۔ وہ باورچی خانے میں کھڑا سرسوں کے ساس میں گردے پکا رہا تھا۔ میں اس کو پریشان کرنے سے گھبرا رہا تھا، مگر جب وہ بغیر دیکھے اپنے عقب میں باورچی خانے کی میز پر کچھ ٹٹول رہا تھا، تو آسکر سمجھ گیا؛ اس نے وہ چھوٹا سا تختہ جس پر کٹی ہوئی پارسلے رکھی ہوئی تھی، اُٹھایا اور اس کے حوالے کر دیا۔ آج بھی مجھے یقین ہے کہ میرے باورچی خانے سے چلے جانے کے بعد وہ حیران پریشان ہوا ہوگا کہ پہلے کبھی، آسکر نے ماتسیرات کو کوئی چیز اس طرح اُٹھا کر نہیں دی تھی۔

میں نے رات کا کھانا مدر ٹروزنسکی کے ساتھ کھایا؛ میں نے اسے خود کو نہلانے دھلانے اور بستر میں لٹانے دیا، اور اس وقت تک انتظار کیا جب تک وہ خراٹے نہیں لینے لگی تھی؛ اس کا ہر خراٹا اختتام پر سیٹی بن جاتا تھا۔ تب میں نے اپنی چپلیں تلاش کیں، کپڑے اٹھائے اور پنجوں کے بل چلتا ہوا کمرے میں اِدھر اُدھر گھوما جہاں بھورے بالوں والی چوہیا خراٹے لے رہی تھی، سیٹی بجا رہی تھی اور روز بروز بوڑھی ہوتی جا رہی تھی:

راہداری میں مجھے کنجی سے کچھ پریشانی ہوئی تھی، مگر بالآخر میں چٹخنی کو اس کی نالی سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ شب خوابی کے بالاپوش میں ملبوس، میں اپنے کپڑوں کا بنڈل، سیڑھی سے ہوتا ہوا، دو چھتی میں لے گیا۔ ہوائی حملے کے دفاع کے لیے جمع کی گئی ریت اور بالٹی سے ٹھوکریں کھاتا، اپنے چھپنے کی جگہ پہنچ گیا، جو چھت چھائے جانے کے کھپریل کے ڈھیروں اور اخبارات کے بنڈلوں کے پیچھے تھی، جنھیں ہوائی حملے سے دفاع کے قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہاں جمع کیا گیا تھا۔ اس جگہ مجھے وہ نقارہ بھی مل گیا جو میں نے ماریا سے چھپا کر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ مجھے راسپوتین اور گوئٹے کی ایک جلدی لائبریری بھی مل گئی تھی۔ کیا میں اپنے پسندیدہ ادیبوں کو بھی اپنے ساتھ لے چلوں؟

کپڑے پہنتے، گردن میں لٹکا اپنا نقارہ سنبھالتے، گیلس میں چوب نقارہ اُڑستے ہوئے، آسکر اپنے دو خداؤں ڈائینی سس (Dionysus)[انگوروں کی فصل کے خدا، جن سے وائن بنائی جاتی ہے]' اور اَپالو سے مذاکرات کرنے لگا تھا۔ خفیہ بلانوشی کے خدا کا مشورہ تھا کہ پڑھنے کی کوئی شے اپنے ساتھ نہ لے جانا، اور اگر بہت ضروری ہو تو راسپوتین کا ایک چھوٹا سا بنڈل لے جا؛ دوسرے جانب اَپالو، نے اپنے شاطرانہ اور حساس طریقے سے فرانس کے سفر ہی سے روکنے کی کوشش کی تھی، مگر جب اس نے دیکھا کہ آسکر نے طے کر لیا ہے، اور باقاعدہ سامان کے لیے مصر ہے، تو اس نے کہا، ٹھیک ہے، تجھے اپنے ساتھ بہت قابلِ احترم جماہی لے جانی ہو گی، جسے لیے ہوئے گوئٹے کو عرصہ ہو گیا تھا، مگر منہ کا مزا بدلنے کے لیے، اور اس لیے بھی کہ مجھے معلوم تھا کہ The Elective Affinities میرے جنسی مسائل کا حل نہیں ہو سکتی، مجھے راسپوتین اور اس کی برہنہ عورت، برہنہ مگر موزوں میں ملبوس عورت، ساتھ لے جانے کی اجازت ہے۔ اگر اَپالو ہم آہنگی پر اصرار کرتا اور 'ڈائینی سس' بلانوشی اور ابتری پر، تو آسکر بھی ایک دیوتا سے کم نہیں تھا، جس کا کام ابتری کو ہم آہنگ کرنا اور دلیل کو مدہوش کرنا تھا۔ اخلاقیات کے علاوہ اسے تمام دیوتاؤں پر، جن کے کردار اور پیشے ماضیِ بعید میں پہچانے جا چکے تھے، فوقیت حاصل تھی: آسکر اپنی پسند کے مطابق پڑھ سکتا تھا، جب کہ دیوتا اپنے آپ پر پابندی لگا رہے تھے۔

لوگ کس طرح ایک فلیٹوں کی عمارت اورانیکس کرایہ داروں کے باورچی خانوں کی خوش بوؤں کے عادی ہو جاتے ہیں۔میں ہر قدم، ہر منزل، ہر فلیٹ اور نام کی ہر تختی سے رخصت ہوا تھا: اورموسیقار'مین'؛ جس کو انھوں نے خدمات کے لیے نا اہل قرار دے کر گھر بھیج دیا تھا جوایک بار پھر بگل بجانے ،وجن پینے اوران کی جانب سے واپس بلانے کا منتظر تھا—اور بعد میں واقعی وہ اس سے ملنے آئے بھی تھے، مگراس بار انھوں نے اس کو بگل اُٹھانے بھی نہیں دیا تھا ۔اور'ایکسیل مشکے'!تم نے اپنا کوڑا کس شئے سے تبدیل کرلیا تھا؟ مسٹر اور مسز'ووئی ینتھ' جو ہمیشہ kohlrabi کھاتے تھے۔چوں کہ مسٹر'بائی ٹرٹ' کو پیٹ کی تکلیف تھی ، پیدل فوج میں خدمات انجام دینے کے بجائے'ٹیشاؤ' میں کام کرنے لگے تھے۔پڑوس میں مسٹر'بائی ٹرٹ' کے والدین رہتے تھے، جن کو اب بھی 'بائی موسکی' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔اورمدرٹروزِنسکی: اپنے فلیٹ کے دروازے کے پاس چوہے کی طرح لیٹی رہتی تھی۔میرے کان لکڑی کےفرش سے لگے رہتے تھے، میں اس کو سیٹی بجاتے سنتا رہتا تھا۔وہ تھنگنا، جس کا اصل نام'رِچل' ہے، لیفٹیننٹ بن گیا تھا، حالاں کہ بچپن میں اُس کو ہمیشہ اونی موزے پہننے پر مجبور کیا جاتا تھا۔'ملاگر' کا بیٹا مرگیا تھا،'آئیک' کا بیٹا مرگیا تھا، کولن کا بیٹا مرگیا تھا مگر گھڑی ساز لاوبتا ابھی زندہ تھا اور مردہ گھڑیوں کو چلاتا رہتا تھا۔اور بوڑھا بائی لانڈ بھی زندہ تھا، ٹیڑھی کیلوں کو ہتھوڑوں سے سیدھا کرتا رہتا تھا۔ اور مسز شوروِنسکی بیمار تھی اور مسٹر شوروِنسکی صحت مند تھے پھر بھی پہلے مرگئے تھے ۔اور زمینی منزل کا کیا حال تھا؟ وہاں کون رہتا تھا؟ وہاں الفریڈ ماتسیرات اور ماریا ماتسیرات رہتے تھے، اور وہ چھوٹو بد معاش، تقریباً دو برس کا، جس کا نام تھا کرٹ۔اور وہ کون تھا جو اتنا بڑا، گہری سانسیں لیتا فلیٹ چھوڑ کر چلا گیا تھا؟وہ آسکر تھا، چھوٹو کرٹ کا باپ۔رات کے اندھیرے میں وہ اپنے ساتھ کیا کیا لے گیا تھا؟ وہ اپنے ساتھ ایک نقارہ لے گیا تھا اور ایک بڑی سی تعلیماتی کتاب۔وہ بلیک آؤٹ گھروں کے سامنے بالکل ساکت کیوں کھڑا ہو گیا تھا، ان گھروں کے درمیان جو ہوائی حملوں کے دفاع کے قوانین پر یقین رکھتے تھے، وہ ان میں سے ایک بلیک آؤٹ گھر کے سامنے کیوں رُکا تھا؟ اس لیے

کہ اس میں بیوہ گریف رہتی تھی، جس نے نہ صرف اس کو تعلیم دی تھی بلکہ کچھ مخصوص ہُنر بھی سکھائے۔ اس نے بلیک آؤٹ گھروں کے سامنے ٹوپی کیوں اُتاری تھی؟ اس لیے کہ اسے گریف سبزی فروش یاد آ گیا تھا، جس کے گھنگھریالے بال اور عقابی ناک تھی، جس نے، ایک ساتھ، خود کو تولا بھی تھا اور پھانسی بھی لگا لی تھی، رسی سے ساکت لٹکے ہونے کے باوجود، جس کی بال گھنگھریالے اور ناک عقابی تھی، اگرچہ اس کی آنکھیں بھوری تھیں، جو اپنے گڑھوں میں لیٹی عام طور پر سوچتی رہتی تھیں، مگر اب تھکی اور اُبلی پڑی تھیں۔ آسکر نے ایک بار پھر زرد رنگ کے لہراتے ربن والی اپنی ملاحوں کی ٹوپی لگا لی تھی اور پیر گھسیٹتے ہوئے چلنے لگا تھا؟ اس لیے کہ اس کی، 'لانگ فوز مال گاڑی کے اسٹیشن پر، کسی سے ملاقات طے تھی۔ کیا وہ وقت پر اسٹیشن پہنچ گیا تھا؟ جی ہاں، پہنچ گیا تھا۔

میں بالکل آخری لمحات میں ریلوے کے پُشتے کے پاس پہنچا تھا، جو بُرووئن شوفر وِیگ 'نمر نگ' سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جی نہیں، میں ڈاکٹر ہولاٹز کے قریبی دفتر کے پاس نہیں رُکا تھا۔ میں نے اپنے خیالوں ہی میں سسٹر اِنگے سے رُخصت لے لی تھی اور 'کلائن ہامروِیگ' کی بیکری والے میاں بیوی کو بھی سلام بھیجا تھا، مگر میں نے یہ سارا کام چلنے کے دوران کیا تھا۔ صرف چرچ آف سیکریڈ ہارٹ نے مجھے ایک لمحے کے لیے رُکنے پر مجبور کیا تھا — وہ لمحہ جس نے میرے پہنچنے میں دیر کر دی تھی۔ پھاٹک بند تھا، مگر میں اپنے خیالات کی آنکھوں میں صاف دیکھ رہا تھا کہ وہ گلابی رنگ کا لڑکا کنواری مریم کے بائیں زانو پر بیٹھا تھا۔ میری مما بے چاری، ایک بار پھر موجود تھی۔ وہ اعتراف کی جگہ گھٹنوں کے بل کھڑی تھی، کریانے کی دُکان والے [ماتسیرات] کی بیوی کے گناہوں کو فادر وِیکے کے کانوں میں اسی طرح بھر رہی تھی جیسے وہ آدھے پاؤنڈ کی تھیلیوں میں چینی بھرا کرتی تھی۔ اور آسکر بائیں جانب کی شہ نشین پر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو طفل یسوع مسیح کو نقارہ نوازی سکھانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اس نے نقارہ بجایا نہیں، اس نے مجھے کوئی معجزہ بھی نہیں دکھایا۔ آسکر نے اس وقت بھی قسم کھائی تھی، اور آج، بند چرچ کے سامنے، ایک بار پھر قسم کھائی ہے: میں اس کو نقارہ نوازی سکھا کر ہی دم لوں گا، آج نہیں تو کل۔ سفرِ طویل

تھا، اور میں نے اس کام کو "کل" پر چھوڑ دیا، نقارہ نواز نے چرچ کا پھاٹک پیچھے چھوڑا، اس امید پر کہ طفل یسوع مجھ سے بچ نہیں سکیں گے۔ میں سُرنگ سے زیادہ دور نہیں تھا کہ ریلوے کے پشتے پر چڑھا، اور اس عمل میں گوئٹے اور راسپوتین کا کچھ حصہ گُم گیا، مگر تعلیماتی سامان کا بیش تر حصہ اس وقت بھی میرے ساتھ تھا جب میں ریل کی پٹریوں پر پہنچا تھا۔ لکڑی کی سلیپروں اور پتھر کی رگیوں پر چند گز میں لڑکھڑایا، اور میں نے اندھیرے میں ٹکراتے ہوئے بیرا کو تقریباً گرا ہی دیا تھا۔

"کیا یہ ہمارا نیکوکار نقارہ نواز نہیں؟" کپتان اور موسیقار مسخرہ چلّایا۔ ایک دوسرے کو احتیاط کی تلقین کرتے ہوئے، ہم پٹریوں پر، دوراہوں، چوراہوں سے گزرتے چلے، کھڑے مال گاڑی کے ڈبوں کے درمیان راستہ بھول گئے، اور بالآخر طویل رخصت پر لے جانے والی گاڑی تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے، جس کا ایک حصہ بیرا کے طائفے کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔

آسکر بہت ٹرام گاڑیاں چڑھ چکا تھا، مگر اب ریل گاڑی میں سفر کرنے والا تھا۔ جب بیرا نے مجھے ریل گاڑی کے ڈبے میں دھکیلا تو ریگونا نے اس شے سے نظر اٹھا کر جس کی وہ سلائی کر رہی تھی، مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا، اور میرے رخسار کا بوسہ لیا۔ مسکراتے ہوئے، مگر سلائی روکے بغیر، اس نے طائفے کے دوسرے دو ارکان کا تعارف کرایا — ایک قلاباز فیلکس تھا، اور دوسری تھی کٹی۔ شہد کے رنگ کے بالوں والی، کٹی، جس کا رنگ کچھ دبتا ہوا سا تھا، غیر دلکش نہیں تھی، اور تقریباً سینیورا کے قد ہی کی تھی۔ اس کا ہلکا سا جرمن لہجہ تھا، جو اس کی دل کشی میں اضافہ کرتا تھا۔ فیلکس، قلاباز، بلاشبہ پورے طائفے میں سب سے بالا قد تھا۔ تقریباً چار فٹ دراز رہا ہوگا۔ بے چارے کا جسم ذرا غیر متوازن سا تھا۔ میرے صاف ستھرے تین فٹ نے اسے پہلے کے مقابلے میں زیادہ حساس بنا دیا تھا۔ اس کا ناک نقشہ تقریباً اعلیٰ درجے کی نسل کے ریس کے گھوڑے کا سا تھا، جس کے باعث ریگونا اس کو "کاوالو" یا "فیلکس کاوالو" پکارتی تھی۔ کپتان بیرا کی طرح وہ قلاباز بھی میدانی بھورے رنگ کی، کارپورل کے نشان والی، فوجی وردی پہنا کرتا تھا۔ خواتین

بھی میدانی بھورے رنگ کی سفری وردی پہنتی تھیں جو اُن پر کچھ جچتی نہیں تھیں۔ ریگونا کی سلائی بھی میدانی بھورے رنگ کی، یعنی، میری وردی نکلی۔ فیلکس اور پیرا نے پارچہ خریدا تھا، روز وِدا اور کئی باری باری سلائی کرتیں، پارچے کو اس وقت تک کترتی رہیں، جب تک کہ میرا پتلون اور کوٹ بالکل صحیح ناپ کا نہیں ہوگیا تھا۔ اور جوتے! 'ویہر ماخت' کی کپڑے کی دُکانوں میں آسکر کے ناپ کے جوتوں کی تلاش بیکار ہوتی۔ مجھے اپنے عام قسم کے فیتے والے جوتوں پر ہی اکتفا کرنی پڑی تھی: مجھے فوجی جوتے کبھی ملے ہی نہیں۔

میرے کاغذات جعلی تھے۔ فیلکس اس نازک کام میں بڑا فن کار ثابت ہوا۔ یہ محض خوش اخلاقی کا تقاضا تھا کہ میں نے احتجاج نہیں کیا۔ جب اس خواب خرام نے مجھے اپنا بھائی، بلکہ بڑا بھائی بنالیا اور میں اس میں اتنا ضرور اضافہ کروں گا: آسکر نیلو ریگونا، پیدائش 21 اکتوبر 1912 بہ مقام نیپلز۔ میں نے اپنے زمانے میں کئی نام استعمال کیے ہیں۔ آسکر نیلو ریگونا یقینی طور پر کم حلاوت آمیز نہیں۔

ریل گاڑی چلی۔ 'اسٹالپ'، 'اسٹیٹن'، 'برلن'، 'ہینو ور' اور 'کولون' ہوتی ہمیں 'میٹز' تک لے گئی۔ برلن میں کچھ نہیں دیکھ سکا۔ ہمیں وہاں پانچ گھنٹے ٹھہرنا پڑا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہوائی حملہ ہو گیا تھا۔ ہمیں تامس کیلرز میں پناہ لینا پڑی تھی۔ ریل گاڑی پر سوار فوجی، تہہ خانوں میں سارڈین مچھلیوں کی طرح بھرے ہوئے تھے۔ جب ملٹری پولیس نے ہمیں بھی وہیں داخل کرنے کی کوشش کی تو ظاہر ہے کہ بہت کچھ کرنا پڑا تھا۔ مشرقی محاذ سے آنے والے لڑکوں میں سے کچھ پیرا کو اور اس کے طائفے کو پیش کیے جانے کھیلوں کے حوالے سے جانتے تھے: انھوں نے خوب تالیاں بجائیں ہوا میں بوسے اچھالے۔ ہم سے کوئی کھیل پیش کرنے کی فرمائش بھی کی گئی؛ چند منٹ کے اندر سابقہ بیئر پینے والے ہال کمرے کے ایک کونے میں اسٹیج سے مشابہ کچھ بنا دیا گیا تھا۔ پیرا انکار نہیں کرسکا، خصوصاً اس وقت جب ہوائی فوج کے ایک میجر نے ضرورت سے زیادہ لجاجت سے درخواست کی تھی کہ ہم ان کے لڑکوں کو خوش کردیں۔

آسکر پہلی بار تھیٹر کے کسی کھیل میں پیش ہونے والا تھا۔ اگرچہ وہ پوری طرح تیار نہیں تھا۔۔۔ ریل گاڑی کے سفر کے دوران پیرا نے کئی کھیلوں کی مشق کرائی تھی۔۔۔ مجھ پر اسٹیج کا خوف

طاری تھا، اور ریگوتا کو میرے ہاتھوں کو تھپتھپانے کے ذریعے تسکین پہنچانے کا پھر موقع مل گیا تھا۔

ناگواری مگر پھرتی کے ساتھ لڑکوں نے اسٹیج پر ہمارا پیشہ ورانہ سامان پہنچایا اور ایک لمحے کے بعد فیلکس اور رگی نے اپنا کھیل شروع کردیا۔ دونوں بالکل ربڑ کے بنے لگتے تھے۔ وہ دونوں آپس میں مل کر خود کو ایک گرہ کی صورت باندھ لیتے، اینٹھ کر اس سے نکل جاتے، واپس آجاتے، اپنے ہاتھ اور بازو اور پاؤں آپس میں اول بدل کر لیتے۔ ان کے تماشے دیکھ کر فوجیوں کی آنکھیں پھٹی کہ پھٹی رہ گئیں، حتیٰ کہ دیکھنے والوں کے جوڑوں میں درد اور عضلات میں پیدا شدید نوعیت کا درد ہونے لگا تھا، جو انھیں کئی راتیں درد میں مبتلا رکھیں گے۔ ابھی فیلکس اور رگی دونوں ایک دوسرے سے خود کو باندھ اور کھول ہی رہے تھے کہ بیرا نے اپنی موسیقی کا کھیل شروع کردیا۔ بیئر سے بالکل خالی اور لبالب بھری بوتلوں سے اُس نے برسوں کے پسندیدہ ترین جنگی نغمے بجائے: اس نے "Erika" اور "Mamatchi, Give Me a Horse" بجایا، اس نے "Stars of the Homeland" کو جگمگا دیا اور بوتلوں کے گلے کے استعمال سے آواز میں گونج پیدا کردی، اور جب اس کا تاثر ٹھیک نہیں ہوا تو وہ اپنے پرانے "Jimmy the Tiger" نامی نغمے پر واپس آگیا اور بوتلوں کے درمیان غصہ کرنے اور دہاڑنے لگا تھا۔ فوجیوں کو یہ کھیل بہت پسند آیا، حتیٰ کے آسکر کے تھکے ہوئے کانوں کو بھی؛ اور جب چند جادوئی فضول سے کرتب دکھانے کے بعد بیرا نے خواب خرام روزویدا ریگونا اور شیشہ تباہ کرنے والے آسکرنیلو ریگونا کے نام کا اعلان کیا تو ناظرین میں جان سی پڑ گئی،، گویا روزویدا اور آسکرنیلو ریگونا کی کامیابی یقینی ہو گئی تھی۔ ہم نے اپنی پیش کش کی ابتدا نقارے پر ہلکے سے ایک نغمے سے کی، جو دمادم اونچی ہوتی ہوئی موسیقی کی بلندی پر لے گئی اور ہر دور کے بعد زورزور سے تالیاں بجائی گئیں اور سامعین کی جانب سے تعریف پر، طے شدہ طریقے سے، دھماکے جیسی موسیقی کی آواز نکالی گئی۔ ایسے موقعوں پر ریگونا کسی سپاہی کو، بلکہ ایک دو افسران کو بھی اسٹیج پر بلاتی؛ وہ ہمیشہ کسی سخت جان کارپورل یا نچلے درجے کے ایک شرمیلے بحری افسر کو بلا کر اپنے پہلو میں بٹھا لیتی تھی۔ اس کے بعد روزویدا پہلو میں بیٹھے شخص افسر کے دل میں جھانکتی — جی ہاں، ریگونا مردوں کے

دلوں کے اندروں میں بھی دیکھ سکتی تھی۔ نہ صرف یہ کہ وہ ساری تفصیلات بیان کر سکتی تھی، وہ ہمیشہ صحیح بھی ہوتی تھی؛ زیرِ اثر شخص کی تنخواہ کی کتاب کی تفصیلات کے علاوہ اس کی نجی زندگی کی تفصیل بھی بتا سکتی تھی۔ اس کی لغزشیں، نزاکتوں اور حاضر جوابی سے پُر ہوتی تھیں۔ اس کے عوض اس نے اپنے تابع کو بیئر کی ایک بوتل تھمائی اور اس کو اتنا بلند کرنے کے لیے کہا کہ تمام ناظرین کو نظر آ سکے۔ پھر اس نے مجھے، آسکر نیلو کو، اشارہ کیا: میرے نقارے نے تیز تر ہوتا ہوا نغمہ بجانا شروع کیا، اور میں نے اپنی آواز بلند کی، وہ آواز جو اس سے کہیں زیادہ سخت گیر کام کے لیے تیار کی گئی تھی۔ گونج دار دھماکے بغیر، ہمارے سامنے کھڑے سخت کوش کارپورل کا بیئر یا دودھ میں شرابور، مجھے یاد نہیں کس شے میں شرابور، حیران پریشان چہرہ تھا، جس منظر نے ہماری پیش کش پر "اختتام" لکھ دیا تھا۔ اور پھر آفرین کا غلغلہ بلند ہوا، جس میں دارالحکومت پر ایک بڑے ہوائی حملے کی آواز گھلی ملی ہوئی تھی۔

ہماری پیش کش مشکل سے بین الاقوامی درجے کی تھی، پھر بھی اس نے جوانوں کو خوش کر دیا تھا، اس نے محاذ کو بھلا دیا تھا، اور یہ بھی کہ طویل رخصت ختم ہو گئی ہے، اور ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیا تھا: اس لیے کہ جب اوپر ہوائی تارپیڈو گرے تو تہہ خانہ لرز گیا تھا، اس کے اندر کی ہر شے دفن ہو گئی تھی، عام روشنی اور ہنگامی حالات والی روشنیاں سرنگوں ہو گئی تھیں، جب کہ ہمارے اطراف کی ہر شے اُلٹ پلٹ گئی تھی، اس وقت بھی دم گھونٹ دینے والے اندھیرے تابوت سے قہقہے بلند ہو رہے تھے، جن کے ساتھ "بیرا...... بیرا...... ہم کو بیرا چاہیے"۔ اور لازول بیرا زور سے بولنے اور اندھیرے میں مسخرہ پن کی باتیں کرنے لگا، اور وہ تہہ خانے میں دبے ہوئے مجمعے سے قہقہوں کی بوچھاڑ نکال رہا تھا۔ اور جب آوازوں نے ریگونا اور آسکر نیلو، کا مطالبہ کیا تو وہ گرج کر بولا: میرے پیارے ٹمن کے سپاہیو، سینیورا ریگونا بہت تھکی ہوئی ہے۔ عظیم جرمن رائخ اور آخری فتح کے خاطر، آسکر نیلو کو بھی تھوڑے سے آرام کی ضرورت ہے۔"

روز ویٹا میرے ساتھ لیٹی ہوئی تھی، اور خوف زدہ ہو رہی تھی۔ اس کے برعکس، آسکر خوف زدہ نہیں تھا، پھر بھی وہ ریگونا کے ساتھ لیٹا رہا۔ اس کے خوف اور میری ہمت

نے دونوں کے ہاتھ ملا دیے تھے۔ مجھ کو اس کا خوف محسوس ہو رہا تھا اور وہ میری ہمت کو محسوس کر رہی تھی۔ بالآخر، میں کچھ خوف زدہ ہو گیا اور وہ حوصلے والی ہو گئی۔ اور جب میں نے اس کا خوف دور کر دیا اور اس کو ہمت دے دی تو میری مردانہ ہمت نے دوسری بار سر اُٹھایا۔ جب کہ میری ہمت اٹھارہ شان دار برس کی تھی جب کہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنی عمر کے کس برس میں تھی، اس لیے کہ اس کے چہرے کی طرح اس کے جسم سے، جس کی بہت کم پیائش ہوئی تھی مگر جو بالکل مکمل تھا، گزرے وقت کا پتا نہیں چلتا تھا۔ لازمانی طور پر ہمت والی اور لازمانی طور پر خوف زدہ روزویدا نے مجھے اپنا جسم پیش کر دیا۔ کسی کو کبھی پتا نہیں چلے گا کہ وہ بوڑھی عورت اٹھارہ برس کی تھی یا ننانوے برس کی، جو دارالحکومت پر ایک بڑے ہوائی حملے کے دوران دبے ہوئے 'ٹامس کیلر' میں، میری ہمت کے نیچے، اس وقت تک کے لیے اپنا خوف کھو چکی تھی، جب تک کہ ہوائی حملوں کے وارڈنوں نے ہم کو کھود کر باہر نکال نہیں لیا تھا؛ اور جوہات آسکر کے لیے پردہ پوشی آسان کر دیتی ہے، یہ ہے کہ خود آسکر کو بھی معلوم نہیں، آیا یہ پہلی بغل گیری صحیح معنوں میں اس کے جسمانی ابعاد کے لیے موزوں بھی تھی یا نہیں، جو اسے ایک ہمت والی بوڑھی عورت نے، یا ایک نوجوان لڑکی نے عطا کیا تھا، خوف نے جس کو مطیع کر دیا تھا۔

# کانکریٹ کا معائنہ

تین ہفتے تک بڑی بڑی چھاؤنیوں کے شہر 'میٹز' کے قلعے کی برجیوں تلے، جو کبھی رومنوں کی سرحدی چوکی بھی رہا تھا، ہم اپنا کھیل پیش کرتے رہے۔ دو ہفتے ہم نے وہی کھیل 'نینسی' میں بھی پیش کیا۔ اب آسکر کے لبوں سے فرانسیسی زبان کے کچھ لفظ پھوٹنے لگے تھے۔ 'رائمز' کے علاقے میں ہمیں پچھلی عالمی جنگ کی تباہی کو دیکھنے اور آفرین کہنے کا موقع ملا تھا۔ انسانی حرکات سے عاجز، عالمی شہرت یافتہ بڑے گرجا گھر کا پتھروں سے بنا جانور خانہ گول پتھروں سے بنے چوراہے پر پانی، مزید پانی اگلتا رہا، جو یہ بتانے کا ایک طریقہ ہے کہ 'رائمز' میں پورا دن، بلکہ رات میں بھی بارش ہوتی تھی۔ مگر پیرس نے ہمیں ایک چمک دار اور معتدل ستمبر کا تحفہ دیا تھا۔ میں نے اپنی انیسویں سالگرہ کا دن روز ویتا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دریائی پشتوں کی سیر کرتے گزارا تھا۔ حالاں کہ میں سارجنٹ فرِیز تروژنسکی کے بھیجے ہوئے پوسٹ کارڈوں کے ذریعے پیرس سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا، مگر میں ذرا بھی مایوس نہیں ہوا۔ جب پہلی بار میں اور روز ویتا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ایفل ٹاور کے نیچے کھڑے ہوئے — اس کا قد تین فٹ تین انچ، یعنی وہ مجھ سے تین انچ اونچی تھی — اور اوپر کی طرف دیکھا تھا تب ہمیں، یہ بھی پہلی بار ہوا تھا کہ اپنی بلندی اور انفرادیت کا احساس ہوا تھا۔ جہاں بھی گئے، ہم نے بوسوں کا تبادلہ کیا، مگر پیرس میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

تاریخ اور فن کو قریب سے دیکھنا کتنا حیرت انگیز ہوتا ہے۔ روز ویدا کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، میں Dôme des Invalides دیکھنے گیا، اور خود کو اس عظیم شاہنشاہ کے بہت قریب محسوس کرتا رہا، اس لیے کہ گو وہ عظیم تھا، مگر دراز قد نہیں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ فریڈرک اعظم کی قبر پر، نپولین نے کہا تھا، جو خود بھی دیو قامت نہیں تھا: ''اگر آج یہ زندہ ہوتا تو اس کو اس جگہ کھڑا نہیں ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے بڑے پیار سے روز ویدا سے سرگوشی میں کہا تھا، ''اگر وہ کارسکا والا زندہ ہوتا تو ہم اس جگہ نہ ہوتے، ہم پلوں کے نیچے، پشتوں پر اور، sur le trottoir de Paris [یعنی پیرس کی گلیوں میں] ایک دوسرے کا بوسہ نہ لے رہے ہوتے۔''

دوسرے گروہوں کی شراکت میں ہم نے Salle Pleyel اور تھیٹر سارہ برنہارٹ میں بڑے بڑے پروگرام کیے۔ آسکر جلد ہی بڑے شہروں کے تھیٹر کے انداز کا عادی ہو گیا تھا، اس نے اپنی معلومات کے خزانے کو مکمل کر لیا اور خود کو پیرس پر قابض فوجوں کے اُکتا دینے والے مذاق کا بھی عادی بنا لیا تھا: پھر میں نے کبھی اپنی صوتی ہنر مندی کو معمولی جرمن بیئر کی بوتلوں پر ضائع نہیں کیا: نہیں، میں نے اسی روشنیوں کے شہر میں شان دار انمول گلدانوں اور پھل رکھنے والے پیالوں، فرانسیسی قلعوں سے لیے گئے شیشوں کی توڑ پھوڑ کی تھی۔ میری کارگزاری تاریخی خطوط پر تیار کی گئی تھی۔ میں نے لوئی چہاردہم کے عہد کی شیشہ کاریوں سے ابتدا کی تھی اور تاریخ ہی کی طرح لوئی پانزدہم تک گیا تھا۔ میں نے انقلابی جوش وجذبے میں بد قسمت لوئی شانزدہم اور اس کی بے سر اور بے پروا میری Antoinette کے چینی کے برتن تباہ کر دیے تھے۔ آخر میں، لوئی فلپ پر چیٹر کاؤ کے بعد میں اپنی لڑائی تیسری جمہوریہ کے زجاجی تصورات تک لے گیا تھا۔

بلا شبہ میرے کام کی تاریخی اہمیت آرکسٹرا کے عام آدمیوں اور نمائش گاہوں کی ذہنی پہنچ سے باہر تھی؛ وہ میرے بنائے ہوئے ٹکڑوں کی عام ٹکڑوں کے مقابلے میں زیادہ تعریف کرتے تھے، مگر کبھی کبھی کوئی اسٹاف افسر یا رائخ کا کوئی اخبار والا بھی ہوتا تھا، جو میرے نقصان کے ساتھ ساتھ میری تاریخی فراست سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ ایک وردی پوش دانش ور کردار نے مجھ کو میرے فن پر مبارک باد دی تھی، جب ہم نے کمانڈنٹ کے

دفتر میں ایک شان دار کھیل پیش کیا تھا۔ آسکر خاص کر ایک بڑے جرمن اخبار کے نامہ نگار کا بہت شکر گزار تھا جس نے خود کو فرانس کا ماہر بتایا تھا اور نہایت آہستگی سے میری توجہ کچھ معمولی غلطیوں کی طرف مبذول کرائی تھی، جو ہمارے کھیل سے متعلق نہیں تھیں۔

ہم نے پورا سردی کا موسم پیرس میں ہی گزارا تھا۔ انھوں نے اوّل درجے کے ہوٹل میں ہمارے قیام کا بندوبست کیا تھا، اور میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ فرانس کے اعلیٰ درجے کے بستروں پر تحقیق میں روزویٹا میری شریک ہوا کرتی تھی۔ تو کیا آسکر پیرس میں خوش تھا؟ تو کیا اس نے گھر والے اپنے پیاروں، ماریا، ماتسیرات، گریچن اور الیکو انڈرشیفلر کو بھلا دیا تھا۔ کیا آسکر نے اپنے بیٹے کُرٹ کو اور اس کی پرنانی انا کووا لچکی کو بھی بھلا دیا تھا؟

اگرچہ میں انھیں بھولا نہیں تھا، مجھے ان کی کمی کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے کوئی فوجی تصویری کارڈ نہیں بھیجے تھے، اپنے زندہ ہونے کا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا، مگر اس کے برعکس، میں نے اپنے گھر والوں کو ایک برس میرے بغیر رہنے کا موقع فراہم کر دیا تھا؛ اس لیے کہ میری روانگی کے وقت ہی میں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا، اس کے بعد سے مجھے ہمیشہ یہ جاننے میں دل چسپی رہتی تھی کہ میری غیر موجودگی میں ان کا کیا حال ہوگا۔ کبھی سڑک پر یا کھیل کے دوران ان کے خدوخال والے سپاہیوں کے چہرے کی تلاش میں رہتا۔ کبھی آسکر سوچنے لگتا کہ شاید فریز ٹروزنسکی یا ایکسل مشکے کا یہاں مشرقی محاذ پر تبادلہ کر دیا گیا ہے، اور اسی تصور میں غرق، ایک یا دوبار اس نے فوجیوں کے اس جمِ غفیر میں ماریا کے خوب صورت بھائی کو دیکھا تھا؛ مگر وہ ماریا کا بھائی نہیں تھا؛ یہ جرمن فوجیوں کا گہرا بھورا رنگ بھی کتنا گمراہ کن ہوتا ہے!

صرف آئیفل ٹاور ہی مجھے گھر کی یاد دلاتا تھا۔ یہ قیاس نہ کر بیٹھیے گا کہ میں اس کی چوٹی پر چڑھ گیا تھا، اور وہاں سے دور دور کے نظارے مجھے اپنے گھر کے خواب دیکھنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ آسکر تصویری پوسٹ کارڈوں میں اور اپنے تصورات میں کئی بار آئیفل ٹاور پر چڑھ چکا تھا، اور اس کا خیال تھا کہ واقعی چڑھائی اس کے لیے مایوسی کا سبب بن سکتی تھی۔ جب میں روزویٹا کے بغیر تنہا آئیفل ٹاور کے قدموں میں بیٹھا یا کھڑا تھا، فولادی

تعمیر کے ماہرین کے بنائے فولادی ڈھانچے کی اوپر کی طرف جاتی ہوئی آہنی شہتیریں، اور وہ عظیم محراب جو ہر طرف جگہ ہونے کے بعد بھی ٹھوس طریقے سے لگائی گئی تھیں، میرے لیے نانی اماں کے پناہ دینے والی جگہ بن گئی تھی۔ آئیفل ٹاور کے نیچے بیٹھے ہوئے، میں اس کے چاروں لنگوں کے نیچے بیٹھا ہوا تھا، Champ de Mars کشویائی آلو کا کھیت تھا، پیرس کی اکتوبر کے مہینے کی بارش 'بساؤ' اور 'رامکاؤ' کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والی ترچھی بارش تھی اور ایسے دنوں میں پورا پیرس، حتیٰ کہ میٹرو بھی، خراب مکھن کی طرح مہکنے لگتی تھی۔ میں خاموش، سوچ میں پڑ گیا۔ روز یودا میری آزردگی کا بہت احترام کرتی تھی اور ایسے موقعوں پر نہایت مہربان اور معقول ہو جاتی تھی؛ بہت اچھی خاتون تھی وہ۔

اپریل 1944 میں — ہر محاذ سے اعلان ہونے لگا تھا کہ ہماری فوجیں کامیابی سے کم کروی گئی ہیں -- ہم لوگوں کو اپنا سامان باندھ کر بحرالکاہل کے دورے پر جانا تھا۔ ہماری پہلی منزل Le Havre تھی۔ مجھے احساس تھا بڑا اکم گو اور مخبوط الحواس ہوتا جا رہا تھا۔ حالاں کہ کھیل کی پیش کش کے دوران اس کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں ہوئی اور وہ ہنستا رہتا تھا، مگر وہ عمر رسیدہ نارسس چہرہ پردہ گرنے کے بعد پتھر کا سا ہو جاتا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا تھا کہ اسے حسد ہو رہا ہے یا اس سے بھی خراب بات یہ تھی کہ اس نے میری نوجوانی کے دم خم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ کانا پھوسی کے ذریعے روز یودا نے میری غلطی کو رفع کر دیا تھا؛ اس کو معلوم نہیں تھا کہ کیا ہو رہا ہے، مگر اس نے دیکھا تھا کہ کچھ افسران کھیل ختم ہونے کے بعد بڑا سے رازداری میں ملاقات کر رہے تھے۔ ایسا لگا، جیسے استاد اپنے اندرون کی طرف ہجرت سے واپس نکل رہا ہے، گویا اپنے جد شہزادے ایوجین کے خون کے زیر اثر کسی راست اقدام کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ اس کے منصوبوں نے اس کو ہم سے اتنی دور کر دیا تھا، اس کو اتنے وسیع اور دور رس استغراق میں پھنسا دیا تھا کہ آسکر کی اپنی سابق روز یودا سے اس کی قربت ایک شگنوں بھری مسکراہٹ سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ ایک دن ٹروول میں، جب ہم قمار خانے میں ٹھہرے ہوئے تھے، اس نے ہمارے درمیان مشترک ڈریسنگ روم کی قالین پر ہم دونوں کو باہم پیچیدگی کے عالم میں دیکھ لیا تھا۔ ہم

اچھل کر بھاگنے والے تھے، مگر اس نے اپنے رویے سے ہم پر واضح کردیا تھا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ اپنی سنگھار میز کے آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا، "مزے کرو بچو، لپٹو اور بوسہ لو، کل ہم کانکریٹ کے معائنے کو جائیں گے۔ اس کے اگلے دن تمھارے ہونٹوں کے درمیان کانکریٹ ہو گی، اپنی گلاب کی کلیوں کو جب تک سنبھال سکو، سنبھالو۔"

1944 کے جون کا مہینہ تھا۔اس وقت تک ہم خلیج 'بسکے' سے ہالینڈ تک اٹلانٹک وال پر [جو ہٹلر نے یورپ کے مغربی ساحل پر اتحادیوں کے حملے کو روکنے کے لیے 1942 میں بنوانی شروع کی تھی۔مترجم] جا چکے تھے، مگر ہم نے اپنا زیادہ وقت اندرونِ ملک صرف کیا تھا اور ہمیں روایتی پِل باکس [pillboxe یعنی زیرِ زمین کانکریٹ سے بنے چھوٹے چھوٹے دفاعی قلعے جو سرحدی چوکیوں کی طرح استعمال کیے جاتے تھے۔مترجم] کم نظر آئے۔ٹروول جانے سے پہلے ہم براہِ راست ساحل پر اپنے کھیل پیش کیا کرتے تھے۔یہیں ہم کو اٹلانٹک وال پر کھیل پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ براانے یہ پیش کش قبول کر لی تھی۔ٹروول میں ہمارے آخری کھیل کے بعد ہمیں Caen کے قریب ایک گاؤں باؤنیٹ میں لے جایا گیا تھا، جو ساحلی ریت کے تودوں سے تین میل پیچھے تھا۔ہمیں کسانوں کے گھر ٹھہرایا گیا تھا۔ وہاں سبزہ زار، جھاڑیوں کی قطار، سیب کے درخت تھے۔یہی وہ جگہ ہے جہاں سیب سے بنی برانڈی متقطر کی جاتی ہے۔ہم نے برانڈی پی اور سونے چلے گئے۔کھڑکی سے فرحت بخش ہوائیں آرہی تھیں، صبح تک ایک مینڈک ٹرٹراتا رہا تھا۔کچھ مینڈک اچھے نقارہ نواز ہوتے ہیں۔میں نے انھیں سوتے میں سنا اور خود سے کہا، آسکر، تمھیں اب گھر جانا ہوگا، تمھارا بیٹا جلد ہی تین برس کا ہو جائے گا۔ تمھیں اس کو نقارہ دینا ہوگا، تم اس سے وعدہ کر چکے ہو۔اس طرح تنبیہہ شدہ اور پریشان باپ، آسکر، ہر گھنٹے جاگ اٹھتا، اندھیرے میں ٹٹولتا، یقین کرتا کہ اس کی روزویدا اس کے پاس موجود ہے، اس کی بو سونگھتا: ریگونا سے کبھی ہلکی ہلکی دارچینی کی، الائچی کی اور جائفل کی بو آتی تھی؛ گرمی کے موسم میں بھی اس سے کرسمس کے کیک کے مصالحوں کی بو آیا کرتی تھی۔

صبح کے وقت فارم میں ایک بکتر بند گاڑی آئی۔ ہم دروازے کے آگے کھڑے

تھے، سمندری ہواؤں میں گپ شپ ہو رہی تھی، ہم کو ہلکی ہلکی سردی لگ رہی تھی۔ طلوع فجر کا وقت تھا اور ٹھنڈ تھی۔ ہم گاڑی میں سوار ہوئے: ہیرا، رگوبا، فیلکس اور رگی، آسکر، اور ہرتسوگ نامی ایک کپتان، جو ہمیں 'کاروگ' کے مغرب میں توپ خانے پر لے جا رہا تھا۔

نارمنڈی کے بارے میں کہنا کہ یہ سرسبز علاقہ ہے، ان کتھئی اور سفید دھبوں والی گایوں کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے، جو شبنم میں نہائی ہوئی، سیدھی جاتی بائی وے کے دائیں بائیں کہر آلود مرغزاروں میں جگالی کر رہی تھیں، جنھوں نے ہماری بکتر بند گاڑی کو اس لاپروائی سے خوش آمدید کہا کہ ہماری گاڑی کا بکتر شرم سے سرخ ہو جاتا، اگر اس کو پہلے ہی سے چھپانے والے رنگ سے پینٹ نہ کر دیا گیا ہوتا۔ سفیدے، جھاڑیوں کے قطاریں، ان پر چڑھی بیلیں، جسیم ساحلی ہوئیں، بالکل خالی، تیز ہوا میں کھڑکھڑاتے ان کے آہنی شٹر۔ ہم ساحلی سڑک پر مڑ گئے، گاڑی سے باہر نکلے، ریت ملی تیز سمندری ہوا اور لہروں کے شور میں لیفٹیننٹ کے پیچھے بھاری قدم رکھتے چلے جا رہے تھے، جو کپتان ہیرا کو باقاعدہ فوجی احترام دے رہا تھا۔

یہ ہلکے، بوتل کے رنگ والا بحر بالٹک نہیں تھا جو سسکیاں لیتی کسی نرم دل کنواری کی طرح ہمارے انتظار میں ہو۔ یہ بحر اکاہل تھا جو اپنے قدیم انداز میں، جوار میں آگے بڑھتا، اور بھاٹے میں پیچھے ہٹتا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کے بعد ہمارے کانکریٹ تھے۔ ہم ان کی تعریف کر سکتے تھے، حتیٰ کہ اگر وہ دیتے نہیں تو، جی بھر کر ان کو تھپتھپا سکتے تھے۔ "ہوشیار!" کانکریٹ کے اندر سے کسی نے آواز دی اور اُچھل کر، سپاٹ کیے گئے کسی کچھوے جیسے ریل باکس سے باہر نکلا، اپنے ہتھیار ریت کے ڈھیروں کے درمیان رکھے جن کو "ڈورا سیون" کہا جاتا تھا، آتے جاتے جوار بھاٹے کی طرف بندوق کے نشانہ لینے والے سوراخ کے ذریعے، معائنہ کرنے والی درزوں سے، اور مشین گن کی نال کے ذریعے دیکھا۔ اس شخص کا نام کارپورل لانکیز تھا۔ وہ لیفٹیننٹ ہرتسوگ کے ساتھ ساتھ ہمارے کپتان ہیرا کا بھی ماتحت تھا۔

لانکیز (سیلیوٹ کرتے ہوئے): ایک کارپورل اور چار سپاہی — کوئی خاص

اطلاع نہیں۔

ہرتسوگ: شکریہ! ایٹ ایز، کارپورل لانگیز۔ کیپٹن، کچھ سُنا تم نے؟ برسوں سے یہی ہو رہا ہے۔

بیرا: مگر جوار بھاٹا تو ہے: اتر تا چڑھتا۔ قدرت کا حصہ۔

ہرتسوگ: یہی تو ہم سب کو مصروف رکھتا ہے۔ اسی لیے تو ہم ایک کے بعد دوسرا پِل باکس بناتے جاتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے فائر کے آڑے آتے رہتے ہیں۔ اس لیے مزید کانکریٹ کے لیے، جلد ہی ہمیں چند کو مسمار کرنا پڑے گا۔

بیرا (کانکریٹ پر ٹھک ٹھک کرتا ہے؛ اور اس کے ساتھ لوگ بھی وہی کرتے ہیں): اور، کیا آپ کانکریٹ پر یقین رکھتے ہیں؟

ہرتسوگ: یقین ہرگز صحیح لفظ نہیں۔ ہمیں کسی چیز پر یقین نہیں رہا۔ کیا خیال ہے تمھارا، لانگیز؟

لانگیز: بالکل صحیح کہا آپ نے۔ بالکل یقین نہیں۔

بیرا: مگر وہ تو ملاتے اور ڈالتے رہتے ہیں۔

ہرتسوگ: بالکل، میرے آپ کے درمیان، کیپٹن، ہمیں قابلِ قدر تجربہ ہو رہا ہے۔ جب تک میں یہاں آیا نہیں تھا، میں نے کبھی ایسی کوئی چیز نہیں بنائی تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو میں اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اب سیمنٹ کے بارے میں شدبد ہو گئی ہے اور امید ہے کہ جنگ کے بعد اس سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ پورا جرمنی ہی نئے سرے سے بنایا جائے گا۔ ذرا اس کانکریٹ کی طرف غور سے دیکھیے (بیرا اور اس کے طائفے کے لوگ کانکریٹ کو جھک جھک کر دیکھنے لگے) تمھیں کیا نظر آ رہا ہے؟ سیپیاں۔ ہمارے پاس سب کچھ ہے جس کی ہمیں ضرورت ہو سکتی ہے۔ بس مال لیجیے اور ملا یئے۔ پتھر، سیپیاں، ریت، سیمنٹ — میں آپ کو اور کیا بتا سکتا ہوں، کیپٹن، آپ تو فن کار ہیں۔ آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ لانگیز، کیپٹن کو بتاؤ کہ ہم اپنی سیمنٹ میں کیا ڈالتے ہیں۔

لانگیز: جی، جناب والا۔ میں کیپٹن کو بتا دوں گا۔ کتے کے بچے، جناب۔ ہماری ہر پِل باکس میں ایک کتا ہے۔ بنیاد میں دفن۔

ہیرا کا طائف: گنّے کا پلّا؟

لانگیز: بہت جلد، Caen سے Le Havre تک گنّے کا ایک بھی پلّا باقی نہیں رہے گا۔

ہیرا کا طائف: یعنی، کہ بس گنّے کے پلّے ختم۔

لانگیز: ہم کتنے شوقین اور بلاؤ ہیں!

ہیرا کا طائف: جلد ہی ہم بلی کے بچے استعمال کرنے لگیں گے۔

ہیرا کا طائف: میاؤں!

لانگیز: مگر بلیاں کتوں جیسی اچھی نہیں ہوتیں۔ اس لیے ہمیں امید ہے کہ جلد ہی یہاں کوئی کارروائی ہوگی۔

ہیرا کا طائف: یعنی یہاں بڑا کھیل ہوگیا (وہ تالیاں بجاتے ہیں)

لانگیز: ہم نے کافی مشق کی ہے۔ اور گنّے کے پلّوں کی کمی پڑ گئی ہے۔

ہیرا کا طائف: اوہ!

لانگیز: ہمیں تعمیر کا کام روکنا ہوگا۔ بلیاں بدقسمتی کی نشانی ہوتی ہیں۔

ہیرا کا طائف: میاؤں! میاؤں!

لانگیز: کیا میں تمھیں مختصراً بتاؤں کہ ہم گنّے کے پلّوں کو کانکریٹ میں کیوں ڈالتے ہیں۔

ہیرا کا طائف: کتّوں کے پلّے!

لانگیز: ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ یہ سب بکواس ہے۔

ہیرا کا طائف: کتنے شرم کی بات ہے۔

لانگیز: مگر یہاں، میرے ساتھی زیادہ تر دیہات سے آئے ہیں اور دیہات میں جب کوئی شخص مکان بناتا ہے، غلّے کا گودام بناتا ہے یا دیہات کا گرجا گھر بناتا ہے، تو رسم یہ ہے کہ بنیاد میں کوئی زندہ شے ڈالی جاتی ہے......اور......

برتسوگ: بہت ہوگیا، لانگیز۔ ایٹ ایز ہو جاؤ۔ جیسا کہ تم نے سنا ہے، جی، یہاں اٹلانٹک وال پر آکر ہم وہمی ہو گئے ہیں۔ آپ کے تھیٹر والوں کی طرح، جن کو کھیل کی ابتدائی رات سے پہلے سیٹی نہیں بجانی چاہیے اور پردہ اٹھنے سے پہلے کسی کے کاندھے

کے اوپر سے تھوکنا نہیں چاہیے۔

بیرا کا طائفہ: تھوئی ۔۔تھوئی ۔۔تھوئی (ہر ایک کے کاندھے کے اوپر سے تھوکو)۔

ہرتسوگ: مگر، مذاق ایک طرف،ہمیں لوگوں کو دل لگی کرنے کا موقع دینا چاہیے۔ حال ہی میں انھوں نے کانکریٹ میں یا سمندری سیپیوں کے موزائیک میں اختراعات کرنا اور پِل باکسوں کے داخلے کی جگہ کو سجانا شروع کردیا ہے اور اس کو اوپر والوں کے احکامات پر برداشت کیا جارہا ہے۔لوگ مصروف رہنا چاہتے ہیں۔کانکریٹ کی وہ خرابیاں ہمارے کمانڈنگ آفیسر کی اعصاب پر سوار ہو جاتی ہیں،مگر اس سے کہتا ہوں: جناب والا،کانکریٹ کی خرابی سر کے اندر کی خرابی سے تو بہتر ہوگی۔ہم جرمن لوگ چین سے بیٹھ نہیں سکتے۔ یہ ایک حقیقت ہے۔

بیرا: اور ہم بھی تو ان لوگوں کو تھوڑا بہت بہلا دیتے ہیں جو اٹلانٹک وال پر انتظار کررہے ہیں......

بیرا کا طائفہ: بیرا کا محاذ کا تھیئٹر تم لوگوں کے لیے گاتا ہے،تم لوگوں کو کھیل پیش کرتا ہے، اور آخری فتح کے لیے تم لوگوں کی ہمت بڑھاتا ہے۔

ہرتسوگ: ہاں، تمھارا نقطۂ نظر بالکل صحیح ہے، مگر صرف تھیئٹر ہی کافی نہیں ہوتا۔ زیادہ تر وقت، ہمیں اپنے آپ پر انحصار کرنا پڑتا ہے، اور ہم اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔ کیوں لانکیز ،کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟

لانکیز: بالکل صحیح جناب۔ہم اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔

ہرتسوگ: یہ ہوئی نہ بات۔جناب، اب اجازت چاہتا ہوں، مجھے 'ڈورا فوڑ' اور 'ڈورا فائیو' کا چکر لگانا ہے، آرام کیجیے، ہماری کانکریٹ کا غور سے معائنہ کیجیے۔ یہ ضروری ہے۔لانکیز آپ کو ہر چیز دکھا دے گا......

لانکیز: جی جناب سب کچھ دکھا دوں گا۔

(بیرا اور لانکیز ایک دوسرے کو سیلیوٹ کرتے ہیں۔ہرتسوگ فوراً چلا جاتا ہے، ریگوبا، آسکر، فیلکس اور کٹی، جو ابھی تک بیرا کے عقب میں کھڑے تھے، اچھل کر آگے

آجاتے ہیں۔ آسکر اپنا نقارہ اٹھائے ہوئے ہے، ریگنا کے ہاتھ میں باورچی خانے کے سامان سے بھری چھابی ہے۔ فیلکس اور رگنی پِل باکس کی کانکریٹ کی چھت پر چڑھ جاتے ہیں اور اپنی قلابازی کی مشق کرنے لگتے ہیں۔ آسکر اور ریگنا بالٹی اور بیلچے سے کھیلنے لگتے ہیں، سادہ سی بات یہ ہے کہ انھیں محبت ہو گئی ہے، گنگناتے ہیں اور فیلکس اور رگنی کو چھیڑنے لگتے ہیں)۔

بیرا: (ماندگی کے ساتھ پِل باکس پر ہر طرف سے نظر ڈالتے ہوئے کہتا ہے) کارپورل، تمھارا سویلین پیشہ کیا ہے؟

لانکیز: پینٹر تھا، جناب، مگر اس کو تو ایک عرصہ ہو گیا ہے۔

بیرا: مکانوں کے پینٹر؟

لانکیز: مکانات بھی، مگر زیادہ تر تصویریں۔

بیرا: واہ بھئی واہ! گویا تم عظیم ریمبراں کے برابر تھے، یا شاید Velasquez کے؟

لانکیز: بس کچھ اسی طرح، دونوں کے درمیان جیسا۔

بیرا: کیوں، واہ بھئی، واہ! تم کانکریٹ کو ملا بھی رہے ہو، انڈیل بھی رہے ہو، اور اس کی حفاظت بھی کر رہے ہو؟ تم کو تو کسی پروپیگنڈا کمپنی میں ہونا چاہیے تھا۔ کیوں، ہمیں بھی تو ایک جنگی فن کار چاہیے تھا، جیسے کہ تم ہو!

لانکیز: یہ میرا کام نہیں، جناب۔ میں جو کچھ کرتا ہوں وہ موجودہ مزاج کے مقابلے میں بہت زیادہ ترچھا ہوتا ہے، لیکن، کیا آپ کے پاس ایک سگریٹ ہوگی......

(بیرا اس کو ایک سگریٹ دیتا ہے)

بیرا: ترچھا؟ شاید تمھارا مطلب ہی کہ زیادہ جدید ہوتا ہے؟

لانکیز: جدید سے کیا مراد ہے آپ کی؟ اچھا، بہر حال، قبل اس کے کہ وہ کانکریٹ سے ابتدا کرتے، کچھ وقت کے لیے ترچھا پن جدید ہوتا تھا۔

بیرا: اوہ۔

لانکیز: جی ہاں۔

بیرا: میرا خیال ہے کہ تم موٹی تہہ بچھاتے ہو۔ شاید، کھُرپی، یا کرنی سے؟

لانکیز: جی، میں ویسے بھی کرتا ہوں۔ میں اس میں اپنا انگوٹھا ڈالتا ہوں، بالکل آٹو میٹک کی طرح، میں اس میں کیلیں اور بٹن ڈالتا ہوں، اور 1933 سے قبل، ایک وقت تھا جب میں سیماب کے سلفائیڈ کے اوپر خار دار تار بھی لگایا کرتا تھا۔ اچھے تجربے ہوتے تھے۔ وہ سب، اب سوئٹزر لینڈ کے ایک نجی عجائب گھر والے کے پاس ہیں۔ صابن بنانے کا کاروبار ہے اس کا۔

ہیرا: اُف یہ جنگ! کتنی بڑی جنگ ہے یہ! اور آج تم لوگ کانکریٹ انڈیل رہے ہو۔ اپنے صلاحیتوں کو مورچہ بندی میں استعمال کر رہے ہو، مگر مجھے اعتراف ہے کہ اپنے زمانے میں 'لیونارڈو' اور 'مائیکل انجیلو' بھی یہی کیا کرتے تھے۔ جب میڈونا (حضرت مریم کے مجسمے) کی مانگ نہیں ہوتی تھی تو جنگی مشینوں کے نقشے بنایا کرتے تھے۔

لانکیز: دیکھا آپ نے! ہمیشہ کچھ نہ کچھ کجی ہوتی ہے۔ حقیقی فن کار کو اپنا اظہار تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر آپ دیکھنا پسند کریں جناب، تو داخلے کے دروازے کے اوپر کے وہ تمام نقش و نگار، میں نے ہی بنائے ہیں۔

ہیرا: (ان کے ایک تفصیلی مطالعے کے بعد) حیرت انگیز! کتنی اچھی پیکر سازی کی ہے تم نے۔ واہ، کیا قوتِ اظہار ہے تمھاری!

لانکیز: میں اسے ساختیاتی پیکر سازی کہتا ہوں۔

ہیرا: اور تمھاری تخلیق، تمھاری تصویریں، کیا میں ان کو اظہارِ فن کہوں۔ اس کا کوئی عنوان ہے؟

لانکیز: میں نے ابھی آپ کو بتایا تو ہے: ساختیات، یا غیر متوازی ساختیات، اگر، آپ یہ نام پسند کریں۔ یہ ایک نیا انداز ہے۔ پہلے کبھی نہیں پیش کیا گیا ہے۔

ہیرا: اس کا کوئی عنوان تو ہونا چاہیے۔ کم از کم غلط تعبیر سے بچانے کے لیے۔ بہر حال، یہ سب تمھارا ہی کام ہے۔

لانکیز: مگر کس لیے۔ عنوانات کس کام کے ہوتے ہیں؟ صرف اس وقت ضروری ہوتے ہیں جب آپ ان کو انھیں کسی نمائش کے کیٹلاگ میں شامل کرنا ہو، تب۔

ہیرا: تم ہوائی باتیں کر رہے ہو، لانکیز۔ مجھے اپنے فن کا پروانہ سمجھو، افسر نہیں۔

سگریٹ؟ (لانگیز ایک سگریٹ لے لیتا ہے) اچھا، تو پھر کیا سوچا ہے تم نے؟

لانگیز: اوہ، اچھا، اگر آپ اسی طرح چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں اس کو اس طرح دیکھ رہا ہوں۔ جب جنگ ختم ہو گی— خواہ وہ کسی طرح ہو، اس کو کسی دن ختم تو ہونا ہے— اچھا، تو جب جنگ ختم ہو گی، تب بھی پِل باکس تو اسی طرح رہیں گے۔ یہ تو باقی رہنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اور پھر میرا وقت شروع ہو گا۔ صدیوں تک ...... (سگریٹ کو جیب میں رکھ لیتا ہے) آپ کے پاس اور سگریٹ تو ہو گی جناب؟ شکریہ جناب ...... صدیاں شروع ہوتی ہیں، ختم ہوتی ہیں، ایک کے بعد دوسری، جیسے کہ وہ کبھی تھیں ہی نہیں، مگر پِل باکس تو باقی رہنے کے لیے ہیں، اہرامِ مصر کی طرح رہنے والے ہیں۔ اور ایک دن کوئی ماہرِ آثاریات آئے گا اور وہ خود سے کہے گا، پہلی اور ساتویں عالمی جنگ کے زمانے میں کیا کیا فضولیات بنائی گئی تھیں۔ بے کار، کانکریٹ کا زیاں؛ ادھر اُدھر، پِل باکس کے داخلے کے دروازے کے اوپر، پرانے زمانے کے گھروں کی طرح، بدسلیقہ، شوقیہ، فضولیات۔ بس یہی کچھ ہے۔ اور پھر وہ 'ڈورا فائیو'، 'ڈورا سکس'، 'ڈورا سیون' دریافت کرے گا؛ اور اس کو غیر متوازی ساختیات نظر آئیں گی، اور وہ خود سے کہے گا، ذرا اِسے تو دیکھو، بہت دل چسپ، بالکل جادو، تباہ کن، پھر بھی روحانیت سے کھلا ہوا ہے۔ اس کام میں کوئی نہایت ذہین، شاید بیسویں صدی کے واحد ذہین انسان نے اپنا واضح، محکم انداز میں، اور ہمیشہ رہنے والا اظہار کیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، ہمارا ماہرِ آثاریات کہے گا، میں سوچ رہا ہوں کہ اس کا کوئی نام بھی ہے، کہ نہیں؟ کوئی دستخط، یہ بتانے کے لیے کہ ماسٹر کون تھا؟ اگر، جناب، آپ غور سے دیکھیں، اپنا سر ذرا ترچھا رکھیں، تو آپ ان ترچھی ساختیات میں دیکھیں گے ......

بیرا: میری عینک۔ لانگیز، ذرا لانا تو۔

لانگیز: بہت اچھا جناب، یہاں لکھا ہوا ہے: ہربرٹ لانگیز، سن انیس سو چوالیس اور عنوان ہے: ظالمانہ، عارفانہ، بیزار۔

بیرا: تم نے ہماری صدی کو اس کا نام دے دیا ہے۔

لانگیز: دیکھا آپ نے!

ہیرا: جب وہ تمھارے کام کو بحال کریں گے، پانچ سو، یا ایک ہزار برس بعد، تو انھیں کانکریٹ میں دفن کتے کے پلّوں کی کچھ ہڈیاں بھی ملیں گی۔

لانگیز: وہ میرے عنوان کو اضافی قوت دیں گی۔

ہیرا: (پُرجوشی سے) کیا زمانہ ہے، اور ہم کیا ہیں، میرے دوست، اگر ہمارا کام — ارے، ذرا دیکھو تو، فیلکس اور کٹی، میرے قلاباز کانکریٹ پر فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

(کافی دیر سے — روزیٹا اور آسکر — فیلکس اور کٹی کے درمیان کاغذ کا ایک ٹکڑا گردش کر رہا تھا اور ہر جوڑا اس پر باری باری کچھ لکھ رہا تھا)۔

کٹی: (ہلکے سے جرمن لہجے میں) مسٹر ہیرا، آپ نے دیکھا، ہم کانکریٹ پر کیا کچھ کر سکتے ہیں (وہ اپنے ہاتھوں کے بل چل رہی تھی)۔

فیلکس: آج تک کوئی کانکریٹ پر اُلٹی قلابازی نہیں کر سکا ہے۔ سیدھی قلابازی بھی نہیں۔ یہ لڑکی دونوں کر لیتی ہے۔

کٹی: ہمیں اسی طرح کا اسٹیج بنانا چاہیے۔

فیلکس: میرے لیے ہوا بہت تیز ہے۔

کٹی: سینما گھروں کی طرح یہاں گرمی یا بو نہیں ہے۔ (وہ خود کو ایک گرہ کی صورت بنا لیتی ہے)

فیلکس: اور ہم نے ابھی، اسی جگہ، ایک نظم تیار کی ہے۔

کٹی: 'ہم' سے تمھارا کیا مطلب ہے؟ آسکرنیلو اور روزیٹا نے مل کر تیار کی ہے۔

فیلکس: مگر ہم نے مدد کی تھی، جب وہ ایک مصرعے کے وزن پر اٹک گئے تھے۔

کٹی: محض ایک لفظ غائب ہے، تو یہ کام ہو جائے گا۔

فیلکس: آسکر جاننا چاہتا ہے کہ ریت میں سے نکلی ہوئی اس میخ جیسی چیز کو کیا کہتے ہیں۔

کٹی: اس لیے کہ نظم کے لیے یہ ضروری ہے۔

فیلکس: ان کی اہمیت کے باعث ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

رکئی: مسٹر کارپورل کیا آپ ہمیں بتائیں گے؟ ان کو کیا کہتے ہیں؟
فیلکس: ہو سکتا ہے کہ اس کی اجازت نہ ہو۔ کہیں دشمن سن نہ لے۔
رکئی: ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم کسی کو بتائیں گے نہیں۔
فیلکس: یہ فن کی لیے ہے۔
رکئی: آسکر نے کتنی محنت کی ہے۔
فیلکس: اور وہ کتنا اچھا لکھتا ہے۔ سوٹر لین طرزِ تحریر میں۔
کئی: میں سوچ رہی ہوں کہ اس نے یہ کہاں سے سیکھا ہے۔
فیلکس: اوہ، آسکر پڑھا لکھا آدمی ہے۔ وہ سب کچھ جانتا ہے، سوائے اس کہ اس نوکیلی شے کو کیا کہتے ہیں۔
لانکیز: میں تمھیں بتاتا ہوں، اگر کپتان کو اعتراض نہ ہو۔
بیرا: مگر، ہو سکتا ہے کہ یہ بہت خفیہ ہو۔
فیلکس: مگر، آسکر جاننا چاہتا ہے۔
رکئی: ورنہ نظم تباہ ہو جائے گی۔
روزویدا: اور ہم سب کو بھی تجسس ہے۔
بیرا: تو پھر تم بتا دو۔ یہ میرا حکم ہے۔
لانکیز: اچھا۔ دراصل ہم ان کو ٹینک اور ساحل پر لگنے والی مشین کے خلاف دفاع کے لیے لگاتے ہیں۔ یہ مارچوب (asparagus) جیسے لگتے ہیں، ہے نا؟ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کو رومیل مارچوب کہتے ہیں۔
فیلکس: رومیل ......!
رکئی: مارچوب؟ کیا یہ نظم میں فٹ ہوگا، آسکر نیلو؟
آسکر: ہاں۔
(وہ کاغذ پر یہ لفظ لکھ لیتا ہے، نظم پِل باکس کے اوپر، کئی کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ خود کو مزید گرہ جیسا بنا لیتی اور مندرجہ ذیل سطروں کو اسکول کے بچوں کی طرح گانے لگتی ہے)

رکٹی : اٹلانٹک وال پر
رومیل نے بھیجے ہمیں فولاد جیسے مارچوب
اور ہم بیٹھے ہوئے ہیں، سخت بالوں کی طرح،
دشمنوں کی آنکھ سے محفوظ ہیں
دیکھتے، قالین پر چلنے کی نرما نرم گرگابی کے خواب
اتوار کا دن روسٹ کا، جمعے کو پکتی مچھلیاں
ہو جہاں ہر شے بہت آرام دہ بھی نرم بھی:
بوڑوا میلان ہے، اور خوب ہے

رہتے ہیں ہم در مکانِ کانکریٹ
اور، کانٹے دار تاروں میں گھرے
دفن کر دیتے ہیں ہم کو جلد ہی، بیت الخلا کی
ریت میں
دیکھتے ہیں خواب ایسے سائبانِ سبز کے
ہوں جو سرداب کے جیسے، اور اچھا وقت ہو
اور یہ سب ہو بہ فیضِ برق اور اس کے پلگ
بوڑوا میلان ہے، اور خوب ہے

سچ کہ ہم میں کچھ مریں گے، بالیقیں
کتنی ماؤں کے جگر ہوں گے فگار
موت گرچہ اب بھی پیرا شوٹ ہے پہنے ہوئے
مرچ کی ڈوری لگی ہوتی ہے اس کے سوٹ میں،
سوچ ہے تسکین کی، مثلِ دوا
بوڑوا میلان ہے، اور خوب ہے
(لانکیر سمیت، سب تالیاں بجاتے ہیں)

لانگیز: یہ پانی کے اُتار کا وقت ہے، سطح خاصی نیچی ہے۔

روز ویوا: یہ ناشتے کا وقت ہے۔

وہ اپنی بڑی سی چھابی نکالتی ہے، جس کو ربن بو نائی اور مصنوعی پھولوں سے سجایا گیا تھا)

بکٹی: اوہ اچھا، کھلے میدان میں پکنک ہونے والی ہے۔

فیلکس: قدرت نے ہماری بھوک تیز کردی ہے۔

روزویوا: اوہ، یہ پیٹ بھرنے کا مقدس عمل، جب تک آدمی ناشتا کرتے رہیں گے، قومیں متحد ہوتی رہیں گی۔

ہیرا: آج ہم کانکریٹ پر دعوت کھائیں گے۔ہمیں انسانی رسوم کوٹھوس بنیادوں پر قائم کرنا چاہیے!

لانگیو کے علاوہ وہ سب پِل باکس پر چڑھ جاتے ہیں۔روزویوا ایک پھول دار خوش رنگ دستر خوان بچھاتی ہے۔بغیر تلے والی چھابی سے وہ چھوٹے چھوٹے جھالروں والے گدے نکالتی ہے۔ایک بڑا سا گلابی اور سبز رنگ کا چھاتا کھولا جاتا ہے، ایک چھوٹا سا گراموفون، لاؤڈ اسپیکر سمیت لگادیا جاتا ہے۔چھوٹی پلیٹیں، چھوٹے چمچے، چھوٹی چھریاں، انڈوں کے کپ اور رومال بانٹے جاتے ہیں۔

فیلکس: مجھے تھوڑا سا pâté de foie gras چاہیے۔

بکٹی: کیا تمھارے پاس اس کیویار میں سے کچھ بچا ہے جو اس دن ہم نے اسٹالس گراؤ میں بچایا تھا؟

آسکر: تمھیں ڈینش مکھن کی اتنی موٹی تہہ نہیں لگانی چاہیے۔

ہیرا: خوشی کی بات ہے کہ تمھیں اس کی صحت کا بہت خیال رہتا ہے۔یہ اچھی بات ہے، بیٹا۔

روزویوا: مگر مجھے تو بہت اچھا لگتا ہے اور میرے لیے اچھا بھی ہے۔اوہ، مجھے وہ کیک اور کریم بہت یاد آتی ہے جو کوپن ہیگن میں، ہوائی فوج میں کھلائی جاتی تھی۔

ہیرا: تھرمس میں ڈچ چاکلیٹ اب بھی گرم ہو گی۔

بکئی: میں تو ٹین والے امریکی بسکٹوں کی دیوانی ہوں۔
روزویدا: مگر وہ اسی وقت مزہ دیتے ہیں جب آپ اوپر سے ان پر جنوبی افریقی اورک کا جام لگا لیں۔
آسکر: تم سے التجا ہے کہ ذرا اعتدال کیا کرو، روزویدا۔
روزویدا: تمھارا خود اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ تم بھی تو غلیظ انگریزی کارن بیف کی موٹی موٹی قاشیں کھایا کرتے ہو، کبھی ان کے بارے میں بھی سوچا ہے تم نے۔
بیرا: پیارے کارپورل، تمھارا کیا خیال ہے۔ کیا میں تمھیں کشمش والی ڈبل روٹی کے کاغذ جیسے پتلے ٹکڑے پر آلوچے کا جام لگا کر دوں؟
لانکیز: اگر میں ڈیوٹی پر نہ ہوں، جناب۔
روزویدا: اس کو سرکاری اجازت کی ضرورت ہوگی۔
بکئی: ہاں، تو اس کو اجازت دے دیجیے نا۔
بیرا: بہت اچھا۔ کارپورل لانکیز، تم کو اجازت دی جاتی ہے کہ تم فرانسیسی جام لگے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا، ایک اُبلا ہوا ڈینش انڈا، تھوڑا سا روسی کیویار، اور ایک کپ اصلی ڈچ چاکلیٹ کا مشروب وصول کرلو......
لانکیز: اچھا، جناب۔
(وہ پِل باکس کے اوپر جا کر دوسروں کے ساتھ شامل ہوجاتا ہے)
بیرا: کیا ہمارے پاس کارپورل کے لیے کوئی اور گدا نہیں ہے؟
آسکر: وہ میرا گدا لے سکتا ہے۔ میں اپنے نقارے پر بیٹھ جاؤں گا۔
روزویدا: کہیں تمھیں سردی نہ لگ جائے، قیمتی آدمی۔ کانکریٹ بہت بے وفا ہوتی ہے۔ اور تم اس کے عادی نہیں ہو۔
بکئی: وہ میرا گدا بھی لے سکتا ہے۔ میں اپنے آپ کو اور زیادہ گرہ میں کس لوں گی، یہ میرے ہاضمے کے لیے بہت اچھا ہوگا۔
فیلکس: میز پوش بچھا کر کھانا، ورنہ کانکریٹ پر شہد گر جائے گا۔ ہم اپنے دفاع

کو مخدوش نہیں کرنا چاہتے۔(سب ہنس پڑتے ہیں)۔

بیرا: واہ سمندری ہوا مجھے کتنی اچھی محسوس ہوتی ہے۔

روز یودا: محسوس!

بیرا: سینہ پھول جاتا ہے۔

روزیودا: پھول جاتا ہے!

بیرا: دل اپنا چھلکا اُتار دیتا ہے۔

روز یودا: چھلکا!

بیرا: روح پھر سے پیدا ہو جاتی ہے

روزیودا: پیدا!

بیرا: آنکھیں اوپر اُٹھنے لگتی ہیں۔

روزیودا: اُٹھتے!

بیرا: سمندر کے اوپر۔ لا متناہی سمندر — کارپورل، مجھے ساحل پر کوئی کالی سی شے دکھائی دے رہی ہے۔ جو کچھ بھی ہوں، وہ پانچ عدد ہیں۔

رکّی: مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔ پانچ کھلی چھتریوں کے ساتھ۔

فیلکس: چھ عدد۔

رکّی: پانچ ہیں۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ!

لانکیز: یہ Lisieux کی راہبائیں ہیں۔ انھیں باہر نکال دیا گیا ہے، اور ان کو بحری جہاز سے کنڈرگارٹن سمیت یہاں بھیج دیا گیا ہے۔ مجھے تو کوئی بچہ دکھائی نہیں دیتا۔ وہاں صرف پانچ چھتریاں ہیں۔

لانکیز: وہ بچوں کو بلونیٹ میں چھوڑ دیتی ہیں۔ کبھی کبھی، جب سمندر اُترا ہوا ہو تو کیکڑے اور شل فش پکڑنے آ جاتی ہیں، جو رومیل کے مارچوب میں پھنس جاتی ہیں۔

رکّی: بے چاری، راہبائیں!

روز یودا: کیوں نہ ہم انھیں کچھ کارن بیف اور بسکٹ دے دیں؟

آسکر: میرا مشورہ ہے کشمش والی ڈبل روٹی اور آلوچے کا جام۔ آج جمعہ ہے؛ راہباؤں کو جمعے کے دن کارن بیف کھانے کی اجازت نہیں۔

رکی: اب وہ دوڑ رہی ہیں۔ ایسا لگتا ہے گویا اپنی چھتریوں کے بل ہوا میں تیر رہی ہیں۔

لانکیز: جب چٹنا ختم ہو جاتا ہے تو ہمیشہ یہی کرنے لگتی ہیں۔ وہ کھیل شروع کر دیتی ہیں۔ بالخصوص اگنیتا، نو آموز، وہ بالکل بچی ہے، اس کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اوپر کیا ہوتا ہے۔ کیا تم ایک اور سگریٹ دے سکتی ہو؟ شکریہ۔ اور وہ موٹی والی جو بھاگ نہیں رہی ہے، اسکولسٹیکا ہے، بالکل بڑی اماں۔ وہ اس طرح ان لوگوں کا ساحل پر کھیلنا پسند نہیں کرتی، اس کے خیال میں یہ ان کے لیے جاری کیے گئے حکم کے خلاف ہے۔

(راہبائیں پس منظر میں اپنی چھتریوں سمیت دوڑتی دکھائی دے رہی ہیں۔ روزویتا گراموفون لگا دیتی ہے: "Sleigh Bells in St. Petersburg." بجنے لگتا ہے۔ راہبائیں شور کرتی، ناچنے لگتی ہیں)

اگنیتا: یوہو، سسٹر، اسکولسٹیکا!

اسکولسٹیکا: اگنیتا، سسٹر اگنیتا!

اگنیتا: یوہو، سسٹر، اسکولسٹیکا!

اسکولسٹیکا: اب واپس آجاؤ بیٹی! سسٹر اگنیتا!

اگنیتا: میں آ نہیں پا رہی ہوں۔ یہ مجھے کھینچے لیے جا رہا ہے۔

اسکولسٹیکا: تب تو تمھیں دعا کرنی چاہیے، سسٹر، تبدیلی کے لیے۔

اگنیتا: افسردگی والی؟

اسکولسٹیکا: رحم دلی والی۔

اگنیتا: خوشی دینے والی؟

اسکولسٹیکا: بس دعا کرو، سسٹر اگنیتا!

اگنیتا: میں دعا تو کر رہی ہوں مگر میں اب بھی کھنچی چلی جا رہی ہوں!

اسکولسٹیکا (دور، اس کی آواز کم ہوتی جا رہی تھی): اگنیتا، سسٹر اگنیتا۔

اگنیا: ہوبہو، مسٹر اسکولسٹیکا!

(راہبائیں غائب ہوگئیں، مگر تھوڑی تھوڑی دیر بعد پس منظر میں، چھتریاں ابھرتی دکھائی دیتی ہیں۔گراموفون ریکارڈ بالکل آڑے مرحلے پر ہے بیچ باکس کے دروازے کے قریب رکھا ٹیلی فون بج اٹھتا ہے۔ لانگیو کود کر جاتا ہے اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیتا ہے، بقیہ لوگ کھانے میں مصروف رہتے ہیں)

روزیدا: ٹیلی فون، ٹیلی فون، جہاں بھی جاؤ، ٹیلی فون۔سمندر اور آسمان کے درمیان بھی ٹیلی فون۔

لانگیو: ڈوراسیون بول رہا ہے۔کارپورل لانگیو۔

ہرتسوگ: (دائیں جانب سے آہستہ آہستہ آ رہا ہے، ہاتھ میں ٹیلی فون لیے، ساتھ میں تار کھینچتا چلا آ رہا ہے۔وہ بار بار رُکتا ہے، اور فون پر بات کرتا ہے): لانگیو، کیا تم سو رہے ہو؟ ڈوراسیون کے سامنے کوئی شے حرکت کر رہی ہے۔ مجھے یقین ہے۔

لانگیو: یہ راہبائیں ہیں، جناب۔

ہرتسوگ: راہبائیں وہاں کیا کر رہی ہیں؟ اور اگر فرض کرو کہ وہ راہبائیں نہیں۔

لانگیو: مگر، وہ راہبائیں ہیں۔ میں ان کو صاف دن کی طرح دیکھ سکتا ہوں۔

ہرتسوگ: کیا تم نے کبھی کیموفلاج کے بارے سنا نہیں؟ پانچویں کالم کے بارے میں بھی نہیں سنا ہے؟ انگریز صدیوں سے یہ کر رہے ہیں۔ وہ اپنی انجیلوں کے ساتھ آتی ہیں، اور قبل اس کے کہ تم کو پتا چلے کہ ان کا ارادہ کیا ہے— دھماکا!

لانگیو: وہ کیکڑے پکڑ رہی ہیں، جناب!

ہرتسوگ: فوراً! ساحل خالی کرایا جائے۔ سنا تم نے؟

لانگیو: جی جناب، جی، مگر وہ تو کیکڑے پکڑ رہی ہیں۔

ہرتسوگ: ہوش کے ناخن لو— لانگیو!

لانگیو: مگر فرض کر لیجیے کہ وہ صرف کیکڑے ہی پکڑ رہی ہیں، اس لیے کہ سمندر اترا ہوا ہے اور بچے اپنے کنڈرگارٹن میں ہیں……

ہرتسوگ: یہ سرکاری حکم ہے۔ لانگیز۔

لانگیز: جی، جناب۔

(لانگیز پِل باکس میں غائب ہو جاتا ہے۔ ہرتسوگ ٹیلی فون لیے باہر چلا جاتا ہے)

آسکر: روز وِدا، اپنے کان بند کر لو۔ نیوز ریل کی طرح گولیاں چلنے والی ہیں۔

کٹی: اوہ، کتنی بُری بات ہے۔ میں اپنی گرہ زیادہ سخت کیے لیتی ہوں۔

بیرا: میں خود بھی سوچ رہا ہوں، کہ کچھ آوازیں آنے والی ہیں۔

فیلکس: ایک اور ریکارڈ لگائے دیتا ہوں۔ اس سے کچھ مدد ہو جائے گی۔

(وہ گراموفون لگا دیتا ہے۔ پلیٹرز "The Great Pretender" گا رہے ہیں۔ مشین گن کی ٹٹ-ٹٹ-ٹٹ شروع ہو جاتی ہے۔ روزوِدا اپنے کان کی لویں پکڑ لیتی ہے۔ فیلکس سر کے بَل کھڑا ہو جاتا ہے۔ پس منظر میں وہ پانچوں راہبائیں اپنی چھتریوں سمیت آسمانوں میں اڑتی دکھائی دے رہی ہیں۔ ریکارڈ کی سوئی پھنس جاتی ہے اور ریکارڈ گانے کے ایک ہی ٹکڑے کو بار بار بجانے لگتا ہے۔ فیلکس واپس اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کٹی اپنی گرہ کھول دیتی ہے۔ روزوِدا اپنی جماہی کو دوبارہ بند کرنے کے لیے میز خالی کرنے لگتی ہے۔ آسکر اور بیرا اس کی مدد کرتے ہیں۔ وہ پِل باکس کی چھت چھوڑ دیتے ہیں۔ لانگیز داخلے کے دروازے میں نمودار ہوتا ہے۔)

لانگیز: کیپٹن، جناب، کیا مجھے ایک سگریٹ دے سکتے ہیں......

بیرا (اس کے خوف زدہ ساتھی اس کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں): کارپورل، تم بہت سگریٹ پینے لگے ہو۔

بیرا کا طائفہ: یہ بہت سگریٹ پیتا ہے۔

لانگیز: یہ سب اس کانکریٹ کی وجہ سے ہے، جناب۔

بیرا: اور فرض کرو کہ ایک دن یہ کانکریٹ نہ ہو تو؟

بیرا کا طائفہ: کانکریٹ ختم۔

لانگیز: کانکریٹ لافانی ہے، جناب۔ جیسے ہم ہیں اور ہماری سگریٹ......

ہیرا: جانتا ہوں جانتا ہوں۔ ہم سگریٹ کے دھوئیں کی طرح غائب ہوجاتے ہیں۔
ہیرا کا طائف: (آہستہ آہستہ جاتے ہوئے): دھواں!
ہیرا: ہزار برس بعد بھی وہ کانکریٹ کو دیکھنے آتے رہیں گے۔
ہیرا کا طائف: ہزار برس بعد بھی۔
ہیرا: انھیں کتوں کے پلّوں کی ہڈیاں ہی ملیں گی۔
ہیرا کا طائف: کتوں کے پلّوں کی ہڈیاں ہی ملیں گی!
ہیرا: اور تمھارے آڑے ترچھے پیکر۔
ہیرا کا طائف: وحشیانہ، صوفیانہ، اُکتایا ہوا!
(لانگیر اکیلا ہوگیا ہے، سگریٹ پی رہا ہے)

-----

حالاں کہ کانکریٹ پر ماشا کرتے ہوئے' آسکر نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا تھا۔ محض اس لیے کہ حملے سے ذرا قبل اس قسم کی باتیں کی گئی تھیں، مجھے ان باتوں کو ریکارڈ کرنا پڑا تھا۔ مزید یہ کہ ہم نے، کانکریٹ کے فن کے ماہر، کارپورل لانگیر کی آخری حد نہیں دیکھی ہے؛ جب جنگ کے بعد کی، اور موجودہ بوژوائی سہولتوں کی تقدیس کرنے کا وقت آئے گا تو ہم پھر ملیں گے۔

جوانوں کو لے جانے والی ہماری بکتر بند گاڑی ساحلی سیر گاہ پر ہمارے انتظار میں تھی۔ لیفٹیننٹ ہرتسوگ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے ماتحتوں کے پاس پہنچا اور اس نے ہیرا سے معذرت کی، کہ ساحل غیر فوجی افراد کے لیے بند تھا اور بند ہونے کا صاف مطلب بند ہونا ہی ہوتا ہے۔ اس نے گاڑی میں بیٹھنے میں خواتین کی مدد کی، ڈرائیور کو احکامات جاری کیے اور ہم Bavent کی طرف واپس روانہ ہوگئے۔ ہم جلدی میں تھے، دوپہر کے کھانے کے لیے وقت نہیں تھا، اس لیے کہ سفیدے کے درختوں کے درمیان، گاؤں کے کنارے، خوب صورت نارمن شیٹو (château) میں دو بجے ہمارا کھیل پیش کیا جانے والا تھا۔
ہمارے پاس مشکل سے آدھ گھنٹے کا وقت تھا، جس میں روشنی کے انتظامات کی

جانچ پڑتال کرتی تھی؛ تب آسکر کے نقارے کی زوردار تھاپ سے پردہ اُٹھایا گیا۔ ہم نئے بھرتی ہونے والوں کے لیے کھیل کھیل رہے تھے۔ ہم نے خوب بڑھ چڑھ کر کھیل پیش کیا، ناظرین کے قہقہے دل سے نکل رہے تھے اور بار بار نکل رہے تھے۔ میں نے شیشے سے بنے پیشاب دان پر اپنے گانے سے وار کیا تھا جس میں سرسوں کے ساس کے ساتھ دو عدد ساسیج رکھی ہوئی تھیں۔ سفید پینٹ کیے ہوئے ہرانے ٹوٹے ہوئے پیشاب دان پر مسخرے والے آنسو بہائے، ساسیج نکالیں اور بھوری وردی کے مجمعے کے قہقہوں کے درمیان انھیں چٹ کر گیا۔ فیلکس اور کٹی نے چمڑے کے ہاف پینٹ اور ٹائیرول کے ہیٹ پہن رکھے تھے، جنھوں نے ان کرداروں کو دل چسپ بنا دیا تھا روزویتا تنگ رو پہلے رنگ کا لبادہ اور ہلکے ہرے رنگ کے دستانے پہنے ہوئے تھی؛ اس کے ننھے ننھے پاؤں سنہرے کارچوبی سینڈلوں میں کسے ہوئے تھے۔ اس کی نیلگوں آدھی بند آنکھیں اور خمار آلود بحیرۂ رومی لہجہ جادوئی خوف پیدا کر رہا تھا۔ آسکر کو— میں نے پہلے بھی یہ بات کہی ہے— کسی خاص وردی کی ضرورت نہیں؛ میں اپنی پرانی ملاحوں والی ہیٹ، جس کے فیتے پر S.M.S.Seydlitz لکھا ہوا ہے، اپنی بحریہ کے نیلے رنگ کی قمیص، جس میں لنگر کے نمونے کے سنہرے بٹن لگے ہوتے ہیں، پہنے ہوئے تھا۔ جیسے ہی کیمرے کی آنکھ مجھ پر پڑی اس نے میری ہاف پینٹ کے عقب کو، اُلٹے ہوئے موزوں کو اور بہت خراب حال جوتے کو دیکھا تھا۔ میرا سفید پالش کیا ہوا نقارہ، اس اطلاع سے سرشار، کہ میرے سامان میں ایسے پانچ اور موجود تھے، میرے گلے میں لٹکا ہوا تھا۔

اس رات ہم نے وہی کھیل افسروں کے لیے اور کیبورگ میسج سنٹر کی بلٹز گرلز (Blitz Girls) لیے دہرایا۔ روزویتا ذرا گھبرا رہی تھی۔ اس نے غلطیاں تو نہیں کیں، مگر اپنے کردار کے درمیان اس نے نیلے رنگ کے فریم کی دھوپ کی عینک لگا لی تھی، اور اچانک اپنا لہجہ تبدیل کر لیا تھا۔ اس کے انکشافات کچھ زیادہ ہی راست ہو گئے تھے؛ مثال کے طور پر اس نے ایک انیمیا زدہ بلٹز گرل کو بتایا، جس کی شرمندگی نے اس کو جھلا دیا تھا، کہ اس کا اپنے کمانڈنگ آفیسر سے معاشقہ چل رہا ہے۔ میرے نزدیک یہ بدمزگی کی

بات تھی، مگر اس پر کافی لوگ ہنسے تھے، اس لیے کہ بلٹز گرل کے ساتھ ہی ایک افسر بیٹھا ہوا تھا، اور کافی وجہ تھی بہت کچھ فرض کر لینے کی......

کھیل کے بعد رجمنٹ کے افسران نے، جنھیں شیٹو میں عارضی طور پر ٹھہرایا گیا تھا، ہماری دعوت کی۔ ہیرا، کٹی، اور فیلکس بعد تک ٹھہرے رہے، مگر ریگوا اور آسکر چپکے سے کھسک کر بستر میں چلے گئے تھے۔ وہ تھکا دینے والا دن تھا۔ ہم لوگ جلد ہی چلے گئے تھے، اور پانچ بجے صبح تک سوتے رہے، جب حملے نے ہم کو جگا دیا تھا۔

میں حملے کے بارے میں کیا بتاؤں؟ کینیڈا والے ہمارے علاقے میں اترے تھے، جو 'اورنے' دریا کے دہانے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ باونیٹ کو خالی کرنا پڑا تھا۔ ہمارا سامان پہلے ہی ٹرک پر لاد دیا گیا تھا۔ ہم رجمنٹ کے کارکنان کے ساتھ لے جائے جا رہے تھے۔ شیٹو کے احاطے میں ایک چلتا پھرتا باورچی خانہ روک دیا گیا تھا۔ روزویدا نے مجھے ایک کپ کافی لانے کے لیے کہا۔ میں اس خوف سے گھبرایا ہوا تھا کہ کہیں ٹرک نہ چھوٹ جائے۔ میں نے انکار کر دیا۔ میں ذرا گستاخ ہو گیا تھا۔

وہ اپنے اونچی ایڑی کے جوتوں میں دوڑی دوڑی محاذ کے باورچی خانے میں گئی، اور عین اس وقت بھاپ اُڑاتی ہوئی کافی ہاتھ لگی جب بحریہ توپ کا ایک گولا آ کر گرا تھا۔

روزویدا، مجھے نہیں معلوم کہ تمھاری عمر کیا ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ تمھارا قد تین فٹ تین انچ ہے، کہ تمھارے لب بحیرۂ روم کی زبان بولتے ہیں، کہ تم سے دارچینی اور جائفل کی بو آتی ہے، اور یہ بھی کہ تم مردوں کے دل کا حال جان لیتی ہو؛ مگر تم خود اپنے دل کا حال نہیں جان سکی ہو، ورنہ تم کافی کے پیچھے بھاگنے کے بجائے میرے پاس ٹھہرتیں، جو بہت گرم تھا۔

Lisieux میں ہیرا نے جعل سازی سے برلن کی روانگی کے احکام جاری کرا دیے تھے۔ ہم کمانڈنٹ کے دفتر کے باہر اس کا انتظار کر رہے تھے، اور جب وہ ہم سے ملا تب اس نے پہلی بار روزویدا کی موت کی خبر دی تھی: ہم احمق بونوں کو کانکریٹ پر ناچنے سے، کیا مطلب جو ویو جیسے آدمیوں کے لیے بنائے گئے ہیں۔ کاش ہم رونٹرم کے نیچے ٹھہرے

رہتے جہاں کسی کو ہماری موجودگی کا شبہ نہ ہوتا!“

میں برلن میں ہیرا سے الگ ہوگیا۔ اس نے ایسی مسکراہٹ سے کہا تھا جو مکڑی کے جالے جیسی پتلی تھی، ”تم ان ہوائی حملوں سے بچاؤ کی جگہوں پر روزویدا کے بغیر کیا کروگے؟“ پھر اس نے میری پیشانی کا بوسہ لیا۔ اس نے مجھے بقیہ پانچ نقاروں کا تحفہ دیا اور سکی اور فیلکس کو میرے ساتھ رہنے کے لیے سرکاری حکم پر واشنگ بھیج دیا۔ اس طرح میں چھ عدد نقاروں اور ایک کتاب سے لیس تھا جب میں جون کی گیارہ تاریخ کو، یعنی اپنے بیٹے کی تیسری سالگرہ سے ایک دن قبل اپنے شہر واپس پہنچا تھا جو اب بھی سالم اور قرونِ وسطی جیسا تھا، جو اب بھی ہر طرح کی گھنٹیوں کی آواز سے گونجتا تھا جو اونچے نیچے گھنٹا گھروں سے ہر گزرے گھنٹے کی یاد دلاتی تھیں۔

# یسوع کی نقل

ارے ہاں گھر واپسی ہو رہی ہے! رات کے آٹھ بج کر آٹھ منٹ پر، فوجوں کو لمبی چھٹی پر لے جانے والی ریل گاڑی واشنگ ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوئی تھی۔ فیلکس اور بگی 'میکس ہا لبے پلاز' تک میرے ساتھ تھے۔ بگی خدا حافظ کہتے وقت رو پڑی تھی۔ 'بوخترلیس' میں فوجیوں کے پروپیگنڈا ہیڈ کوارٹرز پہنچتے پہنچتے نو بج گئے تھے، جب آسکر اپنا سامان 'ڈیلیس ویگ' کی طرف لے کر چلا تھا۔

بالآخر، گھر واپسی ہوئی۔ آج کل ہر نوجوان جو جعلی چیک بناتا ہے، بدیسی فوج میں بھرتی ہوتا ہے یا دھاگے بناتا ہے، اور چند برس بعد اپنے گھر لوٹتا ہے تو اس کو جدید یولیسس سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ گھر واپسی کے وقت ہمارا نوجوان غلط ریل گاڑی میں بیٹھ گیا ہو جو اس کو 'فرینکفرٹ' کے بجائے 'اوبرہاؤسن' لے جائے اور راستے میں اسے کسی قسم کا تجربہ ہو جائے— کیوں نہیں؟ ایسا ہو سکتا ہے اور جوں ہی وہ گھر پہنچتا ہے، وہ ٹیڑھے میڑھے فرضی نام گھڑنے لگتا ہے: 'سیرکے'، 'پینی لوپ'، 'ٹیلی ماکس'۔

آسکر کوئی یولیسس نہیں تھا، اس لیے کہ اس کی گھر واپسی پر ہر چیز بالکل ویسی ہی تھی۔ اپنی فرضی معشوقاؤں کے نرغے میں ہونے کے بعد بھی، اگر وہ یولیسس ہوتا تو ماریا کو 'پینی لوپ' کا کردار ادا کرنا پڑتا، مگر ابھی اس کا ماتسیرت موجود تھا، آسکر کی روانگی کے پہلے جس کے حق میں اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ اور مجھے امید ہے کہ میرے قارئین میں زیادہ

کلاسیکی ذہن کے مالک لوگ، اس کی خواب خرامی کے باعث، بے چاری روز یودا کو ’کیرکے‘ سمجھنے لگیں گے، وہ جادوگرنی جو آدمیوں کو وحشی جانوروں میں تبدیل کر دیتی تھی۔ اور...... میرے بیٹے گرٹے نے اپنے واپس آئے باپ کے لیے ایک اُنگلی بھی نہیں ہلائی تھی؛ اس لیے وہ ’ٹیلی ماکس‘ نہیں تھا، باوجودے کہ وہ مجھے پہچان نہیں سکا تھا۔

اگر تقابل لازم ہوتو—اور میں دیکھ رہا ہوں کہ گھر واپس ہونے والوں کو ایک دو تقابل برداشت کرنے پڑتے ہیں— میں خود کو [ٹیلی ماکس کی طرح] ضائع بیٹا دیکھنا پسند کروں گا؛ اس لیے کہ جب ماتسیرات نے دروازہ کھولا تھا تو اس طرح میرا استقبال کیا تھا گویا وہ میرا قیاسی باپ نہیں اصلی باپ ہے۔ دراصل، اس نے آسکر کی واپسی پر واقعی اس قسم کی خوشی ظاہر کی تھی کہ اس کی خاموش آنکھوں سے آنسو چھلکے پڑے تھے۔ اس دن سے میں نے خود کو صرف آسکر برانسکی کہنا چھوڑ دیا تھا، اور خود کو آسکر ماتسیرات بھی کہنے لگا تھا۔

ماریا نے میرا استقبال ذرا کم گرم جوشی سے کیا تھا، مگر غیر دوستانہ نہیں تھا۔ وہ میز پر بیٹھی ہوئی بورڈ آف ٹریڈ کے لیے غذائی ٹکٹ چسپاں کر رہی تھی، کہ وہ گرٹے کی سالگرہ کے لیے پہلے سے کچھ تحفے جمع کر چکی تھی۔ ایک عملی عورت ہونے کے ناتے، اس نے سب سے پہلے میری صحت کی خاطر، میرے کپڑے اُتارے، غسل دیا جیسا کہ پہلے وقتوں میں ہوتا تھا، میری شرم وغیرہ کو نظر انداز کیا اور مجھے شب خوابی کے لباس میں میز کے قریب بٹھا دیا۔ اس دوران ماتسیرات تلے ہوئے انڈے اور براؤن آلو میز پر لگا چکا تھا۔ میں نے اپنے کھانے کے ساتھ دودھ بھی پیا اور میرے کھانے پینے کے دوران سوال جواب شروع ہو گئے: ”تم کہاں چلے گئے تھے؟ ہم پاگلوں کی طرح تمھیں ڈھونڈتے رہے؛ ہمیں پولیس کے پاس بھی جانا پڑا، اور قسمیں کھانی پڑی تھیں کہ ہم نے تمھیں مار نہیں ڈالا ہے۔ اچھا ہوا کہ تم آگئے، اس کے لیے مالک کا بہت شکر ہے، مگر تم نے ہمیں خاصی مصیبت میں ڈال دیا تھا، اور ابھی مزید مصیبتیں آنے والی ہیں، اس لیے کہ اب تمھیں ان کے پاس لے جانا پڑے گا۔ میں صرف امید ہی کر سکتا ہوں کہ وہ تمھیں کسی ادارے میں داخل نہ کریں، کہ تم اسی کے حق دار ہو، کہ بغیر کہے سُنے تم اچانک غائب ہو گئے تھے۔“

ماریا ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ بہت پریشانی ہوئی تھی۔پبلک ہیلتھ کے محکمے سے ایک اہل کار آیا تھا اور تنہائی میں ماتسیرات سے باتیں کی تھیں، مگر ماتسیرات اتنی زور سے بولا تھا کہ اس کو پورے گھر میں سنا جا سکتا تھا:"اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔میں نے اپنی بیوی سے مرتے وقت وعدہ کیا تھا۔اس کا باپ میں ہوں، بورڈ آف ہیلتھ نہیں۔"

اس طرح مجھے کسی ادارے میں نہیں بھیجا گیا، مگر ہر دو ہفتے کے بعد ماتسیرات کے نام سرکاری خط آتا اور ماتسیرات سے دستخط کی درخواست کی جاتی؛ ماتسیرات دستخط سے انکار کر دیا کرتا تھا، مگر اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ جایا کرتی تھیں۔

آسکر بہتر ہوتا جا رہا تھا؛ اب اس کو ماتسیرات کے ابروؤں کی شکنیں دور کرنی ہوں گی، اس لیے کہ میری آمد پر وہ شگفتہ ہو گیا تھا؛ ماریا کے مقابلے میں وہ کم فکرمند تھا، سوالات بھی کم پوچھتے تھے، اور بس میری گھر واپسی سے خوش تھا۔سب کچھ ہونے کے باوجود، وہ مجھ سے اصل باپ کی طرح پیش آ رہا تھا۔"کرٹ کتنا خوش ہوگا، کہ اس کا چھوٹا سا بھائی واپس آ گیا ہے" ماتسیرات کہہ رہا تھا جب وہ مجھے حیران پریشان مدرژوزسکی کے فلیٹ میں سلانے کے لیے لے جا رہے تھے،"اور ذرا سوچو تو کہ کل کرٹ کی تیسری سالگرہ ہوگی۔"

سالگرہ کی میز پر میرے بیٹے کرٹ کے لیے تین موم بتیوں والا کیک رکھا ہوا تھا، ارغوانی رنگ کا گریچن شیفلر کا بنا ہوا ایک سوئٹر تھا، جس پر اس نے کوئی توجہ نہیں کی تھی، اور کئی دوسری چیزیں بھی تھیں۔بھیانک پیلے رنگ کا ایک بڑا سا گیند تھا، وہ جس پر بیٹھا، اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا، اور آخر میں آلو کاٹنے والے چاقو سے اس میں سوراخ کر دیا تھا۔ربڑ میں لگے زخم سے نکلنے والا میٹھا رقیق چوس رہا تھا جو ایسی ہوا بھری گیندوں کے اندر جمع ہو جایا کرتا ہے۔اور جب اس سے اُکتا گیا تو اس نے بادبانی کشتی کی توڑ پھوڑ شروع کر دی تھی۔ اس کا سیٹی بجانے والا اوپری سرا اور اس سے منسلک رسّی سالم رہ گئی تھی، مگر خوف ناک حد تک اس کے بہت قریب ہی پڑی ہوئی تھی۔

آسکر جو کافی دنوں سے سالگرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا، جس کو تاریخ کے سب سے بڑے پاگل پن کے درمیان شرکت کے لیے مشرق کی طرف جانا پڑ گیا تھا، اپنے

بیٹے اور وارث کی تیسری سالگرہ پر غائب نہیں رہنا چاہتا تھا۔۔۔ آسکر ایک طرف کھڑا اس ننھے کی تباہ کن کوششوں کو دیکھتے ہوئے، اس کی ہمت کی داد دیتے ہوئے، خود اپنے اجداد کا اپنے بیٹے سے موازنہ کر رہا تھا۔ مجھے حقائق کا سامنا تھا۔ جب تم گئے ہوئے تھے۔۔ میں حیرت میں ڈوبا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔۔۔ کُرٹ ایک سر سے کچھ زیادہ بڑھا ہے۔ یہ تو تمھارے اپنے تین فٹ بڑے سے بھی، جس پر تم نے اپنی تیسری سالگرہ سے تقریباً سترہ برس تک سے خود کو روک رکھا ہے، ایک انچ نکلتا ہوا ہے: اب وقت آگیا ہے کہ اس کو نقارہ نواز بنایا جائے اور اس کی نا واجب نشوونما کو روکا جائے۔

میں نے اپنے نقارے اپنے یک چلدی کتب خانے کے ساتھ دو چھتی میں کھپریلوں کے پیچھے رکھ دیے تھے۔ چوں کہ بالغ لوگ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کر رہے تھے، میں نے اپنے بیٹے کو ایک بالکل نیا آلہ دینے کا ویسا ہی موقع فراہم کرنا چاہا، جیسا کہ میری بے چاری ماں نے، جو قول کی پکی تھی، مجھے میری تیسری سالگرہ پر فراہم کیا تھا۔

میرے عہدِ شیر خواری ہی میں ماتسیرات نے مجھے اپنی دُکان کے لیے اپنا وارث منتخب کر لیا تھا۔ اب، جب کہ میں نے اس کو مایوس کردیا ہے، توقع کی جا سکتی ہے کہ اس کے ارادے اس وراثت کو کُرٹ کی جانب منتقل کرنے کے ہوں گے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا کہ اس کو ہر قیمت پر روکا جانا چاہیے۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ آپ آسکر کو خوردہ فروشی کا دشمن گرداننے لگیں۔ اگر میرے بیٹے کو کسی کارخانے کی، حتیٰ کہ نو آبادیات سمیت بادشاہی کی پیش کش بھی کی جائے تب بھی میرے وہی احساسات ہوں گے۔

آسکر نے کبھی اپنے لیے کوئی اُترن پسند نہیں کی ہے، نہ ہی وہ اپنے بیٹے کے لیے ایسا کچھ چاہے گا۔ آسکر اپنے بیٹے تین برس کے کُرٹ کو۔۔۔ اور یہیں میری منطق میں سقم ہو سکتا ہے۔۔۔ مستقل طور پر نقارہ نواز بنانا چاہتا تھا، گویا کسی نو وارد کے لیے ایک ٹین کا نقارہ سنبھالنا ویسا ہی ہے جیسے کہ کسی تیار شدہ مال والی کریانے کی دُکان میں قدم رکھنا۔

یہ تو آسکر کی موجودہ رائے ہے، مگر اس وقت اس پر ایک خواہش سوار تھی: کہ وہ نقارہ نواز بیٹے کو نقارہ نواز باپ کے برابر کھڑا دیکھے، اور دونوں کوتاہ نقارہ نواز بالغوں کی

دنیا کی کارگزاریوں کو دیکھ رہے ہوں؛ کہ نقارہ نوازوں کا ایک خاندان قائم کیا جائے جو اپنے آپ کو ہمیشہ باقی رکھ سکے اور میرے کام کو، ایک نسل کے بعد دوسری نسل تک آگے بڑھاتا رہے، جو میں نے سُرخ وسفید ٹین کے نقارے پر کیا ہے۔

کیا خوب زندگی ہے ہماری بھی! ہم نے کیا کیا نقارہ نوازی کی ہوتی۔ برابر برابر، مگر مختلف کمروں میں، برابر برابر مگر وہ 'لیبس وِیگ' میں اور میں 'لوئیزین اشتراسے' میں، وہ تہہ خانے میں تو میں دوچھتی پر، گرٹ باورچی خانے میں تو آسکر بیت الخلا میں، باپ بیٹے، یہاں وہاں، مگر اکثر یکجا؛ اور جب ہمیں موقع ملتا تو ہم دونوں، میری نانی اور اس کی پرانی نانا کواچکی کے لہنگوں تلے رہنے اور معمولی اُترے ہوئے مکھن کی بو میں سانس لینے کے لیے سرک جاتے۔ اور اُس کی ڈیوڑھی کے سامنے دستک دیتے، میں گرٹ سے کہتا، "دیکھو بیٹا اندر کی طرف دیکھو۔ یہی ہے وہ مقام ہم جہاں سے آئے ہیں اور اگر تم اچھے بچے ہوتے، تو ہم کو گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اندر جانے اور ان سے ملنے کی اجازت ہوتی جو ہمارے انتظار میں ہیں۔"

اور نیچے جھک کر ننھا گرٹ جھانک لیتا۔ اور ہمیشہ کی طرح شائستگی سے مجھ سے، اپنے والد سے، کچھ تشریحات کا طالب ہوتا۔

اور آسکر نے سرگوشی کی ہوتی، "وہ پیاری سی خاتون، جو اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے کھیل رہی ہے، وہ پیاری خاتون جس کا پیارا پیارا لمبوترا چہرہ میرے آنکھ میں آنسو لے آتا ہے، اور بلاشبہ تمھاری آنکھ میں بھی لے آئے گا، بے چاری میری مما ہے، یعنی تمھاری دادی، جو بام مچھلی کا شوربا پی پی کر مرگئی تھی یا اس باعث کہ شاید اس کا دل بہت نرم تھا۔"

"اور کچھ بتائیے پپا، اور کچھ بتائیے نا" ننھے گرٹ شکایتاً پوچھتا، "وہ مونچھوں والا شخص کون ہے؟" اور میں نے رازدارانہ انداز میں کم کی ہوئی آواز میں کہا ہوتا، "وہ جوزف کوواچکی ہے، تمھارا پرنانا۔ ذرا غور سے، اس کی چمکتی ہوئی آتش زن آنکھ کی جانب، اس کی خداداد پولش وحشت کی جانب اور اس کے ابدوؤں کی عملی کشوبیائی چالاکی پر نظر کرو۔ اگر ممکن ہو تو پیروں کی انگلیوں کے جال کو بھی دیکھو۔ 1913 میں، جب کولمبس ان آبی گزرگاہوں سے گزر رہا تھا، یہ شخص لکڑی سے بنے رافٹ کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ اس

کے بعد یہ بہت دور تک پیرتا ہوا گیا تھا؛ وہ پیرا، اور اس وقت تک پیرتا رہا جب تک کہ وہ امریکا پہنچ نہیں گیا، اور وہاں پہنچ کر روڑ پتی بن گیا تھا، مگر وہ اب بھی کبھی کبھی، پانی میں جاتا ہے، پیرتا ہوا واپس آتا ہے، اور یہاں وہاں غوطہ مارتا ہے، جہاں بھگوڑے آتش زن نے پہلے تو پناہ لی تھی اس کے بعد میری مما کے وجود میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔"

"مگر آپ اس خوب صورت مہذب آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہیں جو اس خاتون کے عقب میں چھپا ہوا تھا، اور اب اس کے پہلو میں بیٹھا اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے تھپتھپا رہا ہے؟ اس کی آنکھیں بھی آپ ہی کے جیسی نیلی ہیں، پاپا۔" پھر میں نے — ایک غیر فطری بیٹا، جیسا کہ میں ہوں — اپنی تمام ہمت جمع کی ہوتی اور اپنے پیارے بیٹے کو جواب دیتا: وہ خوابیدہ سی آنکھیں برانسکی کی ہیں جو تمھاری جانب دیکھ رہی ہیں، میرے بیٹے۔ یہ سچ ہے کہ تمھاری آنکھیں بھوری ہیں۔ یہ تم کو میری ماں سے ملی ہیں۔ اور، بالکل اسی 'جان' کی طرح جو بے چاری میری مما کے ہاتھوں کو بوسہ دے رہا ہے، یا ہمیشہ خواب دیکھنے والے کشوبیائیوں کی طرح، اس کا باپ وِنسنٹ بھی برانسکی ہے، اور تم بھی برانسکی ہی ہو۔ ایک دن ہم وہاں واپس جائیں گے، اور اس ماخذ کی طرف چلیں گے جہاں سے بلکے سے اترے ہوئے مکھن کی بو آتی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کا انتظار رہے گا۔"

ان دنوں مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا صحیح معنوں میں خاندانی زندگی صرف میری نانی کوواچکی کے اندروں میں ہی ممکن تھی، جس کو میں نانی کے مکھن کا ٹب کہنا پسند کروں گا۔ آج بہت سی چیزیں بدل گئی ہیں۔ میں چٹکی بجاتے ہی خود کو، اگر سبقت نہیں کر سکتا تو، آسمانی باپ نہیں تو، اس کے واحد پیدا شدہ فرزند، اور سب سے اہم، مقدس روح کے برابر کر سکتا ہوں۔ یسوع کی نقل کرنا میرا پیشہ بن چکا ہے، کہ میں اس کی مشق اسی کراہت سے کرتا ہوں جس طرح دوسرے پیشوں میں کرتا رہتا ہوں۔ پھر بھی، اگرچہ آج میرے لیے کوئی شے اتنی دور نہیں جتنا کہ نانی اماں میں داخلے کا دروازہ، یہ میرے اسلاف میں سے ہے جس کے ذریعے میں اپنے سب سے خوب صورت خاندانی مناظر دیکھ سکتا ہوں۔

میرے ذہن میں اس قسم کے تصورات صرف بارش کے دنوں میں ہی آتے ہیں:

میری نانی اماں دعوت نامے بھیجتی ہے اور ہم سب اس کے اندر جمع ہوتے ہیں۔جان برانسکی اپنے بدن میں گولیوں کے سوراخوں میں،پولش ڈاک خانے کا دفاع کرنے والی چھاتی کے سوراخوں میں گلنار لگائے ہوئے آتا ہے۔ڈرتے ڈرتے ماریا، جس کو میرے کہنے پر دعوت نامہ ملا ہے، میری مما کی طرف جاتی ہے؛ اس کی شفقت حاصل کرنے کی خاطر اس کو کھاتے دکھاتی ہے جو مما نے نہایت احتیاط سے تیار کیے تھے، اور ماریا نے بہت احتیاط سے رکھے ہیں؛ اور مما اپنے کشوبائی قہقہے کے ساتھ، میری معشوق کو گلے لگاتی ہے، رُخسار پر پیار کرتی ہے، اور تاروں کی طرح چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہتی ہے: ''کیوں؟ بیٹی، اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں! کیا ہم دونوں نے ایک ماتسیرات سے شادی نہیں کی ہے اور ایک برانسکی کو دودھ نہیں پلایا ہے؟''

مجھے اپنے آپ کو اور ان خطوط پر اپنے مزید تصورات کو، اور اس قسم کی سوچ کو سختی سے روکنا ہوگا؛ مثال کے طور پر، ایک بیٹے کے بارے میں سوچنا، جان نے جس کا نطفہ رکھا ہو، مما نے جس کو نانی اماں کو واچکی کے سپرد کر دیا ہو، اور بالآخر وہ مکھن کے ٹب میں پیدا ہوا ہو۔ایسے خیالات لابدی ہمیں بہت دور تک لے جائیں گے۔کیا میرا نصف برادر اسٹیفن ، جو بہر حال ہم میں سے ہے، میری ماریا پر بھوکی نظر نہیں ڈالے گا، اور اس کے بعد مالک نہ جانے کیا کچھ ہوگا؟ میرا تصور چاہتا ہے کہ اس کو معصومانہ خاندانی اجتماع تک ہی محدود رکھا جائے۔تیسرے اور چوتھے نقارہ نواز سے دست برداری کرتے ہوئے، میں آسکر اور ننھے کُرٹ پر اکتفا کرتا ہوں۔ اپنے سامعین کی خاطر، میں آئیفل ٹاور کے بارے میں کچھ نقارہ نوازی کیے لیتا ہوں جو ایک اجنبی سرزمین پر میری نانی اماں کا نعم البدل بن گیا تھا۔ میں بہت مطمئن ہوں گا اگر سارے مہمان اور ہماری میزبان اِنّا کوواچکی، ہماری نقارہ نوازی سے لطف لیتی ہے اور سب مل کر نقارے کی تال پر ایک دوسرے کے گھٹنوں پر تالیاں بجاتے ہیں۔

دنیا کو اور اس کے رشتوں کو، میری اپنی نانی اماں کے اندر، ایک مخصوص حد میں آشکار ہوتا دیکھنا مسرت بخش ہو سکتا ہے، مگر آسکر کو اب ، جب کہ ماتسیرات کی طرح وہ بھی ایک قیاسی باپ ہے، 12 جون 1944 کے واقعات ،یعنی ، کُرٹ کی تیسری سالگرہ کی

طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

مگر رابچے کو ایک سویٹر، ایک گیند، ایک بادبانی کشتی، اور ایک سیٹی اور ایک رسّی جو اس کے ساتھ ہوتی ہے، دی گئی ہے۔ اس کو ایک نقارہ، جس پر سرخ اور سفید پالش کی گئی تھی، دیا گیا تھا۔ جب وہ بادبانی کشتی کی توڑ پھوڑ کر چکا تھا تو آسکر آگے بڑھا تھا جس نے، نیا تحفہ یعنی ایک نقارہ اپنی پشت پر چھپا رکھا تھا اور پرانا ٹوٹا پھوٹا نقارہ اس کے پیٹ کے نیچے تک لٹک رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہوئے تھے، صرف ایک قدم دور: میں للی پٹ جیسا بونا؛ اور کرٹ بھی للی پٹ جیسا چھوٹا مگر ایک انچ نکلتا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر غصہ تھا، اس لیے کہ وہ ابھی تک بادبانی کشتی کی توڑ پھوڑ میں مصروف تھا۔ جوں ہی میں نے نقارہ پیش کیا اور اس کو اوپر اٹھا لیا، اس نے 'پامیر' کے — جو ہوا روکنے والی شے کا نام تھا — بچ رہنے والے آخری مستول کو بھی توڑ ڈالا تھا۔ کرٹ نے اس کباڑ کو ایک طرف پھینکا، نقارہ لیا، اور اس کو اُلٹ دیا۔ اب اس کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہو گیا تھا، مگر اس کے چہرے کا تناؤ باقی تھا۔ اب چوبِ نقارہ دینے کا وقت تھا۔ بدقسمتی سے وہ میری دہری حرکات کو غلط سمجھا، خود کو خطرے میں محسوس کیا، اور اس نے نقارے کے کنارے کی مدد سے لکڑیوں کو زمین پر گرا دیا۔ میں ان کو اٹھانے بڑھا تو وہ ذرا پیچھے ہوا۔ میں نے ایک بار پھر لکڑیاں دینا چاہیں، جس پر اس نے سالگرہ کا ایک تحفہ اٹھا کر مجھ پر دے مارا۔ وہ اوپری، سیٹی بجانے والا ہرا نہیں تھا، آسکر تھا، اس کا باپ، جس پر اس نے حملہ کیا تھا۔ اپنے باپ کو چکرانے اور سیٹی بجانے کا سبق سکھانے پر تُلا، اس نے مجھ کو کوڑا لگایا، یہ سوچتے ہوئے کہ چھٹکے بھیا، ذرا ٹھہر نا تو! کیا قابیل ہابیل کو اس وقت تک کوڑے مارتا رہا تھا جب تک کہ ہابیل چکرانے، لڑکھڑانے اور زیادہ چوکس طریقے سے، پہلے دھیمی اور نا موافق شکایت کے انداز میں، پھر اونچی اور زیادہ مستحکم آواز میں گانے نہیں لگا تھا۔ اور اس قابیل نے اپنے کوڑے کی مدد سے مجھے بھی گانے پر مجبور کر دیا: میں اس طرح گانے لگا جیسے کوئی اونچے سُر میں اپنی صبح کی دعائیں گانے لگے، جیسے چاندی سے بنے فرشتے گانے لگیں، جیسے ویانا کا ساگر کنائین گانے لگے، جیسے ہیجڑوں کا طائفہ گانے لگے۔ جس طرح ہابیل نے ڈھیر ہونے سے پہلے گایا ہوگا، اسی طرح میں بھی اپنے بیٹے کرٹ

کے کوڑے کے باعث گلنے کے بعد ڈھیر ہو گیا تھا۔

جب اس نے مجھے گرا ہوا ایک خستہ سرے کی مانند کراہتا ہوا دیکھا تو ہوا میں کوڑا چلانے لگا تھا، گویا اس کے ہاتھ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔اس نے کافی دیر تک نقارے کا معائنہ کیا، ساتھ ہی مجھ پر تجسس کی نگاہ رکھی۔ پہلے تو اس نے کرسی کے کنارے کی مدد سے پالش اُکھاڑی، پھر اس نے میرے تختے کو فرش پر پھینک دیا اور سابق بادبانی کشتی کے بقیہ خول سے نقارے پر وار کرنا شروع کیا۔ مگر جو آوازیں نکل رہی تھیں وہ نقارہ نوازی کی آوازیں نہیں تھیں۔ ان میں تو محض بنیادی تال بھی نہیں تھی ۔دیوانگی جیسی کیفیت میں وہ ایک آلے کو اس طرح پیٹے جا رہا تھا جس کی کسی باقاعدہ نقارہ نواز سے بھی توقع نہیں تھی؛ شاید وہ ایک ہلکی تفریحی کوشش تھی،ایک کھلنڈری اُپج تھی، بڑی توڑ پھوڑ نہیں۔ نقارہ بچک گیا؛ اس نے اپنے خول سے فرار کرنے کی کوشش کی، سرخ و سفید پالش جھاڑ کر اپنی شناخت چھپانے کی کوشش کی۔ آخر میں وہ صرف ایک بد رنگ ٹین کا ڈبا رہ گیا تھا جو رحم کی درخواست کر رہا تھا، مگر باپ کے سالگرہ کے تختے پر بیٹے کو بالکل ترس نہیں آیا اور جب باپ نے ایک بار پھر، قالین کو پھلانگ کر، درد اور تکلیف کے باوجود، بیٹے تک پہنچنے کی کوشش کی تو بیٹے نے پھر چابک سنبھال لی تھی۔اور ٹوٹی پھوٹی کشتی کے اوپری سرے نے پکار کر کہا، چچا میاں، اور چکرانا، رونا یا سیٹی بجانا بند کر دیا، تو نقارے کی، اور چوب نقارہ کی کسی ایسے حساس نقارہ نواز کے ہاتھ آنے کی تمام امیدیں ختم ہو گئی تھیں جو چوب نقارہ کو بے رحمی سے نہیں، اختیار سے استعمال کرے گا۔

جب ماریا کمرے میں داخل ہوئی تو نقارہ کباڑ کے ڈھیر پر جانے کے لیے تیار تھا۔اس نے مجھے اپنے بازو میں بھر لیا، میری سوجی ہوئی آنکھوں کو، زخموں کو پیار کیا، اور میرے ہاتھوں پر لگے خون اور جلد کی لٹکی ہوئی جھالر کو اپنی زبان سے صاف کیا۔

اُف، کاش ماریا نے بد سلوکی کا نشانہ بننے والے، پس ماندہ، قابلِ رحم، معذور بچے کو پیار نہ کیا ہوتا۔کاش اس نا ہنجار نے پیٹے گئے باپ کے ہر زخم میں چھپے عاشق کو پہچانا ہوتا۔یہ کس قدر تسکین بخش عمل ہوتا، اور آنے والے سیاہ مہینوں میں وہ کتنا با وفا خفیہ شوہر ہوتا!

پہلا صدمہ — اگر چہ ماریا پر کوئی خاص اثر کا باعث نہیں تھا — میرے نصف برادر اسٹیفن برانسکی، یا اہلر کی بحرِ منجمد شمالی کے محاذ پر موت تھا، جس نے اس وقت تک اپنے سوتیلے باپ کا خاندانی نام اختیار کر لیا تھا۔ ابھی اس کی لیفٹیننٹ کے عہدے پر ترقی ہوئی تھی کہ اس کا کیریئر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ اپنے والد، جان کے برخلاف جسے 'ساپیے' کے قبرستان میں پولش پوسٹ آفس کے دفاع کے جرم میں گولی مار دی گئی تھی، سزا دیے جانے کے وقت اپنے قمیص کے اندر ایک skat کارڈ چھپا رکھا تھا، لیفٹیننٹ کو اس کے Iron Cross Second Class، Infantry Badge اور نام نہاد Cold Storage Medal سمیت دفن کیا گیا تھا۔

جون کے ختم ہونے پر، مدر ٹرونسکی کو ہلکا سا فالج کا حملہ ہوا جب ڈاکیا اس کے لیے بُری خبر لایا تھا۔ سارجنٹ ٹرونسکی کا زوال تین چیزوں کے باعث ہوا تھا: Führer, Folk, اور Fatherland ۔ اور مرکزی سیکٹر میں ہوا تھا، اور سارجنٹ فرٹز کی ملکیت — اس کا بٹوہ جس میں 'ہائیڈل برگ'، 'بریسٹ'، 'پیرس'، 'بادکروزناخ' اور 'سالونیکی' میں اتاری گئی خوب صورت لڑکیوں کی تصاویر تھیں جن میں بیش تر مسکرا رہی تھیں، Iron Cross First اور Second Class، مختلف قسم کے زخموں پر دیے جانے والے تمغے، bronze close-combat clasp، کے دو عدد two antitank patches اور کچھ خطوط — کیپٹن کناور کے ہاتوں ایئر ہیڈ کوارٹر سے ڈلیس وگ، لانگ فوز بھیج دیے گئے تھے۔

ماتسیرات نے جتنی ممکن ہوئی مدد کی اور جلد ہی مدر ٹرونسکی بہتر محسوس کرنے لگی، حالاں کہ وہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہو سکی تھی۔ سارا سارا دن کھڑکی کے پاس کرسی رکھے بیٹھی رہتی اور مجھ سے اور ماتسیرات سے، جو دن میں دو تین بار کھانے پینے کی چیزیں لے کر اس کے پاس آیا کرتے تھے یہی سوال کرتی کہ ''مرکزی سیکٹر'' کہاں واقع ہے، اور یہ بھی کہ کیا وہاں اتوار کے دن ریل گاڑی کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ اپنے تمام تر نیک ارادوں کے ساتھ ماتسیرات اسے کچھ بتا نہیں سکتا تھا، مگر آسکر نے خاص خاص خبروں اور وہیرماخت اعلانات کے ذریعے جغرافیہ سیکھ لی تھی۔ میں نے اپنے نقارے کے

ذریعے، مرکزی سیکٹر اور اس کے اطراف کی فوری حرکات کے بارے میں، جہاں تک ممکن ہوا، مدرٹروڈ منسکی کو بتانے میں کئی طویل دوپہریں صرف کی تھیں۔

ماریا اپنے وجیہ بھائی سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس کی موت نے ماریا کو مذہبی بنا دیا تھا۔ جولائی کا پورا مہینہ اس نے مذہب پر صرف کر دیا، جس میں وہ پلی بڑھی تھی؛ ہر اتوار کو وہ کرائسٹ چرچ میں مبلغ ہیخت کے درس میں جاتی؛ ایک یا دو بار ماتسیرات بھی اس کے ساتھ جاتا، حالاں کہ وہ تنہا جانا پسند کرتی تھی۔

پروٹسٹنٹ گرجا کے اجتماعات ماریا کو مطمئن نہیں کر سکے۔ ہفتے میں ایک دن، جمعرات یا شاید جمعے کو ماریا دکان ماتسیرات کے حوالے کر دیتی، مجھ کھٹملک کا ہاتھ تھامتی اور گھر سے چل پڑتی تھی۔ نیو مارکٹ کی طرف سے چلنا شروع کرتے، ہم ایلین اشتراسے' میں مڑتے، اس کے بعد میریئن اشتراسے' لیتے اور 'وول گیمبھ' گوشت فروش کی دکان سے گزر کر 'کلائن ہامر' پارک سے ہو کر 'لانگ فورز' اسٹیشن جاتے۔ آسکر سمجھتا کہ ہم کشوبیا کے علاقے 'بِساؤ' جانے والے ہیں، مگر پھر ہم بائیں جانب مڑ جاتے، وہمی انداز میں ٹرننگ کے قریب رک کر مال گاڑی کے گزر جانے کا انتظار کرتے، اور پھر جگہ جگہ سے اُبلتی، ٹپکتی ٹرننگ کے ذریعے چل پڑتے۔ اس کی دوسری جانب، بجائے اس کے کہ سیدھے سنیما گھر کی طرف جاتے، ہم دریا کے پشتے کے ساتھ ساتھ بائیں جانب مڑ جاتے۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ مجھے 'برن شوٹر ویگ' میں ڈاکٹر ہولاتز کے پاس گھسیٹے لے جانا چاہتی ہے، یا وہ اپنا مذہب تبدیل کرنے سیکریڈ ہارٹ گرجا گھر جانا چاہتی ہے۔

ریل کی پٹڑی گرجا گھر کے دروازے کے بالکل سامنے تھی۔ دریا کے پشتے اور کھلے دروازے کے درمیان ہم ساکت کھڑے ہو گئے۔ وہ اگست کے آخری دنوں کی چہل پہل والی دوپہر تھی۔ ہمارے عقب میں کچھ یوکرائن کی عورتیں سر پر سفید رومال باندھے بحری جہازوں کے پھینکے ہوئے سامان میں سے کچھ چن رہی تھیں۔ ہم گرجا گھر کی ٹھنڈی سایہ دار دیوار کے قریب کھڑے تھے۔ دور فاصلے پر، خوش سلیقگی سے لبھانے والی، تیز اور روشن آنکھ جیسی ایک ہمیشہ روشن رہنے والی روشنی تھی۔ ہمارے عقب میں دریائی پشتے پر

یوکرائن کی عورتوں نے چیتا اُٹھانا بند کر دیا تھا۔ سیٹی بجی: ریل آنے والی تھی: ریل آگئی، بہت قریب آگئی: ابھی گزری نہیں: چلی گئی: ریل کا ناقوس بجا، اور یوکرائن کی عورتوں نے اپنا کام پھر شروع کر دیا۔ ماریا تذبذب میں تھی، شاید ایک غیر یقینی کیفیت میں کہ، کون سا پاؤں آگے بڑھائے: اور پھر اس نے ساری ذمے داری مجھ پر ڈال دی، جو پیدائش اور مجسمے کے لحاظ سے اس گرجا سے قریب تر تھا: اس لیے کہ برسوں میں پہلی بار، فرو پاؤڈر اور محبت کے دو ہفتوں کے بعد پہلی بار، اس نے خود کو آسکر کی رہنمائی پر چھوڑ دیا تھا۔

ہم نے دریائی پشتے کو، اس کی آوازوں کو اور اگست اور اس کی چہل پہل کو باہر چھوڑ دیا۔ میں غم انگیزی کے عالم میں، اپنی انگلیوں کو اپنے اندرونی لباس کے اندر رفتار سے کھیلنے کے لیے چھوڑتے ہوئے، ان اجتماعات کو، پاپائے اعظم کے سرکاری اجتماعات کو یاد کرنے لگا تھا۔ شام کی مناجاتوں اور سنیچر کے اعترافات کا اچھا خاصا تجربہ مجھے اپنی ماں کے پہلو میں رہ کر ہو گیا تھا، جس کو مرنے سے کچھ دن قبل ہی، جان سے اس کے رشتے کی شدت کے اعترافات کے باعث دین دار بنا دیا گیا تھا، جو سنیچر بعد سنیچر، اعترافات کے ذریعے اپنا بوجھ اتار دیا کرتی تھی، اور اتوار کو عشائے ربانی کی ہمت افزائی سے لیس، آنے والی جمعرات کو جان سے ملنے ٹشلر گراسے جایا کرتی تھی۔ ان دنوں پادری کون تھا؟ اس کا نام وہی تھا جو اَب ہے، اس لیے کہ وہ اب بھی سیکریڈ ہارٹ کا پادری ہے، یعنی، فادر وینکے: اس کے خطبے خوش گوار حد تک نرم خو اور ادراک سے بالاتر ہوتے تھے، اس کا عقائد پر مبنی مناجات گانے کا انداز اتنا پتلا اور غم انگیز ہوتا تھا کہ مجھ جیسے شخص پر بھی ان دنوں عقیدے سے مشابہ کسی بھی شے کا غلبہ ہو جاتا، اگر اس بائیں شہ نشین والی کنواری، لڑکے یسوع اور لڑکے جان دی بپٹسٹ سے میری قربت نہ ہوتی۔

پھر بھی وہ شہ نشین ہی تھی، جس نے مجھ کو ماریا کو دھوپ سے دروازے کی راہداری میں، اور اس کے بعد فرشی پتھروں سے گرجا گھر کے وسط میں گھسیٹ لانے پر مجبور کیا تھا۔

آسکر نے کچھ وقت لیا، صنوبر کی بنچ پر ماریا کے پہلو میں خاموشی سے بیٹھ گیا اور زیادہ پُر سکون محسوس کرنے لگا۔ کئی برس گزر گئے تھے، پھر بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا

وہی لوگ ابھی تک ان ہی دعاؤں کی کتاب کی ورق گردانی کر رہے ہیں اور فادر ویکلے کے کان کے انتظار کے دوران اپنے اعترافات کی حکمتِ عملی تیار کر رہے ہیں۔ہم شہ نشین کے مرکز سے ذرا ہٹ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ماریا اپنا فیصلہ خود کرے، مگر فیصلہ اس کے لیے آسان بھی ہو۔ایک جانب تو اعتراف گاہ اتنی قریب نہ ہو کہ وہ پریشان ہو جائے تا کہ اس کی تبدیلیِ مذہب آرام سے ہو سکے، جو ظاہر ہے کہ غیر سرکاری ہوتی تھی؛ دوسری جانب، وہ دیکھ سکتی تھی کہ اعتراف کی تیاری میں لوگ کس طرح پیش آتے ہیں، اور یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے وہ اپنے ذہن کو آمادہ کر سکتی تھی۔اس کو اعتراف گاہ میں فادر ویکلے سے اپنی تبدیلیِ مذہب اور عقیدے کے تحفظ کے بارے میں مشورہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں رہ گئی تھی۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا؛ وہ اتنی چھوٹی اور اتنی ناموزوں لگ رہی تھی، جب وہ کیتھلک مذہب کی آزردہ مٹھاس کے لیے خاک، خوش بو، پلاسٹر، پیچیدہ قماش فرشتوں، منعکس روشنی، اکھڑ صوفیوں کے درمیان گھٹنوں کے بل جھک رہی تھی۔

آسکر نے ماریا کو کبھی مار کر صحیح راستہ دکھایا۔وہ سیکھنا چاہتی تھی۔آسکر نے اس کو دکھایا، کہاں اس کے عقب میں، کہاں اس کی دل کی گہرائی میں، کہاں اس کے کاندھوں کے جوڑوں میں، باپ، بیٹا اور مقدس روحوں کے رہنے کی جگہ کہاں ہوتی ہے، اور اگر تم اپنی آمین کی قبولیت چاہتی ہو تو کس طرح تمھیں اپنے ہاتھ باندھنے چاہییں۔ ماریا نے پوری طرح فرماں برداری کی، اس کے ہاتھ آمین کے دوران اپنی جگہ پر آ گئے اور اس نے دُعا کرنی شروع کر دی تھی۔

پہلے تو آسکر نے بھی کچھ مرے ہوئے لوگوں کے لیے دعائیں کرنے کی کوشش کی، مگر اپنے آقا سے روزویدا کے لیے امن کی، مغفرت کی دعا اور جنت کی خوشیاں طلب کرنے کے دوران وہ دنیاوی تفصیلات میں ایسا پھنس گیا تھا کہ آخر میں امن اور جنت کی خوشیاں پیرس کے ایک ہوٹل میں جا بسیں۔لہٰذا میں نے تمہید میں پناہ لی، اس لیے کہ اس میں آپ کو خاموش کرنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا؛ اور ابدی سکون کے لیے میں نے کہا sursum corda, dignum et justum کہ یہی منصفانہ ہے، اور یہی ٹھیک ہے۔تب میں نے ماریا کو بھی اکیلا چھوڑ دیا اور ذرا دور جا کر ایک پہلو سے اُسے دیکھنے لگا تھا۔

ماریا کو کیتھلک دعا کا سلیقہ آ گیا تھا۔ اپنی عبادتوں میں وہ بالکل تصویر جیسی خوب صورت لگتی تھی۔ عبادت پلکوں کو دراز کر دیتی ہے، ابروؤں کو بلند کر دیتی ہے، رخسار اُبھار دیتی ہے، پیشانی کو بُردبار کر دیتی ہے، گردن کو لچک دیتی ہے اور نتھنوں میں لرزہ پیدا کر دیتی ہے۔ ماریا کے، افسردگی میں گھل اٹھنے والے خد و خال نے تقریباً مجھے اس کے اظہارِ محبت میں گرفتار کر دیا تھا۔ مگر کسی کو کسی کی دعا میں خلل انداز نہیں ہونا چاہیے، نہ ایسے وقت میں کسی کو اپنی جانب راغب کرنا چاہیے نہ کسی کی طرف راغب ہونا چاہیے، باوجودے کہ جو دعا کی طرف مائل ہوتے ہیں ان کو یہ جان کر اچھا لگتا ہے، کہ کوئی ان کو دیکھنے کے قابل سمجھتا ہے۔ آسکر اس چکنی بنچ سے سرک کر ماریا کے پاس سے فرار ہو گیا۔ میرے ہاتھ، میرے لبادے کے نیچے اب بھی خاموشی سے نقارے کے اوپر بندھے ہوئے تھے، اور ہم، یعنی میرا نقارہ اور میں، فرشی پتھروں سے نکل گئے، صلیب کے مقامات سے گزرتے، گرجا گھر کے بائیں جانب کے مرکزی حصے سے باہر نکل گئے؛ ہم سینٹ انتھونی کے پاس نہیں ٹھہرے — ہمارے لیے دعا کرو، اس لیے کہ نہ ہمارے بٹوے کھوئے تھے نہ گھر کی کنجی کھوئی تھی، نہ ہم پراگ کے سینٹ ایڈال برٹ کے پاس رُکے تھے، جس کو مشرک پروشیائیوں نے مار ڈالا تھا۔ ہم اس وقت تک کہیں نہیں رُکے جب تک کہ، ایک پتھر سے دوسرے پتھر شطرنجی فرش پھلانگتے قالین لگی سیڑھیوں پر پہنچ نہیں گئے تھے جو بائیں شہ نشین کی طرف لے جاتی تھیں۔

آپ کو میرے الفاظ پر یقین نہیں آئے گا اگر میں کہوں کہ Neo-Gothic اینٹوں سے بنے سیکریڈ ہارٹ گرجا گھر میں، یا بائیں شہ نشین کی ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لڑکا یسوع اب بھی، گلابی رنگ اور برہنہ حالت میں کنواری مریم کے گلابی زانو پر بیٹھا ہوا تھا — مجھے اس خوف سے اس کو کنواری مریم نہیں کہنا چاہیے کہ کہیں اس میں اور میری مَیری، یعنی میری ماریا، میں مغالطہ نہ ہو جائے، جو اس وقت مذہب کی تبدیلی میں منہمک تھی۔ نوجوان جان دی بپٹسٹ، اُسی روئیں والی چاکلیٹی رنگ کی بکری کی کھال میں ملبوس، اب بھی کنواری کے دائیں گھٹنے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور کنواری اپنے بائیں ہاتھ کی پہلی

انگلی سے اشارہ یسوع کی طرف کر رہی تھی، مگر دیکھ جان کی طرف رہی تھی۔

کئی برسوں کی غیر حاضری کے بعد بھی، آسکر کو، دونوں لڑکوں کے خد وخال کے مقابلے میں، کنواری کے ماورانہ تفاخر میں کم دل چسپی تھی۔لڑکا یسوع تقریباً میرے بیٹے کرٹ کی تیسری سالگرہ کے وقت کے قد برابر تھا، یعنی آسکر سے ایک انچ بڑا۔جان، دستاویزات کے مطابق نصرانی [یعنی یسوع] سے بڑا، اور میرے قد کا تھا،مگر دونوں میرے جیسے زود بالغ لگتے تھے،یعنی ابدی سہ سالہ عمر کے۔کچھ بھی بدلا نہیں تھا۔ان کے چہروں پر وہی برسوں پہلے والا شرارتی تاثر قائم تھا، اُن دنوں کا، جب میں اپنی بے چاری مما کے ساتھ سیکریڈ ہارٹ چرچ آیا کرتا تھا۔

قالین لگی سیڑھیوں پر چڑھتے، ابتدائیہ (بسم اللہ) ادا کیے بغیر، میں پردوں کی ہر شکن کو دیکھ رہا تھا؛ آہستہ اور احتیاط سے میں نے ان دو برہنہ جسموں کے پلاسٹر سے بنے اور پینٹ کیے ہوئے بیرون کو اپنے نقارے کی چوب سے چھوا، جس عمل میں مجھے اپنی تمام انگلیوں کو ملا کر چھونے سے بھی زیادہ احساس ہوا تھا؛ کسی بھی شے کو نظر انداز نہ کرتے ہوئے ،میں نے زانوؤں، پیٹوں، بازوؤں اور ایک ایک تِل کو بھی دیکھا۔یسوع بالکل آسکر کی تصویر تھا، میرا جیسا صحت مند گوشت، میرے جیسے مضبوط بھرے بھرے گھٹنے، میرے جیسے مختصر مگر مضبوط نقارہ نواز بازو۔اور اس کا انداز بھی بالکل نقارہ نوازوں جیسا تھا۔وہ کنواری کے زانو پر بیٹھا تھا، بازو اور مٹھیاں اوپر اُٹھی ہوئیں، اس طرح جیسے وہ نقارہ نوازی کا منصوبہ بنا رہا ہو، گویا آسکر نہیں یسوع ہی نقارہ نواز ہے، گویا بس وہ میرے نقارے کے انتظار میں ہے، گویا اس بار سنجیدگی سے وہ کنواری کے، جان کے اور میرے لیے نقارے پر کوئی دُھن مہر کرنے والا ہو۔میں نے وہی کیا جو میں برسوں پہلے کر چکا تھا؛ میں نے اپنے پیٹ کے اوپر سے نقارہ اُتارا اور یسوع کا امتحان لیا۔نہایت احتیاط سے کہ مبادا پینٹ کیے ہوئے پلاسٹر کو نقصان نہ پہنچ جائے، میں نے آسکر کے سُرخ وسفید نقارے کو اس کے گلابی زانوؤں پر رکھ دیا، مگر اس بار ایک نوع کا کینہ مجھے اُکسا رہا تھا، میں معجزوں کے احمقانہ عقیدے کھو چکا تھا، میں بس اس کا پول کھول دینا چاہتا تھا۔حالاں کہ وہ مٹھیاں اٹھائے

ہوئے تھا، حالاں کہ اس کا جسم میرے جسم جیسا سخت کوش تھا، حالاں کہ وہ میرے جیسے سہ سالہ کی پلاسٹر سے بنی، ہو بہ ہو، نقل تھا مگر وہ نقارہ نوازی نہیں کر سکتا تھا، بلکہ اس کو تو نقارہ نوازی کی ہوا تک نہیں لگی تھی۔شاید وہ سوچ رہا تھا: کاش میرے پاس بھی نقارہ ہوتا تو میں بھی نقاری نوازی کر سکتا۔۔۔ہاہا۔۔۔میں نے کہا کہ اب تو تمھارے پاس نقارہ ہے، تو اب کیا ارادے ہیں تمھارے؟ قہقہے میں لرزتے ہوئے، میں نے دونوں چھڑیوں سے اس کی ساسیج جیسی دسوں انگلیوں کو چھوتے ہوئے کہا، میرے پیارے پلاسٹر کے یسوع، نقارہ نوازی شروع کرو! آسکر تین قدم پیچھے ہٹا، تین سیڑھیاں اترا؛ قالین کو پتھروں کے فرش کے لیے چھوڑا اور یسوع سے نقارہ نوازی کے لیے کہا۔آسکر نے دور ہونے کے لیے پیچھے کی طرف بڑا سا قدم اٹھایا۔آسکر نے قہقہہ لگانا شروع کیا کہ یسوع تو صرف بیٹھا رہ سکتا ہے، نقارہ نہیں بجا سکتا، حالاں کہ ہوسکتا ہے کہ وہ بجانا چاہتا ہو۔اُکتاہٹ دانت نکالے میری طرف بڑھی، بالکل اس طرح جیسے کوئی موش بیکن کے ٹکڑے کی طرف دانت نکالے بڑھتا ہے۔۔۔تف ہے مجھ پر اگر وہ نقارہ بجانا شروع نہیں کر دیتا!

ہمارے اطراف کچھ بھی نہیں ہوا، اس نے اپنی داہنی لکڑی سے شروع کیا تھا، پھر بائیں سے ایک دو ضربیں لگائیں، پھر دونوں سے ایک ساتھ۔شکر ہے کہ اپنی لکڑی پر لکڑی نہیں ماری، کہ وہ تجربہ بُرا نہیں تھا۔وہ بہت پُر امید تھا اور اس کا کھیل خاصا رنگ برنگ تھا۔اس نے کچھ پیچیدہ کام بھی کیے تھے مگر اس کی سادہ اور عام تال بھی اتنی ہی کامیاب تھی۔اس کے فن کے انداز میں کوئی فریب نہیں تھا۔اس نے شعبدے بازی سے پرہیز کیا اور صرف نقارہ نوازی کی تھی۔اس کا انداز مذہبی بھی نہیں تھا، نہ اس میں کوئی فوجی ناشائستگی تھی۔ وہ سرتاپا موسیقار تھا، مگر اس میں کوئی کر وفر نہیں تھا۔اُسے اپنی کامیابیوں کا علم تھا۔اس نے "Everything Passes" بجایا، جس کے ساتھ سب گانے لگے تھے اور بلاشبہ ".Lili Marlene" بھی بجایا تھا۔پھر آہستہ آہستہ، ذرا سے جھٹکے کے ساتھ، اس نے اپنی نیلی برنسکی آنکھوں اور گھنگھریالے سر کو میری جانب موڑا، مسکرایا؛ مگر مجھے ایسا لگا گویا وہ تکبر کر رہا ہو؛ اور پھر موسیقی کی پاٹ پوری میں آسکر کی پسندیدہ دھن ترتیب دیتے

چلا گیا۔ اس کی ابتدا "توڑ دو کھڑکی کا شیشہ توڑ دو" سے ہوئی تھی، اور ایک مشورہ "نظام الاوقات" کا بھی تھا: بالکل میری طرح، اس شریر نے راسپوتین کو گوئٹے سے لڑا دیا: میرے ساتھ 'اِسٹاک ٹرم' پر چڑھا: میرے ساتھ روسزم کے نیچے گھسا: 'ٹم یک وانز' میں بام مچھلی پکڑی: بائیں جانب سے، میری مما کے مخروطی تابوت کے ساتھ میرے پیچھے پیچھے چلا، اور جس چیز نے مجھے زیادہ بدحواس کیا تھا وہ یہ تھی کہ اس نے میری نانی اماں کے چاروں لہنگوں کے نیچے بار بار پناہ لی تھی۔

آسکر قریب آ گیا۔ کوئی شے تھی جو اس کو آگے لائی تھی۔ وہ قالین پر ہونا چاہتا تھا، پتھروں پر میں مزید کھڑا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک کے بعد دوسرے زینے پر قدم رکھتا چلا۔ میں اوپر چڑھا حالاں کہ مجھے نیچے اُترنا چاہیے تھا۔ "یسوعؑ" میں نے باقی ماندہ آواز کو مجتمع کر کے جو مجھ میں باقی رہ گئی تھی کہا، "وہ ہمارے لیے سستا سودا نہیں تھا۔ فوراً میرا نقارہ واپس کرو۔" اس نے نقارہ بجانا بند کر دیا، مگر کسی تأمل کے بغیر نہایت آہستگی سے نقارے پر چوب کو صلیب کی صورت رکھ دیا اور ایک لفظ کہے بغیر آسکر کو نقارہ واپس کر دیا، جو اس نے بلا سوچے سمجھے اس کو دے دیا تھا۔

میں شکریہ ادا کیے بغیر تیزی سے سیڑھی اترنے ہی والا تھا، تا کہ جہاں تک میرے پاؤں مجھے سہارا فراہم کر سکیں میں کیتھلک مذہب سے دور بھاگ جاؤں، کہ ایک خوش گوار آواز نے مجھے متوجہ کرتے ہوئے ہوئے پوچھا، "آسکر کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟" میں نے واپس مڑے بغیر جواب دیا "نہیں تو۔" جس پر اس نے، اپنی آواز بلند کیے بغیر پھر کہا، "آسکر کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟" اس بار میرا جواب قدرے درشت تھا، "معاف کرنا بڑے میاں— ہرگز نہیں۔" تیسری بار اس نے مجھ کو جھنجھلا دینے والی آواز میں کہا، "آسکر کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟" میں پلٹا اور اس کے چہرے پر نظریں جما کر میں نے کہا، "نہیں، ہرگز نہیں۔"

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بجائے اس کو زیر کر دینے کے میرا جواب اس کے لیے فتح بن گیا۔ کسی اُستانی کی طرح، اپنی انگشتِ شہادت اُٹھاتے ہوئے اس نے مجھے

ایک ذمے داری سونپ دی، ''تم ہو آسکر، پتھر، اور اسی پتھر پر مجھے اپنا گرجا گھر بنانا ہے۔ بس ا میرے پیچھے پیچھے آؤ!'' آپ میرے غصے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ طیش کے باعث میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ میں نے اس کی پلاسٹر سے بنی پاؤں کی انگلی توڑ ڈالی پھر بھی وہ ہلا نہیں۔ ''اگر، پھر کچھ کہا تو......'' آسکر نے کہا، ''میں تیرا پینٹ بھی کھرچ ڈالوں گا۔''

جواب میں اس سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا؛ اس نے بائیں جانب کی شہ نشین پر نظر ڈالی مگر مجھ کو دیکھ نہیں سکا تھا، اور پھر وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ پراگ کے سینٹ ایڈال برٹ تک پہنچا تھا کہ زینوں پر میرا پاؤں رپٹا، قالین سے ہوتا ہوا میں دھڑام سے پتھر کے فرش پر جا گرا، اور پھر پیچھے دیکھے بغیر، شطرنجی نمونے کے فرش کو پھلانگتا ماریا تک پہنچا، جو تھوڑی دیر پہلے ہی میرے بتائے ہوئے طریقے سے پار کرتی ہوئی آئی تھی۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کو مقدس پانی کے فوارے کی طرف لے گیا؛ میں نے اس سے دوبارہ بلند شہ نشین کی طرف، خود پھلانگ کر کے جانے کے لیے کہا، مگر میں ساتھ نہیں گیا؛ اور جب اس نے عبادت کے دوران جھکنا چاہا تو میں اس کو دھوپ میں کھینچ لایا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ یوکرائن کی عورتیں ریل کی پٹریوں سے جا چکی تھیں۔ ان کی جگہ، ایک مال گاڑی آگے پیچھے کی جا رہی تھی جو لانگ فوز سے زیادہ دور نہیں تھی۔ فضا میں مچھروں کے جھنڈ اُڑتے پھر رہے تھے۔ ریلوے کی آوازوں میں گڈ مڈ گھنٹیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آسکر چیخنا چاہ رہا تھا۔ میں اس یسوع کا کیا کروں؟ میں تو اپنی آواز کو سنجیدہ کرنا چاہ رہا تھا۔ مجھے صلیب سے کیا لینا دینا، مگر میں اچھی طرح جانتا تھا کہ گرجا گھر کی کھڑکیوں کے معاملے میں میری آواز بے بس ہے۔ اسے پیٹر نامی لوگوں کے مندر رہنا نے دو۔ ''ہوشیار آسکر، گرجا گھر کی کھڑکیوں کو نہ چھیڑو۔'' میرے اندر کے شیطان نے سرگوشی کی، ''دیکھ لینا، کسی دن وہ شخص تمھاری آواز کو تباہ کر دے گا۔'' میں نے اوپر نظر کی، ان نیو گوتھک کھڑکیوں کو ناپا اور سر جھٹک کر الگ ہو گیا۔ نہ میں نے گانا گایا، نہ اس کی بات مانی، بس ماریا کے ساتھ ریلوے روڈ کو جانے والی سُرنگ میں داخل ہو گیا۔ رِستی، ٹپکتی سُرنگ سے ہوتے ہوئے، 'کلائن ہامر' پارک کی چڑھائی چڑھتے، 'میرین اشتراسے' سے دائیں مڑ کر،

وول گیمتھوہ گوشت فروش کی دُکان سے گزر کر بائیں مڑے اور نیلسن اشتراسے' میں داخل ہوئے، 'اشترائس باغ' کو پار کر کے 'نیور مارکٹ' پہنچے جہاں ہوائی حملے سے بچاؤ کے لیے پانی کی ٹنکی بنائی جا رہی تھی۔ 'ویلیس وگ' لا متناہی طویل لگی تھی، مگر اس پر گھر بھی بنے ہوئے تھے۔ ماریا کو چھوڑ، آسکر سیڑھیاں چڑھتا دوچھتی میں جا پہنچا۔ بستر کی چادریں سوکھنے کے لیے ٹنگی ہوئی تھیں؛ بستر کی چادروں کے پیچھے ہوائی حملے سے دفاع کی ریت کا ڈھیر لگا ہوا تھا؛ ریت اور بالٹیوں کے، اخباروں کے بنڈل کے اور چھت کے کھپریلوں کے ڈھیر کے پیچھے میری کتاب اور نقارے کی رسد چھپی ہوئی تھی، مگر وہاں جوتوں کا ایک ڈبا بھی تھا جس میں بجلی کے فیوز بلب رکھے ہوئے تھے۔ آسکر نے ایک کو اپنے گانے سے پارہ پارہ کر دیا؛ اس نے ایک اور بلب لیا اور اس کو شیشے کے سفوف میں تبدیل کر دیا، تیسرے کو صفائی سے دو حصوں میں کاٹ دیا۔ چوتھے بلب پر اس کی آواز نے سوٹرلینی رسم الخط میں یسوع کندہ کر دیا، پھر بلب اور کندہ کاری دونوں کا سفوف بنا دیا۔ وہ ایسا اور بھی کرنا چاہ رہا تھا، مگر بدقسمتی سے بلب باقی نہیں بچے تھے۔ تھک کر میں ہوائی حملے کی ریت پر گر گیا، آسکر کی آواز اب بھی باقی تھی۔ شاید یسوع کو ایک شاگرد مل گیا تھا اور جہاں تک میرا معاملہ تھا، گرد جھاڑنے والے میرے پہلے شاگرد بننے والے تھے۔

# گرد جھاڑنے والے

آسکر یسوع کی پیروی کے لیے نہیں بنا تھا۔ پھر بھی یسوع کا وہ جملہ، "میری پیروی کرو" بالواسطہ پیچیدگی سے، میرے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا اور میں اس کا پیروکار بن گیا، حالاں کہ میں اس پر یقین نہیں رکھتا تھا، مگر بقول شخصے، وہی جو شبہ کرتا ہے، یقین کرتا ہے، اور وہی جو منکر ہوتا ہے، سب سے زیادہ یقین کرتا ہے۔ یسوع نے سیکرڈ ہارٹ چرچ میں مجھے ایک چھوٹا سا نجی معجزہ دکھلایا تھا اور میں اپنے شبہات کی بنیاد پر اس کو نظرانداز نہیں کر سکا تھا، بلکہ اس کے برعکس، میں نے یسوع کے دوبارہ معجزہ دکھانے کی تمام کوششیں کر ڈالی تھیں۔

اس کے بعد آسکر کئی بار، ماریا کے بغیر سیکرڈ ہارٹ گیا تھا۔ اس کے لیے چپکے سے کھسک جانا مشکل نہیں تھا، اس لیے کہ مدر ٹروزنسکی اپنی کرسی سے چپکی رہتی تھی۔ یسوع کے پاس مجھے دینے کے لیے تھا بھی کیا؟ کیوں میں نے اپنی آدھی رات مرکز کی بائیں شہ نشین پر گزاری تھی اور مہتمم نوادرات کو مجھے گرجا گھر میں بند کر دینے کا موقع کیوں فراہم کیا تھا؟ آسکر بائیں جانب کی شہ نشین پر اس وقت تک کیوں کھڑا رہا تھا کہ اس کے دست و پا منجمد ہو گئے تھے اور کان جم کر اکڑ گئے تھے؟ اس لیے کہ اپنی تمام تر کچلنے والے انکسار اور مزید کچلنے ڈالنے والے کلمۂ کفر کے باوجود نہ میں نے کبھی اپنے نقارے کی آواز سنی نہ یسوع کی۔

توبہ توبہ! میں نے کل رات، سیکرڈ ہارٹ میں اپنے دانت کٹکٹانے کی ایسی آواز سنی جیسی کہ زندگی بھر نہیں سنی تھی۔ کوئی مسخرہ بھی آسکر سے بہتر کھڑکھڑاہٹ پیدا نہیں کر سکتا۔

یہ تو مشین گن جیسی معلوم ہوئی تھی۔میرے اوپر اور نیچے کے جبڑوں کے درمیان ایک ٹاپنگ پول سا کام کر رہا تھا۔میرے دانت ہر سمت گٹ گٹ کر رہے تھے اور اپنی تعریف میں تالیوں کی گونج کی توقع کر رہے تھے۔ستون لرز رہے تھے، محرابوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے،اور جب دانت نہیں بج رہے تھے تو مجھے کھانسی آنے لگتی تھی۔میری کھانسی شطرنجی نمونے کے پتھروں سے اُچھلتی، گرجا گھر کے بازوؤں والے حصے پر گرتی، مرکزی حصے کے اوپر جاتی، اور کوائر پر بلند ہو جاتی تھی۔ کھانسی ساٹھ کے ہندسے سے ضرب دے کر، باخ کی سوسائٹی کی تنظیم کرتی ہے جو گانے میں نہیں کھانسنے میں مہارت رکھتی ہے؛ میں نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ آسکر کی کھانسی رینگ کر آرگن کی نلکیوں میں داخل ہو گئی ہے اور اب اتوار کے نغمے سے پہلے کبھی نہ سنائی دے گی، صرف تبرکات کے کمرے میں سنائی دے گی، منبر سے سنائی دیتی رہے گی، اس وقت تک، جب تک اس کی طوالت ختم نہیں ہو جاتی، بلند شہ نشین کے پیچھے صلیب پر لٹکے جسم کے قریب سے بھی سنائی دے گی۔میری کھانسی نے کہا کہ میرا کام ختم ہو گیا ہے، مگر کچھ بھی ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ لڑکا میری چوب نقارہ اور نقارہ لیے اسی طرح اکڑا اور پُر غرور بیٹھا رہا، مگر وہ نقارہ کبھی نہیں بجائے گا، اس نے میرے منصوبے کی تکمیل سے انکار کر دیا ہے۔آسکر کو تحریری جواب چاہیے۔ مجھے یہ خراب عادت ایک زمانے سے پڑی ہوئی ہے۔ جب بھی میں کسی گرجا گھر یا کسی مشہور ریوے گرجا گھر جاتا ہوں تو مجھے کھانسی آنی شروع ہو جاتی ہے، خواہ میں بالکل صحت مند ہی کیوں نہ ہوں۔جوں ہی میں اندر قدم رکھتا ہوں، مسلسل کھانسی شروع ہو جاتی ہے جو گوتھک، رومی طرز، بلکہ گرجا کے اپنے طرز کے مطابق بارونق انداز اختیار کر لیتی ہے۔مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ میں آسکر کی کھانسی کو نقارے کے ذریعے 'اُلم' کے یا 'سپایَر' کے بڑے گرجا گھر میں بھی آپ کو سنا سکتا ہوں۔ اس وقت جب میں وسط اگست میں کیتھلک مذہب کے سب سے زیادہ بدفانی اثرات کا ستایا ہوا تھا، مجھے دور دراز کے گرجا گھروں میں جانے کا موقع نہیں ملتا تھا؛ اگر آپ منصوبے کے مطابق 'رائخس ویر' سے واپس بلائے جانے والے فوجیوں میں سے نہ ہوں اور آپ نے اپنی ڈائری میں لکھ رکھا ہو، ''آج 'آرویے نو' کو خالی کر دیا گیا ہے؛ لاجواب گرجا گھر ہے، جنگ کے بعد مونیکا کے

ساتھ ضرور واپس آنا ہے، اور اس کی ٹھیک سے سیر کرنی ہے۔"

میرے لیے پابندی ہے۔ گرجا گھر جانے والا بننا آسان تھا، اس لیے کہ ایسی کوئی شے نہیں تھی جو مجھے گھر میں روک سکتی۔ ماریا تھی، مگر اس کے لیے ماتسیرات تھا۔ میرا بیٹا کرٹ بھی تھا مگر وہ قابو سے باہر ہوتا جا رہا تھا، کبھی میری آنکھوں میں ریت ڈالتا اور کبھی اتنی شدت سے ناخن مارتا کہ میرے پدرانہ گوشت میں اس کے ناخن ٹوٹ جاتے تھے۔ اس کے علاوہ میرے بیٹے نے مجھے مٹھی جیسے دستانے کا ایک جوڑا دکھایا جس میں دھات سے بنے انگلی کے جوڑ جیسے اُبھار لگے ہوئے تھے، اتنے چمک دار کہ ان کو دیکھ کر ہی میرے ناک سے خون بہنے لگتا تھا۔

حیرت کی بات ہے کہ ماتسیرات نے — بے ڈھنگے پن سے مگر ملائمت کے ساتھ میرا دفاع کیا تھا۔ حیرت ہے کہ آسکر نے اس شخص کو، جو اس کے لیے کچھ نہیں تھا، گود میں لینے، گلے سے لگانے اور ایک بار بوسہ لینے دیا تھا۔ آنسو بھری آنکھوں سے ماتسیرات نے، ماریا سے نہیں، اپنے آپ سے کہا تھا، "یہ ممکن ہی نہیں، میں اپنے بیٹے کو کسی کو نہیں دے سکتا۔ ڈاکٹر جو چاہیں کہتے رہیں۔ وہ تو ہمیشہ اسی قسم کی باتیں سوچتے رہتے ہیں۔ میں شرط لگانے پر تیار ہوں کہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہوگی۔" ماریا نے، جو بیٹھی بہی کھاتے میں غذائی اسٹامپ چپکا رہی تھی، جیسا کہ وہ ہر شام کیا کرتی ہے، سر اُٹھا کر دیکھا تھا، "آرام سے، الفریڈ آرام سے۔ تم تو اس طرح باتیں کر رہے ہو جیسے مجھے اس کی کوئی پروا نہیں، مگر جب میں یہ کہتی ہوں کہ جدید طریقہ یہی ہے، تو تم نہ جانے کیا سوچنے لگتے ہو۔"

ماتسیرات نے پیانو کی طرف اشارہ کیا، جس نے بے چاری مما کے انتقال کے بعد سے کوئی موسیقی پیش نہیں کی ہے، "ایگنس کبھی ایسا نہیں کرتی، وہ تو اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتی۔"

ماریا نے پیانو پر نظر کی، اپنے کاندھے ہلائے اور ان کو واپس اپنی جگہ پر جانے دیا، صرف اس وقت جب کچھ کہنے کے لیے وہ اپنا منہ کھول رہی تھی۔ "یقیناً نہیں، وہ آسکر کی ماں تھی، اس کو امید تھی کہ وہ بہتر ہو جائے گی۔ مگر تم نے دیکھا: کچھ بھی نہیں ہوا، اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا، اس کو معلوم نہیں کہ زندہ کس طرح رہا جاتا اور مرا کس طرح جاتا ہے۔"

کیا یہ بیتھوون کا انداز نہیں تھا، جو اداسی کی کیفیت میں، پیانو پر جھکا اداس دُھکر کی ہمت بڑھاتا رہتا تھا، جس سے ماتسیرات کو طاقت ملی تھی؟ ''نہیں'' اس نے چلّا کر کہا، ''کبھی نہیں'' اور میز پر اور اس پر پھیلے ہوئے چیک دار کاغذوں پر زور سے ایک مُکا رسید کیا۔ اس نے ماریا سے وہ خط طلب کیا جو ادارے کی جانب سے آیا تھا، اس کو پڑھا، پھر پڑھا، پھر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے روٹی کے ٹکٹوں، چربی کے ٹکٹوں، غذا کے ٹکٹوں، سفری ٹکٹوں، مشقتی ٹکٹوں، بہت زیادہ مشقت والے ٹکٹوں، حاملہ عورتوں کے ٹکٹوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کے ٹکٹوں پر پھینک دیا۔ اگرچہ ماتسیرات کے طفیل آسکر اُن ڈاکٹروں کے ہتھے نہیں چڑھ سکا تھا، اس کا اپنا ایک تصور تھا، اور آج بھی ہے: جب وہ ماریا پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی نظروں میں ایک خوب صورت کلینک کا تصور ابھرتا ہے جو پہاڑوں کی طرح صحت افزا ہواؤں میں، ہلکے، ہوادار اور دوستانہ ماحول میں، جدید آلاتِ جراحی سے لیس آپریشن تھیٹر سمیت موجود ہو، اور گدے لگے دروازے کے باہر، ماریا شرمندہ مگر مسکراتی ہوئی، مجھے بڑے اعتماد سے اوّل درجے کے معالجین کے حوالے کر رہی ہو، جو خود بھی مسکرا رہے ہوں، اور پُراعتماد بھی ہوں، اور ان کے سفید بالا پوشوں کے پیچھے، ان کے ہاتھوں میں اعتماد پیدا کرنے والی اور فوری اثر کرنے والی جراثیم سے پاک انجکشن کی سوئیاں ہوں۔

پوری دنیا نے مجھے فراموش کر دیا تھا اور وہ صرف میری مما بے چاری کا سایہ تھا جو اس وقت ماتسیرات کی انگلیوں کو فالج زدہ کرنے لگتا تھا، جب بھی ماتسیرات کے دل میں وزارتِ صحت کے تیار کیے ہوئے کاغذ پر دستخط کرنے کا خیال آتا تھا — جس کے باعث آج میں زندہ ہوں۔

آسکر احسان فراموش نظر آنا نہیں چاہتا۔ میرے پاس اب بھی نقارہ ہے، میری آواز اب بھی باقی ہے، جو اب آپ کے کام کی نہیں رہ گئی ہے، اس لیے کہ آپ نے شیشے کے ضمن میں میری تمام کامیابیوں کو سن رکھا ہے، جو آپ کے درمیان انوکھا پن پسند کرنیوالوں کو اُکتانے لگی ہوں گی — مگر میرے لیے آسکر کی آواز، اس کے نقارے کے مقابلے میں، میرے وجود کا ثبوت ہے، لہٰذا ہمیشہ نئی رہے گی، جب تک میں شیشوں کو گا

کر ٹکڑے ٹکڑے کرتا رہوں گا، اور میرا وجود قائم رہے گا۔

اس عرصے میں آسکر کافی گایا کرتا تھا۔ وہ مایوسی کی پیدا کردہ قوت سے گاتا تھا۔ جب بھی میں سکریڈ ہاٹ گرجا گھر سے دیر سے نکلتا، میں گا کر کوئی نہ کوئی چیز توڑ دیا کرتا تھا۔ میں کسی خاص نوعیت کے ہدف کی تلاش میں نہیں رہتا تھا۔ گھر واپسی کے دوران میں کسی دو چھتی کی کھڑکی کو تاڑ لیتا تھا جس کو باقاعدہ بلیک آؤٹ نہیں کیا گیا ہوتا یا سڑک کی کسی روشنی کو جس کا شیشہ قانون کے مطابق نیلا نہیں ہوتا تھا، تباہ کر دیتا۔ ہر بار، جب میں گرجا گھر جاتا، واپسی کے لیے دوسرا راستہ اختیار کرتا تھا۔ ایک شام آسکر نے 'اینٹنی مولر وگ' اور 'میزن اشتراسے' کا راستہ اختیار کیا۔ دوسری شام وہ 'کانزاڈیئم' سے گزرا اور مرکزی دروازے کا شیشہ توڑتا گیا۔ اگست کے آخر میں، ایک دن میں گرجا گھر دیر سے پہنچا اور دروازہ مقفل پایا۔ میں نے غصے کو چہل قدمی سے بہلانے کی کوشش میں گھر جانے کے لیے ایک پیچیدہ راستہ اختیار کر لیا تھا۔ میں 'بانہوف اشتراسے' سے چلا، جہاں میں نے سڑک کا ہر تیسرا لیمپ شہید کر دیا تھا، فلم پیلیس ہوتا دائیں مڑ کر 'ایڈولف ہٹلر اشتراسے' میں داخل ہو گیا۔ میں نے فوج کے ہراول دستے کی بیرکوں کو نظر انداز کر دیا، مگر اپنا غصہ ایک خالی ٹرام گاڑی پر نکالا جو 'اُلیوا' سے میری جانب آ رہی تھی، اور اس کے افسردہ بلیک آؤٹ شیشے کو ایک طرف سے مغموم کالے کاغذ سے محروم کر دیا تھا۔

بریکیں چیخ پڑیں، ٹرام گاڑی رُک گئی، لوگ باہر نکل آئے۔ تھوڑی دیر بُرا کہتے رہے، دوبارہ گاڑی میں سوار ہو گئے۔ اگر آپ سمجھیں تو یہ بھی ایک طرح کی فتح تھی مگر آسکر نے اس کی پروا نہیں کی۔ اپنے غصے کے لیے وہ کسی بیٹھنے کی تلاش میں نکل پڑا، اور اس تک وقت نہیں رُکا جب تک کہ لانگ فور پہنچتے پہنچتے اس کو بالٹک فیکٹری نظر نہیں آ گئی، جو چاندنی میں 'پیرینٹ' کی بڑھئی کی دُکان اور ہوائی اڈے کے وسیع و عریض ہینگروں کے درمیان پھیلی ہوئی تھی۔

اس وقت تک میرے غصے کی شدت کچھ کم ہو گئی تھی۔ فیکٹری سے اپنا تعارف کرانے کے بجائے میں نے انتظار کیا اور چاندنی میں نہائی کھڑکیوں کو گنا۔ اس کے بعد میں اپنا تعارف کرانے ہی والا تھا، مگر پہلے میں نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ وہ نوجوان جو بوخ

اشتراسے سے میرا پیچھا کرتے شاید بانہوف اشتراسے تک آئے تھے، کیا چاہتے تھے۔وہ چھ یا سات لڑکے ٹرام گاڑی کے اسٹاپ کے ساتھ والی پناہ گاہ کے قریب کھڑے تھے اور میں دیکھ سکتا تھا کہ مزید پانچ لڑکے سڑک کے پیڑوں کے پیچھے کھڑے ہوئے تھے۔

جب آسکر نے بیٹیوں کے آپس میں تبادلے کی آواز سنی، عین اسی وقت میں نے چاکلیٹ فیکٹری جانے کا فیصلہ معطل کر دیا تھا تا کہ ان کو Aktien Brewery اور پُل سے ہوتے ہوئے گھر جانے کی سہولت رہے۔ایک گروہ پُل پر سے اشارے کر رہا تھا۔ اس میں تردد کی کوئی بات نہیں تھی،فوجوں کی یہ حرکت میرے مفاد میں تھی۔

میں نے اپنا پیچھا کرنے والوں کو دیکھ لیا تھا،مگر تلاش ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ایسے حالات میں انسان اپنے فرار کے راستوں کا نہایت لطف اور احتیاط سے تعین کرتا ہے: ایسے میں آسکر اپنی مما اور پاپا کو یاد کر کے رویا ضرور ہوگا۔خدا جانے میں نے کس کس کو طلب کیا ہوگا، اپنے نقارے کو یا شاید کسی پولیس والے کو۔ میری ہیئت نے۔یقیناً مجھے بالغوں کی حمایت کا حق دار بنایا ہوگا،مگر آسکر کے اپنے اُصول تھے، اور اکثر وہ ان پر عمل بھی کرتا تھا۔لہٰذا میں نے پولیس کی یا ایسے بالغ افراد کی مدد حاصل نہ کرنے کا فیصلہ کیا جن کو ایک آواز دے کر بلایا جا سکتا تھا۔اتنی توجہ ملنے سے پیدا ہونے والے تجسس اور یک گونہ مسرت کے باعث میں نے حالات کو اپنی نہج پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا، اور ایک نہایت احمقانہ کام کیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا: میں چاکلیٹ فیکٹری کے اطراف تارکول لگے لکڑی کے تختوں سے بنی باڑ میں کوئی سوراخ تلاش کرنے لگا تھا۔ سوراخ تو نہیں ملا،مگر وہ نوجوان ڈاکو، وہی لڑکے، آہستہ آہستہ اور سرد مہری سے میرے اطراف گھیرا تنگ کر رہے تھے۔وہ ٹرام گاڑی کے اسٹاپ پر بنے برآمدے سے، پیڑوں کے نیچے ہوتے ہوئے، سڑک پر آئے، جو پُل سے ذرا فاصلے پر تھی۔آسکر چار دیواری کے ساتھ ساتھ چلتا اور کوئی جگہ تلاش کرتا جا رہا تھا۔انھوں نے مجھے اتنا وقت دیا جس میں مجھے ایک جگہ مل گئی ،جہاں سے باڑ کا ایک تختہ غائب تھا،مگر جب میں کسی نہ کسی طرح اس جگہ سے گھسنے کی کوشش کرنے لگا، جس عمل میں میری پتلون پھٹ گئی تھی،تو میں نے دیکھا کہ دوسری طرف چار بدمعاش، ہوا سے بچنے والی جیکٹ پہنے ہوئے ،اپنی ski پتلونوں کی جیب میں ہاتھ ڈالے میرے انتظار میں کھڑے تھے۔

یہ دیکھ کر کہ اس کیفیت میں کچھ نہیں کیا جاسکتا، میں اپنے پتلون پر ہاتھ پھیر کر چاک تلاش کرنے لگا۔چاک بیٹھنے کی جگہ پر تھا۔میں نے اپنی پھیلی ہوئی انگلیوں سے چاک کو ناپا، اس کو تکلیف دہ حد تک بڑا پایا مگر میں نے لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے، اور حالات کا مقابلہ کرنے کی تیاری سے پہلے، ٹرام گاڑی والے، سڑک والے اور پُل والے تمام لڑکوں کے باڑ پر چڑھنے کا انتظار کیا، اس لیے کہ اندر گھسنے کی جگہ کے لیے ان کے جسم بہت بڑے تھے۔یہ اگست کے آخری دن کا واقعہ تھا۔وقتاً فوقتاً چاند بادلوں کے پیچھے چھپ جاتا تھا۔ میں نے خود ان کو گنا تھا۔بیس کے قریب لڑکے تھے۔سب سے چھوٹا چودہ برس کا، سب سے بڑا سولہ کا یا تقریباً سترہ برس کا تھا۔سن '44 کی گرمی کا موسم بہت گرم اور خشک تھا۔بڑی عمر کے لڑکوں میں سے چار ہوائی فوج کے معاون فوجیوں کی وردی میں تھے۔مجھے یاد ہے کہ اس برس چیری کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔وہ لڑکے آسکر کے اطراف چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں کھڑے ہو گئے، مدھم آواز میں باتیں کرتے، ایسے الفاظ بول رہے تھے میں نے جن کو سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔وہ ایک دوسرے کو عجیب عجیب نام سے بلاتے تھے، جن میں سے چند ہی مجھے یاد رہ گئے ہیں۔وہ پندرہ برس والا، جس کی بھیگی بھیگی آنکھیں تھیں اسے 'ریز' کا نام دیا گیا تھا، اکثر لوگ اس کو 'باؤنسر' بھی کہتے تھے۔اس کے ساتھ والا 'نچی' تھا۔سب سے چھوٹا والا جو سب سے کم عمر نہیں تھا، اس کا اوپری ہونٹ باہر کو نکلا ہوا تھا اور زبان میں لکنت تھی، 'فائر اسٹیلر' تھا۔ایئر فورس کے مددگار سپاہی کو مسٹر اور دوسرے کو اس کی مناسبت سے 'سوپ چکن' کہتے تھے۔ان میں دو تاریخی نام 'لائن ہارٹ' اور 'بلیو بیرڈ' کے تھے۔بلیو بیرڈ دیکھنے میں زنخوں جیسا لگتا تھا، اور میرے پرانے دوست تھے ٹوٹیلا اور تیجا۔ان میں دو اتنے گستاخ تھے کہ وہ خود کو بیلی سارئیس اور نارسیس کہلاتے تھے۔ان کا سولہ سالہ سردار مشہور ڈاکو 'اسٹورٹی بیکر' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔وہ اصلی مخمل کی ہیٹ پہنتا تھا جس کا اوپری حصہ اندر کو ٹھونس دیا گیا تھا تاکہ تیغ جیسا لگے، اور وہ برساتی پہنتا تھا جو اس کے قد کے حساب سے بہت لمبی تھی۔

کسی نے آسکر کی طرف توجہ نہیں کی؛ وہ اس کو تذبذب میں رکھ کر تھکا ڈالنا چاہتے تھے۔ میں، ان رومانوی بالغوں کا ستایا ہوا، نیم وروں نیم بروں، تھک کر اپنے

نقارے پر بیٹھ گیا، چاند کی طرف دیکھنے لگا جو تقریباً پورا تھا اور اپنے خیالات کے ایک حصے کو سیکریڈ ہارٹ گرجا گھر کی طرف منعطف کرنے لگا۔

کاش آج ہی اس نے نقاری نوازی کی ہوتی، یا ایک آدھ لفظ ہی منہ سے نکالا ہوتا۔ مگر نقارے کے مختصر سے تعارف کے بعد میں بالکل چاکلیٹ فیکٹری کے احاطے میں، پولیس والوں اور ڈاکوؤں کے درمیان، بیٹھا اپنا وقت خراب کر رہا تھا۔ شاید وہ میرا یا میرے نقارے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ یسوع کی نقل کے طریقوں کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ایک بار پھر اپنا منہ کھولنے کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ میرے نہ پہنچنے پر مایوس ہوا۔ اس وقت، غالباً وہ اپنے متکبرانہ طریقے سے اپنی بھنویں اوپر کر رہا تھا۔ یسوع بے دلی سے کام کرنے والے ان نوجوانوں کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔ اس کی شبیہ، اس کا شاگرد، اس کا پادری آسکر اس گروہ سے کس طرح پیش آتا۔ کیا وہ نوجوان غنڈوں کے گروہ سے، جس کے فرد خود کو فائر اسٹیلر، بلیوبیرڈ، پچی، اور اِسٹورٹی بیکر کہلواتے ہیں یسوع کے الفاظ استعمال کرتا: "میرے بچو میرے پاس آنے کے لیے کچھ تکلیف اٹھاؤ۔"

اِسٹورٹی بیکر اپنے دستِ راست فائر اسٹیلر سمیت آیا۔ اِسٹورٹی بیکر نے کہا، "کھڑے ہو جاؤ۔"

آسکر کی آنکھیں اب بھی چاند پر جمی ہوئی تھیں، مگر اس کا ذہن سیکریڈ ہارٹ گرجا گھر کی بائیں شہ نشین پر تھا۔ وہ کھڑا نہیں ہوا اور اِسٹورٹی بیکر کے اشارے پر فائر اسٹیلر نے ٹھوکر مار کر نقارہ، جس پر میں بیٹھا ہوا تھا، دور پھینک دیا۔ میں بیٹھنے کے لیے کسی چیز کی تلاش کے لیے اُٹھا اور نقارے کو مزید نقصان سے بچانے کے لیے اپنے زیرِ جامے کے نیچے کر لیا۔ یہ اِسٹورٹی بیکر اچھا لڑکا لگتا ہے، آسکر نے سوچا۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی اور ایک دوسرے سے قریب ہیں، مگر اس کے ہونٹوں کی کاٹ سے زندگی اور تصور صاف جھلکتا ہے۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

گویا اب وہ مجھ سے سوال جواب کرنے والے ہیں۔ اس قسم کی گفتگو سے بیزار ہو کر، میں واپس چاند کی طرف دیکھنے لگا اور یہ سوچتے ہوئے — چاند کو اس بات کی کوئی پروا

نہیں کہ کون کیا سوچ رہا ہے — کہ یہ تو بالکل نقارے جیسا لگ رہا ہے، اور میں معصومیت سے مسکرا دیا۔ "اِسٹورٹی بیکر، یہ مسکرا رہا ہے۔" فائر اِسٹیلر نے میری طرف دیکھا ایک کام کرنے کا مشورہ دیا، جس کو وہ "جھاڑ پونچھ" کہتا ہے۔ پس منظر کے سارے لوگ، مہاسے کے چہروں والے، باؤنسر، مسٹر، کائن ہارٹ اور پٹی سب جھاڑ پونچھ کے حق میں تھے۔

میری نظر اب بھی چاند پر تھی اور ذہن میں "dusting" کے ہجے کر رہا تھا لفظ تو اچھا ہے مگر یقینی طور پر اس کا مطلب کچھ ناگوار ہو گا۔ اِسٹورٹی بیکر نے تحکمانہ لہجے میں کہا "میں بتاؤں گا کہ یہاں کس کو جھاڑا پونچھا جائے، اور کب" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا، "ہم نے تم کو بار بار 'مہوف اشتراسے' جاتے دیکھا ہے! کیوں؟ تم کہاں جاتے ہو؟"

دو سوالات ایک ساتھ۔ آسکر کو اگر حالات کو قابو میں رکھنا ہے تو کم از کم ایک سوال کا جواب دینا پڑے گا۔ میں نے چاند سے نظریں ہٹائیں، اپنی نیلی ترغیب دینے والی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور سکون سے جواب میں کہا، "گرجا گھر۔" اِسٹورٹی بیکر کی بد ساتی کے پیچھے سے میرے جواب پر تبصرے آئے۔ فائر اِسٹیلر نے خیال ظاہر کیا کہ گرجا گھر سے میری مراد سیکریڈ ہارٹ ہے۔

"تمھارا نام کیا ہے؟"

یہ ایک ناگزیر سوال تھا، یہ سوال جو اس وقت کیا جاتا ہے جب ایک آدمی دوسرے آدمی سے ملتا ہے اور انسانی گفتگو میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہ سارے کھیلوں کا نچوڑ فراہم کرتا ہے، اوپیرا کا بھی، مثلاً 'لوہینگرین' کا۔

میں نے انتظار کیا کہ چاند ایک بادل سے دوسرے بادل میں چلا جائے اور میری آنکھوں کی چمک کو اِسٹورٹی بیکر پر کام کرنے دے اس لیے کہ اس پر اتنا ہی وقت لگتا ہے جتنی دیر میں، میں تین پیالہ شوربا کھایا جاتا ہے۔ تب میں بولا، اور اپنا نام بتایا — اگر میں نے اپنا نام آسکر بتایا ہوتا تو قہقہے کے سوا مجھے کیا ملتا؟ "میرا نام یسوع ہے۔" میں نے کہا۔ اس کے بعد ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ بالآخر فائر اِسٹیلر نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے کہا، "چیف، ہمیں بہر حال اس کی جھاڑ پونچھ کرنی پڑے گی۔"

اس بار فائز اِسٹیلر کو اختلاف کا سامنا نہیں کرنا پڑا؛ چٹکی بجاتے اِسٹورٹی بکر نے اجازت دے دی، اور فائز اِسٹیلر نے مجھے گرفت میں لے لیا، کہنی سے ذرا اوپر بازو کے نچلے حصے میں اس نے اپنے مٹھیوں کی ہڈیاں اڑا دیں، گرم اور درد انگیز سنسنی محسوس ہوئی، اس وقت تک ہوتی رہی جب تک اِسٹورٹی بکر نے ایک بار پھر چٹکی بجا کر روکنے کا اشارہ نہیں کر دیا تھا — سو یہ تھی جھاڑ پونچھ!

''اچھا! اب بتاؤ کہ تمھارا نام کیا ہے؟'' اصلی مخمل کی ہیٹ پہنے ہوئے چیف نے اُکتاتے ہوئے، ہوا میں مکّے لہرائے، جس سے اس کی بے ساتی کی لمبی آستینیں سمٹ کر اس کی کہنیوں تک پہنچ گئیں اور اس کی کلائی کی گھڑی چاندنی میں چمکی۔ ''تمھارے پاس سوچنے کے لیے صرف ایک منٹ ہے۔'' اس نے سرگوشی میں کہا، ''اس کے بعد میں لڑکوں کو سبز اشارہ کر دوں گا۔'' آسکر کے پاس پورا ایک منٹ تھا جس میں اسے بے خوف ہو کر چاند کو دیکھنا تھا، اس کے غاروں کا کوئی حل نکالنا تھا، یسوع بننے کے خیال پر دوبارہ غور کرنا تھا۔ یہ سبز اشارے والا معاملہ مجھے پسند نہیں تھا اور یقیناً میں کسی نیم پخت غنڈے کو ہاتھ لگانے دینے والا نہیں تھا۔ میں نے صرف پینتیس سیکنڈ سوچا اور کہا، ''میں یسوع ہوں۔''

اس کے بعد جو کچھ ہوا، بہت اچھا ہوا تھا، مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری منصوبہ بندی سے ہوا تھا۔ میرے دوسرے اعلان — ''میں یسوع ہوں'' — کے فوراً بعد اس سے پہلے کہ اِسٹورٹی بکر چٹکی بجاتا، یا فائز اِسٹیلر جھاڑ پونچھ کر سکتا، ہوائی حملے کا بھونپو بجنے لگا تھا۔ ''......یسوع مسیح......'' آسکر نے کہا اور لمبی سی سانس لے کر کہا تھا۔ چنانچہ، یکے بعد دیگرے، میری شناخت کی تصدیق ہو گئی تھی نزدیکی ہوائی اڈوں کے بھونپوؤں سے، 'نیوفسر لیں' انفنٹری بیرکس کی مرکزی عمارت کے بھونپو سے، ہورسٹ ویسیل ہائی اسکول کی چھت پر لگے بھونپو سے، 'اِسٹرنفیلڈ' ڈپارٹمنٹ اسٹور کے بھونپو سے، اور دور بہت دور، 'ہنڈن برگ ایلی' کے انجینئرنگ اسکول کے بھونپو سے۔ مضافات میں جاگ اٹھنے والے بھونپوؤں نے، آہنی تاروں سے بنے نظامِ تنفس نے اور ضرورت سے زیادہ جذباتی جرنیلوں نے رات کو سوتے سے جگا دیا، پچا، سارے خوابوں کو جھنجھوڑا اور ریزہ ریزہ کر دیا اور

خوابیدہ عوام کے کانوں میں کنکھجورے کی طرح رینگ کر سردی گرم میں، لاپروا چاند کی ایک رحم دل روشنی میں قلبِ ماہیت کردی، کہ اب بلیک آؤٹ کی ضرورت ہی نہیں رہ گئی تھی۔

آسکر جانتا تھا کہ خطرہ اس کے لیے نعمت بن گیا ہے؛ اسٹورٹی بیکر کے لیے نہیں، کہ خطرے کے بھونپوؤں نے اس کو پریشان کردیا تھا۔ اس کے کچھ حاشیہ برداروں کے لیے بھونپو کی آواز مذہبی پکار کے مماثل تھی۔ ہوائی فوج کے چار مددگار فوجیوں کو چار دیواری کو پھلانگنا اور کار کے اڈے اور ہوائی اڈے کے درمیان واقع اپنی اپنی توپوں تک پہنچنا تھا اور ان چلانے والوں کو اُن پر موجود ہونا تھا۔ بقیہ سب، جس میں بیلی سارئیس شامل تھا، 'کوزاڈیم' کے چوکی دار تھے۔ اسٹورٹی بیکر نے بقیہ افراد کو، جو تقریباً پندرہ تھے، اپنے قابو میں رکھا۔ چوں کہ آسمان میں اور کچھ نہیں ہو رہا تھا، اس نے پھر مجھ سے سوال جواب کرنا شروع کردیا تھا، ''اچھا، بہت اچھا...... میرے کان اگر مجھے دھوکا نہیں دے رہے ہیں تو— تم یسوع ہو— مگر، ایک اور سوال! یہ سڑک کی روشنیوں اور کھڑکیوں کے شیشوں کی توڑ پھوڑ کی شرارت، یہ سب کیا ہے؟ یہ سب تم کس طرح کرتے ہو؟ بہتر ہے کہ تم خود اپنی صفائی پیش کردو— کہ ہم یہ سب کچھ اچھی طرح جانتے ہیں۔''

سچ تو یہ ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ انھوں نے میری ایک آدھ صوتی کامیابیاں دیکھی تھیں، اور بس۔ آسکر نے اپنے آپ سے کہا کہ تجھ کو ان چند ٹکے کے لونڈوں سے— جن کو میں اب ان ہی الفاظ سے یاد کروں گا— زیادہ سختی سے پیش نہیں آنا چاہیے۔ ان کے کام کرنے کا انداز نہایت بچکانہ تھا، بہت شوقیہ، بہت سیدھا سادہ— مگر لونڈے تو لونڈے ہی ہوتے ہیں؛ سو میں نے طے کرلیا تھا کہ میں اپنا دماغ ٹھنڈا رکھوں گا۔ یہ تھے وہ لوگ، پچھلے چند ہفتوں سے جس ٹولے کے بارے میں ہر کوئی بات کر رہا تھا، پولیس اور ہٹلر کے کئی شب گشت گروہ بھی جن کی تلاش میں تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا تھا، یہ اسکول کے لڑکے تھے، 'کانزاڈیم' کے، یعنی پیٹری اور ہورسٹ ویسیل ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ جھاڑ پونچھ کرنے والوں کا ایک اور گروہ 'نیوفار واسر' میں بھی تھا جن کی سربراہی ہائی اسکول کے لڑکے کر رہے تھے، جو شیشاؤ' شپ یارڈ اور ریل کے ڈبے بنانے

والے کارخانے میں کام سیکھ رہے تھے۔دو گروہ علاحدہ علاحدہ کام کرتے تھے، مگر صرف اِسٹینفس پارک اور ہنڈن برگ ایلی کی رات کی مہمات میں اکٹھے ہو جاتے تھے، جہاں وہ تربیتی اجتماعات کے بعد گھر جانے والی لیگ آف جرمن گرلز کی عہدے داریوں کی گھات میں بیٹھا کرتے تھے۔ان گروہوں کے درمیان تنازعوں سے پرہیز کیا جاتا تھا؛ ان کے علاقوں کی احتیاط سے حد بندی کردی گئی تھی اور اِسٹورٹی بیکر نیو فار واسر' گروہ کے سردار کو حریف کے بجائے دوست گردانتا تھا۔گرد جھاڑنے والے ہر چیز کے خلاف تھے۔وہ ہٹلر یوتھ کے دفتروں پر حملہ کرتے، باغیچوں میں بوس و کنار میں مشغول فوجیوں پر ان کے تمغے اور عہدے کے نشانات چھیننے کے لیے حملے کرتے اور ایئر فورس آگزیلری کے اپنے ساتھیوں کی مدد سے ہتھیار، گولا بارود اور AA توپوں کی گاڑیوں سے ایندھن چراتے تھے، مگر ان کا اصل منصوبہ، ابتدا سے جس میں مہارت حاصل کر رہے تھے، راشن کے دفتر پر حملہ ہوا کرتا تھا۔

اس وقت تک آسکر کو گرد جھاڑنے والوں کے بارے میں، ان کی تنظیم یا منصوبوں کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا مگر وہ بہت گرا گرا سا اور لاتعلقی کے عالم میں تھا۔اس نے سوچا کہ یہ نوجوان اس کو احساسِ تحفظ اور کسی قسم کا احساسِ وابستگی بھی فراہم کر سکتے ہیں۔ہماری عمروں کے درمیان فرق کے باوجود— میں بیس کا ہونے والا تھا— میں خفیہ طور پر خود کو ان جیسا ہی سمجھنے لگا تھا۔میں نے خود سے کہا، تم ان کو اپنے فن کا ایک نمونہ دکھا کیوں نہیں دیتے؟ نوجوان ہمیشہ سیکھنے کے مشتاق ہوتے ہیں۔تم خود بھی تو کبھی پندرہ یا سولہ کے تھے۔ان کے لیے مثال بن جاؤ، ان کو اپنے کمالات دکھاؤ۔وہ تم سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ہو سکتا ہے کہ وہ تم کو اپنا لیڈر بنا لیں۔آخر تم ان پر زور تو ڈال سکتے ہو، اپنی ذکاوت اور تجربے کو استعمال کر سکتے ہو؛ یہی تو اپنی صلاحیت دکھانے کا، شاگرد بنانے کا اور یسوع کے نقشِ قدم پر چلنے کا موقع ہے۔

شاید اِسٹورٹی بیکر کو شبہ ہو چلا تھا کہ میری خامشی کے عقب میں کچھ خیالات موجیں مار رہے تھے۔اس نے مجھے سوچنے کا موقع دیا اور اس کے لیے میں واقعی اس کا شکرگزار ہوں۔اگست کے آخری دنوں کی چاندنی رات۔ہلکے ہلکے بادل۔ہوائی حملے کا بجتا

ہوا بھونپو۔ساحل پر دویا تین تلاش روشنیاں۔شاید کوئی جاسوس طیارہ۔ پیرس سے پسپائی۔
میرے سامنے بالٹک چاکلیٹ فیکٹری کی عمارت کا کھڑکیوں سے مالا مال چہرہ۔ایک طویل
پسپائی کے بعد آرمی گروپ سکر 'وِسٹولا' پہنچ کر جم گیا تھا۔بالٹک کارخانہ خوردہ فروش بازار
کے لیے کام نہیں کر رہا تھا، اس کا سارا مال ایئر فورس کو چلا جاتا تھا۔آسکر کو جنرل پیٹن کے
سپاہیوں کی، امریکی وردی میں، آئیفل ٹاور کے نیچے پریڈ کے خیال کا عادی ہونا پڑ رہا تھا۔
اس قسم کے تکلیف دہ خیال کے ردِ عمل میں—اُف، روزویٹا کے ساتھ گزارے ہوئے وہ
خوش گوار لمحات— آسکر نے نقارہ بجانے کی ایک چوب اُٹھائی۔اسٹورٹی بیکر نے میرا
طریقۂ اظہار دیکھا اور اس کی آنکھیں میری چوب کا پیچھا کرتی چاکلیٹ فیکٹری تک
گئیں۔جب دن کی روشنی میں کوئی اوقیانوسی جزیرہ جاپانیوں سے پاک کیا جا رہا تھا، کمرے
کی ہماری جانب چاکلیٹ فیکٹری کی کھڑکیوں پر چاند چمک رہا تھا اور اُن تمام لوگوں سے
جو سننا چاہتے تھے، آسکر نے کہا تھا، ''اب یسوع کی آواز کچھ شیشے مسمار کرے گی۔''

پہلے تین شیشوں کی مسماری سے قبل مجھے اُڑتی ہوئی کسی مکھی کی بھن بھن سنائی
دی۔جس وقت دو مزید شیشے اپنے حصے کی چاندنی سے دست بردار ہو رہے تھے، میں سوچ
رہا تھا کہ یہ مکھی ضرور مرنے والی ہوگی ورنہ اتنی زور سے بھن بھن نہ کرتی۔ چناں چہ میں
نے سب سے اوپر والی منزل کی بقیہ کھڑکیوں کو سیاہ کر دیا۔ بے حد زرد، تلاش روشنیوں کی
شعاعیں جو پہلی اور دوسری منزل کی کھڑکیوں کے شیشوں سے ٹکرا کر آ رہی تھیں شاید کیمپ
'ناروک' کے قریبی توپ خانے سے پھینکی جا رہی ہیں۔ساحلی توپ خانوں نے گولے پھینکے،
تب میں نے دوسری منزل کا صفایا کر دیا۔ایک لمحے بعد 'آلٹ شاٹ لینڈ'، 'بیلونگن'
اور 'ھیلمول' کی توپوں نے گولے اگلنے شروع کر دیے۔قبل اس کے کہ میں زمینی منزل کا صفایا
کرتا، پیچھا کرنے والے جہاز اُڑے اور فیکٹری پر بہت نیچی پرواز کی اور AA نے گولا باری
روک دی تھی تا کہ پیچھا کرنے والے جہاز چار انجنوں والے بمبار کی حفاظت کر سکیں جس
پر 'ایلوا' سے پھینکی جانے والی تین تلاش روشنیاں پڑ رہی تھیں۔

پہلے تو آسکر کو خوف ہوا کہ کہیں اینٹی ایئر کرافٹ توپوں کی یہ شان دار کوششیں

ہمارے نئے دوستوں کی توجہ کسی اور طرف مبذول نہ کر دیں۔ میرا کام ختم ہوا، اور میں خوش تھا کہ سب ان شگاف نما تبدیلیوں کی طرف متوجہ تھے جو میں نے چاکلیٹ فیکٹری میں کی تھیں۔ اس وقت بھی، جب قریبی گلی 'ہوڈسن فریڈ بہ گر وگ' سے ''شاباش'' کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں ___ جیسے کسی تھیٹر میں ہوتی ہیں ___ اس لیے کہ ایک بمبار نشانہ بنا تھا، اور شعلوں میں گھرا 'جیس کیتھال' جنگل میں گرتا دیکھا جا رہا تھا، لونڈوں کے اس گروہ کا ایک فرد، "ٹی، شیشے سے محروم فیکٹری سے پرے دیکھ رہا تھا۔ نہ اسٹورٹی بکر نے اور نہ فائز اِسٹار نے، جو اس گروہ کے اہم ارکان تھے، گرتے بمبار میں کوئی دل چسپی دکھائی تھی۔

سوائے چاند اور چھوٹے موٹے ستاروں کے، ایک بار پھر آسمانی پہنائیاں خالی ہو گئی تھیں۔ پیچھا کرنے والے جہاز اُتر چکے تھے۔ دور، بہت دور سے، آگ بجھانے والے انجنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اِسٹورٹی بکر مزا، تحقیر کے انداز میں منہ بناتے ہوئے، اپنی مٹھیاں بلند کیں، جس سے برساتی کی آستین میں پھنسی کلائی کی گھڑی آزاد ہو گئی۔ ایک لفظ بھی کہے بغیر اس نے گھڑی اُتاری اور میرے حوالے کر دی۔ پھر ایک آہِ سرد بھری اور کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر اس وقت تک انتظار کیا جب تک کہ 'آل کلیئر' بھونپو بج کر خاموش نہیں ہو گیا تھا۔ بالآخر اپنے حواریوں کی تالیوں کے درمیان اس نے اپنے منہ سے کچھ الفاظ جاری کیے، ''اچھا، یسوع! اگر تم پسند کرو تو تم ہمارے ساتھ ہو سکتے ہو۔ ہم جھاڑ پونچھ کرنے والے لوگ ہیں؛ اگر تمھیں معلوم ہے کہ اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔''

آسکر ہتھیلی پر رکھ کر گھڑی کے وزن کا اندازہ لگا رہا تھا۔ اچھی، چھوٹی سی گھڑی تھی وہ، جس کا ڈائل اور سوئیاں رات کے بارہ بج کر تئیس منٹ دکھا رہی تھیں۔ آسکر نے گھڑی فائز اِسٹیلر کے حوالے کر دی۔ فائز اِسٹیلر نے باس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اِسٹورٹی بکر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گھر کی طرف مارچ کرنے کے لیے، نقارے کو آرام دہ کیفیت میں کرتے ہوئے آسکر نے کہا، ''یسوع تمھاری رہنمائی کرے گا۔ بس اس کی پیروی کرو۔''

# کرسمس تماشا

ان دنوں خفیہ ہتھیاروں اور آخری فتح کی بہت باتیں ہوتی تھیں ۔ ہم کسی گرد جھاڑنے والے کی بات نہیں کرتے تھے، مگر ہمارے پاس خفیہ ہتھیار تھے۔

گروہ کے ان تیس چالیس ارکان کی رہنمائی کی ذمے داری لینے کے بعد آسکر کا پہلا قدم 'نیو فار واہر' کے گروہ سے اسٹورٹی بیکر کے ذریعے متعارف ہوا تھا۔ مورکان، جس کی عمر صرف سولہ برس تھی اور اس کی چال میں نقص تھا، 'نیو فار واہر' کے پائلٹ دفتر کے افسر کا بیٹا تھا؛ اس کا جسمانی نقص یہ تھا کہ اس کا دایاں پیر بائیں پیر کے مقابلے میں تقریباً ایک انچ چھوٹا تھا، جس کی وجہ سے اس کی ائر فورس آگزیلری میں بھرتی نہیں ہو سکتی تھی ۔ حالاں کہ وہ اپنے لنگ کے معاملے میں ذرا نمائشی تھا، مگر مورکان شرمیلا اور نرم گفتار تھا۔ اس کے لبوں پر ہمیشہ پُرفن تبسم ہوتا تھا اور 'کانراڈینم' کے گریجویٹ کلاس میں وہ بہترین طالب علم مانا جاتا تھا۔ اگر روسی فوج کو کوئی اعتراض نہ ہوتا تو آخری امتحان میں شان دار طریقے سے اس کی کامیابی یقینی تھی ۔ وہ فلسفہ پڑھنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اسٹورٹی بیکر کی طرح، میں جس کی مکمل حمایت حاصل کر چکا تھا، مورکان نے بھی مجھے، جس کو گرد جھاڑنے والوں کی اوّلین کمان مل گئی تھی، یسوع تسلیم کر لیا تھا۔ آسکر کا فوری اصرار تھا کہ مجھے گودام اور مال خانہ دکھایا جائے، اس لیے کہ دونوں گروہ اسی جگہ پر اپنا لوٹ کا مال رکھتے تھے، جو 'لانگ فور' کے ایک نہایت پُرسکون اور وضع دار علاقے میں جیش

کین تھالر ووگ' کے ایک مکان کے وسیع تہہ خانے میں واقع ہے۔ عشق پیچاں اور مختلف نوع کی پھیلنے والی بیلوں سے ڈھکا ہوا یہ گھر جو ایک ڈھلوان مرغزار کے کنارے واقع ہے پُنّی کے والدین ، 'فان پُٹکامر' کی قیام گاہ تھا۔ Pomeranian، پولش اور پروشیائی نسل کے، نائٹ کراس یافتہ مسٹر فان پٹ کامر آزاد فرانس کے ایک ڈویژن کے کماں دار تھے؛ مسز الیزبیتھ فان پٹکامر پچھلے چند ماہ سے صحت کے مسائل کے باعث باویریا کے پہاڑوں میں مقیم تھیں۔ وولف گانگ فان پُٹ کامر، جس کو پُنّی کے نام سے پکارتے تھے، اس مکان کا نگہبان تھا؛ اور وہ بوڑھی، نصف بہری ملازمہ جو نوجوان کی ضروریات کا خیال رکھتی تھی، کبھی اس مکان کی زمینی منزل کے نیچے نہیں گئی تھی، نہ ہم نے کبھی اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا، اس لیے کہ ہم لانڈری روم کے راستے تہہ خانے میں داخل ہوئے تھے۔

گودام میں ٹین کے ڈبوں میں بھری غذا، تمباکو، اور پیراشوٹ سِلک کا انبار تھا۔ الماری کے ایک شیلف میں دو درجن فوجی گھڑیاں لٹکی ہوئی تھیں، جس کو اِسٹورٹی بیکر کے حکم پر پُنّی ہمیشہ درست وقت اور چلتی ہوئی حالت میں رکھتا تھا۔ اس کے بہت سے فرائض میں ایک فرض دو نامی بندوقیں، ایک رائفل اور تمام پستولوں کی صفائی ستھرائی تھا۔ مجھے ایک بروکا ، مشین گن کی کچھ گولیاں اور پچیس عدد دستی بم دکھائے گئے ۔ ان سب کے علاوہ ایندھن سے بھرے کئی جیری کین بھی رکھے ہوئے تھے جن کو راشن کے دفتر پر حملے کی صورت میں استعمال کیا جانا تھا۔ آسکر ــــ یسوع کا پہلا حکم تھا، "گھر کے باغیچے میں ہتھیار اور ایندھن دفن کر دیا جائے ۔ تمام بولٹ اور فائرنگ پن یسوع کے حوالے کر دی جائیں ۔ ہمارے ہتھیار مختلف نوعیت کے ہیں۔" جب لڑکوں نے چُرائے ہوئے تمغوں اور نشانات سے بھرا سِگار کا ایک ڈبا دکھایا تو میں مسکرایا اور کہا کہ اسے وہ لوگ لے جا سکتے ہیں، مگر مجھے چھتری بردار سپاہیوں کے چاقو لے لینے چاہییں تھے۔

اس کے بعد میرے سامنے خزانہ پیش کیا گیا۔ آسکر نے ان کو شمار کرنے کا حکم دیا اور بذاتِ خود اس کی تصدیق کی۔ گرد جھاڑنے والوں کا کُل نقد سرمایہ دو ہزار چار سو تیس رائج مارک تھا۔ یہ شمار 1944 کے ستمبر کی ابتدا میں تھا۔ جب 1945 کے وسط جنوری

میں 'کونیاف' اور 'زوخاف' نے 'وسٹولا' پر قبضہ کرلیا تو پنجی نے اس مال خانے کا اقرار کرلیا تھا اور ہم نے سارا مال خانہ اربابِ اقتدار کے حوالے کر دیا تھا۔ ضلعی عدالت کی بچ پر چھبیس ہزار رائج مارک گن کر ڈھیر کر دیے گئے تھے۔

میری فطرت کے مطابق، آسکر سارے آپریشن کے دوران پس منظر میں رہا۔ گرد جھاڑنے والوں کے رات کے نشانوں کے تعین کے لیے میں دن کے وقت اِسٹورٹی بیکر کے ہمراہ، یا اکیلا بھی جاتا تھا۔ میں نے اِسٹورٹی بیکر یا مورکان کو تنظیمی کام سونپ دیا تھا۔ رات ہونے کے بعد میں مدر ٹروزنسکی کے فلیٹ سے ہلتا بھی نہیں تھا۔ اب ہم خفیہ ہتھیار کی طرف آتے ہیں۔ میں اپنی خواب گاہ کے دریچے پر کھڑا ہو کر، پہلے سے بھی بہت دور، شہر کے دوسرے کنارے کھڑکیوں کو مسمار کرنے کی غرض سے اپنی آواز بلند کیا کرتا تھا۔ میں نے پارٹی کے کئی ہیڈ کوارٹروں اور چھاپے خانے کی کھڑکیوں کے شیشے مسمار کر دیے تھے جو راشن کارڈ چھاپتا تھا۔ اور ایک بار تو میں نے اپنے جنگجو ساتھیوں کے اصرار پر، مگر نا پسندیدگی کے ساتھ، ہائی اسکول کے پرنسپل کے فلیٹ کے باورچی خانے کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ ڈالے تھے، جس سے وہ ناراض ہو گیا تھا۔ یہ نومبر کا واقعہ تھا۔ جس زمانے میں V-1 اور V-2 راکٹ اُڑتے ہوئے انگلستان جاتے تھے، میری آواز 'لانگ فور' اور 'ہنڈن برگ ایلی' کے دورویہ پیڑوں کے اوپر سے پرواز کرتی، مرکزی ریلوے اسٹیشن اور پرانے شہر کو پار کرتی 'فلائشر گاسے' کے عجائب گھر کی مشہور چوبی شخصیت 'نی او بے' کو تلاش کرتی تھی، ہمارے لوگوں کو جس کا حکم دیا گیا تھا۔

میرے ساتھی اس کو تلاش نہیں کر سکے۔ ساتھ والے کمرے میں مدر ٹروزنسکی ساکت و سامت بیٹھی سر ہلایا کرتی تھی۔ ایک طرح تو ہم دونوں میں ایک قدرِ مشترک تھی؛ جب آسکر دور مار گانے میں مشغول ہوتا تو وہ دور دراز کے خیالات میں مگن ہوتی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے ہربرٹ کے لیے خدا کی جنت تلاش کی تھی اور اپنے بیٹے فرٹز کے لیے مرکزی سیکٹر کا محاذ۔ اس کو اپنی دور رہنے والی بڑی بیٹی گسٹے کا بھی خیال رکھنا پڑتا تھا، جس نے 1944 کے اوائل میں شادی کر لی تھی اور دور، 'ڈوسلڈارف' چلی گئی تھی، اس لیے کہ

وہیں ہیلڈ ویٹر کوسٹر کا گھر تھا؛ حالاں کہ وہ خود اپنا زیادہ تر وقت 'کورلینڈ' میں گزارتا تھا۔ بس صرف دو ہفتے کی گھر جانے کی چھٹی ملتی تھی جو گسیٹے اپنے لیے اور اس کو جاننے میں صرف کیا کرتی تھی۔

وہ پُرسکون شامیں ہوا کرتی تھیں۔ آسکر نے جو مدر ٹروزنسکی کے قدموں میں بیٹھا اپنے نقارے میں کچھ تبدیلیاں کر رہا تھا، ٹائل سے بنے چولھے کے دراز میں سے بھنا ہوا ایک سیب نکالا، اور اس جھرّیوں پڑے سیب کو لے کر، جو بوڑھی عورتوں اور بچوں کے لیے ہوتا ہے، اپنی اندھیری خواب گاہ میں غائب ہو گیا۔ اس نے کھڑکی پر لگے بلیک آؤٹ کا سیاہ کاغذ ذرا سا اُٹھایا، کھڑکی ذرا سی کھولی، بس اتنی کہ رات کی تھوڑی سی ٹھنڈک کمرے میں آ جائے۔ پھر اس نے نشانہ لیا اور اپنا ایک دور مار گانا روانہ کر دیا۔ وہ ستاروں کی طرف اپنا گانا نہیں بھیجتا تھا؛ کہکشاں اس کے راستے میں نہیں پڑتی تھی۔ اس کا گانا 'ونٹر فیلڈ پلاٹز' کی سمت کے لیے تھا، ریڈیو کی عمارت کے لیے نہیں، مگر اس بکس نما عمارت کے لیے، جس میں ہٹلر یوتھ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

جب موسم صاف ہوتا تو میرے کام میں مشکل سے ایک منٹ صرف ہوتا تھا۔ اس دوران کھلی کھڑکی سے بھنا ہوا سیب ذرا ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اس کو کھاتے ہوئے میں مدر ٹروزنسکی اور اپنے نقارے کی طرف واپس گیا، اور جلد ہی سونے چلا گیا، اس یقین کے ساتھ کہ جب آسکر سو رہا ہوگا، تو گرد جھاڑنے والے، یسوع کے نام پر، پارٹی کے خزانے لوٹتے ہوں گے، غذائی کارڈ، ربڑ کی مہریں اور ہٹلر یوتھ شب گشتی کے چھپے ہوئے فارم یا ارکان کی فہرست چراتے ہوں گے۔

صرف دل جوئی کی خاطر، میں نے اِسٹورٹی بیکر اور مورکان کو جعلی دستاویز کے ساتھ ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ کے کاروبار میں مشغول کر دیا تھا۔ ہمارے گروہ کے مرکزی دشمن ہٹلر یوتھ گشت والے تھے۔ میرے نزدیک سب ٹھیک تھا؛ اگر وہ اپنے مخالفین کو اغوا کرتے، ان کی گرد جھاڑتے اور فائر اسٹیلر کی طرح، جو اس کام کا ذمے دار تھا، ان کی گیندوں پر پالش کرتے۔

چوں کہ میں ان تمام مہمات سے لاتعلق تھا جو محض ابتدائیہ تھے جن سے اصل

منصوبوں کا پتا نہیں چل سکتا تھا، میں یقینی طور پر کہہ نہیں سکتا کہ وہ گرد جھاڑنے والے ہی تھے جنھوں نے ستمبر 1944 میں خوف ناک شخص بلمنت نیتبرگ' سمیت گشت کے افسران کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گاڑیوں کے پُل کے ذرا پہلے 'موتلاؤ' میں ڈبو دیا تھا۔

بہر حال، میں، آسکر-یسوع، جس نے گرد جھاڑنے والوں کو حکم دیا تھا کہ وہ ضروری سمجھیں تو تمام کہانیوں سے انکار کر دیں جو بعد میں عام ہو گئی تھیں: کہ گرد جھاڑنے والوں کے 'کولون' شہر کے ڈاکوؤں سے تعلقات تھے، کہ پولینڈ کے 'خلیر ہائیڈ' والوں کے ساتھیوں نے ہم پر زور ڈالا تھا، یا ہماری حرکت کا حکم دیا تھا۔ یہ سب محض داستان ہے۔

ہمارے مقدمے کے دوران ہم پر الزام تھا کہ ہیں جولائی والے سازشیوں سے ہمارے روابط تھے، اس لیے کہ پنچی کا باپ، آگسٹ فان پُٹ کلمر، فیلڈ مارشل رومیل سے بہت قریب تھا اور اس نے خودکشی کر لی تھی۔ جنگ کی ابتدا سے پنچی نے پانچ یا چھ بار سے زیادہ اپنے باپ سے ملاقات نہیں کی تھی اور اپنے عہدے کے نشان کی تبدیلی کا عادی ہونے کے بعد کافی دنوں تک اس سے نہیں ملا تھا۔ مقدمے کے بہت بعد ہی اُسے پہلی بار اپنے افسر کے احمقانہ پن کا پتا چلا تھا، اور اگر سچ کہا جائے تو ہمارے نزدیک یہ محض لاپروائی کا معاملہ تھا۔ جب اس کو پتا چلا تو شرم کے باعث اتنی بے شرمی سے رویا تھا کہ فائر اسٹیلر کو، جو اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، ججوں کے سامنے ہی اس کی گرد جھاڑنی پڑی تھی۔

ہماری سرگرمیوں کے دوران صرف ایک ہی بار کسی بالغ نے ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ شپ یارڈ کے کچھ کارکنوں نے، جن کے کمیونسٹوں سے روابط تھے اور میں ایک نظر دیکھ کر ہی بتا سکتا تھا کہ انھوں نے 'شیشاؤ' ڈاک یارڈ میں ہمارے تربیتی لوگوں کے ذریعے ہم سے رسوخ پیدا کرنے اور ہم کو سُرخ خفیہ تحریک میں تبدیل کرنا چاہا تھا۔ ہمارے تربیت یافتہ ناراض نہیں تھے، مگر ہمارے درمیان کے اسکول کے لڑکوں نے تمام سیاسی رجحانات کو رَد کر دیا تھا۔ ایئر فورس کے آگزیلری، مسٹر نے، جو سنکی تھا اور گروہ کا نظریہ ساز بھی، ہمارے اجتماعات میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا۔ "پارٹیوں سے ہمارا کچھ لینا دینا نہیں۔" اس نے علی الاعلان کہا تھا۔ "ہماری لڑائی والدین اور تمام بالغوں سے

ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ، ہمارے ساتھ ہیں یا ہمارے خلاف۔"

اس نے مسئلے کو بلا شبہ ذرا زیادہ سخت طریقے سے پیش کیا اور تمام اسکول کے لڑکوں نے اس سے اتفاق کیا تھا۔ مگر، نتیجہ کیا نکلا؟ گروہی تقسیم! شپ یارڈ کے تربیتی کارکنوں نے اپنا الگ کلب بنا لیا۔ مجھے ان کے الگ ہونے پر افسوس تھا۔ وہ اچھے کارکن تھے۔ اِسٹورٹی بیکر اور مورکان کے اعتراضات کے باوجود وہ خود کو گرد جھاڑنے والے ہی کہتے رہے۔ مقدمے کی کارروائی کے دوران — ان کا دھڑا بھی ہمارے ساتھ منتقی کر دیا گیا تھا — اُن پر شپ یارڈ میں ایک تربیتی آبدوز میں آگ لگانے کا الزام لگایا گیا۔ یو بوٹ کے ایک سو سے زیادہ کپتان اور دوسرے افسران آگ میں جاں بحق ہو گئے تھے جو نچلی منزل میں بھڑک اُٹھی تھی؛ یو بوٹ کے کارکن اپنے علاقوں میں پھنس گئے تھے اور جب ان کے اٹھارہ برس والے نچلے درجے کے افسران نے باہر کھلنے والی کھڑکیوں سے نکلنے کی کوشش کی تو ان کی کمریں پھنس گئیں اور آگ نے اُن کو پیچھے سے آ پکڑا۔ وہ لٹکے ہوئے چیخ رہے تھے اور اس عذاب سے نکالنے کے لیے ان کو گولی مار دینی پڑی تھی۔

اس آگ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ شاید وہ 'نعیشاؤ' کے تربیتی افراد تھے، یا 'ویسٹرلینڈ' سوسائٹی والے رہے ہوں گے۔ گرد جھاڑنے والے آتش زن لوگ نہیں تھے، گو میں نے، جو ان کا روحانی قائد تھا، اپنے نانا کوواچکی سے دو ایک جین ورثے میں پائی ہوں گی۔

مجھے وہ مستری اچھی طرح یاد ہے جس کا اُن دنوں 'نعیشاؤ' سے 'کیل' کے جرمن کارخانے میں تبادلہ کر دیا گیا تھا جو اس تقسیم سے پہلے ہم سے ملنے ہمارے تہہ خانے میں آیا تھا۔ 'فوشوال' کے جہاز قلی کے بیٹے 'ایرخ' اور 'ہورسٹ ہیزگز' اس کو ہمارے پاس لائے تھے۔ اس نے نہایت پیشہ ورانہ انداز میں ہمارے گودام کا معائنہ کیا، کسی بھی ہتھیار کے صحیح حالت میں نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کیا اور بے دلی سے چند الفاظ منظوری کے بھی کہے تھے۔ جب اس نے چیف سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو اِسٹورٹی بیکر نے فوراً اور مورکان نے کچھ تامل کے بعد، اس کو میرے پاس بھیج دیا۔ چناں چہ میرے پاس آتے ہی اس نے ایسا قہقہہ لگایا اور اتنی دیر تک ہنستا رہا تھا کہ عاجز ہو کر آ سکر تقریباً اس نتیجے پر

پہنچنے والا تھا کہ اس کی گرد جھاڑنے کے لیے اس کو گرد جھاڑنے والوں کے حوالے کر دیتا۔

"اس مختصر جانور کو آپ لوگ کس نام سے پکارتے ہیں؟" اس نے میرے کاندھے کی طرف اپنا انگوٹھا جھکاتے ہوئے مورکان سے کہا تھا۔

مورکان شرمندگی سے مسکرایا۔قبل اس کے وہ کچھ کہتا، اِسٹورٹی بیکر نے بد مزگی مگر اطمینان سے کہا تھا، "یہ ہمارا یسوع ہے۔"

مستری کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا، جس کا نام والٹر تھا؛ اس نے ہمارے اپنے ہیڈ کوارٹر ہی میں ہماری توہین کرتے ہوئے کہا، "بولو تم انقلابی ہو یا مذہبی گیت گانے والے لونڈے جو کرسمس کے کھیل کی تیاری کر رہے ہیں؟" اِسٹورٹی بیکر کی آستین سے کھٹاک سے چھاتا بردار سپاہیوں کے چاقو کا پھل نکل آیا؛ اس نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا، فائر اِسٹیکر کو اشارہ کیا، اور مستری کو سناتے ہوئے اپنے گروہ سے مخاطب ہوا، "سنا تم نے، ہم لوگ مذہبی گیت گانے والے لونڈے ہیں اور کرسمس کے کھیل کی تیاری کر رہے ہیں!"

مگر مستری کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا۔اس کے آنکھوں پر پٹی باندھ کر باہر نکال دیا گیا تھا۔چند دن بعد اسی والٹر نے ڈاک یارڈ کی ترمیمی کارکنوں کا اپنا الگ کلب بنا لیا، اور مجھے پورا یقین ہے یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے ترمیمی آبدوز میں آگ لگائی تھی۔

میرے خیال میں اِسٹورٹی بیکر نے صحیح جواب دیا تھا۔ہم لوگ سیاست میں دل چسپی نہیں رکھتے۔ایک بار ایسا ہوا کہ ہم لوگوں نے ہٹلر یوتھ کے گشت کرنے والوں کو اتنا ہراساں کیا تھا کہ وہ اپنے کمروں سے نکلتے ہی نہیں تھے، سوائے اس کے کہ وہ کبھی کبھی ریلوے اسٹیشن پر پچاس غیر ذمے دار نوجوان لڑکیوں کے کاغذات کی پڑتال کر لیا کرتے تھے، ہم نے اپنی سرگرمیوں کو مرکز کے گرجا گھروں میں منتقل کر دیا تھا اور جیسا کہ مستری نے کہا ہے، کرسمس کے کھیلوں کی تیاری کرنے لگے تھے۔

سب سے پہلے ہمیں 'شیشاؤ' کے انمول ترمیمی افراد کا بدل تلاش کرنا تھا۔ اکتوبر کے آخر میں، اِسٹورٹی بیکر نے فیلکس اور پال رینوارڈ بھائیوں کو سیکریڈ ہارٹ گرجا میں کوائر بوائز[مذہبی گیت گانے والے] بنانے کا وعدہ کر لیا تھا۔اِسٹورٹی بیکر نے ان کی

بہن لوسی کے ذریعے رابطہ کیا گیا تھا، جس کو میرے احتجاج کے بعد بھرتی کے جلسے میں شرکت کی اجازت دی گئی تھی۔انھوں نے میرے نقارے پر اپنے بائیں ہاتھ رکھ کر، جس کو وہ ناقابلِ علاج رومانوی لڑکے کی کسی قسم کی علامت سمجھتے تھے، حلف برداری کے الفاظ دہرائے تھے، جس کا متن اتنا فضول اور بازی گری سے پُر تھا کہ اب مجھے یاد بھی نہیں رہا۔

آسکر لوسی کے جلسے میں شریک تھا۔لوسی ایک ہاتھ میں ایک سینڈوچ لیے تھی جو ہلکے ہلکے لرزتی محسوس ہو رہی تھی، اس نے اپنے کندھے ہلائے اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا تھا۔اس کے لومڑی جیسے تکونے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا اور اس نے اپنی آنکھیں اسٹورٹی بیکر کی پشت پر مرکوز رکھی تھیں۔اچانک مجھے گرد جھاڑنے والوں کے مستقبل کے بارے میں خدشات پیدا ہو گئے تھے۔

ہم نے اپنے تہہ خانے کی تزئین و آرائش شروع کردی تھی۔کوائر بوائز کی مدد سے میں ضروری فرنیچر کی فراہمی کی نگرانی کر رہا تھا۔سینٹ کیتھرائن سے ہم نے سولھویں صدی کا نصف قامت کا جوزف [حضرت یوسف کا مجسمہ] لیا جو اصلی ثابت ہوا، چند شمع دان، کچھ وائن کے بڑے پیالے، دھات کی بنی بڑی رکابیاں اور گلاب پاش لیے، اور کارپس کرسٹی کا ایک بینر بھی خرید لیا تھا۔ایک رات ہم چرچ آف ٹرینٹی گئے تو وہاں سے لکڑی سے بنا دنگل بجاتا فرشتہ اُٹھا لائے تھے،فنی اعتبار سے جس کی کوئی قیمت نہیں تھی، اور ایک رنگین اور منقش پردہ، جو کسی پرانے کام کی نقل تھا، جس میں ایک خاتون کا نقش بنا ہوا تھا جو بہت نازک مزاج، باوقار اور فریبی نظر آتی تھی اور اس میں ایک سینگ والا دیو مالائی جانور بھی بنا ہوا تھا جس کو یونی کارن [ایک سنگھا] کہا جاتا ہے، جو بظاہر اس عورت کے زیرِ اثر تھا۔اُس خاتون کے تبسّم میں، اسٹورٹی بیکر کے مطابق، ایک قسم کی کھلنڈری ظالمانہ کیفیت تھی، جیسی کہ لوسی کے لومڑی جیسے چہرے پر چھائی ہوتی ہے اور میرا خیال تھا کہ میرا نائب اس یونی کارن کی طرح فرماں بردار نہیں ہو گا۔ہم نے یہ پردہ اپنے تہہ خانے کی پیچھے کی دیوار پر آویزاں کر دیا، پہلے جس پر موت کے سَر، کالے ہاتھ اور ایسی ہی فضولیات بنی ہوئی تھیں۔ جلد ہی یہ یونی کارن motif ہمارے مباحث پر چھایا محسوس

ہونے لگا تھا۔ اس دوران لوسی ہم سب سے گھل مل گئی تھی، جب چاہے آتی جاتی، اور میرے پیچھے ہنسی ٹھٹھا کرتی رہتی تھی۔ میں نے خود سے سوال کیا کہ ہمیں یہ دوسری، بُنی ہوئی لوسی لانے کی کیا ضرورت تھی، جو ہمارے مائیٹن کو یونی کارن میں تبدیل کرتی جا رہی ہے، جو بُنی ہوئی ہو یا زندہ، آسکر، یہ تمھارے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ گرد جھاڑنے والوں میں اکیلے تم ہی غیر معمولی اور منفرد ہو؛ تم تو انسانی یونی کارن ہو۔

مگر پھر ایڈ وینٹ کے دن آ گئے تھے، اور میں بہت زیادہ خوش تھا۔ ہم نے اطراف کے تمام گرجا گھروں سے محافلِ میلادِ مسیح کی تفصیلات جمع کرنی شروع کر دی تھیں اور جلد ہی وہ منقش پردہ ان کے پیچھے اس طرح چھپ گیا تھا کہ اس کا قصہ — جیسا کہ میں سمجھ رہا تھا — اپنی اہمیت کھو چکا تھا۔ وسط دسمبر میں رُنڈ اِسٹٹ نے 'آرڈینس' میں اپنی جارحیت کا آغاز کیا اور پھر ہم نے بھی اپنے بڑے وار کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔

کئی ہفتوں بعد میں نے ماریا کے ہمراہ دس بجے دن والے مذہبی اجتماع میں شرکت کی تھی، جو ماسیرات کی برہمی کے طفیل کیتھلک اثرات میں ڈوبا ہوا تھا۔ گرد جھاڑنے والے بھی میرے کہے سے پابندی سے گرجا گھر جانے لگے تھے۔ یہ ایک طرح سے اکٹھا ہونے کا طریقہ تھا۔ آخرش اٹھارہ دسمبر کی رات ہم سیکریڈ ہارٹ گرجا گھر میں گھس گئے تھے۔ گھسنا ایک اندازِ بیان ہے۔ کوائز بوائز کا شکریہ کہ ہم نے توڑ پھوڑ نہیں کی تھی، حتیٰ کہ آسکر بھی شیشہ شکنی سے باز رہا تھا۔

برف باری شروع ہو گئی تھی، مگر گرتے ہی برف پگھلتی جا رہی تھی۔ ہم نے تبرکات رکھنے کی جگہ کے پیچھے تین دستی ٹھیلے کھڑے کر دیے تھے۔ چھوٹے 'زین وانڈ' کے پاس مرکزی دروازے کی کنجی تھی۔ پہلے آسکر داخل ہوا اور یکے بعد دیگرے اس نے مقدس پانی کے فوارے تک لڑکوں کی قیادت کی جہاں اس کے کہنے پر وہ بلند شہ نشین کے سامنے جھکے تھے۔ تب میرے کہنے پر انھوں نے سیکریڈ ہارٹ والے یسوع پر ایک کمبل ڈال دیا تھا کہ اس کی نیلی نگاہ ہمارے کام میں مخل نہ ہو۔ باؤنسر اور مسٹر مقام کارپر، یعنی شہ نشین کی بائیں جانب، اپنے اوزار لیے موجود تھے۔ میلادِ مسیح کے تبرکات اور ہری بھری شاخوں

والے ہووے کو راستے سے ہٹاتا تھا۔ ہمارے پاس پہلے ہی ضرورت سے زیادہ چرواہے اور فرشتے، تمام بھیڑیں، گدھے اور گائیں تھیں۔ ہمارا تہہ خانہ فالتو اشیا سے بھرا ہوا تھا؛ صرف مرکزی اشیا کی کمی تھی۔ بیلی سارائیس نے شہ نشین سے پھول ہٹا دیے۔ ٹو ٹیلا اور تیجا نے قالین لپیٹ دیے۔ فادر اِسٹیلر نے اوزار نکال لیے تھے۔ آسکر، گدّے والی بنچ کے پیچھے گھٹنوں کے بل کھڑا کارروائی کی نگرانی کر رہا تھا۔

سب سے پہلے ہمیں جان دی بپٹسٹ اور اس کی رنگین پوستین کو آرے سے کاٹ کر نکالنا تھا۔ خوش قسمتی سے، ہمارے پاس لوہا کاٹنے کی بھی آری موجود تھی، اس لیے کہ پلاسٹر کے اندر انگلیوں کے برابر موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں جو بپٹسٹ لڑکے اور بادل کو جوڑے ہوئے تھیں۔ فادر اِسٹیلر نے آری چلائی۔ وہ ایک دانش ور کی طرح، یعنی اناڑی پن سے یہ کام کر رہا تھا۔ ایک بار پھر ہمیں 'شیشاؤ' کے تربیتی لڑکے یاد آ رہے تھے۔ اب اِسٹورٹی بیکر نے فادر اِسٹیلر کی جگہ لے لی تھی۔ وہ اس سے بہتر کام کر سکتا تھا، اور آدھ گھنٹے کی کھِس کھِس اور چیں چیں کے بعد ہم لڑکے بپٹسٹ کو گرانے میں کامیاب ہو گئے، جس کو ایک اونی کمبل میں لپیٹ دیا گیا۔ پھر ایک لمحے کے لیے ہم کلیسائی سکوتِ نیم شب میں سانس درست کرنے کے لیے رُکے۔

لڑکے یسوع کے مجسمے کو کاٹنے میں ہمیں ذرا زیادہ دیر لگی تھی، جس کا پورا کان کنواری کے زانو پر ٹکا ہوا تھا۔ باؤنسر، بڑا رین وانڈ اور لائن بارٹ پورے چالیس منٹ کام میں جتے رہے۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ مورکان کہاں غائب ہو گیا ہے؟ اُس کا خیال تھا کہ اگر اس کے ساتھی 'نو فارواسر' سے براہِ راست، گرجا گھر میں آ کر ہم سے ملے تو ہماری حرکات پر لوگوں کی توجہ کم ہو گی۔ اِسٹورٹی بیکر بے چین اور چو چڑا ہو رہا تھا۔ کئی بار وہ ریناوارڈ برادران سے مورکان کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔ جیسی کی ہمیں توقع تھی، لوسی کا تذکرہ بھی آیا۔ اِسٹورٹی بیکر نے سوال کرنا چھوڑ دیا، لائن بارٹ کے غیر مشاق ہاتھوں سے آری چھین لی اور تن دہی سے کام کرتے ہوئے آخری ضرب لگا کر، لڑکے یسوع کو اعزاز کے ساتھ زمیں بوس کر دیا۔

جیسے ہی انھوں نے یسوع کو لٹایا اس کے سر کے اطراف بنا ہوا حلقۂ نور ٹوٹ گیا۔ اِسٹورٹی بیکر نے مجھ سے معذرت کی۔ مشکل سے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے ۔۔۔ اس لیے کہ میں بھی عام قسم کی ہیجانیت کا شکار ہو چلا تھا ۔۔ میں نے ان سے سارے ٹکڑے اٹھانے کے لیے کہا، اور وہ سب ایک پیالے میں جمع کر دیے گئے۔ فائر اِسٹیلر کا خیال تھا کہ حلقۂ نور کو گوند سے جوڑا جا سکتا تھا۔ یسوع کو گدوں پر لٹا دیا گیا اور کمبل میں لپیٹ دیا گیا۔

ہمارا منصوبہ تھا کہ ہم کنواری کو کمر کے پاس سے کاٹیں گے اور دوسری کاٹ بادل اور اس کے پاؤں کے تلووں کے درمیان کی جائے گی۔ ہم بادل کو جہاں ہے وہیں چھوڑ دیں گے اور صرف ان تینوں کو، یسوع، کنواری کے دونوں ٹکڑوں اور لڑکے بپتسمت کو لے جائیں گے، اگر گاڑیوں میں سے کسی میں کافی جگہ ہوئی۔ ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ مجسمے ہماری توقع سے کم وزنی نکلے۔ پورا گروہ اندر سے کھوکھلا بنایا گیا تھا۔ ان کی دیواریں ایک انچ سے زیادہ موٹی نہیں تھیں، وزنی حصہ صرف لوہے کا ڈھانچا تھا۔

لڑکے تھک چکے تھے، بالخصوص فائر اِسٹیلر اور لائن ہارٹ۔ کام روکنا پڑا، اس لیے کہ دوسرے، جن میں رین وائڈ برادران شامل تھے، جنھیں آری سے کٹائی کرنی نہیں آتی تھی، ذرا دیر آرام کر سکیں۔ گروہ گدے دار بنچوں پر بیٹھا کانپ رہا تھا۔ اِسٹورٹی بیکر کھڑا اپنی مخملیں ہیٹ کو توڑ مروڑ رہا تھا، جو چرچ میں داخلے کے وقت جس کو اُتار لیا گیا تھا۔ ماحول میرے مزاج کے مطابق نہیں تھا، مگر کچھ کیا جانا تھا۔ لڑکے مذہبی تعمیرات کے اثرات اور پوری رات اور خالی پن سے پریشان تھے۔ کچھ مورکان کی غیر موجودگی سے بھی پریشان تھے۔ رین وائڈ برادران، اِسٹورٹی بیکر سے خوف زدہ تھے اور ایک طرف کھڑے اس وقت تک سرگوشی کرتے رہے، جب تک کہ اِسٹورٹی بیکر نے انھیں خاموشی سے کھڑا رہنے کا حکم نہیں دیا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میں آہستہ آہستہ، گہرا سانس لیتا ہوا دعا کے گدے سے اُٹھا اور سیدھا کنواری کے پاس گیا جو ابھی تک اپنی جگہ پر ہی تھی۔ اس کی آنکھیں جو جان کی طرف تھیں پلاسٹر کی سفید گرد سے اٹی، اب شہ نشین کے زینے پر تھیں۔ اس کی شہادت کی انگلی، جو یسوع کی طرف اشارہ کرتی تھی، اب خلا کی طرف اشارہ کر رہی تھیں، یعنی گرجا گھر کے

مرکز میں بائیں شہ نشین کے اندھیرے کی طرف۔ میں نے یکے بعد دیگرے قدم اٹھائے، پھر اِسٹورٹی بیکر کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے پلٹ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس کی اندر کی طرف دھنسی ہوئی آنکھیں بہت دور تھیں جب تک کی فائز اِسٹیلر نے اُن کی طرف انگلی سے اشارہ نہیں کیا تھا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا مگر ایسے اعتماد سے، جیسا میں نے اُن میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پہلے تو وہ سمجھ نہیں سکا تھا، پھر وہ سمجھا یا جزوی طور پر سمجھا اور آہستہ آہستہ بلکہ بہت آہستہ آگے بڑھا، مگر اس نے شہ نشین کے سارے زینے ایک قدم ہی میں پار کر لیے اور پھر مجھ کو کنواری کے زانو پر پڑے سفید اور بُری طرح کٹے ہوئے بُرادے پر دھکا دیا جس نے لڑکے یسوع کے عقب کے نشان ڈال دیے تھے۔

اِسٹورٹی بیکر فوراً ہی واپس پلٹا اور ایک ہی قدم میں وہ فرش میں لگی پتھر کی سِلوں پر تھا۔ اس عمل میں وہ تقریباً اپنے تصورات کی دنیا میں واپس چلا گیا تھا، مگر پھر اس نے اپنے آپ کو ایک بار جھٹکا دیا، اور اس کی آنکھیں تنگ ہو گئیں۔ گدے دار بنچوں پر بیٹھے ہمارے رفقائے کار مجھے قدرتی طور پر یسوع کی جگہ پر اس طرح بیٹھا دیکھ کر، گویا میں اپنی عبادت کرانے کے لیے بالکل تیار ہوں، اپنے جذبات چھپا نہیں سکے تھے۔

وہ فوراً ہی میرے ارادے کو بھانپ گیا کہ اس نے مجھے میری توقع سے زیادہ دے دیا تھا۔ اس نے نارسیس اور بلیو بیرڈ کو حکم دیا کہ وہ اپنی چکا چوند کر دینے والی روشنیاں مجھ پر اور کنواری پر روشن کر دیں۔ جب روشنیوں کی تیز چمک نے مجھے تقریباً اندھا کر دیا تو اس نے سُرخ روشنی کی کرنوں کو میری طرف کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس نے رین وانڈ برادران کو طلب کیا اور ان سے سرگوشی میں کانفرنس کی۔ وہ اس کے کہے پر عمل کرنے میں تامل کر رہے تھے کہ فائز اِسٹیلر گروہ کی طرف بڑھا اور اپنے مٹھیوں کی ہڈیوں کے جوڑوں کا مظاہرہ کرنے لگا، جو گرد جھاڑنے کے لیے بالکل تیار تھیں؛ برادران نے ہتھیار ڈال دیے اور فائز اِسٹیلر اور مسٹر کے ساتھ تبرکات کے کمرے میں غائب ہو گئے۔ آسکر نے پُر سکون انداز میں انتظار کیا، اپنے نقارے کو تیار کیا اور اسے بالکل حیرت نہیں ہوئی جب مسٹر، جو ایک قد آور شخص تھا، پادری کا لباس زیب تن کیے واپس آیا، جس کے ساتھ کوائر بوائز

کی سُرخ اور سفید پوشاک میں ملبوس دونوں رین وانڈ بدوران بھی تھے۔ وِگر کا لباس پہنے فائر اِسٹیلر وہ سب کچھ ساتھ لایا تھا کسی اجتماع کے لیے جس کی ضرورت ہوتی ہے، اور بادل پر رکھ کر واپس چلا گیا۔ بڑا رین وانڈ خلعت اُٹھائے ہوئے تھا، اور مسٹر فادر ویکنے کی اچھی خاصی نقل بنا ہوا تھا۔ پہلے تو اُس نے کسی اسکول کے لڑکے جیسی تُرش روئی کا مظاہرہ کیا، مگر پھر الفاظ اور اشارات کی رَو میں بہتے ہوئے، ہم سب کو اور بالخصوص مجھ کو، مذہبی اجتماع کرنے کی پیش کش کی، جو محض سادہ لوح مزاج نہیں تھا، جس کو ہمارے مقدمے کے دوران بھی مسلسل مذہبی اجتماع کہا گیا تھا، مگر یقینی طور پر یہ سیاہ [نقلی] ہوگا۔

ان تینوں نے مل کر بتدریج عبادت سے شروعات کی: گدے دار بنچوں اور پتھر کی سلوں پر بیٹھے لڑکے جھکے، اپنے سینوں پر صلیب کے نشان بنائے اور مسٹر نے، جو الفاظ سے واقف تھا، کوائر بوائز کی ماہرانہ مدد سے اجتماع شروع کر دیا۔ میں نے نقارہ بجانا شروع کر دیا، ابتدایئے کے دوران احتیاط سے، مگر آخری مرحلے میں زور شور سے۔ ''حمد و ثنا اس خدا کی جو سب سے بزرگ اور سب سے برتر ہے!'' — میں نے آقا کی اپنے نقارے پر ثنا کی، اجتماع کو دعا کے لیے طلب کیا، دیر تک یسوع کے خطوط (Epistle) کے لیے نقارے پر یک سُرا نغمہ بجاتا رہا، میری حمد بالخصوص کامیاب رہی۔ میں نے دیکھا کہ لڑکے میرے اعتراف عقائد پر یقین کر رہے تھے: پانی میں ملی روٹی اور شراب کی روایتی پیش کش کے دوران، جو مسٹر پیش کر رہا تھا، میں ہلکی آواز میں نقارنوازی کرتا رہا۔ پھول کٹورے کے ساتھ خوش بو کی شراکت کے دوران میں دیکھ رہا تھا کہ مسٹر سلیقے میں دست شوئی کس طرح کراتا ہے۔ ''دعا کرو میرے بھائی بہنو کہ خدا میری قربانیوں کو قبول کرے'' میں نے یہ الفاظ سُرخ روشنی کی دمک میں نقارے پر بجائے، اور Transubstantiation [روٹی اور شراب کی یسوع مسیح کے جسم اور خون میں قلب ماہیت] تک جاری رکھا: یہ میرا جسم ہے۔ میرے حکم پر مسٹر نے ''آؤ کہ ہم دعا کریں'' مناجات (Oremus) کی — گدی دار بنچوں پر بیٹھے لڑکوں نے مالک سے دعا کے دو مختلف طریقے پیش کیے تھے، مگر مسٹر، پروٹسٹنٹ اور کیتھولک، دونوں کو ایک ہی عشائے ربانی میں شامل ہونے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کھانا ختم ہونے سے

پہلے ہی میرے نظارے نے اجتماعی دعائے اعتراف (Confiteor) پیش کی۔ کنواری نے اپنی اُنگلی نظارہ نواز آسکر کی جانب کی۔ دراصل اب میں یسوع کی جگہ لے چکا تھا۔ دعائی اجتماع بالکل گھڑی کی طرح ہو رہا تھا۔ مسٹر کی آواز کبھی بلند ہوتی اور کبھی ڈوب جاتی۔ کتنے شاندار طریقے سے وہ دعائے خیر کو بیان کر رہا تھا: بخشش، نجات اور معافی۔ "جاؤ تم کو آزاد کر دیا گیا ہے۔" جب تک یہ لفظ کہے گئے، مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو روحانی رہائی کا احساس ہو رہا تھا۔ جب دنیوی (secular) بازو گرا تو گرد جھاڑنے والے گروہ نے آسکر اور یسوع میں اپنے اعتقاد کی تصدیق کر دی۔

مجھے اجتماع کے دوران موٹروں کی آواز سنائی دی، اسٹورٹی بیکر نے بھی سر گھما کر دیکھا تھا۔ صرف ہم لوگوں کو ہی حیرت نہیں ہوئی تھی، جب ہمیں آوازیں سنائی دی تھیں، بھاری بھاری ایڑیوں والے سامنے سے، بغلی دروازوں سے اور تبرکات کے کمرے کی جانب سے ہم پر ٹوٹ پڑے تھے۔ اسٹورٹی بیکر نے مجھے کنواری کے زانو سے اُٹھانے کی کوشش کی ۔ میں نے اسے ہٹا دیا ۔وہ سمجھ گیا، سر ہلایا اور لڑکوں کو گھٹنوں کے بل جھکے رہنے دیا تھا۔ وہ اسی حالت میں رُک کے پولیس کا انتظار کرتے رہے۔ پھر وہ لڑکھڑانے لگے، چند نے اپنا توازن کھو دیا، کچھ دونوں گھٹنوں پر گر پڑے، مگر اس وقت تک خاموش کھڑے رہے جب تک کہ قانون نے تین سمتوں سے بائیں بازو کی شہ نشین کو گھیر نہیں لیا تھا۔

پولیس کے پاس بھی فلیش لائٹ تھیں، مگر انھوں نے سفید روشنیاں پسند کیں۔ اسٹورٹی بیکر اُٹھا، اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، آگے بڑھ کر روشنی میں آیا، اور اپنی مخمل کی ٹوپی فائر اسٹیلر کے حوالے کی، جو اَب بھی جھکا ہوا تھا۔ فلیش لائٹ کے بغیر کسی بڑے سے سایے—فادر ویکنے— کے اطراف گھوم کر اسٹورٹی بیکر نے ایک دُبلے پتلے جسم—لوسی رین وانڈ— کو پکڑا جس نے آزاد ہونے کی بہت کوشش کی۔وہ فوجیوں جیسی گول ٹوپی والے تکونے چہرے کو تھپڑ مارتا، مکے لگاتا اور اور نوچتا رہا جب تک کہ ایک پولیس والے نے اُسے ایسا دھکا مارا کہ وہ گدے والی بنچ تک لڑھکتا چلا گیا۔ کنواری پر بیٹھا، میں نے ایک پولس والے کو حیرت سے کہتے سُنا "اوہ خدایا، جیسکے، یہ تو اپنے صاحب کا بیٹا ہے۔"

آسکر کے لیے یہ قدرے سکون کی بات تھی کہ میرا نائب پولیس چیف کا بیٹا نکلا۔ میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی، بلکہ میں تو ٹمٹماتا ہوا سہ سالہ بن گیا، جس کو آوارہ بدمعاشوں نے گمراہ کردیا تھا۔ مجھے صرف تھپکیوں اور تحفظ کی ضرورت تھی۔ فادر ویکنے نے مجھ کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیا۔

پولیس والوں کے علاوہ سب خاموش تھے۔ لڑکے پکڑ پکڑ کر باہر لے جائے گئے۔ فادر ویکنے چکرا کر گرنے ہی والا تھا کہ وہ بیٹھ گیا، مگر پہلے اس نے مجھے اپنے ساز و سامان کے قریب ہی، فرش پر رکھ دیا تھا۔ ہتھوڑوں اور توڑ پھوڑ، اُکھاڑ پچھاڑ کرنے والے دوسرے اوزار کے ڈھیر کے پیچھے مجھے سینڈوچ سے بھری ایک جھابی نظر آئی، جو ہماری مہم کی ابتدا سے پہلے باؤنسر نے بنائی تھی۔ میں وہ جھابی لے کرلوس کے پاس گیا جو اپنے ہلکے سے کوٹ میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس نے مجھے اور جھابی دونوں کو اُٹھا لیا اور ایک لمحے بعد ہی اس کے ہاتھوں میں سینڈوچ دبی ہوئی تھی۔ میں اس کے سُرخ تھپڑ کھائے، پھولے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا: سیاہ شگافوں سے جھانکتی بے چین آنکھیں، منہ چلاتا ہوا تکون چہرہ ایک گھویا، سانچ کھاتی ہوئی، ایک بد کردار چڑیل اور اس وقت بھی جب وہ کچھ کھا رہی تھی، زیادہ دُبلی، زیادہ بھوکی، زیادہ تکونی، زیادہ گڑیا جیسی ہوتی جارہی تھی۔ یہ منظر میرے ذہن پر کسی مہر کی طرح لگ گیا تھا۔ اب کون ہے جو اس مثلث کو میرے ذہن سے مٹائے گا؟ یہ کب تک میرے اندر سانچ کھاتا، آدمیوں کو کھاتا، اور اس طرح مسکراتا رہے گا، جیسے صرف مثلث اور ریپردوں پر بنی مؤنث یونی کارن کو سدھانے والے ہی مسکرا سکتے ہیں۔

جس وقت دو انسپکٹر اس کو پکڑے لے جارہے تھے، اِسٹورٹی بیکر نے اپنے خون بھرا چہرہ گھما کرلوس اور آسکر کی طرف دیکھا تھا۔ میں بھی اس کو جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کو کبھی نہیں پہچانا۔ جب میرے سارے سابق ساتھی چلے گئے تب مجھے بھی لے جایا گیا تھا، مگر میں سینڈوچ کھاتی خاتون کے بازوؤں میں تھا۔

وہاں باقی کون رہ گیا تھا؟ فادر ویکنے، ہماری مُلمّع لالٹینیں، جو ابھی سُرخ چمک رہی تھیں اور وہ سارے لباس جو فادر مسٹر اور اس کے مددگاروں نے اُتارے تھے۔ شراب

کے پیالے اور چار ستونوں اور چار دَر والے تعزیے جیسا چھوٹا سا ڈھانچا (ciborium) شہ نشین کے زینوں پر پڑا ہوا تھا۔ آری سے کٹے ہوئے جان، اور آری سے کٹے ہوئے یسوع اب بھی کنواری کے پاس ہی تھے، جس کو ہمارے ہیڈ کوارٹر کے تہہ خانے میں یونی کارن خاتون کا پاسنگ بنا تھا۔

آسکر کو، میں جس کو اب بھی یسوع ہی کہتا ہوں، سماعت کے لیے عدالت میں پیش کیا گیا جو آسکر یعنی یسوع کی بریت پر ختم ہوا تھا۔

# چیونٹیوں کی شاہراہ

ذرا تصور کیجیے، نہانے کا ایک حوض ہے جس میں ہلکے آسمانی رنگ کے ٹائل لگے ہوئے ہیں۔ سورج کی کرنوں سے کجلائے کئی کسرتی جوان جسم پانی میں ہیں، اور ان ہی جیسے کجلائے جسم کے مرد اور عورتیں حوض کے اطراف ٹائلوں سے بنے کناروں پر رکھی کرسیوں پر نیم دراز ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر ہلکی ہلکی موسیقی بج رہی ہے۔ صحت مند بیزاری ہے، لاتعلق جنسیت ہے۔ ٹائل چکنے ہیں مگر ان پر پھسلتا کوئی نہیں۔ ادھر اُدھر کچھ ممنوعاتی احکام درج ہیں۔ ان کی کوئی ضرورت نہیں، اس لیے کہ نہانے والے گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے آتے ہیں، اور ایسے غیر معمولی کام کے لیے دوسرے جگہیں بنی ہوئی ہیں۔ کبھی کبھار دس فٹ لمبے اسپرنگ بورڈ سے کوئی پانی میں غوطہ لگاتا ہے، مگر پانی میں موجود کوئی توجہ نہیں دیتا۔ نہ ہی ٹائل لگے فرش پر رکھی کرسیوں پر نیم دراز لوگوں کی آنکھیں ان کے ہفتہ وار رسائل سے اُٹھتی ہیں۔ اچانک تازہ ہوا آتی ہے! جی نہیں، تازہ ہوا نہیں، بلکہ ایک جوان مرد، آہستہ آہستہ، اعتماد کے ساتھ پائدان پر قدم رکھتا، تیس فٹ بلند غوطہ مینار پر چڑھتا ہے۔ رسالے نیچے ہو جاتے ہیں، آنکھیں اوپر ہو جاتی ہیں، تکیوں پر سہارا لیے ہوئے جسم بڑے ہونے لگتے ہیں۔ ایک جوان عورت اپنی آنکھوں پر ہاتھ سے سایہ کرتی ہے، کوئی بھول جاتا ہے کہ وہ کیا سوچ رہا تھا، الفاظ حلقوں میں اٹک جاتے ہیں، عشقیہ الفاظ سے شروع ہونے والا جملہ اچانک درمیان ہی میں رُک جاتا ہے — اس لیے کہ مردانہ قوت سے پُر، کسرتی جسم،

اسپرنگ بورڈ پر اوپر نیچے کودنے لگتا ہے، نلوں سے بنے جنگلے پر سہارا لے کر جھکتا ہے، آہستہ آہستہ سے بھرپور نظر نیچے ڈالتا ہے، اپنے سُرین کی باوقار حرکت سے جنگلے سے ہٹ کر اسپرنگ بورڈ پر واپس جاتا ہے، ہر قدم کے ساتھ اسپرنگ بورڈ اوپر سے نیچے کی طرف لہراتا ہے، مرد کی آنکھیں ملی جلی نہانے والی ٹوپیوں پر ہیں: زرد، سبز، سفید، سُرخ ......زرد، سبز، سفید، سُرخ......زرد، سبز...... یہی وہ جگہ ہے جہاں اس کے دوستوں کو بیٹھنا ہوگا: ڈورس اور ایریکا شلگر؛ اور جٹا ڈینیلو اپنے عاشق کے ساتھ، جو واقعی اس کے قابل نہیں۔ وہ ہاتھ ہلاتے ہیں، جٹا بھی ہاتھ ہلا دیتی ہے۔ اپنے توازن سے ذرا پریشان، وہ مرد بھی اپنا ہاتھ ہلا دیتا ہے۔ سب شور مچاتے ہیں۔ وہ کیا چاہ سکتے ہیں؟ کہ وہ مرد آگے بڑھے...... وہ شور مچاتے ہیں......غوطہ لگاؤ...... جٹا بھی چلا کر کہتی ہے......غوطہ لگاؤ۔ مگر وہ اس قسم کے ارادے سے تو اوپر نہیں گیا تھا۔ وہ صرف دیکھنا چاہتا تھا کہ اوپر سے منظر کیسا ہوتا ہے اور پھر زینہ بہ زینہ، آہستہ آہستہ واپس اُتر آتا ہے، مگر اب وہ سب چلّا رہے ہیں، اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی: غوطہ لگاؤ!......چلو، غوطہ لگاؤ!......لگاؤنا!

آپ اتفاق کریں گے کہ اگرچہ غوطہ مینار سے جنت چند قدم صرف چند قدم قریب ہو جاتی ہے، اس پر ہونے کی کیفیت ذرا پریشان کن ہوتی ہے۔ جنوری 1945 میں گرد جھاڑنے والے اور میں، حالاں کہ وہ نہانے کا موسم نہیں تھا، کچھ اسی قسم کی کیفیت میں تھے۔ ہم اوپر چڑھ گئے تھے، اور ہم سب ایک ساتھ غوطہ مینار پر جمع تھے، اور نیچے پانی بغیر حوض کے اطراف گھوڑے کے ناپ جیسی میز پر جج، گواہان اور عدالت کے منشی، سب سنجیدہ بیٹھے ہوئے تھے۔

جھولتے ہوئے، بغیر حفاظتی جنگلے کے اسپرنگ بورڈ پر، اسٹورٹی بیکر آگے بڑھا۔

''کودو!'' جج ایک زبان ہو کر چلّائے۔

مگر اسٹورٹی بیکر کودنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر، گواہوں کی بیچ سے، دُبلا پتلا نسوانی جسم، چُنّٹوں سے بھرا لہنگا اور باویریائی انداز کا جیکٹ پہنے، کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ ہلکے زرد رنگ کا تھا، جس کے بارے میں اب بھی میرا یہی خیال ہے کہ وہ تکونا تھا؛ ہدف کی طرف اشارہ کرنے والے نشان کی طرح اُٹھا:

لوسی رین وانڈ چلائی نہیں۔اس نے سرگوشی میں کہا، "کودو......اِسٹوری بیکر......کودو!

اِسٹورٹی بیکر نے چھلانگ لگا دی۔لوسی واپس گواہوں کی بنچ پر بیٹھ گئی، اور اپنے باوردیائی کوٹ کی آستینیں نیچے، مٹھیوں تک کھینچ لی۔

مورکان لنگڑاتا ہوا اِسپرنگ بورڈ پر آیا۔ججوں نے کودنے کا حکم دیا۔مگر مورکان کودنا نہیں چاہتا تھا؛ اپنے ناخنوں کو شرمندگی سے دیکھا، لوسی کو آستین چڑھانے، مٹھی کو اون سے باہر نکالنے اور سیاہ فریم والے تکونے چہرے کو اظہار کرتے دیکھنے کا انتظار کر رہا تھا، جس کے افقی شگاف سے آنکھیں نظر آتی تھیں۔پھر اس نے اُس تکون کی طرف غصے سے چھلانگ لگادی، مگر تکون کے باہر جا گرا۔

اوپر جاتے وقت، فائز اِسٹیلر اور پنچی کہ زیادہ دوست نہیں تھے، اِسپرنگ بورڈ پر بھی وہ کھے بازی کرنے لگے تھے۔پنچی کہ گر دجھڑائی ہو چکی تھی، اور اس وقت بھی، جب وہ کود رہا تھا، فائز اِسٹیلر اسے جانے نہیں دے رہا تھا۔

باؤنسر، ریشمی لامبی پلکوں والے نے کودنے سے پہلے اپنی ہرنی جیسی افسردہ آنکھیں بند کر لی تھیں۔ہوائی فوج کے اس آگزیلری کو کودنے سے پہلے اپنی وردی اُتارنی پڑی تھی۔

رین وارڈ برادران کو بھی جنت کی طرف لے جانے والی چھلانگ میں کوائر بوائز کی وردی پہنے رہنے کی اجازت نہیں تھی۔گواہوں کی میز پر، جنگ کے زمانے کی اونی جیکٹ پہنے بیٹھی لوسی کو، جو جوان لوگوں کو کودنے کی ترغیب دے رہی تھے، یہ ہرگز قابلِ قبول نہیں تھا۔

تاریخ سے انحراف کرتے ہوئے بیلی سارلیس اور ناریس پہلے کودے، ان کے بعد نوٹیلا اور تیجا۔پھر بلیو برڈ کودا، لائن ہارٹ کودا؛ بعد میں سپاہی: نوز، بُھمین، ٹینکر، پائپر، مسٹر ڈیاٹ، یاتا گان اور کوپر وغیرہ کودے۔

آخری کودنے والا اِسٹوشل تھا، ہائی اسکول کا طالب علم، جس کی آنکھیں اتنی بھینگی تھیں کہ اس کی طرف دیکھ کر سر چکرانے لگتا تھا۔وہ حادثاتی طور پر اس گروہ میں شامل تھا۔اب پلیٹ فارم پر صرف یسوع باقی رہ گیا تھا۔ججوں نے اس کو آسکر ماتسیرات کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کودنے کا حکم دیا، مگر یسوع نے حکم ماننے

سے انکار کردیا۔ سخت اور اٹل لوسی، ٹریل، کاندھوں کے درمیان موتسارٹ جیسی چٹیا جھلاتی، گواہوں کی بیچ سے کھڑی ہوگئی، اپنے سوکھڑ والے بازو پھیلائے، اور بظاہر ساکت ہونٹوں سے سرگوشی کی: "کودو...... پیارے یسوع...... اب کود بھی جاؤ نا......" اس وقت مجھے اس تیس فٹ لمبے جھولتے ہوئے اسپرنگ بورڈ کی مہلک ترغیب کا احساس ہوا؛ میرے گھٹنوں کے جوڑوں میں چھوٹے چھوٹے، بھورے بھورے بلی کے بچے کلبلائے: میرے پاؤں کے تلووں میں خارپشت جوڑے کھانے لگے: میری بغلوں میں ابابیلیں اُڑنے لگیں: اور قدموں میں نہ صرف یورپ، بلکہ ساری دنیا دکھائی دینے لگی۔ 'لوزون' جزیرے پر امریکی اور جاپانی رقص کناں، اس تیزی سے رقص کناں ہوئے کہ ان کی آڑی اور گول آنکھیں دونوں اپنی وردیوں کے بٹن گنوا بیٹھیں۔ مگر عین اسی وقت اسٹاک ہوم کا ایک درزی شام کو پہننے والے ایک خوب صورت جوڑے میں بٹن ٹانک رہا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن برما کے ہاتھیوں کو ہر کیلیبر کے کارتوس کھلا رہا تھا۔[ پیرو کے دارالحکومت] 'لیما' میں ایک بیوہ اپنے طوطے کو "Caramba" کہنا سکھا رہی تھی۔ بحراوقیانوس کے بیچ، گوتھک گرجا گھروں کی طرح سجے، دو طیارہ بردار جہاز آمنے سامنے کھڑے اپنے اپنے ہوائی جہازوں کو ہوا میں بھیج رہے تھے، اور یکے بعد دیگرے دونوں ہی غرق ہو گئے۔ ہوائی جہازوں کے اُترنے کی جگہ نہیں رہ گئی، وہ ہوا میں—— بالکل علامتی طور پر فرشتوں کی طرح—— چکر لگاتے، ایندھن جلانے پر مجبور تھے۔ اور یہ سب 'ہاپارانڈا' میں ٹرام گاڑی کے ایک کنڈکٹر کی وجہ سے ہو رہا تھا جو ابھی ابھی ڈیوٹی ختم کر کے چلا گیا تھا۔ اپنے فرائنگ پین میں انڈے توڑ کر ڈال رہا تھا، دو انڈے اپنے لیے اور ایک اپنی منگیتر کے لیے، جو کسی لمحے آنے والی تھی، اور پوری شام اس کے ساتھ گزارنے کا منصوبہ بنا چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ کونیف اور ژوخوف کی فوجوں سے پیش قدمی کی توقع کی جا سکتی ہے؛ جب کہ آئرلینڈ میں بارش ہو رہی تھی، وہ 'وِستولا' کی جانب سے داخل ہوئے، وارسا پر دیر سے قبضہ ہوا اور کونیگس برگ میں بہت جلد، اس کے باوجود وہ پناما میں ایک عورت کو، جو اپنے گیس کے چولھے پر دودھ گرم کر رہی تھی اور اس کے اُبلنے کو روکنے میں ناکام ہو گئے تھے، جس کے پانچ بچے تھے اور ایک ہی شوہر تھا۔

ناگزیر طور پر واقعات کے دھاگے خود بخود گچھیروں اور گانٹھوں کی صورت لپٹنے لگتے ہیں، جس کو تاریخ کا پارچہ کہا جاتا ہے۔ میں نے اور بھی سرگرمیاں دیکھی ہیں، جیسے انگوٹھے پر انگوٹھا گھمانا۔ تیوری چڑھانا، اوپر نیچے دیکھنا، ہاتھ ملانا، بچے بنانا، جعل سازی کرنا، بجلی بجھانا، برش سے دانت صاف کرنا، لوگوں کو گولی مارنا، اور بچوں کے پوتڑے بدلنا، جن کی پوری دنیا میں مشقیں کی جاتی ہیں، مگر ویسی ہی مہارت سے نہیں۔ اتنی ساری مفید مطلب حرکات سے میرا سر پانی میں پیرنے لگا، تو میں نے مقدمے کی پیروی پس پشت ڈال دی جو میرے اعزاز میں غوطہ مینار کے قدموں تلے جاری تھی۔ ''کودو...... پیارے یسوع...... کودو'' کنواری، لبھانے والی لوسی نے سرگوشی کی۔ وہ شیطان کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے لوسی کو ایک سینڈوچ دی۔ لوسی نے بصد شوق اس میں اپنے دانت گاڑ دیے، مگر اس کی عفت ختم نہیں ہوئی۔ ''کود جا— پیارے یسوع— کود جا'' لوسی نے سینڈوچ کھاتے ہوئے اور مجھ کو اپنا مثلث پیش کرتے ہوئے، جو اب بھی سالم تھا سرگوشی میں کہا تھا۔

میں نے کودنے سے صاف انکار کر دیا تھا، آپ کبھی مجھے کسی غوطہ مینار سے کودتے نہیں دیکھیں گے۔ یہ آسکر کا آخری مقدمہ نہیں تھا۔ کئی کوششیں کی گئی ہیں، ایک تو حال ہی میں، مجھے کودنے پر راغب کرنے کی کوشش ہوئی تھی۔ ایک مقدمے میں— جس کو میں یسوع کا ring-finger trial کہنا پسند کروں گا— بغیر پانی کے حوض کے مقدمے کے افراد سے زیادہ لوگ صرف دیکھنے کے لیے آئے تھے۔ وہ گواہوں کی بنچوں پر یہ طے کر کے بیٹھے تھے کہ وہ آخری وقت تک میرے مقدمے کا لطف اٹھائیں گے۔

مگر میں نے بالکل پروا نہیں کی۔ میں نے بغلوں میں پر پھیلاتی ابابیلوں کے گلے گھونٹ دیے، پاؤں تلے جوڑے کھاتے خارپشتوں کو کچل دیا، گھٹنوں میں کلبلاتے بلی کے بچوں کو بھوکا مار دیا۔ کودنے کی سرفرازی کو حقارت سے ٹھکراتے ہوئے میں اکڑتا ہوا جنگلے کی طرف گیا، اچھل کر سیڑھی پر پہنچا، نیچے اترا، سیڑھی کے ہر پائدان کو میرے اس یقین کو مستحکم کرنے دیا کہ غوطہ مینار صرف چڑھنے ہی کے لیے نہیں، کودے بغیر بھی اترنے کے کام بھی آتا ہے۔

نیچے ماریا اور ماتسیرات میرا انتظار کر رہے تھے۔ فادر ویکنے نے مجھے دعا دی،

حالاں کہ میں نے اس کی درخواست نہیں کی تھی۔ گریچن شیفلر میرے لیے سرما کے موسم کے لیے چھوٹا سا کوٹ اور کیک لائی تھی۔ گرٹ بڑا ہو گیا تھا اور اس نے مجھے باپ یا بھائی ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ میری نانی کو واچکی اپنے بھائی وِنسنٹ کا بازو پکڑے ہوئے تھی۔ وہ دنیا کو اچھی طرح جانتا ہے، اور بے سروپا فضول باتیں کر رہا تھا۔

ہم عدالتی کارروائی کے بعد باہر نکل رہے تھے کہ سادہ لباس میں ایک افسر نے ماتسیرات سے رابطہ کیا، اس کو ایک کاغذ پکڑایا اور کہا، ''مسٹر ماتسیرات، واقعی آپ کو سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ اس بچے کو باہر نکلنے نہیں دینا چاہیے۔ آپ نے دیکھا کہ یہ کس قدر بھولا بھالا اور بے یار و مددگار بچہ ہے۔ ہر وقت بدنام لوگوں میں شامل ہونے پر تیار رہا کرتا ہے۔''

ماریا رو پڑی، اور مجھے میرا نقارہ دے دیا، فادر ویکنے نے مقدمے کے دوران جس کی حفاظت کی تھی۔ ہم مرکزی اسٹیشن کے قریب والے ٹرام کے اسٹاپ گئے۔ راستے کے کچھ آخری حصے ماتسیرات مجھے گود میں لے گیا تھا۔ میں اس کے کاندھے کے اوپر سے پیچھے دیکھتا ایک تکونے چہرے کی تلاش میں تھا، اور سوچ رہا تھا کہ اسے بھی تو غوطہ مینار پر چڑھنا تھا، آیا اسٹورٹی بیکر اور مورکان کے بعد وہ بھی کودی تھی یا نہیں یا میری طرح اس نے بھی سیڑھی سے واپس اُترنے کی سبیل کر لی تھی۔

آج تک میں عام جگہوں پر کسی بڑی چڑیا جیسے جسم والی، نہ خوب صورت اور نہ بد صورت، لڑکی کو تلاش کرتے رہنے کی عادت ترک نہیں کر سکا ہوں، جو ہمیشہ آدمیوں کو کاٹنے کے چکر میں رہتی ہے۔ حتیٰ کہ میں اسپتال کے اپنے پلنگ میں بھی خوف زدہ ہو جاتا ہوں جب برونو کسی غیر متوقع ملاقاتی کی آمد کا اعلان کرتا ہے۔ میں اس بات سے خوف زدہ رہتا ہوں کہ کسی دن لوسی کسی بدمعاش چڑیل کے روپ میں آدھمکے گی اور آخری بار مجھے کود پڑنے پر راضی کرنے کی کوشش کرے گی۔

دس دن تک ماتسیرات سوچتا رہا کہ وہ خط پر دستخط کر کے پبلک ہیلتھ کی وزارت کو واپس بھیجے یا نہیں۔ جب گیارہویں دن اس نے خط پر دستخط کیے اور اس کو ڈاک کے حوالے کیا تو پورا شہر توپ کے گولوں کی زد میں تھا اور اس بات کا امکان کم تھا کہ خط

زیادہ دور نہیں جا سکے گا۔مارشل روکوسوسکی کی فوج کا ہراول دستہ 'یلینگ' پہنچ گیا تھا۔ وائس کی کمان میں جرمن سیکنڈ آرمی نے 'دانتسگ' کے اطراف کے پہاڑوں پر مورچے بنا لیے تھے۔تمام لوگوں کی طرح ہم نے بھی تہہ خانے میں رہنا شروع کر دیا تھا۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں، ہمارا تہہ خانہ دُکان کے نیچے تھا۔آپ غسل خانے کے اُس پار، راہداری سے ہوتے ہوئے تہہ خانے کے دروازے سے اٹھارہ سیڑھیاں اُتر کر، ہائیلانڈ کے اور کاٹر کے تہہ خانوں کے ساتھ، مگر شلاگر کے تہہ خانے سے ہو کر ہمارے تہہ خانے پہنچ سکتے تھے۔بوڑھا ہائیلانڈ ابھی تک گھر ہی میں رہ رہا تھا۔مگر مسز کاٹر، گھڑی ساز لاؤبشاد، آئیکس میاں بیوی، شلاگر میاں بیوی چند بنڈل اٹھا کر غائب ہو گئے تھے۔بعد میں یہ کہانی گشت کر رہی تھی کہ وہ اور ان کے ساتھ الیگزانڈر اور گریچن شیفلر، بالکل آخری دن ایک تفریحی جہاز پر سوار ہو کر یا تو 'اسٹیٹن' یا 'لیوبیک' پہنچ چکے ہوں گے یا کسی بارودی سُرنگ سے ٹکرا گئے ہوں گے۔ بہر حال اس عمارت کے نصف فلیٹ اور تہہ خانے خالی تھے۔ہمارے تہہ خانے میں دُکان کے کاؤنٹر کے پیچھے خود بخود بند ہو جانیوالے خود کار دروازے کے ذریعے ایک اور داخلہ تھا۔لہٰذا ماتسیرات اپنے تہہ خانے میں کیا لاتا کیا لے جاتا تھا، کسی کو علم نہیں ہو پاتا تھا۔ ورنہ، جنگ کے زمانے میں کھانے پینے کے سامان کی ذخیرہ اندوزی برداشت نہیں کی جاتی تھی۔وہ خشک اور گرم کمرہ خشک مٹر اور لوبیا، نوڈل، چینی، مصنوعی شہد، گندم کے آٹے اور مارجرین سے بھرا تھا۔سویڈن کی ڈبل روٹیوں سے بھرے بکس Crisco کی پیٹیوں کے اوپر رکھے تھے۔ ماتسیرات ایک ہنر مند انسان تھا۔اس نے سارے شیلف خود لگائے تھے، جن پر پھلوں اور ترکاریوں سے بھرے ٹین کے ڈبوں کے انبار تھے۔چند عمودی الماریوں کے طفیل، گریف کے اصرار پر، جو ماتسیرات نے جنگ کے برسوں کے درمیان سقف اور فرش کے درمیان لگا دی تھیں، یہ گودام کسی ہوائی حملے کی پناہ گاہ جیسا محفوظ ہو گیا تھا۔کئی بار ماتسیرات نے ان کو ہٹانا چاہا تھا، اس لیے کہ ہوائی حملے کم ہو گئے تھے، مگر ہوائی حملے کا وارڈن گریف احتجاج کرنے کے لیے موجود نہیں تھا، ماریا کا اصرار تھا کہ اس کو اسی طرح رہنے دیا جائے۔وہ ننھے کُرٹ کا اور کبھی کبھی میرا بھی تحفظ چاہتی تھی۔

جنوری کے آخری دنوں، پہلے ہوائی حملے کے دوران بوڑھے ہائی لانڈ اور ماتسیرات نے اکٹھے کوشش کی تھی کہ مدر ٹروزِنسکی کو اس کی کرسی سے اٹھا کر تہہ خانے میں پہنچا دیا جائے، مگر شاید اس کی درخواست پر یا اس کو لے جانے کی کوشش کو ترک کرنے کی غرض سے اسے فلیٹ میں کھڑکی کے پاس بیٹھے چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک دن اندورنِ شہر بڑے ہوائی حملے کے بعد ماریا اور ماتسیرات نے اس بوڑھی عورت کو نوٹے جبڑوں اور ٹکٹکی لگائی آنکھ کو اس حال میں دیکھا گویا آنکھ میں کوئی بھڑ گھس گئی ہو۔ خواب گاہ کا دروازہ قلابون سے اٹھا کر اسے باہر نکالا گیا۔ بوڑھا ہائیلانڈ اپنے اوزار اور چند تختے لیے آیا، جو زیادہ تر پیٹیوں کو کھول کر نکالے گئے تھے۔ ماتسیرات کی دی ہوئی ڈربی سگریٹ پیتے ہوئے اس نے مدر ٹروزِنسکی کے جسم کی ناپ لی۔ اس کام میں آسکر نے اس کی مدد کی تھی۔ دوسرے لوگ اپنے اپنے تہہ خانوں میں غائب ہو گئے، اس لیے کہ گولا باری پھر شروع ہو گئی تھی۔ بوڑھا ہائیلانڈ جلدی میں تھا، اس کے ذہن میں ایک مستطیل بکس ہی بنانا تھا، مگر آسکر کا اصرار تھا کہ تابوت کو روایتی شکل کا ہونا چاہیے۔ میں نے تختوں کو تھاما تاکہ ان کو میری تفصیلات کے مطابق کاٹا جائے، اور ایسا تابوت بنے جو پاؤں کی جانب مخروطی شکل کا ہو، جیسا ہر انسانی جسم طلب کرنے کا حق رکھتا ہے۔

ایک نفیس قسم کا تابوت تیار ہو گیا تھا۔ لینا گریف نے مدر ٹروزِنسکی کو غسل دیا، الماری سے ایک دھلا ہوا نائٹ گاؤن نکالا۔ اس کے ناخن تراشے، بنائی کرنے والی تین سلائیوں کی مدد سے اس کے بال سنوارے۔ مختصر یہ کہ مدر ٹروزِنسکی مرنے کے بعد بھی دیکھنے میں بھورے رنگ کی چوہیا جیسی لگتی تھی، جس کو تمام عمر آلو کے پین کیک کھلائے گئے ہوں۔ بمباری کے دوران وہ چوہیا اپنی کرسی میں بیٹھی اکڑ گئی تھی اور اس کے گھٹنوں نے سیدھا ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ قبل اس کے کہ اس کے تابوت کا ڈھکنا بند کیا جاتا، جوں ہی چند منٹ کے لیے ماریا کمرے سے باہر گئی ہائیلانڈ نے مجبوراً اس کی ٹانگیں توڑ دیں۔ بدقسمتی سے سیاہ رنگ کا نہیں، صرف زرد رنگ کا پینٹ میسر تھا۔ مدر ٹروزِنسکی کو فلیٹ سے باہر سیڑھی سے، بغیر پینٹ کیے، مگر مخروطی شکل کے تابوت میں لے جایا گیا۔ آسکر اپنا نقارہ لیے، تابوت کے

ڈھکنے پر، برابر فاصلے پر، تین بار لکھے الفاظ Vitello Margarine-Vitello Margarine-Vitello Margarine: پڑھتا پیچھے پیچھے چلا۔ یہ الفاظ مدرٹروزنسکی کی گھریلو چربی کی پسندیدگی کی گواہی تھے۔اس لیے کہ وہ ہمیشہ Vitello مارجرین استعمال کرتی تھی جو نباتی چربیوں سے بنائی جاتی ہے، مکھن سے اچھی ہوتی ہے، اس لیے کہ مارجرین تازہ رہتی ہے، صحت بخش اور غذائیت سے بھرپور ہوتی ہے۔اور کھانے والے کو باذوق بناتی ہے۔

بوڑھے ہائیلانڈ نے گریف سبزی فروش کے دستی ٹھیلے پر رکھا اور اس کو 'لوزن اشتراسے'، 'میرین اشتراسے' اور 'ہینس موئلر وگ' سے ہوتے ہوئے، جہاں دو مکانوں میں آگ لگی ہوئی تھی، خواتین کی کلینک کی طرف لے گیا۔ننھے گرٹ کو بیوہ گریف کے ساتھ ہمارے تہہ خانے میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ماریا اور ماتسیرات ٹھیلے کو دھکیل رہے تھے، آسکر تابوت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، اس کی خواہش تھی کہ وہ تابوت پر چڑھ جائے، مگر اس کی اجازت نہیں دی گئی۔سڑکیں مشرقی پروشیا اور ڈیلٹا سے آئے ہوئے مہاجرین سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔اسپورٹس پیلس کے پاس کی زیرِ زمین سڑک سے جانا ممکن نہیں تھا۔ماتسیرات کا مشورہ تھا کہ پارک کے 'کازاڈیم' سے ایک ٹرنگ کیوں نہ کھودی جائے۔ماریا کو یا بوڑھے ہائیلانڈ کو یہ خیال پسند نہیں آیا جو مدرٹروزنسکی ہی کی عمر کا تھا۔میں بھی مخالف تھا، مگر نئی قبرستان پہنچنے کی کوئی امید نہیں تھی، اس لیے کہ اسپورٹس پیلس سے 'ہنڈن برگ ایلی' تک تمام راستے فوجی گاڑیوں کے علاوہ سب کے لیے بند کر دیے گئے تھے۔اس طرح اس چوہیا کو ہربرٹ کے پہلو میں دفن کرنا ممکن نہیں تھا اس لیے ہم نے 'اسٹیفن پارک' میں اس کے لیے جگہ پسند کی جو 'ے وائزے' سے زیادہ دور نہیں تھی۔

میدان کی زمین جمی ہوئی تھی۔ماتسیرات اور بوڑھا ہائیلانڈ باری باری کلھاڑے کی مدد سے کھدائی کر رہے تھے اور ماریا پتھر کی بنچوں کے اطراف اُگی ہوئی عشق پیچاں بیل کی صفائی کی کوشش کر رہی تھی، کہ اس دوران چپکے سے، آسکر 'ہنڈن برگ ایلی' کی طرف کھسک گیا۔کیا اژدھام تھا! کچھ ٹینک بلندیوں سے اور ڈیلٹا سے پسپا ہو رہے تھے، کچھ کو کھینچ کر واپس لایا جا رہا تھا۔پیڑوں سے — وہ شاید، اگر مجھے صحیح یاد ہے، لنڈن نامی

پیڑ تھے— فوجی اورعوامی ملیشیا کے لوگ لٹکے ہوئے تھے۔ ان کی جیکٹوں سے وفتی کے ٹکڑے بندھے ہوئے تھے جن پر بڑے الفاظ میں 'غدار' لکھا ہوا تھا۔ میں نے ان لٹکے ہوئے افراد کے تشنجی چہروں کو دیکھا اور میرے ذہن میں پھانسی دیے گئے عام لوگوں کے چہرے گھوم گئے، بالخصوص سبزی فروش گریف کا چہرہ۔ وہیں نوجوانوں کے پورے پورے گروہ وردیوں سمیت لٹکائے گئے تھے، جن کی وردیاں ان کے جسم سے بڑی تھیں، کئی بار میں تو سمجھا کہ مجھے اِسٹورٹی بیکر نظر آ گیا ہے— مگر رسّی میں لٹکے سارے نوجوان ایک ہی جیسی صورت کے لگے۔ پھر بھی، میں نے خود سے کہا، اچھا تو اب انھوں نے اِسٹورٹی بیکر کو لٹکا دیا ہے، تو میں نے سوچا، شاید لوسی رین وارڈ بھی اسی طرح لٹکا دی گئی ہوگی۔

اس خیال نے آسکر کو مہمیز کر دیا۔ اس نے دونوں جانب کے پیڑوں پر اس بڑی چہرے والی، لنگی لڑکی کی تلاش شروع کر دی اور اس دوران ٹینکوں کے درمیان سے سڑک بھی پار کی تھی، مگر اس طرف بھی صرف سپاہی اور عوامی ملیشیا کی وردی میں ملبوس بوڑھے اور اِسٹورٹی بیکر جیسے جوان بھی لٹکے نظر آئے تھے۔ مایوسی کے عالم میں، تباہ شدہ فور سیزن ریستوران تک میں چلتا چلا گیا، کبھی کبھی پلٹ کر دیکھ بھی لیتا تھا۔ جب میں مدرٹروژنسکی کی قبر کے کنارے، عشق پیچاں کی اور زمین پر پڑی خشک پتیوں کی صفائی کرتی ماریا کی مدد کر رہا تھا، اس وقت بھی، میرے تصور میں، تمام تر تفصیل کے ساتھ لٹکی ہوئی لوسی ہی تھی۔

ہم ٹھیلے کو سبزی کی دُکان پر واپس نہیں لے گئے۔ بوڑھے ہائیلانڈ نے اس کے ٹکڑے کر دیے تھے اور سب کاؤنٹر کے پاس ڈھیر کر دیے گئے تھے۔ ''ہو سکتا ہے کہ ہمیں ٹھیلے کی پھر ضرورت ہو'' ماتسیرات نے کہا تھا، ''اس طرح یہ محفوظ رہے گا۔'' تب اس نے بوڑھے کو ڈربی سگریٹ کی تین ڈبیاں دیں۔

بوڑھے نے کچھ نہیں کہا مگر تقریباً خالی شیلف سے نوڈل کی کئی تھیلیاں اور چینی کی تین تھیلیاں اٹھا کر ساتھ لیتا گیا۔ وہ اپنی نمدے کی چپلوں میں واپس گیا تھا، جو اس نے دفن کے وقت پہن رکھی تھیں۔ ماتسیرات نے شیلف پر رکھے بقیہ مال کو تہہ خانے میں منتقل کر دیا۔

اس کے بعد ہم اپنے بل سے بہت کم نکلا کرتے تھے۔ زِنکا برگ، پیٹس رگس

ڈارف' اور 'شیڈلٹز' کے اطراف تک روسی پہنچ گئے تھے۔اب کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ بلندیوں پر قابض ہو چکے تھے، اس لیے کہ وہ براہِ راست شہر پر گولے برسا رہے تھے۔اندرونِ شہر اور بیرونِ شہر، پُرانا شہر، نیا شہر اور پُرانا نیا شہر، نشیبی شہر اور اسپائس سٹی — جنھیں بنانے میں سیکڑوں برس لگ گئے تھے، جلانے میں صرف تین دن لگے۔ڈانتسِک پر نازل ہونے والی یہ پہلی آگ نہیں تھی۔صدیوں سے Pomerellians, Brandenburgers, Teutonic Knights, پولش، سوئیڈش، اور دوسری بار پھر پروشیائی، فرانسیسی اور سوئیڈش، بلکہ جرمن بھی ہر چند سال بعد تاریخ لکھ رہے تھے کہ ڈانتسِگ شہر جلا دیے جانے کے قابل شہر ہے۔اور اب روسی، پولش، جرمن اور انگریز ایک ساتھ مل کر شہر کی گوتھک تعمیرات کو سوویں بار جلا رہے تھے۔'ہُک اسٹریٹ'، 'لانگ اسٹریٹ'، 'براڈ اسٹریٹ'، 'بِگ ویور اسٹریٹ'، 'لٹل ویور اسٹریٹ' کو شعلوں کی زبانیں چاٹ رہی تھیں؛ 'توبیاس اسٹریٹ'، 'باؤنڈ اسٹریٹ'، 'اولڈ سٹی ڈچ'، 'آؤٹر سٹی ڈچ'، پشتے کی دیواریں اور 'لانگ برج' سب جل رہے تھے۔لکڑی سے بنا 'کرین گیٹ' بالخصوص نفیس آگ پیش کر رہا تھا۔'بریچ میکر اسٹریٹ' پر آگ خود بلند آواز بریچ کے کئی جوڑے ناپ چکی تھی۔سینٹ میری کا گرجا گھر، اندر باہر، جل رہا تھا، اس کی تکونی رنگ دار شیشوں والی کھڑکیوں سے تقریباتی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔جن گھنٹوں کو، سینٹ کیتھرائن، سینٹ جان، سینٹ بریجٹ، سینٹ باربرا، سینٹ ایلزبیتھ، سینٹ پیٹر اور سینٹ پال، ٹرینٹی اور کارپس کرسٹی سے نکالا نہیں گیا تھا اپنے گھنٹا گھروں ہی میں، بغیر کسی تقریب کے، قطرہ قطرہ پگھل کر ختم ہو گئے تھے۔بِگ مِل میں سُرخ گیہوں پیسا جا رہا تھا، بُچر اسٹریٹ سے اتوار کے روسٹ کی بو آ رہی تھی۔میونسپل تھیٹر ایک عظیم کھیل 'آتش زن کا خواب' پیش کر رہا تھا۔شہر کے بزرگوں نے آگ بجھانے والوں کی تنخواہوں میں، آگ ختم ہونے سے پہلے کی تاریخوں سے، تنخواہ بڑھانے کا فیصلہ کر دیا تھا۔'ہولی گھوسٹ اسٹریٹ' ہولی گھوسٹ کے لیے جل رہی تھی۔فرانسسکن خانقاہ سینٹ فرانسس کے نام پر جل رہی تھی جو آگ سے محبت کرتا تھا اور اس کے گیت گایا کرتا تھا۔'اَور لیڈی اسٹریٹ' باپ اور بیٹے دونوں کے نام پر ایک ساتھ جل رہی تھی۔شاید یہ

بتانا ضروری نہیں کہ لکڑی بازار، کوئلہ بازار اور بھوسا بازار سب جل کر خاکستر ہو گئے تھے۔بیکر اسٹریٹ میں سارے تنور اور ان کے ساتھ ڈبل روٹیاں اور رول بھی جل گئے تھے۔'ملک پیچر اسٹریٹ' میں دودھ اُبل گیا تھا۔صرف ویسٹ پروشین فائر انشورنس بلڈنگ نے، خالص علامتی وجوہ کی بنا پر، جلنے سے انکار کر دیا تھا۔

آسکر کو آگ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ جب ماتسیرات بھاگ کر سیڑھیاں چڑھتا ڈاتبنگ کی آگ کا نظارہ کرنے گیا تھا میں تہہ خانے ہی میں ٹھہرا رہا، میں نے جلد آگ پکڑ لینے والی اپنی تمام اشیا دو چھتی میں رکھ دی تھیں۔میں نے پہرا کے دیے ہوئے نقاروں میں سے آخری نقارے کو اور گوئٹے/راسپوتین کی کتاب کو بچانے کا تہیہ کر لیا تھا۔اس کتاب کے صفحات کے درمیان میں نے ایک پنکھا، جو مکڑی کے جالے جیسا نازک اور نفاست سے پینٹ کیا گیا تھا، محفوظ کر رکھا تھا، جسے روزویدا اپنی زندگی کے دنوں میں بڑے وقار سے جھلا کرتی تھی۔ماریا تہہ خانے ہی میں ٹھہری رہی۔مگر ننھا کُرٹ میرے اور ماتسیرات کے ساتھ آگ دیکھنے چھت پر جانا چاہتا تھا۔اگرچہ وہ اپنے بیٹے کے قابو سے باہر اصرار سے خفا تھا، آسکر نے خود سے کہا کہ اس نے آگ سے دلچسپی اپنے نکڑ نانا، میرے پَر نانا، کوواجچکی آتش زن سے ورثے میں پائی ہو گی۔ ماریا نے کُرٹ کو تہہ خانے ہی میں رکھا، اور مجھے ماتسیرات کے ساتھ اوپر جانے کی اجازت تھی۔ میں اپنا مال و متاع لیے اوپر گیا، دو چھتی کی کھڑکی کے ذریعے باہر نظر کی، اور یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ ہمارے پُرانے قابلِ احترام شہر میں اچانک کتنی توانائی آ گئی ہے۔

جب گولے قریب گرنے لگے تو ہم نیچے چلے گئے۔بعد میں ماتسیرات ایک بار پھر اوپر جانا چاہ رہا تھا، مگر ماریا نے جانے نہیں دیا۔وہ گیا نہیں مگر بیوہ گریف کو آگ کی تفصیل بتانے کے دوران رونے لگا تھا۔ایک بار پھر وہ فلیٹ میں گیا، ریڈیو کھولا، مگر کچھ بھی نہیں نکلا۔ خاص خبروں کا تو ذکر ہی کیا، جلتے ہوئے ریڈیو اسٹیشن کی لکڑیوں کی چیخ تک سنائی نہیں دی۔

ماتسیرات تہہ خانے کے بیچ، اپنی گیلس سے کھیلتا کسی بچے کے جیسا حیران پریشان کھڑا تھا، جو فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ وہ سانتا کلاز پر یقین کرتا رہے؛ اور ایسا پہلی بار ہوا تھا

کہ اس نے آخری فتح کے بارے میں اپنے شبہات کا اظہار کیا تھا۔ماریا کے مشورے پر اس نے اپنے کالر سے پارٹی کی پِن نکال لی تھی، مگر وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس سے کس طرح چھٹکارا ہو؛ اس لیے کہ تہہ خانے کا فرش کانکریٹ کا بنا تھا؛ لینا گریف اسے لینے پر تیار نہیں تھی؛ ماریا نے اس کو آلو کی سرما کی فصل میں دفن کردینے کا مشورہ دیا تھا، مگر آلو محفوظ نہیں تھے، وہ اوپر جانے سے خوف زدہ ہو رہا تھا، اس لیے کہ وہ جلد پہنچنے والے تھے۔وہ راستے میں تھے۔اور جب اس نے دو چھتی سے جھانک کر دیکھا تھا تو وہ 'برنٹاؤ' اور 'آلیوا' تک پہنچ چکے تھے۔اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس پن کو ہوائی حملے سے بچنے والی ریت میں کیوں چھپا نہیں دیا تھا، اس لیے کہ اگر یہ مل گئی تو انھیں بہترین بہانہ مل جائے گا۔اس نے پن کو کانکریٹ پر پھینک دیا، گویا اس کو کچل ڈالنا چاہتا تھا، اس کا مشوف بنا دینا چاہتا تھا، مگر گرٹ اور میں، دونوں ایک ساتھ اس کی طرف لپکے۔میں اس تک پہلے پہنچ گیا تھا اور یہ میرے قبضے میں تھی، جب گرٹ نے مجھے مکے مارنے شروع کر دیے، جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتا تھا جب کچھ حاصل کرنا چاہتا تھا، میں نے اس کو اپنے بیٹے کو اس لیے نہیں دیا کہ میں اس کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے کہ آپ روسیوں سے مذاق نہیں کر سکتے۔آسکر کو راسپوتین کی پڑھائی سے یاد آیا، اور جب گرٹ مکے مار رہا تھا اور ماریا ہم کو الگ کرنے کی کوشش کر رہی تھی، میں سوچ رہا تھا کہ وہ سفید روسی، یا عظیم روسی، قزاق یا جارجیائی، کالمک یا کریمیائی تاتار، روتھینیا کے یا یوکرائن کے یا شاید کرغزستان کے ہوں گے اور اگر آسکر اپنے بیٹے کے مکوں کے دباؤ میں آکر اسے گرٹ کو دے دیتا ہے..... بیوہ گریف کی مدد سے ماریا ہم دونوں کو الگ کر سکی تھی۔میں فاتحانہ انداز میں پن اپنی مٹھی میں دبائے ہوئے تھا۔ماتسیرات خوش تھا کہ اس کی جان چھوٹ گئی۔ماریا چیختے گرٹ میں مصروف تھی۔کھلی پن میرے ہاتھ میں پیوست ہو گئی تھی۔مجھے یہ شے کبھی پسند نہیں آئی اور اب بھی پسند نہیں تھی۔جس وقت میں اس کو ماتسیرات کے جیکٹ کے پیچھے لگانا چاہ رہا تھا — مجھے اس کی پارٹی سے کیا مطلب تھا — عین اس وقت وہ ہمارے اوپر، دُکان میں داخل ہو گئے تھے، اور عورتوں کے شوروغل کے باعث تہہ خانے

میں بھی پہنچ گئے۔

جس وقت انھوں نے تہہ خانے کا خود کار دروازہ اُٹھایا تھا، یوسن میرے گوشت میں پیوست تھی۔ میرے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا سوائے اس کے کہ میں ماریا کے لرزتے گھٹنوں کے قریب بیٹھ کر چیونٹیوں کی طرف دیکھ رہا تھا، جنھوں نے سرما کے آلوؤں سے، کانکریٹ کے فرش سے گزرتی، چینی کے بورے تک جاتی ایک فوجی شاہراہ بنا لی تھی۔ وہ بالکل عام سے سفید روسی، تھوڑی سی نسلی ملاوٹ والے ہیں—میں نے خود سے کہا اور عین اسی وقت چھ یا سات، بڑی بڑی آنکھوں اور ٹامی گن سمیت فوجی، سیڑھی پر ظاہر ہوئے۔ اس تمام شور وغوغا کے درمیان یہ اطمینان کی بات تھی کہ روسی فوج کی آمد سے چیونٹیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ وہ اب بھی آلو اور چینی میں دل چسپی رکھتی تھیں، باوجود اس کے کہ ٹامی گن والے لوگوں کے نزدیک ان کی فتوحات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی تھیں۔ مجھے یہ بالکل ٹھیک معلوم ہوا، کہ بالغ لوگوں کو پہلے ہاتھ اُٹھا دینے چاہییں۔ یہ بات مجھے نیوز ریلوں سے معلوم ہوئی تھی، یہی انداز میں نے پولش ڈاک خانے کے زوال کے وقت دیکھا تھا۔ مگر گرٹ کو بالغوں کی نقل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس نے میری مثال لی ہوتی، اپنے باپ کی—اور اگر اپنے باپ سے نہیں تو چیونٹیوں سے سیکھا ہوتا۔ فوراً ہی تین مستطیل وردی والوں کی توجہ لینا گریف کی طرف ہو گئی، اور اس وقت تک کے بے حرکت منظر میں کچھ جان سی پڑ گئی۔ لینا گریف کے منہ سے، جو اپنی طویل بیوگی اور اس سے قبل کے کچھ خالی برس بعد مشکل سے اپنی اچانک مقبولیت کی توقع کر سکتی تھی، حیرت کی چند چیخیں نکل گئیں مگر اس نے فوراً ہی خود کو ایسے مشغلے کے لیے تیار کر لیا تھا جسے وہ تقریباً بھلا چکی تھی۔

میں راسپوتین کی کتاب میں پڑھ چکا تھا کہ روسی بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ بات بالکل سچ ہے۔ ماریا خواہ مخواہ لرز رہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ان چاروں روسیوں نے، بجائے اس کے وہ اپنی اپنی باری لگاتے، گرٹ کو بیوہ گریف کی گود میں بیٹھا کیوں چھوڑ دیا تھا؛ وہ حیرت سے ان کو بچے سے کھیلتے، اور ڈاڈا ڈا کہتے، اس کے رخسار کو چھوتے، اور اُسے بھی ایک آدھ تھپکی دیتے دیکھ رہی تھی۔

کسی نے مجھے اور میرے نقارے کو فرش سے اٹھالیا؛ اب میں چیونٹیوں کا مطالعہ نہیں کر پا رہا تھا اور اپنے زمانے کی زندگی کا ان کی با مقصد صنعت سے تقابل نہیں کر پا رہا تھا۔میرا نقارہ میرے پیٹ پر جھول رہا تھا اور وسیع مسام والی موٹی موٹی روسی انگلیوں کو نقارے پر ایک آدھ تھاپ لگاتے دیکھ رہا تھا، جن پر کوئی رقص بھی کر سکتا تھا؛ میرے خیال میں کسی بالغ کے لیے یہ عمل بُرا نہیں تھا۔آسکر اپنی ہنر مندی دکھانا پسند کرتا، مگر یہ کام اس لیے ممکن نہیں تھا کہ ماتسیرات کی پارٹی کی بوسن ابھی تک اس کے ہاتھ میں پیوست تھی۔

ایک پُر سکون ماحول، جس کو محفوظ و آرام دہ کہا جا سکتا ہے ہمارے تہہ خانے پر طاری تھا۔بیوہ گریف زیادہ بلکہ بہت زیادہ خاموشی سے، اور پھیل کر، یکے بعد دیگرے، ان تین روسیوں کے نیچے لیٹتی ۔جب ان میں سے ایک اپنا کام ختم کر چکا، تو آسکر کو پسینے میں شرابور جوان، ترچھی آنکھوں والے آدمی کے، جو بلا شبہ کالمک تھا، حوالے کر دیا گیا۔بائیں ہاتھ سے مجھے سنبھالتے ہوئے، اس نے دائیں ہاتھ سے، ماتسیرات کے بالکل سامنے، اپنے پتلون کے سامنے کے بٹن بند کیے تھے۔ماتسیرات کے نزدیک کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ بالکل خاموش لائپزگ اسٹیو سے بجری شیلف کے سامنے ہاتھ اُٹھائے، اپنے ہاتھوں کی لکیریں دکھاتا کھڑا رہا، مگر کوئی اس کی لکیریں پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ماریا نے پہلا روسی لفظ سیکھ لیا تھا، اور لرزتے ہوئے وہ ہنسی بھی تھی، شاید وہ اپنا ہارمونیم بھی بجانے لگتی اگر اس وقت اس کی پہنچ میں ہوتا۔اس کے گھٹنوں کا لرزنا بند ہو گیا تھا۔

آسکر کو، جس کا مزاج کم لچک دار تھا اور اب چیونٹیوں کی جگہ کسی اور چیز کی تلاش میں تھا، بھورے کتھئی رنگ کے کیڑوں کی ایک پوری آبادی مل گئی تھی، جو میرے کالمک کے کالروں کے کنارے گھوم پھر رہی تھیں۔میں ان میں سے ایک کو پکڑ کر دیکھنا چاہتا تھا، اس لیے کہ میں نے جوؤں کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا، گوئٹے میں اتنا نہیں جتنا کہ راسپوتین میں دیکھا تھا، مگر کسی ایک جوں کو ایک ہاتھ سے پکڑنا ذرا مشکل ہوتا ہے، اس لیے میں نے پارٹی کی بوسن استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔آسکر کا خیال ہے کہ اس مرحلے پر اسے اپنے اس عمل کی تشریح کر دینی چاہیے۔وہ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا تھا؛

بٹن مجھ میں پیوست تھی اور جوں پکڑنے میں مزاحم ہو رہی تھی۔کالنک کا سینہ پہلے ہی تمغوں اور نشانات سے بھرا ہوا تھا۔اس لیے میں نے اپنا معمولی طور پر بند کیا ہوا ہاتھ ماتسیرات کی طرف بڑھایا، جو میرے پہلو میں کھڑا تھا۔

آپ کہہ سکتے ہیں تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا،مگر شاید مجھے بھی جواب دینے کا حق ہے کہ ماتسیرات کو میرا ہاتھ پکڑنا نہیں چاہیے تھا۔

بہرحال، اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے اس شے سے چھٹکارا مل گیا،مگر دھیرے دھیرے ماتسیرات پر خوف کا غلبہ ہونے لگا تھا، جب اپنی انگلیوں کے درمیان اسے پارٹی کا نشان محسوس ہو رہا تھا۔اب، جب کہ میرا ہاتھ آزاد ہو گیا تھا میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا کہ اس نے بٹن سے کیا سلوک کیا۔جوؤں کا پیچھا کرنے سے پریشان، آسکر نے چیونٹیوں پر توجہ دینے کی کوشش کی،مگر وہ ماتسیرات کے ہاتھ کی ایک تیز حرکت کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکا۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا تھا، میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ عقل مندی اسی میں تھی کہ اس چھوٹی رنگین تکونی شے کو وہ اپنی مٹھی میں ہی دبائے رکھتا۔

مگر وہ تو جلد از جلد اس سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا اور با جود اپنے زرخیز دماغ کے جس کا ایک باورچی، اور ونڈو ڈریسر کی حیثیت میں وہ مظاہرہ کر چکا تھا،اس کے خیال میں اپنے منہ کے علاوہ اس شے کو چھپانے کی کوئی اور جگہ رہ نہیں گئی تھی۔

کبھی کبھی بہت معمولی سی حرکت بھی کتنی اہم ہو جایا کرتی ہے۔ہاتھ سے منہ تک کی یہ معمولی سی حرکت ان دو روسیوں کو ہوشیار کر دینے کے لیے کافی تھی، جو نہایت سکون سے ماریا کے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے، جس نے ان کو ہوائی دفاع کی چارپائی سے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔انھوں نے اپنی ٹامی گن کی نال ماتسیرات کے پیٹ سے لگا دی، اور یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ ماتسیرات کوئی شے نگلنے کی کوشش کر رہا ہے۔

کاش اس نے اپنی مستعد انگلی سے بٹن کو نگلنے سے پہلے بند کر دیا ہوتا اور وہی ہوا، کہ بٹن اس کے حلق میں اٹک گئی، اس کے چہرے کا رنگ ارغوانی ہو گیا، اس کی آنکھیں اُبل پڑیں، وہ کھانسا، چلایا، ہنسا اور اس تمام ہل چل میں وہ اپنا ہاتھ بلند نہیں رکھ

سکا، مگر اس معاملے میں روبی بہت سخت تھے۔ انھوں نے ماتسیرات کو زور سے ڈانٹا، وہ اس کی ہتھیلی دیکھتے رہنا چاہتے تھے، مگر ماتسیرات تو اپنے نرخرے میں مشغول تھا۔ وہ تو اچھی طرح کھانس بھی نہیں پا رہا تھا۔ وہ ناچنے اور ہاتھ پاؤں مارنے لگا تھا، اور اس دوران شیلف پر رکھے لائپ زگ اسٹیو کے سارے ڈبے فرش پر آرہے۔ میرے کالمک نے، جو ابھی تک خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا، مجھے آہستگی سے فرش پر رکھا، اپنی پشت کی طرف ہاتھ بڑھایا، کچھ نکال کر اس کو افقی کیفیت میں کیا، اور کمر کے پاس سے گولی چلا دی۔ قبل اس کے کہ ماتسیرات کا دم رُکنا بند ہوتا، اس نے ماتسیرات میں پوری میگزین خالی کر دی۔

جب قسمت حرکت میں آتی ہے تو انسان کیا کچھ نہیں کرنے لگتا ہے۔ جب میرا قیاسی باپ پارٹی بیج نگل رہا تھا اور مر رہا تھا، میں نے، غیر ارادی طور پر، اور اس سے بے خبر کہ میں کیا کر رہا تھا، اپنی انگلی میں ایک جوں مسل دی تھی جو کالمک کے کالر پر پکڑی تھی۔ ماتسیرات چیونٹیوں کی شاہراہ پر گرا پڑا تھا۔ دُکان میں جاتی سیڑھی کے راستے روبی چلے گئے، اور اپنے ساتھ مصنوعی شہد کے کئی ڈبے بھی لیتے گئے تھے۔ میرا کالمک سب سے آخر میں گیا، مگر وہ شہد نہیں لے گیا، اس لیے کہ اُسے اپنی نامی گن کی میگزین بدلنی تھی۔ بیوہ گریف بال بکھرائے، نیم برہنہ مارجرین کی پیٹیوں کے درمیان پڑی تھی۔ ماریا نے کُرٹ کو اتنی زور سے پکڑ رکھا تھا گویا اس کو کچل ڈالے گی۔ گوئٹے کا ایک مصرع میرے ذہن پر تیر گیا تھا۔ چیونٹیاں ایک نئی کیفیت سے دوچار تھیں، متبادل راستے سے نڈر، انھوں نے دہرے پڑے ماتسیرات کے جسم کے اطراف سے ایک نئی شاہراہ بنائی تھی؛ اس لیے کہ پھٹے بورے سے ریزہ ریزہ گرتی چینی اپنے مٹھاس سے محروم نہیں ہوئی تھی، اور مارشل روکوسوسکی ڈانزِگ شہر پر قابض تھا۔

# کروں یا نہ کروں؟

سب سے پہلے روگی آئے، اس کے بعد گوتھ اور پھر کیپی ڈے [مشرقی جرمنی کے قبائل] آئے تھے، آسکر جس براہِ راست نسل سے ہے۔ کچھ دنوں بعد پول [پولینڈ کے باشندوں] نے 'پراگ' کے 'اڈال برٹ' کو بھیجا جو صلیب کے ساتھ آیا تھا اور کشوبیائیوں اور بوروسیان' نے اس کو کلھاڑی سے مار ڈالا تھا۔ یہ واقعہ ماہی گیروں کے گاؤں 'گیڈانِک' میں پیش آیا تھا۔ 'گیڈانِک' بعد میں 'دانتسِگ' بن گیا، پھر اس کو t کے بغیر لکھا جانے لگا، اور آج یہ شہر گڈانسک کہلاتا ہے۔

مگر ان نقشہ جاتی ترقیات سے پہلے اور کشوبیائیوں کی آمد سے پہلے پومیریلیا' کے نوابین' گیڈانِک' آئے تھے۔ یہ لوگ 'سوبیس لاو، 'سامبور، 'میسٹ وِن اور 'سوانتو پولک' کہلاتے تھے۔ یہ گاؤں ایک چھوٹا سا قصبہ بن گیا۔ پھر لوٹ کھسوٹ اور تاراجی کی نیت سے وحشی بوروسیان' آئے۔ اس کے بعد بے مروت 'برینڈن برگز' آئے جنھوں نے ویسی ہی لوٹ مار اور تباہی پھیلائی۔ پولینڈ کے بولیسلا نے بھی اسی طرح اپنا کام کیا اور ابھی تباہی کی مرمت پوری ہوئی تھی کی ٹیوٹائی جنگجو اپنی روایات کے ساتھ آدھمکے۔

صدیاں گزر گئیں۔ شہر تاراج ہوا اور پومیریلیائی نوابین، ٹیوٹائی سلسلے کے گرانڈ ماسٹرز، پولینڈ کے بادشاہوں اور شاہی مخالفین، برینڈن برگ کے کاؤنٹ اور ولوکلاویک کے پادریوں کے ہاتھوں اس کی از سرِ نو تعمیر ہوئی۔ تعمیری اور تباہی کی رہنمائی کرنے والے

اوٹو اور والڈے مار، بوگوسا، بائبرخ فان پلو سکے تھے—اور ڈائٹ برخ فان آلٹن برگ، جس نے اس جگہ ٹیوٹانی قلعہ تعمیر کرلیا جو 'ہے ویلیس پلاٹز' کہلایا، جہاں بیسویں صدی میں پولینڈ کے ڈاک خانے کا دفاع کیا گیا تھا۔

ہوسائی آئے، ادھر اُدھر دو چار گولیاں چلائیں اور چلے گئے۔ ٹیوٹانی جنگجو شہر بدر کردیے گئے اور قلعہ توڑ دیا گیا، اس لیے کہ شہر کے باسی اپنے شہر میں قلعے کے وجود سے اُکتا گئے تھے۔ پولینڈ والوں نے شہر پر قبضہ کرلیا مگر وہ کسی سے کم نہیں تھے۔ وہ بادشاہ جس نے ان سے چھٹکارا دلایا، ولادِسلاف کا عظیم بیٹا کہلایا۔ اس کے بعد ہنگری کا لوئی آیا اور لوئی کے بعد اس کی بیٹی جادوگا آئی۔ اس نے لیتھوینیا کے جاگیلو سے شادی کی، جس نے بعد میں جاگیلائی خاندان کی بنیاد رکھی۔ ولادِسلاف دوئم کے بعد ولادِسلاف سوئم آیا، پھر ایک اور کازیمیری آیا، جس میں باقاعدہ پُرجوشی کی کمی تھی، اور تیرہ طویل برس تک ٹیوٹانی جنگجوؤں سے جنگ کے نام پر ڈانسنگ کے تاجروں کا خون چوستا رہا تھا۔ دوسری جانب جان البرٹ ترکوں سے الجھا رہا۔ الیگزانڈر کے بعد سگمنٹ اِستاری، یا سگِس مُنڈ کلاں آیا۔ سِگِس مُنڈ آگسٹس کے باب کے بعد اِسٹیفن باتوری نے نیا باب کھولا، پولینڈ والے جس کے نام پر اپنے بحری جہازوں کے نام رکھنا پسند کرتے ہیں۔ اس نے شہر کا محاصرہ کیا اور مالک ہی جانے کب تک توپ کے گولے برساتا رہا تھا، مگر اس کو فتح کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ پھر سویڈن والے آئے اور اسی انداز میں کام کرتے رہے۔ انھیں شہر کا محاصرہ کرنا اتنا اچھا لگا تھا کہ انھوں نے یہ عمل کئی بار دہرایا۔ اسی زمانے میں خلیج ڈانسنگ ولندیزیوں، ڈنمارک والوں اور انگریزوں میں بہت مقبول رہا تھا اور ڈانسنگ کے ساحلی علاقے میں محض جہاز رانی کرنے والے غیر ملکی کپتان ہیرو بن گئے تھے۔ 'اولیوا' کا زمانۂ امن! کتنا خوب صورت اور پُر امن محسوس ہوتا ہے! بڑی طاقتوں نے پہلی بار دیکھا کہ پولینڈ کی سرزمین تقسیم کے لیے خود کو بڑے اچھے انداز میں پیش کرتی ہے۔ سویڈ، سویڈ اور مزید سویڈ—سویڈن کی قبریں، سویڈن کی مارکاٹ، سویڈن کے پھانسی گھاٹ! اس کے بعد روسی اور جرمن آئے، اس لیے کہ پولینڈ کا بادشاہ بے چارہ اسٹینز لالیسزنسکی شہر میں چھپا ہوا تھا۔ اس ایک بادشاہ کی خاطر

اٹھارہ سو مکان مسمار کیے گئے تھے اور بے چارہ بادشاہ جب فرانس فرار ہوگیا، اس لیے کہ وہاں اس کا داماد رہتا تھا، تو دانتسِگ کے لوگوں کو ایک ملین جرمانہ بھرنا پڑا تھا۔

پولینڈ تین حصوں میں تقسیم کردیا گیا۔ پروشیائی زبردستی آئے اور شہر کے دروازوں پر پولینڈ کے عقاب پر اپنے عقاب پینٹ کردیے۔ ماہرِ تعلیم یوہنا فاک کو صرف اتنا وقت ملا تھا کہ وہ اپنا مشہور کرسمس گیت "O Du fröhliche..." لکھتا، کہ دندناتے فرانسیسی آ پہنچے۔ نپولین کا جنرل Rapp کہلایا اور دانتسِگ عوام کی بدحالی پر اس کو بیس ملین فرانک ادا کیے گئے تھے۔ فرانسیسی قبضے کی دہشت انگیزیوں پر شبہ نہیں کیا جانا چاہیے، مگر اس کا عرصہ سات برس کا تھا۔ پھر روسی اور پروشیائی آگئے اور انھوں نے 'مشیتر نیسل' پر گولے باری سے اس کو جلا کر خاکستر کردیا تھا۔ وہ 'فری اسٹیٹ' کا اختتام تھا، نپولین نے جس کا خواب دیکھا تھا۔ پروشیائیوں کو ایک بار پھر شہر کے دروازوں پر اپنے عقاب پینٹ کرنے کا موقع مل گیا۔ پروشیائی کاملیت سے یہ کام کرنے کے بعد انھوں نے ہاتھ سے گولے پھینکنے والی چوتھی رجمنٹ، پہلا توپ خانہ بریگیڈ، انجینئروں کا پہلا بریگیڈ اور لائب ہسار کی پہلی رجمنٹ قائم کی۔ انفنٹری کی تیسویں رجمنٹ، اٹھارہویں رجمنٹ، فٹ گارڈز کی تیسری رجمنٹ، چوالیسویں انفنٹری رجمنٹ اور بندوقچیوں کی تینتیس ویں رجمنٹ وغیرہ، سب ایک وقت میں اس شہر میں چھاؤنی بنا دیے گئے، حالاں کہ ان میں سے کوئی بھی زیادہ عرصے نہیں ٹھہر سکا تھا، مگر مشہور ایک سو اٹھائیس ویں انفنٹری رجمنٹ 1920 تک یہاں سے گئی نہیں تھی۔ بات کی تکمیل کی خاطر، یہ بتانا بہتر ہوگا کہ پروشیائی عہد میں قلعے کی پہلی بٹالین، دوسری انفنٹری بٹالین، پہلی مشرقی پروشیائی آرٹلری رجمنٹ اور اس کے بعد دوسری پومیریائی فوٹ آرٹلری رجمنٹ کی شمولیت کے لیے پہلے توپ خانے کی بریگیڈ کو وسعت دی گئی تھی۔ لائب ہُسار کی پہلی رجمنٹ کے بعد دوسری لائب ہُسار رجمنٹ بنائی گئی۔ دوسری جانب Uhlans کی آٹھویں رجمنٹ ایک مختصر عرصے اندرونِ شہر مقیم رہی تھی، جب کہ سترہویں پروشیائی کوارٹر ماسٹر بٹالین شہر کی دیواروں کے باہر، لانگ فور کے مضافات میں رکھی گئی تھی۔

برکہارڈ، راوشننگ، اور گرائیزر کے زمانے میں فری اسٹیٹ میں ہری وردی والی سیکورٹی پولیس جرمن مقتدرہ کی نمائندگی کرتی تھی۔ یہ کیفیت فورسٹر کے ماتحت 1939 میں تبدیل ہو گئی تھی۔ انھوں نے بنی بیرکیس تیزی سے وردی پوش جوانوں سے بھرتی جا رہی تھیں، جو ہر قسم کے ہتھیار استعمال کرتے تھے۔ ہم 1939 سے 1945 تک دانتسِگ اور اس کے مضافات میں مقیم یا وہاں سے آرکٹک محاذ پر بھیجے جانے والے تمام یونٹ گنوا سکتے ہیں۔ آسکر اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے محض اتنا کہنا چاہے گا کہ، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، مارشل روکوسوسکی اُس وقت آیا تھا۔ اور شہر کو قائم دیکھ کر اسے اپنے عظیم پیش رو یاد آگئے اور اس نے اپنی آرٹلری کی گولا باری سے پورے شہر میں آگ لگا دی تھی، تاکہ جو اس کے بعد آتے وہ شہر کی دوبارہ تعمیر میں اپنی طاقت صرف کر سکتے۔

حیرت سے کہنا پڑتا ہے کہ، اس بار نہ پروشیائی، نہ سویڈن والے اور نہ فرانسیسی آئے؛ اس بار صرف پول تھے جو آئے تھے۔

پول اپنے تمام ساز و سامان سمیت 'ولنا، بیالستاک اور لووؤ' میں رہنے کے کوارٹروں کی تلاش میں آئے تھے۔ ہمارے پاس ایک صاحب فان گولڈ نام کے آئے تھے؛ پوری دنیا میں وہ تنِ تنہا تھے، مگر اس طرح پیش آرہے تھے گویا ایک وسیع خاندان ان کو گھیرے ہوئے ہے، جو اُن کے احکامات کے بغیر ایک منٹ بھی گزارا نہیں سکتا۔ مسٹر فانگولڈ نے ایک دم پورا کریانے کا گودام سنبھال لیا، اور اپنی بیوی لوبا کو، جو بالکل غائب اور بے حس تھی، ترازو، مٹی کے تیل کی ٹنکی، ساسیج ٹانگنے والے پیتل کے چھڑ، پیسے رکھنے والا خالی غلا، اور نہایت پُرجوشی سے تہہ خانے میں رکھا کریانے کا سامان دکھانے لگے تھے۔ انھوں نے ماریا کو سیلز گرل کے طور پر بھرتی بھی کر لیا اور بڑی طویل الفاظی سے اس کا اپنی بیوی لوبا سے تعارف بھی کرایا، چناں چہ ماریا نے مسٹر فان گولڈ کو ہمارا ماتسیرات دکھایا جو تین دن سے ایک مربع ترپال کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ ہم اس کی تدفین نہیں کر سکتے تھے، اس لیے کہ ساری سڑکیں، سارے راستے بائیسکلوں، سلائی کی مشینوں اور عورتوں کے متلاشی حریص روسیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

مسٹر فان گولڈ نے میت دیکھی، جس کو ہم نے چت بل لٹا دیا تھا، اس نے اپنے

ہاتھ سے میت کے سر پر اسی ولولہ انگیز انداز میں تھپکی دی جس طرح آسکر ہیکس منڈ، کھلونا فروش کو برسوں پہلے تھپکی دیتے دیکھا کرتا تھا۔ اس نے نہ صرف اپنی بیوی لوبا کو، بلکہ سارے خاندان کو تہہ خانے میں آنے کے لیے آواز دی، اور بلا شبہ اس نے سب کو آتے دیکھا تھا، اس لیے کہ ان کو نام بنام بلا رہا تھا: لوبا، لیف، یاکوب، بیریک، لیوون، مینڈیل اور سونیا۔ اس نے سب کو بتایا کہ وہ کون تھا جو مردہ لیٹا ہوا تھا، اور پھر وہ ہم سب کو بتانے لگا کہ وہ سب جن کو اس نے ابھی طلب کیا ہے، اور اس کی خواہرِ نسبتی، اور خواہرِ نسبتی کا دوسرا ماد اور نسبتی بھی جس کے پانچ بچے تھے، سب 'ٹریب لنکا' کے مختلف شمشانوں میں لے جانے سے قبل اسی طرح لٹائے گئے تھے، اور سب کے سب وہیں لیٹے رہے، سوائے خود اس کے، اس لیے کہ اس کو ان سب پر چونا چھڑکنا تھا۔

پھر اس نے ماتسیرات کی میت اوپر دُکان میں لے جانے میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ اس کے اہلِ خانہ ایک بار پھر اس کے اطراف تھے، اور اس نے اپنی بیوی لوبا کو میت کے نہلانے میں ماریا کی مدد کرنے کے لیے کہا۔ بیوی نے ایک انگلی بھی نہیں ہلائی مگر مسٹر فان گولڈ دیکھ نہیں سکا، اس لیے کہ اب وہ تہہ خانے سے دُکان میں مال منتقل کرنے لگا تھا۔ اس بار لینا گریف، جس نے مدر ٹروزنسکی کی میت کو غسل دیا تھا، ہماری مدد کے لیے موجود نہیں تھی؛ اس کا گھر روسیوں سے بھرا ہوا تھا اور ہم اس کو گانا گاتا سن سکتے تھے۔

بوڑھے ہائیلانڈ کو جفت سازی کی ملازمت مل گئی تھی۔ وہ روسیوں کے جوتوں میں نئے تلے لگانے میں مصروف ہو گیا تھا جو تیز پیش قدمی کے باعث گھس گئے تھے، اور وہ پہلے تو تابوت بنانے کے لیے بھی تیار نہیں تھا، مگر جب مسٹر فان گولڈ نے اس کو ایک کاروبار میں گھسیٹ لیا— ہماری دُکان سے ڈربی سگریٹ اور اس کے برآمدے سے بجلی کا ایک موٹر — تو اس نے جوتے ایک طرف رکھ دیے اور اپنے اوزار اور آخر میں اپنے تختے اُٹھا لیے۔

اس وقت — جب تک کہ ہم نکالے نہیں گئے تھے، مسٹر فان گولڈ نے تہہ خانہ ہمارے حوالے نہیں کیا تھا — ہم مدر ٹروزنسکی کے فلیٹ میں رہ رہے تھے، جس کو پڑوسیوں نے اور پولش مہاجروں نے ساز و سامان سے بالکل خالی نہیں کر دیا تھا۔ ہائیلانڈ نے باورچی

خانے اور بیٹھک کے درمیان کے دروازے کو اس کے قلابے سے نکال دیا، اس لیے کہ بیٹھک اور باورچی خانے کا دروازہ مدر برژینسکی کا تابوت بنانے میں کام آ گیا تھا۔ نیچے، احاطے میں، وہ ڈربی سگریٹ پیتا، اور ایک ساتھ ڈبے پھینکتا جا رہا تھا۔ ہم اوپر ہی ٹھہرے رہے۔ میں نے ایک کرسی اٹھائی جو فلیٹ میں باقی رہ گئی تھی، اور ٹوٹی کھڑکی کو دھکا دے کر کھول دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ بوڑھا بس ایک مستطیل تابوت بنا رہا تھا، اور پاؤں کی جانب مخروطی اور باعزت تابوتوں جیسا تابوت بنانے کی زحمت گوارا نہیں کر رہا تھا۔

آسکر نے پھر ماتسیرات کو نہیں دیکھا، اس لیے کہ جب تابوت بیوہ گریف کے ٹھیلے پر رکھنے کے لیے اٹھایا گیا تو وائیٹیلو مارجرین کے تختے تابوت میں جڑے جا چکے تھے، حالاں کہ اپنی پوری زندگی، مارجرین کھانا تو کجا ماتسیرات کھانا پکانے میں بھی مارجرین سے پرہیز کرتا تھا۔

ماریا نے مسٹر فان گولڈ کو ہمارے ساتھ چلنے کی دعوت دی؛ وہ سڑکوں پر موجود روسیوں سے بہت خوف زدہ تھی۔ فان گولڈ کو، جو دُکان کے کاؤنٹر پر چڑھا بیٹھا دفتی کے پیالے سے چمچہ چمچہ شہد نکال رہا تھا، پہلے تو بہت اندیشے تھے: اسے خوف تھا کہ لوبا اس پر شک کرے گی، مگر پھر بظاہر اس کی بیوی نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی، اس لیے وہ مجھے شہد دیتا ہوا کاؤنٹر سے کھسک گیا۔ وہ میں نے کرٹ کو دے دیا، جس نے ایک مختصر سی چُسکی لی، جب کہ ماریا مسٹر فان گولڈ کو سیاہ رنگ کا اوورکوٹ پہننے میں مدد کر رہی تھی جس میں بھورے رنگ کا خرگوش کا فر لگا ہوا تھا۔ دُکان بند کرنے سے پہلے اس نے اپنی بیوی کو متنبہ کی تھی کہ وہ کسی کے لیے دُکان نہیں کھولے گی۔ اس نے اپنی ٹاپ ہیٹ لگائی، جو اس پر خاصی چھوٹی تھی، جسے ماتسیرات کئی شادیوں اور جنازوں میں لگا چکا تھا۔

بوڑھے ہائیلانڈ نے شہر کے قبرستان تک ٹھیلا ڈھکیلنے سے انکار کر دیا۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا کہ اسے ابھی کچھ جوتوں کی مرمت کرنی تھی۔ میکس ہالبے پلائز پر جس کے کھنڈر سے ابھی تک دھواں اُٹھ رہا تھا، وہ بائیں جانب 'برونسٹر ویگ' میں مُڑ گیا، اور میرا قیاس تھا کہ وہ 'ساپسے' کی طرف جا رہا تھا۔ فروری کی ہلکی ہلکی دھوپ میں روسی فوجی گھروں کے باہر بیٹھے، دستی گھڑیاں، اور جیبی گھڑیاں چھانٹ رہے تھے، چاندی کے چمچوں

پر ریت سے پالش کر رہے تھے، اور یہ دیکھنے کا تجربہ کر رہے تھے کہ چولی سے کان کس طرح بند کیے جاتے ہیں، اور آئل پینٹنگ، گرانڈ فادر گھنٹہ، نہانے کے ٹب، ریڈیو اور کپڑے سے بنے پیڑوں سے بنی رُکاوٹ والے راستوں پر بائیسکل کس طرح چلائی جاتی ہے۔ اپنی ہنرمندی پر پُر جوش تالیوں سے ہمت افزائی میں وہ آٹھ کا ہندسہ بناتے، موڑ کاٹتے چھلّے بناتے اور اس دوران بچے لے جانے والی گاڑیوں کو اور کھڑکیوں سے پھینکے جانے والے فانوس جیسی اشیا کو بچاتے کھیل کر رہے تھے۔ ہم گزرنے لگے تو انھوں نے چند سکنڈ کے لیے اپنا کھیل روک دیا۔ بے تکلف ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس کچھ سپاہیوں نے ٹھیلے کو ماریا کی طرف ڈھکیلنے میں ہماری مدد کی مگر مسٹر فان گولڈ نے ہمیں للکارا، جو روسی بول سکتا تھا اور اس کے پاس سرکاری راہداری نامہ بھی تھا۔ عورتوں کی ہیٹ لگائے ایک فوجی نے ہمیں زندہ طوطے سمیت ایک پنجرا دیا، جس میں طوطا اڈّے پر بیٹھا ہوا تھا۔ گرٹ نے، جو ٹھیلے کے اطراف اُچھل کود کر رہا تھا، طوطے کے پر نوچنے کی کوشش کی۔ تحفے سے انکار کے خوف سے ماریا نے پنجرے کو گرٹ سے دور کرنے کے لیے اُٹھا کر مجھے ٹھیلے پر رکھ دینے کے لیے دیا۔ آسکر، جسے افریقی طوطے میں دل چسپی نہیں تھی پنجرے کو مارجرین کی پیٹیوں سے بنائے ہوئے ماتسیرات کے تابوت پر رکھ دیا۔ میں ٹھیلے کے پچھلے حصے پر بیٹھا ہوا تھا، میرے پاؤں مسٹر فان گولڈ کے چہرے کے سامنے لہرا رہے تھے، جس پر تفکر کی اُداسی چھائی ہوئی تھی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی پیچیدہ خیال میں گم ہے اور اس سے نکلنا نہیں چاہتا۔

میں نے مسٹر فان گولڈ کو اس کے سنجیدہ خیالات سے نکالنے کی کوشش میں ایک شوخ نغمہ بجایا، مگر اس کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلی نہیں آئی، اس کی آنکھیں کہیں اور تھیں، شاید دور افتادہ 'گیلیشیا' میں، اور ایک چیز میں جو اُسے نظر نہیں آئی تھی، وہ میرا نقارہ تھا۔ آسکر نے نقارہ بجانا بند کر دیا اور اس کے بعد کوئی آواز نہیں آرہی تھی سوائے ماریا کے گریے کے اور پہیے کی گڑگڑاہٹ کے۔

کتنا خوش گوار سرما کا موسم ہے، میں سوچ رہا تھا جب ہم 'لانگ فور' کا آخری گھر پیچھے چھوڑ چکے تھے؛ میں اس افریقی طوطے پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا جو شام ڈھلے، ہوائی

اڈے پر لہراتی سورج کی کرنوں میں اپنے پر پھیلا رہا تھا۔

ہوائی اڈے پر پہرا تھا، ہروُسن جانے والی سڑک بند تھی۔ایک افسر مسٹر فان گولڈ سے گفتگو کر رہا تھا، جو اس دوران اپنے ہیٹ کو انگلیوں پر ٹکائے تھا اور اس کے مہین، سُرخی مائل سنہرے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ایک لمحے کے لیے ماتسیرات کے تابوت پر تھپتھپاتے ہوئے، اس طرح جیسے اس کی اندر رکھے مال کا تعین کر رہا ہو، اور ایک انگلی سی طوطے کو گدگداتے ہوئے، افسر نے ہمیں گزر جانے دیا، مگر ہمارے ساتھ دو جوان کر دیے، جو سولہ سے زیادہ کے نہیں رہے ہوں گے۔ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے جو بہت چھوٹی تھیں اور نامی گن لیے تھے جو بہت بڑی تھیں، ہماری حفاظت کے لیے یا شاید ہم پر نظر رکھنے کے لیے تھیں۔

بوڑھا ہائیلانڈ پلٹ کر دیکھے بغیر ٹھیلا دھکیل رہا تھا۔وہ آہستہ ہوئے بغیر ایک ہاتھ سے سگریٹ جلانے کی ترکیب جانتا تھا۔اوپر ہوائی جہاز آ جا رہے تھے۔فروری کے آخر یا مارچ کی ابتدا کے موسم کی خاموشی کے باعث ان کے انجنوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔صرف سورج کی جانب کچھ بادل تھے، جو آہستہ آہستہ رنگین ہوتے جا رہے تھے۔بمبار ہوائی جہاز 'ہیلا' کی طرف پرواز کر رہے تھے یا جزیرہ نما 'ہیلا' سے واپس آ رہے تھے، جہاں سیکنڈ آرمی کی باقیات مقابلہ کر رہی تھیں۔

موسم اور جہاز کی آوازیں مجھے افسردہ کر رہی تھیں۔کوئی شے اتنی تکلیف دہ نہیں، جو مارچ کے بادلوں سے خالی، ہوائی جہاز کے انجنوں کے بڑھتے ہوئے سُروں یا اترتے ہوئے سُروں سے بھرے آسمان سے پیدا ہونے والے اس قسم کی کراہت کا مداوا کر سکے۔دو روسی پلّے، ناکامیابی سے ہمارے قدم سے قدم ملا کر مارچ کرنے کی کوشش سے حالات اور بھی خراب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔پہلے پتھریلی اور بعد میں ٹوٹی پھوٹی کولتار کی سڑک پر چلنے کے باعث، شاید جلدی میں تیار کیے جانے والے تابوت کا کوئی تختہ ڈھیلا ہو گیا تھا؛ ہم ہوا کے مقابل چل رہے تھے اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ میں پیچھے بیٹھا ہوا تھا، مُردہ ماتسیرات کی بدبو آ رہی تھی، اور جب ہم 'ساسپے' قبرستان پہنچ گئے تب آسکر کو سکون ہوا تھا۔

ہم ٹھیلے کو آہنی پھاٹک تک نہیں لے جا سکے، اس لیے کہ T34 کے جلے ہوئے

ملبے سے راستہ بند ہو گیا تھا۔مجبوراً اس کے اطراف سے ہو کر نیو فار واسر جانے والے دوسرے ٹینکوں کی، شاہراہ کی بائیں جانب، ریت میں پہیوں کے گہرے نشانات بن گئے تھے اور قبرستان کی بیرونی دیوار کا ایک حصہ بھی منہدم ہو گیا تھا۔ مسٹر فان گولڈ نے بوڑھے ہائیلانڈ سے عقب کے راستے سے داخل ہونے کے لیے کہا۔ وہ لوگ تابوت کو، جو بیچ سے کچھ دھنس گیا تھا، ٹینکوں کے پہیوں کے نشانات کے ساتھ لے چلے، بڑی مشکل سے پتھروں کے ڈھیر کو پار کیا تھا جو منہدم دیوار کی وجہ سے بن گیا تھا اور بالآخر اپنی بقیہ طاقت سے گرے ہوئے لوحِ مزارات کے درمیان چند قدم چل پائے تھے۔ ہائی لانڈ سگریٹ پینے میں مست تھا اور تابوت کے اوپر اس کا دھواں چھوڑ رہا تھا۔ میں تابوت کے ساتھ افریقی طوطے کا پنجرہ بھی لے گیا تھا۔ ماریا اپنے ساتھ دو عدد بیلچے کھینچے لا رہی تھی۔ ننھا کُرٹ ایک گینتی لیے، بلکہ لہراتا، اپنی جان کو خطرے میں ڈالتا، سنگِ خارا سے بنے لوحِ مزارات پر حملہ آور ہو گیا۔ ماریا نے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے گینتی چھین کے گورکن کے حوالے کر دی۔ کتنی خوش قسمتی کی بات ہے، میں نے شمالی دیوار کے قریب جان برانسکی کی قبر تلاش کرتے ہوئے خود سے کہا تھا، کہ یہاں کی زمین ریتیلی ہے اس لیے جمی نہیں ہے۔ اُس کی قبر یہیں، یا یہیں آس پاس کسی جگہ ہوگی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا، اس لیے کہ بدلتے موسموں نے چغلی کھانے والی سفید پُتائی کی دیوار کو 'ساپسپے' کی چوطرفہ بھورے رنگ کی دیواروں جیسا کر دیا تھا۔

میں عقبی پھاٹک سے واپس آیا، خشک ہوتے صنوبروں کی طرف دیکھا۔ میں نے کوئی اور غیر متعلق بات سوچنے کے خوف کے بجائے اپنے دل میں سوچا، اچھا تو اب یہ لوگ ماتسیرات کو دفن کرنے والے ہیں۔ اور اس معاملے میں مجھے جزوی طور کچھ اور بات بھی نظر آئی، اور وہ یہ تھی کہ skat کے دونوں کھلاڑی بھائیوں کو ایک ہی قسم کی ریتیلی زمین میں لٹا دیا جانا چاہیے، اگر چہ میری بے چاری ماما ان دونوں کے قریب نہیں ہوگی۔

جنازوں کو دیکھ کر ہمیشہ دوسرے جنازے یاد آنے لگتے ہیں۔

ریتیلی زمین مزاحمت کر رہی تھی کہ شاید مزید تجربے کار گورکنوں کا تقاضا کر رہی تھی۔ پیچھے مڑ کر زور سے لمبا سانس لیتے ہوئے ماریا نے ایک بار پھر رونا شروع کر دیا،

جب اس نے دیکھا کہ گُرٹ طوطے کے پنجرے پر پتھر پھینک رہا تھا۔ گُرٹ کا نشانہ خطا ہوا، پتھر اوپر سے گزر گیا؛ ماریا اپنی تمام تر سنجیدگی کے ساتھ زیادہ زور سے رونے لگی تھی، اس لیے کہ ماتسیرات اس سے بچھڑ رہا تھا، اس لیے کہ اس نے ماتسیرات میں کچھ پایا تھا، جو میرے خیال میں اس میں نہیں تھا، مگر جہاں تک اس کا تعلق تھا، وہ آج کے بعد بھی حقیقی اور محبت کے قابل ہوگا۔ مسٹر فان گولڈ ولاسے کے کچھ الفاظ کہنے لگا، اس طرح اس کو سستانے کا موقع مل گیا، اس لیے کہ کھدائی اس پر بھاری ہو رہی تھی۔ بوڑھا ہائیلانڈ سونا تلاش کرنے والوں کی طرح تواتر سے بیلچہ چلا رہا تھا اور مٹی اپنے پیچھے پھینکتا جا رہا تھا، ساتھ ہی، طے شدہ وقفے وقفے سے سگریٹ کا دھواں بھی نکالتا جا رہا تھا۔ ہم سے چند قدم دور، قبرستان کی دیوار پر دو روسی پلے بیٹھے ہوا میں بڑبڑا رہے تھے۔ اوپر ہوائی جہاز اور سورج رفتہ رفتہ اپنے انجام کو پہنچتا جا رہا تھا۔

ابھی تک انھوں نے تقریباً تین فٹ کھدائی کی تھی۔ آسکر، قدیم سنگِ خارا کے درمیان، خشک ہوتے صنوبروں کے درمیان اور ماتسیرات کی بیوہ اور ایک لڑکے گُرٹ کے درمیان جو چڑیا کے پنجرے پر پتھر پھینک رہا تھا، متحیر اور بے حرکت کھڑا ہوا تھا۔

کروں، یا نہ کروں؟ — آسکر، تم اب اکیس برس کے ہونے والے ہو۔ کرو گے یا نہیں کرو گے؟ — اب تم یتیم ہو۔ دراصل اب تمھیں کچھ کرنا چاہیے، اب وقت آ گیا ہے۔ جب بے چاری تمھاری مما مری تھی، تم آدھے یتیم ہوئے تھے۔ اسی وقت تمھیں فیصلہ کر لینا چاہیے تھا۔ پھر ان لوگوں نے تمھارے قیاسی باپ کو مٹی تلے لٹا دیا تھا۔ اس عمل نے تم کو پورا قیاسی یتیم بنا دیا تھا۔ اسی زمین پر جس کو 'ساسپے' کہا جاتا ہے، تم ایک ہلکا سا زنگ آلود کارتوس کا خول لیے کھڑے تھے۔ بارش ہو رہی تھی، اور JU-52 جہاز اترنے کی تیاری کر رہا تھا۔ کیا اُس وقت بھی، اگر بارش کی آواز میں نہیں تو زمین پر اُترتے ہوئے سامان بردار ہوائی جہاز کی گھن گرج میں بھی تم کو یہ "کروں، یا نہ کروں" سنائی نہیں دیا تھا؟ تم نے اپنے آپ سے کہا تھا، یہ بارش کی آواز ہے، یہ ہوائی جہاز کے انجنوں کی آواز ہے؛ آپ چاہیں تو اس قسم کی بودی تشریحات، کسی بھی متن سے اخذ کر سکتے ہیں۔ تم چاہتے تھے

کہ ہر بات سادہ ترین ہو، محض قیاسی نہ ہو۔

کروں، یا نہ کروں؟ اب یہ لوگ تمھارے دوسرے قیاسی باپ، ماتسیرات کے لیے شگاف بنا رہے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، تمھارے مزید قیاسی باپ نہیں ہیں۔تو پھر، تم کیوں بوتل کے سبز رنگ والی دو بوتلوں— کروں، یا نہ کروں؟— سے شعبدہ بازی کرتے رہتے ہو۔اب کون رہ گیا ہے جس سے سوال کیا جائے؟ یہ خشک ہوتے صنوبر خود کتنے نامناسب لگتے ہیں؟

مجھے ایک پتلی سی، ڈھلے لوہے کی صلیب مل گئی، جس کے نقش و نگار اور کندہ الفاظ— میتھلڈ ے گرنکل یا زرنکل، خراب ہو چکے تھے۔گویا ریت میں بھی کروں، یا نہ کروں؟ کا سلسلہ جاری تھا۔ اونٹ کتارے کی جھاڑیوں اور جنگلی اوٹس کے درمیان بھی.....کروں؟ نظر آیا تھا، یا یہ دراصل— نہ کروں؟ تھا۔ کھانے کی پلیٹوں کی ناپ کے تین یا چار زنگ آلود آرائشی ہار بھی— کروں؟ کا سوال کر رہے تھے، جو کسی زمانے میں صنوبر کی پتیوں یا laurel جیسے رہے ہوں گے یا— بالآخر کر ڈالوں؟ کہہ رہے تھے۔میں نے انھیں ہاتھ میں لے کر تولا تو انھوں نے بھی وہی سوال— کروں؟ پوچھ لیا، جب کہ لوہے کی صلیب کا اوپری سرا— یا نہ کروں؟ کا قطر کروں؟ کے برابر کر رہا تھا، یا ہو سکتا ہے کہ ڈیڑھ انچ زیادہ یا نہ کروں؟ رہا ہوگا۔میں نے خود کو چھ فٹ بلند ہو جانے کا حکم دیا اور— کروں؟ کہا، یا شاید — نہ کروں؟ کہا تھا، کہ نشانہ خطا ہو گیا تھا۔کیا میں دوبارہ کوشش کروں؟ صلیب کچھ زیادہ ہی — کروں؟ کے جھکاؤ پر تھی۔وہ نام میتھلڈ ے گرنکل تھا یا زرنکل تھا۔زرنکل— میں کروں؟ گرنکل— میں کروں؟ یہ چھٹی بار ہو رہا تھا، اور میں ساتویں بار بھی یہی کرنا چاہ رہا تھا۔میں نے سبز زرنکل سے پوچھا، میتھلڈ ے نے کہا، ہاں کرو؛ وہ جوانی ہی میں مر گئی تھی، ستائیس برس کی عمر میں، اور 1968 میں پیدا ہوئی تھی۔ میں اکیس کا ہونے والا تھا، جب میں نے ساتویں بار کہا تھا؛ جب میرا مسئلہ— کروں، یا نہ کروں؟ آسان ہو گیا تھا، اور اس کی قلبِ ماہیت ہو گئی تھی، ظاہر شدہ میں، آرائشی ہار میں، نشانہ شدہ میں، اور فاتح "مجھے کرنا چاہیے" میں۔

جب آسکر، اپنی زبان پر اور دل میں اپنی خواہش "مجھے کرنا چاہیے" لیے گورکموں کے پاس گیا تو پنجرے والا افریقی طوطا چیخا اور اپنے کئی نیلے پیلے پَر جھاڑ دیے، اس لیے کہ گرٹ کے پتھروں میں سے ایک نشانے پر لگا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے بیٹے کو کس سوال نے اتنا مجبور کیا تھا کہ وہ پنجرے والے طوطے پر پتھر پھینکتا رہا، اور آخری کامیاب کوشش نے اس کے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

انھوں نے تابوت کو گڑھے کے کنارے رکھ دیا، جو تقریباً چار فٹ گہرا تھا۔ بوڑھا ہائیلانڈ جلدی میں تھا، مگر اس وقت تک انتظار کرنا پڑا تھا جب تک کہ ماریا نے اپنی کیتھلک دعا مکمل نہیں کر لی تھی، جب کہ مسٹر فان گولڈ اپنی ریشمی ہیٹ اپنے سینے پر رکھے ہوئے تھا، اور اس کی آنکھ گیلیشیا میں اٹکی ہوئی تھی۔ گرٹ بھی قریب آ گیا۔ اپنے ہدف کے بعد شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا؛ اور وہ خود بھی، آسکر کی طرح، اپنی وجوہ کی بنا پر قبر کی طرف چلا تھا۔

تذبذب کی کیفیت مجھے مارے ڈال رہی تھی۔ بہر حال، وہ میرا بیٹا تھا جس نے کوئی فیصلہ کیا تھا۔ کیا اس نے، آخرِ کار، مجھ سے محبت کرنے اور مجھے اپنا اصل باپ مان لینے کا فیصلہ کر لیا تھا؟ اگر چہ بہت دیر ہو چکی تھی، مگر کیا اس نے نقارہ سنبھالنے کا فیصلہ کر لیا تھا؟ یا اس کا فیصلہ تھا میرا قیاسی باپ، آسکر، مردہ باد! جس نے میرے قیاسی باپ ماتسیرات کو پارٹی کی پن سے مار ڈالا ہے، جس کی کوئی اور وجہ نہیں ہو سکتی تھی، سوائے اس کے کہ وہ باپوں سے تنگ آ چکا تھا۔ شاید وہ بھی قتل کے ذریعے اپنی طفلی محبت کا اظہار کرنا چاہ رہا تھا جو باپ اور بیٹوں کے درمیان ہو سکتی ہے۔

جس وقت بوڑھا ہائیلانڈ ماتسیرات کے تابوت کو قبر میں اُتار رہا تھا، ماتسیرات کے نرخرے میں اٹکی پن، اور روسی نامی گن کی تمام گولیاں اس کے پیٹ میں بھری ہوئی تھیں، آسکر نے تصور کر لیا تھا کہ ماتسیرات کو اس نے جان بوجھ کر قتل کیا ہے، اس لیے کہ بہ گمانِ غالب وہ محض اس کا باپ ہی نہیں، اس کا حقیقی باپ تھا؛ اور یہ بھی کہ وہ تمام زندگی اپنے ساتھ باپ کو گھسیٹے پھرنے سے تنگ آ چکا تھا۔

لہٰذا یہ صحیح نہیں ہے کہ جب میں نے کانکریٹ کے فرش سے پارٹی کا نشان اُٹھایا

تھا تو سیفٹی واسن کھلی ہوئی تھی۔ پن میری بند مٹھی میں کھل گئی تھی۔وہ ایک نوکیلی چوسنے والی گولی تھی جو میں نے ماتسیرات کو دی تھی اس ارادے سے کہ وہ اس پر لگا پارٹی کا نشان دیکھ لیں، کہ وہ پارٹی کے نشان کو اپنے منہ میں رکھ رہا ہے اور اس پر اس کا گلا بند ہو جائے گا— پارٹی پر، اور مجھ پر، یعنی اپنے بیٹے پر بھی، کہ یہ کیفیت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔

بوڑھے ہائی لانڈ نے بیلچا چلانا شروع کردیا۔ ننھے کُرٹ نے بے ڈھنگے پن سے مگر دل لگا کر اس کی مدد کی۔ میں نے کبھی ماتسیرات سے محبت نہیں کی تھی۔کبھی کبھی ہی وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔وہ میری خدمت کرتا تھا، مگر باپ کی صورت میں کم اور باورچی کی حیثیت میں زیادہ۔ کھانا اچھا پکاتا تھا۔اگر آج کل بھی مجھے ماتسیرات یاد آتا ہے تو وہ کونسبرگ ڈمپلنگ کی وجہ سے، سرکے سے بنے ساس میں سؤر کے گردوں کی وجہ سے، horseradish اور کریم کے ساتھ پکائی ہوئی کارپ مچھلی سے، بام مچھلی کے سبز سوپ سے، اس کے ساور کراوٹ کے ساتھ کاسلر ریپوخس سے اور اس کے تمام کبھی نہ بھولنے والے اتوار کے روسٹ سے، آج بھی میری زبان اور دانتوں کے درمیان جن کا ذائقہ بھلایا نہیں جا سکتا۔وہ لوگ اس شخص کے تابوت میں پکانے والا چمچا رکھنا بھول گئے جو جذبات کو شوربے میں بدل دیا کرتا تھا۔وہ اس کے تابوت میں skat کارڈ کا ایک پیکٹ رکھنا بھی بھول گئے تھے۔ وہ skat کھلاڑی کے مقابلے میں بہتر باورچی تھا۔ پھر بھی وہ جان برانسکی اور مما کے مقابلے میں بہتر کھلاڑی تھا۔ یہی اس کی نعمت تھی، یہی اس کا المیہ بھی تھا۔ماریا کو مجھ سے چھین لینے پر میں کبھی اس کو معاف نہیں کر سکا ہوں، حالاں کہ وہ اس کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا تھا اور اس پر کبھی ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا، اور جب وہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتی تو عام طور ہمیشہ ہتھیار ڈال دیتا تھا۔اس نے مجھے پبلک ہیلتھ کے حوالے نہیں کیا، اور اسی وقت خط پر دستخط کیے تھے جب ڈاک کی ترسیل بند ہو گئی تھی۔جب میں بجلی کے بلب کے نیچے دنیا میں آیا تھا، اس نے مجھے دُکان دار بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔کاؤنٹر پر کھڑے ہونے سے بچنے کے لیے آسکر نے سترہ برس نقارے کے عقب میں کھڑے گزار دیے تھے۔ آسکر نے سُرخ اور سفید پالش والے ایک سو سے زیادہ نقاروں کے پیچھے اپنے دن گزارے تھے۔ اب

ما تسیرات سیدھا لیٹا ہوا تھا، کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ آسکر کی دی ہوئی سگریٹ پھونکتے ہوئے، بوڑھے ہائی لانڈ نے بیلچے سے اس پر مٹی ڈالی تھی۔ آسکر کو دُکان کو سنبھال لینا چاہیے تھا۔ اس دوران مسٹر فان گولڈ نے اپنے بڑے، کبھی نظر نہ آنے والے خاندان کے ساتھ دُکان سنبھال لی تھی۔ مگر ورثے میں باقی سب کچھ مجھے ملا تھا: ماریا، کرٹ، اور ان دونوں کی ذمے داری۔

ماریا اب بھی واقعی رو رہی تھی اور کیتھلک انداز میں دعا کر رہی تھی۔ مسٹر فان گولڈ گیلیشیا میں گم تھا اور اُسے کچھ گتھیاں سلجھانی تھیں۔ کُرٹ تھکتا جا رہا تھا مگر بیلچہ چلا رہا تھا۔ روسی پکے قبرستان کی دیوار پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ ترش رو بوڑھا ہائی لانڈ مارجرین کی پیٹیوں سے بنے تابوت پر تواتر سے 'ساپیے' کی ریت ڈال رہا تھا۔ آسکر اب بھی Vitello کے تین حرف پڑھ سکتا تھا۔ اس مرحلے پر اس نے ''کروں یا نہ کروں؟'' کے بجائے ''یہ ہونا چاہیے'' کہتے ہوئے اپنی گردن سے نقارہ اُتار پھینکا۔ اور نقارہ اس جگہ پھینکا جہاں ریت اتنی گہری تھی کہ اس کی آواز کو دبانے کے لیے کافی تھی۔ میں نے چوب نقارہ بھی پھینک دیں۔ وہ ریت میں گھس گئیں۔ میرا یہ نقارہ گرد جھاڑنے والے دنوں کا تھا، یہ بیرا کے دیے جانے والے نقاروں میں آخری نقارہ تھا۔ ہمارے مالک نے میرے فیصلے کے بارے میں کیا سوچا ہو گا؟ یسوع نے بھی یہ نقارہ بجایا تھا، جیسے کہ اس روسی نے بجایا تھا جس کے بڑے بڑے کھلے مُسام تھے، اور بینک کی تجوری کی طرح بنے ہوئے تھے۔ اس نقارے میں اب جان نہیں رہ گئی تھی، مگر جب اس کی سطح پر ایک بیلچہ بھر ریت گری تو اس میں سے آواز نکلی تھی۔ دوسرے بیلچے پر کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ تیسرے بیلچے پر خاموش اپنے سُرخ و سفید پالش کا تھوڑا سا حصہ دکھا تا رہا، جب تک ریت نے اسے پوری طرح ڈھک نہیں لیا تھا۔

نقارے پر ریت جمع ہوتی جا رہی تھی، ریت ڈھیر بنتی گئی — اور میں بھی بڑھنے لگا تھا؛ اس عمل کی پہلی نشانی خون خارج کرنے والی تیز نکسیر تھی۔

سب سے پہلے کُرٹ نے خون دیکھا تھا۔ ''اس کے خون بہہ رہا ہے...... اس کے خون بہہ رہا ہے۔'' وہ چلا چلا کر پکار رہا تھا، مسٹر فان گولڈ کو ''گیلیشیا'' سے، ماریا کو

عبادت سے؛ حتیٰ کہ اُس نے اُن دونوں روسی جوانوں کو بھی پکارا تھا، جو سارا وقت گرونسن کی سمت دیوار پر بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے، اور وقتی طور پر میں خوف زدہ کر دیا تھا۔

بوڑھے ہائی لانڈ نے بیلچے کو ریت میں چھوڑا کھاڑا اُٹھایا اور میری گردن اس کے ٹھنڈے نیلگوں سیاہ لوہے پر رکھ دی۔ ٹھنڈی دھات نے مطلوبہ اثر دکھایا۔ نکسیر کا خون آہستہ آہستہ کم ہونے لگا۔ بوڑھا بیلچے سے ریت ڈالنے چلا گیا۔ جب خون بہنا بالکل بند ہو گیا، اس وقت قبر کے کناروں پر کچھ ریت باقی رہ گئی تھی، مگر میری نشوونما جاری رہی، کہ میں اپنے اندر گڑگڑاہٹ، تڑخنے اور چینے جیسی آوازیں سُن سکتا تھا۔

بوڑھا ہائی لانڈ قبر بھر چکا تو اس نے قریبی قبر سے پُرانی، بغیر کسی تحریر کی، صلیب اُٹھائی تازہ ڈھیر پر، اندازاً ماسیرات کے سر اور میرے دفن شدہ نقارے کے درمیان، نصب کر دی۔ ''یہ ٹھیک رہے گا'' بوڑھے نے کہا۔ آسکر کو، جو چلنے کے قابل نہیں تھا، اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔ مجھ کو لیے، وہ سب کی رہنمائی کرتا، جن میں دو نامی گن والے روسی بچے بھی شامل تھے، قبرستان سے باہر، ٹوٹی دیوار کے اس پار، ٹینکوں کے پہیوں سے بنے راستے کے کنارے کنارے، ٹھیلے تک لے گیا، جو شاہراہ پر کھڑا تھا۔ میں نے پلٹ کر قبرستان پر ایک نظر ڈالی۔ ماریا طوطے سمیت پنجرا اُٹھائے تھی، مسٹر فان گولڈ اوزار لیے ہوئے تھا، کُرٹ کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا، دو روسی ٹوپی پہنے ہوئے تھا جو بہت چھوٹی تھیں، نامی گن لیے ہوئے تھے جو اُن کے لیے بہت بڑی تھیں، اور راستے وزنی بوجھ کو دیکھ کر باغ کے صنوبر جھکے جا رہے تھے۔

ریت سے کوٹنار کی شاہراہ تک کا راستہ اب بھی جلے ہوئے ٹینکوں سے بند تھا۔ ایک ٹینک پر لیوشگر بیٹھا تھا۔ 'ہیلا' سے آنے والے بلند پرواز ہوائی جہاز 'ہیلا' کی طرف واپس جا رہے تھے۔ لیوشگر محتاط تھا کہ جلے T34 سے اس کے دستانے کالے نہ ہو جائیں۔ گالے جیسے چھوٹے بادلوں کے نرغے میں سورج 'زوپوٹ' کے قریب 'ئاور ماؤنٹین' پر ڈوب رہا تھا۔ لیوشگر ٹینک سے اُتر کر بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔

لیوشگر کو دیکھ کر بوڑھا ہائی لانڈ ہنس پڑا۔ ''کیا کسی نے اس جیسا کوئی دیکھا ہے؟ پوری دنیا ختم ہو جائے مگر کوئی لیوشگر کو گرا نہیں سکے گا۔'' مذاق میں اس نے کالے نیل

کوٹ کو ایک دھپ لگائی اور مسٹر فان گولڈ کو بتایا، "یہ ہمارا لیو شنگر ہے۔ یہ ہم سے تعزیت کرنا اور ہاتھ ملانا چاہتا ہے۔"

اس نے سچ کہا تھا۔ لیو شنگر نے اپنے دستانے جھٹکے اور ہمیشہ کی طرح تسلی دیتے ہوئے سب سے تعزیت کی۔ "آپ لوگوں نے آقا کو دیکھا ہے؟" اس نے پوچھا "آپ لوگوں نے آقا کو دیکھا ہے؟" اُسے کسی نے نہیں دیکھا تھا اور ماریا نے، نہ معلوم کیوں طوطے سمیت پنجرا لیو کو پکڑا دیا۔

اور جب آسکر کی باری آئی، جسے بوڑھے بائی لانڈ نے اُٹھا کر تھیلے پر رکھ دیا تھا۔ لیو شنگر کا چہرہ خود بخود تحلیل ہوتا جا رہا تھا، ہوائیں اس کے لباس کو پھلا رہی تھیں، ایک قسم کے رقص نے اس کے پیر پکڑ لیے تھے۔ "او لارڈ..... او لارڈ" وہ اس طرح چیخا کہ پنجرے کا طوطا بھی دہل گیا تھا۔ لارڈ کو دیکھو..... یہ تو بڑھ رہا ہے، یہ تو بڑھ رہا ہے!" پھر پنجرے سمیت وہ ہوا میں بلند ہو گیا، دوڑا، اُڑا، ناچا، لڑکھڑایا اور چیختے طوطے کے ساتھ بھاگا، اور خود بھی چڑیا جیسا بن گیا تھا۔ بالآخر پرواز کرتے ہوئے، وہ میدانوں پر سے گزرتا، غلاظت کے میدان سے گزرا اور نامی بندوقوں کی آوازوں کے ذریعے اس کی آواز سنی گئی: یہ تو بڑھ رہا ہے، یہ تو بڑھ رہا ہے۔ اس وقت بھی وہ چیخ رہا تھا جب دو روسی جوانوں نے اپنی بندوقیں بھرلی تھیں اور بندوق کہہ رہی تھی، "یہ تو بڑھ رہا ہے!" اور تو اور، نامی بندوقیں دوبارہ بولیں، جب آسکر بغیر پائیدان کی سیڑھیوں سے گر کر ایک محیط بے ہوشی کے عالم میں چلا گیا تھا تو میں طوطے کی آواز بھی سن سکتا تھا، پہاڑی کوے کی آواز سن سکتا تھا: میں لیو کی بھی آواز سن سکتا تھا جو پوری دنیا سے کہہ رہا تھا "یہ تو بڑھ رہا ہے، یہ تو بڑھ رہا ہے، یہ تو بڑھ رہا ہے....."

# جراثیم کُش دوا

پچھلی شب، میں جلد باز خوابوں کے نرغے میں تھا۔ وہ میرے ملاقات کے دِنوں کے دوستوں کی طرح تھے۔ ایک خواب کے بعد دوسرا خواب؛ یکے بعد دیگرے آئے اور بتا کر گئے کہ کون سے خواب بتائے جانے کے قابل ہوتے ہیں: بے معنی قصے، تکرار اور خود کلامی سے بھرے، جن کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ وہ ایسی آوازیں اور نالائق اداکاروں کے ایسے اشاروں میں پیش کیے گئے تھے کہ توجہ کے طالب تھے۔ جب میں نے ناشتے کے وقت بدونو کو قصے بتانے کی کوشش کی تو میں ان سے جان نہیں چھڑا سکا، اس لیے کہ میں سب کچھ بھلا چکا تھا۔ آسکر میں خواب دیکھنے کی لیاقت نہیں تھی۔ جب بدونو میری ناشتے کی میز صاف کر رہا تھا، میں نے اس سے رواروی میں پوچھا تھا، ”میرے پیارے بدونو، سچ کہنا، میرا قد کتنا ہے؟“

بدونو نے مربے کی پلیٹ میرے کافی کے پیالے کے اوپر رکھ دی اور فکرمندی کے لہجے میں کہا، ”کیوں؟ مسٹر ماتسیرات، آپ نے مربے کو تو چھوا بھی نہیں۔“

میں سرزنش کے ان لفظوں سے کتنا واقف ہوں۔ ہر روز ناشتے کے بعد میں یہی سنتا ہوں۔ ہر صبح بدونو میرے لیے اتنا ذرا سا مربہ لاتا ہے اور چاہتا ہے کہ میں اس کو اخبار کی طرح اوڑھ لوں۔ مجھے تو مربے کی شکل بھی برداشت نہیں، چہ جائے کہ اس کا کھانا۔ لہٰذا میں خاموش سختی سے بدونو کو جھڑک دیتا ہوں، ”بدونو تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مربے مجھے پسند نہیں۔ اچھا، مجھے یہ تو بتاؤ کہ میرا قد کتنا ہے؟“

بہ وٹو کی آنکھوں میں کسی ناپید ہشت پا جیسی صورت پیدا ہو گئی تھی۔ جب وہ کچھ سوچنے لگتا ہے تو وہ اپنی ماقبل تاریخ نظر سے چھت کو گھورنے لگتا ہے، اور اگر کچھ کہنا چاہتا ہے تو وہ چھت ہی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ آج صبح جب اس نے چھت سے مخاطب ہو کر کہا، ”مگر یہ صرف اسٹرابری کا مربہ ہی تو ہے۔“ جب خاصے وقفے کے بعد — اس لیے کہ اپنی خاموشی سے میں نے آسکر کے قد کے بارے میں سوال پر زور دیا تھا — بہ وٹو کی نظر چھت سے واپس آئی، خود کو میرے پلنگ میں لگے چھڑوں سے لپیٹا، اور مجھے یہ سننے کا افتخار حاصل ہوا کہ میرا قد چار فٹ ایک انچ ہے۔

”کیا تم ایک بار پھر میری پیمائش نہیں کر سکتے، بہ وٹو، میرے اطمینانِ قلب کی خاطر؟“

پلک جھپکائے بغیر ہی بہ وٹو نے اپنے پتلون کی عقبی جیب سے ناپنے کا فیتا نکالا، اس انداز میں میرا لحاف اُتار پھینکا گویا وہ کوئی وحشی ہو، میرا نائٹ گاؤن اُتارا جو کھسکا ہو گیا تھا، زرد درندہ صفت فیتے کو کھولا، جو پانچ فٹ گیارہ انچ پر ختم ہو جاتا تھا، اس کو میرے پہلو میں رکھا اور مجھے ناپا۔ اس کے ہاتھ نہایت سرعت سے کام کر رہے تھے، مگر اس کی آنکھیں اس وقت بھی ڈائنوسار کے عہد میں رہ رہی تھیں۔ آخر فیتے کو آرام نصیب ہوا اور اس نے اس طرح اعلان کیا گویا وہ اپنی یافت سے پڑھ رہا تھا، ”وہی چار فٹ، ایک انچ۔“

فیتے کو لپیٹنے اور ناشتے کی سینی ہٹانے کے دوران اسے اتنا شور مچانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا میرے قد کی ناپ اس کے پسند کے مطابق نہیں تھی؟

ناشتے کی سینی لے کر کمرے سے واپس جاتے ہی، جس میں انڈے کی زردی کے ساتھ اُبکائی لانے والے رنگ کا اسٹرابری مربہ بھی تھا، بہ وٹو نے دروازے میں بنے سوراخ سے جھانکا — ایسی نظر سے جس سے میں خود کو پہاڑیوں جیسا قدیم محسوس کرنے لگا تھا اور پھر اس نے کافی دیر کے لیے مجھے میرے چار فٹ ایک انچ کے ساتھ تنہا چھوڑ دیا۔

اچھا، واقعی آسکر اتنا اونچا ہو گیا ہے! کسی بونے، ٹھگنے، یا مختصر انسان سے بھی بڑا؟ راگونا، یعنی میری روزویٹا، کی پہاڑی کتنی بلند تھی؟ اور ماسٹر بیبرا کا قد کتنا تھا، جو شہزادے یوجین کی اولاد میں سے تھا اور اس پر قائم رہنے میں کامیاب بھی تھا؟ آج میں کیٹی کو اور فیلکس کو

بھی نیچا دکھا سکتا ہوں۔ جب کہ وہ سب، میں نے ابھی جن کے نام لیے ہیں، آسکر کو دوستانہ انداز میں نیچا دیکھتے رہے ہیں، جو اپنے اکیسویں برس تک صرف تین فٹ قد کا تھا۔

اُسی وقت سے، جب 'ساپے' کے قبرستان میں ماتسیرات کے دفن کے وقت وہ پتھر مجھے لگا تھا، میرا قد بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ آسکر نے پتھر کا نام لے لیا ہے۔ لہٰذا اب مجھے قبرستان کے واقعات کی اپنی یادداشت درست کرنی ہوگی۔

شکریہ اس چھوٹے سے quoits کے کھیل کا، جب مجھے پتا چلا تھا کہ میرے لیے اب ''کروں، یا نہ کروں؟'' نہیں ہوگا، بلکہ اب صرف ''کرنا چاہیے، ضرور، میں ضرور کروں گا'' ہی ہوگا۔ میں نے اپنا نقارہ اُتار پھینکا تھا، چوب سمیت، ماتسیرات کی قبر کے اندر ڈال دیا تھا اور اپنی نشوونما کا ارادہ کر لیا تھا۔ اچانک میرے کانوں میں گھنٹی بجنے کا احساس ہونے لگا تھا، زور سے، زور زور سے۔ عین اس وقت جب میرے سر کے عقب میں ایک پتھر لگا تھا، اخروٹ کے برابر کا، جو میرے بیٹے نے، اپنی چار سالہ قوت سے پھینکا تھا۔ اگر چہ وہ چوٹ میرے لیے حیرت کا باعث نہیں تھی — مجھے شبہ تھا کہ میرا بیٹا میرے خلاف سازش کر رہا ہے — تو میں نے اپنے نقارے کے لیے ماتسیرات کی قبر میں چھلانگ لگائی تھی۔

بوڑھے ہائیلانڈ نے اپنی، بوڑھے آدمیوں جیسی خشک گرفت سے، مجھے قبر کے گڑھے سے کھینچ نکالا تھا مگر نقارے اور چوب نقارہ کو وہیں چھوڑ دیا تھا۔ پھر میری ناک سے خون بہنے لگا تھا اور اس نے میری گردن ٹھنڈے کلھاڑے پر رکھی تھی۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، نکسیر میں افاقہ ہونے لگا تھا، مگر میں بڑھنے لگا تھا، اگر چہ اتنی آہستگی سے کہ صرف لیو شگر ہی دیکھ سکا تھا، چناں چہ اس نے پوری دنیا کے سامنے، زوردار آواز اور چڑیوں کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ جیسے انداز میں، میرے بڑھنے کا اعلان کر دیا تھا۔

یہ تو تھا ضمیمہ؛ جو دراصل فالتو ہے؛ اس لیے کہ میں پتھر کے لگنے اور خود کو ماتسیرات کی قبر میں گرا دینے سے پہلے سے ہی بڑھنا شروع ہو گیا تھا، مگر سب سے پہلے تو ماریا اور مسٹر فان گولڈ نے میرے بڑھنے کے عمل، یا جیسا کہ وہ کہتے تھے بیماری، کی وجہ دیکھ لی تھی، یعنی وہ پتھر جو آ کر میرے سر میں لگا تھا، اور قبر میں میری چھلانگ۔ قبرستان سے

واپسی سے قبل ہی ماریا نے گرٹ کی پٹائی کردی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہورہا تھا۔ اس لیے کہ اس نے میری بھلائی ہی کے لیے پتھر پھینکا ہوگا، مری نشوونما کو تیز کرنے کے لیے۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ اس کا بھی ایک بڑا سا باپ ہو، یا محض ماتسیرات کا نعم البدل ہو؛ مگر سچ تو یہ ہے کہ اس نے مجھے نہ کبھی باپ مانا ہے نہ میری عزت کی ہے۔

میرے بڑھنے کے دوران، جو ایک برس تک جاری رہا، دونوں جنس کے کئی ڈاکٹروں نے یہ نظریہ تسلیم کرلیا تھا کہ پتھر کی چوٹ اور قبر میں چھلانگ ہی اس کیفیت کے ذمے دار تھے اور انھوں نے میری بیماری کی تفصیلات میں اس کا اضافہ کردیا تھا۔ آسکر ماتسیرات ایک ناقص آسکر ہے، اس لیے کہ اس کے سر کے عقب میں ایک پتھر لگا تھا... وغیرہ وغیرہ۔

اس مرحلے پر مناسب سمجھتا ہوں کہ میں اپنی تیسری سالگرہ کو یاد کروں، اور یہ بھی کہ میری صحیح سوانح حیات کے بارے میں بالغوں نے کیا کہا ہے؟ یہ ہے جو انھوں نے کہا تھا: تین برس کی عمر میں آسکر ماتسیرات تہہ خانے کی سیڑھیوں سے لڑھکتا کنکریٹ کے فرش تک آیا تھا۔ اس حادثے نے اس کی نشوونما میں رکاوٹ پیدا کردی... وغیرہ وغیرہ۔

ان تشریحات میں ہمیں انسان کی سمجھ میں آنے والی خواہشات نظر آتی ہیں جن کی بنا پر تمام مبینہ معجزات کے جسمانی جواز تلاش کیے جاتے ہیں۔ آسکر کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ بھی تمام معجزات کو، غیر ذمے دارانہ مزاج سمجھ کر رد کردینے سے پہلے، بے حد احتیاط سے تجزیہ کرتا ہے۔

'ساسپے' قبرستان سے واپسی پر مدرٹروزنسکی کے فلیٹ میں نئے کرایہ دار ملے۔ بہت اچھے لوگ تھے۔ جب تک ہمیں کچھ اور نہیں مل جاتا، انھوں نے ہمیں اپنے ساتھ ہی ٹھہرانے کی پیش کش کردی تھی، مگر مسٹر فان گولڈ نے ضرورت سے زیادہ بھیڑ کا مشورہ دینے سے انکار کردیا، اور کہا کہ ہم ان کے زمینی فلیٹ کی خواب گاہ کو استعمال کرسکتے ہیں، کہ فی الحال وہ اپنی بیٹھک ہی میں گزارا کرلے گا۔ ماریا نے اس خیال سے اس انتظام سے اختلاف کیا، کہ حال ہی میں بیوہ ہونے کے باعث کسی مرد کے ساتھ اس کا تنہا قیام صحیح نہیں ہوگا۔ اس وقت فان گولڈ کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ تنہا مرد ہے، مگر لیوبا کی 'توانا موجودگی' میں وہ ماریا کے دلائل کو آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ لیوبا کی خاطر، وہ کچھ اور مختلف نوعیت کا انتظام کرے گا اور تہ خانہ ہمیں واپس

کر دے گا۔ اس نے گودام کی نئے سرے سے تنظیم میں بھی ہماری مدد کی۔ چوں کہ میں بیمار تھا اس لیے بیٹھک میں، میری مما کے پیانو کے پہلو میں، میرا بستر لگا دیا گیا۔

ڈاکٹر مشکل سے ملتا تھا۔ تقریباً سارے ڈاکٹر فوج کے ہمراہ چلے گئے تھے، اس لیے کہ جنوری میں بیماری کے انشورنس کا فنڈ مغرب کی طرف منتقل کر دیا گیا تھا، اور خال خال ہی مریض آتے تھے۔ طویل تلاش کے بعد مسٹر فان گولڈ بیلنگ' سے ایک لیڈی ڈاکٹر کو آنے پر بمشکل تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے جو ہیلن لانگے اسکول میں قطعِ اعضا کر رہی تھی، جہاں وہر ماخت اور سرخ فوج دونوں کے زخمی پہلو بہ پہلو لیٹے ہوتے تھے۔ اس نے غور کرنے کا وعدہ کیا تھا، اور چار روز کے اندر ہی تیار ہو گئی۔ وہ میرے بستر کے کنارے بیٹھی، میرے معائنے کے دوران یکے بعد دیگرے تین یا چار سگریٹ پھونکتی رہی اور آخری سگریٹ کے دوران ہی سو گئی تھی۔

مسٹر فان گولڈ اس کو جگانے سے ڈر رہے تھے۔ ماریا نے اس کو ایک ہلکا سا ٹہوکا دیا۔ مگر ڈاکٹر جاگی نہیں جب تک کہ اس کی سگریٹ جل کر اس کی انگلی تک پہنچ نہیں گئی تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی اور قالین پر ہی سگریٹ کو مسل کر بجھا دیا۔ وہ اعصابی ہیجانی کیفیت میں الفاظ تول تول کر بولتی تھی، ''مجھے معاف کرنا ہو گا۔ تین ہفتوں سے آنکھ بند نہیں کی ہے۔ میں 'کیسے مارک' میں پروشیا کے ریل گاڑی بھر بچوں کے ساتھ تھی۔ بچوں کو کشتی پر نہیں لے جا سکی۔ صرف فوجیوں کو لے گئی۔ چار ہزار بچے تھے۔ سب ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔'' اسی انداز سے وہ میرے رخسار تھپتھپا رہی تھی۔ اپنے لبوں میں سگریٹ اڑستے ہوئے، اس نے آستین چڑھائی اور اپنے بریف کیس سے انجکشن کی ایک شیشی نکالی۔

اپنے بازو میں انجکشن لگاتے ہوئے اس نے ماریا سے کہا، ''میں تمھیں بتا نہیں سکتی کہ اس بچے کو کیا ہو گیا ہے۔ یہاں نہیں، اسے اسپتال میں ہونا چاہیے۔ تم لوگوں کو یہاں سے چلے جانا چاہیے، مغرب کی طرف۔ کلائیوں، گھٹنوں اور کاندھوں کے جوڑوں میں ورم ہے۔ آخر میں دماغ پر حملہ ہو سکتا ہے۔ اس کو ٹھنڈے پانی کی پٹی لگاؤ۔ میں کچھ گولیاں چھوڑے جا رہی ہوں، ہو سکتا ہے کہ درد کے وجہ سے سو نہ سکے۔''

مجھے یہ کم گو ڈاکٹر پسند آئی، جس کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھے کیا تکلیف ہے، اور اس نے اس امر کا اعتراف بھی کر لیا۔ اگلے چند ہفتوں میں ماریا اور مسٹر فان گولڈ نے میرے ماتھے پر کئی سو ٹھنڈی پٹیاں رکھیں جس سے مجھے بہت آرام ملا، مگر میرے گھٹنوں، کلائیوں اور کاندھے کے جوڑوں اور سر کا ورم اور درد کم نہیں ہوا۔ جس چیز نے ماریا اور مسٹر فان گولڈ کو خوف زدہ کر دیا تھا، وہ سر کا ورم تھا۔ ماریا نے مجھے گولیاں دیں، وہ بہت جلد ختم ہو گئی تھیں۔ اس نے بخار کے گراف بنانے شروع کیے، پنسل اور رولر کے تجربے کیے، میرے درجۂ حرارت کے گراف کے اطراف بڑی خیالی شکلیں بنائیں، جن کے لیے چور بازار سے مصنوعی شہد کے بدلے حاصل کیا ہوا تھرمامیٹر دن میں پانچ بار استعمال کیا جاتا تھا۔ میرے بخار کا چارٹ کسی پہاڑی سلسلے کی طرح نظر آتا تھا جس میں خوفناک خالی جگہیں بھی تھیں ــــ میں کورِ ایلپس کے اور کورِ اینڈس کی برفیلی چوٹیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے درجۂ حرارت کے بارے میں کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔ صبح کے وقت عموماً ایک سو اور پانچ بجے دس بخار ہوا کرتا تھا؛ اور شام کے وقت بڑھ کر ایک سو دو ہو جاتا تھا، اور اپنی نشوونما کے زمانے میں میرا [درجۂ حرارت] زیادہ سے زیادہ ایک سو دو اعشاریہ سات ہو جایا کرتا تھا۔ میں نے اپنے بخار کے دوران طرح طرح کی چیزوں کے بارے میں سنا تھا، یعنی، میں ایک merry-go-round کی سواری کر رہا تھا، میں اس پر سے اُترنا چاہ رہا تھا مگر اُتر نہیں سکا۔ میں بہت سے چھوٹے چھوٹے بچوں میں سے ایک تھا، جو آگ بجھانے والے انجنوں میں، راج ہنسوں، کتوں، بلیوں، سوّروں اور بارہ سنگھاؤں کے خول میں بیٹھا چکر لگا رہا تھا۔ میں اس سے نکلنا چاہتا تھا مگر مجھے اس کی اجازت نہیں تھی۔ سارے چھوٹے چیخ رہے تھے، میری طرح وہ بھی فائر انجنوں سے اور راج ہنسوں، بلیوں، کتوں، سوّروں اور بارہ سنگھوں کے خول سے نکل جانا چاہتے تھے، وہ اس merry-go-round کو پسند نہیں کرتے تھے، مگر ان کو نکل جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس merry-go-round کے پاس آسمانی باپ کھڑا ہوتا تھا اور ہر بار جب merry-go-round رکتا تو وہ ایک اور چکر کی اُجرت ادا کر دیا کرتا تھا۔ اور ہم دعا

کرتے تھے: اے ہمارے جنتی باپ، ہم جانتے ہیں کہ آپ کے پاس بہت سی فالتو چیزیں ہیں، ہم جانتے ہیں کہ آپ merry go-round سے ہماری تواضع کرنا چاہتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ دنیا گول ہے۔ ازراہِ مہربانی اپنی جیبی کتاب پھینک دیں، اور کہیں کہ "رُک جاؤ، ختم، دور کے بند ہونے کا وقت ہے، ہم بے چارے بچے چکرا رہے ہیں، وہی ہمیں لائے ہیں؛ چار ہزار کو، وِستولا پر سے 'کاسے مارک' تک لائے ہیں، مگر ہم اس کو پار نہیں کر سکتے، اس لیے کہ آپ کا merry-go-round، آپ کا merry-go-round..." مگر خدا، ہمارا باپ، merry-go-round کا مالک، اپنے بڑے رحیمانہ انداز میں مسکرایا اور اس کے بٹوے سے ایک اور سکّہ اُڑتا ہوا آیا merry-go-round کو جاری رکھنے کے لیے! ہمارے چار ہزار بچوں کے لیے، بیچ میں کھڑے آسکر سمیت، آگ بجھانے والے انجنوں اور خول نما راج ہنسوں، کتوں، سؤروں اور بارہ سنگھوں میں، ایک چھلے کی صورت گھومتے ہوئے اور ہر بار جب میرا بارہ سنگھا — مجھے اب بھی یقین کہ وہ بارہ سنگھا ہی تھا — ہمیں اپنے باپ سے، اس merry-go-round والے سے، بھری جنت میں لے گیا، اس کے کئی چہرے تھے: وہ راسپوتین تھا، ہنستا اور دوسری سواری کے سکّے اپنے روحانی مسیحا کے دانتوں سے کاٹتا تھا؛ اور پھر وہ گوئٹے تھا، شاعر شہزادہ، جس کے ہاتھ میں نہایت خوب صورت کڑھا ہوا بٹوا تھا، اور جو سکّے اس میں سے نکالے گئے تھے، ان سب پر اس کے جنتی باپ کے حیاتی خاکے کی مہر لگی ہوئی تھی؛ اور ایک بار پھر راسپوتین نشے میں تھا، اور جناب فان گوئٹے سنجیدہ تھے۔ تھوڑا سا پاگل پن راسپوتین کے ساتھ، اور تھوڑی سی ہوش مندی گوئٹے کے ساتھ۔ راسپوتین کے ساتھ شدت پسند، تنظیمی قوتیں گوئٹے کے ہم راہ۔ بلوائی راسپوتین کے اطراف، کیلنڈر کے قول والے گوئٹے کے ساتھ — جب بالآخر merry-go-round آہستہ ہوگیا — اس لیے نہیں کہ میرا بخار کم ہو گیا تھا، بلکہ اس لیے کہ سکون پہنچانے والی شخصیت میرے بخار کے اوپر جھک گئی تھی، اس لیے کہ مسٹر فان گولڈ مجھ پر جھک گئے تھے اور merry-go-round کو روک دیا تھا۔ انھوں نے آگ بجھانے والے انجنوں کو، راج ہنس کو، اور بارہ سنگھے کو، راسپوتین کے کم قدر سکّوں

کو، گوئٹے کو نئے سرے سے تربیت کے لیے، ہمارے چار ہزار بدحواس بچوں کو، تیرتا ہوا، وستولا کے اُس پار ڈکاسے مارک، جنت کے دارالملکوت کی طرف — بھیج دیا، اور آسکر کو اس کے بسترِ علالت سے اٹھایا، Lysol کے بادل تک اُٹھایا، یعنی، مجھے جراثیم سے پاک کر دیا۔

یہ سب ایک جوں سے شروع ہوا تھا، جو بعد میں اس کی عادت بن گئی۔ پہلے اسے ننھے کُرٹ پر جوں ملی، اس کے بعد مجھ پر، ماریا پر اور خود اس پر۔ جوئیں شاید کالمُک چھوڑ گیا تھا، جس نے ماریا سے ماتسیرات کو چھین لیا تھا۔ مسٹر فان گولڈ کتنی زور سے چلایا تھا جب ان کو دیکھا تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں، سب کو طلب کیا تھا؛ اسے شبہ تھا کہ یہ کیڑے ان میں بھی پہنچ گئے ہیں۔

جب اس نے رول کیے ہوئے اوٹ اور مصنوعی شہد کے بدلے میں مختلف قسم کی جراثیم کش دوائیں حاصل کر لیں تو ہر روز اپنے آپ کو، اپنے پورے اہلِ خانہ کو، ماریا کو، اور مجھ کو جراثیم سے پاک کرنے لگا تھا۔ اس نے ہمیں رگڑا، ہم پر پھوار ماری، اور اسی کا پاؤڈر چھڑکا۔ اور جب وہ پھوار مار رہا تھا، پاؤڈر چھڑک رہا تھا، اور رگڑ رہا تھا تو میرا بخار آگ کی طرح بڑھ گیا تھا، اس کی زبان اِدھر اُدھر نکل رہی تھی، اور مجھے کاربجر کاربولک ایسڈ، لائم اور لائسول کے بارے میں معلوم ہوا جو اس نے پھوار کی صورت ڈالا تھا، چھڑکا تھا، جب وہ "ٹریبلنکا" کے مشقتی کیمپ میں جراثیم کشی کا کام کرتا تھا۔ ہر روز دو بجے دوپہر، جراثیم کُش ماریوز فان گولڈ کی سرکاری حیثیت میں وہ لائسول چھڑکتا تھا: کیمپ کی سڑکوں پر، بیرکس میں، غسل خانوں میں، شمشان بھٹیوں میں، کپڑوں کے ڈھیروں پر، ان پر جو غسل کے انتظار میں کھڑے ہوتے، ان پر جو غسل کے بعد لیٹے ہوتے، اس سب پر جو بھٹیوں سے نکلا ہوتا اور جو بھٹیوں میں جانے والا ہوتا تھا۔ اس نے سب کے نام لکھ لیے تھے، اس لیے کہ وہ ان سب کو جانتا تھا۔ اس نے مجھ بلاؤر کے بارے میں بتایا، جس نے اگست کے گرم دن جراثیم کشی کرنے والے کو مشورہ دیا تھا کہ کیمپ کی سڑکوں پر لائسول کے بجائے مٹی کا تیل چھڑک دے۔ مسٹر فان گولڈ نے اس کا مشورہ مان لیا تھا۔ اور بلاؤر کے پاس دیا سلائی تھی۔ ZOB کے زیف گرلانڈ نے ان سب سے رازداری کا حلف لیا۔ اور انجینئر گلیفسکی نے اسلحہ

خانے کا دروازہ توڑ لیا تھا۔ بلاور نے کیپٹن کنٹز کو گولی مار دی تھی۔ اِسٹولباخ اور وارنسکی نے زیسپیئس کو گلا دبا کر مار ڈالا تھا؛ دوسرے لوگوں نے ٹرانیکی کیمپ کے چوکی داروں کو قابو کر لیا تھا۔ کچھ بجلی کی ہائی ٹینشن باڑ کاٹتے ہوئے مر گئے تھے۔ سارجنٹ شوپکے، جو شاگردوں کو غسل خانے لے جاتے وقت ہمیشہ لطیفے سنایا کرتا تھا، کیمپ کے پھاٹک پر کھڑا گولیاں برسا رہا تھا، مگر یہ اس کے کام نہیں آیا اور سب ایک ساتھ اس پر چڑھ بیٹھے تھے: اُدیک کاوے، موئیل لیوٹ، اور ہموخ لیزر، ہرسٹ ڈامبلاٹ اور لیئیک زیکیل بھی شامل تھے، اور منو نیاز باران اپنی ڈیبورا کے ساتھ، اور لولیک بینگمان نے چلا کر کہا تھا: ''فان گولڈ کہاں ہے؟ قبل اس کے جہاز آجائیں، اس کو یہاں سے باہر نکالنا ہے۔'' مسٹر فان گولڈ اپنی بیوی لیوبا کے انتظار میں تھا۔ اس نے پکارا پھر بھی وہ نہیں آئی۔ لہٰذا انھوں نے اس کو پکڑ لیا، دائیں جانب یاکوب جیلینٹر تھا، بائیں جانب موردیشا شوار بارڈ تھا۔ اور ان کے سامنے ڈاکٹر اٹلاس بھاگا، جس نے ٹریبلنکا کیمپ میں، اور بعد میں ولنا کے جنگل میں لائسول کے چھڑکاؤ کا مشورہ دیا تھا اور کہتا تھا کہ لائسول زندگی سے زیادہ اہم ہے۔ یہی مسٹر فان گولڈ اس کی تائید کر سکتا تھا، اس لیے کہ اس نے ایک نہیں — شمار کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے — بہت سارے، مُردوں اور عورتوں کی لاشوں پر لائسول چھڑکا تھا اور بس۔ وہ جو لائسول میں بیرتا تھا، سب کے نام جانتا تھا، اور میرے لیے بھی، جب زندگی اور موت کا سوال تھا، اتنے نام یاد رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ پھر نام کم اہمیت کے ہو گئے تھے، زندہ کے، اور اگر زندہ کے نہیں تو مُردہ کے، کہ کتنوں کی مسٹر فان گولڈ کے جراثیم کش مادّوں سے جراثیم کشی ٹھیک سے اور وقت پر ہوئی تھی یا نہیں۔

رفتہ رفتہ بخار سے چھٹکارا مل گیا، اور اپریل کا مہینہ آ گیا تھا۔ ایک بار پھر merry-go-round بخار کا چکر چل گیا اور مسٹر فان گولڈ کو مردہ زندہ سب پر لائسول چھڑکنا پڑا تھا۔ اس کے بعد پھر بخار کم ہو گیا، اور اب اپریل ختم ہو رہا تھا۔ مئی کی شروعات میں میری گردن چھوٹی ہونے لگی اور سینہ چوڑا اور اونچا ہونے لگا، اس قدر کہ میں اپنے سر کو خم کیے بغیر اپنی ٹھوڑی سے آسکر کی ہنسلی کی ہڈی کو رگڑ سکتا تھا۔ ایک بار پھر بخار تھا اور لائسول۔ اور میں نے ماریا کی سرگوشی کے الفاظ سنے جو لائسول میں تیر رہے تھے، ''کاش اس

کی نشوونما گنج نہ ہو! کاش اس کے کوب نہ ہو! کاش اس کے بھیجے میں پانی نہ بھرے!''

مسٹر فان گولڈ نے ماریا کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ ان کے علم کے مطابق ایسے بھی لوگ تھے جو گنجی اور بھیجے میں پانی بھرنے کے باوجود بھی کامیاب رہے تھے۔ مثال کے طور پر ایک صاحب رومن فرائڈ ریخ تھے جو اپنی کوزہ پشتی سمیت ارجنٹائن گئے تھے اور سلائی کی مشین کا کاروبار شروع کیا تھا جو بہت بڑھا اور مشہور ہوا تھا۔ کامیاب کوزہ پشت فرائڈ ریخ کی کہانی ماریا کو تسکین تو نہیں پہنچا سکی تھی مگر اس کے بیان کرنے والے مسٹر فان گولڈ اتنے جذباتی ہو گئے تھے کہ انھوں نے ہماری کریانے کی دُکان کسی نئے چہرے کو دینے کا فیصلہ کر لیا۔ مئی کے درمیان، جنگ کے فوراً بعد، نئی مصنوعات بازار میں آنے لگی تھیں۔ اس نے سلائی کی مشین اور مشین کے فالتو پُرزے کا کاروبار شروع کر دیا مگر تبدیلی کے عرصے کے درمیان کریانے کی فرخت جاری رکھی تھی۔ کیسا دِل خوش کن زمانہ تھا۔ نقد ادائیگی کبھی کبھار ہی ہوتی تھی۔ ہر شے کسی شے کے بدلے میں مل جاتی تھی۔ مصنوعی شہد، اوٹس، چینی، آٹا، مارجرین اور ڈاکٹر اوٹکر بیکنگ پاؤڈر کی تھیلیوں کی بائیسکلوں میں، بائیسکلوں کے فالتو پرزوں کی بجلی کے موٹروں میں، اور ان کی اوزار میں قلبِ ماہیت ہو جاتی تھی۔ اوزار پوستین بن جاتے تھے، گویا مسٹر فان گولڈ جادو کے زور سے پوستین کو سلائی کی مشین بنا دیتے تھے۔ ننھا عُرٹ تبادلے کے اس کھیل میں کارآمد ہو گیا تھا۔ وہ گاہک لاتا، معاملات طے کرتا اور اس نئے کام میں ماریا سے زیادہ ماہر ہو گیا تھا۔ اب تقریباً ماتسیرات جیسا ہی زمانہ آ گیا تھا۔ ماریا کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی، ناخنوں کی تکلیف وہ پالش سمیت، پرانے گاہکوں کا انتظار کرتی جو اَب بھی شہر میں رہتے تھے، اور نئے گاہکوں سے معلوم کرتی کہ ان کی ضروریات کیا ہیں۔ عُرٹ پیدائشی زباں داں تھا۔ عُرٹ ہر جگہ موجود ہوتا تھا۔ مسٹر فان گولڈ اس پر بھروسا کرتے تھے، ابھی پانچ برس کا بھی نہیں ہوا تھا کہ سلائی کی مشینوں کا ماہر ہو گیا تھا۔ 'پان ہوف اشتراسے' کے چور بازار میں موجود سیکڑوں ماڈلوں کے درمیان ایک ہی نظر میں وہ اوّل درجے کی سنگر اور پاف مشینیں تلاش کر لیتا تھا۔ مسٹر فان گولڈ اس کے علم کی قدر کرتے تھے۔

مئی کے آخر میں میری نانی کوواچکی ہم سے ملنے آئی اور زور زور سے سانسیں

لیتی صوفے پر لیٹ گئی۔ وہ 'بساؤ' اور 'برنتاؤ' سے پیدل چل کر آئی تھی۔ مسٹر فان گولڈ گرٹ کے بہت معترف تھے اور ماریا کے بارے میں بھی اچھے خیالات رکھتے تھے۔ انھوں نے میری نانی اماں کو میری بیماری کا سارا قصہ تفصیل سے سنایا اور بار بار جراثیم کش دوا کی افادیت کا ذکر کرتے رہے۔ آسکر کے لیے بھی ان کے پاس تعریف کے خاصے الفاظ تھے۔ میں بہت خاموش اور مہذب رہتا تھا اور بیماری کے دوران ایک بار بھی رویا نہیں تھا۔

میری نانی اماں کو مٹی کے تیل کی ضرورت تھی اس لیے کہ 'بساؤ' میں روشنی نہیں تھی۔ مسٹر فان گولڈ نے اس کو مٹی کے تیل کے بارے میں 'ٹریبلنکا' کیمپ کی مختلف النوع ذمے داریوں سے اور جراثیم کشی کے ذمے دار کی حیثیت میں اپنے تجربات سے آگاہ کیا۔ اس نے ماریا سے دو بوتلوں میں مٹی کا تیل بھرنے، مصنوعی شہد کی ایک بوتل تیار کرنے اور ساتھ میں طرح طرح کی جراثیم کش دوائیں تیار کرنے کے لیے کہا، اور وہ تمام باتیں سنیں جو 'بساؤ' میں لڑائی کے دوران پیش آئی تھیں۔ اس نے 'ویریک' کی تباہی کی تفصیل بھی بیان کی جس کو کچھ عرصہ قبل 'فیروگا' کے نام سے موسوم کر دیا گیا تھا۔ اور یہ بھی کہ 'بساؤ' کو بھی اس کا قبل از جنگ کا نام 'بائیسیو' دے دیا گیا تھا۔ اور اسےبکر کو، جو 'رامکاؤ' کے کسانوں کا بہت مستعد لیڈر تھا، جس نے اس کے بھائی ونسنٹ کے بیٹے کی بیوہ 'ہیڈ وگ' سے شادی کر لی تھی — جو ڈاک خانے میں مارا گیا تھا — فارم کے مزدوروں نے دفتر کے باہر پھانسی دے کر مار ڈالا تھا۔ وہ تو ایکر سے شادی کرنے کی پاداش میں ہیڈ وگ کو بھی لٹکانا چاہ رہے تھے، باوجود کہ وہ ایک پولش ہیرو کی بیوہ تھی، اس لیے اور بھی کہ اسٹیفن لیفٹیننٹ تھا اور اس کا جرمن لیگ آف گرلز سے تعلق تھا۔ "چلو اچھا ہوا۔" نانی اماں نے کہا، "اسٹیفن کو مزید تکلیف نہیں دے سکے اس لیے کہ وہ آرکٹک میں مارا گیا تھا۔ وہ لوگ مارگا کو لے جا کر کیمپ میں بند کر دینا چاہتے تھے، مگر ونسنٹ نے اپنا منہ کھولا، اور اس دن وہ اس طرح بولا، جیسا کہ اپنی زندگی میں کبھی نہیں بولا تھا۔ اور اب ہیڈ وگ اور مارگا دونوں ہمارے ساتھ ہیں اور کھیتی باڑی میں مدد کرتی ہیں۔ مگر، ونسنٹ کو بہت زیادہ باتیں کرنے کی پاداش میں نکال دیا گیا تھا، اور میرا خیال ہے کہ وہ زیادہ دن نہیں چلے گا۔ اور اس بوڑھی نانی اماں نے بھی بہت تکلیف

اٹھائی ہے؛ سارے بدن میں درد، دِل میں اور سر میں بھی درد رہتا ہے، جہاں کسی احمق نے مجھے مارا تھا،اس لیے کہ اُس کے نزدیک یہی کرنا صحیح تھا۔‘‘

یہ تھا اگوا چکی کا رونا دھونا، اپنا سر پکڑنا اور اٹھتے وقت میرے سر پر تھپتھپانا۔اس نے مندرجہ ذیل باتوں پر غور کرتے ہوئے کہا،’’ہاں آسکر، کشوبیائی ایسے ہی ہوتے ہیں۔وہ ہمیشہ نقصان اُٹھاتے ہیں۔اب تم بھی وہاں جارہے ہو جہاں کے حالات اچھے ہیں،اب نانی اماں اکیلی رہ جائے گی۔ کشوبیائی لوگ کہیں جانے کے معاملے میں اچھے نہیں۔ وہ وہیں ٹھہرے رہتے ہیں جہاں کے ہوتے ہیں اور سر تہیں اٹھاتے ہیں تا کہ ہر کوئی ان کو نشانہ نہ بنا سکے،اس لیے کہ نہ ہم اصلی پولش ہیں اور نہ اصلی جرمن،اور اگر آپ کشوبیائی ہیں تو آپ نہ جرمنوں کے لیے، نہ پولش کے لیے قابلِ قبول ہیں۔وہ ہر شے خالص چاہتے ہیں۔‘‘

میری نانی اماں زور سے ہنسی، مٹی کی بوتل،مصنوعی شہد اور جراثیم کش دوا کو اپنے چار لہنگوں کے نیچے چھپا لیا، باوجود شدید فوجی، سیاسی اور تاریخی اتھل پتھل کے جن کا آلو جیسا رنگ کبھی نہیں اترا۔

وہ جانے ہی والی تھی مگر مسٹر فان گولڈ نے چند منٹ رُک جانے کے لیے کہا۔وہ چاہتا تھا کہ نانی اماں کی اس کی بیوی لیوبا سے اور اس کے بقیہ اہلِ خانہ سے ملاقات ہوجائے۔ جب اس کی بیوی نہیں آئی تو میری نانی اماں نے کہا،’’کوئی بات نہیں، میں بھی اکثر لوگوں کو ایگنس کے نام سے پکارتی ہوں۔ میں کہتی ہوں، ایگنس، میری بیٹی، آؤ کپڑے نچوڑنے میں اپنی بوڑھی ماں کی مدد کرو اور تمھاری لیوبا ہی کی طرح وہ بھی نہیں آتی اور وِنسنٹ میرا بھائی، حالاں کہ بیمار ہے،مگر رات کے اندھیرے میں دروازے کے باہر کھڑا رہتا ہے، اسے اپنے بیٹے جان کو جو ڈاک خانے میں کام کرتا تھا اور مارا گیا، اتنی زور زور سے پکارنا نہیں چاہیے کہ اس کے پڑوسیوں کی نیند میں خلل پڑے۔‘‘

وہ دروازے کے قریب پہنچ چکی تھی اور سر پر اپنا رومال باندھ رہی تھی، جب میں نے اپنے بستر سے اسے ’’بابکا، بابکا‘‘ کہہ کر پکارا، جس کے معنیٰ نانی اماں، نانی اماں ہوتے ہیں۔وہ پلٹی اور اپنے لہنگے کو ذرا سا اوپر اٹھایا، گویا مجھے اس کے اندر لے لینا چاہتی تھی، مگر

پھر شاید اسے یاد آ گیا کہ وہ جگہ تو پہلے ہی مٹی کے تیل کی بوتلوں، شہد اور جراثیم کش دواؤں سے بھری ہوئی ہے اور میرے، یعنی آسکر کے بغیر ہی چلی گئی۔

جون کے شروع ہوتے ہی پہلا قافلہ مغرب کے لیے روانہ ہو گیا۔ ماریا نے کچھ نہیں کہا، مگر میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ فرنیچر، دُکان، مکان، 'ہنڈن برگ ایلی' کی دونوں جانب بنے مقبروں، اور 'ساپیے' قبرستان کے مٹی کے ڈھیر کو الوداع کہہ رہی تھی۔

کبھی کبھی شام کے وقت، گریٹ کے ساتھ تہ خانے میں جانے سے پہلے، وہ میرے بستر کے قریب آ بیٹھتی، بے چاری میری مما کے پیانو کے قریب اور اپنے بائیں ہاتھ سے ہارمونیکا بجاتی اور ساتھ ہی کوشش کرتی کہ اپنے داہنے ہاتھ کی ایک انگلی سے اپنے سُر سے پیانو کا سُر بھی ملاتی رہے۔

یہ موسیقی مسٹر فان گولڈ کو اچھی نہیں لگتی تھی؛ وہ ماریا کو روک دیتا، وہ ہارمونیکا بجانا بند کر دیتی اور پیانو کو بند کرنے لگتی تو وہ ذرا دیر اور بجانے کے لیے کہتا۔

پھر اس نے شادی کا پیغام دے دیا۔ آسکر کو اس کی توقع تھی۔ مسٹر فان گولڈ اب اپنی لیوبا کو کم کم پکارتا تھا اور گرمی کی ایک شام، جب اسے اطمینان ہو گیا کہ لیوبا چلی گئی ہے، تو اس نے گنگناتے ہوئے ماریا کو باقاعدہ شادی کا پیغام دے دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اس کے دونوں بچوں کی، جن میں بیمار آسکر شامل تھا، دیکھ بھال بھی کرے گا۔ فان گولڈ نے اسے کاروبار میں حصے دار بنانے کی بھی پیش کش کی۔

ماریا بائیس برس کی تھی۔ اس کی نوجوانی کے دنوں کا حسن، جو اتفاقیہ طور پر رفتہ رفتہ بڑھتا گیا تھا، اب قائم ہو گیا تھا۔ جنگ شروع ہونے سے چند ماہ پہلے ماتسیرات نے اس کے بالوں کو گھنگھریالا بنانے کا خرچ برداشت کیا تھا۔ اب وہ میرے زمانے والی چٹیا نہیں بناتی تھی۔ اب اس کے بال شانوں پر بکھرے ہوتے تھے، جن کے باعث اس کی شخصیت میں نکھار اور وقار پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اب ذرا ترش رو لڑکی بن گئی تھی اور اس ترش رو لڑکی نے 'نہیں' کہہ دیا؛ مسٹر فان گولڈ کا پیغام قبول نہیں کیا۔ ماریا اس قالین پر، جو کبھی ہمارا تھا، کھڑی ہوئی، اس کی ایک جانب گریٹ تھا اور اس نے ٹائل سے بنے چولھے کی طرف

اپنے انگوٹھے سے اشارہ کیا اور مسٹر فان گولڈ اور آسکر نے اس کو کہتے ہوئے سنا، "یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ جگہ پوری طرح صاف ستھری کر دی گئی ہے۔ ہم 'رہائن لینڈ' جا رہے ہیں جہاں میری بہن گسیٹے رہتی ہے۔ اس نے ایک ہیڈ ویٹر سے شادی کر لی ہے۔ اس کا نام گوئسٹر ہے، اور وہ ہم کو عارضی طور پر رکھ لے گا، ہم تینوں کو۔"

اگلے دن اس نے درخواست دے دی اور تین دن بعد ہمارے کاغذات آگئے۔ اس کے بعد سے مسٹر فان گولڈ کو چپ لگ گئی تھی۔ اس نے دکان بند کر دی۔ جب ماریا اپنا سامان باندھ رہی تھی، وہ اندھیری دکان میں، ترازو کے قریب کاؤنٹر پر بیٹھا تھا۔ اس کی 'منی' کہنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی، مگر جب ماریا الوداع کہنے آئی تو وہ کاؤنٹر سے اتر گیا، اپنی بائیسکل اور ٹریلر نکالا، اور کہا کہ وہ ہم کو اسٹیشن پہنچا دے گا۔

ہمیں پچاس پاؤنڈ وزن ساتھ لے جانے کی اجازت تھی۔ ربڑ کے ٹائروں والے ٹریلر پر آسکر اور سامان لادا گیا۔ مسٹر فان گولڈ بائیسکل کو دھکا دے رہا تھا۔ ماریا نے کرٹ کا ہاتھ پکڑ لیا تھا اور جب ہم بائیں مڑ کر 'ایلسن اشتراسے' میں داخل ہو رہے تھے کہ اس نے پلٹ کر آخری بار دیکھا تھا۔ میں 'لیبس وگ' پر آخری نظر نہیں ڈال سکا تھا اس لیے کہ مجھے گردن موڑنے سے درد ہوتا تھا۔ آسکر کا سر بالکل ساکت تھا، صرف آنکھوں کے ذریعے ہی وہ اپنی حرکت قائم رکھ سکتا تھا، کہ میں الوداع ہو رہا تھا 'میرین اشتراسے' سے، 'اشتراتسیاخ' سے، 'کلائن ہامر پارک' سے، تمرنگ سے جس میں اب بھی غلاظت اُبل رہی تھی، 'باتھوف اشتراسے' سے، اپنے غیر منہدم سیکریڈ ہارٹ چرچ سے، اور 'لانگ فوز' اسٹیشن سے جس کو Wrzeszcz کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے، مگر اس کا تلفظ کون ادا کر سکتا ہے؟

ہمیں انتظار کرنا پڑا تھا۔ بالآخر جب گاڑی آئی تو وہ مال گاڑی تھی۔ لوگ بہت تھے، اور بچے بھی بے شمار۔ سامان کی تلاشی لی گئی اور وزن کیا گیا۔ فوجیوں نے ہر ڈبے میں پیال کا ایک گٹھا ڈال دیا تھا۔ موسیقی نہیں تھی، مگر کم از کم بارش تو نہیں ہو رہی تھی۔ موسم جزوی طور پر ابر آلود تھا اور مشرقی ہوا چل رہی تھی۔

ہمیں آخر سے چوتھے ڈبے میں جگہ مل گئی۔ مسٹر فان گولڈ نیچے ریل کی پٹڑی

پر کھڑا تھا، اس کے پتلے، سُرخی مائل بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ جب انجن نے ایک دھکے سے اپنے آنے کا اعلان کیا، تو وہ قریب آیا، ماریا کو تین پیکٹ مارجرین کے اور دو مصنوعی شہد کے دیے۔ اور جب پولش زبان میں اعلان، اور رونا دھونا، چیخنا چلانا شروع ہوا اور گاڑی حرکت کرنے لگی تو اس نے ہمارے سامان میں جراثیم کش دوا کے ایک پیکٹ کا اضافہ کردیا تھا — لائسول زندگی سے زیادہ ضروری شے ہے۔ پھر ہم مسٹر فان گولڈ کو پیچھے چھوڑتے حرکت کرنے لگے تھے۔ وہ اپنے سُرخی مائل ہوا میں لہراتے بالوں سمیت کھڑا، چھوٹا اور چھوٹا ہوتا جا رہا تھا، جیسا کہ اس وقت ہوتا ہے جب گاڑیاں جانے لگتی ہیں، اور پھر سوائے ہلتے ہوئے ہاتھوں کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور جلد ہی وہ بالکل غائب ہو گیا تھا۔

# مال گاڑی میں نشوونما

وہ درد اور دُکھن اب بھی ہے۔ انھوں نے واپس مجھے میرے تکیے پر لٹا دیا ہے۔ ہڈیوں اور جوڑوں میں ہونے والی پسپائی کی آوازوں سے پیچھا چھڑانے کی خاطر میں نے دانت پیسنے شروع کر دیے ہیں۔ میں اپنی دسوں انگلیاں دیکھتا ہوں اور مجھے اعتراف ہے کہ ان پر ورم ہے۔ نقارہ نوازی کی آخری کوشش سے ثابت ہو گیا ہے کہ آسکر کی انگلیوں پر نہ صرف معمولی سا ورم ہے، بلکہ وہ عارضی طور پر نقارہ بجانے کے قابل نہیں؛ وہ چوبِ نقارہ پکڑ نہیں پا رہی ہیں۔

میرا فاؤنٹین پن بھی میرے احکامات سے انکار کر رہا ہے۔ مجھے برونو سے ٹھنڈی پٹیوں کی فرمائش کرنی ہو گی۔ جب میرے ہاتھ، پاؤں اور گھٹنے سب ٹھنڈی پٹیوں میں لپٹے ہوئے ہوں گے اور جب وہ میرے سر پر بھی ٹھنڈا کپڑا رکھ دے گا، تب میں اس کو پنسل اور کاغذ دوں گا، اس لیے کہ میں اس کو اپنا فاؤنٹین پن دینا پسند نہیں کرتا۔ کیا برونو ٹھیک سے میری بات سننا پسند کرے گا؟ کیا وہ 12 جون 1945 کو مال گاڑی میں شروع ہونے والے سفر کے بارے میں صحیح اندراج کر سکے گا؟ برونو گلِ لالہ کی تصویر کے نیچے میز پر بیٹھا ہے۔ اب وہ اپنا سر گھماتا ہے، مجھے اس کا وہ پہلو دکھاتا ہے جس کو چہرہ کہا جاتا ہے، جب کہ کسی اسطوری جانور کی طرح آنکھ مجھ سے پرے، ایک بائیں جانب اور دوسری دائیں جانب دیکھ رہی ہے۔ اپنے پپڑی پڑے ہونٹوں پر آڑی پنسل رکھ لیتا ہے۔ یہ کسی کے انتظار کرنے کے طریقے کی نقل ہے، مگر یہ اعتراف کرتے ہوئے بھی کہ واقعی وہ میرے بولنے کے

اور کہانی لکھنا شروع کرنے کے اشارے کے انتظار میں ہے، اس کے خیالات گرہوں سے بھری فضا سی میں مصروف ہیں۔ وہ چیزوں کو آپس میں گرہ لگا کر باندھ دے گا، جب کہ آسکر کی ذمے داری بہت سے الفاظ کی مدد سے میری گرہ بند تاریخ کو سلجھانے کی ہوگی۔ اب برونو لکھ رہا ہے:

---

من کہ مسمی برونو منسٹربرگ سکنہ 'آلٹینا' در 'ساور لینڈ' غیر شادی شدہ و بے اولاد، ملازم بہ حیثیت مرد نرس، نجی پولیمین در مقام دماغی اسپتال ہوں۔ مسٹر ماتسیرات تقریباً ایک برس سے میرے زیرِ علاج ہیں۔ اور بھی کئی افراد میرے زیرِ علاج ہیں، مگر اس موقعے پر میں ان کے بارے کچھ نہیں کہنا چاہوں گا۔ مسٹر ماتسیرات سب سے بے زبان اور اچھے مریض ہیں۔ وہ کبھی اتنے وحشی نہیں ہو جاتے کہ مدد کے لیے مجھے دوسرے نرسوں کو بلانا پڑے۔ آج انھوں نے مجھ سے اپنی ضرورت سے زیادہ تھکی انگلیوں کو آرام دینے کی خاطر اور گرہ دار اشکال بنانے سے روکنے کے لیے کہا ہے۔ پھر بھی، میں نے اپنی جیب میں کچھ فالتو دھاگے رکھ لیے ہیں اور جیسے جیسے وہ کہانی بیان کریں گے میں، اپنی تحریر مسٹر ماتسیرات کی کہانی کے مطابق، ایک پیکر کے زیریں اعضا سے شروع کروں گا، جس کو میں ''مشرق کا مہاجر'' کہوں گا۔ یہ امر میں نے مریض کی بیان کی ہوئی کہانیوں میں سے پہلی کہانی سے اخذ کیا ہے۔ اب تک میں نے ان کی نانی کے بارے میں تفصیلات دیکھی ہیں، جس کو میں ''چار لہنگوں کے آلو'' کہوں گا، ان کے نانا کو پانی میں تیرتے تختوں والا آدمی، جس کے دھاگوں کے باعث میں اس کو ذرا بڑھا چڑھا کر ''کولمبس'' کہتا ہوں؛ میرے دھاگوں نے ان کی بے چاری مما کو ''مچھلی خور حسینہ'' میں بدل دیا ہے، اور ان کے دونوں باپ، ماتسیرات اور جان برانسکی ''اسکیٹ کے دو کھلاڑی'' بن گئے ہیں۔ میں نے ان کے دوست ہربرٹ ٹروزنسکی کی زخموں کے نشانوں سے بھری پشت کا عنوان Rough Going رکھا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے ایسی جگہوں اور شان دار عمارات سے بھی خیالات لیے ہیں جیسے کہ پولش ڈاک خانہ، 'اسٹاک ٹرم'، 'اسٹاٹ تھیٹر'، 'آرسنل پیسیج'، 'میری ٹائم میوزیم'، گریف سبزی فروش کی دُکان کا تہ خانہ، پستلاٹسی اسکول، برونسٹر کا حمام، چرچ آف سیکریڈ

بارٹ، فور سیزن کیفے، بالٹک چاکلیٹ فیکٹری، اٹلانٹک دیواروالے پول باکس، آئفل ٹاور، برلن کا اینٹھی اسٹیشن، رائمس کتھیڈرل، نہ کم اور نہ بیش، وہ فلیٹ جہاں مسٹر ماتسیرات نے اپنی زندگی کی پہلی روشنی دیکھی تھی۔ 'ساپے' اور 'ہرمہ نا ؤ' کے قبرستانوں کی چار دیواروں اور لوح مزارات نے کچھ تزئین کے مشورے بھی دیے ہیں؛ یعنی کرہ بالائے کرہ، میں نے وسٹولا اور سین دریاؤں کو رواں کیا ہے، اور بالٹک و اٹلانٹک کی لہروں کو خاص طور پر ساحل سے ٹکرانا سکھایا ہے۔ میں نے کشوبیائی آلو کے کھیتوں اور نارمن مرغ زاروں کے دھاگوں کے ٹکڑوں کو شکل عطا کی ہے، اور باقی بچ رہنے والی زمین کو آباد کیا ہے، جس کو میں اختصار میں یورپ کہتا ہوں، جس میں ایسی بھی شخصیتیں ہیں جیسے ڈاک خانے کے دفاع کرنے والے، کریانہ مرچنٹ، روسٹرم کے اوپر والے لوگ، روسٹرم کے نیچے والے لوگ، اسکول کے سینگ بردار لڑکے، عجائب خانوں کے آنجہانی رکھوالے، کرسمس کی تیاری کرنے والے طفلانِ خطا کار، غروب آفتاب والے پولش گھڑ سوار، تاریخ ساز چیونٹیاں۔ محاذ کے تھیٹر کے کھڑے سپاہی، ٹربیلنکا کیمپ کی جراثیم کشی کرنے والے۔ میں نے ابھی ''مشرق کے مہاجر'' کا ذکر شروع کیا ہے، جو آگے چل کر شاید مشرق کے مہاجرین کے گروہ میں تبدیل ہو جائے گا۔

12 جون 1945 کو، تقریباً گیارہ بجے دن، مسٹر ماتسیرات ڈانزیگ سے پسپا ہو گئے، جس کو ان دنوں 'گڈانسک' کہا جاتا تھا۔ ان کے ساتھ، بیوہ ماریا ماتسیرات تھیں، جن کو میرے مریض اپنی سابق معشوق کہتے ہیں، اور اُن کا بیٹا کرٹ ماتسیرات میرے مریض کے بیان کے مطابق ان کا بیٹا ہے۔ اس کے علاوہ وہ بیان کرتے ہیں کہ مال گاڑی کے ڈبے میں بتیس دوسرے افراد تھے، جن میں، راہباؤں کے لباس میں ملبوس چار فرانسسکی راہبائیں بھی تھیں، اور سر پر رومال باندھے ایک نوجوان لڑکی تھی جو مسٹر ماتسیرات کی شناخت کے مطابق لوسی رینوارڈ تھی۔ کئی بار دُہرائے جانے والے سوالات کے جواب میں میرے مریض نے اعتراف کیا ہے کہ اس لڑکی کا اصل نام 'ریجائنا رائیک' تھا مگر وہ ایک لومڑی جیسے تکونے چہرے والی کے بارے میں مسلسل باتیں کرتا رہتا ہے اور اس کو لوسی کے نام سے ہی پکارتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود، اس نوجوان لڑکی کا اصل نام، جس کے بیان کرنے کی اجازت چاہتا

ہوں، مس ریچانا رانگ ہی تھا۔ وہ اپنے والدین، والدین کے والدین اور ایک بیمار عم کے ساتھ سفر کر رہی تھی، جو اس کے مطابق، معدے کے سرطان میں مبتلا تھا۔ اس کا بیمار عم بہت باتیں کرتا تھا اور جلد ہی اس نے خود کو سوشل ڈیموکریٹ شناخت کرا دیا تھا۔

جہاں تک میرے مریض کو یاد ہے، 'گڈینیا' تک کے سفر میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی، جو ساڑھے چار برس قبل سے 'گوٹن ہافن' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جب تک ریل گاڑی 'زوپوٹ' سے گزر نہیں گئی تھی، 'اولیوا' کی دو عورتیں، کئی بچے اور 'لانگ فوز' کا ایک بزرگ شخص گریہ کر رہے تھے، جب کہ راہبائیں دعا میں مصروف ہو گئی تھیں۔

گاڑی 'گڈینیا' میں پانچ گھنٹے رُکی رہی۔ دو عورتیں اور چھ بچے ڈبے میں داخل کیے گئے تھے۔ جیسا کہ میرے مریض نے بتایا ہے، سوشل ڈیموکریٹ صاحب نے اس بنیاد پر اصرار کیا کہ وہ علیل ہیں، ماقبل جنگ کے سوشل ڈیموکریٹ ہونے کے ناتے خصوصی سلوک کے حق دار ہیں، مگر جب انھوں نے بیٹھ جانے اور اپنی زبان بند کرنے سے انکار کر دیا تو قافلے کے نگہبان پولش افسر نے ان کے رخسار پر ایک زوردار چانٹا رسید کیا اور ان کو بہت رواں جرمن زبان میں سمجھا دیا تھا کہ وہ، یعنی پولش افسر، نہیں جانتا کہ سوشل ڈیموکریٹ کسے کہتے ہیں۔ دورانِ جنگ اس کو جرمنی کے مختلف حصوں میں جبری دورے کرنے پڑے تھے، مگر اس کے کان نے کبھی سوشل ڈیموکریٹ کے الفاظ سنے بھی نہیں تھے۔ معدے کے سرطان کے مریض سوشل ڈیموکریٹ کو موقع ہی نہیں ملا کہ وہ پولش افسر کو اپنے اغراض و مقاصد، نوعیت اور جرمنی کی سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کی تاریخ سے آگاہ کر سکتا، اس لیے کہ پولش افسر ڈبے سے چلا گیا تھا، دروازے بند کر دیے تھے اور باہر سے چٹخنی لگا دی گئی تھی۔

میں یہ لکھنا تو بھول ہی گیا کہ ہر مسافر پیال پر بیٹھا یا لیٹا تھا۔ جب گاڑی نے اس دوپہر دیر سے حرکت شروع کی تو کچھ عورتوں نے چیخ کر کہا تھا، ''ارے، ہم تو دانتسگ کی طرف واپس جا رہے ہیں،'' مگر وہ غلطی پر تھیں۔ وہ حرکت دراصل ڈبوں کو آگے پیچھے کرنے کی غرض سے ہوئی تھی، اور جلد ہی وہ مغرب کی طرف رواں، 'اِسٹالپ' جا رہے تھے۔ ہمارے مخبرین بتاتے ہیں کہ مغرب کے اس سفر کو چار دن لگ گئے تھے؛ سابقہ طرف

دار اور نوجوان پولش غنڈے کھلے میدانوں میں بار بار ریل گاڑی روک لیتے تھے۔ غنڈے سرکانے والے دروازے کھولتے جس سے کچھ تازہ ہوا داخل ہوتی، مگر کاربن آکسائیڈ کے ساتھ ہر بار وہ مسافروں کا کچھ سامان ساتھ لے جاتے۔ جب بھی نوجوان ڈکیت مسٹر ماتسیرات کے ڈبے میں داخل ہوتے، وہ چار راہبائیں کھڑی ہو جاتیں اور اپنی اپنی صلیبیں بلند کر دیتی تھیں۔ ان چار صلیبوں نے نوجوانوں پر گہرا اثر ڈالا تھا مگر وہ مسافروں کے سوٹ کیس اور سفری تھیلے سڑک پر پھینکنے سے باز نہیں آئے۔

جب اس سوشل ڈیموکریٹ نے ایک کاغذ پیش کیا جس میں وامبنگ یا گڈانسک میں متیم پولینڈ کے اربابِ اقتدار نے تصدیق کردی تھی کہ وہ 1931 سے 1937 تک اپنی پارٹی کے سارے واجبات ادا کرتا رہا ہے، مگر ان غنڈوں پر کوئی اثر نہیں ہوا، بلکہ انھوں نے تو اس کے ہاتھ سے وہ کاغذ چھین لیا اور اس کے دو سوٹ کیس اور اس کی بیوی کا سفری تھیلا بھی لے گئے تھے؛ اور پومیریائی' تازہ ہوا میں وہ بڑے چار خانے والا سرما کا ایک نفیس کوٹ بھی لے گئے جس پر سوشل ڈیموکریٹ لیٹا رہتا تھا۔

اس سب کے باوجود مسٹر ماتسیرات کہتے ہیں کہ وہ لڑکے باتمیز معلوم ہوتے تھے اور ان پر اچھا اثر چھوڑا تھا۔ ان کا خیال ہے کہ یہ ان کے رہنما کا اثر تھا اور انھوں نے مسٹر ماتسیرات کو خوشی اور غم کے ساتھ، گرد جھاڑنے والوں کے کماں دار اِسٹورٹی بیکر کی یاد دلا دی تھی۔

جب وہ نوجوان، جو اِسٹورٹی بیکر سے بہت مشابہ تھا، مسز ماریا ماتسیرات کے ہاتھوں سے اس کا سفری تھیلا چھین رہا تھا مسٹر ماتسیرات بالکل آخری لمحے وہاں پہنچ گئے اور انھوں نے اپنی خاندانی البم بچا لی، خوش قسمتی سے جو سب سے اوپر رکھی ہوئی تھی۔ نوجوان ڈاکو غصے میں آ گیا، مگر جب میرے مریض نے البم کھول کر اپنی نانی اماں کو واچکی کی ایک تصویر دکھائی تو اس لڑکے نے بلاشبہ اس کو اپنی نانی سمجھ کر ماریا کا سفری تھیلا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی نوکیلی پولش ٹوپی کی طرف دو انگلیاں اُٹھا کر فوجی سلام کرتے ہوئے ماتسیرات کے اہلِ خانہ کی جانب رُخ کیا اور ''الوداع، گڈ بائی'' کہا، ماتسیرات کے سفری تھیلے کو چھوڑا اور کسی اور کا سوٹ کیس لے کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ کار میں چلتا بنا۔

ایک معمولی سی انڈر ویئر کے علاوہ اس سفری تھیلے میں، جو خاندانی البم کے طفیل بچ رہا تھا، کتابیں، بینک کی کتابیں اور ماتسیرات کریانہ اسٹور کے ٹیکس کے کاغذات، یاقوت کا نیکلس جو کبھی ماتسیرات کی ماں کی ملکیت تھا، جس کو میرے مریض نے جراثیم کش دوا کے پیکٹ میں چھپا رکھا تھا؛ تعلیماتی ضخیم جلد، جس میں راسپوتین کے اقتباسات اور گوئٹے کے آدھے انتخابات بھی مسٹر ماتسیرات کے سوئے مغرب سفر میں ہمراہ تھے۔

میرے مریض نے مجھے بتایا کہ اس سفر کے دوران وہ اکثر تصویری البم کو دیکھتا، کبھی تعلیماتی جلد کو کھولتا، اور ان دونوں جلدوں سے، اپنے جوڑوں میں شدید درد کے باوجود، تفکر کے کئی گھنٹے گزار لیا کرتا تھا۔

اس نے مجھ سے خاص کر یہ بھی بتانے کے لیے کہا ہے کہ اس تمام ہل جُل اور اچھال بیچ، پٹری کی اَول بدل، گاڑی کے پہیوں کے اگلے دُھرے کی مسلسل لرزش نے جس کے عین اوپر وہ لیٹا ہوا تھا، اس کی نشوونما میں اعانت کی تھی۔ اس کے بدن کی چوڑائی رُک گئی اور لمبائی میں اضافہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کے جوڑوں کو، جن میں ورم تھا مگر سوزش نہیں تھی، پُرسکون رہنے کا موقع مل گیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے کان، ناک، اور شاید اعضائے تناسل بھی — مجھے بتایا گیا ہے کہ — ریل گاڑی کی گڑگڑاہٹ سے بڑھے ہیں۔ جب تک گاڑی حرکت میں رہتی، مسٹر ماتسیرات کو جوڑوں کا درد بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ صرف اس وقت، جب ہم درد لوگوں کے لیے، یا لونڈے لپاڑوں کے روکے گاڑی رُکتی تو — اس کے کہے کے مطابق — تیز درد اور چبھن شروع ہو جاتی تھی، جس کو، جہاں تک ممکن ہوتا، وہ خاندانی تصویروں کے البم کے مطالعے سے بہلاتا رہا تھا۔

اس نے مجھے بتایا ہے کہ پولش اسٹورتی بیکر کے علاوہ بہت سے نوجوان ڈاکوؤں کو، اور ادھیڑ عمر کے ایک ہم درد کو بھی، ان خاندانی تصویروں میں دل چسپی تھی۔ وہ سخت جان جنگجو سب کچھ چھوڑ کر بیٹھ گیا، سگریٹ سلگائی، اور ایک بھی مستطیل چھوڑے بغیر البم کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اس نے نانا کوولچکی کی شباہت سے شروعات کی تھی اور مسز ماریا اور اس کے بیٹے، ایک، دو، تین، چار برس کے کرٹ کی تصویریں بھی دیکھیں۔ میرے مریض نے یہ

بھی بتایا تھا کہ وہ خاندان کے دیہی مناظر دیکھ کر مسکرایا بھی تھا۔ اس ہم درد کو آنجہانی مسٹر ماتسیرات اور مسٹر ہیلمرز کے جو 'رامکاؤ' کے کسانوں کا لیڈر تھا، کالر پر لگے پارٹی نشان دیکھ کر خفگی ہوئی تھی جس نے پولش ڈاک خانے کے دفاع کرنے والے جان برانسکی کی بیوہ سے شادی کر لی تھی۔ مریض نے مجھ بتایا کہ اس نے ایذا پہنچانے والے اس نشان کو تنقید کرنے والوں کی نظروں کے سامنے قلم بنانے والے اپنے چاقو سے کھرچ کر مٹا دیا تھا۔

مسٹر ماتسیرات نے مجھے یہ بتانا مناسب سمجھا تھا کہ یہ ہم درد، اور دوسرے ہم درد لوگوں کی طرح، اصلی ہم درد شخص تھا۔ میرے مریض کے بقیہ لیکچر کے مطابق کوئی جزوی ہم درد نہیں ہوا کرتا۔ اصلی ہم درد ہمیشہ، زندگی بھر، ہم درد ہی رہتے ہیں۔ وہ معزول حکومتوں کو دوبارہ اقتدار میں لاتے ہیں اور دوسرے ہم درد افراد کی مدد سے موجودہ حکومتوں کو گراتے بھی ہیں۔ مسٹر ماتسیرات مُصر تھے اور ان کا یہ نظریہ میرے نزدیک قابلِ قبول تھا کہ ان تمام لوگوں میں سے جو سیاست میں قدم رکھتے ہیں، آپ کا ناقابلِ اصلاح ہم درد اسی کی بیخ کنی کرتا ہے خود جس کو بنایا ہوتا ہے، اور اس فن کار کی طرح ہوتا ہے جو مسلسل خود اپنی ہی بنائی ہوئی تخلیقات کو رد کرتا رہتا ہے۔

میری اپنی بھی کچھ ایسی ہی کیفیت ہوتی ہے۔ جوں ہی میں دھاگوں اور گرہوں سے بنائے ہوئے مجسموں پر پلاسٹر چڑھا کر مکمل کر چکتا ہوں، تو میں خود ہی اپنے مکّوں سے انھیں مسمار کر دیتا ہوں۔ اس بات سے چند ماہ قبل مجھے اپنے افسر کی دی ہوئی ایک ذمے داری یاد آ گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں سادہ اور معمولی دھاگوں کی مدد سے روسی روحانی معالج راسپوتین اور جرمن شہزادے گوئٹے کو ملا کر ایک شکل تیار کروں، جس میں خود اس کی بھی شباہت آئے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میں نے دو متضاد افراد کی قابلِ قبول نقل بنانے کے عمل میں کتنے میل لمبے دھاگوں کو گرہوں میں تبدیل کیا ہوگا، مگر اس ہم درد کی طرح، مسٹر ماتسیرات جس کی اتنی تعریف کرتے رہتے ہیں، میں بھی بے چین رہتا ہوں؛ اور جسے میں اپنے دائیں ہاتھ سے بناتا ہوں اسی کو بائیں ہاتھ سے مسمار کر دیتا ہوں اور جس کو میرا بایاں ہاتھ تشکیل دیتا ہے اس کو میرے دائیں ہاتھ کا مکّا مسمار کر دیتا ہے۔

مسٹر ماتسیرات خود بھی اپنی کہانی کو ایک سیدھی لکیر پر قائم نہیں رکھ پاتے ہیں۔
ان چار راہباؤں کو یاد کیجیے جو مال گاڑی کے ڈبے میں سفر کر رہی تھیں۔ پہلے وہ ان کو فرانسسکن کہتے پھر فوراً ہی ان کو ونسینٹ والیاں کہنا شروع کر دیتے، مگر جو اُن کے سارے کیے دھرے کو تباہ کر دیتی ہے وہ ایک نوجوان عورت ہے جس کے نام دو ہیں اور لومڑی جیسا ایک ہی چہرہ ہے۔ لہٰذا میرے خیال میں مجھے مشرق سے مغرب ان کے سفر کے دو مختلف احوال لکھنے ہوں گے، مگر میرا یہ طریق نہیں۔ میں محض سوشل ڈیموکریٹ پر ارتکاز کرنا پسند کروں گا، جو ایک ہی نام سے سب کام کرتا ہے، اور میرا مریض مجھے یقین دلا رہا ہے کہ 'اِستولپ' پہنچنے تک ایک کہانی جسے اس نے بار بار دہرایا ہے، کہ 1937 میں وہ اس قسم کا ہم درد تھا کہ اپنے فالتو وقت میں دیواروں پر پوسٹر لگانے میں اپنی صحت اور اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی، اس لیے کہ وہ ان چند سوشل ڈیموکریٹ لوگوں میں سے تھا جو اُس وقت بھی پوسٹر لگا رہے تھے، جب بارش ہو رہی تھی۔

انھوں نے اس وقت بھی وہی کہانی سنائی تھی جب 'اِستولپ' پہنچنے سے پہلے جوان ڈاکو ہمیں نہ جانے کتنی بار روک چکے تھے۔ چوں کہ اب جب کہ بہ مشکل ہی ہمارا کوئی بھی سامان بچ رہا تھا، ان لوگوں نے ہمارے کپڑوں کی طرف توجہ کی، مگر انھوں نے بہت مناسب رویہ اختیار کیا تھا، وہ صرف ہمارے کپڑے چاہتے تھے۔ سوشل ڈیموکریٹ کے لیے ان کا طریقہ مناسب کے بالکل برعکس تھا؛ اس کا خیال تھا، جس کا اس نے اظہار بھی کیا تھا، کہ ایک ہنرمند درزی ان گزوں کپڑے سے اچھے اچھے سوٹ تیار کر سکتا ہے جو راہبائیں اپنے جسم کے گرد لپیٹے ہوئے تھیں۔ سوشل ڈیموکریٹ نے، نہایت دین دارانہ انداز میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ خدا کو نہیں مانتا۔ نوجوان ڈاکوؤں نے ایسا کوئی دین دارانہ اعلان نہیں کیا تھا، مگر بچ جانے والے کلیسا سے ان کے منسلک ہونے پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ باوجود اس کے، اس میں لکڑی کے ریشے ملے ہوئے تھے، انھیں راہباؤں کے اونی کپڑے سے زیادہ اس بے دین کے ابھرے سوٹ کے کپڑے میں دل چسپی تھی۔ بے دین نے اپنا کوٹ، اپنی واسکٹ اور اپنا پتلون اُتارنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بجائے ان سے اپنے مختصر مگر شان

دار سوشل ڈیموکریٹ پوسٹر لگانے والے کیریئر کی تفصیل بیان کر دی اور جب اس نے بولنا بند کر دینے یا اپنا سوٹ اُتارنے سے انکار کر دیا، تو اسے اپنے پیٹ میں جرمن فوج کے ایک سابقہ جوتے کی زوردار ٹھوکر کھانی پڑ گئی۔

سوشل ڈیموکریٹ نے قے کر دی۔ اس کی قے کا دورہ طویل اور تکلیف دہ تھا، اور آخر میں وہ خون تھوکنے لگا تھا۔ وہ اپنے لباس کی پروا کیے بغیر قے کرنے لگا اور ہمارے نوجوان مجرموں کی اس کے سوٹ میں دل چسپی ختم ہو گئی، حالاں اچھے قسم کی ڈرائی کلیننگ کے بعد سوٹ ان کے کام آ سکتا تھا۔ مردوں کے لباس سے لاتعلق ہو کر انھوں نے مسز ماریا ماتسیرات کے ہلکے نیلے رنگ کا مصنوعی ریشم سے بنا بلاؤز اُتروا لیا اور ایک نوجوان لڑکی کی باویریا کے طرز کی بُنی ہوئی جیکٹ اُتروا لی، جس کا نام لوسی رین واند بلکہ ریجائینا رائک تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ڈبے کے دروازے بند کر دیے، مگر مکمل طور پر نہیں اور گاڑی نے حرکت کرنی شروع کر دی، جب کہ سوشل ڈیموکریٹ مر رہا تھا۔

'اِسٹولپ' سے ایک یا دو میل قبل ریل گاڑی کو دوسری لائن پر منتقل کر دیا گیا تھا، جہاں وہ ماہِ جون کی تاروں بھری، صاف مگر قدرے ٹھنڈی رات بھر کھڑی رہی۔

سوشل ڈیموکریٹ، جس کے سوٹ نے اتنا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا، اسی رات انتقال کر گیا۔ وہ زور زور سے خدا کی توہین کرتا اور مزدور طبقے کو جدوجہد پر اُبھارتا، بغیر کسی وقار کے مر گیا تھا۔ بالکل فلموں کی طرح اس کے آخری الفاظ تھے ''آزادی زندہ باد!'' اس کے بعد ایک بڑی سی قے میں، جس نے پورے ڈبے میں ہراس پیدا کر دیا تھا، اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کے بعد، میرے مریض کا کہنا تھا کہ، نہ کوئی چیخا نہ کوئی رویا۔ ایک طویل خاموشی تھی، جس کو مسز ماریا ماتسیرات کے کٹکٹاتے دانتوں کی آواز نے توڑا تھا، جو بغیر بلاؤز کے سردی سے کانپنے لگی تھی اور اپنے بیٹے کُرٹ کے اور شوہر ماتسیرات کے بچے ہوئے تمام کپڑے اپنے اوپر ڈال لیے تھے۔ صبح ہوتے ہی بڑے دل جگرے والی دو راہباؤں نے کھلے دروازے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بچوں اور بڑوں کے فضلے اور سوشل ڈیموکریٹ کی قے بھرے پیال کو ڈبے کے باہر پھینک دیا۔

'اسٹولپ' میں پولس افسروں نے ریل گاڑی کا معائنہ کیا۔ گرم شوربا اور کافی کی قسم کا ایک مشروب تقسیم کیا گیا۔ مسٹر ماتسیرات کے ڈبے میں موجود میت بیماری پھیلنے کے خوف سے ضبط کر لی گئی اور میڈیکل کور کے کچھ لوگ اس کو ایک تختے پر ڈال کر لے گئے۔ راہباؤں کی درخواست پر ایک بڑے افسر نے مختصر دعا کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ انھیں میت کے جوتے، موزے اور سوٹ اتارنے کی بھی اجازت دے دی گئی تھی۔ میت کے کپڑے اُتارنے کے منظر کے دوران — بعد میں میت کو سیمنٹ کی بوریوں سے ڈھانک دیا گیا تھا — میرا مریض سوشل ڈیموکریٹ کی عم زاد کو دیکھ رہا تھا۔ حالاں کہ اس لڑکی کا نام رائنک تھا، مگر ایک بار پھر میرے مریض کو لوسی رین وارڈ یاد آ گئی تھی، میں نے دھاگوں کی گرہوں سے بنے منظر میں جس کو دیکھ کر "سینڈ وچ خور" کا عنوان دیا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مال گاڑی والی لڑکی نے اپنے مرحوم چچا کے اس منظر کے باعث سینڈوچ نہیں لی تھی، مگر اس نے اپنے چچا زاد کے سوٹ کی لوٹ مار میں حصہ ضرور لیا تھا اور اس کی واسکٹ حاصل کر کے اپنی اُس پھٹی ہوئی جیکٹ کی جگہ پہن لی تھی جو اس سے چھین لی گئی تھی، اور اپنے نئے لباس میں وہ خود کو اپنے جیبی آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ اور مسٹر ماتسیرات مجھے بتاتے ہیں — جب بھی وہ اس بارے میں سوچتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں — کہ اس لڑکی نے ان کو اسی آئینے میں دیکھ لیا تھا، کہ وہ اپنے مثلث چہرے کے شگافوں میں سے جھانکتی آنکھوں سے ان کا معائنہ کر رہی تھی۔

'اسٹولپ' سے 'اسٹیٹین' کے سفر میں دو دن لگ گئے۔ اس دوران گاڑی کئی بار غیر ضروری طور پر روکی گئی تھی اور نامی گرامی اور چھتری بردار سپاہیوں کے چاقوؤں سے لیس نوجوان غنڈے ڈبوں میں آتے رہے، مگر ان کا آنا نسبتاً کم سے کم ہوتا گیا، اس لیے کہ لوٹ مار کے لیے کچھ باقی ہی نہیں رہ گیا تھا۔

میرے مریض کا دعویٰ ہے کہ وہ دانتسگ یا گڈانسک کے سفر کے دوران ساڑھے تین سے چار انچ تک بڑھ گیا تھا۔ اضافہ زیادہ تر ٹانگوں میں ہوا تھا، سر یا سینے میں بہت کم تبدیلی ہوئی تھی۔ حالاں کہ پورے سفر کے دوران میرا مریض اپنی پشت کے بل لیٹا رہا، اور وہ اپنی پشت میں ہونے والے ابھار کو روک نہیں سکا تھا جو بائیں جانب جھکا ہوا تھا۔ مسٹر ماتسیرات بھی

اعتراف کرتے ہیں کہ اسٹیشن کے بعد درد بڑھ گیا تھا—اس دوران جرمن ریلوے والے آگئے تھے—اور خاندانی البم کی ورق گردانی سے کچھ فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ حالاں کہ اس میں سے جو چیخیں نکلی تھیں بہت تیز اور طویل تھیں، مگر ان کی وجہ سے اسٹیشنوں میں کسی شیشے کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ماتسیرات نے کہا، 'میری آواز شیشے توڑنے کی طاقت کھو چکی ہے' مگر وہ چاروں راہباؤں کو لے آئے جنھوں نے کبھی نہ ختم ہونے والی دعائیں شروع کر دیں۔

ان کے ساتھ سفر کرنے والوں میں سے زیادہ تر، جن میں مس ریجائینا اور سوشل ڈیموکریٹ کے دوسرے اہلِ خاندان شامل تھے، 'نشووینِ' پر قافلے کو چھوڑ گئے۔ مسٹر ماتسیرات بہت افسردہ تھے۔ وہ نوجوان لڑکیوں کو دیکھنے کے بہت عادی ہو گئے تھے۔ ان کے لیے اس لڑکی کا نظارہ اتنا ضروری ہو گیا تھا کہ ان کو تشنج کے دورے پڑنے شروع ہو گئے تھے، ساتھ ہی تیز بخار بھی ہو گیا تھا۔ مسز ماریا ماتسیرات کے مطابق وہ کسی لوسی نام کی لڑکی کے لیے رونے لگے، خود کو اساطیری جانور، یک سنگھا، کہنے لگے اور گرنے سے خوف کھانے لگے تھے، مگر ساتھ ہی تیس فٹ بلند غوطہ مینار سے کودنے کے خواہش مند بھی ہو گئے تھے۔

لوئینبرگ میں مسٹر ماتسیرات کو اسپتال لے جایا گیا تھا۔ وہاں بخار کے دوران ان کی کچھ نرسوں سے دوستی ہو گئی تھی، مگر جلد ہی ان کو ہینوور کی یونی ورسٹی کی کلینک میں بھیج دیا گیا، جہاں کے ڈاکٹر ان کا بخار کم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کچھ دنوں تک مسٹر ماتسیرات، ماریا ماتسیرات اور اس کے بیٹے کرٹ سے بہت کم مل سکے تھے؛ مگر جب ماریا کو اسی کلینک میں صفائی کرنے کی ملازمت مل گئی تو وہ مسٹر ماتسیرات سے ہر روز ملاقات کرنے لگی تھی۔ مسز ماتسیرات کو کلینک میں قیام کی سہولت نہیں تھی؛ وہ اور اس کا چھوٹا سا بیٹا شہر کے باہر کے ایک مہاجر کیمپ میں رہنے لگے تھے اور اس کو کم از کم تین سے چار گھنٹے، ہمیشہ ضرورت سے زیادہ ہی بھری ریل گاڑیوں کے پائدان پر لٹکے سفر میں لگ جایا کرتے تھے۔ وہ جلد ہی تھک جایا کرتی تھی، اس لیے ڈاکٹروں نے مریض کو 'ڈوسلڈارف' بھیجنے کی اجازت دے دی جہاں مسز ماتسیرات کی ایک بہن رہتی تھی۔ اس بہن نے، جس کا نام گسٹے تھا، ایک ہیڈ ویٹر سے شادی کر لی تھی، جس سے اس کی جنگ کے

دوران ملاقات ہوئی تھی۔ ہیڈ ویٹر کو اس زمانے میں روس میں مفت رہنے اور کھانے کی سہولت میسر تھی، جس کی وجہ سے کیسے اپنی بہن کو ڈھائی کمرے کے برابر رہنے کی جگہ دے سکتی تھی۔ مسٹر ماتسیرات ڈوسلڈارف سٹی اسپتال میں داخل تھے۔

فلیٹ آسان جگہ پر واقع تھا۔ وہاں سے سٹی اسپتال براہِ راست، کئی ٹرام گاڑیاں جاتی تھیں۔ مسٹر ماتسیرات وہاں اگست 1945 سے مئی 1946 تک داخل رہے تھے۔ پچھلے ایک گھنٹے تک وہ مجھ سے ایک ساتھ کئی نرسوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے نام ہیں سسٹر مونیکا، سسٹر ہلمٹروڈ، سسٹر والبرگا، سسٹر السے، اور سسٹر گیرٹروڈ۔ انھیں ہر قسم کی نہایت مشکل گپ شپ کی باتیں اب بھی یاد ہیں؛ وہ نرسوں کی وردی کے دیوانے اور ان کی روزمرہ کی زندگی سے بہت متاثر ہیں۔ انھوں نے اسپتال کے کھانے کے بارے میں ایک لفظ بھی اپنے منہ سے نہیں نکالا ہے، حالاں کہ اگر میرا حافظہ غلط نہیں، تو اس زمانے میں اس کے کھانے اور برف جیسے ٹھنڈے کمروں کی بابت بات کرنا ممکن نہیں تھا، مگر وہ اُکتا دینے کی حد تک باتیں بتاتے رہتے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سسٹر السے نے ہیڈ نرس کو، نہایت راز داری میں سب کچھ بتا دیا تھا، جس پر ہیڈ نرس کو دوپہر کھانے کی چھٹی کے بعد نرسوں کے کوارٹر کا معائنہ کرنے کی ہمت ہوئی تھی؛ وہاں سے چھوٹی موٹی چیزیں چوری ہو گئی تھیں اور 'ڈارٹمنڈ' کی ایک نرس کو — شاید اس کا نام گرٹروڈ تھا — الزام دیا گیا تھا، جو شاید صحیح نہیں تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نوجوان ڈاکٹر بھی تھے، جو ہمیشہ نرسوں کے پیچھے بھاگا کرتے تھے اور انھیں صرف ایک ہی شے درکار ہوتی تھی — نرسوں کی سگریٹ کے ٹکٹ۔ اس کے علاوہ ایک لیب اسسٹنٹ کے بارے میں — جو نرس نہیں تھی — یہ بتانا مناسب سمجھتے ہیں کہ اُس پر خود اپنا حمل گرانے کا الزام تھا، شاید جس میں ایک زیرِ تربیت نے اس کی مدد کی تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ میرا مریض اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنا وقت کیوں ضائع کرتا رہتا ہے۔

مسٹر ماتسیرات نے مجھ سے کہا ہے کہ میں صرف ان کے بارے میں کچھ بیان کروں۔ مجھے بہت خوشی ہو گی کہ اب میں نرسوں کے بارے میں بہت سے بناوٹی اور طویل قصے چھوڑ سکوں گا۔

میرے مریض کا قد چار فٹ ایک انچ ہے۔ وہ اپنے کاندھوں کے درمیان، تقریباً نظر نہ آنے والی گردن پر ایک وبالِ دوش سر لیے پھرتا ہے، جو عام تناسب کے مقابلے میں کافی بڑا ہے۔ اس کی آنکھیں نیلے رنگ کی ہیں، چمک دار، ذہانت سے پُر اور زندگی سے بھرپور، کبھی کبھی خوابیدہ اور بے خودی کے عالم میں بھی نظر آنے لگتی ہیں۔ اس کے بال گھنے، ہلکے سے گھنگھریالے اور گہرے سنہتئی رنگ کے ہیں۔ اس کو اپنے بازوؤں کا مظاہرہ کرنا بہت پسند ہے، جو اس کے جسم کے مقابلے میں مضبوط ہیں اور اس کے ہاتھ، جیسا کہ وہ خود کہتا ہے، بہت خوب صورت ہیں۔ خصوصاً اس وقت جب وہ نقارہ نوازی کرتا ہے—انتظامیہ کی جانب سے تین یا چار گھنٹے روزانہ جس کی اجازت ہوتی ہے— اس کی انگلیاں اگرچہ اس کی اپنی مرضی کے مطابق حرکت کرتی ہیں، مگر محسوس ہوتا ہے گویا کسی اور متناسب الاعضا جسم کی ہوں۔ مسٹر ماتسیرات نے گراموفون ریکارڈوں کے ذریعے بہت دولت کمائی ہے اور یہ سلسلہ اب ابھی جاری ہے۔ دل چسپی رکھنے والے لوگ ملاقاتیوں کے دن ان کو دیکھنے آیا کرتے ہیں۔ اس مقدمے سے پہلے، بلکہ یہاں لائے جانے سے پہلے بھی، میں ان کے نام سے واقف تھا، اس لیے کہ مسٹر آسکر ماتسیرات بڑے معروف نقارہ نواز ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان کو بے گناہ سمجھتا ہوں اور مجھے یقین نہیں کہ وہ ہمیں ہمارے ساتھ ٹھہرے رہیں گے یا ان کو دوبارہ اپنے کامیاب پیشے پر واپس جانے کے لیے رہا کر دیا جائے گا۔

اس وقت بھی وہ مجھے اپنا قد ناپنے کے لیے کہہ رہے ہیں حالاں کہ ابھی دو دن قبل ہی میں یہ کام کر چکا ہوں۔

---

جو کچھ میرے نگہبان برونو نے لکھا ہے، اس کو پڑھے بغیر، میں آسکر، ایک بار پھر اپنا قلم اُٹھاتا ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر قبل، برونو نے اپنے تہہ کیے جانے والے رول سے مجھے ناپا ہے۔ اس کا رول اب بھی میرے پاس ہی پڑا ہوا ہے، اور وہ نتیجے کا زور زور سے اعلان کرتا ہوا کمرے سے باہر بھاگتا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی گرہوں والی تخلیق بھی زمین پر پھینک دی ہے جس پر وہ خفیہ طور پر، اس وقت بھی کام کر رہا تھا جب میں اس کو اپنی

کہانی سنا رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ڈاکٹر (مس) بارن اسٹرگر کے پاس گیا ہے۔

قبل اس کے کہ ڈاکٹر آ کر بروِنو کی پیدائش کی تصدیق کرے، آسکر خود ہی اس کے بارے میں سب کچھ بتا دے گا — ان تین دنوں کے دوران جب میں اپنے نگہبان کو اپنی نشو ونما کی کہانی سنا رہا تھا، میرا قد پورے ایک انچ بڑھ گیا ہے۔

لہٰذا، آج کے بعد سے آسکر کا قد چار فٹ دو انچ کہا جائے گا۔ اب وہ بتائے گا کہ مناسب صحت میں ہوتے ہوئے، بونے پن، لکھنے کی مشکل، مگر تقریر وتحریر میں رواں، مجھے 'ڈوسلڈارف' سٹی اسپتال سے اس امید پر فارغ کر دیا گیا تھا کہ میں — جیسی کہ اسپتال والوں کو توقع تھی — اپنی نئی اور بالغ زندگی شروع کروں گا۔

# آتشیں پتھر اورلوحِ مزارات

فربہ، خواب ناک اور خوش خصال — گیسے ٹروزینسکی کو گیسے کوسٹر بننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، بالخصوص اس لیے کہ اس کی کوسٹر سے رفاقت بہت محدود تھی: انھیں منگنی کے بعد صرف دو ہفتے گزرے تھے کہ کوسٹر کو آرکٹک محاذ پر بھیج دیا گیا؛ جب وہ طویل رخصت پر گھر آیا تو دونوں نے شادی کر لی، چند راتیں ساتھ گزاریں، بیشتر ہوائی حملے کی پناہ گاہوں میں۔ اگرچہ 'کورلینڈ' میں فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد سے کوسٹر کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی، جب بھی گیسے سے اس کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ کہتی تھی، ''وہ وہ تو روس میں قیدی بنا لیا گیا ہے۔ اس کے یہاں آنے پر کچھ تبدیلیاں ہونی ہیں۔''

اس کے ذہن میں جو تبدیلیاں تھیں وہ ماریا اور بالخصوص کُرٹ کے بارے میں ہونی تھیں۔ اسپتال سے فراغت کے وقت میں نے نرسوں کو الوداع کہا، اس وعدے کے ساتھ کہ موقع ملتے ہی میں ملنے آؤں گا۔ تب میں نے 'بِلک' جانے والی ٹرام گاڑی پکڑی، جہاں دو بہنیں اور کُرٹ رہتا تھا۔ چوتھی منزل تک کے فلیٹ باقی رہ گئے تھے؛ بقیہ، چھت سمیت سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔ تیسری منزل کے فلیٹ میں داخل ہوا تو ماریا اور کُرٹ کو چور بازاری کے کام میں منہمک پایا۔ کُرٹ جو چھ برس کا ہو چکا تھا، انگلیوں پر حساب لگا لیتا تھا۔ چور بازار میں کام کرتے ہوئے بھی ماریا ماتسیرات کی وفادار تھی۔ وہ مصنوعی شہد کا کاروبار کرتی تھی۔ بغیر لیبل کے مرتبانوں میں رکھا شہد چمچوں سے نکالا اور

باورچی خانے کی ترازو پر چوتھائی پاؤنڈ کے حصوں میں تولا جاتا تھا۔ ابھی میں اس تنگ سے فلیٹ میں پوری طرح رہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مجھ کو بھی کام پر لگا دیا گیا۔

گرٹ کاؤنٹر کے پیچھے صابن کی پیٹی پر بیٹھا تھا۔ اس نے گھر آتے والد کی طرف دیکھا تھا مگر اس کی ٹھنڈی نیلی آنکھیں کسی اور دل چسپ شے میں منہمک تھیں۔ کاؤنٹر پر ایک کاغذ رکھا ہوا تھا جس پر وہ تحیلاتی ہندسوں کو جوڑ گھٹا رہا تھا۔ صرف چھ ہفتے، کھچا کھچ بھرے اور ناکافی گرم اسکول میں پڑھائی کے بعد ایک مصروف خودساختہ آدمی نظر آنے لگا تھا۔

گسیٹے کوئسعر کافی پی رہی تھی، اصلی کافی، جو آسکر کو اس وقت معلوم ہوئی، جب اس نے آسکر کو بھی ایک کپ میں پیش کی۔ جب میں شہد میں مصروف تھا، اس نے میرے پیچھے کے کوب پر نظر کی اور تجسس کے ساتھ اس نے ماریا سے دردمندی کا اظہار کیا۔ وہ بس اتنا ہی کر سکتی تھی کہ بیٹھ جاتی اور میرے کوب پر ہاتھ نہ پھیرتی، اس لیے کہ دوسری عورتوں کی طرح اس کو بھی یقین تھا کہ کسی کوب کو چھونا، تھپتھپانا یا اس پر زور سے ہاتھ مارنا خوش قسمتی لاتا ہے۔ گسیٹے کے لیے خوش قسمتی کوئسعر کی واپسی ہوتی، جو سب کچھ بدل دیتی۔ اس نے خود کو قابو میں رکھا، کافی کے پیالے کو تھپتھپادیا اور ایک گہرا سانس لیا، جس کے بعد دعا کی جو میں کئی ماہ سے دن میں کئی بار سنتا رہتا تھا، ''جب کوئسعر گھر لوٹے گا تو، قبل اس کے آپ 'جیک اسمتھ' کہیں، بہت کچھ بدل چکا ہوگا۔ میں اس پر اپنی آخری کوڑی کی شرط لگا سکتی ہوں۔''

گسیٹے چوربازاری کو پسند نہیں کرتی تھی، مگر مصنوعی شہد کے بدلے حاصل ہونے والی کافی سے پرہیز بھی نہیں کرتی تھی۔ جب گاہک آتے تو وہ بیر پٹختی باورچی خانے میں چلی جاتی، جہاں سے نمائشی احتجاج کی آوازیں بلند کرنے لگتی۔

گاہکوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ نو بجے صبح، ناشتے کے فوراً بعد گھنٹیاں بجنی شروع ہو جاتی تھیں، مختصر گھنٹی، طویل گھنٹی، چھوٹی گھنٹی۔ دس بجے رات کے بعد اکثر، گرٹ کے احتجاج پر، گسیٹے گھنٹی کا بٹن بند کر دیتی تھی، جس کے اسکول کا کام تکلیف دہ حد تک اس کے کاروباری دن تک پھیل جاتا تھا۔

''مصنوعی شہد؟'' آنے والے نے کہا۔

ماریا نے اثبات میں آہستہ سے سر ہلایا۔ اور پوچھا، ''چوتھائی پاؤنڈ یا نصف پاؤنڈ؟'' مگر ایسے بھی گاہک ہوتے تھے جن کو شہد نہیں چاہیے ہوتا تھا۔ وہ ''چقماق پتھر'' طلب کرتے۔ چناں چہ گرٹ، جس کا اسکول ایک دن صبح، ایک دن دوپہر کو ہوتا تھا، اپنی حساب کتاب کی مصروفیت سے نکل کر، اپنے سوئیٹر کے نیچے ہاتھ ڈال کر کپڑے سے بنی ایک چھوٹی سے تھیلی نکالتا اور چیلنج کرنے والی اپنی بچکانہ آواز کو اتنا بڑھاتا کہ پوری بیٹھک گونجنے لگتی۔

''کتنے چاہئیں، تین عدد یا چار عدد؟ میرا مشورہ ہے کہ آپ پانچ عدد لے جایئے۔ جب تک آپ سوچیں گے اس کا عدد چوبیس تک پہنچ سکتا ہے۔ پچھلے ہفتے یہ اٹھارہ عدد تھے، اس صبح مجھے بیس عدد مانگنے پڑ گئے تھے۔ اگر آپ دو گھنٹے پہلے آتے، اسکول کے فوراً بعد تو میں آپ کو اکیس عدد فراہم کر سکتا تھا۔''

چھ بلاک لمبے اور چار بلاک چوڑے علاقے میں صرف گرٹ ہی چقماق پتھر فراہم کرتا تھا۔ اس کا ایک ''ذریعہ'' تھا؛ اس نے کسی کو کبھی نہیں بتایا کہ وہ کون اور کیا تھا، حالاں کہ وہ ان کی بات کرتے نہیں تھکتا تھا۔ رات کو سوتے وقت بھی وہ دعا کے بجائے کہتا تھا، ''میرے پاس ایک ذریعہ ہے۔''

میرا دعویٰ تھا کہ اس کے باپ کی حیثیت میں مجھے اپنے بیٹے کے اس ''ذریعے'' کو جاننے کا پورا حق ہے۔ وہ تو ''میرے پاس ایک ذریعہ ہے'' کہتے ہوئے یہ زحمت بھی گوارا نہیں کرتا کہ اپنے اس جملے میں کچھ پُر اسراریت ہی شامل کر دیتا۔ اگر اس کے لہجے میں کچھ شامل ہوتا ہے تو وہ اس کا تفاخر ہے، خود اعتمادی ہے۔

''تمھیں یہ چقماق کہاں سے ملے ہیں؟'' میں نے دہاڑتے ہوئے کہا تھا، ''تم کو اسی لمحے بتانا ہوگا۔''

ایسے موقعوں پہ جب میں اس ذریعے کو جاننے کی کوشش کرتا تو ماریا کا وہی طے شدہ جواب ہوتا تھا۔ ''اس بچے کی جان چھوڑ دو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ تمھارا معاملہ نہیں؛ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اس سے کوئی سوال کر سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں؛ تیسری بات یہ ہے کہ تم بھول جاؤ کے تم اس کے باپ ہو۔ چند ماہ پہلے تو خود تم boo بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔''

جب میں نے گرٹ کے "ذریعے" کے جاننے پر زیادہ اصرار کیا تو ماریا نے شہد کے مرتبان پر ایک دھپ لگاتے ہوئے مجھ پر اور گسیے پر بھی گالیوں کی بوچھاڑ کر دی، جو "ذریعے" کی تلاش میں کبھی کبھی آسکر کی حمایت کر دیتی تھی، "کیا خوب ہو تم لوگ بھی: اس بے چارے کا کاروبار تباہ کرنے پر تُل گئے ہو۔ جو ہاتھ تمھیں کھلاتا ہے اسی کو کاٹ رہے ہو۔ جب میں ان دس کیلوریوں کے بارے میں سوچتی ہوں جو آسکر کو بیمار ہونے کے ناتے ملتی ہیں، جنھیں وہ دو دن میں ہڑپ کر جاتا ہے، تو مجھے ہنسی بھی آتی اور رونا بھی، بلکہ میرا تو قہقہہ لگانے کو دل چاہنے لگتا ہے۔"

آسکر اس سے انکار نہیں کر پاتا: واقعی ان دنوں میری بھوک بہت بڑھ گئی تھی: وہ تو گرٹ کا طفیل تھا جو شہد کے علاوہ بھی کچھ لے آتا تھا، جو اسپتال کے معمولی کھانے کے بعد اس کو توانائی فراہم کرتا تھا۔ آسکر شرم سے ڈوب گیا۔ ننھے گرٹ سے جیب خرچ لے کر وہ بلک کے فلیٹ سے چلا جاتا، تاکہ شرم سے اس کی ناک رگڑی جانے سے بچ جائے۔

آج معاشیاتی معجزے پر تنقید کرنے والے بے شمار ہیں جو ماضی کی یادوں میں ڈوبے ہوئے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں—اور ان حالات کو جتنا کم یاد کرتے ہیں اتنے ہی زیادہ ماضی پرست ہوتے جاتے ہیں—"ہائے، مروجہ سکے کی تشکیلِ نو سے پہلے کے دن بھی کیا دن تھے۔ آخر، لوگ اس وقت بھی تو زندہ رہتے تھے۔ ان کے خالی پیٹ انھیں تھیٹر کے ٹکٹ کے لیے قطار بنانے سے روکتے تو نہیں تھے۔ اور وہ شان دار پارٹیاں، ہم جنھیں چند کھارے بسکٹوں اور آلو کی شراب سے مزین کیا کرتے تھے، آج کی کیویار اور شمپین کی بھرماروالی پارٹیوں سے کہیں زیادہ دل چسپ ہوا کرتی تھیں۔" آپ اس کو گزرے دنوں کی رومانویت پرستی کہہ سکتے ہیں۔ اگر میں چاہوں تو ان بہترین مواقع پر بھی آنسو بہا سکتا ہوں، اس لیے کہ ان دنوں جب گرٹ کے "ذرائع" کے چشمے اُبال پر تھے، اچانک میری دل چسپیاں تعلیم بالغان کی طرف زیادہ منعطف ہو گئی تھیں، اور مجھ میں ایک خاص قسم کے تہذیبی اثرات، مفت میں، جذب ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے شبینہ اسکول میں داخلہ لے لیا تھا، اور باقاعدہ برٹش سینٹر جایا کرتا تھا، جس کو "Die Brücke" کہتے تھے، جہاں

کیتھلک اور پروٹسٹنٹ اکٹھے اپنی غلطیوں کا محاسبہ کرتے، اور ان سے بھی مل کر محاسبہ کرتے جو خود سے کہا کرتے تھے، ''ہمیں اپنے کام ابھی شروع کر دینے چاہییں؛ جب حالات بہتر ہوں گے تب تک تو ہم انھیں ختم بھی کر چکے ہوں گے، اور ہمارا ضمیر بھی صاف ہو جائے گا۔''

مگر جو بھی ہو، میری تعلیم اسی شبینہ اسکول کی مرہونِ منت ہے: میں پہلا شخص ہوں جو اعتراف کر رہا ہے کہ یہ بہت نہیں تھی، حالاں کہ اس میں پڑنے والے خلل میں کچھ دھوم دھام ضرور تھی۔ میں نے زور شور سے پڑھنا شروع کر دیا تھا، حالاں کہ میں اس سے اب بھی مطمئن نہیں ہوں، اب جب کہ میں بڑھ گیا ہوں، اس ضرورت سے زیادہ سادہ دنیا میں، جو گوئٹے اور راسپوتین میں بٹی ہوئی ہے یا اس اطلاع کے ساتھ کہ کوہلر کے 1916-1904 بحری کیلنڈر کے معاملات کو نکالا جا سکتا ہے۔ میں ہمیشہ پڑھتا رہتا تھا، حالاں کہ مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے واش روم میں کیا پڑھا تھا۔ میں تھیٹر کے ٹکٹ خریدنے والی قطار میں کھڑا بھی پڑھتا رہتا تھا، موتسارٹ کی جیسی چٹیوں والی نوجوان لڑکیوں کے جھرمٹ میں بھی پڑھا کرتا تھا۔ میں اس وقت بھی پڑھتا تھا جب گرٹ چقماق کے پتھر بیچا کرتا تھا، اس وقت بھی جب میں مصنوعی شہد کو بوتلوں میں بھرا کرتا تھا۔ اور جب بجلی بند کر دی جاتی تو میں چربی سے بنی موم بتیوں کی روشنی میں بھی پڑھتا تھا جو گرٹ کے ''ذرائع'' سے حاصل کی جاتی تھیں۔

میں یہ کہنے میں شرمندگی محسوس کرتا ہوں کہ ان دنوں میں نے جو کچھ بھی پڑھا تھا وہ میرے شعور کا حصہ نہیں بن سکا، کہ جو کچھ ایک آنکھ سے داخل ہوتا، دوسری آنکھ سے باہر ہو جاتا تھا۔ ایک دو جملے، ایک دو کہاوتیں، بس یہی کچھ باقی رہا ہے۔ اور تھیٹر کے اداکاروں کے کچھ نام بھی ہیں: ہوپے، پیٹر ڈسر، فلیکنچی ٹلنڈ، اور اس کا حرف 'R' کا مخصوص تلفظ۔ مجھے تجرباتی تھیٹر کے کچھ طلبہ بھی یاد رہ گئے ہیں جنھوں نے فلیکنچی ٹلنڈ کے 'R' کے تلفظ کو بہتر کرنے کی کوشش کی تھی؛ مجھے گرونڈ گنس، 'تاسو' کی صورت بھی یاد ہے: وہ ہمیشہ اصولی سیاہ رنگ پہنا کرتا تھا، مگر اس نے گوئٹے کے متن سے laurel کا ہار نکال دیا تھا، اس بنیاد پر کہ سبزے نے اس کا بال جلا دیا تھا۔ اور ایک بار پھر گرونڈ گنس سیاہ لباس میں، جیسے ہیملٹ۔ لو، اور سنو! فلیکنچی ٹلنڈ کا دعویٰ ہے کہ ہیملٹ موٹا ہے۔ یارک کی کھوپڑی مجھ پر

بہت اثر انداز ہوئی ہے، اس لیے کہ اس نے گروف گن سے کچھ اشارے کسب کیے ہیں۔ 'ڈراؤسی فان ورطوز ٹھنڈے برف تھیٹر میں مبہوت ناظرین کے سامنے اپنا کردار ادا کرتا تھا۔میرے نزدیک گسیٹے کا شوہر کوسٹر ٹوٹے شیشے والے پکمان کی مثال تھا، جو گھر واپسی پر ہمیشہ کے لیے سب کچھ بدل دے گا، جس میں میرے بیٹے کُرٹ کا ''ذریعہ'' بھی شامل ہوگا۔

اب، جب کہ سب کچھ ماضی کا حصہ بن چکا ہے؛ آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ مابعد جنگ کی بلا نوشی صرف بلا نوشی ہی ہوتی ہے، اس لیے اس کے بعد خمار کی کیفیت ہوتی ہے، اور خمار کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام کام، اچھے ہوں یا بُرے، جو کل تک تازہ تھے، زندہ تھے اور حقیقت تھے، ماضی کا حصہ بن جاتے ہیں۔آج میں ان تمام احکامات کی قدر کر سکتا ہوں جو گریچن شیفلر نے اپنی سفری یادگاروں اور اپنی بُنائی کے دوران مجھ پر جاری کیے تھے: راسپوتین کم: گوئٹے اعتدال میں: کیزر کی تاریخ شہرِ دانتسگ: اس جنگی جہاز کے ہتھیار جو سمندر کی تہہ میں پڑا ہوا ہے:تمام جاپانی تارپیڈو کشتیوں کی رفتار (ناٹ میں) جنھوں نے سوشیما کی جنگ میں حصہ لیا تھا:بیلی ساریس اور نارسیس کا، ٹوٹیلا اور تیجا، جن کو فیلکس ڈان کی کتاب A Struggle for Rome. میں پیش کیا گیا ہے۔

میں نے 1947 کے موسمِ بہار میں شبینہ اسکول اور Pastor Niemöller کو چھوڑ دیا، اور گستاف گروف گن کی دوسری بالکنی سے بھی چھٹی لے لی تھی، جو اب بھی ہیملٹ کے کھیل میں شامل ہوتا ہے۔

ابھی دو برس بھی نہیں گزرے، جب ماتسیرات کی قبر کے قریب میں نے بڑے ہونے کا تہیہ کر لیا تھا، اور بالغوں کی زندگی میں دل چسپی لینی چھوڑ دی تھی۔ میں اپنے سہ سالہ قد و قامت کو یاد کرنے لگا تھا۔ میں ایک بار پھر تین فٹ کا انسان بن جانا چاہتا تھا، اپنے دوست برا سے بھی چھوٹا، اپنی پیاری روزویٹا سے بھی چھوٹا۔ آسکر کو اپنا نقارہ بہت یاد آتا تھا۔ میں طویل چہل قدمی کرنے لگا تھا، جو اکثر سٹی اسپتال پر ختم ہوتی تھی۔ کچھ بھی ہو، میں مہینے میں ایک بار پروفیسر ارڈیل سے ملنے ضرور جاتا تھا، جو آسکر کو ایک دل چسپ مریض سمجھتا تھا۔ بہ ایں وقفے سے، آسکر نرسوں سے بھی ملتا تھا، جن سے

اس کی بیماری کے دوران ملاقات ہو گئی تھی۔اس وقت بھی جب ان کے پاس آ سکر کے لیے وقت نہیں ہوتا تھا، صحت یا موت کے آثار پیش کرتی ان کی تیز تیز چلتی سفید وردیاں، اس کو خوشیوں جیسا احساس فراہم کرتی تھیں۔

نرسیں مجھے پسند کرتی تھی، بچوں کی طرح، میرے کوب سے کھیل کرتیں، کھانے کے لیے اچھی اچھی چیزیں دیتیں اور مجھے اسپتال کی زندگی کی پیچیدگیوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی، نیند آور کہانیاں سناتی تھیں۔ میں سنتا، مشورے دیتا اور ان کے چھوٹے موٹے تنازعات میں ثالثی بھی کرتا تھا، اس لیے کہ مجھے ہیڈ نرس کی ہم دردی حاصل تھی۔ان دنوں میں، بیس یا اس سے زیادہ نرسوں کی وردیوں کے نیچے جو جوان یا بہت زیادہ جوان نہیں ہوتی تھیں، غائب ہو جایا کرتا—اور کچھ حیرت انگیز طریقے سے ان کی خواہشات کی شے بن جاتا تھا۔

جیسا کہ برونو کہہ چکا ہے، آسکر کے ہاتھ خوب صورت اور ولولہ انگیز ہیں، گھنگھریالے بال ہیں اور ہمیشہ نیلی رہنے والی بر اسکی آنکھیں ہیں۔شاید میرے ولولہ انگیز ہاتھ، آنکھیں اور بال، میرے کوب اور تنگ محرابی سینے سے میری ٹھوڑی کی پریشان کر دینے والی قربت کی وجہ سے زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ میں اکثر نرسوں کے کمرے میں بیٹھا ہوتا تھا، وہ میرے ہاتھ پکڑتیں، انگلیوں سے کھیلتیں، میرے بال سہلاتیں اور ایک دوسرے سے کہتیں، ''اس کی آنکھوں میں جھانکو تو دنیا ومافیہا سے بے خبری ہو جاتی ہے۔''

اس طرح میں اپنے کوب سے افضل تھا اور اگر میرے پاس میرا نقارہ ہوتا، اگر میں ماضی کی نقارہ نوازی کی اپنی صلاحیت پر بھروسا کرتا تو شاید اسپتال میں کچھ فتوحات بھی کر لیتا، مگر مجھے اپنی جسمانی کیفیات پر یقین نہیں تھا، کہ جب میں ان ابتدائی ضیافتوں کے بعد اسپتال سے فارغ ہوں گا تو اصل خوراک سے فیض یاب ہو بھی سکوں گا یا نہیں۔ میں ہوا خوری کے لیے باغ میں یا اس باڑ کے اطراف نکل جاتا جو اپنی گھنی جالیوں کے ذریعے مجھے ذہنی سکون پہنچاتی تھیں، جس کا اظہار میں سیٹی بجا کر کیا کرتا تھا۔ میں 'ورسٹن' اور 'بنر اتھ' جاتی ٹرام گاڑیوں کو دیکھا کرتا یا بائیسکل کے ساتھ ساتھ چلتے پارک کے چہل قدمی کے راستے پر چلتا، قدرت کی خوش گوار اکتاہٹ پر مسکراتا، جو بہار سے اٹکھیلیاں کرتی اور

کلیوں کی تقریباً ناقابلِ سماعت چیخ کی آوازیں سنتا رہتا تھا۔

اس طرف، ہمارا اتواری پینٹر، جنت کا فن کار، ہر روز کچھ نہ کچھ نئی سبز شے ورسٹن کو قبرستان پیش کر دیتا ہے۔قبرستان ہمیشہ میرے لیے کشش کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کو قرینے سے، ابہام سے ماورا، منطقی صورت میں، مردانگی سے بھرپور، اور زندہ رکھا جاتا ہے۔قبرستانوں میں آپ ہمت کر سکتے ہیں، فیصلے کر سکتے ہیں،قبرستانوں میں زندگی اپنے خدوخال نکالتی ہے۔اس سے میرا مطلب قبروں کے کنارے نہیں۔

قبرستان کی شمالی دیوار کے برابر'بموگیٔ' جانے والی ایک گلی گزرتی ہے، جس پر لوحِ مزار بنانے والی کم ازکم چھ کمپنیوں کے دفاتر ہیں۔اس میں دو ادارے بڑے ہیں: سی اِشنوگ اور جوتیس وہمبل۔ بقیہ سب چھوٹے چھوٹے دستی کام کرنے والے لوگ ہیں: آر بیڈن رائخ، جے بوئس، کون اینڈ ملر اور پی کارنیف۔ سائبان اور کارخانے، جن کی چھتوں سے لٹکے بڑے بڑے سائن بورڈ، کچھ تازہ پینٹ کیے ہوئے، بقیہ مشکل سے پڑھے جا سکتے تھے، جن پر ادارے کے نام اور ان کی تخلیقات کے نام لکھے ہوئے تھے: لوحِ مزارات-- جنازہ گاہ اور ان کے حاشیے— قدرتی اور مصنوعی پتھر—کے نقش۔کارنیف کا سائن بورڈ بہت خستہ حالت میں تھا— پی کارنیف، پتھر کاٹنے والے اور جنازہ گاہ کا سنگ تراش۔

کارخانوں اور خاردار تاروں کی باڑ کے درمیان سادہ قسم کے پائدانوں پر رکھی یادگاروں کی نفیس قطاریں؛ مختلف پیمائش کی، کسی تنہا قبر یا چار قبروں پر مشتمل محرابی جگہوں کی زینت کے لیے۔باڑ کے بالکل پیچھے، ہیرے کی طرز کے بنے، مختلف قسم کی لوحِ مزارات: پالش شدہ پتھروں سے بنی سلیں، بچوں کی قبر کے تیس انچ کے دھندلے 'سائیلیشیا' پتھر کے لوحِ مزار، جن کے اطراف بنے ہوئے بگل کے حاشیے اور ٹوٹے گلاب کے پھول۔ان کے بعد سرخ رنگ کے پتھروں کی سلیں جو بم باری میں تباہ ہونے والے ڈپارٹمینٹل اسٹوروں کی عمارتوں کے اگلے حصوں سے نکالی گئی تھیں۔مرکزی حصے میں تین پائدانوں پر رکھی ٹائیرول کے نیلگوں سفید رنگ کے پتھر سے بنی یادگار تھی، جس کی دونوں جانب منقش سلیں تھیں، صنعت والے جن کو کارپَس کہتے ہیں۔کارپَس بغیر ڈاڑھی والے جسم تھے: ان

کے سر اور گھٹنے بائیں جانب مڑے، سر پر کانٹوں کے تاج، تین ناخن، کھلے ہاتھ اور میری یاد کے مطابق پیٹ میں بنے زخم سے نکلتے خون کے پانچ عدد قطرے تھے۔

'یونگ' میں صرف اتنے ہی ادارے نہیں تھے جو اموات سے متعلق یادگاریں بناتے تھے جن کے کارپس بائیں جانب مڑے ہوتے— کبھی بہار کے موسم کے لیے دس یادگاریں بنا رکھتے تھے، مگر کارنیف کے یسوع مسیح کا مجھ پر خاص قسم کا اثر ہوا تھا، اس لیے کہ اس میں میری صلیب والے کھلاڑی کی بہت شباہت تھی جو اپنی بازو کی مچھلیاں دکھلاتا، سینہ پھلاتا سیکریڈ ہارٹ۔ گرجا گھر کی مرکزی شہ نشین پر بیٹھا ہوتا ہے۔ میں نے باڑ میں لگی تار کی جالی سے قریب لکڑی کو کھرچتے، ہر موجود شے کے بارے میں سوچتے اور اس کے بارے میں بھی سوچتے ہوئے جو موجود نہ ہو، اس کے بارے میں بھی سوچتے اور ایک دو خیالات پر غور کرتے کئی گھنٹے وہیں گزار دیے۔کافی دیر تک کارنیف روپوش میں رہا۔ چولھے کا ایک پائپ جس میں کئی موڑ لگے تھے دُکان کی کھڑکیوں سے ہوتا ہوا مسطح چھت پر نکلتا تھا۔ان دنوں اچھا کوئلہ دستیاب نہیں تھا۔ان میں سے پیلے رنگ کا دھواں بھک بھک نکلتا اور چھت پر گرتا تھا۔کھڑکیوں سے بھی دھواں نکلتا، بارش کے پانی کے پائپ کے ذریعے نیچے آتا اور لوحِ مزارات پر گرتا جو تیاری کے مختلف درجات میں ہوتے تھے۔

کارخانے کے پھسلنے والے دروازے کے باہر، کئی ترپالوں کے نیچے ایک تین پہیوں والا ٹرک کھڑا تھا، اس طرح، گویا اسے نیچے پرواز کرنے والے جنگی جہازوں سے بچنے کے لیے چھپایا گیا تھا۔دُکان کی لکڑیوں کی لوہے سے ٹکراؤ اور ٹوٹ کر نکلنے والے لوہے کے ٹکڑے اس بات کی گواہی تھے کہ پتھر کاٹنے والے کام میں مشغول ہیں۔

مئی کے مہینے میں تین پہیے والے ٹرک سے ترپال ہٹا دی گئی تھی اور دُکان کا پھسلنے والا دروازہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔میں دیکھ سکتا تھا کہ کارخانے میں کٹائی کرنے والی تیج پر، بھورے پتھر کے اوپر بھورا پتھر، پالش کرنے والی مشین جو پھانسی گھاٹ جیسی دکھائی دیتی تھی، پلاسٹر سے بنے ماڈلوں سے بھرے شیلف اور بالآخر کارنیف دکھائی دیا۔وہ ذرا آگے کی طرف جھک کر چلتا تھا، اور اس کے گھٹنے مستقل طور پر مڑے ہوتے تھے، جب کہ اس کا

سر تختی سے آگے کی طرف ہوتا تھا۔اس کی گردن کے پیچھے چپکانے والی کثیف ٹیپ، جو کبھی گلابی رنگ کی رہی ہو گی، صلیب کے نشان کی صورت لگی ہوئی تھی۔وہ اپنے ہاتھ میں ایک کھانچا لیے دُکان سے باہر نکلا، اس خیال سے کہ بہار کا موسم آ گیا ہے اور زمین کو صاف کرنا شروع کر دیا۔لوحِ مزارات کے درمیان وہ احتیاط سے کھانچا چلا رہا تھا اور کبھی خشک پتے ہٹانے کے لیے جھک جاتا تھا۔اس دوران مجھے اس کی آواز نے چونکا دیا۔''کیا بات ہے، بیٹے، کیا گھر والوں کو اب تمھاری ضرورت نہیں رہی؟''

''مجھے لوحِ مزار بہت اچھے لگتے ہیں۔'' میں نے جواب میں کہا۔

''یہ بات کبھی زور سے نہ کہنا۔'' اس نے کہا، ''یہ بدقسمتی کی بات ہو گی۔اس قسم کی بات کی تو وہ تم پر بھی ایک عدد پتھر لاد دیں گے۔'' اس کے بعد ہی اس نے اپنی اکڑی گردن کو حرکت دی تھی، مجھ پر، یا شاید میرے کوب پر نظر ڈالنے کے لیے۔''بتاؤ تو سہی کہ تم نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔یہ [کوب] سونے کے وقت تمھارے آڑے نہیں آتے؟''

میں اس پر ہنس دیا۔پھر میں نے کہا، کہ ضروری نہیں کہ کوب کو عیب ہی سمجھا جائے، کہ اس نے کبھی مجھے شرمندہ نہیں کیا، کہ یقین جانو، کوب کچھ عورتوں، بلکہ لڑکیوں کی کم زوری ہوتے ہیں، اور وہ کوب کے مختلف تناسب اور امکانات کا اپنے آپ کو عادی بنا لیتی ہیں۔

کھانچے کے دستے پر اپنی ٹھوڑی ٹکائے، کورنیف نے سوچتے ہوئے کہا، ''ہو سکتا ہے۔میں نے بھی سنا ہے۔''

پھر وہ آتش فشانی پتھروں کی کان کے زمانے کی باتیں کرنے لگا، جب اس کے پاس ایک عورت تھی جس کا ایک پیر لکڑی کا تھا، جس کو بکسوا کھول کر الگ کیا جا سکتا تھا۔اس کے خیال کے مطابق وہ بھی میرے کوب ہی جیسا، بلکہ میرے گیس میٹر کی طرح تھا، جسے وہ اسی نام سے پکارنے پر اصرار کر رہا تھا، مگر میٹر کو تو آسانی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔سنگ تراش کی یادداشت بہت طویل، وسیع اور مکمل تھی۔میں نے اس کی بات ختم ہونے اور اس کی عورت کے بکسوا بند کر کے اپنا چوبی پیر لگا لینے تک کا انتظار کیا۔تب میں نے اس سے اجازت طلب کی کہ کیا میں اس کی دُکان دیکھ سکتا ہوں۔کارنیف نے باڑ میں لگا پھاٹک کھول دیا اور اپنے

کھانچے سے پھسلنے والے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔میرے جوتوں کے نیچے کی بجری بجی اور ایک لمحے بعد گندھک، چونے اور سیلن کی بو نے مجھے ڈھانپ لیا۔

ناشپاتی کی شکل، لکڑی سے بنی ہتھوڑیاں، جن سے ایک ہی قسم کی ماہرانہ ضرب لگائی جاتی تھی، پتھر کی کھردری کٹی ہوئی سلوں پر رکھی ہوئی تھیں۔لکڑی سے بنی منبت کاری کی ہتھوڑیاں، گول سروں والے چپٹی دار اوزار، تازہ تازہ ڈھالے ہوئے، آب داری سے نیلی، لمبی اسپرنگ جیسی کندہ کاری کی چھینیاں، اور سنگِ مرمر کے لیے نُکیلی چھینیاں، چار پایوں والی آرا چلانے کی لکڑی سے بنی گھوڑیاں، جن پر پالش کرنے والی سوکھتی لئی اور لکڑی سے بنے بیلنوں پر حرکت کرتی، گچ سے بنی، موٹی زرد پنیر جیسی، پالش شدہ سلیں دو قبروں کے لیے کافی۔یہ تھا منظر کارنیف کے کارخانے کا۔

"وہ بُش ہتھوڑا ہے، وہ چمچہ چھینی ہے، وہ جھری کاٹنے والی چھینی ہے، اور وہ......" کارنیف نے ہاتھ کی چوڑائی کا ایک تختہ اُٹھایا جو تین فٹ لمبا تھا، اور قریب سے اس کے کنارے کا معائنہ کیا،"اور یہ ایک سیدھا کنارا ہے؛ میں اس کو تربیت پانے والوں کو مارنے کے لیے استعمال کرتا ہوں، جب وہ کاہلی کرتے ہیں۔"

اب میرا سوال خالص شریفانہ نہیں تھا،"کیا آپ تربیتی لڑکے ملازم رکھتے ہیں؟"

کارنیف نے مجھے اپنی مشکلات بتائیں،"میں صرف پانچ لڑکے مصروف رکھ سکتا ہوں، مگر مجھے ایک بھی میسر نہیں۔آج کل کے سارے جوان زنخے صرف یہ سیکھنا چاہتے ہیں کہ چور بازار میں جعلی چینی کیسے چلائی جائے۔" میری طرح سنگ تراش بھی خطرناک سازشیوں کا مخالف تھا جو نوجوانوں کے فائدہ مند ہُنر سیکھنے میں رُکاوٹ بنتے ہیں۔جب کارنیف مجھے، بہت کھردرے سے نفیس تک، گھسائی کرنے والے پتھر اور ان کے اثرات دکھا رہا تھا، اس وقت میرے ذہن میں ایک چھوٹا سا خیال پک رہا تھا۔جھانواں پتھر کھردری پالش کرنے کے لیے، چاکلیٹی رنگ کے پتھر اعلیٰ درجے کی پالش کے لیے، اور اب میرا وہ خیال پھر سر اٹھا رہا تھا، مگر اس پر ذرا اونچی، زیادہ چمک دار پالش ہو چکی تھی۔کارنیف نے حروف کے نمونے دکھائے، ابھرے اور کھدے ہوئے متن پر لیکچر دیا، مجھ کو سونے کاری

کے بارے میں بتایا؛ کہ یہ اتنا مہنگا نہیں ہوتا جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، کہ آپ ایک گھوڑے اور اس کے سوار [ کے مجسمے ] پر بہت کم لاگت سے اصلی سونا کاری کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں نیو مارکٹ' میں نصب قیصر ولیم کی یادگار آ گئی تھی، پولش اربابِ اقتدار جس پر سونا کاری کروانا چاہ سکتے ہیں، مگر نہ گھوڑے اور نہ سوار نے مجھے اپنی خیال کو رَد کرنے دیا، جو زیادہ ہی چمک دار ہوتا جا رہا تھا۔ میں اس خیال پر غور کرتا رہا، اور اس کی ترتیب کرنے لگا تھا، جس وقت کارنیف مجھے سنگ تراشی کے لیے تین پاؤں والی stippling مشین کے کام کرنے کے طریقے کی تشریح کر رہا تھا، ساتھ ہی یسوع مسیح کے، صلیب پر چڑھائے جانے کے کسی ماڈل پر اپنی انگلیوں کے جوڑوں کی ہڈیوں سے ٹھک ٹھک کر رہا تھا، ''گویا تم اب ایک شاگرد رکھنے کے بارے میں سوچ رہے ہو؟'' یہ میری پہلی ترتیب تھی۔ میرا خیال زور پکڑتا گیا۔ دراصل جو کچھ میں نے کہا تھا وہ کچھ یوں تھا، مجھے پتا چلا ہے کہ تم کسی شاگرد کی تلاش میں ہو، یا میں نے غلط سنا ہے؟ کارنیف نے گردن کی پشت پر لگی چپکانے والی ٹیپ کو رگڑا، جو اس کی گردن کے پھوڑے کو ڈھانکے ہوئے تھی۔ ''میرا مطلب ہے کہ تم مجھے اپنا شاگرد بنانا پسند کرو گے، بقیہ چیزیں ویسی ہی رہیں گی۔'' میں نے اپنا سوال ذرا بے ڈھنگے پن سے کیا تھا اور اپنی غلطی کو فوراً درست کیا، ''میری صلاحیتوں کو کم نہ سمجھو، میرے پیارے مسٹر کارنیف۔ صرف میرے پاؤں ہی ہیں جو پس ماندہ ہیں۔ میرے بازوؤں میں وافر قوت ہے۔'' اپنے عزم سے خوش اور حتی الامکان جانے کی خواہش کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے اپنے بازو برہنہ کر دیے اور کارنیف کو بازوؤں کی مچھلیوں کو دبا کر دیکھنے کی دعوت دی، جو چھوٹی مگر سخت تھیں۔ جب اس نے ان کو محسوس کرنے کے لیے کوئی حرکت نہیں کی تو میں نے قریب کی سلوں پر پڑی منبت کاری کرنے والی ایک چھینی اٹھا کر اپنے بازو پر رکھی اور اُسے مچھلیوں کی مدد سے اچھالا۔ میں نے اپنا یہ تماشا اس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ کارنیف نے پالش کرنے والی ایک مشین چلا نہیں دی تھی؛ دو قبروں کے لیے بنائے جانے چونے کے پتھر سے بنے پائدان پر کھردرے پتھر کی ڈسک کی تیزی سے چلنے کی آواز آنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد، جب کارنیف کی آنکھیں مشین پر جمی

ہوئی تھیں، اس نے مشین کی آواز سے بلند آواز میں چیخ کر کہا "اب اسے برداشت کرو، بیٹا۔ بڑا مشکل کام ہے۔ ذرا سوچ لو، اگر سمجھ میں آئے تو آنا، میں تمھیں رکھ لوں گا۔"

کارنیف کے حکم کے بعد، پورے ہفتے میں اپنے ارادے پر غور کرتا رہا: ایک جانب گرٹ کا چقماق اور دوسری جانب کارنیف کے لوحِ مزارات۔ ماریا ہمیشہ مجھ میں نقص نکالا کرتی تھی۔ "تم ہمارے بجٹ پر بوجھ ہو آسکر۔ تم کوئی کام کیوں نہیں شروع کر لیتے؟ چائے، کوکو، یا پاؤڈر کا دودھ۔" میں نے کوئی کام شروع نہیں کیا۔ اس کے برعکس میں گسیٹے کے کہے پر غور کرنے لگا تھا، جو غائب کوسٹر کی مثال پیش کرتے ہوئے چور بازاری کے بارے میں میرے منفی رویے کی تعریف کیا کرتی تھی۔ جو بات مجھے زیادہ پریشان کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ میرا بیٹا گرٹ وہیں بیٹھا تصوراتی اعداد و شمار لکھا کرتا اور مجھ کو اسی طرح نظر انداز کرتا، جیسے میں نے برسوں ماتسیرات کو نظر انداز کیا تھا۔ ہم دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ گسیٹے نے دکان کی گھنٹی کا بٹن بند کر دیا تھا تاکہ ہمارے گاہک ہم کو بیکن کے ساتھ scrambled انڈے کھاتے دیکھ نہ لیں۔ ماریا نے کہا، "دیکھا تم نے آسکر، ہم کتنی اچھی اچھی چیزیں کھاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہتے۔" گرٹ نے گہرا سانس لیا۔ چقماق پتھر کم ہو کر پھر اٹھارہ رہ گئے تھے۔ گسیٹے دل لگا کر کھانا کھا رہی تھی اور میں بھی۔ میں انڈے کھانا پسند کرتا ہوں، مگر کھاتے ہوئے بھی افسردہ تھا، اس لیے کہ انڈے کا پاؤڈر اتنا اشتہا انگیز نہیں ہوتا اور اچانک، لقمہ چباتے ہوئے مجھ میں ایک خواہش نے انگڑائی لی، اتنی شدید انگڑائی کہ میرے رخسار میں لرزش پیدا ہو گئی۔ اپنے تمام بہتر فیصلوں، اپنی ذہنی ساخت کے برعکس مجھے خوشی چاہیے تھی۔ میں بے حد خوش رہنا چاہتا تھا۔ ابھی سب صبر شکر سے پاؤڈر کے انڈے کھا ہی رہے تھے کہ میں میز سے اُٹھا، الماری تک گیا، گویا خوشیاں اس میں رکھی ہوئی تھیں۔ اپنے ڈبے کی تلاشی کے دوران مجھے خوشی تو نہیں ملی مگر تصویروں کے البم کے پیچھے مسٹر فان گولڈ کی جراثیم کش دوا کی دو تھیلیاں نظر آ گئیں۔ ایک تھیلی میں، خوشی تو نہیں نکلی، مگر جراثیم کش دوا سے پوری طرح صاف کیا ہوا میری مما کا نیکلس مل گیا، جو جان برانسکی نے کئی برس

پہلے سرما کی ایک رات، جب زیادہ برف پڑنے کی بو محسوس ہو رہی تھی، ایک دُکان کی کھڑکی سے اُڑا لیا تھا، جس میں تھوڑی دیر پہلے آسکر نے ایک بڑا سا گول سا سوراخ کر دیا تھا، ان دنوں جو اپنی آواز کی مدد سے شیشے کاٹ دینے میں خوشی محسوس کیا کرتا تھا۔ یہ وہی نیکلس تھا جسے لے کر میں فلیٹ سے نکلا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ نیکلس میرے کام کی ابتدا، بلکہ چھلانگ لگانے کی بنیاد دے گا۔ میں نے مرکزی اسٹیشن جانے والی ٹرام گاڑی لی اور راستے بھر سوچتا گیا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا— اور طویل گفت وشنید کے دوران بھی میرے اسی قسم کے خیالات تھے۔ مگر وہ یک دست انسان اور جرمن، جن کو سب تشخیص کار کہتے تھے، صرف نکلیس کی مادّی قدر و قیمت سے واقف تھے۔ وہ سمجھ نہیں سکے کہ وہ میرے آگے خوشیوں کے کون سے راستے رکھ رہے تھے، جب میری مما کے نیکلس کے عوض انھوں نے مجھے اصلی چمڑے کا ایک بریف کیس اور "امی" [امریکی] سگریٹ کی اسٹرائک کے بارہ کارٹن تھما دیے تھے۔

اسی دوپہر میں 'پلک' پہنچا۔ میں نے بڑی قیمت کے عوض کی اسٹرائک کے بارہ کارٹن بیچ دیے۔ میں ان کی حیرانی سے لطف اندوز ہوا، سنہرے تمباکو کے اس پہاڑ کو ان کی جانب سرکاتے ہوئے کہا، یہ سب آپ کے ہیں۔ اس کے بعد آپ مجھے تنہا چھوڑ دیجیے۔ ان سگریٹوں کے عوض، یہ کوئی بڑا کام نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ، کل سے مجھے ایک لنچ باکس مع لنچ، چاہیے ہوگا۔ امید ہے کہ آپ اپنے شہد اور چقماق پتھروں سے مطمئن ہوں گے۔ میں نے یہ جملہ غصے یا آزردگی میں نہیں کہا تھا۔ کل سے میں ایک اور فن کی مشق کروں گا، میری خوشیاں تحریر میں ہوا کریں گی یا اگر اس کو پیشہ وارنہ لفظوں میں کہا جائے تو، لوحِ مزارات پر کندہ ہوں گی۔

کارنیف نے ایک سو رائخ ماہانہ مشاہرے پر مجھے مددگار کی حیثیت میں ملازم رکھ لیا۔ یہ زیادہ رقم نہیں تھی، مگر میں نے سخت محنت سے کام کیا۔ پہلے ہفتے کے آخر تک یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ میں بھاری کام کے لیے موزوں نہیں۔ مجھے ایک خاندان کے حجرۂ قبر کے لیے بلجیم کی پتھر کی کان سے تازہ تازہ نکالے ہوئے سنگِ خارا پر مثبت کاری کے کام

کے لیے رکھا گیا تھا۔ ایک گھنٹے تک مشکل سے مجھے چھینی پکڑنا آیا تھا اور لکڑی سے بنی ہتھوڑی والا ہاتھ سن ہو گیا تھا۔ مجھے کند چھینی سے کام کو بھی کارنیف پر چھوڑنا پڑا تھا، مگر اپنی ہنر مندی کے طفیل میں تیز چھینی سے سِلوں کو مربع صورت میں بنانے، چار ضربوں سے لکیریں بنانے اور ڈولومائٹ کے حاشیے بنانے لگا تھا۔ خاص قسم کے بنے اسٹول پر بیٹھا، داہنے ہاتھ میں چھینی اور کارنیف کے اعتراض کے باوجود جو مجھ کو سیدھے ہاتھ سے کام کرنے والا بنانا چاہتا تھا، بائیں ہاتھ میں ناشپاتی کی شکل کی چوبی ہتھوڑی یا لوہے سے بنی بُش ہتھوڑی ہوتی: پتھر سے لوہا ٹکراتا، بُش ہتھوڑی کے چونسٹھ دندانے ایک ساتھ ہی پتھر کو نرم کرنے کے لیے اس میں داخل ہو جاتے۔ اس میں خوشی تھی: میرے نقارے میں نہیں، جو یقینی طور پر محض متبادل تھا، مگر ایک شے متبادل خوشی بھی تو ہوتی ہے: شاید خوشی ہوتی ہی متبادل شے ہے، شاید ہر خوشی، کسی خوشی ہی کی متبادل ہوتی ہے۔ سو اب میں متبادل خوشیوں کے گودام میں تھا: سنگِ مرمر کی خوشی، ریتیلے پتھر کی خوشی۔ سخت خوشی: Carrara۔ دھندلی، بُھربُھری خوشی: سنگِ جراحت۔ کروم فولاد کاٹنے کی خوشی: چٹان: سبز خوشی: سبز خوشی: ٹوفا [ایک قسم کا بُھربُھرا پتھر]۔ رنگین خوشی: دریائے 'لاہن' [Lahn] سے۔ بکھری خوشی: آتش فشانی پتھر سے۔ ٹھنڈی خوشی آئیفل [ناور بنانے والے] سے۔ خوشی ایک آتش فشاں کی طرح اُبلتی ہے اور میرے دانتوں کی رگڑ کری بن کر، خاک کی چادر کی طرح بکھر جاتی ہے۔ میں کتبہ کاری میں با صلاحیت ثابت ہوا۔ جلد ہی میں کارنیف سے آگے نکل گیا اور اس نے تزئین کاری کے تمام کام مجھے سونپ دیے، نقش و نگاری کی پتیاں اور ٹوٹے ہوئے گلاب کے پھول، ان لوگوں کے لیے جو اپنے اوائلِ عمری ہی میں انتقال کر گئے تھے، عیسائی علامتیں جیسے XP یا INRI، بانسریاں اور تسبیحیں، انڈے اور [جہازوں کے] لنگر، مسطح کونے، اور دوہرے مسطح کونے۔ آسکر ہر قسم کے اور ہر قیمت کے لوحِ مزار بنانے لگا۔ اور جب میں نے آٹھ گھنٹے کی محنت سے دھندلے رنگ کی پالش شدہ سِل تیار کی اور اس پر یہ عبارت کندہ کی: خدائی آرام گاہ میرے پیارے شوہر کی — نئی سطر — ہمارے پیارے باپ، بھائی اور عم — نئی سطر — جوزف ایسر — نئی

سطر — پیدائش: 3/اپریل 1885، وفات 22 جون 1946 — نئی سطر — زندگی موت کا دروازہ ہے — جب میں نے یہ عبارت دوبارہ پڑھی، تب مجھے متبادل خوشی کا احساس ہوا، یعنی میں خوش گوار انداز میں خوش ہو گیا تھا۔ جوزف ایسر کے پاس کے لیے، جو اکسٹھ برس کی عمر میں انتقال کر گئے تھے؛ اور میری چھینٹی سے اُٹھنے والے سبز بادل کے باعث میں نے ایسر کی یادگار میں موجود حرف O کندہ کرنے میں بہت احتیاط سے کام لیا تھا؛ آسکر کو حرف O بہت پسند تھا کہ اس میں اسے بہت یکسانیت اور دوام نظر آتا تھا، حالاں کہ وہ ہمیشہ ذرا بڑا معلوم ہوتا ہے۔

مئی کے آخر میں مجھے ایک پتھر کاٹنے والے کا مددگار بنا دیا گیا؛ اکتوبر کی ابتدا میں کارنیف کے دو پھوڑے نکل آئے تھے، اور وقت آ گیا تھا کہ جنوبی قبرستان میں، ہرمن ویب مخت اور ایلسی ویب مخت، المعروف بہ فریتاگ، کے لیے سفید یا کسی ہلکے رنگ کی سِل نصب کی جاتی۔ اس وقت تک، میری قوت پر شبہے کے باعث، کارنیف مجھے قبرستان نہیں لے جاتا تھا۔ جب اسے ایک لوح مزار لے جانا اور نصب کرنا ہوتا، تو عام طور پر جولیس ووبئل کے آدمیوں میں سے ایک کو ساتھ لے جاتا، جو تقریباً بالکل بہرا تھا، مگر کام بہت اچھا کرتا تھا۔ اس کے عوض کارنیف ووبئل کو — جس کے پاس آٹھ آدمی ملازم تھے — ہنگامی حالت میں مدد فراہم کرتا تھا۔ بارہا، میں نے قبرستان کے کام میں اپنی خدمات کی پیش کش کی تھی؛ مجھے قبرستانوں میں بہت دل چسپی تھی، حالاں کہ ان دنوں کوئی فیصلے نہیں کیے جاتے تھے۔ خوش قسمتی سے ووبئل کی دُکان پر اکتوبر مصروفیتوں کا زمانہ ہوتا تھا اور قبل اس کے کہ پالا پڑنا شروع ہو جاتا اس کو سارے آدمیوں کی ضرورت ہوتی تھی؛ لہٰذا، کارنیف کو مجھ پر انحصار کرنا پڑتا تھا۔

ہم نے سِل کو سخت لکڑی سے بنے بڑے بڑے بیلنوں پر رکھا اور اس کو چڑھائی پر ڈھکیلتے ہوئے، تین پہیوں والے ٹرک پر پیچھے سے لاد دیا۔ اس کا پائدان بھی ساتھ ہی رکھ دیا، کناروں میں کاغذ کے خالی بورے ٹھونس دیے، سارے اوزار، سیمنٹ، ریت، بجری اور اتارنے کے لیے بیلن اور بیتیاں بھی ساتھ رکھ لیں۔ میں نے پچھلا دروازہ بند کر دیا،

کارنیف سوار ہوا اور انجن چلا دیا۔ پھر اس نے اپنی پھوڑوں والی گردن کھڑکی سے باہر نکالی اور چلایا ''آجاؤ بیٹا! اپنا لنچ باکس اور سامان بھی ساتھ رکھ لو۔'' ہم نئی اسپتال کے اطراف آہستہ آہستہ چلے۔ پھاٹک کے باہر نرسوں کا سفید بادل لہرا رہا تھا، جس میں وہ بھی شامل تھی جسے میں جانتا تھا، سسٹر گرٹروڈ۔ میں نے ہاتھ ہلایا، جواب میں اس نے بھی ہاتھ ہلا دیا۔ خوش قسمتی کہ وہ نظر آ گئی تھی، میں نے سوچا، کسی دن اس کو دعوت دینی چاہیے۔ باوجود ے کہ، جب ہم دریائے رھائن کی طرف مڑ گئے اور وہ نظر سے غائب ہو گئی تھی، میں نے اس کو دعوت دینے کا ارادہ کر لیا تھا، 'کیپر شام' جانے؛ سنیما دیکھنے کے لیے، یا Gründgens کے لیے تھیٹر؛ ارے واہ، یہ تو وہی پیلی عمارت ہے، مگر ضروری نہیں کہ یہ تھیٹر ہی ہو؛ قبرستان کے خزاں زدہ پیڑوں سے اُٹھتا دھواں، ماحول کی تبدیلی تم پر خوش گوار اثر ڈال سکتی ہے سسٹر گرٹروڈ۔ ایک اور قبرستان، دوسرے لوح مزارات بنانے والے؛ بیوئز اور کرانٹس، پوٹ گیزر، قدرتی پتھر، تزئین، اموات کا فن، گوکلائن، قبرستان کے باغات اور سبزہ زار بنانے والے؛ داخلے کے وقت سوال و جواب، قبرستان میں داخلہ آسان نہیں: قبر 79، سیکٹر آٹھ، ویب نخت ہرمن کے لیے پتھر کی سِل۔ چوکی دار کا دو انگلیوں والا سلام؛ قبرستان میں لنچ گرم کرنے کے لیے چھوڑے گئے پیال؛ اور مُردوں کی ہڈیاں رکھنے والے کمرے کے سامنے کھڑا لیوشگر۔

''وہ سفید دستانوں والا'' میں کارنیف سے پوچھتا ہوں، ''کیا وہ لیوشگر تو نہیں؟''

کارنیف اپنے پھوڑے سہلاتا بولا، ''نہیں، نہیں تو، لیوشگر کا تو میں نے نام بھی نہیں سنا۔ وہ تو ولیم سلوبر ہے؛ یہیں رہتا ہے۔'' اس اطلاع سے مجھے کیسے تسکین ہو سکتی تھی؟ میں خود 'واشٹنگ' میں رہا ہوں، اور اب 'ڈوسلڈارف' میں ہوں، پھر بھی میرا نام آسکر ہی ہے۔ ''واشٹنگ میں ایک شخص تھا، بالکل اسی جیسا، جو قبرستانوں کے اطراف منڈلاتا رہتا تھا۔ اس کا نام تھا لیو شگر؛ قبرستان میں آنے جانے سے پہلے وہ صرف لیو تھا، ایک مذہبی مدرسے کا طالب علم۔''

ہم ولیم سلوبر کے پاس سے ہو کر گزر گئے۔ اس نے ہمیں دیکھ کر سفید دستانہ ہلایا اور میں جنوبی قبرستان سے مانوس ہو گیا۔ اکتوبر کا مہینہ، قبروں کے درمیان راستے، دنیا

کے دانت اور بال گرنے لگے ہیں — یہ دوسرا طریقہ ہے بیان کرنے کا کہ پیڑوں سے زرد پتے گر رہے تھے۔ خاموشی، اُڑتی گوریاں، چہل قدمی کرتے لوگ، سیکشن آٹھ کی طرف رواں ہمارا پھٹ پھٹ کرتا تین پہیوں والا ٹرک، جو ابھی بہت دور ہے۔ اِدھر اُدھر بوڑھی عورتیں ہیں اپنے پانی دینے والے برتنوں سمیت، پوتے پوتیوں کے ہمراہ، کالے سویڈش سنگِ خارا پر چمکتا سورج، پتھر سے بنی یادگاریں، ٹوٹے ستون — جنگ کی تباہی کی علامت — سدا بہار درختوں کے عقب میں سبز رنگ کا فرشتہ۔ ایک عورت اپنی آنکھوں پر سنگِ مرمر کا سائبان بنائے، اپنے ہی سنگِ مرمر کو چمکا رہی تھی۔ پتھر سے بنی کھڑاؤں میں دیو دار درختوں کو دعا دیتا یسوع، اور سیکشن چار میں ایک اور یسوع دیودار کے درختوں کو دعائیں دیتا۔ سیکشن چار اور سیکشن پانچ کے درمیان راستوں پر دن میں مزے مزے کے خواب دیکھنے لگا تھا:

مثلاً سمندر — اور یہ سمندر، دوسری اشیا کے علاوہ، جس کے کنارے پر ایک لاش۔ زوپوٹ ساحل کی سڑک کی جانب سے، وائلن کی موسیقی اور جنگ کے اندھوں کے لیے چھوٹی آتش بازی کی شرمیلی ابتدا۔ سہ سالہ آسکر، سمندر کی پھینکی ہوئی کسی شے پر اس امید میں جھکا کہ یہ ماریا ہوگی یا شاید سسٹر گرٹروڈ، جس کو مجھے کسی دن دعوت دینی ہے۔ مگر وہ گوری لوسی ہے، شاید وہی لوسی، جیسا کہ میں آتش بازی کی روشنی میں دیکھ سکا ہوں جو اپنی انتہا پر پہنچنے والی ہے۔ میں تو اس کی صورت بھی نہیں دیکھ سکا، میں اس کو اس کی بُنی ہوئی باویریائی جیکٹ سے پہچان سکتا ہوں، جسے وہ اس وقت پہنتی ہے جب کوئی شیطنت کرنے والی ہوتی ہے۔ جب میں نے اس کو اتارا تو اون بھیگا ہوا تھا۔ جیکٹ کے اوپر سے پہنی ہوئی جیکٹ بھی بھیگی ہوئی تھی۔ ایک اور باویریائی جیکٹ۔ اور آخر میں جب آتش بازی بالکل ختم ہو گئی، جب صرف وائلن باقی بچے تھے، مجھے اون کے نیچے اون، کھلاڑیوں کی جرسی میں لپٹا ہوا اس کا دل ملا تھا، جس پر لکھا تھا 'لیگ آف جرمن گرلز'، اس دل میں، لوسی کے دل میں چھوٹا سا ٹھنڈا مقبرہ، جس پر لکھا تھا: آسکر کی آرام گاہ — آسکر کی آرام گاہ — آسکر کی آرام گاہ ......

"جاگو، اٹھو بیٹا!" کارنیف نے میرے دن کے خوابوں کے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔ ہم بائیں سیکشن آٹھ میں مڑے، نیا سیکشن جس میں درخت نہیں تھے، چند لوحِ مزارات تھیں اور میدان ہمارے سامنے بھوکا پڑا تھا۔ قبریں ایک جیسی تھیں، تازہ بغیر آرائش کی، مگر پچھلے پانچ مدفون مٹی، خشک بار اور بارش سے تر بتر بن والے مٹی کے ڈھیر صاف پہچانے جاتے تھے۔

ہمیں 79 نمبر فوراً مل گیا، چوتھی قطار کی ابتدا ہی میں، ساتویں سیکشن سے ملا ہوا، تیز بڑھنے والے درختوں اور سائبیلیائی سنگِ مرمر کے کئی لوحِ مزارات کے ساتھ، جو قرینے سے منظم کیے گئے تھے۔ ہم پیچھے سے 79 تک گئے اور اوزار، سیمنٹ، بجری تیل سے چمکتی ہوئی سِلیں اُتاریں۔ ہم سِلیں اُتارنے لگے تو ہمارا تین پہیوں والا ٹرک ایک بار اُچھلا تھا۔ کارنیف نے ایچ ویب بخت اور ای ویب بخت کے نام کی قبروں کے سرھانے عارضی طور پر لگی صلیبیں ہٹا لیں؛ میں نے اس کو کھودنے والی مشین دی اور اس نے کانکریٹ کے کھمبے لگانے کے لیے قبرستان کے قوانین کے مطابق پانچ فٹ تین انچ گہرے سوراخ بنانے شروع کیے، جب کہ میں سیکشن سات سے پانی لایا اور کانکریٹ بنانے لگا تھا۔ میں نے اپنا کام ختم کیا ہی تھا کہ اس نے بھی اعلان کیا کہ وہ پانچ فٹ کھود چکا ہے۔ میں ان سوراخوں میں کانکریٹ بھرنے، اور کارنیف پتھر کی سِل پر بیٹھا اپنی سانسیں درست کرنے اور اپنے پھوڑوں کو چھو کر اندازہ لگانے لگا تھا۔ "بس اب آخری منزل پر ہے۔" اس نے کہا، "مجھے ہمیشہ پتا چل جاتا ہے جب یہ پھٹنے والے ہوتے ہیں۔" میں اس کی بات سے بے پروا سوراخ میں کانکریٹ ٹھونستا رہا۔ ساتویں سیکشن سے آنے والا کسی پروٹسٹنٹ کا جنازہ، آٹھویں سے نویں سیکشن کی طرف آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ جب وہ ہم سے پرے تین قطاریں پیچھے تھے کہ کارنیف اُترا اور قبرستان کے قانون کے مطابق، پادری اور اس کے نائب سب نے جنازے کے جلوس کے احترام میں اپنی ٹوپیاں اُتار لیں۔ جنازے کے فوراً بعد سیاہ لباس میں ملبوس ایک غیر متوازن، تنِ تنہا، عورت وارد ہوئی۔ اس کے پیچھے آنے والے اس سے بہت بڑے اور توانا لوگ تھے۔

"اللہ اکبر!" کارنیف نے کراہتے ہوئے کہا، "ایسا لگتا ہے گویا سِل اُٹھانے

سے پہلے وہ اٹھ بیٹھیں گے۔" اس دوران جنازے کا جلوس سیکشن نو تک پہنچ چکا تھا، جہاں اس نے اپنی تنظیم کی اور برادری کی اونچی نیچی آوازوں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔کانکریٹ جم گیا تھا اور ہم بنیادوں پر پائدان رکھ سکتے تھے، مگر کارنیف کہ اس کی گردن کھل گئی تھی، منہ کے بل پتھر کی سل پر لیٹا رہا۔اس نے اپنی ٹوپی گھسیٹ کر ماتھے پر گرائی اور اپنی قمیص اور جیکٹ کے کالر تک گھسیٹ لی تھی، جب کہ مرنے والے کے حالاتِ زندگی سیکشن نو سے ہم تک پہنچ رہے تھے۔ہمیں سل پر چڑھنا اور کارنیف کی پشت پر بیٹھنا تھا۔ میں نے اس کیفیت میں ان پر ایک نظر ڈالی؛ وہاں دو تھے، ایک کے اوپر دوسرا۔ پیچھے رہ جانے والا بڑا آدمی بھاری بار لیے سیکشن نو کی طرف جا رہا تھا، اور جنازے کا خطبہ ختم ہونے کے قریب تھا۔میں نے ایک جھٹکے میں پلاسٹر کا بڑا سا ٹکڑا توڑ لیا، سفیدے کے پتے سے ichthyol کے لیس دار مادّے کو پونچھا اور دونوں ہاتھوں کا معائنہ کیا۔ وہ تقریباً ایک ہی پیمائش کے تھے، زردی مائل گہرے بھورے رنگ کے۔"آؤ ہم دعا کریں" سیکشن نو سے آنے والی ہوا نے کہا۔اس کو ایک اشارہ سمجھتے ہوئے میں نے اپنے سر کو ایک جانب گھمایا اور ساتھ ہی اپنے انگوٹھوں کے نیچے سے سفیدے کے پتوں کو کھینچا۔"اے میرے باپ ......" کارنیف کراہا، "دبا نہیں بیٹا، کھینچ۔" میں نے کھینچا۔"رہے نام تیرا۔" کارنیف نے دعا میں شریک ہونے کی کوشش کی۔"...... تیرا ہی راج ہو" ...... کھینچنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، اس لیے میں نے پھر دبایا ...... "ویسا ہی ہوگا، جیسا کہ تو چاہتا ہے" ...... یہ ایک معجزہ تھا کہ دھماکا نہیں ہوا۔اور ایک بار پھر: ...... "آج ہمیں عطا کر" ......اور کارنیف نے اس میں اضافہ کیا: ...... "مداخلتِ بے جا نہیں، لالچ نہیں ......" اور پھر وہی ہوا جس کی توقع تھی ...... "سلطنت، طاقت اور عروج" ......اور میں نے آخری رنگ برنگی یادگار دبا کر کھینچ لی تھی۔"......اور ہمیشہ کے لیے، آمین" ...... جب میں آخری دباؤ ڈال رہا تھا، کارنیف نے کہا ......"آمین" ......اور آخری کوشش: ......"آمین" ......اور جب سیکشن نو میں لوگوں نے تعزیت شروع کی تو کارنیف نے پھر آمین کہی۔سل پر پڑے پڑے اس نے سکھ کا ایک لمبا سانس لیا،"پائدان کے نیچے کی کچھ کانکریٹ باقی ہے؟" اس نے پوچھا۔میں نے کہا، ہاں۔اور اس نے پھر کہا،"آمین۔"

میں نے مضبوطی کے لیے باقی ماندہ کانکریٹ دو ستونوں کے درمیان انڈیل دی۔ تب کارنیف پالش کی ہوئی عبارت سے کھسکا اور آسکر نے اس کو خزاں زدہ سفیدے کی پتیاں اور اس کے پھوڑے کی اسی رنگ کی باقیات پیش کیں۔ ہم نے اپنی ایک بار پھر اپنی ٹوپیاں پہن لیں، پتھر کو پکڑا اور جب سیکش نو کا دفن کا کام ختم ہوا، پتھر کی وہ سِل نصب کردی جو ہرمن ویب مخت اور ایلسی ویب مخت المعروف بہ فریتاگ کی قبر کا نشان بننے والی تھی۔

# فارچونا نارتھ

اُس زمانے میں صرف اُن ہی لوگوں کو لوحِ مزار نصیب ہوتی تھی جو صفحۂ ارض پر کچھ چھوڑ جاتے تھے۔ ضروری نہیں تھا، وہ ہیرا ہو یا موتیوں کی مالا ہو۔ پانچ بورے آلو کے عوض اچھا خاصا بڑا 'گریزائم' کا پتھر مل جاتا تھا۔ بلجیم کے سنگِ خارا سے بنی دو افراد کی قبر کے لیے تین پائدانوں پر رکھی یادگار کے عوض تین پیس کے دو سوٹ کا کپڑا مل جاتا تھا۔ درزی کی بیوہ کے پاس، جس نے ہمیں مال دیا تھا، ایک شاگرد کام کرتا تھا؛ اس نے ڈولومائٹ کے بنے حاشیوں کے عوض سوٹ سینے کا وعدہ کر لیا تھا۔

ایک شام، کام ختم کرنے کے بعد کارنیف اور میں نے 'اسٹاک ٹرم' کے لیے دس نمبر ٹرام گاڑی پکڑی، جہاں ہم ویڈولیگرٹ اپنی ناپ دینے گئے تھے۔ یہ کہنا غیر ضروری ہوگا کہ آسکر نے بکتر بند انفینٹری کی وری پہن رکھی تھی، ماریا نے جس میں تبدیلی کر دی تھی۔ جیکٹ کے بٹنوں کی جگہ تبدیل کر دی گئی تھی، پھر بھی، میری عجیب جسمانی بناوٹ کے باعث بٹن بند کرنا ناممکن ہو رہا تھا۔

وہ سوٹ جو شاگرد ویگنس بنانے والا تھا گہرے نیلے رنگ کا، سوئی جیسی مہین لکیروں اور ہلکے بھورے رنگ کے استر والا تھا؛ اکہرا اور کاندھوں پر نمدے لگے تھے؛ یہ سوٹ میرا کوب چھپاتا نہیں تھا، مگر اس کو بڑھا چڑھا کر پیش بھی نہیں کرتا تھا؛ پتلون کے پائنچے نمائشی چوڑے نہیں تھے۔ لباس کے معاملے میں اب بھی میرا ماڈل ماسٹر بیرا ہی تھا، اس

لیے بٹن کے لیے یا گیلس کے لیے پتلون میں لوپ نہیں لگائے جاتے تھے؛ چیک دار واسکٹ، سامنے سے ہلکی اور پیچھے سے دورنگی تھی۔ یہ سب ملا کر پانچ پیس [عدد] ہوتے تھے۔

جس وقت ۶ شخص کارنیف کے دہرے سوٹ پر کام نہیں کر رہا تھا، ایک جوتوں کا سوداگر اپنی بیوی کی قبر کے سلسلے میں ہم سے ملنے آیا، جو 1943 کے ہوائی حملے میں ماری گئی تھی۔ پہلے تو اس نے راشن کے کوپن سے کام چلانا چاہا، مگر ہم نے مصنوعات پر اصرار کیا۔ خوب صورت حاشیوں سمیت سائیلیسیائی سنگِ مرمر کے لیے کارنیف نے اپنے لیے گہرے کتھئی رنگ کے آکسفرڈ جوتے اور قالین پر چلنے والی چپلیں حاصل کیں، اور میرے لیے پانچ نمبر کے پرانے فیشن کے اونچی ایڑی والے سیاہ جوتے جو میرے کم زور ٹخنوں کو سہارا دیتے تھے، اور باوجود قدیم انداز کے، وہ بہت اچھے لگتے تھے۔

شہد تولنے والی ترازو پر رائخ مارک کا ایک بنڈل رکھتے ہوئے، میں نے ماریا سے، اپنے لیے دو سفید قمیصیں، جس میں سے ایک دھاری دار ہو، اور دو ٹائیاں، ایک ہلکے بھورے رنگ کی اور ایک گہرے کتھئی رنگ کی خریدنے کے لیے کہا، "بقیہ۔" میں نے کہا، "میری پیاری ماریا، تمھارے اور گرٹ کے لیے ہیں، جو اپنے لیے نہیں ہمیشہ دوسروں کے لیے سوچتی ہے۔"

جب میری سخاوت جاری تھی، میں نے گسٹے کو اصلی ہڈی سے بنے ہتھے والی چھتری اور تقریباً نئے skat تاش کے پتے دیے، اس لیے کہ اس کو تاش کے پتے بچھانے کا شوق تھا، مگر جب اسے جاننے کی جستجو ہوتی تھی کہ کوئسٹر کب آئے گا، تو پڑوسیوں کے تاش کے پتے مانگنا بہت برا لگتا تھا۔

جب کارنیف اور آسکر اپنے سوٹ لینے گئے تو ہم آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھ کر شرمندہ ہوئے، مگر ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے تھے۔ کارنیف کو اپنی متاثرہ گردن موڑنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ اس کے بازو آگے جھکے ہوئے کاندھوں سے لٹک رہے تھے اور اس نے اپنے مڑے ہوئے گھٹنوں کو سیدھا کرنا چاہا تھا۔ میرے نئے کپڑے مجھے آسیبی، دان شورانہ شکل دیتے ہیں، بالخصوص اس وقت جب میں اپنے ہاتھ سینے پر باندھ لیتا ہوں، اور اپنے دائیں کم زور پیر پر اپنے وزن کو سہارا دے کر بائیں پیر کو غیر

جذباتی انداز میں آگے بڑھاتا ہوں۔ کارنیف اور اس کی حیرت زدگی پر مسکراتے ہوئے، میں آئینے کے سامنے گیا، اس قدر قریب کھڑا ہوا کہ اپنے عکس کو بوسہ دے سکتا تھا، مگر آئینے پر اپنے سانس سے بننے والی دھند میں اپنے چہرے کو چھپا کر مطمئن ہو گیا اور کچھ کہا، گویا بس یوں کہہ رہا ہوں، ''میاں آسکر، تمھیں ایک ٹائی پن کی بھی ضرورت ہے۔''

جب ایک ہفتے، بعد ایک اتوار کی دو پہر میں اپنی نرسوں سے ملنے کی اسپتال گیا تو اپنی نفاست اور بالکل نئے روپ کے باعث ایک نقرئی ٹائی پن کا مالک بن گیا تھا، جس میں ایک موتی بھی جڑا ہوا تھا۔

جب میری پیاری لڑکیوں نے مجھے نرسوں کے کمرے میں بیٹھے دیکھا تو وہ گنگ ہو کر رہ گئیں۔ یہ واقعہ 1947 کے موسم گرما کے آخری دنوں کا ہے۔ میں نے روایتی انداز میں اپنے ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے اور اپنے چمڑے کے دستانوں سے کھیل رہا تھا۔ اب مجھے سنگ تراش کے مددگار کی حیثیت میں کام کرتے اور کھانچے وغیرہ بنانے کی مہارت کو ایک برس ہو گیا تھا۔ میں اپنے پاؤں اس طرح تلے اوپر رکھے بیٹھا تھا کہ میرے پتلون کی لکیر خراب نہ ہو جائے۔ ہماری اچھی گسٹے نے میرے سوٹ کا خیال رکھا، اس طرح، گویا وہ کوسعر کے لیے بنوایا گیا ہو، جس کی گھر واپسی سب کچھ بدل دینے والی تھی۔ سسٹر گرٹروڈ نے کپڑے کو چھو کر محسوس کرنا چاہا، اور میں نے اسے چھونے دیا تھا۔ 1947 کے موسم بہار میں ہم نے خود انڈوں سے بنائی برانڈی اور دو پاؤنڈ مکھن سے بنائے ہوئے سینڈ کیک کے ساتھ کرٹ کی ساتویں سالگرہ منائی تھی۔ میں نے اسے چوہے کے رنگ کا ایک نمدے کا کوٹ دیا تھا۔ جب کہ سسٹر گرٹروڈ اور دوسری نرسوں نے اور میں نے مل کر کچھ مٹھائی دی تھی، بیس پاؤنڈ کچی شکر کے علاوہ جو ہمیں ایک ڈائیورائٹ رسل کے عوض دی گئی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ننھا کرٹ اسکول بہت پسند کرتا ہے۔ اس کی استانی جوان اور دل کش تھی اور کسی طرح بھی مس اسپولنس آور سے مشابہ نہیں تھی، اس کی تعریف ضرور کر رہی تھی؛ اس کا کہنا تھا کہ وہ بہت خوش مزاج مگر قدرے سنجیدہ شخصیت ہے۔ جب آپ مٹھائی لے جائیں تو نرسیں کتنی سنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ جب میں چند لمحے کے لیے سسٹر گرٹروڈ کے ساتھ تنہا ہوا

تو میں نے اس کی اتوار کی چھٹیوں کے بارے میں پوچھا۔

''مثلاً— آج میں پانچ بجے شام کے بعد فارغ ہوں۔'' مسٹر گرٹروڈ نے قدرے بے دلی سے اضافہ کیا، ''شہر میں کچھ کرنے کے لیے نہیں۔'' میں نے کہا کوشش تو کرنی چاہیے۔ اس کا ردِعمل تھا، ''کوشش کرنے کا فائدہ؟'' اُس کا ارادہ تھا کہ آج وہ گھر سے باہر کہیں سوئے گی۔ میں نے زیادہ سنجیدگی سے دعوت دی، اور جب وہ طے نہیں کرپائی تو اس نے بہت پُراسرار طریقے سے خود ہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ ''کچھ چُہل ہوتی رہنی چاہیے... مسٹر گرٹروڈ— جوانی ایک ہی بار آتی ہے۔ میں کسی کو جانتی ہوں جس کے پاس کیک کے بہت سارے ٹکٹ ہیں۔'' میں نے اس کے آخری جملے پر اپنا اظہار جیب تھپتھپاتے اور چاکلیٹ پیش کرتے ہوئے کیا تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ میں بہت خوف زدہ ہو گیا تھا، جب اس 'ویسٹ پھالیائی' چھنال نے، جو میرے طرز کی بالکل نہیں تھی، کہا ''اچھا، جیسا تم کہو، مگر اس جگہ نہیں، 'کارمیلکس پلائز' کیسا رہے گا؟''

میں شاید ہی مسٹر گرٹروڈ کی خود سے یا کسی اور سے، ملاقات کی توقع کرتا، اور وہ بھی اسپتال کے مرکزی دروازے کے قریب۔ ٹھیک چھ بجے میں 'کارمیلکس پلائز' کی گھڑی کے نیچے، جس سے اب بھی جنگ کے اثرات نمایاں تھے، جو وقت بتانے سے معذور ہو گئی تھی، اس کے انتظار میں تھا۔ وہ وقت پر آ پہنچی، اس لیے کہ میں اپنی سستی سی جیبی گھڑی میں دیکھ رہا تھا، جو میں نے چند ہفتے قبل ہی خریدی تھی۔ میں اسے بالکل پہچان نہیں سکا۔ اگر میں نے اسے پہلے دیکھ لیا ہوتا، مثال کے طور پر پچاس قدم دور ٹرام گاڑی سے اترتے ہوئے، تو میں چپکے سے وہاں سے غائب ہو جاتا؛ اس لیے کہ مسٹر گرٹروڈ آج سفید وردی اور ریڈ کراس بٹن والی مسٹر گرٹروڈ بن کر نہیں آئی تھی، وہ شکستہ حال وضع قطع کے شہری لباس میں ڈارٹ منڈ یا ہام کے درمیان کے کسی قصبے کی مس گرٹروڈ ولمز تھی۔ اسے میری مایوسی کا اندازہ نہیں ہوا، مگر اس نے کہا کہ اسے آنے میں دیر ہو جاتی، مگر وہ قدرے بدتمیز سے بولی، اس لیے کہ ہیڈ نرس نے پانچ بجے سے ذرا پہلے کوئی کام سونپ دیا تھا۔

''اچھا، مس گرٹروڈ، کیا میں آپ کو کچھ مشورے دے سکتا ہوں؟ چلیے، پہلے ہم

بیکری کی دکان میں کچھ دیر آرام کرتے ہیں، اس کے بعد جو تم کہو — ہم سنیما جا سکتے ہیں، تھیٹر کے ٹکٹ کے لیے تو دیر ہو گئی ہے، یا کچھ رقص نہ ہو جائے؟" "ارے واہ، ہاں، چلو رقص کے لیے چلتے ہیں۔" وہ شوق سے چلائی، مگر جب میری تمام تر نفاست کے باوجود، اسے احساس ہوا کہ میں اس کے ساتھ رقص کے قابل نہیں تھا، تو بہت دیر ہو چکی تھی۔

یک گونہ کمینے پن کے ساتھ — کہ وہ نرس کی وردی میں کیوں نہیں آئی، جو مجھے بہت پسند ہے — میں نے پروگرام پر صاد کر دیا: وہ جلد ہی اپنی بے تصوری کے باعث، سب کچھ بھول گئی اور میرے ساتھ کیک خوری میں مشغول ہو گئی — میں نے ایک ٹکڑا کھایا تو اس نے تین — جس میں ضرور سیمنٹ کی ملاوٹ رہی ہوگی۔ میں نے، رقم اور کیک کے ٹکٹ سے قیمت ادا کی، اور پھر ہم 'گیرشیم' جانے والی ٹرام گاڑی میں سوار ہو گئے، اس لیے کہ اگر کارنیف پر یقین کر لیا جائے تو 'گرافن برگ' میں ایک رقص گاہ ہوا کرتی تھی۔

سفر کا آخری ٹکڑا ہم نے آہستہ آہستہ پیدل چل کر طے کیا، اس لیے کہ ٹرام گاڑی چڑھائی والے حصے سے ذرا پہلے رک گئی تھی۔ وہ ہمیشہ جیسی ستمبر کی ایک شام تھی۔ گرٹروڈ کی چوبی سینڈل، جو کوپنوں کے بغیر دستیاب ہوتی تھی، ریشم کے کرگھوں کی طرح کھٹاک کھٹاک آواز کرتی تھی۔ یہ آواز مجھے مسرور کر دیتی تھی۔ چڑھائی سے نیچے آتے لوگ پلٹ کر ہمیں دیکھتے۔ مس گرٹروڈ شرما رہی تھی۔ میں اس کا عادی تھا، اس لیے مجھے بالکل پروا نہیں تھی۔ کیوں نہ ہو، وہ میرے کیک کے ٹکٹ تھے جنھوں نے اس کو گرمن کی پیسٹری کی دکان میں سیمنٹ کیک کے تین ٹکڑے کھلائے تھے۔

رقص گاہ کا نام 'ویدگرز' تھا، جس کو شیر کی ماند' بھی کہا جاتا تھا۔ ٹکٹ کی کھڑکی چھوڑنے سے پہلے بھی لوگ کھی کھی کر رہے تھے اور ہم رقص گاہ میں داخل ہوئے تو سارے سر ہماری جانب مڑ گئے۔ سسٹر گرٹروڈ اپنے عام لباس میں بھی مضطرب ہو رہی تھی اور تہہ ہو جانے والی کرسی سے ٹکرا کر گر گئی ہوتی اگر ایک ویٹر اور میں نے مل کر اس کو سہارا نہ دیا ہوتا۔ ویٹر ہمیں رقص کی جگہ سے قریب ایک میز پر لے گیا، میں نے دو ٹھنڈے مشروب منگائے، اور چپکے سے کہا، جو صرف ویٹر ہی سن پایا تھا، "ہو سکے تو، اس میں ایک دو شاٹ 'بھی ڈال دینا، پلیز۔"

'شیر کی مانڈ' میں ایک بڑا کمرہ تھا، جو کبھی گھڑ سواری کی اکادمی رہا ہوگا۔ بموں کے نشانات سے بھری سقف کو پچھلے برس کے میلے کے لہراتے جھنڈوں اور ہاروں سے سجایا گیا تھا۔ بے آواز رنگین روشنیاں دائروں کی شکل میں گھوم رہی تھیں، جن کی کرنیں، فیشن ایبل لباسوں، مصنوعی ریشمی بلاؤزوں میں ملبوس، چور بازاری کرنے والے نوجوان لڑکے لڑکیوں کے تیل سے چپڑے اور بنائے گئے بالوں کو چمکا رہی تھیں، جو ایک دوسرے سے واقف محسوس ہوتے تھے۔

مشروب پیش کیا جا چکا تو میں نے ویٹر سے دس امریکی سگریٹ خریدیں، ایک مسٹر گرٹروڈ کو دی، اور ایک دوسرے ویٹر کو پیش کی، جس نے اسے اپنے کان پر رکھ لیا۔ اپنی دوست کی سگریٹ جلانے کے بعد میں نے آسکر کا پیلے رنگ کا سگریٹ ہولڈر نکالا اور آدھا اونٹ [امریکی سگریٹ camel] پیا۔ ہمارے اطراف کی میزیں خالی تھیں۔ مسٹر گرٹروڈ نے ہمت کر کے اپنا سر اُٹھایا۔ جب میں نے اونٹ کا بڑا سا ٹوٹا ایش ٹرے میں مسل کر وہیں چھوڑ دیا تو مسٹر گرٹروڈ نے بڑے ماہرانہ انداز میں اُٹھایا اور اپنے چمک دار ہینڈ بیگ کی بیرونی جیب میں رکھ لیا۔

"'ڈارٹ منڈ' کے میرے منگیتر کے لیے۔" اس نے کہا، "دیوانوں کی طرح سگریٹ پیتا ہے۔"

مجھے خوشی تھی کہ میں اس کا منگیتر نہیں تھا، اور اس پر بھی خوشی ہوئی کی موسیقی شروع ہو گئی تھی۔

پانچ سازوں والے بینڈ نے "Don't Fence me in." بجانا شروع کیا۔ نرم تلووں والے جوتے پہنے لوگ دوڑ کر، بغیر کسی سے ٹکرائے ہوئے، رقص کی جگہ کے پار گئے اور ان خواتین کے ہاتھ تھام لیے، جنھوں نے اپنے دستی بیگ اپنی سہیلیوں کو حفاظت سے رکھنے کے لیے پکڑا دیے تھے اور انھیں لیے رقص کی جگہ پر واپس آ گئے۔

کچھ جوڑے طویل تجربے کی بنا پر بڑی روانی سے رقص کر رہے تھے۔ اس دوران بھی چور بازاری کا کام رُکا نہیں تھا۔ رہائین کے علاقے کی بولی اور امریکی لہجے کی ملاوٹ میں باتیں کرتے جوڑے ایک لمحے کو رُکتے، بس یوں ہی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کچھ باتیں

کرتے اور اس دوران ان کے درمیان کچھ لین دین ہوجاتا تھا؛ پکے چور بازاری کرنے والے کبھی اپنے کام سے چھٹی نہیں کرتے!

پہلے رقص کے بعد ہم بیٹھے رہے، اگلے فاکس ٹراٹ کے دوران بھی یہی کیفیت رہی۔ آسکر کبھی کبھی مردوں کے پیروں پر نظر ڈال لیتا۔ جب بینڈ نے "Rosamund" دھن چھیڑی تو اس نے پریشان مسٹر گرٹروڈ سے رقص کی درخواست کی۔

رقص بندی میں جان برانسکی کی تربیت کو یاد کرتے ہوئے میں نے، جو تقریباً دو نمبر کے برابر مسٹر گرٹروڈ سے چھوٹا تھا، schieber کرنے کی کوشش کی: مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ جو دھن چھیڑی گئی ہے اس کو چلانا ہوگا، بلکہ بڑھانا بھی ہوگا۔ بڑے تکلف سے گرٹروڈ نے رہنمائی قبول کی۔ میں عقب سے اسے مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا، اس کے قدموں کو آگے پیچھے تقریباً دھکیل رہا تھا۔ اپنے کج نہ ہونے والے بازوؤں سے ہر رکاوٹ کو دور کرتے ہوئے ہم رقص کے فرش کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک آتے جاتے رہے۔ میری توقع سے کہیں بہتر رقص چلتا رہا۔ میں نے ایک دو غلطیاں کیں۔ میرے رخسار اس کے بلاوز سے چپکے رہے، میرے ہاتھ اس کی کمر کو سہارا دے رہے تھے۔ میں schieber کے کلاسیکی انداز کو ترک کیے بغیر رقص کرتا رہا، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ کا ساتھی پیچھے کی طرف گرنے لگے اور آپ اس پر گرنے لگیں تو اس کو سنبھالا دیا جائے، اس لیے کہ اچھے رقاص کبھی گرتے نہیں۔

جلد ہی ہمیں کچھ ناظرین مل گئے تھے۔ مجھے اس قسم کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں: ”میں کہہ نہیں رہا تھا کہ یہ جمی ہے؟۔ ارے! ذرا جمی کو تو دیکھو۔ ہیلو جمی۔ سنو جمی۔ جمی۔ چلو جمی، چلیں۔“

بدقسمتی سے میں مسٹر گرٹروڈ کا چہرہ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ وہ اس تعریف کو با معنی احترام سمجھ رہی تھی یا کچھ اور۔ ایک نرس، بہر حال، اس قسم کی شرمندہ کردینے والی چاپلوسی کی عادی ہوا کرتی ہے۔

ہم بیٹھ گئے۔ ہمارے اطراف کے لوگ اب بھی تالیاں بجا رہے تھے۔ پانچ

نفری بینڈ نے کئی بار اپنے ساز بجا کر ہمیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ادھر "ہنگی" اور "دیکھا ان دونوں کو؟" کا شور مچا ہوا تھا۔عین اس وقت مسز گرٹروڈ نے خواتین کے واش روم کے بارے میں کچھ بڑ بڑاتے ہوئے اپنا دستی بیگ اُٹھایا جس میں 'ڈارٹ منڈ' والے منگیتر کے لیے سگریٹ کا ایک ٹکڑا تھا، شرم سے سُرخ چہرہ لیے، راستہ بناتی، راستے میں آنے والی کرسیوں اور میزوں کے درمیان، ہر شے سے ٹکراتی، خواتین کے کمرے کی طرف چلی جو اتفاق سے باہر نکلنے والے راستے کے بالکل قریب تھا۔پھر وہ واپس نہیں آئی۔اٹھنے سے پہلے اس نے اپنا مشروب ایک بڑے سے گھونٹ میں اپنے اندر اُنڈیل لیا تھا، جو الوداع کہنے کا ایک انداز ہوتا ہے: مسز گرٹروڈ مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

اور آسکر؟ زرد رنگ کے سگریٹ ہولڈر میں امریکی سگریٹ لگائے، اس نے ویٹر سے اِسٹنیپ لانے کے لیے کہا جو بہت آہستگی سے مسز گرٹروڈ کا خالی گلاس اٹھا رہا۔ آسکر نے ہر قیمت مسکرانے کا عہد کر لیا تھا۔اس کے تبسم میں افسردگی کی ملاوٹ رہی ہوگی، مگر وہ بہر حال تبسم تھا۔اپنے ہاتھ باندھے، پیر پہ پیر رکھے، اپنا پانچ نمبری، سیاہ رنگ کا نازک جوتا ہلا رہا تھا اور بچے کھچے احترام کا لطف لے رہا تھا۔

'شیر کی ماند' کے معمول کے آنے والے نوجوان بہت اچھے لوگ تھے: اس بار لہرانے والی دھن بجائی جا رہی تھی اور انھوں نے فرشِ رقص سے لہراتے ہوئے میری جانب دیکھ کر اشارے کیے، "ہیلو" لڑکوں نے شور مچاتے ہوئے کہا، اور لڑکیوں نے کہا "ذرا آرام سے۔" میں نے اپنا سگریٹ ہولڈر ہلا کر انسانیت کے ان سچے مخزنوں کا شکریہ ادا کیا اور بناوٹی مسکراہٹ سے سب کی طرف دیکھا، جب بینڈ ماسٹر نے نقارے، جھانجھ اور مثلث سے ایک زبردست 'سولو' پیش کیا، جس سے مجھے اپنے 'ردھم' کے دن یاد آ گئے۔اگلا رقص، اس نے اعلان کیا، ladies' invitation ہوگا۔

ان دنوں کا ایک بہت پسندیدہ سازینہ "Jimmy the Tiger," شروع ہوا، جو بلاشبہ میرے لیے تھا، حالاں کہ 'شیر کی ماند' کا کوئی شخص بھی عوامی جلسے برباد کرنے والے میرے کردار سے واقف نہیں رہا ہوگا۔ایک منحنی سی حنائی بالوں والی، بے چین روح

میرے قریب آئی اور چیونگ گم کو ایک لمحے کا آرام دیتے ہوئے، سگریٹ نوشی سے بھرائی آواز سے، میرے کان میں سرگوشی کی ".Jimmy theTiger" یعنی، اب میں اس کا پسندیدہ ہم رقص تھا۔ پھر جنگلیوں کی طرح اچھل کود کرتے ہم "وحشی" رقص کرتے رہے؛ چیتا تقریباً دس منٹ تک اپنے مخملیں پنجوں پر چلتا رہا۔ بینڈ نے پھر ایک تعریفی ساز بجایا، اس لیے کہ میرا کوب با قاعدہ ملبوس تھا، میں اپنے پیروں پر، پھرتیلا اور واقعی وحشی چیتے جیسا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی مداح کو اپنی میز پر آنے کی دعوت دی اور ہیلما — کہ یہی اس کا نام تھا — سے کہا، اگر اس کی دوست ہینیلور بھی آنا چاہتی ہے تو بصد شوق آسکتی ہے۔ ہینیلور خاموش، سست اور بلا نوش لڑکی تھی۔ اس کے برعکس ہیلما امریکی سگریٹوں کی عادی تھی، اور مجھے ویٹر سے مزید فرمائش کرنی پڑی تھی۔

بہت اچھی شام تھی۔ ہم نے "Hey Bob A Re Bop," "In the Mood," "Shoeshine Boy," پر رقص کیا، رقص کے دوران بات چیت چلتی رہی، دو مزید نوجوان لڑکیوں سے بھی گپ شپ رہی، جو زیادہ مشقت طلب نہیں تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ "گراف اڈولف پلاٹز" پر واقع ٹیلی فون ایکسچینج میں کام کرتی ہیں، اور یہ بھی کہ وہاں کی بہت سی لڑکیاں ہر سنیچر اتوار کی شب 'ویدگز' میں آتی ہیں۔ وہ خود بھی، جب ڈیوٹی پر نہ ہوں، باقاعدگی سے خود ہی آجاتی ہیں اور میں نے بھی اکثر آنے کا وعدہ کر لیا، اس لیے کہ ہیلما اور ہینیلور بہت اچھی لڑکیاں تھیں، اس لیے اور بھی کہ جب ٹیلی فون نہ آرہے ہوں تو ٹیلی فون آپریٹر لڑکیاں بہت آسان ہوتی ہیں — یہ ایک لطیفہ تھا جس پر دل کھول کر ہنسا جا سکتا تھا۔

بہت دنوں بعد ایک دن میرا اسٹی اسپتال جانا ہوا۔ جب میں نے باقاعدہ آنا جانا شروع کیا، سسٹر گرٹروڈ کا امراضِ نسواں میں تبادلہ ہو گیا تھا۔ دور سے ہاتھ ہلانے کے سوا میں اس سے پھر کبھی نہیں ملا۔ میں 'شیر کی مانند' کی پسندیدہ شخصیت بن گیا تھا۔ لڑکیاں مجھے استعمال کرتی تھیں مگر زیادہ نہیں۔ ان کے ذریعے میری قابض انگریزی فوج کے کئی لوگوں سے سلام دعا ہو گئی تھی اور میں انگریزی کے دو چار درجن الفاظ بھی سیکھ گیا تھا۔ میری دو موسیقاروں سے بھی دوستی ہو گئی تھی، مگر میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا، نقاروں سے

دور رہا، اور کارنیف کی سنگ تراشی سے لطف لیتا رہا۔

1947 سے 1948 تک کے سخت سرمائی موسم کے درمیان میرا ٹیلی فون والی لڑکیوں سے رابطہ رہا۔ خاموش، سست بیچلور سے، کسی زیادہ خرچ کے بغیر، خاصی قربت رہی، مگر غیر وابستہ اور وقتی درجے سے کبھی آگے نہیں بڑھی۔

سرما کے موسم میں سنگ تراش اپنے آلات کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اوزار کو تیز کیا جاتا تھا، چند بچے ہوئے بلاک مسطح کیے اور کندہ کاری کے لیے تیار کیے گئے۔ کارنیف اور میں نے مل کر گودام از سرِ نو ذخیرہ کیا، خزاں کے موسم میں جو تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ ہم نے پتھروں کی باقیات سے کچھ مصنوعی پتھر بھی بنائے۔ میں نے stippling مشین کی مدد سے کچھ سادہ قسم کی سنگ تراشی کی، فرشتوں کے سر بنانے میں مدد کی، یسوع مسیح کا سر مع کانٹوں کے تاج اور مقدس روح کی فاختائیں بنائیں۔ جب برف گری تو بیلچے سے صاف کی، پالش کرنے والے مشین کو جانے والے نلکوں پر جمی برف پگھلائی۔

1948 کے فروری میں، Ash Wednesday کے فوراً بعد — جون کے سالانہ میلے کے درمیان میرا وزن کچھ کم ہو گیا تھا اور میں ہوا جیسا لگنے لگا ہوں گا، اس لیے 'شیر کی مانند' رقص گاہ کی کچھ لڑکیاں مجھ کو ڈاکٹر کہنے لگی تھیں — دریائے رھائین کے بائیں کنارے کے پہلے کاشت کار ہماری پیش کش دیکھنے آئے تھے۔ کارنیف گٹھیا کے اپنے سالانہ علاج، یعنی ڈوپیس برگ کی ایک ڈھلائی کی بھٹی کی مرمت کے لیے گیا ہوا تھا۔ جب وہ ہفتے بعد، سوکھا اور بغیر پھوڑے کا، واپس آیا تو میں تین پتھر، جس میں سے ایک اچھے دام گیا تھا، فروخت کر چکا تھا، اور ایک تین افراد کے مقبرے کے لیے تھا۔ کارنیف نے 'کرش ہائم' کے پتھروں کی دو سلیں فروخت کیں اور مارچ کی ابتدا میں ہم نے ان کو نصب کرنا شروع کیا۔ سائیلیسیائی سنگِ مرمر کی ایک سل 'گریوین بروچ' گئی، 'کرش ہائم' کے دو پتھر 'نوئس' کے قریب کے دیہی قبرستان میں لگے ہیں، سُرخ پتھروں کی ایک سل جس پر میرے بنائے ہوئے فرشتوں کے سر ہیں 'اسٹومیل' کے قبرستان میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مارچ کے آخر میں ہم 'ڈائیوٹرائٹ' کے پتھر جن پر کانٹوں کے تاج کے یسوع بنے

ہوئے تھے، 'کلاس ہام' کی جانب، آہستہ آہستہ لے گئے اس لیے کہ ہمارے تین پہیوں والے ٹرک پر ضرورت سے زیادہ بار تھا، یعنی ہمیں 'نوئس' پر دریائے رھائین پار کرنا تھا۔ 'نوئس' سے بذریعہ 'گریوین بروئچ' 'رومرس کرشین' اس کے بعد سڑک کے ذریعے 'برگ ہائم اِرفت' گئے۔ 'رحدت' اور 'مید رآؤسم' کو پیچھے چھوڑتے ہوئے، گاڑی کا کوئی دُھرا توڑے بغیر، ہم 'اوبر آؤسم' پہنچ گئے۔ وہاں کا قبرستان ایک پہاڑی گاؤں کی جانب ڈھلان پر واقع ہے۔

واہ، کیا منظر تھا! 'اِرفت لانڈ' نرم کوئلے کا ملک ہمارے قدموں میں۔ آسمان کی طرف بھاپ اُگلتی ہوئی فارچونا ورکس کی آٹھ چمنیاں۔ نیا فارچونا توانائی پیدا کرنے والا کارخانہ، اس طرح سی سی کرتا تھا گویا کسی دم پھٹ پڑے گا۔ بار برداری کے چھکڑوں کی رینگتی قطاروں سے غالب خام دھات کا پہاڑ۔ ہر تین منٹ بعد، کھلونے جیسے معدنیاتی کوئلے سے بھری ریل گاڑی، توانائی کے کارخانے کی جانب، یا وہاں سے واپس ہوتی ہوئی، ایک بڑا کھلونا، یا دیوؤں کا کھلونا، ہائی ٹینشن برقی تاروں کی لائن، جو قبرستان کے ایک کونے پر سے گزرتی تھی، تین تار، توانائی سے بھرے، 'کولون' تک جاتے تھے۔ دوسری لائنیں، دوسری جانب، بلجیم اور ہالینڈ، یعنی دنیا کے مدار کی طرف جاتی تھیں۔ ہم نے فلائیز خاندان کے لیے ڈائیورائٹ سِل نصب کی — جو بجلی پیدا کرتا ہے... گورکن اپنے مددگار کے ساتھ، اس موقعے پر جو لیوشنگر کی جگہ کام کر رہا تھا، اپنے اوزار کے ساتھ گزرا۔ ہم بجلی کے ٹینشن کے میدان میں کھڑے تھے۔ تین قطار دور، انھوں نے مکین قبر کو کہیں اور لے جانے کے لیے قبر کھدائی شروع کی۔ ہوا میں قبل از وقت قبر کھدائی کی بو تھی، مگر اتنی بُری بھی نہیں، ابھی صرف مارچ کا مہینہ تھا۔ معدنیاتی کوئلے کے انبار کے درمیان بہار کے سبزے کے میدان۔ گورکن کی عینک کے شیشوں کے درمیان کی کمان دھاگے سے باندھی گئی تھی، وہ دھیمے لہجے میں اپنی لیوشنگر سے بحث کر رہا تھا، کہ تقریباً ایک منٹ تک فارچونا کے کارخانے کا سائرن بجتا رہا، ہمارا سانس رُکا رہا؛ اس کا تو ذکر ہی کیا جس کی باقیات نکال کر لے جائی جا رہی تھیں، صرف ہائی ٹینشن تاروں کا کام جاری تھا۔ سائرن جھک گیا، پانی میں گر پڑا اور ڈوب گیا، گاؤں کی بھورے رنگ کی سلیٹ کی چھتوں سے لنچ کے وقت کا اعلان کرتے

ہوئے دھوئیں کے مرغولے بلند ہوئے، جس کے بعد گرجا کی گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئیں: دعا کرو اور کام کرو، صنعت اور مذہب ایک دوسرے کے لیے نعمت۔ فارچونا میں شفٹ بدلی۔ہم نے اپنے پورک کے سینڈوچ نکالے، مگر قبر کھدائی میں دیر نہیں ہوئی اور ہائی ٹینشن کرنٹ، فاتح طاقتوں کی طرف، ہالینڈ کے لیمپ روشن رکھنے کے لیے تعطل بغیر رواں رہی، مگر اس طرف بار بار ہمہ تن رو بند کی جاتی رہی، مگر مُردہ عورت کو دن کی روشنی نظر آ گئی تھی۔

جب کارنیف بنیاد کے لیے پانچ فٹ گہرے سوراخ کھود چکا تو وہ عورت نکال کر تازہ ہوا میں لائی گئی۔وہ زیادہ عرصے اندھیرے میں نہیں رہی تھی، بس زوال کے بعد سے، اس نے ہونے والی اصلاحات کے ساتھ ساتھ، قدم بہ قدم، اپنی ترقی جاری رکھی تھی۔ان لوگوں کو جو 'روہر' اور 'رھائین لینڈ' کے صنعتی کارخانوں کو اکھاڑ رہے تھے، بہت کامیابی ہوئی تھی؛ سرما کے اس موسم میں، جو میں نے 'شیر کی مانند' نامی رقص گاہ میں ضائع کیا تھا، اس عورت نے بہت اہم ترقی کی تھی اور اب، جب کہ ہم کانکریٹ ڈال رہے تھے اور پائدان نصب کر رہے تھے، اس کو ایک کے بعد دوسرے، ٹکڑے نکالنے پر راضی کرنا چاہیے تھا، مگر جست سے بنا خول اسی لیے تھا، کہ اس کا کوئی بھی ٹکڑا، کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو گم نہ ہو جائے۔بالکل اسی طرح، جب فارچونا میں مفت کوئلہ بانٹا جا رہا تھا، بچے ضرورت سے زیادہ بوجھ سے لدے ہوئے کوئلے کے ٹرک کے پیچھے بھاگتے اور کوئلے کے گرے ہوئے ٹکڑوں کو چنتے جاتے تھے، اس لیے کہ کارڈینل فرِنگ نے منبر سے اعلان کر دیا تھا، واقعی میں تم سب سے کہتا ہوں، کہ کوئلہ اُڑا لینا گناہ نہیں، مگر اس عورت کے لیے تو آگ روشن رکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔میرے خیال میں وہ مارچ کے اس روایتی موسم میں ٹھنڈی نہیں ہو گئی تھی، کافی حد تک اس کی جلد باقی رہ گئی تھی: اس میں کچھ درزیں بن گئی تھیں؛ مگر ان کو کپڑے اور بال نے ڈھانپ دیا تھا، کہ اس کے بال اب بھی اسی طرح گھنگھریالے تھے۔تابوت کے دوسرے لوازمات بھی لے جانے کے قابل تھے، بلکہ لکڑی کے کچھ ایسے ٹکڑے بھی تھے جو دوسرے قبرستان جانا چاہیں گے، جہاں نہ کسان ہوں گے اور نہ فارچونا کے کان کن، اس لیے کہ یہ دوسری آخری آرام گاہ شہر میں ہونے والی تھی،

جہاں ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہا تھا، انیس عدد سفینما ایک ساتھ کام کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے کہ جیسا کہ گورگس نے ہمیں بتایا ہے، یہ عورت اس جگہ کی نہیں تھی، اس کو کہیں سے نکال کر لایا گیا تھا: ''یہ عورت 'کولون' کی رہنے والی تھی، اور اب یہ لوگ اس کو دریائے 'رھائین کے اس پار 'تمھیانم' لے جا رہے ہیں۔'' اگر پورے ایک منٹ کے لیے سائرن بجنے نہ لگتا تو شاید وہ کچھ اور بھی بتاتا۔ سائرن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، میں قبر کی طرف گیا؛ سائرن کی مسلسل آواز کے باوجود میں قبر کشائی کے عمل کو دیکھنا چاہتا تھا، اور میں اپنے ساتھ کچھ لے بھی گیا تھا، اور جب میں بجت کے خول کے قریب پہنچا تو وہ میرا بیلچہ نکلا، جس کو میں نے چلانا شروع کردیا تھا، مدد کے لیے نہیں، صرف اس لیے کہ اتفاق سے یہ میرے پاس موجود تھا۔ اس کے سرے پر میں نے کوئی شے اٹھائی جو زمین پر گر پڑی تھی۔ یہ بیلچہ کسی زمانے میں رائج لیبر سروس کی ملکیت رہا تھا۔ اور رائج لیبر سروس پر جو شے میں نے اٹھائی تھی، وہ بیچ کی ایک انگلی تھی، اور جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ یہ پناہ گزین عورت کی انگوٹھی والی انگلی گری نہیں تھی بلکہ بے حس گورگس نے کاٹی تھی، مگر مجھے محسوس ہوا کہ وہ نہایت خوب صورت اور نازک تھی۔ اسی طرح اس عورت کے سر کا حسن، جو اس خول میں رکھی گئی تھی، اور 1947 اور 1948 کے موسم سرما میں محفوظ رہی تھی، یقیناً آپ کو یاد ہوگا جو بہت سخت تھے، محفوظ رہ گیا تھا، اگر چہ مائل بہ تنزلی تھا۔ مزید یہ کہ اس عورت کا سر اور اس کی انگلیاں مجھ سے بہت قریب تھیں، Fortuna North سے زیادہ انسانیت والی تھیں۔ میں آرام سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس صنعتی منظر سے اتنا ہی لطف ملا ہے جیسا کہ تھیٹر میں گستاف گرونجین سے، ایسا زمینی حسن، جس کو میں ہمیشہ نا قابلِ اعتبار سمجھتا تھا، باوجود ے کہ اس میں فن تھا، جب کہ اس مہاجر عورت کا پیدا کردہ اثر بہت فطری تھا۔ مانا کہ گوئٹے کی طرح، ہائی ٹینشن تاروں نے مجھے کائناتی احساس دیا تھا، مگر اس عورت کی انگلیوں نے میرے دل کو چھو لیا تھا۔ وہ اس وقت بھی میرے دل سے بہت قریب تھیں جب میں نے اس کو مرد سمجھنا شروع کردیا تھا، اس لیے کہ میری وہ چیز میرے فیصلے کرنے کی صلاحیت کے زیادہ مطابق تھی اور اس نے میری قلبِ ماہیت کر دی تھی 'پارک' میں اور

عورت کی قلبِ ماہیت ہیملٹ میں کر دی تھی۔۔۔ جس کا نصف اب بھی زمین میں، اور نصف جست کے اس خول میں تھا۔ اور میں، یارک، کھیل پنجم میں، بیوقوف ''ہوریشیو، میں اسے جانتا تھا'' منظر یکم، جو اس دنیا کی ہر شہ نشین پر۔۔۔ ''افسوس، بے چارہ یارک!''۔۔۔ ہیملٹ کو اپنا کاسئہ سر دے دیتا ہے تا کہ کوئی گروڈجینس یا سر لارنس اُولیویئے ہیملٹ کے کردار میں اسپر غور کرے۔ ''کہاں ہیں اب تمھارے طعنے؟ تمھاری اُچھل کود؟ میں لیبر سرویں کے بیلچے کے سرے پر گروڈجینس کی ہیملٹ انگلیاں رکھے دریائے رحائین کی وادی کے نرم کنکوں کے میدانوں میں، کان کنوں، کسانوں اور ان کے خاندانوں کی قبروں کے درمیان کھڑا، 'اوبرہاوسن' نامی گاؤں کی سلیٹوں والے چھت کے نیچے دیکھ رہا تھا۔ میرے لیے گاؤں کا قبرستان دنیا کا مرکز تھا، جب کہ Fortuna North پُر وقار نیم دیوتا میرا حریف بن گیا تھا۔ میدان ڈنمارک کے میدان تھے؛ 'ایرفت' میری پٹی تھی، آس پاس پڑا جو کچھ سڑ رہا تھا وہ ڈنمارک کی ریاست میں سڑ رہا تھا۔۔۔ اور میں ایک یارک تھا۔ ہائی ٹینشن کرنٹ سے پُر، کڑ کڑ کرتا، ہائی ٹینشن فرشتے، تین تین کی قطار میں، افق کی طرف، گوتھک دیوؤں والے کولون کی طرف، چقندر کے کھیتوں سے گزرتے ہوئے گا رہے تھے۔ مگر زمین کوئلہ اور لاش اُگل رہی تھی، یارک کی نہیں ہیملٹ کی۔ دوسرے، کھیل میں جن کا کوئی کردار نہیں تھا، وہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو گئے تھے۔۔۔ ''خاموشی موت ہوتی ہے''۔۔۔ لوحِ مزارات کے نیچے، اسی طرح جیسے ہم فلائیز کے خاندان کو بھاری بھرکم ڈائیورائٹ سِسل کے نیچے دبا رہے تھے۔ مگر میرے لیے، آسکر برانسکی یارک کے لیے یہ نیا عہد طلوع ہو رہا تھا، اور وہ شاید ہی اس سے واقف رہا ہوگا، میں نے اپنے بیلچے کے سرے پر رکھی ہیملٹ کی گھسی ہوئی انگلیوں پر ایک بار پھر فوری نظر ڈالی۔۔۔ ''یہ موٹا ہے اور مشکل سے سانس لے پاتا ہے''۔۔۔ میں نے گروڈجنس کے کھیل نمبر تین، سیکشن ایک، کی طرف دیکھا، میں نے اس کی ہونے یا نہ ہونے کی مشکل پر نظر کی، اس کی فضول ضابطہ بندی رد کر دی اور اس کے سوال کو زیادہ سنجیدگی سے پیش کیا: میرا بیٹا اور میرے بیٹے کے لائٹر کا چقماق، یعنی میرا زمینی اور آسمانی باپ، میری نانی کے چار لہنگے، حسن، تصویروں سے

لازوال میری بے چاری مما، ہربرٹ ٹروزنسکی کی پیٹھ کے نشانات کی بھول بھلیاں، پولش پوسٹ آفس میں خون جذب کر لینے والی ڈاک کی چھاپیاں، امریکا، مگر امریکا کیا شے ہے ٹرام گاڑی نمبر نو کے مقابلے میں جو ٹم ولسن' جاتی ہے؟ میں نے ماریا کی ونیلا خوش بو پر غور کیا، جواب بھی کبھی کبھی سنگھائی دے جاتی ہے اور لوسی رویَن وانڈ کے تکونے چہرے کا فریبِ نظر بھی: میں نے، موت کی حدتک جراثیم سے پاک کرنے والے مسٹر فان گولڈ سے پارٹی یونین کی تلاش کے بارے میں سوال کیا جو ماتسیرات کے نرخرے میں غائب ہو گئی تھی۔ اور آخر کارنیف کی جانب، بلکہ بجلی کی پاور لائن کے اونچے ستونوں کی طرف رُخ کرتے ہوئے کہا— میرا فیصلہ ہو گیا تھا، مگر اس سے نکلنے سے قبل، مجھے تھیٹر سے متعلق سوال کی ضرورت محسوس ہوتی تھی جو ہیملٹ کے بارے میں شبہ پیدا کر دے گا مگر مجھے، یارک کو، ایک شہری کی حیثیت میں جائز قرار دے دے گا، پھر کارنیف کی طرف رُخ کرتے ہوئے، جس نے مجھے بلایا تھا اس لیے کہ پائدان سے ہمارے پتھر جوڑنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں ایک ایمان دار شہری بننے کی خواہش کے باعث لرز گیا تھا، اور گروجین کی نقل کرتے ہوئے کہا تھا، حالاں کہ وہ مشکل سے یارک بن سکا تھا، بیلچے کے سرے پر کہا تھا، "سوال یہ ہے کہ میں شادی کروں یا نہ کروں۔"

فارچونا نارتھ کے سامنے والے قبرستان کے اس بحران کے بعد، میں نے 'ویڈنگز' کی رقص گاہ، 'شیر کی مانند' میں رقص کرنا ترک کر دیا، ٹیلی فون ایکسچینج کی لڑکیوں سے سارے ناتے توڑ لیے، جن کی سب سے پہلی قابلیت فون کا کنکشن دلوانے میں تھی۔

میں مئی کے مہینے میں ماریا کو سنیما دکھانے لے گیا۔ سنیما کے بعد ہم ایک ریستوران میں گئے اور جی بھر کے کھانا کھایا۔ کھلے دل سے ہماری بات ہوئی۔ ماریا بہت پریشان تھی کہ گرٹ کے ذرائع ختم ہو رہے ہیں، اس لیے کہ شہد کا کاروبار گھٹتا جا رہا ہے، اس لیے کہ میں کم زور، جیسا کہ وہ کہنا چاہ رہی تھی، کئی ماہ سے خاندان کی مدد کر رہا تھا۔ میں نے ماریا کو دلاسا دیا، اس کو بتایا کہ آسکر سے جو کچھ بھی ممکن ہوا کرتا رہا ہے، کہ آسکر بھاری ذمے داری سنبھالنے کو زیادہ پسند کرتا ہے: اس کی حسن و جمال کی تعریف کی، اور

آخر میں اپنی تجویز پیش کر دی۔

اس نے مجھ سے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ کئی ہفتے میرے یارک کے سوال کا جواب خاموشی اور فرار تھا؛ اور آخر میں جواب وہی عام طریقے والا تھا۔

ماریا نے کئی وجوہ پیش کیں۔ اس نے میری آستین سہلائی، مجھے "ڈیئر آسکر" کہا، اور کہا کہ اس دنیا کے لیے میں بہت اچھا آدمی ہوں، مجھے اپنا دوست سمجھنے کی درخواست کی، مگر جب میں نے صاف لفظوں میں پوچھا تو اس نے شادی سے انکار کر دیا۔

اور اس طرح یارک اچھا شہری نہیں بنا، ہیملٹ بنا، احمق بن گیا۔

# میڈونا ۴۹

نظامِ زر کی اصلاحات بہت جلد ہو گئیں، اور میں اس کے نتیجے میں آسکر کی مالیات کے سدھار کی کوشش میں بالکل بیوقوف بن گیا تھا۔ مجھے یا تو اس کے کوب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانا تھا یا کم از کم روزمرہ کے لیے اس پر انحصار کرنا تھا۔

اس کے بعد بھی میں اچھا شہری رہا ہوں گا۔نظامِ زر کی اصلاحات کے بعد کے عرصے نے ــــ اب اچھی طرح واضح ہو چکا ہے ــــ آج ہم جس میں جی رہے ہیں، اور جس میں درمیانے درجے کی جنت کے بیج بوئے جا چکے ہیں، ایک بورژوا آسکر تخلیق کر دیا ہوگا۔ ایک شوہر اور بال بچوں والا آدمی ہوتے ہوئے مجھے جرمنی کی تعمیرِ نو میں حصہ لینا چاہیے تھا؛ آج مجھے درمیانے درجے کے سنگ تراشی کے کاروبار کا مالک ہونا چاہیے تھا، جس کے ذریعے کام کرنے والے تمیں آدمیوں کو رزق، دفتری عمارات، بیمے کے محلات اور چونے کے پتھروں سے بنے ان کی چہرے مہیا ہونے چاہییں تھے جو آج کل بہت عام ہو چکے ہیں: مجھے ایک کاروباری آدمی، خاندان کا سربراہ اور سوسائٹی کا ایک با عزت انسان ہونا چاہیے تھا، مگر ماریا نے مجھے رد کر دیا تھا۔

لہٰذا اس وقت آسکر کو اپنا کوب یاد آیا اور وہ فن کا نشانہ بن گیا۔قبل اس کے کہ کارنیف، جو خود بھی لوحِ مزارات بنانے والے کی حیثیت میں نظامِ زر کے باعث خطرے میں تھا، مجھے رخصت کر دیتا، میں نے خود ہی ملازمت سے استعفٰی دے دیا۔ جب میں گھسے

کونسٹر کے باورچی خانے/ بیٹھک میں بیٹھا انگوٹھے نہیں گھما رہا ہوتا، سڑک کے کونوں پر کھڑا ہو جاتا تھا؛ رفتہ رفتہ میرا درزی کے ہاتھوں بنایا ہوا سوٹ خراب ہونے لگا اور میری شخصیت سے لاپروائی برتنے لگا تھا۔ ماریا سے لڑائیاں تو نہیں ہوتی تھیں، مگر لڑائیوں کے خطرے کے خوف سے میں 'بلک' کے فلیٹ سے سویرے ہی نکل جایا کرتا تھا۔ پہلے تو میں راج ہنسوں کو دیکھنے 'گراف ایڈولف پلاٹز' چلا جاتا تھا، مگر بعد میں راج ہنسوں کو 'ہوف گارڈن' میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ چھوٹا، سوچ میں ڈوبا، مگر تنگی سے مبرا آدمی، یعنی میں، پارک کی بنچ پر بیٹھا رہتا تھا، جو سڑک کے اُس پار، قریب قریب واقع، میونسپل ایمپلائمنٹ ایجنسی اور اکادمی آف آرٹ کے قریب تھا، جو 'ڈوسلڈارف' میں ہیں۔

یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ انسان کسی پارک کی بنچ پر کتنی دیر بیٹھا رہ سکتا ہے؛ اس وقت تک بیٹھتا ہے جب وہ لکڑی میں تبدیل ہو کر، لکڑی سے بنے دوسرے اجسام سے ربط کی ضرورت محسوس کرنے لگتا ہے: بوڑھے مرد صرف اچھے موسم میں آتے ہیں، بوڑھی عورتیں جو رفتہ رفتہ بچکانہ باتیں کرنے لگتی ہیں، بچے جو کھیل کود کرتے اور شور مچاتے ہیں، محبت کرنے والے جنھیں جلد الگ ہو جانا پڑتا ہے مگر ابھی نہیں، ابھی نہیں کی تکرار کرتے رہتے ہیں، ہر موسم میں ملتے ہیں۔ راج ہنس کالے ہو گئے ہیں، موسم گرم ہے، سرد ہے یا فصل کے مطابق معتدل ہے۔ بہت کاغذ پھینکا جاتا ہے: ٹکڑے اِدھر اُدھر اُڑتے ہیں یا راستوں پر پڑے رہتے ہیں، اس وقت تک کہ ٹوپی والا ایک آدمی، شہر کا ملازم، نوکیلی چھڑی میں پھنسا کر ان کو اٹھا نہیں لے جاتا ہے۔

آ سکر بیٹھتے وقت اپنے بلاؤز اور پتلون کے گھٹنوں، دونوں کا یکساں خیال رکھتا تھا۔ جی ہاں، میں نے وہ لاغر نوجوان مرد اور عینک والی لڑکی کو دیکھا تھا — لڑکی چمڑے کے اوورکوٹ میں، پرانی وہرماخت کی پیٹی لگائے ہوئے تھی — مجھ سے مخاطب ہوئی۔ اس بات کا خیال شاید اس کے دوستوں کے دل میں بھی آیا ہوگا، جو اپنی بدمعاش ہیئت کے باوجود مجھ سے، مجھ کوزہ پشت سے، بات کرتے خوف کھا رہے تھے، اس لیے کہ انھیں میری پوشیدہ عظمت کا احساس ہو گیا تھا۔ لڑکی نے ہمت کی تھی۔ وہ اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے

میرے سامنے جم کر کھڑی رہی جب تک کہ میں نے اس کو بیٹھنے کی دعوت نہیں دے دی تھی۔ دریائے رھائین سے پھوار اُٹھ رہی تھی جو اس کی عینک کو دھندلا رہی تھی؛ وہ بولتی رہی، بولتی رہی، جب تک کہ میں نے اس سے اپنی عینک صاف کرنے کے لیے اور قرینے سے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے کہہ نہیں دیا۔ تب اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ مجھے ان سے سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔انھوں نے فوراً ہی پینٹر کی حیثیت میں اپنا تعارف کرا دیا جو کسی ماڈل کی تلاش میں تھے۔میں بالکل وہی تھا انھیں جس کی تلاش تھی، اس لیے کہ انھوں نے یہ بات بڑی پُرجوشی سے کہی تھی جو تقریباً پریشان کردینے والی تھی۔جب میں نے اپنا انگوٹھا پہلی اور بیچ والی انگلی سے رگڑا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ برہنہ ماڈل بننے کے لیے اکادمی فی گھنٹا ایک مارک اسی پفس یا دو مارک ادا کرتی ہے، مگر ٹھگنی لڑکی نے کہا، یہ بات قرین از قیاس نہیں معلوم ہوتی۔

آسکر نے ہامی کیوں بھر لی تھی؟ کیا یہ فن کا لالچ تھا؟ یا دولت کا؟ دراصل دونوں ہی باتیں تھیں۔اس میں فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں ہمیشہ کے لیے پارک کے بنچ کی موجودگی کی خوشیاں اور افسردگی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے دوستوں کے پیچھے— ٹھگنی لڑکی بڑے اعتماد سے آگے چل رہی تھی، دونوں نوجوان اس طرح جھکے ہوئے چل رہے تھے گویا اپنی جینئس کا بار اپنی پشت پر لیے ہوئے ہوں- ایمپلائمنٹ ایجنسی کے پاس سے گزرتا، جزوی طور پر تباہ اکیڈمی آف آرٹ کی طرف چلا تھا۔

پروفیسر کوزحن— سیاہ ڈاڑھی، کوئلے جیسی کالی آنکھیں، کالے رنگ کی نرم ہیٹ، سیاہ ناخن والا— متفق تھا کہ میں ایک لاجواب ماڈل ہوں گا۔

کوئلے جیسے کالی چھیدتی آنکھیں، نتھنوں سے خارج ہوتی سیاہی کے ساتھ، تھوڑی دیر اس نے میرے اطراف گھوم کر معائنہ کیا۔سیاہ انگلیوں والے کسی غیر مرئی دشمن کی طرح اس نے اعلان کیا، ''فن الزام ہوتا ہے، اظہار ہوتا ہے، دیوانگی ہوتا ہے۔فن سفید کاغذ اور سیاہ کوئلے کے درمیان لڑائی ہوتا ہے۔''

پروفیسر کوزحن مجھے اسٹوڈیو کے اندر لے گیا، اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر مجھے

گھومنے والے گول پلیٹ فارم پر رکھ دیا، اور اس کو گھمایا، مجھے چکرانے کے لیے نہیں، ہر جانب سے آسکر کے تناسب کے مظاہرے کے لیے۔ میرے اطراف پینٹنگ رکھنے کی سولہ عدد تپائیاں تھیں۔ کوئلے کی سانس والے پروفیسر نے اپنے شاگردوں کو کچھ ہدایات دیں، کہ وہ اظہار چاہتا ہے، ہمیشہ اظہار، کالا بھجنگ، بے حد سیاہ ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک میں، یعنی آسکر، انسان کا بکھرا ہوا عکس ہوں، الزام ہوں، چیلنج ہوں اور اس صدی کا لامتناہی اظہار ہوں۔ اس کے بعد اس نے تپائیوں کے اوپر سے گرجتے ہوئے کہا، میں چاہتا ہوں کہ تم اس معذور، قدرت کے اس عجوبے کا خاکہ بناؤ؛ میں چاہتا ہوں کہ تم اس کو ذبح کرو، صلیب پر چڑھاؤ، کوئلے کے کیلوں سے اپنے کاغذ پر گاڑ دو۔

یہ ابتدا کا اشارہ تھا۔ کوئلے کی سولہ نوکیلی چھڑیاں [پنسلیں] سولہ تپائیوں کے پیچھے متحرک ہو گئیں؛ کیونکہ میرے اظہار کے، میرے کوب کے اظہار کے قائل ہو گیا، اس کو کالا کر دیا اور اس کو کاغذ پر اُتار دیا۔ پروفیسر کوچن کے شاگردوں نے میرے اظہار کا اتنا سیاہ نقش پیش کیا تھا کہ میرے کوب کے ابعاد ناگزیر طور پر مبالغہ آمیز ہو گئے؛ اظہار نے کاغذ میں سمانے سے انکار کر دیا، حالاں کہ انھوں نے بڑے سے بڑا کاغذ استعمال کیا تھا۔

پروفیسر کوچن نے ان سولہ کوئلہ کاروں کو ایک اچھا مشورہ دیا: میرے خاکے کی ابتدا کوب سے نہیں — جو کیفیتِ اظہار سے اتنا مملو ہے کہ کوئی بھی پیکر اس کو سنبھال نہیں سکے گا — میرے سر کو کاغذ کے اوپری پانچویں حصے پر، جہاں تک ممکن ہو، سیاہ کرنے سے شروع کرو۔

میرے خوب صورت بال گہرے کتھئی رنگ کے ہیں۔ انھوں نے مجھے بکھرے بالوں والا خانہ بدوش بنا دیا۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی میری نیلی آنکھوں پر غور نہیں کیا تھا۔ پندرہ منٹ کے وقفے کے دوران — کہ ہر ماڈل کو تین چوتھائی گھنٹے ماڈل بنے رہنے کے بعد پندرہ منٹ کا وقفہ دیا جاتا ہے — میں نے تمام سولہ خاکوں پر ایک نظر ڈالی۔ میرے نازک خد و خال کے اطراف مذمت ہی مذمت تھی، میری آنکھوں کی تابندگی کہیں بھی نظر نہیں آئی؛ جہاں واضح اور دل کش چمک ہونی چاہیے تھی وہاں مجھے نوتے کوئلے سے بنے گمراہ کُن دائرے نظر آ رہے تھے۔

بہر حال، فن کا اصل تو آزادیٔ اظہار ہی ہوتا ہے۔ میں نے مشفقانہ رویہ اختیار کیا۔ میں نے اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہا کہ فن کی دیوی کی اولاد نے تمھارے اندر کے راسپوتین کو پہچان لیا ہے؛ مگر کیا یہ لوگ کبھی گوئٹے کو بھی دریافت کر سکیں گے، جو تمھاری روح کے اندر خوابیدہ ہے، اور کیا وہ کبھی اس کو بھی جگا کر کاغذ پر لا سکیں گے، معنی خیز کوئلے سے نہیں، حساس اور پابند پنسل کی نوک کے ذریعے؟ نہ وہ سولہ شاگرد خواہ وہ کتنے ہی باذوق کیوں ہوں، نہ پروفیسر کونحن اپنے منفرد کوئلے کے نشانات کی مدد سے آسکر کا قابلِ قبول خاکہ بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس کے باوجود چھ گھنٹے یومیہ پر میری اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی اور وہ بھی احترام کے ساتھ۔ بند کیے ہوئے واش بیسن، پردے یا آسمانی رنگ کے اسٹوڈیو کی کھڑکی سے نظر آنے والے ہلکے ابر آلود آسمان کے پس منظر میں ہر روز میں اسی پنس فی گھنٹے کی اجرت پر اپنے تمام تر اظہار کے ساتھ ماڈل کی صورت بیٹھا رہتا۔

چند ہفتوں کے اندر طلبہ نے اچھے خاصے اور دل چسپ خاکے پیش کیے۔ ان کا "اظہار" خاصا معتدل ہو گیا تھا، میرے کُب کے ابعاد زیادہ معقول تھے؛ کبھی کبھی تو وہ سر سے پیر تک، میرے سینے پر لگے جیکٹ کے بٹن سے میرے پشت کے اُبھار تک کو، میرے پورے وجود کے ساتھ خاکے میں پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں پس منظر کی بھی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ نظامِ زر کی اصلاحات کے باوجود، یہ نوجوان جنگ کو بھولے نہیں تھے؛ میرے عقب میں انھوں نے کھنڈرات بھی بنائے تھے، جن کی کھڑکیوں کی جگہ، التزام کی صورت، سیاہ خلا بنائے گئے تھے۔ تباہ شدہ پیڑوں کے ٹھنٹھ کے درمیان، مجھ کو ایک فراموش کردہ، لاغر مہاجر کی صورت پیش کیا گیا تھا؛ ان کے کوئلے نے مجھ کو زندانی بنا دیا، میرے اطراف زخمی کر دینے والے خار دار تار لگا دیے؛ مجھے کسی سزا یافتہ قیدی کے لباس میں پیش کیا اور میرے ہاتھ میں ٹین کا ایک کھوکھلا نقارہ دے دیا تھا، قید خانے کی کھڑکیوں نے مجھ میں حزینہ گرافک کشش پیدا کر دی تھی۔ اور یہ سب کچھ اظہارِ فن کے نام پر کیا گیا تھا۔

مگر چوں کہ میں، سیاہ بالوں والا خانہ بدوش آسکر جس کو، یہ ساری بد حالی دکھانے کی خاطر، اس کی اصل نیلی آنکھ میں نہیں، سیاہ کوئلے جیسی آنکھ میں پیش کیا گیا تھا

میں سکون سے، خاموش کھڑا (یا بیٹھا) رہتا، حالاں کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ خاردار تارخاکے کے لیے مناسب موضوع نہیں تھے۔اس کے باوجود میں خوش تھا کہ مجسمہ سازوں نے — جیسا کہ سب جانتے ہیں، کبھی کبھی بغیر کسی وقتی پس منظر کے بھی کام کرنا پڑتا ہے — مجھ سے برہنہ ماڈل بننے کی درخواست کی تھی۔

اس بار کسی شاگرد نے نہیں، خود ماسٹر نے مجھ سے بات کی تھی۔پروفیسر 'ماروہن' میرے کوئلہ کھینے والے پروفیسر کے دوست تھے۔ایک دن جب میں کوزحن کے خستہ اور کوئلے سے بنے بے شمار فریم شدہ خاکوں سے بھرے نجی اسٹوڈیو میں بے حرکت کھڑا تھا اور ایک سیاہ ڈاڑھی والا کوئلے کے بے نظیر سیاہ خطوط سے مجھے کاغذ پر منتقل کر رہا تھا، پروفیسر ماروہن مجھ سے ملنے آیا۔گٹھے بدن اور پچاس کے پیٹے کا ایک آدمی، جس نے اگر خاکستری ہیٹ نہ پہنی ہوتی جو اس کو فن کار کی صورت میں پیش کرتی تھی، تو وہ اپنے سفید بالاپوش میں کوئی سرجن ہی نظر آتا۔

پہلی نظر ہی میں مجھے ماروہن کلاسیکی پیکر کا رسیا لگا تھا۔اس نے میری ساخت کو بالکل نامنظور کر دیا اور کوزحن کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا: جس کا نجی خانہ بدوش ماڈلوں سے بھرا نہیں تھا، جن کے باعث اسے جپسی کیک کہا جانے لگا تھا۔کیا اسے پریشاں حال لوگوں پر کام کرنا چاہیے؟ کہا جاتا ہے کہ خانہ بدوشوں کے خاکے اچھے داموں بکا کرتے تھے؛ تو کیا ہمارا کوئلہ کھینے والا اس امید میں تھا کہ بونوں کے خاکے بھی زیادہ مقبول ہوں گے؟ اپنے دوست کے تمسخر کی شدت کو پروفیسر کوزحن نے اپنے کوئلے کے جوشیلے خطوط میں منتقل کر دیا: آسکر کی تصویروں میں یہ تصویر سب سے زیادہ سیاہ تصویر تھی۔سوائے رخسار کی ہڈیوں، ناک، ماتھے اور ہاتھوں کی اداس دھند کے، کوزحن نے میرے ہاتھ بڑے اور گٹھیا کے وجہ سے ورم شدہ اور اپنے اظہار کے لیے بے چین بنا دیے تھے اور اس نے اس خاکے کو اپنی کوئلے کی عیاشیوں کے درمیان رکھ دیا تھا، لیکن اس خاکے میں، بعد میں جس کی نمائشوں میں بہت پذیرائی ہوئی تھی، میری آنکھیں نیلی ہیں، یعنی عام ماندگی کی جگہ ایک واضح ہلکا رنگ استعمال کیا گیا تھا۔آسکر اس انحراف کو ماروہن کے رسوخ کا مرہونِ منت قرار دیتا ہے، جو کالے

ہچکچاہٹ اظہار کا متعصب مخالف نہیں، بلکہ کلاسکیت پسند تھا اور میری آنکھوں کی گوئٹے جیسی وضاحت پر نظر رکھتا تھا۔ وہ صرف آسکر کی نظریں ہی ہو سکتی تھیں جنھوں نے کلاسیکی ہم آہنگی کے رسیا کو اپنی سنگ تراشی کے لیے مجھ کو مناسب ماڈل کے طور پر منتخب کیا تھا۔

ماروہن کے اسٹوڈیو کی روشنیاں خاک سے اٹی اور برہنہ تھیں۔ اس میں ایک بھی مکمل تخلیق نہیں تھی، مگر ہر طرف خوبی سے سوچے گئے جسموں کے منصوبوں کے ڈھانچے بکھرے ہوئے تھے جن کے لیے تار، لوہا اور سیسے کی نلکیاں موجود تھیں، جو ماڈل بنانے والے مٹی کے بغیر بھی، مستقبل کی ہم آہنگی کا منظر پیش کرتی تھیں۔

میں بالکل برہنہ ہو کر پانچ دن تک ماڈل بنا، اور اس نے مجھے دو مارک فی گھنٹا اجرت ادا کی۔ پلیٹ فارم پر کھریا مٹی سے بنا نشان بتاتا تھا کہ میرا دایاں پاؤں کس جگہ رکھا جائے گا۔ کئی ہفتے میں ماروہن کے لیے ماڈل بنا۔ اس دوران اس نے پیروں کے مقابلے میں بازوؤں کے لیے ایک خاص انداز مقرر کیا تھا۔ اس نے مجھے ہر طرح کوشش کرنے دی: بایاں ہاتھ لٹکا ہوا؛ دایاں ہاتھ میرے سر کے اوپر سے مڑا ہوا؛ دونوں ہاتھ میرے سینے پر بندھے یا میرے کوب کے نیچے؛ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے ہوئے؛ امکانات کثیر تھے، اور مجسمہ ساز نے ہر طرح کوشش کی تھی، پہلے خود مجھ پر، پھر لچک دار تاروں کی مدد سے لوہے کے ڈھانچے پر۔

بالآخر مہینے بھر کی کشش کے بعد اس نے گندھی ہوئی مٹی سے میرا مجسمہ بنانے کا فیصلہ کیا، جس میں یا تو میرے ہاتھ سر کے پیچھے بندھے ہوں گے یا بالکل بغیر ہاتھوں کے جسم کی صورت؛ وہ ڈھانچے بنا بنا کر اس قدر تھک گیا تھا کہ اس نے مزید کوشش نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ مٹھی بھر گندھی ہوئی مٹی اٹھاتا، کبھی آگے قدم بڑھا کر اس کو لگانے کی کوشش کرتا، مگر پھر وہ مٹھی کے بے جسم اور بے شکل لوندے کو بکس میں ڈال دیتا؛ بخار کے عالم میں لرزتا، بیٹھا مجھ کو اور میرے ڈھانچے کو گھورنے لگتا اور ڈھانچا بالکل صحیح ہوتا تھا۔

اس نے تنگ آ کر گہرا سانس لیا، اور کہا کہ اس کے سر میں درد ہونے لگا ہے اور آسکر سے کسی قسم کی خفگی کے بغیر، ہاتھ کھینچ لیا۔ اس نے کوب سمیت ڈھانچا مع بندھے

ہوئے پیر، آزاد پیر، بازو بنانے والی نلکیوں اور لوہے سے بنی گردن کے پیچھے بندھی تار سے بنی انگلیاں اٹھائیں اور دوسرے تمام قبل از وقت نامکمل چھوڑے ہوئے ڈھانچے اٹھا کر، ایک کونے میں رکھ دیے۔ آہستگی سے، بغیر کسی بہانے کے، خود اپنی بے اہمیتی کے پیشِ نظر لکڑی کے چھپڑ، جن کو تتلیاں بھی کہا جاتا ہے، جنھیں مٹی کا بوجھ اٹھانا تھا، میرے کوب کے پنجرے میں پھڑ پھڑانے لگے تھے۔

اس کے بعد ہم نے چائے پی اور تقریباً ایک گھنٹے تک گپ شپ کی۔ یہ وقت بھی کام کے وقت میں شامل تھا۔ پھر اس نے گزرے زمانے کی باتیں چھیڑ دیں جب وہ مائیکل اینجلو کی مانند محنت سے اور بے محابا انداز میں، گاڑی بھر مٹی، ڈھانچوں پر اور بے شمار مکمل مجسموں پر تھوپ دیا کرتا تھا، جن میں سے بیش تر جنگ کے زمانے میں تباہ ہو گئے۔ میں نے اس کو آسکر کی سنگ تراشی اور کندہ کاری کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی بتایا۔ تھوڑی دیر تک ہم بے مقصد باتیں کرتے رہے، اس کے بعد وہ مجھے اپنے طلبہ کے پاس ماڈلنگ کے لیے لے گیا۔

اگر لمبے بال صنفِ نازک کی علامت ہوتے ہیں، تو ماروہن کے دس میں سے چھ شاگردوں کو لڑکیاں گردانا جا سکتا ہے۔ چار بہت بے تکلف اور باصلاحیت تھے۔ دو بہت خوب صورت، زندہ دل اور لاابالی لڑکیاں تھیں۔ برہنہ ماڈل بننے میں مجھے کبھی شرمندگی محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس آسکر کو دو لاابالی مجسمہ ساز لڑکیوں کی حیرت پر اس وقت لطف آیا جب انھوں نے مجھے پہلی بار پلیٹ فارم پر کھڑے دیکھا اور غور کیا کہ کوب کے اور چھوٹے قد کے باوجود آسکر کا عضوِ تناسل عام بالغ انسان کے عضو سے محض چٹکی بھر چھوٹا رہا ہوگا۔

شاگردوں کی مشکل استاد سے قدرے مختلف تھی۔ ڈھانچا دو دن میں تیار ہو گیا تھا؛ اور وہ ذہانت کے ہیجان میں جلدی میں اور بے ہنگم طریقے سے باندھی گئی نلکیوں پر مٹی تھوپنے لگے، مگر دراصل انھوں نے کوب کے ابھار میں کافی تتلیاں نہیں ڈالی تھیں۔ اس لیے کہ جوں ہی ماڈلنگ کی گیلی مٹی، آسکر کا مجسمہ بنانے کے لیے لگائی گئی، جو ساری دنیا کو پہاڑ آسکر کے بجائے کسی پہاڑ کے دامن کی طرح دکھائی دیتا تھا، تو وہ دس کے دس ڈھیر ہونے شروع ہو گئے۔ میرا سر میرے پیروں کے درمیان آ گرا، نلکیوں سے لگی مٹی اکھڑ گئی، میرا

کوب جھک کر گھٹنوں تک آ گیا، اور میں ماروہن کی تعریف کرنے لگا جس کے بنائے ہوئے ڈھانچے اتنے مکمل تھے کہ ان کو گوشت سے ڈھکنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

زندہ دل اور خداداد صلاحیتوں کی مالک مجسمہ ساز لڑکیاں رو پڑیں، جب مٹی کا آسکر ڈھانچے کے آسکر سے الگ ہو گیا تھا۔ اور جب ناپائیدار گوشت علامتی طور پر میری ہڈیوں سے گرا تھا تو وہ خوب صورت مگر لاأبالی مجسمہ ساز لڑکیاں چننے لگی تھیں۔ کئی ہفتوں کے بعد کلاس نے منظوری کے قابل چند مجسمے تیار کیے، پہلا مٹی کا، بقیہ پلاسٹر اور مصنوعی سنگِ مرمر کے۔ وہ سب End of Term نمائش میں رکھے گئے تھے، اور مجھے زندہ دل مگر خداداد صلاحیت والی مجسمہ ساز لڑکیوں اور خوب صورت مگر لاأبالی جوان عورتوں کے درمیان نئی مماثلت کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ جب زندہ دل مگر صلاحیت والی جوان لڑکیوں نے دوبارہ بڑی احتیاط مگر شرم گیری کے ساتھ میرا سر، دست و پا، اور کوب بنائے تو یا تو انھوں نے میرے عضوِ تناسل کو نظر انداز کر دیا تھا یا اس کو رسمی طور پر فضولیاتی شے سمجھ لیا تھا، جب کہ بڑی بڑی نیلی آنکھوں اور جوان مگر مخروطی انگلیوں والی بے سلیقہ لڑکیوں نے میرے جسم کے تناسب اور اعضا کی ہم آہنگی پر کم توجہ دی تھی، مگر میرے بارعب عضوِ تناسل کی حتی الامکان باضابطہ نقل گری کی تھی، لیکن چوں کہ میں اس وقت اس موضوع پر بات کر رہا ہوں تو مجھے اپنے مرد مجسمہ سازوں کو نہیں بھولنا چاہیے: انھوں نے میری تجرید کی تھی؛ مسطح اور کھری دار تختوں کے استعمال سے انھوں نے مجھ کو ایک مکعب کی شکل میں پیش کیا تھا اور وہ شے جسے زندہ دل خواتین نے نظر انداز کر دیا تھا، اور خوب صورت لڑکیوں نے نفسانی حقیقت پسندی کے ساتھ بنایا تھا؛ مردوں نے اپنی زرینہ جبلتوں کے باعث ان کو برابر کی مکعب، مگر ٹھوس جیومیٹری شکلوں میں ڈھال دیا تھا۔

کیا یہ سب میری نیلی آنکھوں کے باعث ہوا تھا یا ان ہیٹروں کی وجہ سے، مجسمہ ساز جن سے برہنہ آسکر کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے: بہر حال، کچھ نوجوان پینٹر جو محض خوب صورت اور جوان مجسمہ ساز لڑکیوں کو دیکھنے کی غرض سے آئے تھے، انھیں یا تو میری آنکھوں کی نیل میں یا میری چمک دار، شعاعوں سے متاثر، لابسٹر جیسی سرخ جلد کے حسن کو

دیکھ کر مجھے اوپری منزلوں میں اٹھا لے گئے جہاں پینٹ کرنے کے فن کی تعلیم دی جا رہی تھی۔

پہلے تو پینٹ کرنے والے میری نیلی آنکھوں سے بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے میرے پورے وجود کو نیلے رنگ میں دیکھا۔ آسکر کا کھلتا ہوا رنگ، اس کے گھنگھریالے گھنے بال، اس کا تازہ گلابی رنگ کا منہ، سب کچھ بھیانک نیلے رنگ میں ڈوب گیا تھا؛ حتیٰ کہ، نیلے گوشت کے کچھ حصوں میں، یہاں وہاں، صرف خرابی کے عمل کو تیز تر کرنے کے لیے، کچھ جاں بہ لب سبزہ، کچھ کریہہ زردی رنگ آئی تھی۔ کارنیوال والے ہفتے سے قبل تک آسکر نے کسی اور رنگ کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا تھا، مگر جب تہہ خانے میں ہونے والی اکادمی کی تقریبات میں اس کو 'اُلا' مل گئی تو اُسے اٹھا لایا تا کہ وہ پینٹروں کی Muse بن سکے۔

تو کیا وہ Shrove Monday تھا؟ جی ہاں! وہ Shrove Monday تھا جب میں نے تقریبات میں شرکت کرنے کا فیصلہ کیا، اور خاص وضع قطع کی پوشاک زیبِ تن کی تھی، تا کہ اس رنگ بہ رنگے ہجوم میں ایک پوشاک پوش آسکر بھی شامل ہو۔

جب ماریا نے مجھے آئینے کے سامنے دیکھا تو بولی: "آسکر، بہتر ہے کہ تم گھر پر ہی رہو، تم وہاں کچل جاؤ گے۔"

اس کے باوجود لباسِ فاخرہ زیبِ تن کرتے اس نے میری مدد کی، اور وہ تمام ٹکڑے کاٹ کر نکال دیے جن کی سلائی سے اس کی بہن گسٹے نے لباس کو مسخروں کا لباس بنا دیا تھا۔ پہلے تو میں Velasquez کا بونا بننا چاہتا تھا۔ میں نے ناریس یا شہزادہ ایوجین بھی بننا چاہا تھا، مگر جب میں پورے قد کے ساتھ بڑے سے آئینے کے سامنے کھڑا ہوا، جس میں جنگ کی باقیات کے طور پر ایک آڑا بال پڑا ہوا تھا، جب پورا بوقلموں، ڈھیلا ڈھالا، کٹا پھٹا اور گھنٹیوں سے مزین لباس سامنے آیا تو میرا بیٹا کُرٹ اتنی زور سے ہنسا تھا کہ اس کی کھانسی رُک نہیں سکی، اور میں نے آہستگی سے خود سے کہا، آسکر، اب تم یارک بیوقوف بن گئے ہو، مگر اب وہ بادشاہ کہاں ہے جس کے سامنے احمقانہ کھیل کھیلو گے؟

اس شام گاڑی میں جو مجھے اکادمی کے قریب واقع 'رینگر تو ز' لے گئی تھی، جلد ہی مجھے نظر آ گیا تھا کہ آسکر/یارک، عوام کو، جن میں تمام لونڈے لپاڑی اور ہسپانوی رقاص شامل

تھے، جو اپنے روزمرہ کے بے ہنگم کام بھلا دینا چاہتے تھے، ہنسا نہیں سکا۔ نہیں، میں نے ان کو خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ مجھ سے کنارہ کشی کر گئے، اس قدر کہ اگر چہ گاڑی بھری ہوئی تھی، مجھے بیٹھنے کے لیے آسانی سے ایک نشست مل گئی تھی۔ اکادمی کے باہر، پولیس والے ڈنڈے لیے گھوم رہے تھے جن کا کارنیوال کے تصورات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

فن کے طلبہ کی رقص گاہ بھری ہوئی تھی، پھر بھی بہت سارے لوگ مزید داخل ہونا چاہ رہے تھے۔ اس کے نتیجے میں ہونے والا ہجوم خونیں ہونے کے بجائے زیادہ رنگین ہو گیا تھا۔

جب آسکر نے اپنے گھنٹی بجائی، تو مجمع بحیرۂ احمر کی طرح پھٹا، اور ایک پولیس والا جس کے پیشے نے اس کی آنکھ کو تیز تر کر دیا تھا، میرے اصل کو پہچان گیا۔ اس نے نیچے کی طرف دیکھ کر مجھے سلیوٹ کیا اور اپنے ڈنڈے کو لہراتے ہوئے، میری نگہبانی کرتا، مجھے تہہ خانے کی تقریب تک لے گیا۔ ہم پہنچے تو محفل گرم ہو رہی تھی مگر اُبال پر نہیں آئی تھی۔

کسی کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ فن کاروں کا رقص ایسا واقعہ ہوتا ہے جس میں فن کار خود ہی رقص کرتے ہیں۔ زیادہ تر حقیقی فن کار، کارنیوال کے رنگ میں رنگے پریشان، دل چسپ طریقے سے سجائے گئے ناپائیدار کاؤنٹروں کے پیچھے کھڑے بیئر، اشنیپ، شمپین، اور سا ئیج فروخت کر کے کچھ کمانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ تفریح کے لیے آنے والے زیادہ تر دیہاڑی لگانے والے شہری تھے جو مے نوشی کرنے اور فن کاروں کی طرح دولت لٹانے آئے تھے۔

زینوں پر، کونوں میں، میزوں تلے خوف ناک جوڑوں کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹا گزارنے کے بعد، جو شاید مسرور کرنے والی تکلیف کی تفتیش کر رہے تھے، میری دولیسبو، یا میں یوں بھی کہہ سکتا ہوں کہ ہم جنس پرست چین کی دو لڑکیوں سے دوستی ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ لپٹی رہا کرتی تھیں۔ حالاں کہ انھوں نے اپنے باہمی معاملات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، انھوں نے میرے زیادہ حساس علاقوں میں دست اندازی نہیں کی تھی، بلکہ مجھے ایک منظر پیش کیا تھا جو اکثر تفریح کا باعث ہوا تھا۔ ہم نے دیر تک ایک ساتھ شمپین نوشی کی اور میری اجازت سے، انھوں نے میرے کوب کو، جو اپنے آخری سرے پر تیز اور سینگ جیسا ابھار پیش کرتا تھا، تجربات کے لیے استعمال کیا تھا جس میں خاصی کامیابی ہوئی تھی اور ایک بار

پھر میرا نظریہ صحیح ہو گیا تھا کہ کوب عورتوں کے لیے خوش قسمتی کا باعث ہوتا ہے۔

بہر حال، آگے چل کر ان مصروفیات نے مجھ کو زیادہ ترش رُو بنا دیا تھا۔ مجھ پر خیالات کا ہجوم ہو جایا کرتا اور میں سیاسی مسائل سے پریشان ہونے لگا تھا؛ میں نے میز پر شمعوں سے برلن کے محاصرے کا نقشہ بنایا اور ہوائی جہاز کے ذریعے نکل بھاگنے کی ایک تصویر بھی بنائی۔ اور یہ سوچ کر کہ چینن کی یہ دونوں لڑکیاں ایک ساتھ نہیں ہو سکتی تھیں، میں جرمنی کے دوبارہ اتحاد سے مایوس ہونے لگا تھا اور پھر میں نے وہ کچھ کیا مجھ سے جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ آسکر نے، پارک کے کردار میں، زندگی کا مقصد تلاش کرنا شروع کیا۔

جب میری دوست لڑکیاں مزید کچھ دکھا نہ سکیں تو انھوں نے رونا شروع کر دیا، اور ان کے مشرقی انداز واضح ہونے لگے تھے۔ زخمی، ڈھیلا ڈھالا، اپنی گھنٹیاں بجاتا میں کھڑا ہو گیا۔ میرا دو تہائی حصہ گھر واپس جانا چاہتا تھا، مگر بقیہ ایک تہائی اب بھی کارنیوال جیسے کچھ تجربات کی امید کر رہا تھا۔ عین اس وقت مجھے کارپورل لانکیز نظر آ گیا، یعنی اس نے مجھ سے بات کی۔

تمھیں یاد ہے نا، ہم 1944 کے موسمِ گرما میں اٹلانٹک وال پر ملے تھے۔ اس نے کانکریٹ کی دیکھ بھال کی تھی اور ماسٹر بیرا کے سگریٹیں پی تھیں۔

زینہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے ان میں سے گزرنے کی کوشش کی۔ میں نے سگریٹ سلگائی ہی تھی کہ کسی نے مجھے کونچا اور پچھلے جنگ کے ایک کارپورل نے مجھ سے کہا، ''پیارے دوست، کیا مجھے ایک سگریٹ دے سکتے ہو؟''

ان مانوس الفاظ کے علاوہ، وہ میدانِ جنگ کے بھورے لباس میں بھی تھا۔ حیرت کہ میں نے اسے فوراً پہچان لیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے دوبارہ تعلقات استوار کرنے کی کوشش نہ کی ہوتی اگر اس کارپورل اور کانکریٹ رنگنے والے کی بھوری گود میں ایک لڑکی بیٹھی نہ ہوتی۔

پہلے مجھے پینٹر سے بات کرنے دیجیے، اس کے بعد میں اس لڑکی کے بارے میں بات کروں گا۔ میں نے نہ صرف اس کو ایک سگریٹ دی، بلکہ اس کو جلایا بھی اور جب

دھویں کا پہلا مرغولہ اُٹھا تو میں نے کہا، کارپورل لانکیز، تمھیں یاد ہے نا؟ محاذ پر برا کا تھیٹر؟ وحشیانہ، صوفیانہ، اُکتا دینے والا؟

جب میں نے ان لفظوں میں بات کی تو اس کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی؛ اس نے اپنی سگریٹ کو گرنے سے سنبھال لیا تھا، مگر وہ عورت اس کے گھٹنوں سے گر گئی تھی۔ وہ کسی بچی سے زیادہ بڑی نہیں تھی، لمبی ٹانگوں والی اور شراب کے نشے میں مدہوش۔ میں نے اس کو زمین پر گرنے سے پہلے ہی پکڑ کر لانکیز کی گود میں بٹھا دیا تھا اور جب ہم دونوں، لانکیز اور آسکر، نے لیفٹنٹ کے بارے میں حقارت آمیز یادوں پر مشتمل باتیں کیں، جس کو لانکیز سنکی کہتا تھا، اور میرے استاد برا کے بارے میں بھی کچھ خیالات پیش کیے، اور ان راہباؤں کے بارے میں بھی جواُس دِن رومیل کی مارچوب میں بھی [دوسری عالمی جنگ کے دوران جرمن فیلڈ مارشل رومیل نے فرانس کے ساحل پر اتحادی افواج کے چھاتا بردار سپاہیوں اور جہازوں کو اترنے سے روکنے کے لیے میخیں نصب کروادی تھیں جن کو Rommel asparagus کا نام دیا گیا تھا۔ مترجم] کیکڑے پکڑ رہی تھیں، میں حیرت سے اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ فرشتہ بن کر آئی تھی اور مختلف نوعیت کی دفتی سے ڈھلی ہیٹ پہنے تھی جو انڈے بھیجنے میں استعمال ہوتی ہے۔ باوجود اپنے مضمحل پروں، اور بہت زیادہ مدہوشی کے وہ اب بھی جنت کی مکینوں جیسی فن کارانہ کشش رکھتی تھی۔

"یہ ہے اُلا۔" لانکیز نے مجھے بتایا، "اس نے خیاطی سیکھی ہے، مگر اب یہ ایک مصور بننا چاہتی ہے، مگر میں اس سے کہتا ہوں کہ اس کو بھول جاؤ، کہ خیاطی میں بھی یہ خاصا کما سکتی ہے۔"

آسکر نے، جس نے فن میں اچھا خاصا کمایا ہے، اُلا کو فوراً ہی اکادمی کے پینٹروں سے متعارف کرا دیا، جو یقینی طور پر اس کو ماڈل اور میوز [فن کی دیوی] کے طور پر لے سکیں گے۔ لانکیز میری تجویز سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے فوراً ہی میرے تین سگریٹ اڑا لیے، مگر اس کے عوض، اگر مجھے ٹیکسی کا کرایہ دینے میں عار نہ ہو تو، مجھے اپنے اسٹوڈیو کو دیکھنے کی دعوت دے ڈالی۔

اور پھر کارنیوال پس پشت ڈال کر ہم روانہ ہو گئے۔ میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور لانکیز نے الکوحل سے جلنے والے اپنے چولھے پر ہمارے لیے کافی بنائی جس سے وہ میوز ہوش میں آ گئی۔ جب میری داہنی انگشتِ شہادت سے کونچنے کی مدد سے اس کا پیٹ خالی ہو گیا تو وہ تقریباً بالکل سنجیدہ ہو گئی۔

اس کے بعد ہی مجھ پر اس کی ہلکی نیلی آنکھوں اور اس کی آواز کی حیرتیں آشکار ہوئیں، جو چڑیوں جیسی، شاید ٹین کی کھنک جیسی تھی، جس میں کم کشش نہیں تھی۔ لانکیز نے میرا مشورہ کہ وہ اکادمی میں ماڈل کے طور پر کام کرے گی پیش کر دیا، جو محض مشورہ نہیں حکم کے مانند تھا۔ پہلے تو لڑکی نے انکار کر دیا کہ وہ دوسرے مصوروں کے لیے نہ ماڈل بننا چاہے گی اور نہ میوز بلکہ وہ صرف لانکیز کے لیے کام کرے گی۔

چناں چہ اس نے، جیسا کبھی کبھی با صلاحیت مصور بھی کرتے ہیں، اس کے رخسار پر ایک زور دار تھپڑ رسید کیا؛ اس کے بعد پھر وہی سوال کیا، اور پھر منہ ہی منہ میں ہنس دیا جب، اس لڑکی نے روتے ہوئے جس طرح فرشتے روتے ہوں گے، اکادمی میں معقول اجرت پر ماڈل بننے بلکہ میوز کا کردار بھی ادا کرنے کا بھی اقرار کر لیا۔

یاد رہے کہ اُلا کا قد تقریباً پانچ فٹ دس انچ ہے؛ وہ بہت نازک اندام، ملائم، اور نہایت حسین عورت ہے، جس کو دیکھ کر بوٹی چیلی' اور 'کراناش' یا دونوں ایک ساتھ یاد آنے لگتی ہیں۔ہم دونوں ایک ساتھ برہنہ ماڈل ہو کر سامنے آئے۔جھینگے کے گوشت کا رنگ بھی تقریباً اس کے لمبے چکنے گوشت کی طرح ہوتا ہے، جس پر ہلکا سا بچپنا بھی ہے۔ اس کے سر کے بال کچھ پتلے سے، مگر طویل اور پیال جیسے سنہرے رنگ کے ہیں۔اس کے زیرِ ناف بال سُرخی مائل اور گھنگھریالے اور ایک چھوٹے سے مثلث تک محدود ہیں۔اُلا اپنی بغل کے بال ہر ہفتے صاف کرتی ہے۔

جیسی کہ توقع تھی، عام نوعیت کے طالب علم ہمارے ساتھ کچھ زیادہ کام نہیں کر سکے، انھوں نے لڑکی کے بازو بہت لمبے بنا دیے، میرا سر بہت بڑا بنا دیا اور وہ ہم دونوں کو کسی باقاعدہ ترتیب میں ٹھونس نہیں سکے تھے۔وہ تو صرف 'نزگیے' اور 'راشکول نیکوف' تھے

جنھوں نے ہمیں دریافت کیا، تب ہی آسکر اور میوز کی کوئی قابلِ ذکر تصویر بن سکی تھی۔ وہ سوئی ہوئی۔ میں اسے چونکا کر جگاتا ہوا: جنگل کا دیوتا اور پری زاد حسینہ۔ میں بیٹھا ہوا؛ وہ اپنی چھوٹی اور ہمیشہ کی طرح لرزتی ہوئی چھاتیوں کے ساتھ میرے اوپر جھکی ہوئی، میرے بالوں کو تھپتھپاتی ہوئی: حسن اور درندہ۔ وہ لیٹی ہوئی، میں اس کی ٹانگوں کے درمیان، جوش میں آئے ہوئے گھوڑے کے بہروپ میں: عورت اور یک سنگھا۔

یہ سب کچھ زیگے اور راشکول نیکوف کے انداز میں تھا: رنگین، یا بھورے رنگ اور مہین برش میں (راشکول نیکوف) یا کسی جینئس (زیگے) کے تختۂ مصوری کے تیزی سے چلتے ہوئے چاقو سے بنا تھا۔ ان تصویروں میں سے کچھ میں اُلا اور آسکر کے درمیان قربت کی پُر اسراریت بھی تھی؛ وہ راشکول نیکوف کی تصویریں تھیں، جو ہماری مدد سے، ورائے حقیقت پسندی کی بلندی تک پہنچ گیا تھا۔ آسکر کا چہرہ ہمارے دادا کے گھڑیال کے شہد جیسے زرد رنگ ڈائل جیسا ہو گیا تھا؛ میرے کوب میں مشینی گلاب کھل اٹھے تھے جنھیں اُلا نے توڑ لیا تھا؛ ایک تصویر میں اُلا ایک طرف مسکراتی ہوئی اور دوسری جانب لمبے بیروں والی، جس کو بیچ سے کاٹ کر کھول دیا گیا تھا اور اس کے اندر، تلی اور جگر کے درمیان آسکر بیٹھا ہوا کسی تصویری کتاب کے ورق پلٹ رہا تھا۔ کبھی وہ ہم کو کچھ لباس پہنا دیتے، اُلا کو فاختہ بنا دیتے اور مجھے بسورتا ہوا سفید چمک دار پینٹ سے رنگے چہرے والا مسخرہ۔ وہ راشکول نیکوف تھا — اس کی یہ عرفیت اس وجہ سے تھی کہ وہ ہمیشہ جرم وسزا، غلطی اور تلافی کے بارے میں باتیں کرتے تھکتا نہیں تھا — جس کی تصویر شاہکار نکلی: میں اُلا کے دودھ جیسے سفید برہنہ زانوؤں پر بیٹھا، ایک معذور لڑکا — وہ میڈونا تھی جب کہ میں یسوع تھا۔

"Madonna 49" عنوان کی یہ پینٹنگ کئی نمائشوں میں رکھی گئی تھی؛ یہ ایک پُر اثر پوسٹر بھی ثابت ہوئی تھی، جو میری ہمیشہ کی محترم ماریا کی نظر سے بھی گزرا تھا، اور اس پر ہماری گھریلو لڑائی بھی ہوئی تھی۔ اس کو وادیِ رہائن کے ایک صنعت کار نے خاصی بڑی رقم میں خرید لیا تھا، اور آج بھی ایک بڑے کاروباری ادارے کے بورڈ روم میں ٹنگی، بورڈ کے ڈائریکٹروں پر اثر انداز ہوتی رہتی ہے۔

اپنے کوب اور اس کے متناسب بنیاد پر کیے جانے والے ذہانت سے بھرپور عفریتی اظہار کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اُلا اور میری دونوں کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی، اور ہم دونوں کو ماڈلنگ کے لیے، الگ الگ، ڈھائی مارک فی گھنٹا اجرت ملنے لگی تھی۔ اُلا بھی اپنے نئے پیشے سے خوش تھی۔ اب جب کہ اس کی معقول اور مستقل آمدنی ہو گئی تھی، وہ سینگ بردار لانکیز بھی اس سے بہتر سلوک کرنے لگا تھا اور اسی وقت اس کی ٹھکائی کرتا تھا جب اس کا تجریدی مزاج خود فصد در ہونا چاہتا تھا۔ ماڈل کی حیثیت میں وہ اس کا کوئی استعمال نہیں کر سکتا تھا، مگر، اس کے لیے بھی وہ لڑکی ایک میوز ہی تھی، اس لیے کہ اس کے کان بند کرنے کے بعد ہی لانکیز کے ہاتھ اپنی اصلی تخلیقی قوت حاصل کر سکتے تھے۔

مجھ میں بھی اُلا کی غم آلود نزاکت کی وجہ سے، جو دراصل کسی فرشتے کی بتائے دوام کی کیفیت ہوتی ہے، تشدد کے جذبات ابھرتے تھے مگر میں ان پر قابو پا لیتا تھا اور جب بھی اس کو زور سے کوڑے مارنے کی خواہش پیدا ہوتی، تو میں اس کو پیسٹری کی دکان پر لے جاتا یا مخصوص قسم کی نفاست سے، جو فن کاروں سے میری رفاقتوں کے باعث پیدا ہوئی تھی، میں اپنے جسمانی تناسب کے مقابلے میں، اس کو، نہایت مصروف 'کوئینگ ایلی' میں ایک نادر پودے کی صورت میں پیش کرتا، جہاں ہم کو ہکا بکا ہو کر دیکھا جاتا تھا۔ ورنہ بالآخر میں اس کے لیے لیونڈر کے موزے اور گلابی دستانے خرید دیتا تھا۔

راشکول نیکوف کا معاملہ الگ تھا، جو اس کو ہاتھ لگائے بغیر بھی اس سے بہت قریبی تعلقات رکھتا تھا۔ وہ، ماڈلنگ کی طرح، جس قدر ممکن ہوتا، اس کی ٹانگیں پھیلا کر بٹھا دیتا تھا۔ خود چند قدم دور ایک اسٹول پر بیٹھ جاتا اور اس کی اندامِ نہانی کو گھورتا، اس سے نہایت جذباتی، پھڑائی ہوئی سرگوشی میں جرم اور تلافی کے بارے میں باتیں کرتا۔ میوز کی اندامِ نہانی نم آلود اور کشادہ ہو جاتی اور تھوڑی دیر بعد راشکول نیکوف دیکھنے اور اپنے آپ کو سننے کی وجہ سے کیفیتِ انبساط و انزال سے دوچار ہو جاتا۔ جس کے بعد وہ اپنے اسٹول سے اچھل کر کھڑا ہو جاتا اور "Madonna 49" کو پینٹنگ کی بیاتی پر جما کر اپنے پُرشکوہ برش سے رنگ بھرنے لگتا تھا۔

کبھی کبھی راشکول نیکوف مجھے بھی گھورنے لگتا تھا، مگر اس کی اور وجوہ ہوتی تھیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا مجھ میں کسی چیز کی کمی تھی۔ وہ مجھ سے انگلیوں کے درمیان ایک قسم کے خلا کی باتیں کرتا اور میرے ہاتھوں میں ایک کے بعد دوسری شے پکڑانے لگتا۔ اس نے آسکر کو پستول سے مسلح کیا، آسکر کو میڈونا کا نشانہ لینے دیا۔ یا میں میڈونا کے سامنے ریت گھڑی کا شیشہ یا آئینہ رکھتا، جو گروی (convex) ہونے کے باعث اس کو بھیا نک بنا دیتا تھا۔ اس نے مجھے قینچی، مچھلی کے کانٹے، ٹیلی فون کے ریسیور، چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز، بکتر بند کاریں، دخانی جہاز پکڑائے مگر کوئی شے اس خلا کو بھر نہیں سکی۔ آسکر کو اس دن سے خوف آتا تھا جس دن مصور وہ شے لے کر آجائے گا جو میرے ہاتھ میں آنے کے لیے بنی تھی اور بالآخر ایک دن وہ نقارہ لے آیا، تو میں نے چلا کر کہا تھا، ''نہیں!''

راشکول نیکوف: ''آسکر! لو یہ نقارہ سنبھالو۔ میں تمھارے آر پار دیکھ چکا ہوں۔''

میں: لرزتا ہوا: ''اب کبھی نہیں۔ وہ سب ختم ہو چکا ہے۔''

راشکول نیکوف: ''کوئی چیز ختم نہیں ہوتی، ہر شے واپس آتی ہے، جرم، تلافی، اور مزید جرم۔''

میں: اپنی آخری قوت سے کہا: ''آسکر تلافی کر چکا ہے، اس کو نقارے سے باز رکھو۔ میں ہر وہ شے پکڑ سکتا ہوں جو تم کہو ہر شے، مگر نقارہ نہیں۔''

اُلا مجھ پر جھکی تو میں رو پڑا کہ آنسوؤں کے باعث اندھا، میں اس کو بوسہ لینے سے روک نہیں سکا، میں میوز کو وہ خوف ناک بوسہ لینے سے روک نہیں سکا تھا۔ آپ سب، جن کا کسی میوز نے کبھی بوسہ لیا ہو، یقینی طور پر سمجھ سکتے ہیں کہ آسکر کو اس ایک بوسے کی مہر لگ جانے کے بعد نقارہ واپس لینا پڑ جائے گا، جسے برسوں پہلے اس نے رد کر دیا تھا، اس نقارے کے ساتھ جو اس نے 'سانپے' کے قبرستان کی ریت میں دفن کر دیا تھا۔

مگر میں نے نقارہ نوازی نہیں کی۔ صرف ماڈل کے طور نقارہ پکڑے رہا اور مجھ کو یسوع نقارہ نواز لڑکے کی صورت پینٹ کیا گیا، جو میڈونا 49 کے برہنہ زانو پر بیٹھا ہوا تھا۔

یہ تھا وہ منظر جس میں ماریا نے مجھے فن کی ایک نمائش کے ایک پوسٹر پر دیکھا تھا۔ میری لاعلمی میں، وہ نمائش گئی تھی اور اس تصویر کو دیکھا تھا؛ وہ کافی دیر کھڑی رہی ہوگی،

اس لیے کہ جب اس نے اس کے بارے میں بات کی تو مجھے گرٹ کے اسکول رولر سے مارا بھی تھا۔ وہ، جو کئی ماہ سے پُر تکلف غذا کی دُکان میں اچھے مشاہرے پر ملازم تھی، پہلے سیلز گرل بنی، پھر، اپنی واضح صلاحیتوں کے طفیل خزانچی بن گئی تھی اور اب مغربی جرمنی کی باقاعدہ شہری بن چکی تھی، اور مشرق کی جانب سے ہونے والی چور بازاری سے اس کا کوئی واسطہ نہیں رہ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے مجھے سؤر، بھڑوا اور ذلیل کہہ کر پکارا تھا۔ وہ تو اس حد تک چلی گئی تھی کہ اس نے چلا کر کہا تھا کہ اسے نہ اس غلیظ دولت کی ضرورت ہے جو میں اپنے غلیظ پیشے سے کما رہا تھا اور نہ اب میری ضرورت تھی۔

حالاں کہ ماریا نے جلد اپنا آخری جملہ واپس لے لیا تھا، اور صرف دو ہفتے بعد وہ میرے رہنے اور کھانے کے عوض میری ماڈلنگ کی آمدنی کا خاصا حصہ ہتھیا لیتی تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں اس کے، اس کی بہن گستے اور اپنے بیٹے گرٹ کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ پہلے تو میرا ارادہ تھا کہ میں کہیں دور چلا جاؤں گا، ہیمبرگ یا شاید کسی ساحلی علاقے میں، مگر ماریا نے، جسے میرے چلے جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، اپنی بہن کی حمایت کے ساتھ اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ میں اپنے لیے ایک کمرہ تلاش کر لوں جو اس سے اور گرٹ سے زیادہ فاصلے پر نہ ہو، مگر 'ڈوسلڈارف' ہی میں کہیں ہو۔

# خار پشت

اس نے صرف ایک ذیلی کرایہ دار کی حیثیت سے نقارہ نوازی کے ذریعے ماضی کو پیش کرنے کا فن سیکھا تھا۔ وہ صرف ایک کمرہ ہی نہیں تھا؛ خار پشت نے، احاطے میں بنے تابوت کے گودام نے اور مسٹر ڈوروتھیا کے علاوہ مسٹر منظر نے بھی اس کی مدد کی تھی۔

کیا آپ پارسیفال (Parsifal) سے واقف ہیں؟ میں بھی اسے پوری طرح نہیں جانتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ برف پر تین قطرہ خون کے بارے میں ایک کہانی ہے۔ کہانی سچی ہے، اس لیے کہ یہ ہاتھ میں دستانے کی طرح فٹ ہوتی ہے۔ غالباً یہ ہر اس شخص کی کہانی ہے جس کے پاس کوئی خیال ہوتا ہے۔

میں اس وقت بھی فن کا خادم تھا؛ مجھے نیلے، ہرے اور زمینی رنگوں میں پینٹ کیا جاتا تھا؛ میں نے خود کو نرم کوئلے سے بننے والے خاکوں، اور پس مناظر کے آگے رکھے جانے کے لیے پیش کیا؛ میں نے میوز اُلا کی معیت میں، اکادمی میں پورے سرما میں ایک سیمسٹر کا اور اس کے بعد آنے والے موسم گرما کے سیمسٹر کا بھی خیال پیش کیا تھا، مگر برف پہلے ہی گر چکی تھی جس کو تین قطرہ خون ملنا تھا جس کے منظر نے مجھے اسی طرح مبہوت کیا، جس طرح اس نے احمق پارسیفال کو مبہوت کر دیا تھا، جس کے بارے میں احمق آسکر اتنی کم معلومات رکھتا ہے کہ وہ خود بھی اسی پارسیفال جیسا نظر آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا نقش بے سلیقہ مگر صاف ہے؛ کہ برف نرس کی وردی ہے؛ سرخ صلیب ہے، جو مسٹر ڈوروتھیا

سمیت بیش تر نرسیں اپنے بروچ کے درمیان پہنتی ہیں جوان کے کالر کو بند رکھتا ہے، جو میرے لیے تین قطرے خون جیسا تھا۔ میں وہاں بیٹھا تھا اور اس پر سے اپنی نظریں ہٹا نہیں سکا تھا۔

مگر قبل اس سے کہ میں زائیڈلر کے فلیٹ کے ساتھ غسل خانے میں بیٹھتا، مجھے کمرہ تلاش کرنے کے لیے جانا تھا۔ سرما کا سیمسٹر ختم ہونے کے قریب تھا؛ طلبہ میں سے کچھ جو ایسٹر کے بعد واپس نہ آنے کا منصوبہ بنا رہے تھے، اپنے کمرے خالی کرنے والے تھے۔ میری ساتھی میوز اُلا میری مددگار ثابت ہوئی: وہ مجھے طلبہ کے ہاؤسنگ کے دفتر لے گئی، جہاں انھوں نے مجھے بہت سارے پتے دیے اور اکادمی کی جانب سے ایک سفارشی خط بھی فراہم کیا۔

پتوں پر نظر ڈالنے سے پہلے میں 'دِست وِیگ' میں سنگ تراش کارنیف سے ملنے اس کی دکان پر گیا۔ اس سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ اس کی پسندیدگی مجھے اس کے پاس کھینچ کر لے گئی تھی، مگر میں فرصت کے دوران کام کی تلاش میں بھی تھا: میں اُلا کے ساتھ اور اس کے بغیر بھی چند گھنٹے نجی ماڈلنگ کرتا تھا مگر اس سے ملنے والی اُجرت مجھے مشکل سے اگلے چھ ہفتوں تک زندہ رکھ سکتی تھی، مزید یہ کہ مجھے کمرہ بھی لینا تھا اور کرایہ بھی بڑھا تھا۔

مجھے کارنیف میں کوئی تبدیلی نہیں دکھائی دی— ایک پھوڑا ابھی تک پکا نہیں تھا، بقیہ دو تقریباً ٹھیک ہو چکے تھے۔ بلجیم کا ایک سنگِ خارا جسے کارنیف درست کر چکا تھا، اس پر پالش کر رہا تھا۔ ہم نے تھوڑی دیر باتیں کیں؛ میں نے پتھر پر بڑی حروف کندہ کرنے والی چھینیوں سے کھیلتے ہوئے کچھ مشورے دیے اور ان سلوں کو دیکھنا چاہا جو قرینے سے کاٹی اور پالش کی گئی تھیں اور کندہ کاری کے لیے تیار تھیں۔ دو سلیں، ایک shell lime کی اور دوسری سائیلیسیائی سنگِ مرمر کی، کارنیف نے فروخت کر دی تھیں اور حروف کی کندہ کاری کرانے والے ماہر کے انتظار میں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے کارنیف کو نظامِ زر کی اصلاحات کے دوران کامیابی سے مشکل وقت گزار لینے پر مبارک باد پیش کی۔ پھر بھی، ہمیں اس خیال سے تسلی تھی کہ نظامِ زر کی اصلاحات خواہ کتنی ہی قوی، ضروری اور امید پرستانہ کیوں نہ ہوں، یہ لوگوں کو مرنے اور لوحِ مزارات بنوانے سے روک نہیں سکیں گی۔

ہماری پیشین گوئیوں کی تصدیق ہو گئی۔ ایک بار پھر لوگ مرنے اور خریدنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ نظامِ زرعی اصلاحات سے نئے کاروبار میں بھی اضافہ ہوا تھا؛ گوشت فروش اپنی دکانوں کے چہرے، اور کبھی کبھی اندرون کو بھی نفیس سنگِ مرمر سے آراستہ کرا رہے تھے؛ کچھ بینک اور بڑی بڑی دکانیں بھی، اپنے سابقہ وقار کو بحال کرنے کی غرض سے ریت کے پتھروں اور چونے کے پتھروں کی مرمت کروانے اور ان کو دوبارہ آراستہ کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔

میں نے کارنیف کو اس کی سرگرمیوں پر مبارک باد دی اور اس سے پوچھا کہ کیا وہ خود سارا کام کرنے کے قابل ہے، پہلے تو اس نے ایک طرح کے گریز کا جواب دیا، مگر بعد میں اعتراف کیا کہ کبھی کبھی اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش اس کے چار ہاتھ ہوتے؛ اور بالآخر اس نے ایک تجویز پیش کی کہ میں نصف دن کی بنیاد پر اس کے لیے حروف کی کندہ کاری کا کام کروں؛ وہ مجھے گہرے حروف کے لیے پینتالیس پینی فی حرف چونے کے پتھروں پر، اور پچپن پینی فی حرف سنگِ خارا اور ڈائیورائٹ پتھروں پر دے گا، جب کہ ابھرے ہوئے حروف کے لیے وہ ساٹھ اور پچھتر پینی ادا کرے گا۔

میں نے فوراً ہی shell lime کے ایک ٹکڑے پر کام شروع کر دیا۔ جلد ہی اپنی ہنرمندی دوبارہ حاصل کر کے میں نے — الائز کوفر 3 ستمبر 1887: 10 جون 1946 پر مشتمل کندہ کاری کر دی۔ اس عبارت میں سب ملا کر چونتیس حروف اور ہندسے تھے۔ اس طرح مجھے واپسی پر پندرہ مارک اور تیس پینی اجرت مل گئی۔

یہ رقم ماہانہ کرایے کی ایک تہائی کے برابر تھی، جو میں نے دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں چالیس مارک ماہانہ سے زیادہ دینے پر تیار نہیں تھا، اس لیے کہ آسکر اب بھی 'بلک' والے گھر کی مدد کرنے کو اپنا فریضہ سمجھتا تھا۔

ہاؤزنگ آفس والے مجھ پر مہربان تھے کہ انھوں نے مجھے چار پتے دے دیے: میرا پہلا انتخاب تھا:... زائیڈ لر — جولیچر اشٹراسے — اس لیے کہ یہ جگہ اکادمی سے قریب تھی۔ میں نے مئی کی ابتدا میں ایک گرم اور کہر آلود دن، جیسا کہ زیریں رھائین لینڈ

کے موسمِ بہار میں ہوتا ہے، شروعات کی تھی، جب میرے پاس معقول رقم جمع ہو گئی تھی۔ماریا نے میرے سوٹ پر استری کر دی تھی اور میں خوش وضع نظر آرہا تھا۔عمارت کا استر کاری سے بنا چہرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار اور اس کے سامنے ایک خاک آلودہ شاہ بلوط کا درخت تھا۔چوں کہ جوئیٹر اشتراسے کا نصف حصہ کھنڈر بن چکا تھا، برامد والے گھر کا یا سڑک کے اس پار کا تذکرہ نہ کرنا غیر حقیقی ہوگا۔بائیں جانب ایک ڈھیر تھا جس پر گھاس اور خود رو پھول اُگے ہوئے تھے، اور کہیں کہیں زنگ آلودہ T کی شکل کی آہنی شہتیریں نظر آجاتی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ اس جگہ چار منزلہ عمارت رہی ہوگی۔اس کی دائیں جانب جزوی طور پر مسمار گھر کی تیسری منزل تک مرمت ہو چکی تھی۔مگر بظاہر معمار کا سرمایہ ختم ہو چکا تھا؛ عمارت کے چہرے پر لگی سویڈن کے سنگِ خارا کی سِلوں پر جگہ جگہ شگاف پڑے ہوئے تھے جن کی مرمت کی اشد ضرورت تھی۔شورنے مان تجہیز و تکفین والے کی دُکان کے نام کے کئی حرف غائب تھے، مجھے یاد نہیں کون سے۔شیشے جیسے چکنے سنگِ خارا پر بنی کھجور کی دو شاخیں اسی طرح باقی تھیں جو دُکان کو خفیف سی پارسائی اور احترام دیتی تھیں۔

یہ کاروبار پچھتر برس سے جاری تھا۔تابوت بنانے کا کارخانہ احاطے میں تھا، میری کھڑکی کے سامنے، میں جسے دیکھنے کے قابل پاتا تھا۔صاف موسم میں برآمدے سے تیار شدہ تابوت نکلتے، آرے کی گھوڑی پر چڑھائے جاتے تاکہ ان کی پالش درست کی جا سکے۔مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ یہ آخری آرام گاہیں عام روایتی انداز میں پائنتی کی جانب مخروطی تھیں۔

میری گھنٹی کا جواب زائیڈلر نے خود دروازہ کھول کر دیا تھا۔چھوٹا قد، سانس چڑھا ہوا، خارپشت جیسا حلیہ، دروازے کے درمیان کھڑا تھا؛ موٹے شیشے کی عینک اور نصف چہرہ ڈاڑھی بنانے کے صابن سے چھپا ہوا تھا۔ڈاڑھی بنانے کا برش اپنے رخسار سے لگا رکھا تھا، عادی شرابی نظر آتا تھا اور لہجے سے مغربی پھالیائی معلوم ہوتا تھا۔

"اگر کمرہ پسند نہ ہو تو آئیں بائیں شائیں کی ضرورت نہیں۔میں ڈاڑھی بنا رہا ہوں، اس کے بعد مجھے اپنے پاؤں بھی دھونے ہیں۔" صاف ظاہر ہے کہ وہ دکھانے کی تقریب میں موجود نہیں تھا۔میں نے کمرہ دیکھا۔بلاشبہ کمرہ پسند نہیں آیا؛ کمرہ پہلے کبھی غسل

خانہ تھا، آدھی دیوار فیروزی رنگ کے ٹائلوں سے ڈھکی تھی، آدھی دیوار پر تشنج پیدا کر دینے والے نمونے کا کاغذ لگا تھا۔ میں نے اپنے احساس کا اظہار نہیں کیا۔ خشک ہوتے ہوئے صابن اور بغیر دُھلے پاؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے، میں نے پوچھا، کیا نہانے کے ٹب کو نکال دیا جائے گا، بالخصوص اس لیے کہ اس میں پانی نکلنے کا پائپ بھی لگا ہوا نہیں ہے۔

مسکراتے ہوئے، اس نے اپنا بھورے خارپشت کے جیسا سر ہلا دیا اور ڈاڑھی بنانے کے صابن میں جھاگ پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ یہ اس کا جواب تھا۔ چناں چہ میں نے چالیس مارک ماہانہ کرایے پر، نہانے کے ٹب کے سمیت، کمرہ لینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

ہم کم روشن، نلی جیسی راہداری سے، کئی شیشے کے، مختلف رنگوں سے رنگے دروازوں سے گزرتے، واپس آئے اور پھر میں نے پوچھا کہ فلیٹ میں اور کون رہتا ہے۔

"بیوی اور کرایے دار۔"

میں نے ایک شیشے کے دھندلے دروازے پر ٹھک ٹھک کیا جو فلیٹ میں داخلے سے ایک قدم کے فاصلے پر تھا۔

"ایک نرس" زائیڈلر نے کہا، "بہت کم نظر آتی ہے۔ تم اسے کبھی دیکھ نہیں پاؤگے۔ وہ یہاں صرف سونے کے لیے آتی ہے، کبھی نہیں بھی آتی۔"

میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ "نرس" کا لفظ سن کر آسکر ایک لمحے کے لیے لڑکھڑا گیا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دوسرے کمرے والوں کے بارے میں پوچھنے کی ہمت نہیں کی، مگر اپنے کمرے کے نہانے کے ٹب کی جگہ پر غور کرنے لگا: ٹب ہال سے قریب دائیں جانب تھا۔

زائیڈلر نے میرے کوٹ کے سامنے والے کالر پر تھپکی دیتے ہوئے کہا، "اگر تمھارے پاس الکوحل کا چولھا ہو تو تم اپنے کمرے میں کھانا پکا سکتے ہو۔ کبھی کبھی باورچی خانہ بھی استعمال کر سکتے ہو، اگر چولھا تمھارے لیے زیادہ اونچا نہ ہو۔"

آسکر کے قد کے بارے میں یہ پہلا اشارہ تھا۔ اس نے اکادمی کی سفارش پر

اچٹتی سی نظر ڈالی: اس پر اکادمی کے ڈائریکٹر پروفیسر ریوزر کے دستخط تھے، جو اس کے حق میں جاتا محسوس ہوا۔ میں نے اس کے تمام ''کرو'' اور ''نہ کرو'' سے اتفاق کیا اور وعدہ کیا کہ اپنے کپڑے باہر دھلواؤں گا؛ اسے ڈر تھا کہ غسل خانے کے دیواری کاغذ کے لیے بھاپ نقصان دہ ہوتی ہے۔ میں کھلے دل سے یہ وعدہ کر سکتا تھا، اس لیے کہ ماریا نے میرے کپڑے دھونے کا وعدہ کیا تھا۔

اس مرحلے پر، مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے اس جگہ کو چھوڑ دینا چاہیے تھا کہ میں اپنا سامان لینے اور پولیس رجسٹریشن فارم بھرنے کے لیے جا رہا ہوں، مگر آسکر نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ وہ اس فلیٹ کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ بغیر کسی وجہ کے اس نے مالک مکان سے کہا کہ وہ اس کو غسل خانہ دکھائے۔ میرے میزبان نے، جنگ اور جنگ سے پہلے کے زمانے کی یاد دلانے والے پلائی ووڈ کے ایک دروازے کی طرف اپنے انگوٹھے سے اشارہ کر دیا، مگر جب آسکر کی حرکتوں سے محسوس ہوا کہ وہ غسل خانے کو استعمال کرنا چاہ رہا ہے تو زائیڈلر نے، جس کے چہرے پر ڈاڑھی بنانے والا صابن خشک ہو کر کھجلی پیدا کر رہا تھا، بجلی کا بٹن دبا کر روشنی کر دی تھی۔

غسل خانے کے اندر جا کر میں پریشان ہو گیا، اس لیے کہ آسکر کو اس وقت اندر جانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بہرحال میں نے ضد میں آ کر تھوڑی دیر انتظار کیا کہ آسکر تھوڑا سا پیشاب ہی کر لے۔ میرے مثانے پر نا کافی زور کے پیشِ نظر اور اس لیے بھی کہ لکڑی کی سیٹ بہت تنگ تھی، مجھے احتیاط کرنی پڑی تھی کہ سیٹ اور فرش کا ٹائل گیلا نہ ہو جائے۔ پھر بھی مجھے اس خستہ سیٹ پر پڑے چند قطروں کو اپنے رومال میں جذب کرنا پڑا اور ٹائل پر پڑے کچھ بدقسمت نشانات کو اپنے جوتے کے تلے سے رگڑ کر مٹانا پڑا تھا۔

زائیڈلر نے میری غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے چہرے پر سخت ہو جانے والے صابن کو صاف نہیں کیا تھا۔ اس نے راہداری میں انتظار کرنے کو بہتر جانا شاید اس لیے کہ اس کو میرے اندر چھپے جوکر کا احساس ہو گیا تھا، ''کیا تم عجیب آدمی نہیں! لیز پر دستخط سے پہلے ہی تم نے غسل خانہ بھی استعمال کر لیا ہے۔''

وہ ڈاڑھی بنانے والے اپنے ٹھنڈے اور خشک صابن لگے برش سمیت، یقیناً کسی دل لگی کے منصوبے کے ساتھ، میری طرف متوجہ ہوا تھا، مگر اس نے کچھ کیا نہیں، صرف میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ جب آسکر اُلٹے قدموں باہر سیڑھی کی طرف جا رہا تھا اور اس کی نظریں اس خارپشت پر جمی ہوئی تھیں، میں نے دیکھا کہ غسل خانے کا دروازہ، باورچی خانے کے دروازے اور دھندلے شیشے والے دروازے کے درمیان تھا جس کے پیچھے تربیت یافتہ نرس، ہمیشہ نہیں مگر، اپنی راتیں بسر کرتی تھی۔

جب اس دوپہر آسکر، اپنے سامان کے ساتھ جس میں وہ نیا نقارہ بھی شامل تھا جو میڈوناؤں کے پینٹر راشکول نیکوف نے اسے دیا تھا، پولیس رجسٹریشن فارم لیے واپس ہوا، تو تازہ بنی ہوئی ڈاڑھی والا خارپشت، جس نے بلاشبہ اس دوران اپنے پاؤں دھو لیے تھے، مجھ کو اپنی بیٹھک میں لے گیا۔

بیٹھک میں بجھے ہوئے سگار کی بو آ رہی تھی۔ ان سگاروں کی بو جو کئی بار جلائے گئے تھے۔ وہاں شاید قیمتی قالینوں کی بھی بو تھی، جو پرت بہ پرت پورے کمرے میں بچھے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں پرانے کیلنڈروں کی بھی بو تھی، مگر مجھے کیلنڈر نظر نہیں آئے، اس لیے وہ قالینوں ہی کی بو رہی ہوگی۔ حیرت کی بات ہے کہ چرمی گدوں والی آرام دہ کرسیوں کی اپنی کوئی بو نہیں تھی۔ اس بات نے مجھے مایوس کیا تھا، اس لیے کہ آسکر کبھی کسی چرمی کرسی میں نہیں بیٹھا تھا، مگر اس کو معلوم تھا کی چرمی گدوں کی بو کیسی ہوتی ہے اس لیے اسے شبہ ہوا تھا کہ یہ چرم مصنوعی ہوگا۔

ان چکنی، بغیر بو والی اور جیسا کہ میں نے بعد میں معلوم کر لیا تھا، اصلی چرمی کرسیوں میں سے ایک پر مسز زائیڈلر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ درزی کے ہاتھوں کا سلا ہوا بھورے رنگ کا سوٹ پہنے تھی، جو اس کے جسم پر مناسب طور پر فِٹ تھا۔ اس کی اسکرٹ کھسک کر گھٹنے کے اوپر چلی گئی تھی اور کھسکی ہوئی جگہ پر تین انگلیوں کے برابر اس کے زانو نظر آ رہے تھے۔ چوں کہ اس نے اپنے لباس کو ٹھیک کرنے کی کوشش نہیں کی اور آسکر کو محسوس ہوا گویا وہ روئی تھی، مجھے الفاظ کے ذریعے اپنے تعارف کرانے کی ہمت نہیں

ہوئی۔ میرا تم خاموشی کا تم تھا: اپنے آخری مراحل میں وہ زائیڈلر کی طرف مڑ گیا، جس نے اپنے انگوٹھے کی حرکت اور ہلکی سی کھانسی سے اپنے بیوی کا تعارف کرایا تھا۔

کمرہ بڑا اور مربع شکل کا تھا۔ گھر کے سامنے والے شاہ بلوط کے درخت کے سایے کی وجہ سے یہ نسبتاً بڑا اور نسبتاً چھوٹا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس اور نقارہ دروازے کے قریب ہی چھوڑ دیا اور اپنا رجسٹریشن فارم لیے زائیڈلر کی طرف بڑھا، جو کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ آسکر کو اپنے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دی، اس لیے کہ وہ قالینوں پر چلا تھا — میں نے جنھیں گن لیا تھا — مختلف رنگ کی جھالروں والے یا بغیر جھالروں والے چار قالین بچھے ہوئے تھے، جو مل کر حیرت انگیز نمونہ بن گئے تھے۔ سب سے نیچے والا قالین سرخی مائل بھورے رنگ کا تھا اور دیوار کے پاس سے شروع ہوا تھا؛ اگلا، جو تقریباً سبز رنگ کا تھا، اس کا زیادہ حصہ فرنیچر — بھاری سائیڈ بورڈ، شراب کے درجنوں گلاسوں سے بھری چینی کے برتنوں کی الماری اور بڑے وسیع ڈبلی پلنگ — کے نیچے تھا۔ تیسرا قالین نیلے رنگ کے نمونے کا ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ چوتھا، مکمل ارغوانی رنگ کا، قابلِ توسیع کھانے کی میز کے نیچے تھا جس پر محفوظ رکھنے والے موم جامے سے بنا میز پوش بچھا ہوا تھا اور چار چرمی گدّوں والی کرسیاں تھیں، جن میں برابر برابر فاصلے سے پیتل کی چوڑے سروں والی کیلیں جڑی ہوئی تھیں۔

چوں کہ وہاں اور بھی قالین تھے، صرف اس مقصد کے لیے نہیں، دیواروں پر ٹنگے، اور کچھ یوں ہی لپیٹے ہوئے کونوں میں رکھے ہوئے تھے، آسکر سمجھا کہ شاید خار پشت نظامِ زر کی اصلاحات سے قبل قالین کا کاروبار کرتا تھا اور بعد میں کچھ قالین بچ رہے ہوں گے۔

بیرونی دیوار پر ٹنگے دو قالینوں کے درمیان جو شرقی معلوم ہوتے تھے، بسمارک کی شباہت والی صرف ایک تصویر ٹنگی تھی۔ خار پشت، آہنی چانسلر کے نیچے، ایک چرمی کرسی پر بیٹھا تھا اور اس میں اس کی خاندانی شباہت تھی۔ اس نے میرے ہاتھ سے رجسٹریشن فارم لے لیا، سرکاری دستاویز کو الٹ پلٹ کر غور سے، تنقیدی نظر سے اور بے صبرے پن سے دیکھا۔ اس کی بیوی نے سرگوشی میں پوچھا، کیا اس میں کوئی غلطی ہے؟ اس کے سوال پر خار

پشت کو غصہ آ گیا، جس کے باعث وہ چانسلر سے اور بھی مشابہ ہو گیا تھا۔ کرسی نے اسے بے دخل کر دیا۔ چاروں قالینوں پر کھڑا، اس نے رجسٹریشن فارم کو ایک جانب کر دیا اور اپنے آپ کو اور اپنی واسکٹ کو ہوا سے بھرا اور ایک ہی حرکت میں وہ پہلی اور دوسری قالین پر تھا؛ اپنی بیوی کو حقارت سے دیکھا، جس نے اپنا بنائی کا کام شروع کر دیا تھا؛ اور تحکمانہ انداز میں سارے لفظ ایک ساتھ ادا کر دیے: تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی؟ یہاں میرے سوا کوئی اور بات نہیں کرے گا! خاموش ہو جاؤ، اور اپنا منہ بند رکھو! سمجھیں!

چوں کہ مسز زانیڈر پُر سکون اور بغیر کسی اضطراب کے اپنے کام میں محو رہی، خار پشت کا مسئلہ یہ تھا، جیسا کہ وہ قالین سے کرتا تھا، کہ وہ اپنے غصے کو معقولیت کے ساتھ بڑھاتا گھٹاتا تھا۔ ایک ہی قدم میں وہ چینی کے برتنوں کی الماری کے قریب پہنچا، جس کو اس طرح کھولا جیسے اس سے کسی عام قسم کی جھنکار مقصود ہو۔ احتیاط سے، اپنی بڑھی ہوئی انگلیوں کو میکانکی انداز میں استعمال کرتے ہوئے، برانڈی کے آٹھ عدد گلاس اُٹھائے، ان کو خراب کیے بغیر ڈبے سے نکالا، کسی میزبان کی طرح پنجوں کے بل چلا، جو نہایت چالاکی سے خود کو اور اپنے ساتھ مہمانوں کو سبز رنگ کے ٹائلوں والے چولھے کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہو، اور اچانک ہر قسم کی احتیاط کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے ہاتھ کے نازک وزن کو ڈھلے ہوئے لوہے سے بنے چولھے کے دروازے پر دے مارا۔

اس سارے ڈرامے کا سب سے حیرت انگیز حصہ یہ تھا کہ اس کی کارکردگی کے دوران، جس میں نشانے کی درستگی کی ضرورت ہوتی ہے، خار پشت نے اپنی عینکوں والی آنکھ اپنی بیوی پر جمائے رکھی تھی، جو دائیں جانب کی کھڑکی کے قریب جا کر سوئی میں دھاگا ڈالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ گلاسوں کی تباہی کو مشکل سے ایک سیکنڈ ہی گزرا ہوگا کہ مسز نے اپنا نازک کام کیا تھا، جس کی کامیاب تکمیل کے لیے جمے ہوئے ہاتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر وہ اپنی کرسی کی طرف گئی اور بیٹھ گئی، اور ایک بار پھر اس کی اسکرٹ، گھٹنے کے اوپر کھسک کر تین انگل کے برابر گلابی زانوؤں کو منکشف کر رہی تھی۔ بددلی اور عاجزی سے خار پشت نے اپنی بیوی کی کھڑکی کی طرف حرکت پر، سوئی میں دھاگا پرونے پر اور کر

سی پر اس کی واپسی پر نظر رکھی تھی۔ اس کے کرسی پر واپس پہنچتے ہی خار پشت اُٹھا، چولھے کے پیچھے سے صفائی کرنے کا برش اور خاک دان اُٹھایا، بکھرے ہوئے شیشے سمیٹے، ان کو ردی اخبار میں ڈالا جو پہلے سے برانڈی کے جام کے ٹکڑوں سے نصف بھرا ہوا تھا۔ اب، اس میں اس نوعیت کی تیسری توڑ پھوڑ کے لیے جگہ نہیں رہ گئی تھی۔

اگر قاری یہ سمجھ رہا ہے کہ آسکر نے خار پشت کی شیشہ شکنی میں اپنی شیشہ شکنی دیکھی ہوگی تو میں صرف اتنا ہی کہوں گا، وہ بالکل غلط نہیں: ایک بار میں نے بھی اپنے غصے کی، شیشہ شکنی میں قلبِ ماہیت کی تھی مگر ان دنوں کسی نے مجھے خاک داں اور برش استعمال کرتے نہیں دیکھا ہوگا!

اپنے غصے کے آثار ہٹا دینے کے بعد زائیڈلر ایک بار پھر بیٹھ گیا۔ آسکر نے ایک بار پھر اپنا رجسٹریشن فارم اس کی جانب بڑھایا، جسے گرا دینا پڑا تھا، تاکہ برانڈی کے گلاسوں کے لیے دونوں ہاتھ خالی ہوں۔

زائیڈلر نے فارم پر دستخط کر دیے اور مجھے بتایا کہ وہ توقع کرتا ہے کہ فلیٹ میں قانون کی حکمرانی ہوگی اور یہ بھی کہ اگر ہر شخص نے وہی کیا جو اس نے چاہا، تو ہمارا کیا حال ہوگا، اور وہ یہ سب اچھی طرح جانتا ہے اس لیے کہ اس نے پندرہ برس تک بال کاٹنے کی مشینیں فروخت کی ہیں، اور کیا میں اس مشین سے واقف ہوں۔

آسکر نے کچھ حرکات کیں جن سے زائیڈلر یہ نتیجہ نکال سکا کہ مجھے بال کاٹنے کی مشینوں کے بارے میں کافی معلومات ہیں، اس لیے میں بھی مؤثر سیلز مین ہو سکتا ہوں۔ جب وہ اپنے کام کے اوقات کی تشریح کر چکا — ایک ہفتہ سڑک پر، دو ہفتے گھر پر — تو آسکر میں اس کی دل چسپی ختم ہوگئی۔ پہلے سے زیادہ خار پشتی کے ساتھ، وہ ہلکے بھورے رنگ کے چرم کی گدی والی چڑ چڑ کرتی کرسی پر جھولنے لگا اور اس کی عینک چمچمانے لگی تھی، اور اس کے ساتھ یا بغیر اس کے، اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑانا شروع کیا: جاجاجاجاجا۔ اب میرے چلے جانے کا وقت آ گیا تھا۔

پہلے آسکر نے مسز زائیڈلر سے اجازت لی۔ مسز زائیڈلر کے ہاتھ ٹھنڈے، بغیر

ہڈیوں کے مگر خشک تھے۔ اس خار پشت نے اپنی کرسی ہی سے اپنا ہاتھ ہلا دیا تھا اور مجھے دروازے کی طرف جانے کا اشارہ کیا جہاں میرا سامان رکھا ہوا تھا۔ ابھی میں سامان میں مصروف تھا کہ اس کی آواز آئی، ''یہ تمھارے سوٹ کیس سے بندھا ہوا کیا ہے؟''

''یہ میرا نقارہ ہے۔''

''کیا اسے تم یہاں بجانے کا خیال رکھتے ہو؟''

''ضروری نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں بہت نقارہ نوازی کرتا تھا۔''

''ضرور بجاؤ، مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں گھر پر کم ہی ہوتا ہوں۔''

''اب شاید ہی میں کبھی نقارہ نوازی کروں۔''

''تو، کیا وجہ تھی کہ تم اتنے مختصر سے رہ گئے؟''

''ایک بد قسمت حادثے نے میری نشو ونما روک دی تھی۔''

''مجھے امید ہے کہ تم ہمیں زیادہ پریشان نہیں کرو گے... مرگی کے دورے... وغیرہ۔''

''پچھلے چند برسوں میں، رفتہ رفتہ میری صحت بہتر ہوئی ہے۔ دیکھو، میں کتنا پھرتیلا ہوں۔'' چناں چہ آسکر نے زائیڈلر کی خاطر کچھ اچھل کود کی، جمناسٹک کے کچھ کرتب دکھائے، جو اس نے تھیٹر کے زمانے میں سیکھے تھے۔ مسز زائیڈلر کھی کھی کر کے ہنسی، جب کہ مسٹر زائیڈلر اپنے زانوؤں پر ہاتھ مارتے وقت واقعی خار پشت بن گیا تھا۔ اس کے بعد میں راہداری میں تھا، نرس کے دھندلے شیشے، غسل خانے کے دروازے اور باورچی خانے کے دروازے سے گزرتے ہوئے، میں اپنے کمرے میں اپنا سامان لے گیا، جس میں میرا نقارہ بھی شامل تھا۔

یہ مئی کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد سے تربیت یافتہ نرس کی پُر اسراریت نے مجھے اس کی طرف راغب کیا، وہ مجھ پر غالب آ گئی تھی اور مجھے دیوانہ بنا دیا تھا۔ نرسوں کے بارے میں میرے احساسات ایک طرح کی بیماری ہے۔ شاید یہ لاعلاج ہے، اس لیے کہ آج بھی، یہ سب ماضی کا حصہ بن جانے کے باوجود، میں اپنے نگہبان برونو سے اختلاف کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے کہتا ہے کہ صرف مرد ہی باقاعدہ نرس بن سکتے ہیں، کہ کسی مریض کی یہ خواہش کہ کوئی خاتون ہی اس کی نگہبانی کرے، اس کی بیماری کی ایک اور علامت ہوتی ہے۔ جب کہ برونو ہی

کے کہنے کے مطابق، مرد نرس فرض شناسی سے اپنے مریض کی خدمت کرتا ہے اور اکثر اس کو شفا بھی دیتا، جب کہ اس کا مؤنث مماثل، جو عورت ہوتی ہے، اپنے مریض کو دھوکا دیتی ہے، کبھی شفایابی کی صورت میں اور کبھی خوب صورت شہوانی موت کی صورت میں۔

یہ میرا نگہبان کہتا ہے۔ شاید وہ صحیح کہتا ہے، مگر اس کا اعتراف کرنے میں مجھے تامل کرنا چاہیے۔ کوئی شخص جسے ہر دو یا تین برس بعد خاتون نرس کے ہاتھوں زندگی ملتی ہے، شکرگزاری کیے بغیر نہیں رہ سکتا؛ وہ کسی ترش مزاج عمر رسیدہ مذکر نرس کو، خواہ وہ کتنا ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو، اس بات کی اجازت نہیں دے گا کہ میری معشوق خواتین نرسوں کے بارے میں میرے تصور کو داغ دار کردے، خاص کر اس لیے کہ اس کا مقصد محض پیشہ وارانہ حسد ہو ہوگا۔

اس کی ابتدا میری تیسری سالگرہ کے موقعے پر تہ خانے کے زینے سے میرے گرنے سے ہوئی تھی۔ شاید اس کا نام مسٹر لوٹے تھا، اور وہ 'پراؤسٹ' کی رہنے والی تھی۔ ڈاکٹر ہولاٹز کی معاون مسٹر اِنگے کئی برس میرے ساتھ رہی تھی۔ پولش ڈاک خانے کے دفاع کے بعد میں ایک ہی وقت میں کئی نرسوں کے ہاتھوں میں رہا تھا۔ مجھے ان میں سے صرف ایک کا نام یاد رہ گیا ہے: مسٹر ارنی یا برنی۔ 'لوئنے برگ' اور اس کے بعد، یونی ورسٹی کلینک ہینوور، کی بے شمار بے نام نرسیں تھیں۔ اس کے بعد 'ڈوسلڈارف' کے سٹی اسپتال کی نرسیں، جن میں پہلی اور ممتاز نرس مسٹر گرٹروڈ تھی۔ اور پھر بغیر کسی اسپتال گئے بھی وہ میرے قریب آئی تھی۔ آسکر عالم صحت میں بھی ایک نرس کا شکار ہو گیا، جو زائیڈلر کے فلیٹ کے ایک کمرے کی کرایے دار تھی۔ اس دن کے بعد سے میری دنیا نرسوں سے بھر گئی تھی۔

جب میں علی الصباح، کارنیف کے کارخانے، حروف کی کندہ کاری کرنے گیا، میری ٹرام گاڑی کے اسٹاپ کا نام تھا: میری ٹی اسپتال۔ اینٹوں سے بنی گزرگاہ کے باہر، اور پھولوں سے بھرے میدان سے ڈیوٹی پر جانے والی نرسیں آتی جاتی تھیں۔ میں خود کو اکثر اسی ٹرام گاڑی میں سوار، اور اسی پلیٹ فارم پر بہت ساری تھکی ہوئی، یا کم از کم تھکی دکھائی دینے والی نرسوں کے ساتھ پاتا تھا۔ پہلے تو مجھے ان کی خوش بو سے کراہت آتی تھی مگر جلد ہی میں اس کی تلاش میں رہتا اور ان کی وردی سے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

اس کے بعد ڈسٹ ویگ نے۔ میں اچھے موسم میں لوحِ مزارات کی نمائش کے درمیان کام کرتا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ایک ساتھ دو دو اور ایک ساتھ چار چار کو چھٹی کے گھنٹے کے دوران گزرتے دیکھتا اور آسکر کو مجبور کرتا کہ وہ اپنے سنگِ خارا سے نظر اٹھا کر دیکھے اور اس طرح ہر الجھنے والی نظر کی غفلت میں چینی نقصان کا باعث ہوتی تھی۔

فلموں کے اشتہارات: جرمنی کے لوگ ہمیشہ سے نرسوں کی فلموں کے رسیا رہے ہیں۔ماریا شیل نے مجھے فلموں کی لت لگائی تھی۔ وہ نرسوں کی وردی پہنے ہنستی روتی؛ اس کے رات دن ایثار نفس سے بھرے ہوتے تھے؛ مسکراتی اور نرسوں کی ٹوپی پہنے، وہ غم زدہ موسیقی بجاتی تھی۔بعد میں، شدید مایوسی کے باعث اپنا شب خوابی کا لباس پھاڑنے کے قریب آگئی تھی مگر خودکشی کی ناکام کوشش کے بعد اس نے اپنی محبت کو قربان کر دیا اور اپنے پیشے سے وابستہ رہی اور اپنی ٹوپی اور ریڈ کراس کی پن پہنتی رہی۔جب آسکر کا باشعور دماغ ہنستا اور فلم میں فحاشی کی ایک لامتناہی زنجیر بُنتا تو آسکر کی آنکھیں آنسو بہاتیں، اور میں، نیم نابینا، سفید پوش اور بے نام خواتین Samaritans کے ریگستان میں بہ سسٹر ڈوروتھیا کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہتا، جس نے، جہاں تک میں جانتا تھا، زائیڈلر کے فلیٹ میں دھندلے شیشے والے دروازے کا کمرہ کرایے پر لے رکھا تھا۔

جب وہ کبھی رات کی ڈیوٹی سے واپس آتی تو مجھے اس کے قدموں کی آواز سُنائی دیتی۔میں نے اس کو، دن کی شفٹ کے بعد، نو بجے رات کے قریب بھی سُنا تھا۔ جب اس کو ہال میں چلتے سنتا تو آسکر ہمیشہ اپنی کرسی میں بیٹھا نہیں رہتا تھا۔اکثر وبیشتر وہ دروازے کی کُنڈی سے کھیلتا رہتا تھا۔اس کھیل سے اسے کون روک سکتا تھا؟ کون ہے جو راہداری سے گزرتی کسی چیز کی طرف نہیں دیکھتا جو اس کے لیے گزر رہی ہو؟ جب ساری آوازیں اُچھلنے پر اُکسا رہی ہوں تو کون اپنی کرسی میں بیٹھا رہ سکتا ہے۔

خاموشی بہت خراب شے ہوتی ہے۔ہم نے چوبی، خاموش اور غیر متحرک مؤنث کٹھ پتلی کے سلسلے میں خاموشی کی طاقت دیکھی ہے۔ وہاں ہم نے عجائب گھر کے پہلے خدمت گار کو اپنے خون میں غلطاں زمین پر پڑا دیکھا تھا۔ہر ایک نے یہی کہا تھا کہ نئی او بے

نے اس کو مار ڈالا ہے۔ ڈائریکٹر نئے خدمت گار کی تلاش میں تھا اس لیے کہ عجائب گھر کو کھلا رکھنا تھا۔ جب دوسرا خدمت گار بھی قتل ہو گیا تو ہر شخص چیخ اٹھا تھا کہ ٹی او بے نے اسے بھی قتل کر دیا ہے۔ عجائب گھر کے ڈائریکٹر کو تیسرا خدمت گار ملنا مشکل ہو گیا تھا — یا شاید وہ گیارہواں خدمت بھی تلاش کر رہا تھا۔ اور پھر ایک دن وہ خدمت گار بھی جس کی تلاش مشکل ہو رہی تھی، مر گیا۔ اور ہر ایک چیخا، ٹی او بے، ٹی او بے، سبز پینٹ اور زرد آنکھوں والی؛ چوبی ٹی او بے، بے لباس، بے سانس، بے پسینہ، بے لرزش، نہ گرم اور نہ ٹھنڈی؛ ٹی او بے، بغیر کیڑوں والی، اس لیے کہ تاریخی قدر و قیمت کے باعث اس پر کیڑوں کو مارنے والا اسپرے کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے ایک چڑیل جلا دی گئی تھی، چوب تراش کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تھا، جہاز غرق ہو گئے تھے، مگر وہ تیرتی رہی اور بچ گئی تھی۔ ٹی او بے چوبی تھی، مگر اس پر آگ اثر نہیں کرتی تھی، ٹی او بے قتل کرتی تھی مگر قابلِ قدر رہی۔ اسکول کے لڑکے، طلب، ایک عمر رسیدہ مبلغ اور عجائب گھر کے خدمت گاروں کے غول نے اس کی خاموشی کی قیمت ادا کی تھی۔ میرے دوست ہربرٹ ٹروزنسکی نے کو وکر جان دے دی تھی؛ مگر ٹی او بے، پھر بھی خشک، صرف خاموشی میں بڑھتی رہی تھی۔

جب نرس اپنے کمرے سے، راہداری سے اور خار پشت کے فلیٹ سے صبح سویرے نکلی تھی، تقریباً چھ بجے، تو ہر شے بالکل ساکن ہو گئی تھی، حالاں کہ اپنی موجودگی میں اس نے کبھی شور نہیں کیا تھا۔ خاموشی کو برداشت کرنے والے آسکر نے اپنے بستر ہی سے زبردستی آواز پیدا کی، کرسی ہٹانے سے یا نہانے کے ٹب کی طرف ایک سیب کو لڑھکانے سے کوئی آواز پیدا کرنی پڑی تھی۔

تقریباً آٹھ بجے ایک سرسراہٹ سنائی دی۔ ڈاکیا تھا جو بیرونی دروازے کے درز سے خطوط اور پوسٹ کارڈ ڈال رہا تھا۔ صرف آسکر ہی نہیں، بلکہ مسز زائیڈلر بھی اس آواز کا انتظار کرتی تھی۔ وہ مانیس مان کمپنی کے دفاتر میں سیکریٹری تھی اور نو بجے تک دفتر نہیں جاتی تھی۔ اس نے پہلے مجھے جانے دیا؛ وہ آسکر تھا جس نے سرسراہٹ پر پہلی نظر ڈالی تھی۔ حالاں کہ میں بہت آہستگی سے گیا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ میری آواز سن لے گی، میں نے

اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا تا کہ مجھے روشنی نہ کرنی پڑے۔ میں نے ساری ڈاک ایک ساتھ اُٹھا لی تھی۔ باقاعدہ، ہر ہفتے ایک خط ماریا کا آتا تھا، جس میں وہ اپنے، بچے کے اور بہن حسے کے حالات تفصیل سے لکھتی تھی۔ اس خط کو اپنے پاجامے کے جیب میں چھپا کر، تیزی سے بقیہ ڈاک دیکھتا تھا۔ ہر شے جو زانیڈ ر میاں بیوی کے نام یا ایک مسٹر منٹسر کے نام ہوتی، جو راہداری کے آخر میں رہتا تھا، فرش پر واپس ڈال دیتا تھا۔ سسٹر ڈوروتھیا کی ڈاک کو میں الٹ پلٹ کر دیکھتا، سونگھتا اور لکھنے والے کا پتا بھی دیکھنے کی کوشش کرتا۔

سسٹر ڈوروتھیا کی مجھ سے زیادہ ڈاک ہوتی تھی، مگر بہت زیادہ نہیں۔ اس کا پورا نام تھا ڈوروتھیا کوئن گیٹر؛ مگر میں اسے صرف سسٹر ڈوروتھیا ہی کہتا تھا اور اکثر کا آخری نام بھول جاتا تھا — ایک نرس کو آخری نام کی ضرورت بھی کیا ہوتی ہے؟ اس کے پاس 'ہلڈے شائم' سے اس کے ماں کے خطوط آتے تھے۔ تمام مغربی جرمنی سے پوسٹ کارڈ بھی آتے تھے، ان میں زیادہ تر عشق پیچاں بیل سے ڈھکے اسپتالوں کی تصویریں ہوتی تھیں، نرسوں کی جانب سے، جن سے وہ تربیتی اسکول میں ملی تھی، ظاہر ہے کہ یہ سب سسٹر ڈوروتھیا کی دوست نرسوں سے تعلقات رکھنے کی وجہ سے آیا کرتے تھے۔

تقریباً یہ تمام مراسلات، جیسا کہ آسکر نے پتا چلا لیا تھا، کافی مصالحے دار اور دل چسپ ہوتے تھے۔ پھر بھی یہ سسٹر ڈوروتھیا کے ماضی پر کچھ روشنی ڈالتے تھے: اس نے 'کولون' شہر کے ونسنٹ اسپتال میں، 'آخن' کے ایک نجی کلینک میں، اور 'ہلڈ شائم' میں کام کیا تھا، جہاں اب بھی اس کی ماں رہتی تھی۔ یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ وہ 'لوئر سیکسونی' سے تعلق رکھتی تھی یا آسکر کی طرح مشرق کی مہاجر تھی اور جنگ کے بعد وہاں آباد ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ سسٹر قریب ہی کام کرتی تھی، میرین اسپتال میں اور یہ بھی کہ اس کی قریبی دوست کا نام تھا بیٹا، اس لیے کہ پوسٹ کارڈ اس سسٹر بیٹیا کے حوالوں سے بھرے ہوتے تھے۔

اس کی گرل فرینڈ کے وجود سے مجھے طرح طرح کے خیال آنے شروع ہو گئے تھے۔ میں نے سسٹر بیٹیا کے لیے کچھ خط تیار کیے، ان میں سے ایک خط میں اس سے مصالحت کرانے کی درخواست بھی کی تھی؛ دوسرے خط میں ڈوروتھیا کے بارے میں کچھ

نہیں لکھا تھا؛ میرا خیال تھا کہ پہلے پیٹیا سے رابطہ ہو جائے اور بعد میں ڈوروتھیا کی طرف رُخ ہو۔ میں نے پانچ یا چھ خط تیار کیے تھے، جن میں سے ایک یا دو پر اس کا نام، پتا بھی لکھ دیا تھا اور میں لیٹر باکس کی طرف چلا بھی تھا، مگر کوئی بھی ڈاک میں ڈالا نہیں گیا۔

پھر بھی میں نے اپنے پاگل پن میں، ان درخواستوں میں سے ایک آدھ بھیج بھی دیا ہوتا — ایک دوشنبے کے دن، جب ماریا نے اپنے افسر مسٹر اسٹنبول سے اپنا سلسلہ شروع کر دیا تھا، جو ایسا واقعہ تھا جس نے مجھے بجھا کر رکھ دیا تھا — اگر مجھے فرش پر، خطوط کے لیے دروازے میں بنائے گئے درز کے نیچے، پڑا وہ پیغام مل نہ گیا ہوتا جس نے میرے جذبۂ محبت کی حاسدانہ محبت میں قلبِ ماہیت کر دی تھی۔

لفافے پر لکھے نام اور پتے سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ خط میرین اسپتال کے کسی ڈاکٹر ایرخ وَرنِز نے لکھا تھا۔ منگل کے دن ایک اور خط آیا۔ جمعرات تیسرا خط لائی۔ اس جمعرات میری دماغی کیفیت کیا تھی، میں بتا نہیں سکتا۔ آسکر لڑکھڑاتا واپس اپنے کمرے میں گیا، باورچی خانے کی کرسی پر گر پڑا، جس نے میرے غسل خانے کو رہنے کی جگہ میں بدل دیا تھا، اور پھر میں نے ماریا کے ہفتہ وار خط کو پاجامے کی جیب سے نکالا — اپنے عشق کے باوجود اس نے پابندی سے، صفائی سے اور تفصیل سے خط لکھنے کا عمل جاری رکھا تھا — لفافے کو پھاڑ کر کھولا اور خط کو، بے لطف آنکھوں سے گھور کر دیکھا؛ اس وقت آسکر نے مسز زائیڈلر کو مسٹر مُنستر کو آواز دیتے سُنا تھا، جس نے کوئی جواب نہیں دیا مگر مسٹر مُنستر اندر ہی رہے ہوں گے، اس لیے کہ مسز زائیڈلر نے خود ان کا دروازہ کھولا، ڈاک حوالے کی اور اس سے باتیں کرتی رہی۔

مسز زائیڈلر اب بھی باتیں کر رہی تھی مگر میں سن نہیں سکتا تھا۔ میں نے دیوار پر لگے کاغذ کی عمودی، افقی، فطری دیوانگی اور خمیدہ دیوانگی کے آگے ہتھیار ڈال دیے، جو کئی ہزار گنا بڑھ گئی تھی۔ میں نے خود کو ماتسیرات کی صورت میں دیکھا، جو بے وفا بیوی کے شوہر کی طرح غذائیت سے پُر روٹی کھا رہا ہو اور کسی قسم کی شرمندگی یا اضطراب نے مجھے اپنے جان برانسکی کی نمائندگی کرنے سے باز نہیں رکھا، جو شیطانی بھیس میں ورغلانے والا

تھا، مخملیں کالر والے روایتی اوورکوٹ میں، ڈاکٹر ہولائز کے سفید بالاپوش میں اور ڈاکٹر وَرز کے اتنے ہی سفید بالا پوش میں لپٹا اور اگر اسے معقول ہونا ہے تو ہر صورت میں ورغلانے والا، بد چلنی کرنے والا، توہین کرنے والا، تازیانہ لگانے والا اور اذیت دینے والا تھا، مختصراً ہر وہ کام کرنے والا تھا جو ایک ورغلانے والا کرتا ہے۔

آج میں مسکرا سکتا ہوں، جب مجھے وہ تصور یاد آتا ہے جس نے آسکر کو دیوار کے کاغذ جیسا زرد اور پاگل بنا دیا تھا۔ میں نے ڈاکٹری پڑھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ میں جلد ہی ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ یقیناً میں میرین اسپتال میں ڈاکٹر بن جاؤں گا۔ میں ڈاکٹر وَرز کو ننگا کردوں گا، اس کی نالائقی کو آشکار کردوں گا، یہی نہیں، میں اس کی مجرمانہ غفلت بھی ثابت کردوں گا جس کے باعث گلے کے آپریشن کے دوران ایک مریض کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور یہ پتا چل جائے گا کہ یہ مسٹر وَرز تو کسی ڈاکٹری کے اسکول میں گیا بھی نہیں۔ اس نے چند واجبی سی دوائیں اٹھائی تھیں جب جنگ کے دوران وہ اسپتال میں ایک اردلی کی حیثیت میں کام کرتا تھا۔ نیم حکیم اب جیل جاتا ہے۔ اور آسکر اپنی کم عمری کے باوجود ڈاکٹروں کا افسر بن جاتا ہے۔ ایک نیا پروفیسر سا اور ممدوح، جس کے پہلو میں سسٹر ڈوروتھیا ہوگی، جس کے پیچھے، گونجتی ہوئی غلام گردشوں میں، سفید پوش غلاموں کی ایک فوج ہوگی، جو مریضوں کو دیکھتا ہوا، آخری لمحے آپریشن کا فیصلہ کرتا ہے۔ کتنا اچھا ہوا کہ یہ فلم کبھی بنی ہی نہیں!

# کپڑوں کی الماری میں

یہ فرض نہیں کرلیا جانا چاہیے کہ آسکر کی ساری عمر نرسوں کے چکر میں گزر گئی تھی۔ بہرحال میری پیشہ ورانہ مصروفیتیں بھی تھیں۔ مجھے حروف کی کندہ کاری چھوڑ دینی پڑی تھی، اس لیے کہ اکادمی کا موسم گرما کا سیمسٹر شروع ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر مجھے اور اُلا کو فن کے طلبہ کے سامنے ماڈل بن کر بیٹھنے پر اچھی رقم مل گئی تھی، جب کہ ان طلبہ نے ہم پر اپنی بصری یا بے بصری کی تمام ترکیبیں استعمال کی تھیں۔ ان میں بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے ہمارے مقصد کو، وجود کو تباہ کیا، رد کیا اور ہماری تردید کی، کاغذ اور کینوس پر، لکیریں، مستطیل اور دائروں سے، دیوار کے کاغذ بنا کر، جن میں سب کچھ تھا سوائے آسکر اور اُلا کے — یا آپ چاہیں تو اس میں پُراسراریت بھی شامل کر لیں — اور ان فضولیات کو زوردار عنوان دیے، مثال کے طور پر... ''اُلٹی پکٹ''... ''وقت سے پہلے مناجات''... ''نئی جگہوں پر سرخی'' وغیرہ۔

یہ طریقہ بالخصوص نئے طلبہ کو پسند آیا تھا جن کو لکیر کھینچنا بھی نہیں آیا تھا۔ ہمارے 'کوخن' اور 'ماروہن' کے اسٹوڈیو کے پرانے دوستوں کے ساتھ سب کچھ ٹھیک رہا، انعام یافتہ طلبہ زینگے اور راشکول نیکوف کا تو ذکر ہی کیا۔

اپنے منکسر المزاج وجود میں، میوز اُلا نے عملی فن کاری میں اچھے مذاق کا مظاہرہ کیا تھا۔ لانکیز نے اسے چھوڑ دیا تھا، مگر اُلا نے نئے دیواری کاغذ کے نمونے بنانے کے ولولے اور جوش وخروش میں اسے بھلا دیا اور خود کو قائل کر لیا تھا کہ 'مائیکل' نامی انتیز عمر

کے پینٹر کی زیبائشی تجریدیت، پیاری، خوش گوار، تیکھی، انوکھی اور بلا کی بلکہ طرح دار بھی تھی۔ 'مائیکل' کو ایسے پیکر بہت پسند آتے تھے جن میں چینی اور شربت بھرے ایسٹر انڈوں کی ایمائیت اور اشارے ہوں، مگر اس کا ذکر قابلِ ذکر نہیں؛ اس کے بعد سے اُلا کو مائیکل سے ملاقات کے کئی موقعے ملے تھے، اور اس وقت — جیسا کہ اس نے مجھے بتایا تھا، جب وہ میرے اور بروٹو کے لیے مٹھائی لیے، پرسوں مجھ سے ملنے آئی تھی — جیسا کہ وہ ہمیشہ کہا کرتی ہے کہ وہ ایک سنجیدہ اور دیرپا رشتہ شروع کرنے والی تھی۔

سیمسٹر کی ابتدا میں اُلا نے صرف "New Trends" کے لیے ماڈلنگ کرنی چاہی تھی — یہ ایک پسّو تھا جو اس کے ایسٹر کے انڈے پینٹ کرنے والے مائیکل نے اس کے کان میں ڈال دیا تھا؛ اس کی منگنی کا تحفہ وہ الفاظ تھے جو وہ مجھ سے گفتگو میں استعمال کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے تعلقات، بُروج سیارگان، لجبوں، مناظر، وانے وار ساختوں، گلاوٹ کے طریقوں اور عملِ بُروگی پر گفتگو کی تھی۔ وہ، جس کی روزانہ کی بات کیلے اور ٹماٹر کے عرق پر مشتمل ہوتی تھی، اب فوٹو سیل، رنگین ایٹم پر گفتگو کرتی تھی، جن کا پنے حرکیاتی اعتبار سے سپاٹ مداروں میں، طاقت کے میدانوں میں ان کی فطری حیثیت مل گئی تھی، مگر وہ اس پر رُکی نہیں؛ نہیں، وہ آگے بڑھتی رہی... میرے آرام کے وقفے کے دوران میرے ساتھ بھی اس کا گفتگو کا لہجہ ہوتا تھا یا اس وقت جب ہم کبھی کبھی 'رامشر اشٹراسے' میں کافی پینے جایا کرتے تھے۔ اس وقت بھی جب ایسٹر کے انڈے رنگنے والے حرکی پینٹر سے اس کی منگنی ختم ہو گئی تھی، اس وقت بھی جب اس کی کوئحس کے شاگردوں میں سے ایک نسوانی جنس کی رسیا لڑکی سے تھوڑے عرصے تعلقات رہے تھے، اور وہ معروضی دنیا کی طرف لوٹ آئی تھی، تب بھی اس نے اپنی لغت یا لفظیات باقی رکھی تھیں، جس کی وجہ سے اس کا چہرہ اتنا سُت گیا تھا کہ اس کے منہ کے دونوں جانب دو گہری لکیریں بن گئی تھیں۔

اس مرحلے پر مجھے اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ راشکول نیکوف کا خیال نہیں تھا کہ میوز اُلا کو نرس کی وردی پہنائی جائے اور اس کو آسکر کے ساتھ پینٹ کیا جائے۔ "Madonna 49" کے بعد اس نے ہم کو "The Abduction of Europa" میں ڈال دیا تھا — میں جس

کا ٹائل تھا۔ اور متنازعہ "Abduction" کے فوراً بعد "Fool Heals Nurse" بنایا گیا۔

وہ میرا ایک چھوٹا سا لطیفہ تھا جس نے راشکول نیکوف کے تصور کی چنگاری کو ہوا دے دی تھی۔ سنجیدہ، سرخ بالوں والا اور چالباز، اس نے اپنے برش کو صاف کیا اور اس پر غور کرنے لگا تھا؛ اُلا کی طرف گھور کر دیکھنے کے بعد اس نے جرم اور کفارے کی بات شروع کردی۔ اس پر میں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ مجھے جرم کی صورت دیکھے، الا کو کفارے کی طرح: میرا جرم۔ میں نے کہا، واضح ہے؛ اور جہاں تک کفارے کا سوال ہے، تو کیوں نہ اس کو نرس کی وردی پہنا دی جائے؟

اگر اس لاجواب تصویر کو بعد میں ایک اور گمراہ کن عنوان دیا گیا، تو وہ راشکول نیکوف کی حرکت تھی۔ خود میں نے بھی اس کو Temptation کہا ہوتا، اس لیے کہ میرا داہنا پینٹ کیا ہوا ہاتھ کسی دروازے کی گھنڈی کو پکڑ کر گھمارہا تھا اور دروازے کو ایک اور کمرے میں کھول رہا تھا جہاں وہ نرس کھڑی ہوئی ہے۔ یا پھر اس کو The Doorknob کہا جا سکتا تھا، اس لیے کہ اگر مجھ سے کوئی نام سوچنے کے لیے کہا جاتا تو میں doorknob کا مشورہ دیتا، اس لیے کہ یہ ابھار کیا ہیں جو دروازوں میں لگائے جاتے ہیں؛ اس لیے کہ یہ ہم کو ورغلانے کے لیے نہیں ہیں اور اس لیے کہ سسٹر ڈوروتھیا کے کمرے کا دھندلے شیشے کا دروازہ میرے ورغلانے کے لیے تھا، جب خارپشت مزک پر ہوتا، سسٹر ڈوروتھیا اسپتال میں، اور مسز زائیڈلر' مائیس مان کے دفتر میں۔

آسکر پانی کی نکاسی کے پائپ کے بغیر ٹب والے اپنے کمرے سے نکلتا، راہداری کو پار کرتا، نرس کے کمرے کی طرف جاتا اور دروازے کی گھنڈی پکڑ لیتا تھا۔

جون کے مہینے کے درمیان تک — اور میں تقریباً ہر روز یہ تجربہ کرتا تھا — دروازے نے میرے ورغلانے کو برداشت کیا۔ میں اس نتیجے پر پہنچ رہا تھا کہ سسٹر ڈوروتھیا اپنے کام کے معاملے میں بہت چوکس ہو گئی ہے اور مجھے یہ امید ترک کردینی چاہیے کہ وہ کبھی دروازے کو تالا لگانا بھول جائے گی۔ اور یہی وجہ تھی کہ جب میرے دباؤ سے دروازہ کھلا تو میرے احمقانہ ردِعمل نے اس کو پھر بند کردیا تھا۔

آسکر وہاں کئی منٹ تک نہایت مستعدی سے کھڑا رہا، اتنے سارے منتشر نوعیت

کے خیالات کے ساتھ، کہ اسے اپنے دل کو کسی نظام کا پابند کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

یہ سب کچھ اس وقت ہوا، جب میں نے اپنے خیالات کسی اور مضمون کی طرف منتقل کر دیے تھے — میں ماریا اور اس کے عاشق کے بارے سوچنے لگا تھا— ماریا کا ایک عاشق ہے... عاشق اس کو کافی بنانے کا برتن دیتا ہے... عاشق اور ماریا سنیچر کی رات کو اپالو جاتے ہیں... ماریا دفتر میں اپنے عاشق کو مسٹر وغیرہ وغیرہ کہہ کر مخاطب کرتی ہے... عاشق اس کا افسر ہے، اور دُکان کا مالک ہے، جہاں وہ کام کرتی ہے — صرف اس کے بعد ہی، جب میں ماریا اور اس کے عاشق پر کئی زاویوں سے غور کر چکا تو بمشکل اپنے دماغ کو منظم کر سکا تھا اور دھندلے شیشے کا دروازہ کھولا تھا۔ میں نے پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں ہو گی، اس لیے کہ دروازے کے غیر واضح طور پر شفاف حصے سے کبھی ہلکی سی بھی سورج کی روشنی دکھائی نہیں دی تھی۔ جیسا کہ میرے کمرے میں ہے، دائیں طرف پہنچ کر مجھے بجلی کا بٹن ملا۔ چالیس واٹ کا بلب اس اُطاقِ محروس کے لیے بہت کافی تھا، جس کو مشکل ہی سے کمرہ کہا جا سکتا ہے۔ اپنے نصف بدن کو آئینے کے رُو بہ رُو پا کر میں قدرے پریشان ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس میں نظر آنے والے میرے اُلٹے نقوش میں کوئی نئی بات نہیں تھی، آ سکر وہاں سے ہٹا نہیں؛ وہ آئینے کے سامنے سنگھار میز پر رکھی ہوئی اشیا سے بہت مسحور ہو گیا تھا۔

واش بیسن کی سفید نام چینی میں نیلے کالے دھبے تھے۔ میز کے اوپری سطح پر بھی، جس کو کاٹ کر اس میں بیسن بٹھایا گیا تھا، نقائص تھے۔ اس کلابایاں کونا غائب تھا اور غائب ٹکڑا آئینے کے نیچے میز کی سطح پر پڑا آئینے کو اپنی رگوں کے نقوش دکھا رہا تھا۔ ٹوٹے ہوئے کنارے سے چھلکے کی طرح نکلنے والی گوند خراب مرمت کی گواہی دے رہی تھی۔ میری سنگ تراش انگلیوں میں کھجلی ہونے لگی تھی۔ مجھے کارنیف کی بنائی ہوئی مارٹر کی سیمنٹ یاد آنے لگی تھی، جو بے حد خستہ سنگِ مرمر کی سِلوں کی ایسی دیرپا مرمت کرتی تھی کہ یہ گوشت فروشوں کی بڑی بڑی دُکانوں کے چہروں پر سجنے لگی تھیں۔

جب ان مانوس خیالات نے مجھے آئینے میں ظالمانہ طریقے سے بگاڑے ہوئے اپنے نقوش سے ہٹا دیا تو میں اس خوش بو کو نام دینے کے قابل ہو گیا، جو اس وقت مجھ سے

ٹکرائی تھی جب میں اندر آیا تھا۔

دراصل وہ سرکہ تھا۔ بعد میں، اور صرف چند ہفتے پہلے ایک بار پھر، میں نے اپنے قیاس سے اس تیز خوش بو کا تعین کر لیا تھا کہ سسٹر ڈوروتھیا نے ایک دن پہلے سرکہ ملے پانی سے اپنے بال دھوئے ہوں گے، مگر سنگھار میز پر سرکے کی بوتل نہیں ملی۔ نہ کسی اور برتن میں سرکہ ملا تھا، جس پر کچھ اور لیبل لگا ہو؛ مزید، میں نے اکثر اپنے آپ سے یہ بھی کہا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ سسٹر ڈوروتھیا نے زائیڈکر کے باورچی خانے میں پانی گرم کیا تھا، جس کے لیے اسے زائیڈکر کی اجازت لینی ہوتی اور اپنے کمرے میں بال دھونے کی زحمت اُٹھانی پڑتی؛ جب کہ اسپتال میں بہترین غسل خانے اور نہانے کے شاور موجود ہیں؟ پھر بھی شاید ہیڈ نرس یا اسپتال کی انتظامیہ نے نرسوں پر حفظانِ صحت کی مخصوص تنصیبات کا استعمال ممنوع کر دیا ہوگا؛ شاید سسٹر ڈوروتھیا نے مجبوراً فریجی آئینے کے سامنے لگے تام چینی کے بیسن میں اپنے بال دھوئے تھے۔

اگرچہ میز پر سرکے کی کوئی بوتل نہیں تھی، وہاں، چیک دار سنگِ مرمر پر، بے شمار بوتلیں اور مرتبان رکھے ہوئے تھے۔ روئی کے گالے کے ایک بنڈل اور غیر استعمال شدہ ٹھیوں کی موجودگی کے پیشِ نظر آسکر نے چھوٹی بوتلوں کے محلول پر مزید تحقیق روک دی تھی، مگر میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ ان میں عام سنگھار کی اشیا اور بے ضرر مرہم رہے ہوں گے۔

سسٹر ڈوروتھیا نے اپنا سنگھار برش میں لگا چھوڑ دیا تھا۔ اس کو نکالنے اور اس کا معائنہ کرنے میں مجھے خاصی جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ کتنی خوش قسمتی کی بات ہے کہ میں نے ایسا کیا تھا، اس لیے کہ اس موقعے پر آسکر نے ایک بہت اہم دریافت کی تھی: کہ اس نرس کے بال ہلکے پیلے رنگ کے تھے، شاید ashblonde، مگر کنگھی سے نکلنے والے مردہ بالوں سے زیادہ بجسس نتائج نہیں نکالے جا سکتے۔ بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ سسٹر ڈوروتھیا کے بال ہلکے زرد رنگ کے تھے۔

اس کے علاوہ کنگھے سے ملنے والے بالوں سے پتا چلا تھا کہ سسٹر ڈوروتھیا کو بال گرنے کا عارضہ لاحق تھا، وہ عارضہ جس سے وہ بہت پریشان ہوئی ہوگی۔ یہ نرسوں کی

ٹوپی کی خرابی ہے، میں نے اپنے آپ سے کہا تھا؛ مگر میں نے ساری ٹوپیوں کو بُرا نہیں کہا تھا، اس لیے کہ نرسوں کی ٹوپی کے بغیر کوئی اسپتال باقاعدہ کیسے چلایا جا سکتا ہے؟

سر کے سے آسکر کی ناگواری اپنی جگہ، مگر مجھ میں اس خیال سے کہ سسٹر ڈوروتھیا کے بال جھڑ رہے تھے، جو جذبہ ابھرا تھا وہ محبت کا جذبہ تھا، جو اندیشے اور ترحم سے تیار ہوا تھا۔ یہ اس کیفیت کی نمایاں صفت ہوتی ہے میں جس سے اس وقت گزر رہا تھا، ساتھ ہی میرے ذہن میں بالوں کے کئی لوشن بھی آ رہے تھے، میں نے جن کے بارے میں سنا تھا اور فیصلہ کر لیا تھا کہ میں اپنی پہلی فرصت میں ڈوروتھیا کو ایک یا ایک سے زیادہ لوشن پیش کروں گا۔ اپنی پہلی ملاقات کے خواب دیکھتے ہوئے، جو موسم گرما کے آسمان تلے، اناج کے لہراتے پودوں کے درمیان ہونے والی تھی، میں نے کنگھے سے چند خانہ بدوش بال نکال لیے، ان کا ایک چھوٹا سا بنڈل بنایا اور ان کو گرہ میں باندھ کر محفوظ بنا دیا۔ میں نے پھونک مار کر بالوں کو گرد اور خشکی سے پاک کیا، اور اپنے اس خزانے کو احتیاط سے اپنے بٹوے کے ایک خانے میں چھپا لیا، جس میں سے پہلے رکھی ہوئی چیزیں نکال کر پھینک دی تھیں۔

بٹوے کو اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھنے کے بعد، میں نے کنگھا اٹھایا، جسے میں نے میز پر رکھ دیا تھا، اس لیے کہ اس وقت میرے ہاتھ خالی نہیں تھے۔ میں نے کنگھی کو بلب کے سامنے کیا تاکہ اس کے آر پار دیکھا جا سکے۔ میں نے اس کے چکنے اور کھردرے دندانوں کی قطار کا معائنہ کیا اور دیکھا کہ اس کے دو دندانے غائب تھے۔ میں کھردرے دندانوں کی نوکوں پر ناخن چلانے کی اپنی خواہش کو دبا نہیں سکا تھا؛ ان سے کھیلتے ہوئے آسکر کو چند بالوں کی چمک نظر آ گئی جنھیں تجسس دور کرنے کی خاطر میں نے جان بوجھ کر کنگھی میں لگا رہنے دیا تھا۔

بالآخر میں نے کنگھی کو واپس برش میں پھنسا دیا اور سنگھار میز کے پاس سے چلا گیا، جو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب ایک غیر متوازن تصویر پیش کر رہی تھی۔ سسٹر ڈوروتھیا کے بستر کی طرف جاتے ہوئے میں ایک کرسی سے ٹکرایا جس پر ایک چولی ٹنگی ہوئی تھی جو بار بار دھوئی گئی تھی اور میں نے دیکھا کہ دھل دھل کر اس کے کنارے سفید ہو گئے تھے۔

چولی کے دونوں خالی گڑھے بھرنے کے لیے آسکر کے پاس سوائے اس کی دو

مٹھیوں کے اور کچھ نہیں تھا، مگر مٹھیاں ناکافی تھیں۔ بہت سخت اور بہت چیمن، وہ ان دو پیالوں میں اجنبی بھی تھیں اور ناخوش بھی، میں جن کے مشمولات سے ناواقف تھا ورنہ میں خوشی خوشی روزانہ تیچھے تیچھے ان کو پیتا رہتا؛ ہو سکتا ہے کہ اس عمل سے مجھے متلی ہونے لگتی، اس لیے کہ کسی شے کے بہت زیادہ استعمال سے پیٹ خراب ہو جاتا ہے، مگر متلی کے بعد کا ہلکا پن اور مٹھاس ہی اصل محبت ہوتی ہے، جو متلی کو پسندیدہ بنا دیتی ہے۔

مجھے ڈاکٹر ورنر یاد آ گیا اور میں نے چولی سے اپنی مٹھیاں نکال لیں، مگر جب ڈاکٹر ورنر غائب ہو گیا تب ہی میں مسٹر ڈوروتھیا کے بستر کی طرف جا سکا تھا۔ سو، یہ تھا ڈوروتھیا کا بستر! کتنی بار آسکر نے اس کے تصور کی کوشش کی تھی؛ اور اب میرے سامنے تھا وہ کتھئی رنگ سے پینٹ کیا ہوا ڈراؤنا، لکڑی کا ڈھانچا، جو کبھی میرے سکون و آرام اور کبھی بے خوابی کی وجہ ہوتا تھا۔ میں تو ڈوروتھیا کے لیے دھات کا بنا سفید تام چینی کا پلنگ پسند کرتا، جس میں پیتل کی گھنڈیاں لگی ہوں، ہلکے سے ڈھانچے کا ہو، نہ کہ ایسی تکلیف دہ اور محرومِ محبت شے جیسا! غیر متحرک، اپنا بھاری، جذبات سے عاری، حتیٰ کہ حسد سے بھی معذور، سر لیے میں کچھ دیر کھڑا، اپنی نیند کی قربان گاہ کو دیکھتا رہا اور میرے خیال میں یہ سنگِ خارا رہا ہوگا۔ پھر میں نے اس منظر سے اپنی نظریں ہٹا لیں۔ آسکر کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مسٹر ڈوروتھیا اور اس کا سامانِ استراحت اس قابلِ نفرت مقبرے میں ہوگا۔

میں اس خیال سے سنگھار میز کی طرف واپس گیا کہ میں قیاسی مرہم کے مرتبانوں کو دیکھوں۔ واپسی پر کپڑوں کی الماری نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کی پیمائش کروں، اس کے پینٹ کو سیاہ کتھئی سمجھوں، اس پر لگی ہوئی زیبائشی نقوش پر غور کروں اور بالآخر اس کو کھولوں؛ اس لیے کہ ایسی کون سی الماری ہے جو کھولے جانے کا مطالبہ نہیں کرتی۔ اس میں تالا نہیں تھا، اس کے دروازے ایک مڑی ہوئی کیل سے بند کیے گئے تھے؛ میں نے اسے ایک دم عمودی کیفیت میں پلٹ دیا اور میری مدد کے بغیر دروازے ایک گہرا سانس لے کر کھل گئے اور مجھے اتنا وسیع منظر پیش کیا کہ مجھے پیچھے ہٹ کر ذرا فاصلے سے اس کو پوری طور پر دیکھنا پڑا تھا۔ آسکر خود کو سنگھار میز کی تفصیلات میں غرق نہیں کرنا چاہتا؛

نہ کبھی اس بات کی خواہش تھی، جیسا کہ بستر کے معاملے میں ہوا تھا، کہ تعصب فیصلہ کرے: نہیں! اس نے اپنے آپ کو الماری کے حوالے کرنے کا عہد کر لیا تھا، جس نے اپنی تخلیق کے پہلے دن کی تازگی کے ساتھ اپنے بازو پھیلا دیے تھے۔

پھر بھی، ناقابلِ علاج حسن پسند آسکر، تنقید سے پرہیز نہیں کر سکا تھا؛ کسی وحشی نے جلدی میں آری سے اس کے پیر کاٹ دیے تھے اور مسخ شدہ الماری کو سطحِ فرش فرش پر ڈال دیا تھا۔

اس کا اندرون بہترین حالت میں تھا۔ دائیں جانب، تین گہرے خانے بنے ہوئے تھے جن میں زیر جاموں اور بلاؤزوں کا انبار تھا؛ سفید، گلابی اور ان میں ایک ہلکے آسمانی رنگ کا بھی تھا، آسکر کے خیال کے مطابق اس کا رنگ خراب نہیں ہوگا۔ دائیں جانب کے دروازوں کے اندر دو سرخ اور سبز موم جامے کے تھیلے ٹنگے تھے، ایک میں خواتین کے لمبے موزے تھے اور دوسرے میں وہ موزے تھے مسٹر ڈوروتھیا نے جن کی مرمت کی تھی۔ میرے خیال میں، یہ موزے معیار میں ان کے برابر ہیں جو ماریا کے افسر اور عاشق نے اس کو دیے تھے، مگر ان کی بُنت زیادہ گھنی اور دیرپا تھی۔ بائیں جانب کلف لگی، چم چم کرتی نرس کی وردیاں ٹنگی تھیں۔ ٹوپی رکھنے کے خانے میں نرسوں کی خوب صورت، سادہ اور اعلیٰ درجے کی نازک ٹوپیاں تھیں، جنھیں اناڑی ہاتھ لگنے کا خطرہ نہیں تھا۔ زیر جاموں کی بائیں جانب ٹنگے شہری لباسوں پر میں نے صرف اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی۔ سستے اور نوع نوع کے بے تکے کپڑوں کی موجودگی نے میری خفیہ امیدوں کی تصدیق کر دی تھی: مسٹر ڈوروتھیا لباس کے اس شعبے میں گہری دل چسپی نہیں رکھتی تھی۔ اور یہی تاثر، مصنوعی پھولوں سے مزین، برتنوں کی شکل کی، تین یا چار ٹوپیوں سے ملتا تھا، جن کو لاپروائی سے ٹوپیوں کے انبار سے الگ ڈال دیا گیا تھا۔ ہیٹ کے خانے میں رنگین جلدوں والی ایک درجن کے قریب کتابیں بھی تھیں، جو بُنائی سے بچ رہنے والے اون سے بھرے جوتے کے ڈبوں کے سہارے رکھی ہوئی تھیں۔

کتابوں کے عنوان پڑھنے کے لیے آسکر کو اس خانے کے قریب جانا اور اپنے سر کو جھکانا پڑا تھا اور میں نے مشفقانہ تبسم کے ساتھ اپنا سر جھکا کر انھیں دیکھا: اچھا! تو

بسسٹر ڈوروتھیا جرم و سزا کے ناول سے بھی شوق رکھتی ہے مگر میں الماری کے غیرِ عسکری حصے کے بارے کافی کہہ چکا ہوں۔ کتابوں کی محبت میں زیادہ قریب جا کر میں پسپا نہیں ہوا؛ اس کے برعکس، میں نے الماری میں اپنا سر داخل کر دیا اور اس کا حصہ بن جانے کی بڑھتی ہوئی خواہش کو روکنا چھوڑ دیا اور کپڑوں کے اس حصے کا حصہ بن گیا جہاں بسسٹر ڈوروتھیا اپنے قابلِ دید وجود کا ایک قابلِ تعریف حصہ رکھا کرتی تھی۔

مجھے تو نیچی ایڑی کے معقول جوتوں کو ہٹانا بھی نہیں پڑا تھا، جو الماری کے فرش پر ایستادہ تھے، نفاست سے پالش کردہ اور پہن کر جانے کے لیے تیار۔ گویا مجھ کو اندر داخل ہونے کی دعوت دی جا رہی ہو؛ الماری کی اشیا اس طرح رکھی گئی تھیں کہ آسکر ایک لباس بھی ہلے ڈلے بغیر اس کے بیچ میں پناہ لے سکتا تھا تو قع سے بھرپور، میں رینگ کر اندر داخل ہو گیا اور اپنی ایڑیوں کے بل بیٹھ گیا۔

شروع میں تو میرا ذہن پُرسکون نہیں تھا۔ آسکر کو محسوس ہوا گویا فرنیچر اور بجلی کا بلب، سب اسی کو دیکھ رہے ہیں۔ میں نے الماری میں اپنے عارضی قیام کو زیادہ بے تکلف بنانے کی خواہش میں دروازوں کو اندر سے بند کر لینے کی کوشش کی، مگر یہ کام آسان نہیں تھا۔ روشنی پھر بھی داخل ہو رہی تھی، مگر اتنی نہیں کہ مجھے تکلیف پہنچاتی۔ وہ بو زیادہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ پرانے فیشن کی، صاف ستھری خوش بو جو سرکے کی نہیں، مگر ہلکی پتنگوں کو دور بھگانے والی؛ ایک اچھی خوش بو تھی۔

الماری کے اندر بیٹھ کر آسکر کیا کر رہا تھا؟ اس نے اپنی پیشانی بسسٹر ڈوروتھیا کی قریب ترین وردی پر ٹکا دی تھی، جس نے اس پر زندگی کے ہر پہلو کا دروازہ کھول دیا۔ میرا بایاں ہاتھ جو شاید سہارا لینے کے لیے کسی شے کی تلاش میں تھا، غیر عسکری کپڑوں سے گزرتا ہوا پیچھے کی طرف گیا، بھٹک گیا، غائب ہو گیا، گرفت ڈھیلی ہو گئی، پھر بڑھا، کوئی چکنی اور لچک دار شے پکڑ لی اور بالآخر — اس شے کو پکڑے ہوئے — افقی انداز میں لگا ہوا ایک سہارا پا گیا، جو الماری کے عقبی تختے کو سہارا دے رہا تھا، اور میرے لیے بھی وہی کام کرنا چاہتا تھا۔ میرا ہاتھ آزاد تھا، میں نے اس کو آگے بڑھایا اور اپنی آنکھوں کے سامنے

پیش کیا کہ میں اپنے پیچھے کیا شے پا گیا ہوں۔

مجھے سیاہ رنگ کی ایک پیٹی نظر آئی، مگر فوراً ہی مجھے پیٹی سے زیادہ کوئی اور شے بھی نظر آ گئی تھی، اس لیے کہ وہ الماری میں اتنی بھوری ہو گئی تھی کہ ایک پیٹنٹ چمڑے کی پیٹی آسانی سے کوئی اور شے سمجھی جا سکتی تھی۔ شاید یہ کوئی اور ہی شے تھی، اتنی ہی لمبی اور چکنی، جتنی کہ ایک ناقابلِ اصلاح نقارہ نواز نے 'نیو فار واٹر' کے 'بریک واٹر' کی بندرگاہ میں دیکھی تھی: اس دن بے چاری میری مما رس بھری کے رنگ کی سجاوٹ والے اپنے آسمانی رنگ کے موسمِ بہار کے کوٹ میں تھی، جان برانسکی اپنے مخمل کے کالر والے کوٹ میں تھا، اور آسکر اپنی ملاحوں کی ٹوپی میں تھا جس پر سنہری کڑھائی میں "S.M.S. Seydlitz" لکھا ہوا تھا؛ اور ایک ڈھیلا ڈھالا اور مخمل کے کالر والا، میرے اور مما کے آگے گویا تھا، جو اپنی اونچی ایڑی کے جوتے کے باعث روشنی کے مینار تک کو نہیں سکتی تھی، جس کے نیچے بندرگاہ کا قلی انگنی کی ڈور، نمک سے بھرا بورا اور اس میں ہونے والی حرکت لیے بیٹھا ہوا تھا۔ بورے اور انگنی کی ڈور کو دیکھتے ہی ہم نے مینار کے نیچے والے آدمی سے پوچھا تھا کہ مچھلی مارنے کے لیے وہ انگنی کی ڈور کیوں استعمال کرتا ہے، مگر اس کا 'نیو فار واٹر' یا 'بروسن' والا ساتھی ہنسا اور اس نے اپنا لیس دار کھنچتی لعابِ دہن زمین پر تھوک دیا تھا، جو 'بریک واٹر' کے پانی میں اوپر نیچے ہوا، مگر اس جگہ کوئی اتھل پتھل نہیں کر سکا تھا، جب تک کہ ایک سمندری چڑیا اسے دور نہیں لے گئی تھی؛ اس لیے کہ سمندری چڑیاں ہر قسم کی شے اٹھا لے جاتی ہیں، کہ وہ چگنے کے معاملے میں تمھاری نخرہ کرنے والی فاختائیں نہیں ہوتیں، نہ کسی معنی میں کوئی نرس — کیا یہ بہت آسان نہیں ہوگا اگر آپ ہر شے کو سفیدی میں لپیٹ کر کسی الماری میں ڈال دیں؟ اور کچھ یوں ہی سیاہی کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ ان دنوں میں شیطان صفت کالی چڑیل سے خوف نہیں کھاتا تھا، میں بے خوف الماری کے اندر بیٹھا رہتا تھا اور الماری کے باہر بھی، مگر ویسا ہی نڈر رہا جیسا کہ 'نیو فار واٹر' کے 'بلیک واٹر' میں بیٹھا تھا: ایک طرف پیٹنٹ چمڑے کی بنی پیٹی لیے اور دوسری طرف کچھ اور لیے جو کالی اور پھسلنے والی شے تھی مگر پیٹی نہیں تھی۔ چوں کہ میں الماری میں تھا، میں نے

الماری کی اشیا کے درمیان تقابل کرنا شروع کیا، اور میں نے شیطان صفت کالی چڑیل کو اس کا نام لے کر پکارا تھا، مگر اس وقت وہ میرے کسی کام کی نہیں تھی، کہ میں سفیدی کے معاملے میں بہت دور جا چکا تھا اور مشکل سے ایک سمندری چڑیا اور بسٹر ڈورو تھیا کے درمیان امتیاز کر سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اپنے ذہن سے فاختاؤں، کبوتروں اور ایسی تمام فضولیات کو نکال پھینکا تھا، اس لیے اور بھی کہ وہ پینے کوسٹ نہیں بلکہ گُڈ فرائیڈے کا دن تھا جب ہم 'مُرو کسی' سے نکلے تھے اور 'مُریک واٹر تک' چلتے رہے تھے، مزید اس لیے بھی کہ وہاں 'مُریک واٹر' پر کبوتر نہیں تھے جہاں تیمو فار واسر' والا آدمی اپنی انگلی والی ڈور لیے بیٹھا تھا اور تھوک رہا تھا۔ اور جب 'مُرو کسی' کے قلی نے ڈور کھینچی تھی اور جب ڈور رُکی تب پتا چلا تھا کہ 'موتلاؤ' کے پانی سے نکلتے وقت یہ اتنی بھاری کیوں ہو رہی تھی، جب میری مما نے جان برانسکی کے کاندھے اور مخمل کے کالر پر اپنا سر رکھا تھا، اس لیے کہ اس کا چہرہ پنیر کی طرح سبز ہو رہا تھا، اس لیے کہ وہ چلی جانا چاہتی تھی، مگر اسے دیکھنا پڑا تھا کہ قلی نے گھوڑے کا کٹا سر پتھروں پر پھینک دیا تھا اور اس کی ایال سے سمندر کے رنگ کی بام مچھلیاں رگری تھیں اور مردہ سر سے بڑی بڑی مچھلیاں کھینچ کر نکالی گئی تھیں۔ قلی نے گھوڑے کا منہ کھول کر دانتوں کے درمیان لکڑی کا ایک ٹکڑا پھنسا دیا، جس سے گھوڑا ہنسنے لگا تھا، اور پھر اس نے گھوڑے کے منہ میں اپنا بالوں بھرا ہاتھ ڈالا اور مچھلیوں کو تلاش کیا تھا، اور اسی طرح اس نے دو مچھلیاں ایک ساتھ نکالیں، جیسے کہ میں الماری میں کچھ تلاش کر رہا تھا، اور میں نے الماری میں سے پیٹنٹ چمڑے کی پیٹی نکالی تھی۔ اس نے انھیں ہوا میں لہرایا اور پتھروں پر دے مارا تھا، جب میری مما نے پورا ناشتا اُگل دیا تھا، جس میں دودھ میں بنی کافی تھی، انڈے کی سفیدی اور زردی تھی، تھوڑا سا جام تھا اور سفید آٹے کی ڈبل روٹی کے کچھ ٹکڑے تھے۔ ناشتا اتنی مقدار میں تھا کہ سمندری پرندے اس پر ٹوٹ پڑے تھے، ان میں کچھ نیچے سے آ کر اس پر گر پڑے تھے — میں ان کی چیخوں کا تذکرہ نہیں کروں گا اس لیے کہ سب جانتے ہیں کی سمندری چڑیوں کی آنکھیں شیطانی ہوتی ہیں۔ جیسا کی جان برانسکی کے معاملے ہوا تھا، ان کو اُڑایا نہیں گیا تھا، اس لیے کہ وہ سمندری چڑیوں کو دیکھ کر

خوف سے اکڑ جاتا تھا اور اپنی خوف زدہ نیلی آنکھیں دونوں ہاتھوں سے بند کر لیتا تھا۔ انھوں نے تو میرے نقارے پر بھی توجہ نہیں دی تھی، بلکہ اس کو تو بالکل ہضم ہی کر گئی تھیں، جب میں نے غصے میں آخر، بلکہ پُر جوشی کے ساتھ، اپنے نقارے پر کچھ نئی دھنیں بھی بنائی تھیں، مگر میری مما کو تو ایک ہی پریشانی تھی، اس نے ہاتھوں سے دبا کر اپنا منھ بند کر رکھا تھا، مگر اس میں سے کچھ نکلنے والا نہیں تھا، کہ اس نے بہت زیادہ کھایا بھی نہیں تھا، اس لیے کہ میری مما اپنا وزن کم کر رہی تھی اور ہفتے میں دوبار عورتوں کی انجمن میں جمناسٹک کے لیے جاتی تھی، مگر اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا، اس لیے کہ وہ چھپ چھپ کر کھایا کرتی تھی، اور اس کو اپنے وعدے توڑنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ مل جاتا تھا۔ اور جہاں تک نیو واسرز کے آدمی کا معاملہ تھا، تو اس نے ہر قسم کے نظریات کو توڑ کر گھوڑے کے منہ سے آخری بام مچھلی کھینچ کر نکالی تھی۔ وہ پوری طرح سفید ویلے سے بھری تھی، اس لیے کہ وہ گھوڑے کے دماغ میں گھسی ہوئی تھی، مگر قلی اسے اوپر نیچے اس وقت تک لہراتا رہا تھا جب تک کہ ویلا پوری طرح گر نہیں گیا تھا، جب تک کہ بام مچھلی کی اپنی پالش نظر نہیں آگئی تھی اور وہ پینٹ چمڑے کی پیٹی کی طرح چمکنے نہیں لگی تھی۔ دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ جب سسٹر ڈوروتھیا، ریڈ کراس پن کے بغیر، عام لباس میں جاتی تھی تو وہ بھی ایسی ہی پیٹی لگاتی تھی۔

ہم گھر کی طرف چل پڑے تھے، حالاں کہ ماتسیرات وہیں ٹھہرنا چاہتا تھا، اس لیے کہ تقریباً اٹھارہ ہزار ٹن والا فن لینڈ کا جہاز بندرگاہ میں داخل ہو رہا تھا اور لہریں پیدا کر رہا تھا۔ قلی نے گھوڑے کا سر 'بریک واٹر' میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ ایک لمحے کے بعد گھوڑا سفید پڑ گیا اور چیخ پڑا تھا، مگر وہ گھوڑے کی طرح نہیں چیخا، بادل کی طرح چیخا تھا جو سفید ہوتا ہے اور بسیار خور ہوتا ہے اور گھوڑے کے سر پر اتر آتا ہے۔ یہ سب کچھ اچھائی کے لیے تھا، اس لیے کہ اب گھوڑا نظر سے اوجھل ہو گیا تھا، حالاں کہ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس سفید اضطراب کی تہ میں کیا پوشیدہ تھا۔ فن لینڈ والے نے بھی ہم کو کسی اور طرف متوجہ کر دیا، وہ ویسا ہی زنگ خوردہ تھا جیسی کی 'ساپیے' کے قبرستان کی باڑ، اور وہ لکڑی لے کر جا رہا تھا۔ مگر میری مما بے چاری نے پلٹ کر نہ فن لینڈ والے کی طرف دیکھا تھا، نہ سمندری

پرندوں کی طرف۔ وہ تو مرگئی تھی۔ حالاں کہ پہلے اس نے نہ صرف ہمارے پیانو پر "Fly, little seagull, fly away to Heligoland" گایا تھا بلکہ خوب گایا تھا، مگر اس نے یہ گانا پھر کبھی نہیں گایا؛ پہلے تو وہ زیادہ مچھلی نہیں کھاتی تھی، مگر اچانک اس نے اتنی مچھلی کھانی شروع کر دی تھی، اتنی بڑی بڑی مچھلیاں، اتنی موٹی موٹی مچھلیاں کہ ایک دن وہ پھر کچھ بھی نہ کھا سکی، کہ وہ اس سے بیزار ہو چکی تھی، بام مچھلی سے بیزار، زندگی سے بیزار، بالخصوص مردوں سے بیزار اور شاید آسکر سے بھی۔ بہر حال وہ، جو کبھی کسی شے کو ترک نہیں کر سکی تھی، اتنی کفایت شعار اور ایسی اعتدال پسند ہو گئی تھی کہ خود کو 'برنٹاؤ' میں دفن کرا لیا۔ میں نے یہ لطف اندوزی اور کفایت شعاری ورثے میں پائی ہے۔ میں ہر چیز چاہتا ہوں مگر ایسی نہیں جس کے بغیر رہ نہیں سکتا— سوائے دھویں میں پکی بام مچھلی کے، کہ میں ان کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ ایسا ہی ایک اور استثنا سسٹر ڈوروتھیا تھی، جس کو میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا، میں جس کی پینٹنٹ چمڑے کی پٹی کا دیوانہ نہیں تھا— پھر بھی میں خود کو اس سے الگ نہیں کر سکا تھا؛ وہ لامتناہی تھی، وہ بڑھتی گئی تھی اور اپنے فارغ ہاتھ سے میں نے اپنے پتلون کے بٹن بھی کھولے تھے، تا کہ میں سسٹر ڈوروتھیا کے بارے میں اپنے تصور کی دو بارہ وضاحت کر سکوں، جو فن لینڈ کے تاجر اور اس کی وارنش کی ہوئی بے شمار بام مچھلیوں نے دھندلا دیا تھا۔ بالآخر سمندری پرندوں کی مدد سے آسکر نے 'ٹریک واٹر' کے غلبے کو اُتار پھینکا اور سسٹر ڈوروتھیا کی دنیا کو اس خالی، مگر دل کش وردیوں کے درمیان دریافت کر لیا، مگر جب بالآخر میں ان کو اور اس کے مخصوص خد و خال کو اپنے سامنے دیکھ سکا تو اچانک الماری کے آواز کرتے ہوئے دروازے کھل گئے؛ تیز روشنی نے مجھے سراسیمہ کر دیا اور مجھے اپنے قریب ٹنگے ہوئے بالا پوش کو دھبوں سے بچانے کی کوشش کرنی پڑی تھی۔ صرف ایک عبوری کیفیت پیدا کرنے اور الماری میں میرے قیام کے دباؤ کو کم کرنے کے لیے، جو میری توقع سے کہیں بڑھ کر تھا، میں نے وہ کچھ کیا جو برسوں سے نہیں کیا گیا تھا؛ میں نے الماری کی خشک عقبی دیوار پر کچھ نقارہ نوازی کی، جو بہت شان دار نہیں تھی۔ پھر میں باہر نکلا اور ایک بار پھر اندر کی صفائی کی جانچ پڑتال کی؛ میں نے کسی طرح کی

ابتری کہیں پھیلائی تھی، حتیٰ کہ پیٹنٹ چمڑے کی پیٹی کی چمک بھی محفوظ تھی، نہیں، اس میں کہیں کہیں کچھ معمولی دھبے تھے، جن پہ میں نے اپنا گرم سانس ڈال کر چمکایا، قبل اس کے کہ پیٹی کوئی اور شے بن گئی اور بام مچھلیوں کی یاد دلانے کے قابل ہو گئی جو برسوں پہلے نیو فار واسز کی بندرگاہ برکیک واٹرز میں پکڑی گئی تھیں۔

میں، یعنی آسکر نے چالیس واٹ کے بلب کی برقی رو کاٹ دی، جس نے سسٹر ڈوروتھیا کے کمرے کے دورے کے درمیان مسلسل مجھ پر نظر رکھی تھی۔

# کلیپ

اپنی جیب میں ہلکے زرد رنگ کے بالوں کا بنڈل لیے میں راہداری میں موجود تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اُن بالوں کو محسوس کرنا چاہا تھا، چہرے کے نیچے، اپنے کوٹ کے استر کے نیچے، اپنی واسکٹ، قمیص اور زیر جامے کے نیچے؛ مگر میں بہت تھکا ہوا تھا اور ایک عجیب روکھے انداز میں مطمئن، اپنے خزانے پر ایک نظر ڈالنا چاہ رہا تھا، جو محض تکیے پر گری پائی جانے شے سے بڑھ کر تھا۔

اس وقت صرف آسکر نے اپنے آپ سے اعتراف کیا تھا کہ وہ کسی بہت مختلف نوعیت کے خزانوں کی تلاش میں تھا۔ میں صرف اتنا چاہتا تھا کہ کسی طرح میں ڈاکٹر ؤورز کی سسٹر ڈوروتھیا کے کمرے میں موجودگی کو ظاہر کرسکوں، کوئی خط یا ان لفافوں میں سے کسی ایک کو پاکر، میں جن سے اچھی طرح واقف تھا۔ مجھے کچھ نہیں ملا۔ کوئی تحریر شدہ کاغذ تو کیا ملتا، ایک لفافہ تک نہیں ملا۔ آسکر نے اعتراف کیا کہ اس نے سارے جرم وسزا والے ناول، ایک ایک کرکے، ٹوپیوں کے خانے سے ہٹا دیے تھے اور انتساب کی اور لگائے گئے نشانوں کی تلاش میں ان کو کھول کر دیکھا بھی تھا۔ میں تصویر کی تلاش میں بھی تھا، اس لیے کہ آسکر میرین اسپتال کے تقریباً سارے ڈاکٹروں کی صورتوں سے واقف تھا، نام کے ذریعے نہیں— مگر ڈاکٹر ؤورز کی کوئی تصویر نہیں ملی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ورز سسٹر ڈوروتھیا کے کمرے سے واقف نہیں تھا،

اور اگر کبھی دیکھا بھی تھا تو کوئی نشانی چھوڑنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ آسکر کو خوشی ہوئی۔ کیا مجھے اس ڈاکٹر سے زیادہ فوقیت حاصل نہیں؟ کیا اس کی کسی نشانی کی غیر موجودگی ایک مثبت ثبوت نہیں تھی کہ ڈاکٹر اور نرس کے درمیان کے تعلقات اسپتال تک محدود تھے، لہٰذا خالصتاً پیشہ ورانہ تھے اور اگر ان کے درمیان کوئی ذاتی بات تھی تو یک طرفہ تھی؟

پھر بھی، آسکر کا حسد کسی محرک کے لیے بے چین تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر وِرنر کا ہلکا سا بھی شائبہ میرے لیے ایک ضرب کے مماثل ہوتا، مگر ساتھ ہی وہ میرے المارِی کے مختصر سے قیام سے غیر متناسب اطمینان کا باعث ہوتا۔

مجھے یاد نہیں کہ میں اپنے کمرے تک واپس کیسے پہنچا تھا، مگر مجھے راہداری کے آخر میں واقع مسٹر منٹسر کے دروازے کے عقب سے آنے والی ایک مصنوعی کھانسی ضرور یاد ہے، جیسی کسی کو متوجہ کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ ان مسٹر منٹسر کا مجھ سے کیا واسطہ تھا؟ کیا میرے لیے سسٹر ڈوروتھیا ہی بہت نہیں تھی؟ کیا یہ وقت میرے لیے مسٹر منٹسر کا مزید بار اُٹھانے کے لیے موزوں تھا— کون جانے کہ اس نام کے پیچھے کیا چھپا ہوگا؟ اس لیے آسکر دعوت دینے والی کھانسی سننے سے قاصر رہا یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ مجھ سے کیا توقع کی جا رہی ہے، اور جب میں اپنے کمرے میں واپس پہنچا تب احساس ہوا کہ اس مسٹر منٹسر، اس مکمل طور پر اجنبی نے، جو میرے لیے کچھ بھی نہیں تھا، آسکر کو اپنے کمرے میں بلانے کے لیے مصنوعی کھانسی کی تھی۔

میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں: اس لیے کہ مجھے افسوس تھا کہ میں نے کھانسی پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا، اس لیے کہ میرا کمرہ اتنا تنگ اور ساتھ ہی اتنا وسیع محسوس ہوا تھا کہ کھانسنے والے مسٹر منٹسر سے ایک گفتگو، خواہ وہ کتنی ہی جبری اور ناگوار کیوں نہ ہوتی، میری بہتری کا باعث ہوتی، مگر میں ہمت نہیں کر سکا کہ میں— مثال کے طور پر، راہداری میں جا کر ایک جوابی کھانسی کھانس سکتا تھا— راہداری کے آخری دروازے کے پیچھے بیٹھے شخص سے تاخیر سے رابطہ کرتا۔ میں نے سُستی سے اپنی باورچی خانے کی کرسی کی بے مقصد پہلو داری کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور بے چین ہو گیا، جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے جب میں کرسی میں بیٹھا ہوتا

ہوں۔ اپنے بستر سے طبی حوالے کی ایک کتاب اٹھائی، اس بے ترتیب بوجھ کو پھینک دیا جس پر اچھی خاصی رقم خرچ ہوئی تھی اور راشکول نیکوف کا تحفے میں دیا ہوا نقارہ میز پر سے اٹھایا۔ میں اس کو ہاتھ میں لیے رہا، مگر نہ اس کی طرف اس کی چوب کو لے جا سکا نہ آسکر نے آنسو بہائے، جو اس گول سفید پالش پر گر جاتے اور مجھے بحر اور تال سے نجات مل جاتی۔

اس مرحلے پر میں گم کردہ معصومیت پر، دو آسکروں کے درمیان ایک تقابل پر، دوامی طور پر سہ سالہ طفل نقارہ نواز پر، اور بے صدا، بے آنسو اور بے نقارہ کوزہ پشت پر مضمون لکھ سکتا تھا مگر وہ تو کچھ زیادہ ہی سہل کاری ہو جائے گی اور حقیقت کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکے گا۔ اپنی نقارہ نوازی کے دنوں میں بھی آسکر ایک سے زیادہ بار اپنی معصومیت گنوا چکا تھا اور اس کو دوبارہ حاصل بھی کر لیا تھا یا انتظار کیا تھا کہ دوبارہ پیدا ہو جائے گی؛ اس لیے کہ معصومیت فراوانی سے اگنے والے خود رو گھاس پات جیسی ہوتی ہے — ذرا معصوم نانیوں دادیوں کو یاد کیجیے جو کسی زمانے میں ناگوار اور بد اندیش نوزائیدہ رہی ہوں گی — جی نہیں، یہ معصومیت اور گم کردہ معصومیت کا کوئی بے معنی تصور نہیں تھا، جس نے آسکر کو اپنے باورچی خانے کی کرسی سے اچھلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نہیں، یہ سسٹر ڈوروتھیا کے لیے میرا پیار تھا جس نے مجھے نقارے کو کنوارا نقارہ رہنے دینے، کمرہ، راہداری اور فلیٹ کو چھوڑنے اور جلدی سے اکادمی جانے کا حکم دیا تھا، حالاں کہ پروفیسر کوخن سے میری ملاقات کا وقت دوپہر کے بعد طے تھا۔

جب آسکر ہچکچاتا ہوا کمرے سے باہر نکلا، راہداری میں قدم رکھا، دکھاوے کے طور پر فلیٹ کا دروازہ کھولا تو میں نے مسٹر مُنتسر کے دروازے کی جانب اپنے کان لگا دیے۔ وہ کھانسا نہیں۔

شرمندہ، برگشتہ، آسودہ اور بھوکا، زندگی سے اُکتایا اور زندگی کا مشتاق، میں رو دینے والا تھا، میں پہلے فلیٹ سے نکلا پھر جولیئر اشترا سے پر واقع اس عمارت سے بھی باہر آ گیا۔

چند دن بعد میں نے ایک زمانے سے دل میں پالے ہوئے اپنے منصوبے پر عمل کیا، جس کو رو کرنے پر اتنا وقت خرچ ہوا تھا کہ میں نے اس کو بڑی تفصیل سے دوبارہ تیار

کیا تھا۔اس دن صبح کا وقت خالی تھا۔تین بجے دن کے بعد ہی آسکر اور اُلا، ذہین راشکول نیکوف کے ماڈلنگ کرنے والے تھے، میں جس میں یولیسس کے کردار میں تھا، جو گھر واپسی پر 'پینی لوپے' کو اپنا کوب پیش کرنے والا تھا— بلا شبہ جو اس کی غیر موجودگی کے دوران اُبھرا تھا۔ میں نے مصور کو یہ منصوبے ختم کر دینے کا مشورہ دیا تھا، مگر میری کوشش بے کار گئی۔ کچھ دنوں تک تو وہ یونانی دیوتاؤں اور نیم دیوتاؤں کے نام سے ناجائز فائدہ اُٹھاتا رہا، اور اُلا افسانوی داستانوں میں دل چسپی لیتی رہی۔ بالآخر میں نے ہار مان لی اور میں وولکن [آگ اور آہن گری کے دیوتا Vulcan مترجم] کے روپ میں، اس کے بعد پرِاسپیرینا کے ساتھ پلوٹو بنا اور آخر میں کوزہ پشت یولیسس کے کردار میں پینٹ کیا گیا، مگر چوں کہ میں صبح والے معاملے کے بارے میں زیادہ فکر مند تھا، آسکر آپ کو یہ نہیں بتائے گا کہ میوز اُلا پینی لوپے کے کردار میں کیسی لگی تھی، مگر اس کے بجائے کہے گا: زائیڈلر کے فلیٹ میں سب ٹھیک تھا۔ خار پشت بال کاٹنے کی مشین کے ساتھ سڑک پر تھا۔ سسٹر ڈوروتھیا دن کی شفٹ پر تھی اور چھ بجے صبح گھر سے چلی گئی تھی اور مسز زائیڈلر اس وقت بھی بستر میں تھی، جب آٹھ بجنے کے کچھ دیر بعد ڈاک آئی تھی۔

میں نے فوراً ڈاک دیکھی، اس میں میرے لیے کچھ نہیں تھا— ماریا کا خط دو دن پہلے آچکا تھا— مگر میں نے پہلی ہی نظر میں ایک لفافہ دیکھ لیا تھا جو اسی شہر سے ڈاک میں ڈالا گیا تھا اور اس پر پتا بلاشبہ ڈاکٹر ورنر نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ پہلے تو میں نے اس کو دوسرے خطوط کے ساتھ وہیں فرش پر ڈال دیا، جو مسٹر منٹسر اور مسز زائیڈلر کے نام تھے، اپنے کمرے میں واپس گیا اور اس وقت تک انتظار کیا جب مسز زائیڈلر اپنے کمرے سے باہر نکلی، منٹسر کے خطوط اُٹھائے، باورچی خانے میں گئی، اپنی خواب گاہ میں واپس گئی اور دس منٹ کے اندر فلیٹ سے باہر چلی گئی، اس لیے کہ مانیس مان میں اس کا کام نو بجے شروع ہوتا تھا۔

احتیاطاً آسکر نے چند لمحے انتظار کیا، آہستہ آہستہ لباس تبدیل کیا، بہت سکون سے اپنے ناخن صاف کیے اور اس کے بعد ہی کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ میں باورچی خانے میں گیا، المونیم کی ایک پتیلی نصف سطح تک پانی سے بھری، گیس کے تین چولھوں میں

سے سب بڑے چولھے پر رکھی اور گیس کو دیا سلائی دکھا کر شعلے کو تیز ترین کر دیا، مگر جب پانی ابلنے پر آیا تو شعلے کو کم کر دیا تھا۔ اس کے بعد اپنے خیالات کو احتیاط سے قابو میں کرتے ہوئے اور ان کو ہاتھ کی حرکت کے قریب تر کرنے کے بعد، میں مسز ڈوروتھیا کے کمرے کی طرف گیا، وہ خط نکالا جو مسز زائیڈلر نے نصف شیشے والے دروازے کے نیچے آدھا ٹھونس دیا تھا، باورچی خانے میں واپس گیا اور بہت احتیاط سے لفافے کو اس وقت تک بھاپ کے اوپر کیے رکھا جب تک کہ گزند کے بغیر لفافہ کھل نہیں گیا تھا۔ یہ بتانا ضروری نہیں کہ آسکر نے ڈاکٹر ورز کے خط کو برتن کے اوپر کرنے سے پہلے چولھے کی گیس بند کر دی تھی۔

میں نے ڈاکٹر کے پیغام کو باورچی خانے میں نہیں، اپنے بستر پر لیٹ کر پڑھا تھا۔ پہلے تو میں بہت مایوس ہوا، اس لیے کہ نہ القاب "ڈیئر مس ڈوروتھیا" نے اور نہ اختتامیے "آپ کا مخلص، ایرخ ورز" نے ڈاکٹر اور نرس کے درمیان تعلقات پر کوئی روشنی ڈالی تھی۔

نہ وہ خط پڑھتے وقت مجھے اس میں ایک بھی کشادہ دلی سے لکھا اور جذبات سے پُر لفظ نظر آیا تھا۔ ڈاکٹر نے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ پچھلے دن اس نے مسز ڈوروتھیا کو مردوں کے لیے مخصوص پویلین کے دروازے کے قریب دیکھا تھا، مگر اس سے بات نہیں کر سکا تھا۔ ڈاکٹر کو اس کی وجہ معلوم نہیں ہوئی کہ جب مسز ڈوروتھیا نے ڈاکٹر کو اس کی دوست مسز بیٹیا کے ساتھ کانفرنس میں دیکھا تھا، جہاں تک مجھے یاد ہے، تو مسز ڈوروتھیا مڑ کر دوسری جانب کیوں چلی گئی تھی۔ ڈاکٹر ورز نے صرف اس عمل کی تشریح کی درخواست کی تھی۔ اس کے مطابق مسز بیٹیا کے ساتھ اس کی گفتگو خالص پیشہ ورانہ نوعیت کی تھی۔ مسز بیٹیا قدرے جوشیلی ہو رہی تھی، مگر جیسا کہ اسے، یعنی مسز ڈوروتھیا کو معلوم تھا، اس نے ہمیشہ اور حتی الامکان اس سے فاصلہ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوئی آسان بات نہیں تھی اس لیے کہ وہ، یعنی مسز ڈوروتھیا، بیٹیا کو اچھی طرح جانتی تھی — ایسے بھی اوقات آئے تھے جب مسز بیٹیا نے اپنے احساسات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی مگر ڈاکٹر ورز نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ خط کا آخری جملہ یہ تھا، "یقین کرو، تم جب چاہو اور جس وقت چاہو میرے پاس آ سکتی ہو۔" ان سطور میں چھپی وضع داری اور بے مہر نخوت کے

باوجود، مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی کہ ڈاکٹر ورنر کے ادیبانہ انداز تحریر میں لکھا یہ رُقعہ دراصل جذبات سے بھرا ایک مکتوبِ محبت تھا۔

میں نے بالکل میکانکی انداز میں خط کو واپس لفافے میں رکھ دیا اور حفظانِ صحت کے بالکل ابتدائی اُصول نظر انداز کرتے ہوئے میں نے لفافے کو اپنے لعابِ دہن سے نم کرتے ہوئے بند بھی کر دیا تھا، جس پر شاید ورنر نے بھی اپنا لعاب دہن لگایا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں بے اختیار ہنسنے لگا اور ہنستے ہوئے میں، باری باری، اپنا ماتھا اور اپنا سر پیٹنے لگا تھا۔ تھوڑی دیر یہ سب کرنے کے بعد میں نے اپنا ہاتھ آسکر کی پیشانی سے ہٹا کر اپنے کمرے کے دروازے کی گھنڈی پر لگا دیا، دروازہ کھولا، راہداری میں قدم رکھا اور اس خط کا نصف بہتر ڈوروتھیا کے دروازے کے نیچے سرکا دیا۔

ابھی میں خط رکھ کے اٹھا بھی نہیں تھا کہ ہال کمرے کی دوسرے جانب سے آتی مسٹر منٹسر کی آواز سنائی دی۔ وہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کر اور نہایت موثر انداز میں بول رہا تھا گویا وہ کسی کو اِملا لکھا رہا ہو؛ میں اس کا ایک ایک لفظ سمجھ رہا تھا، ”جناب والا— کیا— مہربانی— کر کے— آپ— مجھے— تھوڑا سا— پانی— لا— دیں— گے؟“

میں کھڑا ہو گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ آدمی ضرور بیمار ہوگا، مگر مجھے فوراً احساس ہو گیا تھا کہ اس دروازے کے پیچھے کا آدمی بیمار نہیں تھا اور یہ بھی کہ آسکر کے خیال کے مطابق اس کا پانی مانگنا کمرے کے اندر بلانے کا بہانہ تھا۔ میں نے کبھی اس قسم کی بے سبب درخواست پر کسی اجنبی کے کمرے میں قدم نہیں رکھا ہے!

پہلے تو میں نے سوچا کہ میں اسے وہ نیم گرم پانی لا کر دوں گا جس کی مدد سے میں نے ڈاکٹر ورنر کا خط کھولا تھا، مگر میں نے استعمال شدہ پانی sink میں انڈیل دیا، برتن میں نلکے کا تازہ پانی بھرا اور برتن لے کر اس دروازے تک گیا جس کے پیچھے وہ آواز رہتی تھی، جس نے مجھ سے پانی، شاید صرف پانی ہی مانگا تھا۔

آسکر نے دستک دی، داخل ہوا اور داخل ہوتے ہی اسے ویسی ہی مہک کا سامنا ہوا جو کلیپ کی شخصیت سے مخصوص تھی۔ اس کے اطراف کی ہوا کا بہتر ڈوروتھیا کے

کمرے میں موجود سر کے جیسی مہک سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ اس کو میٹھا کھٹا کہنا بھی گمراہ کرنے کے مترادف ہوگا۔ یہ منشمر یا جو مجھے کلیپ ہی کی طرح لگا تھا— فربہ، مجہول، سست مگر غیر متحرک نہیں، توہم پرست، تیزی سے پسینے میں شرابور ہونے والا، بے دھلا، مگر متروکہ— بانسری اور کارنٹ نواز کی طرح نہیں، جس میں کوئی خاص بات تھی، جو اس کو مرنے سے روکتی رہتی تھی، جس میں اب بھی ایسی لاش کی سی بو ہے، جو ہمیشہ سگریٹ نوشی میں، پیپر منٹ چوسنے میں اور لہسن کھانے میں مشغول رہتی ہو۔ اس وقت بھی یہی مہک تھی اور آج بھی اس کی وہی مہک ہے اور سانس بھی ویسی ہی ہے، جب، فضا میں ناپائیداری اور زندگی سے محبت کے جذبے کا انجکشن لگاتا ہوا، اپنی مہک کے ساتھ، ملاقات کے دن مجھ پر نازل ہوتا ہے، اور الوداع کہنے کے بعد، برونو کو ہر دروازہ، ہر کھڑکی کھول دینے پر مجبور کر دیتا ہے، اور ایک بار پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا ہے۔

آج آسکر صاحب فراش ہے۔ اس وقت، کلیپ مجھے زائیڈ کر کے فلیٹ میں، بستر کی باقیات میں لیٹا خوشی خوشی سڑتا ہوا ملا تھا۔ میں اس کے قریب گیا، تو مجھے ایک پرانے فیشن والا، انتہا درجے کا بارونق طرز کا الکوحل سے جلنے والا لیمپ، اسپاگیٹی کے ایک درجن یا اس سے زیادہ پیکٹ، زیتون کے تیل کے کئی ڈبے، ٹماٹر کی لبدی کے چند ٹیوب، اخبار کے کاغذ میں لپٹا، نم اور لوندے جیسا نمک اور نیم گرم بیئر کی ایک پیٹی نظر آئی تھی۔ وہ لیٹے لیٹے بیئر کی بوتلوں میں پیشاب کرتا اور جیسا کہ اس نے رازداری میں مجھے بتایا تھا، وہ سبزی مائل بوتلوں پر ان کا ڈھکنا لگا دیتا تھا اور ان میں اتنا ہی ہوتا تھا جتنا وہ خارج کرتا تھا، جب کہ زیادہ تر بوتلیں گلے تک بھری تھیں۔ اچانک پیاس کی صورت میں، غلط فہمی سے بچنے کی خاطر، ان کو بیئر کی بوتلوں سے، جو اپنے نام کی باقاعدہ حق دار تھیں، الگ رکھتا تھا۔ اگرچہ اس کے کمرے میں پانی کا نلکا تھا— تھوڑے سے من چلے جذبے میں آ کر وہ واش بیسن میں بھی پیشاب کر سکتا تھا— وہ اٹھنے، بستر چھوڑنے یا اسپاگیٹی میں تازہ پانی ڈالنے کے معاملے میں بہت سست تھا یا اپنے آپ کو درد کے موافق کرنے کے باعث بہت مصروف رہتا تھا۔

چوں کہ— مسٹر منشمر، اپنی اسپاگیٹی پکانے میں ہمیشہ وہی پانی استعمال کرتا تھا،

اور کئی بار پسپائے ہوئے، بڑھتے ہوئے لیس دار رقیق کی بہت حفاظت کرتا تھا: وہ اکثر بیئر کی بوتلوں کی رسد کی مدد سے، لگاتار چار دن سے بھی زیادہ، پیٹھ کے بل لیٹا رہ سکتا تھا۔ صرف اس وقت حالات دگر گوں ہو گئے تھے جب اس کی اسپاگیٹی کا وہی پانی بار بار اُلٹ کر، ضرورت سے زیادہ نمکین، لَس دار، دلدل کی طرح کا ہو گیا تھا۔ ایسے موقعوں پر شاید خود کو بھوک سے مر جانے دیتا؛ مگر ان دنوں اس قسم کی بات کے لیے اس کے پاس نظریاتی بنیادوں کی کمی تھی، اور مزید یہ کہ اس کی تپتیا، اپنی نوعیت کے اعتبار سے چار یا پانچ دنوں تک ہی چل سکتی تھی۔ ورنہ، وہ مسز زائیڈلر کے تعاون سے جو اس کی ڈاک لایا کرتی تھی، خود کو بیرونی دنیا سے، یا اسپاگیٹی کے زیادہ بڑے برتن سے، بڑی آسانی سے خودمختار بنا سکتا تھا۔

جس دن آسکر نے ڈاک کی رازداری کی پامالی کی تھی کلیپ پانچ دن سے، بغیر کسی امداد کے، بستر میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کی اسپاگیٹی کے پانی کی باقیات، اشتہار چپکانے کے قابل ہو گئی ہوں گی۔ یہ کیفیت تھی جب اس نے میرے متذبذب قدم کی آواز سنی تھی، وہ قدم جو راہ داری میں مسٹر ڈوروتھیا اور اس کی خط کتابت کے سلسلے میں پہلے سے مصروف تھا۔ یہ دیکھ کر کہ آسکر نے اس کی نقلی کھانسی پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا تھا، اس نے اپنی آواز کو اس دن کی خلاف ورزی میں شامل کر دیا تھا جب میں نے ڈاکٹر ورنر کا خط جذباتی محبت نامہ کھولا تھا، اور کہا تھا، "جناب والا— مہربانی— کر کے— کیا— آپ— مجھے— تھوڑا— سا— پانی— لا— دیں— گے؟

اور میں نے برتن لیا تھا، نیم گرم پانی انڈیلا تھا، پانی کی ٹونٹی کھولی تھی اور پانی کو اس وقت تک نکلنے دیا تھا جب تک کہ برتن آدھا بھر نہیں گیا تھا، کچھ اور پانی ملایا تھا اور اس کے لیے تازہ پانی لے گیا تھا۔ میں اس کے قیاس کے مطابق مہربان جناب والا تھا؛ میں نے خود کو ماتسیرات، سنگ تراش اور کندہ کار کے نام سے متعارف کرایا تھا۔

اس نے بھی شائستگی سے اپنے جسم کا اوپری حصہ ایک دو ڈگری اٹھایا، خود کو ایگن مُنتسر، جاز کے موسیقار کی حیثیت میں تعارف کرایا تھا، مگر مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کو کلیپ کے نام سے ہی مخاطب کیا کروں، اس لیے کہ اس کے باپ کا نام بھی مُنتسر تھا۔ میں اس کی

درخواست کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا؛ اور یہ مکمل طور پر انکسار تھا جس نے مجھے تاثیرات کا نام رکھنے پر مجبور کیا تھا، اور ایسا بہت کم موقعوں پر ہوا تھا کہ میں نے خود کو آسکر بدانسکی کہلوانے کا ارادہ کر لیا تھا؛ میں تو خود کو کو اچکی کہلوانا زیادہ پسند کرتا، یا محض آسکر۔ نتیجے کے طور پر مجھے اس فربہ اور جھکے ہوئے جوان آدمی کو— میں نے جس کو تیس کا سمجھا تھا مگر وہ اس سے بھی کم نکلا— صرف کلیپ کہنے میں کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی زبان سے کو اچکی صحیح طرح ادا نہیں کر پاتا تھا، سو اس نے مجھے آسکر ہی کہا۔

ہم نے آپس میں گفتگو کی، جس کی ابتدا کرنے میں خاصی مشکل ہوئی تھی، اور ہم نے خود کو تفریحی موضوعات تک ہی محدود رکھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا وہ مقدر پر یقین رکھتا ہے؟ وہ یقین رکھتا تھا۔ کیا اسے یقین تھا ایک دن ہر ایک کو مرجانا ہے؟ ہاں، اسے یقین تھا کہ ایک دن تمام آدمیوں کو مرنا ہوگا، مگر اس بات پر کم یقین تھا کہ تمام آدمیوں کو پیدا ہونا پڑتا ہے۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ وہ خود بھی غلطی سے پیدا ہو گیا ہے؛ اور ایک بار پھر آسکر کو اس سے قرابت داری محسوس ہوئی۔ ہم دونوں جنت پر یقین رکھتے تھے، مگر جب وہ "جنت" کا لفظ منہ سے نکالتا تھا تو بڑی ناگوار ہنسی ہنستا اور بستر کے اندر کہیں خود کو کھجانے لگتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کلیپ، یہیں اور اسی وقت، مبتذل منصوبے تیار کر رہا تھا جن کو جنت میں پورا کرے گا۔ جب سیاست کی بات نکلی تو وہ تقریباً جذباتی ہو گیا؛ اس نے تین سو سے زیادہ جرمن اشراف کے نام گنانے شروع کر دیے، وہ جن کے حوالے پورا جرمنی کر دینا چاہتا تھا، سوائے 'ہینوور' کی جاگیر کے، جسے کلیپ نے نہایت فیاضی سے برطانیہ کی سلطنت کو سونپ دیا تھا۔ جب میں نے پوچھا کہ سابق آزاد شہر وتشینگ پر کون حکومت کرے گا، تو اس نے کہا کہ اسے افسوس ہے کہ اس نے یہ نام کبھی سنا ہی نہیں، پھر بھی اس نے مجھ کو 'برگ' کی نوابیوں میں سے ایک نوابی پیش کر دی تھی، اور وہ مجھے یقین دلا رہا تھا کہ وہ تقریباً براہ راست جان ولیم کا وارث ہے۔ آخر میں— ہم سچائی کے تصور کو واضح کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس ضمن میں آگے بڑھ رہے تھے— کچھ شاطرانہ طور پر کیے گئے سوالات سے میں نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ کلیپ پچھلے تین برس سے زائیڈلر کا کرایے دار تھا۔ ہم نے

پہلے نہ ملنے پر اظہار افسوس کیا۔ میں نے کہا کہ یہ خار پشت کی غلطی تھی، جس نے اپنے صاحب فراش کرایے دار کے بارے میں کافی نہیں بتایا تھا، اسی طرح، جیسے اس نے کبھی بسمر ڈورو تھیا کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، سوائے اس کے کہ دھندلے شیشے والے دروازے کے عقب میں ایک نرس رہتی ہے۔

آسکر، مسٹر منتشر پر ابتدا ہی سے اپنی پریشانیوں کا بوجھ ڈالنا شروع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے نرس کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ اس کے بجائے خود اس کے بارے میں پوچھا، ''نرس کی مناسبت سے بات چلی ہے تو۔'' میں نے کہا، ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کچھ بیمار ہو؟'' ایک بار پھر کلیپ نے اپنے جسم کو ایک ڈگری کے قریب بلند کیا، مگر جب اس پر یہ واضح ہو گیا کہ وہ زاویہ قائمہ تک کبھی اُٹھ نہیں سکے گا، تو واپس لیٹ گیا اور اپنے صاحب فراش ہونے کی صحیح وجہ کا اعتراف کیا: وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آیا اس کی صحت اچھی، درمیانی درجے کی یا بہت خراب تھی۔ اسے اس ولاسے کی امید تھی کہ وہ درمیانے درجے میں آ رہی تھی۔ اور پھر وہی ہوا— وہی، جس کا مجھے ڈر تھا، مگر مجھے امید تھی کہ وہ ایک طویل اور شاخ در شاخ پھیلنے والی گفتگو سے احتراز کرے گا۔ ''ارے جناب! کیا آپ کچھ اسپاگیٹی کھانا پسند کریں گے؟'' میرے پاس کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ ہم کو میرے لائے ہوئے تازہ پانی میں پکائی اسپاگیٹی زہر مار کرنی پڑی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اسپاگیٹی پکانے والے برتن کی sink میں رکھ کر اچھی طرح صفائی کرتا، مگر میں اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نکالنا نہیں چاہ رہا تھا۔ کلیپ نے کروٹ لی اور خاموشی سے، کسی خواب خرام کی جیسی محتاط حرکات کے ساتھ اپنی طباخی کی طرف توجہ دی۔ جب اسپاگیٹی پوری طرح پک گئی تو اس نے اس کو ایک بڑے سے خالی ڈبے میں چھانا، پھر، اپنے جسم کی پوزیشن کو بظاہر بدلے بغیر ہی، اپنے بستر کے نیچے ہاتھ ڈالا اور ٹماٹر کی اُبدی اور چکنائی سے تہہ بہ تہہ بھری پلیٹ نکالی۔ پھر ایک لمحے کے ظاہری پس و پیش کے بعد ایک بار پھر بستر کے نیچے ہاتھ ڈالا اور اخبار کا ایک گٹھا کھینچ کر نکالا، اس سے پلیٹ کو صاف کیا، اور کاغذ کو واپس بستر کے نیچے ڈال دیا۔ پھر اس نے پلیٹ پر اپنے منہ کی بھاپ ڈالی اس طرح گویا وہ گرد کا آخری ذرہ

بھی اُڑا دینا چاہتا ہو، اور آخر میں نہایت شریفانہ انداز میں مجھے وہ نہایت کریہہ ڈش پیش کی، جیسی نہ میں نے کبھی دیکھی تھی اور نہ کبھی آسکر کو کھانے کے لیے پیش کی گئی تھی۔

میں نے کہا، پہلے آپ! مگر وہ تو کامل میزبان تھا، وہ کب ماننے والا تھا۔ مجھے چمچہ کانٹا پیش کرنے کے بعد، جن میں اتنی چکنائی لگی ہوئی تھی کہ وہ میری انگلیوں میں چپک سے گئے، اس نے میری پلیٹ پر اسپاگیٹی کا ڈھیر لگا دیا۔ اس پر، اپنے مزید شریفانہ انداز میں، اس نے میری پلیٹ پر ایک لمبے کیڑے جیسی ٹماٹر کی لُبدی بھی نکال دی، جس کو اپنی مشاق حرکات سے ایک سجاوٹی لکیر میں تبدیل کر دیا۔ اس نے خود پکانے والے برتن میں کھایا تھا۔ اس نے اپنی خوراک پر خود ہی ٹماٹر کی لُبدی اور تیل ڈالا، دونوں خوراک پر سیاہ مرچ بھی چھڑکی، اس کو ملایا بھی، اور مجھے بھی اسی طرح ملانے کا مشورہ دیا تھا۔ ''ارے جناب!'' جب سب کچھ ہو چکا تو بولا، ''معاف کیجیے گا، میں پارمیزان چھڑکنا تو بھول ہی گیا تھا۔ پھر بھی، امید ہے کہ آپ کو مزہ آیا ہوگا۔''

میں آج تک سمجھ نہیں پایا ہوں کہ اس کو ایسا گندا چمچہ کانٹا پیش کرنے کی ہمت کیسے ہوئی تھی۔ حیرت کی بات ہے کہ مجھے اسپاگیٹی کھانے میں لطف آیا تھا۔ دراصل کلیپ کی اسپاگیٹی میرے لیے عمل طباخی کی مثال بن گئی تھی اور اس کے بعد سے، میں ہر مینو کا اسی سے موازنہ کرتا ہوں، جو میرے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

اس دعوت کے بعد، میں نے نظر بچا کر اس صاحب فراش آدمی کے کمرے کا جائزہ لیا۔ سب سے زیادہ دل چسپی کی چیز، سقف کے بالکل نیچے، کھلی ہوئی چمنی تھی، جس کے ذریعے پورے کمرے میں ایک سیاہ سانس جیسی کیفیت پھیلی ہوئی تھی۔ دو عدد کھڑکیاں تھیں اور باہر تیز ہوا تھی۔ بظاہر وہ تیز ہوا تھی جو چمنی کے سوراخ کے ذریعے پورے کمرے میں دھوئیں کی کالک کے جھٹکے پہنچا رہی تھی اور سیاہ رنگ کی گرد فرنیچر پر جمع ہو رہی تھی۔ چوں کہ فرنیچر کمرے کے درمیان رکھے ہوئے پلنگ اور تہ کی لپٹے ہوئے قالین پر مشتمل تھا، بہت احتیاط کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ کمرے کی کوئی شے بستر کی چادر، سر کے نیچے تکیے کے غلاف اور تولیے سے ــــ جس سے کلیپ ہمیشہ اپنا منہ ڈھانپ لیتا تھا جب ہوا کے جھکڑ کمرے میں

سیاہی کے بادل ڈھکیل دیتے تھے ـــ زیادہ کائی نہیں تھی جو کبھی سفید رہی ہوگی۔

دونوں کھڑکیاں، زائیڈلر کی بیٹھک کی طرح، 'جوبگر اشتراسے' کی طرف کھلتی تھیں، جہاں گھر کے بالکل سامنے، سبز پتیوں والے صنوبر کے درخت ایستادہ تھے۔ کمرے میں ایک ہی تصویر تھی، انگلستان کی ملکہ الزبتھ کی رنگین تصویر، جو شاید کسی ہفتہ وار تصویری رسالے سے کاٹ کر لگائی گئی تھی۔ تصویر کے نیچے ہُک پر چمڑے کے تھیلوں والا ایک بین باجا بھی ٹنگا ہوا تھا، سیاہی جمع ہونے کے باوجود جس کی چمک دیکھی جا سکتی تھی۔ ایلزبتھ اور فلپ کی رنگین تصویر دیکھتے وقت میرے ذہن میں بے چاری مسٹر ڈوروتھیا کا خیال آرہا تھا جو آسکر اور ڈاکٹر ورنر کے درمیان بٹی ہوئی تھی، کلیپ مجھے بتا رہا تھا کہ وہ برطانوی شاہی خاندان کا بہت وفادار حمایتی ہے، اسی لیے اس نے برطانیہ کی قابض فوج کی اسکاٹش رجمنٹ کے بین باجا بجانے والوں سے بین بجانے کی تربیت بھی لی تھی۔ اتفاق دیکھیے کہ ملکہ برطانیہ اس رجمنٹ کی کرنل بھی تھی، شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے اسی رجمنٹ کے بین بجانے والوں سے بین بجانا سیکھنا چاہا تھا؛ کلیپ نے ملکہ کو نیوز ریل میں، کلاٹ پہنے، رجمنٹ کا معائنہ کرتے دیکھا تھا۔

حیرت کی بات ہے کہ اس مقام پر میرے اندر کے کیتھلک نے انگڑائی لینی شروع کی۔ میں نے کہا تھا کہ مجھے شبہ ہے کی الزبتھ بین باجے کی موسیقی سے واقف ہوگی، اور پھر میں نے دو چار جملے کیتھلک میری اسٹیورٹ کی غیر منصفانہ اور ظالمانہ سزائے موت کے بارے میں بھی کہہ دیے اور مختصراً کلیپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی تھی کہ میرے خیال میں ایلزبتھ پتھر جیسی بہری تھی۔

مجھے شاہی پرست کلیپ سے پھٹ پڑنے کی توقع تھی مگر وہ اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے وہ بلند درجے کا علم رکھتا ہو، اور مجھ سے اس کی تشریح طلب کی، کیا ایسی کوئی بنیاد ہے جس سے معلوم ہو کہ میں موسیقی کا بڑا ماہر ہوں۔

کافی دیر تک آسکر کلیپ کو گھورتا رہا۔ نا دانستہ طور پر اس نے میرے اندر ایک چنگاری بھڑکا دی تھی، اور سر سے نکل کر وہ چنگاری میرے کوب تک پہنچ گئی۔ یہ کچھ اس طرح تھا گویا میرے تمام پرانے، خستہ اور تھکے ہوئے نقاروں نے خود ہی اپنے آخری فیصلے کا جشن

منانے کا فیصلہ کر لیا ہو۔ وہ تمام ہزاروں نقارے جو میں نے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیے تھے، اور وہ ایک نقارہ جو 'ساسپے' کے قبرستان میں مدفون تھا، سب ایک ساتھ، پھر سے پیدا ہو گئے تھے؛ اور ان کی گونج میرے پورے وجود میں سما گئی تھی۔ میں بستر سے اُچھلا، کلیپ سے ایک لمحے کی معافی کی درخواست کی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ بستر ڈوروتھیا کے دھندلے شیشے والے نصف دروازے کے باہر اب بھی وہ نصف لفافہ نکلا ہوا تھا؛ میں دوڑ کر اپنے کمرے میں گیا، جہاں میرا سامنا اس نقارے سے ہوا جو مجھے راشکول نیکوف نے دیا تھا، جب وہ اپنی پینٹنگ "Madonna 49." بنا رہا تھا۔ میں نے نقارہ اور دو چوب اٹھائیں اور کمرے سے باہر نکل گیا، ممنوع کمرے کے پاس سے گزرا اور اُس کے اسپاگیٹی باورچی خانے میں اس طرح داخل ہوا جیسے کوئی مسافر طویل آوارہ گردی کے بعد واپس آ رہا ہو۔ میں پلنگ کے کنارے بیٹھ گیا اور بغیر کہے میں نے اپنا سرخ وسفید پالش شدہ سلنڈر استعمال کے لیے تیار کیا۔ میں پہلے ذرا جھجکا پھر ایک لمحے کے لیے چوب نقارہ کو یوں ہی ہوا میں حرکت دی۔ پھر ششدر کلیپ سے پرے دیکھتے ہوئے، میں نے ایک چوب کو نقارے پر گر جانے دیا گویا یہ واقعہ بے ارادہ ہو گیا تھا، اور پھر نقارہ آسکر کو جواب دینے لگا اور آسکر چوب نقارہ کو استعمال کرنے لگا تھا۔ میں نے نقارہ بجانا شروع کر دیا اور سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا: ابتدا سے ابتدا ہو رہی تھی۔ میری پیدائش کے لمحے بجلی کے دو بلب کے درمیان ایک پتنگا نقارہ بجا رہا تھا؛ میں نے تہہ خانے کے سولہ زینوں اور تیسری سالگرہ کی تقریب پر اور سیڑھیوں سے گرنے کا نقارہ بجایا؛ میں نے پیستالوتسی اسکول کے نظامِ اوقات کا نقارہ بجایا، میں نقارے کے ساتھ 'اسٹاک ٹرم' پر چڑھا، اس کے ساتھ سیاسی روسٹرموں کے نیچے، بام مچھلیوں اور سمندری پرندوں پر اور گڈ فرائیڈے پر قالین کی پٹائی کا نقارہ بجایا۔ نقارہ نوازی کرتے ہوئے میں اپنی ممّا کے تابوت کے پائیں مخروطی حصے پر بیٹھا؛ میں نے ہربرٹ ٹروزنسکی کی نشانوں والی پیٹھ کی داستان پر نقارہ بجایا۔ اور جب میں پولش ڈاک خانے کے دفاع کے وقت باہر نقارہ بجا رہا تھا، میں نے بہت دور ایک حرکت دیکھی تھی؛ جب میں بستر کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا: نصف آنکھ کھولے، میں نے کلیپ کو بیٹھے، اپنے تکیے کے نیچے سے

ایک بعید از قیاس بانسری نکالتے، اس کو اپنے ہونٹوں پہ لگاتے، اور آوازیں نکالتے دیکھا تھا جو اتنی میٹھی اور غیر فطری، میری نقارہ نوازی سے اتنی ہم آہنگ تھی کہ میں کلیپ کی 'ساپیے' کے قبرستان میں رہنمائی کے قابل ہو گیا تھا اور، جب لیو شنگر اپنا رقص ختم کر چکا تو کلیپ نے میرا پہلا محبت بھرا جھاگ پیدا کرنے والا فوری پاؤڈر بنانے میں میری مدد کی تھی، میں نے کلیپ کی لینا کے جنگلوں میں رہنمائی بھی کی تھی؛ میں نے 165 پاؤنڈ کے پاسنگ والی گریف کی بنائی نقارہ نوازی کی مشین کے آخری کھیل میں بھی اس کی رہنمائی کی تھی؛ میں نے محاذ پر بیبرا کے تھیٹر میں کلیپ کا خیر مقدم کیا تھا، یسوع کو بولنے پر تیار کیا تھا، اور اِسٹورٹی بیکر اور اس کے گرد جھاڑنے والے ساتھیوں کے غوطہ لگانے والے مینار سے کودنے، اور نیچے بیٹھی لوسی پر نقارہ بجایا تھا۔ میں نے روسیوں اور چیونٹیوں کو اپنے نقارے کا قبضہ لینے دیا تھا، مگر میں نے کلیپ کی 'ساپیے' قبرستان میں واپسی کی رہنمائی نہیں کی تھی، جہاں میں نے اپنا نقارہ ماتسیرات کی قبر کے اندر پھینک دیا تھا، مگر اپنی مرکزی، کبھی نہ رُکنے والی دھن بجائی تھی: ،اکتوبر کی بارش میں کشوبیائی آلو کے کھیت میں نانی اناں اپنے چار لہنگوں سمیت دور بیٹھی تھی اور آسکر کا دل پتھر کا ہو گیا تھا جب میں نے سنا کہ کلیپ کی بانسری سے قطرہ قطرہ اکتوبر کی بارش ٹپک رہی تھی، جب، چار لہنگوں اور بارش کے نیچے، کلیپ کی بانسری نے آتش زن کو واپچکی کو تلاش کر لیا اور جشن منایا تھا، نہیں، میری مما کی ابتدا کی نمائندگی کی تھی۔

ہم گھنٹوں اپنا کھیل کھیلتے رہے۔ پانی پر تیرتے لکڑی کے تختوں کے ذریعے میرے نانا کے فرار پر کئی دھن بجانے کے بعد، خوش مگر تھکے ہوئے، ایک مناجات کے ساتھ، امید کے گیت کے ساتھ، یہ سمجھتے ہوئے کہ شاید غائب آتش زن معجزانہ طور پر بچا لیا گیا تھا، ہم نے اپنا کنسرٹ ختم کر دیا تھا۔

قبل اس کے کہ آخری سُر اس کی بانسری سے نکلتا، کلیپ اُچھل کر اپنے نرم گرم بستر سے باہر نکلا۔ مُردہ جسموں جیسی مہک اس کے پیچھے پیچھے چلی، مگر اس نے کھڑکیوں کو توڑ کر کھول دیا، چمنی کے سوراخ میں اخبار کا گٹھا ٹھونس دیا، ایلزبتھ کی تصویر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالی اور اعلان کیا کہ شاہی عہد ختم ہو گیا ہے، واش بیسن میں پانی بہایا اور اپنے جسم کو بھی دھویا؛ جی ہاں۔

کلیپ نے غسل کیا، کہ اس کے پاس ایسی کوئی شے نہیں تھی جو بہہ جاتی۔ یہ محض دھلائی ہی نہیں تھی، یہ تطہیر کا عمل تھا۔ اور جب وہ تطہیر شدہ پانی ٹپکاتا غسل خانے سے نکلا اور اپنے فربہ، برہنہ جسم کے ساتھ میرے سامنے کھڑا ہوا تو اس کے تر چھے، لٹکے ہوئے، توانائی سے لبریز، بے ہنگم عضوِ مخصوص نے مجھے اکسایا، ہوا نے مجھے بلند کر دیا— اس لیے کہ آسکر اب بھی ہلکے وزن کا تھا— اور جب اس کا بلند ہونے والا قہقہہ چھت سے جا ٹکرایا، تو میں سمجھ گیا تھا کہ آسکر کا نقارہ مرنے کے بعد زندہ ہونے والا تنہا نہیں تھا، اس لیے کہ کلیپ کو بھی نئی زندگی مل گئی تھی۔ اور پھر دونوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور رخسار کا بوسہ لیا۔

اسی دن شام کے قریب— ہم باہر گئے، بیئر پی اور پیاز کے ساتھ خون سے بنا ساسیج کھایا— کلیپ نے مشورہ دیا کہ ہم مل کر جاز کا ایک بینڈ بنائیں۔ میں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا، مگر آسکر طے کر چکا تھا کہ وہ اپنی ماڈلنگ اور سنگ تراشی چھوڑ دے گا اور جاز بینڈ کا percussion man بن جائے گا۔

# ریشہ بردار قالین پر

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس دن جس کا ابھی تذکرہ کیا گیا ہے، آسکر نے کلیپ کو بستر سے نکل پڑنے کا جواز مہیا کر دیا تھا۔ وہ بے حد خوش اُچھل کر اپنے بدبو دار بستر سے نکل پڑا تھا؛ ایک عرصے بعد غسل کیا تھا؛ اب وہ ایک نیا آدمی ہے، جو کہتا ہے Terrific اور The world is my oyster۔ اور آج بھی، جب کہ آسکر جس کو بستر میں لیٹے رہنے کا حق حاصل ہے، میں سوچ رہا ہوں، کلیپ میرے برامد ہونے کی کوشش کر رہا ہے، وہ مجھے اس دماغ کے اسپتال کے بستر سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے، اس لیے کہ میں نے اس کو اسپاگیٹی یا ورچی خانے کے بستر کو چھوڑ دینے کے قابل بنایا ہے۔

ہفتے میں ایک بار مجھے ملاقاتیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے، جاز اور موسیقی زدہ اشتراکی منشور کے بارے میں اس کی دھواں دھار تقریریں سننی پڑتی ہیں، اس لیے کہ جوں ہی میں نے اسے اس کے بستر اور بین باجوں والی البلز بتھ سے محروم کیا — جو جب تک بستر میں لیٹا تھا شاہی پرست تھا اور اس کے دل وجان انگلستان کے شاہی خاندان کے لیے وقف تھے — وہ کمیونسٹ پارٹی کا چندہ دینے والا رکن بن گیا تھا، اشتراکیت ہمیشہ سے اس کا غیر قانونی شغل تھا۔ بیئر پیا، خون سے بنے ساسیج کھانا ان بے ضرر چھوٹے آدمیوں کے باعث تھا جو بار پر کھڑے ہوتے ہیں، بوتلوں پر لگے لیبل کا، جاز بینڈ کی کل وقتی اجتماعی کارکردگی کا یا سوویت اجتماعی زرعی فارموں کا معائنہ کرتے ہیں۔

ہمارے اس دور میں ایک با بصیرت خواب خرام کی بالکل گنجائش نہیں۔ اپنے پناہ نواز بستر سے اجنبی ہو جانے کے بعد، کلیپ کے پاس کامریڈ بننے کا امکان تھا اور وہ بھی غیر قانونی طریقے سے، جس نے اس کی دل فریبی میں اضافہ کردیا۔ جاز اس کے لیے دوسرے مذہب جیسا تھا۔ مزید یہ کہ پیدائشی پروٹسٹنٹ کلیپ مذہب بدل کر کیتھولک بن سکتا تھا: آپ کو ماننا پڑے گا کہ کلیپ چالاک آدمی ہے۔ اس نے ہر مذہب کی طرف جانے والا راستہ کھلا رکھا تھا۔ احتیاط، اس کا وزنی دمکتا ہوا گوشت ہے، اور اس کی حسِ مزاح نے جو تالیوں پر زندہ رہتی ہے اس کو مارکس کی تعلیمات اور جاز کے پُراسراریت کے اتصال سے ایک خفیہ نظام تیار کرنے کے قابل بنا دیا ہے۔ اگر کوئی بائیں بازو کے مزدور قسم کا پادری اپنا مذہب تبدیل کر لیتا ہے، اور اگر اس کے پاس Dixieland کے ریکارڈوں کا ذخیرہ ہے، تو آپ دیکھیں گے کہ مارکسی جاز کا پروانہ اتوار کو شعائرِ مقدسہ لے کر جائے گا اور اپنے جسم کی مہک کو کسی نیو گوتھک گرجا گھر کی خوش بو سے ملا دے گا۔

میرے اور اس قسم کے مقدر کے درمیان کی آڑ میرا پلنگ ہے، دھڑکتے، زندگی سے پیار کرنے والے وعدوں کے ذریعے کلیپ جس سے مجھے نکلوانے کی کوشش میں رہتا ہے۔ وہ عدالت کو ایک عرض داشت کے بعد دوسری عرض داشت بھجواتا رہتا ہے اور میرے وکیل سے مل کر نئے سرے سے مقدمہ شروع کرانے کے لیے ساز باز کرتا رہتا ہے: وہ چاہتا ہے آسکر بری ہو جائے اور آزاد کردیا جائے—وہ چاہتا ہے کہ مجھے اسپتال سے نکال دیا جائے— مگر کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ مجھ سے اور میرے بستر سے حسد رکھتا ہے۔

پھر بھی، مجھے بالکل افسوس نہیں کہ زائیڈلر کے فلیٹ میں رہائش کے دوران، میں نے ایک صاحبِ فراش دوست کی، ایک ایستادہ، دھم دھم چلتے، بلکہ کبھی کبھی دوڑتے دوست میں قلبِ ماہیت کردی ہے۔ عرق ریز خیالات والے وقت کے علاوہ، جو میں نے سسٹر ڈوروتھیا پر لگا دیا تھا، اب میری اپنی ایک بے فکر زندگی ہے۔ "سن یار کلیپ!" میں اس کے کندھے پر دھپ لگا کر کہتا، "اس جاز بینڈ کا کیا بنا؟" اور وہ میرے کوب کو سہلانے لگتا، جس کو اپنے پیٹ کی طرح عزیز رکھتا ہے۔ "آسکر اور میں" اس نے دنیا کے

سامنے اعلان کیا، ''ہم ایک جاز بینڈ بنانے جا رہے ہیں۔ ہمیں صرف ایک اچھا گٹار بجانے والا چاہیے، ایسا جو، اگر کبھی ضرورت پڑ جائے تو بینجو بھی بجا سکے۔''

اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نقارہ اور بانسری ہی کافی نہیں ہو سکتے۔ ایک اور غنائی ساز کی ضرورت تھی۔ ایک خستہ bass گٹار سے بھی کام چل جاتا؛ اور دکھانے کے لیے بھی تو کچھ ہونا چاہیے، مگر اس کے باوجود bass گٹار بجانے والے بھی تو مشکل سے ملتے ہیں۔ تو بس ہم شد و مد سے ایک گٹار بجانے والے کی تلاش میں لگ گئے۔ ہم فلم دیکھنے جاتے، اگر تمھیں یاد ہے تو، ہم ہفتے میں دو بار تصویریں بنواتے، بیئر پیتے، خون کی ساسیج اور پیاز کھاتے، اپنی پاسپورٹ کی تصویروں سے احمقانہ حرکتیں کرتے۔ وہی وقت تھا، جب کلیپ اپنی سرخ بالوں والی اِلسے سے ملا تھا اور بغیر سوچے سمجھے اس کو اپنی تصویر دے دی تھی اور صرف اسی کی وجہ سے اس سے شادی کرنی پڑی تھی مگر ہمیں گٹار بجانے والا نہیں ملا۔

ماڈل کی حیثیت میں، مجھے 'ڈوسلڈارف' کے پرانے شہر، اس کی نشانہ بننے والی کھڑکیوں کے شیشوں، اس کی سرسوں اور پنیر، اس کی بیئر کی مہک اور زیرین رھائنی سکون کے بارے میں کچھ معلومات تھیں، مگر صرف کلیپ ہی ان سے اچھی آگاہی رکھتا تھا۔ ہم نے 'سینٹ لیمبرٹس چرچ' کے اطراف، ہر شراب خانے میں، اور بالخصوص 'راٹنگر اشتراسے' میں، یونی کارن وغیرہ میں گٹار بجانے والے کی تلاش کی تھی، اس لیے کہ بابی، جو رقص گاہ کے بینڈ کا سربراہ تھا، کبھی کبھی ہمارے ساتھ بانسری اور کھلونے نقارے میں شریک ہوتا تھا، جو باوجود دائیں ہاتھ کی غائب انگلی کے percussion man کی حیثیت میں بھی بے ہنگم نہیں تھا۔ یونی کارن میں بھی ہمیں کوئی گٹار نواز تو نہیں ملا، مگر مجھے خاصی مشق ضرور ہو گئی تھی۔ جنگ کے زمانے میں تھیٹر کے میرے تجربے کے ساتھ بھی مجھے کیا حاصل ہوتا جو مجھے تیزی سے اس زمانے کی لہروں میں واپس لے جاتا، اگر مجھے سسٹر ڈوروتھیا نہ ملی ہوتی، جو اکثر میرا نشانہ خطا کر دیتی ہے۔

میرے نصف خیالات اس لڑکی ہی کے ساتھ تھے۔ اگر میں نے صرف نقارے پر اکتفا کی ہوتی تو معاملات ٹھیک رہتے، مگر یہ ہوا کہ میرے خیالات نقارے سے شروع ہو کر سسٹر ڈوروتھیا کی ریڈ کراس وضع پر ختم ہو گئے۔ کلیپ بانسری کے بارے میں میری

خرابیاں دور کرنے میں ماہر نکلا؛ مگر وہ آسکر کو اپنے خیالات میں نصف غرق دیکھ کر پریشان ہو جاتا تھا، "کیا تم بھوکے ہو؟ اچھا، میں کچھ ساسیج منگاتا ہوں۔"

اس دنیا کے تمام غموں کے عقب میں کلیپ کو ایک حریص بھوک نظر آ رہی تھی؛ اسے یقین تھا کہ اس کا علاج خون سے بنی ساسیج کے ایک ٹکڑے سے ہو سکتا ہے۔ کلیپ کو یہ سمجھانے کے لیے کہ اس کے غموں کا نام بھوک ہے، بستر ڈورو تھیا نہیں، آسکر کو کتنی مقدار میں تازہ خون کی ساسیج اور پیاز کے تلے ہوئے لچھے بیئر کے ذریعے حلق کے نیچے اتارنے پڑے تھے۔

ہمیشہ کی طرح ہم زائیڈلر کے فلیٹ سے سویرے ہی نکل گئے اور ناشتا پرانے شہر میں کیا تھا۔ اب میں اکادمی اسی وقت جاتا تھا جب ہمیں فلم دیکھنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی۔ میوز اُلا، جو اس دوران تیسری یا چوتھی بار لانکیز سے منگنی کر چکی تھی، مل نہیں سکتی تھی، اس لیے کہ لانکیز کو پہلی بار اہم صنعتی ذمے داریاں سونپی جانے والی تھیں، مگر آسکر اُلا کے بغیر ماڈلنگ کرنے پر راضی نہیں تھا، اس لیے کہ جب میں اکیلا ماڈلنگ کرتا تو وہ مجھے بڑی بھیانک صورت میں، اور سیاہ ترین رنگوں میں پیش کرتے تھے۔ اس لیے میں اب پوری طرح اپنے دوست کلیپ کے ساتھ تھا۔ میں ماریا اور ننھے کرٹ سے ملنے جا سکتا تھا، مگر ان کے فلیٹ میں مجھے سکون نہیں ملتا۔ اس کا افسر اور عاشق شوہر مسٹر اسٹنبل ہمیشہ وہاں موجود ہوتا تھا۔

ایک دن 1949 کی خزاں کی ابتدا میں کلیپ اور میں اپنے کمروں سے نکل کر راہداری میں ملے، دھندلے شیشے والے دروازے سے زیادہ دور نہیں۔ ہم اپنے سازوں کے ساتھ فلیٹ سے جانے والے تھے کہ زائیڈلر نے کھناک سے اپنی بیٹھک کا دروازہ کھولا اور ہم کو اندر آنے کی دعوت دی۔

وہ گول لپیٹا ہوا ایک بھاری، ناریل کے ریشوں کا، قالین اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا، جس کو راہداری میں رنر (runner) کی طرح بچھانا چاہتا تھا۔ یہ رنر اٹھائیس فٹ لمبا تھا، جب کہ راہداری کی لمبائی پچیس فٹ سات انچ تھی؛ کلیپ اور مجھ کو اس کا زائد حصہ کاٹ کر نکال دینا تھا۔ یہ کام ہم نے بیٹھ کر کیا، اس لیے کہ ناریل کے ریشوں سے بنا قالین

کاٹنا محنت مانگتا ہے۔ہم فارغ ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ رَفَر تقریباً ایک انچ چھوٹا رہ گیا تھا، حالاں کی چوڑائی بالکل ٹھیک تھی۔ اس کے بعد زائیڈلر نے، جس نے ہمیں بتایا تھا کہ جھکنے میں اسے تکلیف ہوتی ہے، ہم سے رَفَر میں کیلیں لگانے کے لیے کہا۔کیل لگانے کے دوران آسکر نے سوچا، کیوں نہ اس کو کھینچ کر بڑھادیا جائے؛ اس طرح ہم خلا کو بھرنے میں یا تقریباً بھرنے میں کامیاب ہو گئے۔ہم نے بڑے اور مسطح سروالی کیلیں استعمال کیں، اس لیے کہ کھردری بُنت کے رَفَر میں چھوٹے سروالی کیلوں کی گرفت کام نہیں کرتی۔ آسکر اور کلیپ دونوں کے انگوٹھے ہتھوڑی سے محفوظ رہے، مگر کچھ کیلیں ٹیڑھی ضرور ہو گئی تھیں، مگر اس میں ہماری غلطی نہیں تھی، کیلوں کا معیار خراب تھا، مگر اس وقت زائیڈلر کے ذخیرے میں یہی موجود تھیں اور نظامِ زر کی اصلاحات کے پہلے کی بنی ہوئی تھیں۔ جب رَفَر آدھا لگایا جا چکا، تو ہم نے اپنی ہتھوڑیاں چلیپائی انداز میں تلے اوپر رکھ دیں، اور خارپُشت کی طرف نظر کی، جو ہمارے کام کی نگرانی کر رہا تھا، ایسی نظر سے جو گستاخی سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر رہی تھی مگر تمنائی ضرور تھی۔وہ کمرے میں گیا اور اپنے مشہور برانڈی کے گلاسوں میں سے تین عدد گلاس اور اشنیپ کی ایک بوتل لیے واپس آیا۔ہم نے قالین کی دیر پائی کا جام پیا؛ پہلا جام انڈیلنے کے بعد ہم نے کہا— اس بار بھی ہمارا لہجہ مطالبے کا نہیں محض تمنا کا تھا— ناریل کا ریشہ انسان کی پیاس بڑھادیتا ہے۔مجھے یقین ہے کہ برانڈی کے یہ گلاس خارپُشت کی برہم مزاجی کے باعث ریزہ ریزہ ہونے سے پہلے، ایک وقت میں کئی بار اشنیپ سے پُر ہونے کے موقعے پا کر خوش ضرور ہوئے ہوں گے۔کلیپ کے ہاتھوں سے چھوٹ کر ایک خالی گلاس قالین پر گرا تو ٹوٹا نہیں، اس سے آواز بھی نہیں آئی۔ ہم سب نے قالین کے گیت گائے۔ جب مسز زائیڈلر بھی، جو اپنے کمرے سے ہمارا کام دیکھ رہی تھی، قالین کے گیت گانے میں شامل ہوئی تو خارپُشت غصے سے بھڑک اُٹھا۔اس نے قالین کے اس حصے پر زور سے قدم رکھا جس پر کیل نہیں لگی تھی، تین خالی گلاس اُٹھائے اور اپنے کمرے میں غائب ہو گیا۔چینی کے برتن کی الماری کھڑکھڑائی— تین گلاس کافی نہیں تھے اور وہ مزید گلاس نکال رہا تھا— اور ایک لمحے بعد آسکر کو آشنا موسیقی سنائی دی؛ اس کے تصور کی آنکھ میں زائیڈلر کا

ٹانگوں والا چولھا ابھرا، اُس کے لوہے کے ڈھلے دروازے کی نیچے برانڈی کے تین گلاس ٹوٹے پڑے تھے، خاک دان اور برش کے لیے جھکا زائیڈلر ٹوٹے گلاسوں کے ٹکڑے چن رہا تھا جو خارپشت کی وجہ سے ٹوٹے تھے۔ مسز زائیڈلر دروازے کے قریب کھڑی تھی جب گلاس چھن چھنائے اور اس کے پیچھے دھڑام سے گر پڑے تھے۔ وہ ہمارے کام میں دل چسپی لے رہی تھی؛ خارپشت کی برہم مزاجی کے دوران ہم نے پھر اپنی ہتھوڑیاں اُٹھالی تھیں۔ وہ واپس نہیں آیا، مگر اشنیپ کی بوتل چھوڑ گیا تھا۔ پہلے تو مسز زائیڈلر کی موجودگی نے ہمیں شرمندہ کیا اور جب ہم نے باری باری بوتل اپنے منہ سے لگائی تو اس نے سر ہلا کر دوستانہ رضامندی کا اظہار کیا، اس سے ہمیں اطمینان ہوگیا، مگر ہمیں خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ہم بوتل اس کی جانب بھی بڑھاتے اور گھونٹ کی پیش کش کرتے۔ پھر بھی، ہم نے اس کے باعث صاف ستھرا کام کیا تھا اور ہماری کیلیں قرینے سے برابر فاصلے پر لگائی گئی تھیں۔ جب آسکر بسسٹر ڈوروتھیا کے کمرے کے باہر ہتھوڑی چلا رہا تھا، ہر ضرب پر دھندلے شیشے کی کھڑکیاں کھڑ کھڑ کرتیں۔ اس سے وہ تیز ہوگیا، اتنا کہ ایک بار تو اس نے ہتھوڑی گر جانے دی تھی، مگر جب وہ شیشے کے دروازے کے آگے چلا گیا تو اسے اور اس کے ہتھوڑے کو اطمینان ہوگیا۔

ہر کام کبھی نہ کبھی ختم ہوتا ہے۔ اسی طرح ریشے والے رگر کا کام بھی اختتام کو پہنچا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک بڑے سر والی کیلیں، اپنے گلے تک فرش کے تختے میں گڑی ہوئی تھیں، صرف ان کے سر باریل کے لمبے گھنگریالے ریشوں سے اوپر تھے۔ اپنے کام سے مطمئن، قالین کی لمبائی کا لطف اٹھاتے، ہم راہداری میں آگے پیچھے کئی بار چلے، اپنے اچھے کام پر خود کو مبارک باد دی اور روا روی میں کہتے گئے کہ ناشتے سے پہلے خالی پیٹ قالین لگانا آسان نہیں ہوتا۔ بالآخر ہمارا مقصد حاصل ہوگیا۔ بالکل نئے، کنوارے رگر پر مسز زائیڈلر قدم رنجہ ہوئیں، باورچی خانے کی طرف چلیں، کافی بنائی اور کچھ انڈے تلے۔ ہم نے اپنے کمرے میں ناشتا کیا؛ مسز زائیڈلر ننھے ننھے قدم رکھتی چلی گئی کہ اب اس کے دفتر، مانس مان، جانے کا وقت ہوگیا تھا۔ ہم نے کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دیا، ناشتا کیا، اپنی محنت کا

ذائقہ چکھا اور ریشے والے زیر، کو ریشہ ورانہ انداز میں اپنی طرف رن (run) کرتے دیکھا۔
ایسے سستے قالین کی اتنی تعریف کیوں؟ جس کی نظامِ زر کی اصلاحات سے قبل یقینی طور پر محض مبادلے کی کچھ ہی قیمت رہی ہوگی؟ یہ سوال اپنی جگہ حق بجانب ہے۔ آسکر کی پیش بینی جواب دیتی ہے، یہی وہ ریشے والا زیر ہے جس پر آنے والی رات آسکر کی سسٹر ڈوروتھیا سے پہلے ملاقات ہوئی تھی۔

آدھی رات کا وقت رہا ہوگا جب میں خون کی ساسیج اور بیئر سے سیر گھر آیا تھا۔ میں نے کلیپ کو، گٹار نواز کی تلاش میں، پرانے شہر میں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے زائیڈلر کے فلیٹ کی کنجی کا سوراخ مل گیا، راہداری میں بچھا ریشے کا زیر مل گیا، اپنے کپڑے اُتارنے کے بعد اپنا بستر مل گیا، مگر مجھے اپنا پاجامہ نہیں ملا، وہ تو ماریا کی دھلائی کے انبار میں تھا؛ اس کے بجائے مجھے ریشے کے زیر کا فالتو ٹکڑا مل گیا، جو ہم نے کاٹ کر نکال دیا تھا، اس کو اپنے بستر کے پہلو میں بچھالیا، بستر میں داخل ہو گیا، مگر نیند نہیں ملی۔

ضروری نہیں کہ آپ کو ہر بات بتائی جائے جو آسکر نے سوچی تھی یا بے پروائی سے اس کے سر میں گھومی تھی، اس لیے کہ وہ سو نہیں سکا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آج مجھے میری بے خوابی کی وجہ معلوم ہو گئی ہے۔ بستر میں داخل ہونے سے پہلے میں ننگے پاؤں اپنے بستر کے پہلو میں پڑے نئے قالین کے ٹکڑے پر کھڑا ہوا تھا۔ ناریل کے ریشے میری ننگی جلد میں داخل ہو کر خون میں رینگ گئے تھے: بستر پر لیٹ جانے کے بہت بعد تک میں ساکن ناریل کے ریشوں پر کھڑا تھا، یہی وجہ ہے کہ میں سو نہیں سکا؛ اس لیے کہ ناریل کے ریشے کی چٹائی پر کھڑے ہونے کے مقابلے میں کوئی چیز زیادہ ہیجان خیز، زیادہ دافعِ خواب، زیادہ خیال انگیز نہیں ہوتی۔

نصف شب کے بعد، بہت دیر تک آسکر، ایک ہی وقت میں چٹائی پر ساکن کھڑا بھی تھا اور بستر میں لیٹا بھی تھا؛ تین بجنے کے قریب اسے ایک دروازے کی آواز سنائی دی اور پھر دوسرے دروازے کی۔ میں سمجھا کہ وہ کلیپ ہوگا، بغیر گٹار نواز، مگر خون کی ساسیج سے پُر؛ پھر بھی میں جانتا تھا کہ وہ کلیپ نہیں تھا جس نے پہلے ایک دروازہ کھولا، پھر دوسرا دروازہ۔ اس کے علاوہ، میں نے سوچا کہ جب تک تم بستر میں بے کار لیٹے ہو اور ناریل کے

ریشے تمھارے پیروں کے تلوے کاٹ رہے ہیں، تو بہتر ہے کہ تم، محض اپنے تصور میں نہیں، بلکہ جسمانی طور پر بستر سے نکلو اور بستر کے پہلو میں بچھی ریشے کی چٹائی پر کھڑے ہو جاؤ۔

آسکر نے یہی کیا۔ اس کے نتائج نکلے۔ جوں ہی میں نے چٹائی پر پیر رکھا، اس نے مجھے، میرے پاؤں کے تلووں کے ذریعے، اپنی اصلیت اور اپنی ابتدا یاد دلائی— راہداری میں بچھی پچیس فٹ چھ انچ طویل رنر کی۔ کیا یہ اس لیے ہوا تھا کہ میں کاٹے گئے ٹکڑے کے لیے افسردہ تھا؟ کیا یہ اس لیے تھا کہ میں نے راہداری کے دروازوں کی آوازیں سنی تھیں اور یقین نہیں، قیاس کیا تھا کہ وہ کلیپ تھا؟ بہر حال، آسکر، جسے بستر میں جاتے وقت اس کا پاجامہ نہیں ملا تھا اس وقت جھکا ہوا تھا، دونوں ہاتھوں میں چٹائی کا ایک ایک ٹکڑا پکڑے ہوئے تھا، اپنے پاؤں ایک طرف اس وقت تک بڑھائے کہ وہ چٹائی پر نہیں بلکہ فرش پر تھا اور تیس انچ کے اس ٹکڑے کو اپنے پیروں کے درمیان اور اپنے جسم کے سامنے کھینچا جو، جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے، چار فٹ ایک انچ کا تھا۔ اس کی بدہنگی نفاست سے ڈھک گئی تھی، مگر گھٹنوں سے ہنسلی کی ہڈی تک وہ ناریل کے ریشے کے رسوخ کی زد میں تھا اور یہ رسوخ زیادہ ہوا جب ریشوں کی اس بہیر کے پیچھے اس نے اپنا تاریک کمرہ راہداری کے لیے چھوڑ دیا، اور رنر پر اپنے پاؤں جما لیے تھے۔

کیا یہ کوئی تعجب کی بات تھی، اگر میں نے چھوٹے چھوٹے تیز قدم اٹھائے تھے، تاکہ میں اپنے پیروں کے نیچے کے ریشہ ورانہ رسوخ سے باہر نکل سکوں، کہ اگر میں اپنے بچاؤ اور تلاش کی کوشش میں وہاں پہنچ گیا جہاں فرش-ٹوائلٹ تھا؟ -پر ناریل کا ریشہ نہیں۔

یہ واقعہ اتنی ہی تاریکی [ٹوائلٹ] میں پیش آیا تھا، جیسے کہ راہداری یا آسکر کا کمرہ، جو بہر حال تصرف میں تھا، جیسا کہ ایک دبی نسوانی چیخ نے مجھ پر واضح کر دیا تھا۔ میرا ریشے کا نمدا کسی بیٹھے ہوئے انسان سے ٹکرایا۔ جب میں نے ٹوائلٹ چھوڑنے کے لیے کوئی حرکت نہیں کی— کہ میرے پیچھے ناریل کے ریشے نے مجھے دھمکی دی تھی— تو بیٹھے ہوئے انسان نے مجھے بے دخل کرنے کی کوشش کی۔

''کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟ چلے جاؤ یہاں سے!'' ایک آواز نے کہا تھا جو مسز

زائیڈ لر کی نہیں ہو سکتی تھی ۔ اس ''کون ہو تم؟'' میں ایک نوعیت کی شکایت تھی۔

''اوہ! اچھا، اچھا... بسسٹر ڈوروتھیا... یہ تم ہو — بوجھو... میں کون ہوں!'' میں نے چھیڑ خانی کی کوشش کی جو مجھے امید تھی کہ ہماری اس شرمندہ کر دینے والے حالات میں ملاقات سے اس کی توجہ ہٹا دے گی، مگر وہ بوجھنے کی کیفیت میں نہیں تھی۔ وہ کھڑی ہو گئی، اندھیرے کے عالم میں میری جانب بڑھی اور مجھے رزر پر دھکیلنے کی کوشش کی مگر اس کے ہاتھ بہت اوپر، میرے سر کے اوپر کے خلا میں تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ نیچے کرنے کی کوشش کی، مگر اس بار میں نہیں، میرا ریشہ والرنہ ایپرن، میرا اماریل کا نمدا تھا جو اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ ایک بار پھر وہ چیخی — افوہ! یہ عورتیں، ہمیشہ چیخنے کیوں لگتی ہیں؟ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا بسسٹر ڈوروتھیا میری جگہ کسی اور کو سمجھ بیٹھی تھی، اسی لیے کہ وہ لرزنے لگی تھی۔

''اوہ خدایا، یہ تو وہی شیطان ہے!''

میں اپنی ہنسی نہیں روک سکا، مگر یہ بد باطن شرارت نہیں تھی۔ اس نے بہرحال اس کو شیطانی ہنسی گردانا تھا۔ شیطان کا لفظ مجھے پسند نہیں تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے ایک بار پھر پوچھا۔

''میں ہوں... شیطان!... بسسٹر ڈوروتھیا سے ملنے آیا ہوں۔'' آسکر نے کہا۔

''اوہ خدایا... مگر کس لیے؟'' اس نے کہا۔

اب آہستہ آہستہ مجھے اپنے کردار میں اپنا کردار محسوس ہونے لگا تھا، اور شیطان میرا اُکسانے والا تھا۔

''اس لیے کہ شیطان بسسٹر ڈوروتھیا سے محبت کرتا ہے!''

''نہیں... نہیں... میں نہیں مان سکتی۔'' اس نے چیخ کر کہا۔

اس نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی مگر ایک بار پھر میرے نمدے کا شیطانی ریشہ سامنے آ گیا — اس کا نائٹ گاؤن بہت پتلے کپڑے کا رہا ہوگا۔ اس کی دسوں انگلیوں کو شیطانی ورغلاہٹ کا سامنا تھا اور وہ اچانک چکرانے لگی تھی۔ وہ چکرا کر آگے کی طرف گری؛ میں نے اس کو اپنے نمدے میں لے لیا، دیر تک سنبھالے رہا، اور اپنے شیطانی کردار میں کچھ

فیصلہ کرنے لگا تھا۔ میں آہستہ سے اسے اس کے گھٹنوں کے بل رکھ کر پکڑے رہا اور کوشش کی کہ وہ ٹوائلٹ کے ٹھنڈے ٹائلوں سے نہ لگیں، بلکہ راہداری میں بچھے ریشے کے قالین پر ٹک جائیں۔ پھر میں نے اس کو پیچھے کی طرف پھسل جانے دیا؛ اس کا سر مغرب کی جانب تھا، کلیپ کے دروازے کی طرف۔ اس کا پورا قد اب— جو اس کے اپنے مطابق کم از کم پانچ فٹ چار انچ رہا ہوگا— پیٹھ کے بل رِگر پر تھا؛ میں نے اس کو اسی ریشہ دار شے سے ڈھانک دیا، مگر میرے پاس صرف تیس انچ کا ٹکڑا تھا۔ پہلے میں نے اس کا اوپری سرا اس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا، مگر اس کا نیچے والا حصہ کھسک کر اس کے زانو پر آگیا تھا۔ مجھے اس ٹکڑے کو دو انچ کے برابر اور سرکانا پڑا تھا؛ مگر اب وہ اس کے منہ پر آگیا تھا، مگر اس کی ناک باہر تھی، اور وہ سانس لے سکتی تھی۔ وہ سانس لینے سے کچھ زیادہ ہی کر رہی تھی؛ اور جب آسکر نے اسے اس کی ساتھ چٹائی پر لٹایا، اور اس کے تمام ہزاروں ریشوں کو ارتعاش میں ڈال دیا، اس لیے کہ سسٹر ڈوروتھیا سے براہِ راست لمس کے بجائے وہ ناریل کے ریشوں پر انحصار کر رہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے سسٹر ڈوروتھیا سے گفتگو کرنی چاہی، مگر سسٹر ڈوروتھیا نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ ریشہ بردار رِگر اور ریشوں والی چٹائی کے درمیان کپکپی ہونے لگی، جب میں نے کہا تھا کہ میں شیطان ہوں، اور اس نام کو شیطانی سسکی کے ساتھ ادا بھی کیا تھا، اپنا پتا جہنم بتایا تھا اور اس میں کچھ تصویری اشارے بھی شامل کر دیے تھے۔ میں نے اپنے بستر کے پہلو والی ریشہ بردار چٹائی کو حرکت میں رکھنے کے لیے دو تین جھٹکے بھی دیے تھے، اس لیے کہ میرے کانوں نے سادہ لفظوں میں بتایا تھا کہ ریشے سسٹر ڈوروتھیا میں ویسی ہی سنسنی پیدا کر دیتے ہیں جیسی کہ برسوں پہلے فز پاؤڈر میری معشوق میں پیدا کر دیتا تھا، بس اتنا فرق تھا کہ پاؤڈر کامیابی سے میرے ایک سرے کو عمودی حالت میں، بلکہ فاتحانہ کیفیت میں ایستادہ رکھتا تھا، جب کہ یہاں ریشہ بردار چٹائی پر مجھے شرم ناک ناکامی کا سامنا ہے۔ ممکن نہیں تھا کہ میں اپنا لنگر ڈال دیتا۔ میرا ننھا دوست جو، فز پاؤڈر کے دنوں میں اور اس کے بعد بھی اکثر، پورے قصد اور خواہش کے ساتھ تن کر ایستادہ رہتا تھا، اب سرنگوں اور یہاں، ناریل کے ریشے پر، لاغر، توانائی سے محروم اور بے حس رہتا ہے۔ کوئی شے اس کو ہلا نہیں سکتی، نہ

میرے دانش ورانہ دلائل، نہ مسٹر ڈوروتھیا کی دل چور چور کر دینے والی اپیلیں، جو بسوری اور کراہی: ''آجاؤ... شیطان... آجاؤ۔''

''شیطان آرہا ہے۔'' میں نے دعُووں کے ذریعے اسے تسکین دینے کی کوشش کی۔

''شیطان ایک منٹ میں تیار ہوجائے گا۔'' میں شیطانی لہجے میں کہہ رہا تھا، ساتھ ہی شیطان سے میرا مکالمہ ہو رہا تھا، جو بچپنے کے دن سے مجھ میں جاگزیں ہے۔

میں نے سرزنش کرتے ہوئے کہا، ''شیطان... رنگ میں بھنگ نہ ڈال... شیطان: خدا کے لیے مجھے اس طرح رُسوا تو نہ کر۔ اور پھر چاپلوسی سے کام لیتے ہوئے کہا، یہ تم کو زیب نہیں دیتا، بڑے میاں۔ ذرا سوچو، ماریا کا خیال کرو یا اس سے بھی بڑھ کر، بیوہ گریف کا خیال کرو دونوں مل کر، کہ ہم خوش نما پیرس میں اپنی ڈارلنگ روزویدا سے کیسی کیسی شوخیاں کیا کرتے تھے؟ شیطان کا جواب تُرش رو اور تکراری تھا: میرا مزاج ٹھیک نہیں، آسکر۔ جب شیطان کا مزاج خراب ہو تو نیکی فاتح ہوتی ہے۔ کیا شیطان کو بھی کبھی کبھار، کسی مزاج میں ہونے کا حق نہیں؟ اس آری جیسے انداز میں، شیطان نے میری مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ میں نے ریشہ دار چٹائی کو متحرک رکھا، مسٹر ڈوروتھیا کو بے دردی سے رگڑتا رہا، مگر بتدریج ناتواں ہوتا جا رہا تھا۔ ''آؤ شیطان!'' اس نے سسکی لے کر کہا، ''اُف، پلیز آجاؤ نا۔'' اور آخر کار، میں نے چٹائی کے نیچے بے حد مایوس، واہیات اور بے جواز ردِعمل کا مظاہرہ کیا: میں نے ہدف کا گولیوں سے عاری پستول سے نشانہ لیا۔ اس نے اپنے شیطان کی مدد کرنے کی کوشش کی، اس کے بازو چٹائی کے باہر نکل آئے، میرے اطراف حمائل ہو گئے، میرے کوب کو، میری گرم، انسانی مگر بے ریشہ، جلد کو دریافت کرنے لگی مگر یہ وہ شیطان نہیں جس کی اسے طلب تھی۔ اب ''آؤ... شیطان... آجاؤ نا!'' کی سرگوشیاں بند ہو گئی تھیں۔ ان کے بجائے اس نے اپنا گلا صاف کرتے ہوئے اپنا اصلی سوال دُہرایا، مگر دوسرے انداز میں، ''خدا کے لیے بتاؤ، تم کون ہو، تم کیا چاہتے ہو؟'' میں الگ ہو گیا اور اعتراف کیا کہ کاغذات کے مطابق میرا نام آسکر ماتسیرات ہے، کہ میں اس کا پڑوسی ہوں، کہ میں دل و جان سے اس سے محبت کرتا ہوں: مسٹر ڈوروتھیا سے۔

اگر کوئی بد خواہ روح یہ سمجھتی ہے کہ مسز ڈوروتھیا نے مجھے بد دعا دی تھی اور ریشہ بردار زمّر پر ڈھکیل دیا تھا تو آسکر اس کو مایوس مگر یک گونہ اطمینان کے ساتھ یقین دلانا چاہتا ہے کہ مسز ڈوروتھیا نے بہت آہستہ اور سوچ سمجھ کر، اس انداز سے میرے کوب سے اپنا ہاتھ ہٹایا تھا گویا وہ مایوسانہ طور پر اس کو سہلا رہی ہو۔ اس نے بغیر کسی قسم کے تشدد کے رونا، سسکی لینا شروع کر دیا تھا۔ اور مجھے احساس بھی نہیں ہوا تھا جب وہ کسمسا کر میرے اور اس چٹائی کے نیچے سے نکل کر فرش پر چلی گئی تھی۔ قالین نے اس کے قدموں کی آواز کو جذب کر لیا تھا۔ میں نے ایک دروازہ کھلتے، ایک دروازہ بند ہوتے، ایک کنجی گھومتی ہوئی سنی تھی: اس کے بعد دھندلے شیشے والے دروازے کے چھ عدد مربعوں پر اندر کی روشنی ہو گئی تھی۔

آسکر وہیں لیٹا رہا، اپنے آپ کو چٹائی سے ڈھانپ لیا، جس میں اب بھی ہلکی سے شیطانی گرمی باقی تھی۔ میری آنکھیں چھ روشن مربعوں پر لگی ہوئی تھیں۔ دھندلے شیشوں پر بار بار کوئی سایہ تیزی سے گزر جاتا تھا۔ اب وہ اپنے کپڑوں کی الماری کی طرف جا رہی ہے، میں نے خود سے کہا، اور اب واش اسٹینڈ کی طرف۔ آسکر کو ایک شیطان صفت اقدام کی سوجھی۔ اپنی چٹائی لیے میں زمّر کے اوپر رینگتا دروازے کی طرف گیا، لکڑی کو کھرونچا، اپنے آپ کو ذرا بلند کیا اور شیشے کے دو نچلے مربعوں پر جستجویانہ اور داد خواہانہ انداز میں ہاتھ پھیرا۔ مسز ڈوروتھیا نے دروازہ نہیں کھولا: الماری اور واش اسٹینڈ کے درمیان مصروف تیزی سے آتی جاتی رہی۔ میں بس اتنی حقیقت سے واقف تھا: مسز ڈوروتھیا روانگی کے لیے سامان باندھ رہی تھی، مجھ سے دور جانے کے لیے۔

ایک ہلکی سے امید بھی، کہ کمرے سے جاتے ہوئے وہ مجھے بجلی سے روشن اپنا چہرہ دکھائے گی، پوری نہیں ہوئی۔ پہلے دھندلے شیشوں کے پیچھے کی روشنی گل ہوئی پھر میں نے کنجی پھرنے کی آواز سنی، دروازہ کھلا، ریشہ بردار زمّر پر جوتا رکھا گیا، میں اس کی طرف بڑھا، ایک سوٹ کیس اور ایک موزہ پوش پیر سے ٹکرایا۔ اس نے، پیدل ورزش کرنے والے ایک معقول جوتے سے، جو میں اس کی الماری میں دیکھ چکا تھا، میرے سینے پر ٹھوکر رسید کی اور جب آخری بار آسکر نے التجا کی، "مسز ڈوروتھیا"، فلیٹ کا دروازہ زور سے

بند ہوا—ایک عورت مجھے چھوڑ گئی تھی۔

آپ اور وہ سب جو میرے رنج کو سمجھ سکتے ہیں اب کہیں گے، آسکر، جاؤ، سو رہو۔اس توہین آمیز واردات کے بعد راہداری میں تمھارا کیا رکھا ہے؟ اس وقت صبح کے چار بج رہے ہیں۔تم ریشہ بہ دار قالین پر، بغیر کسی چادر کے لیٹے ہوئے ہو۔تمھارے ہاتھوں اور گھٹنوں کی جلد چھل گئی ہے۔تمھارا دل رو رہا ہے، تمھارا عضو دُکھ رہا ہے، تمھاری ندامت دہائی دے رہی ہے۔تم نے مسٹر زائیڈلر کو جگا دیا ہے۔اس نے اپنی بیوی کو جگا دیا ہے۔ ایک منٹ بعد وہ اٹھ جائیں گے، اپنی خواب گاہ کا دروازہ کھولیں گے، اور تمھیں دیکھیں گے۔جاؤ، سو رہو آسکر، پانچ بجنے والے ہیں۔

ریشہ بہ دار زمّر پر لیٹا میں بھی خود کو یہی مشورہ دے رہا تھا، مگر میں کانپ رہا تھا، اور ساکن لیٹا رہا۔میں سسٹر ڈوروتھیا کے جسم کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر مجھے سوائے ناریل کے ریشوں کے کچھ محسوس نہیں ہوا، وہ ہر جگہ تھے، حتیٰ کہ میرے دانتوں کے درمیان بھی۔آسکر پر روشنی کی کرن پڑی۔ زائیڈلر کے کمرے کا دروازہ کسی شگاف کی طرح کھلا۔ زائیڈلر کا خار پشت سر، اس کے اوپر دھات کے گرگر سے بھرا مسز زائیڈلر کا سر دکھائی دیا۔انھوں نے گھور کر دیکھا، مسز کھلکھلائی، مسٹر نے مجھے آواز دی، میں نے جواب نہیں دیا۔مسز کھلکھلاتی رہی۔مسٹر نے کہا خاموش رہو۔مسز نے پوچھا، کیا غلط کام کیا ہے میں نے؟ مسٹر نے کہا، یہ سب نہیں چلے گا۔مسز نے کہا، یہ عزت دار کا گھر ہے۔مسٹر نے مجھے نکال باہر کرنے کی دھمکی دی، مگر میں خاموش رہا، اس لیے کہ پیمانہ ابھی لبریز نہیں ہوا تھا۔ زائیڈلروں نے دروازہ کھولا، مسٹر نے ہال میں روشنی کی۔وہ کینہ پرور آنکھ لیے میری طرف بڑھے۔مسٹر بہت غصے میں تھا اس وقت جو برانڈی کے گلاسوں پر اُترنے والا نہیں تھا۔ وہ میرے سرھانے کھڑا تھا اور آسکر خار پشت کے غصے کے انتظار میں تھا، مگر زائیڈلر اپنی برہمی کو سینے سے کبھی نکال نہیں سکا۔سیڑھی پر ایک غوغا ہوا، ایک مشکوک کنجی کچھ تلاش کر رہی تھی اور بالآخر اسے تالے کا سوراخ مل گیا، کلیپ اندر داخل ہوا، اپنے ساتھ ایک آدمی لایا، جو اسی کی طرح نشے میں تھا— شولے، گٹار نواز، جس کی ایک زمانے سے تلاش تھی۔

دونوں نے زائیڈر اور بیوی کو ٹھنڈا کیا، آسکر کے اوپر جھکے، کوئی سوال نہیں کیا، مجھے اُٹھایا، مجھے اور میری شیطانی چٹائی کو میرے کمرے میں لے گئے۔

کلیپ نے سہلا کر میرا جسم گرم کیا۔ گٹار نواز نے میرے کپڑے اُٹھائے۔ دونوں نے مل کر مجھے لباس پہنایا اور میرے آنسو خشک کیے۔ سسکیاں۔ کھڑکی کے باہر سویرا۔ اُڑتی گوریاں۔ کلیپ نے میرے گلے میں میرا نقارہ پہنایا، اپنی چھوٹی سی بانسری دکھلائی۔ سسکیاں۔ گٹار نواز نے اپنا گٹار اُٹھایا۔ اُڑتی گوریاں۔ دوستوں نے مجھے گھیر لیا، اپنے درمیان لے لیا، سسکی لیتے، مگر غیر مزاحم آسکر کو فلیٹ کے باہر، 'جوئیلشر اشتراسے' لے گئے، اُڑتی گوریاؤں کی طرف، اس کو ماریل کے ریشوں کے جنجال سے باہر نکالا، روشن ہوتی سڑکوں پر میری رہنمائی کی، ہوف گارٹن سے افلاک نما کی طرف، اور دریائے رھائن کے کناروں کی طرف، ہالینڈ کی طرف بہتا پانی، کشتیوں سے لٹکی الگنی کی رسیاں۔

چھ سے نو تک، غبار آلود ستمبر کی صبح؛ کلیپ بگل نواز: شولے، گٹار نواز: آسکر percussion man: دریائے رھائن کے دائیں کنارے پر بیٹھے ہوئے۔ ہم نے دھن بنائی، اس کے ریکارڈ بنائے، ایک ہی بوتل سے سب نے شراب پی، دوسرے کنارے کے سفیدے کے درختوں کے پار گھورا، 'ڈوئیس بُرگ' کے لیے کوئلہ لے جاتی، لہریں اُٹھاتی دخانی کشتیوں کی بابت جاز اور غم انگیز مسی سپی موسیقی سے پذیرائی کی۔ اس دوران ہم حال ہی میں قائم کیے گئے جاز بینڈ کا نام سوچتے رہے۔

جب سورج کی کرنوں نے سویرے کی دھند کو رنگین کیا، اور ہماری موسیقی میں ناشتے کی طلب بڑھی، آسکر، جس نے اپنا نقارہ اپنے اور گزری رات کے درمیان رکھ دیا تھا، کھڑا ہوا، اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ رقم نکالی، جس کا مطلب ناشتا تھا، اور اپنے دوستوں کے درمیان نو زائیدہ بینڈ کے نام کا اعلان کیا: ہم سب نے اتفاق کیا کہ ہم خود کو The Rhine River Three کہلائیں گے، اور ہم ناشتا کرنے روانہ ہو گئے۔

# پیاز کا تہہ خانہ

ہمیں وادیِ رھائن کے مرغزاروں سے پیار تھا اور ریستوران و رقص گاہ کے مالک فرڈیننڈ اشمو بھی 'ڈوسِنڈارف' اور 'کیز رس ورتھ' کے درمیان رھائن کے دائیں کنارے سے محبت کرتا تھا۔ ہم نے اپنی زیادہ تر مشق 'اِسٹوگم' پر کی تھی۔ اس دوران اِشمو ہلکے درجے کی رائفل لیے ساحلی باڑوں اور جھاڑیوں میں گوریاں تلاش کرتا پھرتا تھا۔ یہ اس کا مشغلہ تھا، تفریح تھی۔ ایک دن جب کاروبار نے اس کو پریشان کردیا تو اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ مرسیڈیز کا اسٹیرنگ سنبھالے، اور وہ دریا کے کنارے، پارک سے ہوتے ہوئے 'اِسٹاکم' تک گاڑی چلانے نکل گئے۔ وہ بوجھل قدم اٹھاتا، رائفل نال زمین کی جانب کیے، مرغزاروں سے ہوتا ہوا چلا، عقب میں اس کی بیوی رواں تھی، جو شاید کار ہی میں ٹھہرنا پسند کرتی۔ بہت دور نکل جانے کے بعد اس نے بیوی کو دریا کنارے ایک آرام دہ پتھر پر بٹھا دیا اور خود جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ جب ہم اپنا ragtime بجاتے، وہ جھاڑیوں میں اُچھلتا کودتا ہوتا۔ ہم موسیقی بناتے اور وہ گوریاں شکار کرتا۔

جب شولے نے — کلیپ کی طرح جو شہر کے ہر بار کے مالک سے واقف تھا — جھاڑیوں میں بندوق چلتی سنی تو اس نے اعلان کیا: "اِشمو گوریاں شکار کر رہا ہے۔"

چوں کہ اِشمو زندہ نہیں رہا، اس لیے میں اس مرحلے پر اس کا ذکرِ وفات بھی کر دینا چاہتا ہوں: اِشمو ایک اچھا نشانے باز تھا اور اچھا آدمی بھی تھا؛ اس لیے کہ جب بھی وہ شکار

پہ جاتا، گولیاں اس کی بائیں جیب میں ہوتیں، مگر دائیں جیب پرندوں کے دانے سے بھری ہوتی تھی، جنھیں وہ فیاضانہ انداز میں چڑیوں کے درمیان بکھیر دیتا، پہلے نہیں، مگر جب وہ شکار کر چکا ہوتا تھا، اور اس نے کبھی ایک دوپہر میں بارہ سے زیادہ پرندے شکار نہیں کیے تھے۔

نومبر 1949 کی ایک سہانی صبح، جب اِشمو بقیدِ حیات تھا، اور ہم رھائن کے ساحلوں پر اپنی مشق کر رہے تھے، وہ ہم سے مخاطب ہوا، ایسی آواز میں جو بہت اونچی اور غصے سے بھری تھی، جس کو سنجیدگی سے لیا جاتا تھا۔ ''میں پرندے کس طرح شکار کروں، تم لوگ موسیقی سے انھیں بھگا دیتے ہو؟''

''اوہ'' کلیپ نے اپنی بانسری اُٹھا کر اس طرح معذرت کی گویا وہ رائفل سے سلامی دے رہا ہو۔ ''یقیناً، آپ ایسے شریف انسان ہیں، جس میں اعلیٰ درجے کا احساسِ موسیقی بھی ہے، جو ہمارے سُروں سے اپنی شکار بازی کو ہم آہنگ بھی رکھتا ہے۔ تسلیمات، مسٹر اِشمو!'' اِشمو خوش ہوا کہ کلیپ اس کو اس کے نام سے جانتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کس طرح؟ کلیپ نے اظہارِ برہمی کرتے ہوئے کہا، ہر آدمی اِشمو کو کیوں جانتا ہے۔ گلیوں میں ہر کوئی کہتا ہے، وہ رہا اِشمو؛ اشمو جا رہا ہے؛ آپ نے اِشمو کو دیکھا ہے؟؛ آج اِشمو کدھر ہے؟؛ اِشمو گوریاں مارنے گیا ہے۔

گویا عوامی شخصیت میں قلبِ ماہیت شدہ اِشمو ہمیں سگریٹ پلاتا، ہمارے نام پوچھتا اور ہماری معلومات سے استفادہ کرتا۔ ہم نے اس کو چیتے کی کھال پیش کی، اس نے اپنی بیوی کو آواز دی جو اپنے فَر کوٹ میں ملبوس ایک پتھر پر بیٹھی رھائن کے پانیوں میں محو تھی۔ فَر کوٹ پہنے، وہ ہمارے ساتھ ہو گئی اور ہم کھیلنے لگے: اس بار کھیل تھا، ''ہائی سوسائٹی'' اور جب ہم فارغ ہو گئے تو اپنے فَر کوٹ میں ملبوس اس نے کہا، ''کیوں فَرڈی، کیا تمھیں تہہ خانے کے لیے بس یہی چاہیے؟'' اس کا بھی یہی خیال تھا: دراصل، اس کا خیال تھا کہ وہ خود ہمیں تلاش کرنے گیا تھا، اور ہمیں تلاش کر لیا تھا۔ پھر بھی، قبل اس کے کہ اِشمو نے، غور کرنے، شاید حساب لگانے، رھائن کے پانیوں پر کئی مسطح پتھر پھینکنے سے پہلے پیش کش کی تھی — کیا ہم دس مارک فی شام، بلکہ بارہ مارک فی شام اَن یَن سیلر ( Onion

Cellar) میں نو سے دو تک کھیل سکتے ہیں؟ گیلپ نے کہا، سترہ، اس لیے کہ شاید اشمو پندرہ کہتا؛ اشمو نے کہا، ساڑھے چودہ، اور ہم نے سودا کر لیا۔

باہر سڑک سے دیکھو تو 'اَن یَن سیلر' بھی دوسری بہت سی نئی رقص گاہوں کی طرح نظر آتی ہے، جن میں پرانے طرز کے شان دار بار، کیبرے اور مہنگی قیمتیں ادا کرنی ہوتی ہیں۔ مہنگی قیمتوں کا جواز ان شبینہ تفریح گاہوں کی بدیسی سجاوٹ سے ہوتی ہیں جن میں کچھ آرٹسٹ کلب کہلاتی ہیں، اور ان کے نام بھی نئے نئے ہوتے ہیں، مثلاً The Ravioli Room (پردہ پوش اور خالص)، The Taboo (پُراسرار اور وجودی)، The Paprika (پھیکا اور بلند حوصلہ)۔ اور، اسی طرح وہاں The Onion Cellar بھی تھی۔

اَن یَن سیلر کے الفاظ اور پیاز سے ایک تیکھی اور معصومانہ شباہت کو دیدہ و دانستہ بھدے انداز میں نام چینی کے سائن بورڈ کی صورت پینٹ کیا گیا تھا جس کو عمارت کے سامنے قدیم جرمن انداز کے لوہے میں ڈھلے پھانسی گھاٹ کی طرح لٹکایا گیا تھا۔ عمارت میں یکہ و تنہا کھڑکی تھی جس میں گہرے ہرے رنگ کا ایک موٹا شیشہ لگا تھا، اور لوہے کا دروازہ، جس پر رہنمائی کے لیے سُرخ رنگ کا تیر بنایا گیا تھا۔ یہ جگہ بلا شبہ جنگ کے زمانے میں ہوائی حملے کی پناہ گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ اس کے باہر بھیڑ کی کھال سے بنے بھدے سے لباس میں کھڑا دربان۔ ہر کس و ناکس کو اَن یَن سیلر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ بالخصوص جمعے کے دن، جب تنخواہیں بیئر میں تبدیل ہو جایا کرتی ہیں، یہ دربان کی ذمے داری ہوتی تھی کہ وہ پرانے شہر کے مخصوص قسم کے لوگوں کو اندر آنے نہ دے جن کے لیے 'اَن یَن سیلر' مہنگی جگہ تھی۔ سُرخ تیر والے دروازے کے پیچھے اندر آنے والوں کو پانچ کانکریٹ سے بنے قدمچوں کا سامنا ہوتا تھا۔ آپ نیچے اتریے تو خود کو ایک تین فٹ کی چھوٹی سی جگہ پائیں گے جہاں پکاسو کی نمائش کا اشتہار، اور پھر ایک نہایت فن کارانہ موڑ۔ مزید چار قدمچے آپ کو کوٹ ٹانگنے کی جگہ لے جاتے ہیں۔ دفتی سے بنے ایک سائن بورڈ پر ''روانگی کے وقت بل ادا کیجیے'' لکھا ہوتا تھا اور کاؤنٹر پر کھڑا نوجوان، جو عموماً ڈاڑھی والا فن کار ہوتا، قبل از داخلہ رقم لینے سے انکار کر دیتا تھا، اس لیے

کہ اُن ڈَن سیلر نہ صرف مہنگی جگہ تھی، یہاں اونچے درجے کے لوگ ہی آسکتے تھے۔ مالک بہ نفسِ نفیس ہر مہمان کا واضح اظہار اور متحرک ترجمانی کرنے والے ابرووں سے خیر مقدم کرتا، گویا آنے والے کو خفیہ رسوم میں شامل کر رہا ہو۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، مالک کا نام تھا فرڈیننڈ اِشمو؛ یہی وہ آدمی تھا جو کبھی کبھی گوریاں شکار کرتا تھا، اور نظامِ زر کی اصلاحات کے بعد سے 'ڈوسلڈارف' میں (اور جگہوں پر بھی) ابھرنے والی سوسائٹی پر نگاہ رکھتا تھا۔

اُن ڈَن سیلر واقعی ایک تہ خانہ تھا؛ دراصل یہ جگہ خاصی مرطوب اور سرد جگہ تھی۔ نَلی جیسی ساخت، اس کی پیمائش، اندازاً تیرہ فٹ چوڑی اور ساٹھ فٹ طویل، اور اس کو دو عدد خالص ڈھلے لوہے کے اسٹوو سے گرم رکھا جاتا تھا، مگر ایک طرح سے، یہ سیلر تہہ خانہ نہیں تھا۔ اس کی چھت نکال دی گئی تھی، اس طرح اس جگہ میں سابقہ زمینی منزل کا فلیٹ بھی شامل ہو گیا تھا۔ وہ یکہ وتنہا سادہ شیشے کی کھڑکی تہہ خانے کی کھڑکی نہیں، سابقہ فلیٹ کی کھڑکی تھی، مگر چوں کہ اس میں لگے غیر شفاف موٹے شیشے سے باہر دیکھنا ممکن نہیں تھا؛ چوں کہ وہاں ایک گیلری تھی جس پر ایک اعلیٰ درجے کے عمودی زینے کے ذریعے پہنچا جا سکتا تھا، اُن ڈَن سیلر کو مستند کہا جا سکتا ہے، باوجودے کہ یہ تہہ خانہ نہیں، مگر اسے تہہ خانہ ہی کیوں ہونا چاہیے؟

آسکر آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ گیلری پر لے جانے والا زینہ حقیقی زینہ نہیں ایک عرشے کو دوسرے عرشے سے ملانے والا زینہ تھا، اس لیے بہت عمودی ہونے کے باعث اور اس لیے کہ استعمال کے وقت لرزتا بھی تھا، اس کے دونوں جانب الگنی کی رسیاں لگی ہوئی تھیں، اور ان پر چڑھ کر آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کسی جہاز پر بحری سفر کر رہے ہیں۔

اُن ڈَن سیلر میں گیس لیمپ کے ذریعے روشنی کی جاتی تھی، جیسے کان کن استعمال کرتے ہیں، جو کاربائیڈ کی بو پھیلاتے تھے — قیمت بڑھانے کی ایک اور وجہ — گاہک کو [تصورات میں] کسی کان کی گیلری تک لے جاتے تھے، مثال کے طور پر پوٹاش کی کان میں، سطحِ زمین سے تین ہزار فٹ نیچے: جہاں کمر تک برہنہ کان کن پتھروں کو کاٹتے، کھرچنے والے نمک نکالتے ہیں، گاڑیوں کو بھرنے کے لیے بوجھ اٹھانے والا چرخہ

گھن گرج پیدا کرتا ہے: بہت دور جہاں گیلری فرائیڈ رخ شال' نمبر دو کی طرف مڑتی ہے، ایک لہراتی ہوئی روشنی نظر آتی ہے: یہ ہے ہیڈ فورمین اور اس کا منس مٹھ ہیلو، کاربائیڈ کا لیمپ جھلاتا ہوا، جیسا، بالکل سادہ، چھپاکے سے سفیدی کی ہوئی اَن یَمن سیلر کی دیوار پر اپنی روشنی اور بو پھیلاتا، قیمتوں میں اضافہ کرتا اور اصلی ماحول پیدا کرتا، آویزاں ہوتا ہے۔

گاہک عام قسم کی، تکلیف دہ پیٹیوں پر بیٹھتے، جنھیں آلو کے بوروں سے ڈھانپ دیا گیا ہوتا تھا، مگر تختوں سے ہی صاف کی ہوئی، بے داغ میزیں، مہمانوں کو کان کے [تصوراتی سفر] سے واپس نہایت پُرسکون، دیہاتی سرائے میں، جیسی کبھی کبھی فلموں میں نظر آتی ہیں، واپس لاتی تھیں۔بس یہی کچھ ہوتا تھا۔اور بار؟... کوئی بار نہیں... ویٹر، مینو پلیز... نہ کوئی ویٹر اور نہ مینو! دراصل، وہاں اور کوئی نہیں تھا سوائے ہم لوگوں کے، یعنی، Rhine River Three۔کلیپ، شولے اور آسکر زینے کے نیچے جا بیٹھے جو صحیح معنوں میں زینہ نہیں لرزتا زینہ تھا۔ہم نو بجے پہنچ گئے تھے، اپنے ساز نکالے، اور دس بجے کے قریب بجانا شروع کر دیا تھا، مگر ٹھہریے، ابھی تو صرف ساڑھے نو بجے ہیں، اور میں وقت ہو جانے تک کچھ نہیں بتا سکتا۔اس وقت بس ہمیں اِشمو پر نظر رکھنی ہے، وہی جو کم درجے کی رائفل سے کبھی کبھی گوریاں مارتا تھا۔

جوں ہی اَن یَمن سیلر بھر گیا— نصف بھرے کو پورا بھرا تصور کیا جاتا تھا— میزبان اِشمو نے اپنی شال اوڑھ لی۔ یہ شال خاص کر اسی کے لیے بنائی گئی تھی۔ یہ کوبالٹ جیسے گہرے نیلے رنگ کے ریشم سے بنائی گئی تھی جس پر سنہرے رنگ کے نمونے بنے تھے۔میں یہ سب اس لیے بتا رہا ہوں کہ اس شال کا اوڑھنا اہمیت کا حامل تھا۔چھپائی سے بنایا گیا نمونہ سنہرے مائل پیلے رنگ کی پیازوں پر مشتمل تھا۔اَن یَمن سیلر اس وقت تک ''دکھلا'' نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک کہ اِشمو یہ شال اوڑھ نہیں لیتا تھا۔گاہک تجار، ڈاکٹر، وکیل، مصور، صحافی، تھیٹر اور فلم والے، کھیل کی دنیا کے مشہور لوگ، صوبائی اور میونسپل حکومتوں کے افسران، المختصر اس دنیا کے نمائندے جو خود کو دانش وروں کی دنیا کہتی ہے، اپنی بیویوں، معشوقاؤں، سیکرٹریوں، اندرونی سجاوٹ کے ماہرین اور کبھی کبھی مذکر معشوقوں سمیت بوروں

سے ڈھکی پیٹیوں پر بیٹھنے آتے تھے۔ جب تک اِشمو اپنی سنہرے مائل زرد رنگ پیازوں والی شال اوڑھ نہیں لیتا تھا، گفتگو مدھم زمہ دتی اور بے رس ہوتی تھی۔ یہ لوگ بات کرنا، اپنے ذہن کا بوجھ اُتارنا چاہتے تھے مگر عام حالات میں اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اپنی ان کہی کہہ نہیں پاتے تھے، اس کے باوجود وہ کتنے بے تاب ہوتے تھے اپنے دل کا حال کہنے کے لیے، دل کے، معدے کے اور آنتوں کے ذریعے باتیں کرنے کے لیے، کچھ دیر کے لیے اپنے دماغ کو بھول جانے کے لیے، خام اور ملمع کے بغیر سچائی کو کھول کر پیش کرنے کے لیے، اپنے اندر کے آدمی کے لیے۔ یہاں وہاں، بگاڑے کیریئر، ٹوٹے ازدواجی رشتوں کے چھپانے کے لیے۔ پتا چلا ہے کہ وہاں کے بڑے سر، ذہین چہرہ اور نرم اور تقریباً نازک ہاتھ والے ایک صاحب کا اپنے بیٹے سے تنازعہ چل رہا ہے، جو اپنے باپ کے ماضی سے ناخوش ہے۔ سمور کے لباس میں دو خواتین، جو کاربائیڈ لیمپ کی روشنی میں اب بھی بہت پُر کشش دکھائی دیتی ہیں، دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کا یقین اُٹھ گیا ہے، مگر یہ نہیں بتاتیں کس پر سے۔ بڑے سر والے صاحب کے ماضی کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں، نہ ہمیں اس کا کوئی علم ہے کہ ان کا بیٹا ان کے ماضی کے بارے میں کس طرح پریشان کر رہا ہے؛ اگر آپ آسکر کو ایک نامہذب استعارے پر معاف فرمائیں: انڈے دینے کے لیے بار بار زور لگانا پڑتا ہے...

اُن یَنی سیلر میں لگائے جانے والے زور سے اس وقت تک کے لیے معمولی نتائج نکلے تھے، جب تک کہ اِشمو اپنی خاص شال میں باہر نہیں نکلا تھا۔ ایک خوش مزاج "اوہ" کے ذریعے خیر مقدم کے بعد، جس کے لیے اس نے اپنے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا تھا، وہ چند لمحوں کے لیے اُن یَنی سیلر کے آخر میں لگے پردے کے پیچھے، جہاں ٹوائلٹ اور گودام واقع تھے، غائب ہو گیا تھا۔

مگر ایک ذرا زیادہ خوش مزاج "اوہ"، ایک پُرسکون اور واگزاشت کے "اوہ" سے میزبان کا، اس کی واپسی پر خیر مقدم کیوں کیا گیا تھا؟

ایک کامیاب نائٹ کلب کا مالک پردے کے پیچھے غائب ہو جاتا ہے، گودام سے کچھ نکالتا ہے، واش روم کے خدمت گار کی، دھیمے لہجے میں منتخب کردہ لفظوں کے

ذریعے اہانت کرتا ہے، جو وہاں بیٹھا باتصویر ہفتہ وار پڑھ رہا تھا؛ پردے کے سامنے دوبارہ نمودار ہوتا ہے، اور اس کا آسٹریلیا سے آنے والے کسی افسانوی عم کی طرح، نجات دہندے کی طرح خیر مقدم کیا جاتا ہے!

اِشمو اپنے بازو میں ایک چھوٹی سی چھابی لٹکائے واپس آیا اور اپنے مہمانوں کے درمیاں گھوما پھرا۔ چھابی پیلے اور نیلے چار خانوں والے ایک رومال سے ڈھکی ہوئی تھی۔ رومال کے اوپر مچھلی اور خنزیر کی شکل کے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے تختے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے آداب وتسلیم کے ساتھ یہ تختے اپنے مہمانوں میں تقسیم کیے جس سے حتمی طور پر پتا چل گیا تھا کہ وہ 'بوڈاپسٹ' یا 'ویانا' میں پلا بڑھا تھا؛ اِشمو کی مسکراہٹ قیاساً اصل مونا لیزا کی مسکراہٹ کی نقل در نقل کی طرح تھی۔

ان چھوٹے چھوٹے تختوں کو قبول کرتے وقت مہمان بہت سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ کچھ نے اپنے پڑوسیوں سے ان تختوں کا خنزیر کے پسندیدہ تختوں سے مبادلہ کرلیا اور کچھ نے پُراسرار مچھلیوں کی شکل کے تختوں سے۔ کچھ مہمانوں نے لکڑی کے ان تختوں کو سونگھا اور اِدھر اُدھر رکھ دیا۔ گیلری میں اپنے مہمانوں کی خدمت کرنے کے بعد اِشمو نے اس وقت تک انتظار کیا، جب سارے تختے اپنی اپنی جگہ رکھ دیے گئے تھے۔

تب— اور ہر دل کی دھڑکن تیز ہو گئی— اس نے، بالکل کسی جادوگر کی طرح، رومال ہٹایا: اس رومال کے نیچے ایک اور رومال تھا جس پر پھل تراش یا سبزی کاٹنے والے چاقو رکھے ہوئے تھے، جو پہلی نظر میں پہچانے نہیں جا سکتے تھے۔ اس نے وہ بھی تقسیم کیے، مگر اس بار وہ تیز تیز چل رہا تھا، جس سے مہمانوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی، جس کے باعث اس کو اپنی قیمتیں بڑھانے کا موقع مل گیا تھا۔ اس نے مزید آداب وتسلیم کی زحمت نہیں کی، اور چاقوؤں کے مبادلے کا موقع نہیں دیا؛ اس کی حرکت میں اب ایک طے شدہ شتابی سی در آئی تھی۔ "اپنی اپنی جگہ سب تیار ہو جائیں" اس نے بہ آوازِ بلند کہا۔ اور ''Go'' کہتے ہی اس نے چھابی پر پڑا دوسرا رومال کھینچا؛ چھابی میں بے شمار پیاز تھیں— سنہری مائل زرد پیاز، جیسی اس کی شال پر بنی ہوئی تھیں: ٹیولپ کے پیاز نما بلب

نہیں، سادہ عام قسم کی پیاز؛ ویسی ہی پیاز جو عورتیں بازار میں خریدتی ہیں؛ جیسی کہ سبزی کی دُکان والی عورتیں بیچتی ہیں؛ جیسی کہ کسان، کسان کی بیوی، یا اُجرت پر کام کرنے والی لڑکیاں کھیت میں لگاتی ہیں اور فصل میں نکالتی ہیں؛ جیسی پیاز ہالینڈ کے کم درجے کے فن کار اپنی پینٹ کی ہوئی تصویروں میں پیش کرتے ہیں۔ تب اس نے اپنے مہمانوں میں پیاز تقسیم کرنی شروع کی، جب تک کہ ہر مہمان کو ایک پیاز مل نہیں گئی تھی، اور سوائے اِسٹوو کی پھڑپھڑاہٹ اور کاربائیڈ کے لیمپوں کی سیٹی کے کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی، اس لیے کہ عالی شان تقسیمِ پیاز کے بعد خاموشی چھا گئی تھی اور اس خاموشی میں فرڈیننڈ اِشمو نے بلند آواز میں کہا، خواتین وحضرات، بسم اللہ کیجیے۔'' اور اس نے اپنی شال کا ایک کونا، فضا میں کسی کودنے والے کی طرح، اپنے بائیں شانے پر اُچھال دیا۔ یہ اشارہ تھا۔

مہمانوں نے پیاز چھیلنی شروع کی۔ کہا جاتا ہے کہ پیاز کے سات چھلکے ہوتے ہیں۔ خواتین اور حضرات نے چاقو سے چھلکے اتارے۔ انھوں نے پہلا، تیسرا، ہلکے زرد رنگ کا، سنہری مائل زرد، زنگ کے رنگ کا، یا اس سے بھی اچھے رنگ والا، پیاز کا چھلکا اتارا؛ وہ پیاز چھیلتے رہے اور پیاز شیشے جیسی، ہری، سفیدی مائل یا اس سے بہتر چھلکے والی، چپک دار ہوگئیں، بو دینے لگیں، اور ان میں سے پیاز جیسی مہک آنے لگی۔ تب انھوں نے پیاز کاٹی جیسی کہ لوگ کاٹا کرتے ہیں، مشاقی سے یا اناڑی پن سے، ان تختوں پر جو خنزیر یا مچھلی کی شکل کے تھے؛ سب کاٹتے رہے، ایک جانب سے، پھر دوسری جانب سے، جب تک کہ عرق پھوٹ کر نکلنے، بخار بن کر اُڑنے نہیں لگا تھا — زیادہ عمر کے مہمان چھل تراش چاقو استعمال کرنے کے عادی نہیں تھے، اور انھیں احتیاط کی ضرورت تھی تاکہ انگلیاں نہ کٹ جائیں، جب کہ کچھ کی انگلیاں کٹ بھی گئی تھیں مگر انھیں پتا ہی نہیں چلا تھا — خواتین اس معاملے میں زیادہ ماہر نکلیں، مگر سب نہیں، مگر کم از کم وہ جو خانہ دار بیویاں تھیں جو جانتی تھیں کہ ہیش براؤن آلوؤں کے لیے یا کلیجی۔سیب۔ پیاز کے چھلوں کے لیے پیاز کیسے کاٹی جاتی ہے؛ مگر اشمو کے اَن۔سن سیلر میں کچھ بھی نہیں تھا؛ وہاں کھانے کے لیے بھی کچھ بھی نہیں تھا، اور جسے کھانا ہوتا اسے کسی اور جگہ جانا پڑتا تھا، مثال کے طور پر "Fischl"

میں، اس لیے کہ اَن سَی سیگر میں صرف کاٹ ہو رہی تھی، مگر اتنی بہت ساری پیاز کیوں کاٹی جا رہی تھی؟ بس، صرف نام کے لیے۔ اَن سَی سیگر کی اپنی خصوصیت پیاز جو تھی۔ اور اس کے علاوہ، اگر آپ غور سے دیکھیں تو پیاز، کٹی پیاز— مگر— بس بہت ہو گیا تھا، اشمو کے مہمانوں نے دیکھنا چھوڑ دیا تھا، وہ اور کچھ نہیں دیکھ سکتے تھے، اس لیے کہ ان کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا، اس لیے نہیں کہ ان کے دل بھر گئے تھے؛ اس لیے کہ یہ ضروری نہیں کہ جب دل بھر جائے تو آنکھیں ضرور بہنے لگیں، کچھ لوگ اس کیفیت کو کبھی سنبھال نہیں سکتے، بالخصوص ہماری صدی میں، جو باوجود اپنے دکھوں اور غم کے، یقینی طور پر بغیر آنسوؤں کی صدی کہی جائے گی۔ یہی خشک سالی تھی، یہ بے اشکی ہی تھی جو استطاعت رکھنے والوں کو اشمو کے اَن سَی سیلر کھینچ لائی تھی، جہاں میزبان نے اسّی پینی کے عوض انھیں— مچھلی یا خنزیر کی شکل کے— تختے، پھل تراش چاقو؛ اور بارہ مارک کے عوض کھیت، باغ اور باورچی خانے کے معیاری پیاز تھما دی تھی اور انھیں ترغیب دلائی تھی کہ وہ اپنی پیاز چھوٹی چھوٹی کاٹتے رہیں جب تک کہ عرق— پیاز کا عرق کیا کرتا ہے؟ اس نے وہ کیا جو دنیا اور دنیا کے غم نہ کر سکے: جو انسانی آنسو لے آیا تھا۔ اس نے ان کو رُلا دیا۔ آخر کار وہ رونے کے قابل ہو گئے۔ باقاعدہ رونے کے لیے، بغیر کسی رُکاوٹ کے، دیوانوں کی طرح رونے لگے۔ آنسو بہے اور ساتھ سب کچھ بہا لے گئے۔ اس کے بعد بارش آئی، [یعنی] شبنم۔ آسکر کے پاس تصور ہے سیلابی دروازوں کے کھلنے کا۔ بہار کے سیلاب میں بند کے ٹوٹ جانے کا۔ کیا نام ہے اس دریا کا جو، ہر بہار چھلکنے لگتا ہے اور حکومت اس کو بند کرنے کے لیے کچھ نہیں کرتی؟ اس اچانک تند و تیز اُتھل پتھل کے بعد بارہ مارک اسّی پینس کے عوض، انسانوں نے، جو اچھی طرح رو چکے تھے، بولنے کے لیے اپنے منہ کھول دیے۔ متذبذب، اپنے ہی لفظوں کی برہنگی سے سہمے، تکلیف دہ، بوریوں سے ڈھکی پیٹیوں پر بیٹھے، جو اچھی طرح اشک بہا چکے تھے، خود کو سوال و جواب کے لیے، اوور کوٹ کی طرح الٹ دینے کے لیے، اپنے پڑوسیوں کے سامنے پیش کر دیا۔ مگر آسکر، جو کلیپ اور شولے کے ساتھ زینے یا لرزتے زینے کے پیچھے بے اشک بیٹھا تھا، محتاط رہے گا، تمام انکشافات سے، از خود تہمت آمیزی سے اور

اعترافات سے جو اُس کے کان میں پڑے تھے۔ وہ صرف کہانی بیان کرے گا: مس ییوخ کی، جس نے اپنے مسٹر وِلمر کو کئی بار کھویا تھا، اور اس طرح ایک مضبوط دل حاصل کیا تھا اور بے اشک آنکھ، جس نے اِشمو کی اَن-دَس سیکر میں بار بار آمد کو لازمی بنا دیا تھا۔

ہماری ملاقات ٹرام گاڑی میں ہوئی تھی، مس ییوخ نے رونا ختم کرتے ہوئے کہا۔ میں اسٹور سے نکلی ہی تھی— وہ کتابوں کی بہت اچھی دُکان کی مالک ہے اور خود ہی چلاتی بھی ہے۔ اس دن گاڑی بھری ہوئی تھی اور وِلی— یعنی مسٹر وِلمر— میرے داہنے پیر پر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ اتنی سختی سے کھڑا ہوا تھا کہ میں مزید اس پیر پر کھڑی نہیں ہو پا رہی تھی۔ پہلی ہی نظر میں ہم محبت میں گرفتار ہو گئے تھے۔ میں چل نہیں پا رہی تھی، اس لیے اس نے مجھے اپنا بازو پیش کر دیا، میری رہنمائی کی، بلکہ مجھے میرے گھر تک لے گیا تھا اور اس دن سے وہ بہت محبت سے میرے پیر کے انگوٹھے کی نگہداشت کر رہا تھا جو اس کی ایڑی سے دب کر سیاہ ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے محبت کی، صرف میرے انگوٹھے سے نہیں، اس وقت تک، جب تک کہ— داہنے انگوٹھے کا— ناخن جدا نہیں ہو گیا تھا، مگر ایسی کوئی شے نہیں رہ گئی تھی جو ناخن پیدا ہونے سے روک دیتی۔ جس دن مردہ ناخن گرا، اس کی محبت سرد ہونی شروع ہو گئی۔ ہم دونوں اس بات پر افسردہ ہو گئے تھے۔ وہی وقت تھا جب وِلی کے ذہن میں— وہ اب بھی مجھے چاہتا تھا، اس کے علاوہ، ہمارے درمیان کتنا کچھ مشترک بھی تو تھا— وہ خوف ناک خیال آیا تھا۔ اس نے استدعا کی، مجھے اجازت دو کہ میں تمھارے بائیں پیر کے انگوٹھے کو اس وقت تک پامال کروں جب تک کہ اس کا ناخن ہلکے، اور اس کے بعد گہرے اودے رنگ کا نہیں ہو جاتا۔ میں نے رضامندی ظاہر کر دی اور اس نے پامالی شروع کر دی۔ ایک بار پھر وہ دل و جان سے مجھ سے محبت کرنے لگا تھا اور اس کی محبت اس وقت تک کے لیے دیرپا ہو گئی جب تک کہ میرے بائیں انگوٹھے کا ناخن خزاں کے پتے کی طرح گر نہیں گیا تھا؛ اور ایک بار پھر ہماری محبت خزاں کا شکار ہو گئی۔ وہ دائیں پیر کے انگوٹھے کو دوبارہ پامال کرنا چاہتا تھا، کہ اس دوران ناخن بڑھ آیا تھا، مگر میں نے اسے اجازت نہیں دی۔ اگر تمھارے دل پر میرے لیے محبت اتنی غالب

آ گئی ہے، میں نے کہا، تو یہ ناخن سے آگے کیوں نہیں بڑھتی۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ مجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ مہینوں بعد، ہماری ایک کنسرٹ میں ملاقات ہوئی۔ اتفاق سے میرے برابر والی نشست خالی تھی، اور وقفے کے دوران وہ آ کر وہیں بیٹھ گیا۔ بینڈ Ninth Symphony بجا رہا تھا۔ جب کورس شروع ہوا تو میں نے اپنے دائیں پیر کا جوتا اتار کر اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے اپنی پوری طاقت سے جوتے پر اپنا قدم رکھ دیا، مگر میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس سے کنسرٹ میں مداخلت ہوتی۔ سات ہفتے بعد وِلی ایک بار پھر مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم دو دفعہ پھر الگ ہوئے: دو بار میں نے اپنے جوتے کی نوک آگے کی، پہلی بائیں پیر کی، اس کے بعد دائیں پیر کی۔ اب میرے دونوں انگوٹھے معذور ہیں۔ ناخن اب کبھی نہیں بڑھیں گے۔ وقتاً فوقتاً وِلی مجھ سے ملنے آتا ہے، ہیجان میں مبتلا، میرے اور اپنے بارے میں ہم دردی سے، میرے قدموں میں قالین پر آ بیٹھتا ہے اور بے محبت اور بے اشک ہمارے شکار انگوٹھوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی میں کہتی ہوں: آؤ وِلی، اِشمو کے اُن-یَن سیلر چلیں اور جی بھر کر روئیں، مگر ابھی تک تو وہ انکار ہی کرتا رہتا ہے۔ اس بے چارے کو آنسوؤں کی تشفی کے بغیر کتنا دکھ ہوتا ہوگا۔

بعد میں— آسکر یہ بات صرف ان لوگوں کے اطمینان کی غرض سے بتا رہا ہے جنھیں تجسس ہے— مسٹر وولمر (مجھے یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ وہ ریڈیو بیچتا تھا) ہمارے تہہ خانے میں آیا تھا۔ دونوں مل کر خوب روئے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسا کہ کلیپ نے کل ملاقات کے گھنٹے میں بتایا، دونوں کی شادی ہو گئی ہے۔

یہ منگل سے سنیچر کی بات تھی— اُن-یَن سیلر اتوار کے دن بند تھا— کہ پیاز نے وجودِ انسانی کے مزید دو بنیادی المیے دکھائے تھے، مگر سب سے شدید رُلائی دوشنبے کے دن ہوتی تھی، جب ہمارے سیلر میں نئی نسل کے لوگ آتے تھے۔ دوشنبے کے دن اِشمو نے طلبہ کو پیاز آدھی قیمت پر دی تھی۔ زیادہ تر آنے والے میڈیکل اور پری میڈیکل کے، دونوں جنس کے طلبہ ہوتے تھے۔ فنون کے طلبہ بھی آتے تھے، خاص کر وہ جن کا منصوبہ تھا کہ بعد میں وہ نقشہ نویسی سکھائیں گے، اور وہ اپنے خرچ کی رقم کا ایک حصہ پیاز پر خرچ

کر دیتے تھے۔ اس کے بعد سے میں سوچتا ہوں کہ ہائی اسکول کے آخری سال کے طلبہ پیاز کے لیے رقم کہاں سے پا جاتے ہیں؟

نوجوانوں کا رونے کا طریقہ اور ہی ہوتا ہے۔ ان کے اپنے بزرگوں کے مسائل بالکل مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ امتحانات ہی ان کی اذیت کا سبب ہوتے ہیں۔ اوہ، کیسے کیسے تنازعات تھے، باپ اور بیٹے کے درمیان، ماں اور بیٹی کے درمیان جو اَن یَن سیگر میں پیش کیے گئے تھے۔ نوجوان لوگوں کے ایک بڑے حصے کا خیال تھا کہ ان کو سمجھا نہیں جاتا؛ مگر زیادہ تر اس کے عادی تھے؛ رونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آسکر یہ دیکھ کر خوش تھا کہ، صرف جنسی محرومی ہی نہیں، محبت بھی جوان دوستوں کی آنکھوں سے آنسو نچوڑ سکتی ہے۔ مثال کے طور پر گیر ہارڈ اور گڈ رون!

پہلے وہ لوگ نیچے کی منزل میں بیٹھے؛ بعد میں وہ گیلری میں بیٹھ کر روئے۔ لڑکی، لمبی اور گٹھے جسم کی، ہینڈ بال کھیلنے والی اور علمِ کیمیا کی طالبہ۔ اس نے اپنے بال اپنی گردن پر ایک بڑے سے بن کی طرح بنا لیے تھے۔ زیادہ تر وقت وہ اپنے سامنے خلا ہی میں دیکھتی رہی تھی، مادرانہ آنکھیں، شفاف، بے باک، جمی ہوئی نظر جو جنگ کے زمانے کی عورتوں کی انجمن کی یاد دلاتی تھی۔

اس کی نفیس پیشانی، چکنی، دودھ جیسی سفید اور تابندہ صحت کے باوجود اس کا چہرہ اس کی بدقسمتی تھا۔ اس کے رخسار، ٹھوس، کنٹھ تک لگی ٹھوڑی میں تکلیف وہ اُگتی ہوئی ڈاڑھی کے آثار جنھیں بے چاری لڑکی شیو کے ذریعے مٹانے کی ناکام کوشش کرتی تھی۔ اس کی حساس جلد پر ریزر بلیڈ سے شدید ردِعمل پیدا ہوتا تھا۔ گڈ رون اپنے سُرخ، شگافتہ جلد، مہاسوں سے بھرے چہرے کے لیے روئی، بار بار اُگتی ہوئی ڈاڑھی کے لیے روئی۔ وہ دونوں، مِس پیوخ کی طرح، ٹرام گاڑی میں نہیں، ریل گاڑی میں ملے تھے۔ مرد اس کے سامنے بیٹھا تھا، وہ دونوں سیمسٹر کی تعطیل کے بعد واپس آ رہے تھے۔ اپنی ڈاڑھی کے باوجود وہ مرد کو اچھی لگی تھی۔ لڑکی اپنی ڈاڑھی کے باعث اس سے محبت کرنے سے ڈر رہی تھی، مگر لڑکے کو اس کی ٹھوڑی کے باوجود پسند کرتی تھی جو خود اس کے لیے بدقسمتی تھی، جو

اتنی چکنی اور بے ریش تھی جیسے کسی بچے کی سُرین، اور لڑکیوں کے سامنے شرمندہ کر دیتی تھی۔ پھر بھی، گر ہارڈ نے گڈرون سے بات کی اور جب تک ریل گاڑی 'ڈوسلڈارف' اسٹیشن پہنچتی، کم از کم وہ دوست بن گئے تھے۔ اس کے بعد وہ روزانہ ایک دوسرے سے ملاقات کرتے، تبادلۂ خیالات کرتے، مگر کبھی اشارے کنایے میں بھی ڈاڑھی کی بات نہیں نکلتی، جو کہیں غائب تھی تو کہیں موجود۔ گر ہارڈ گڈرون کا بہت خیال رکھتا تھا؛ یہ جانتے ہوئے کہ لڑکی کی جلد بہت حساس ہے، اس نے کبھی بوسہ نہیں لیا۔ ان کی محبت پاکیزہ رہی، حالاں کہ پاکیزگی سے انھیں کچھ حاصل نہیں ہوا تھا، کہ لڑکی کیمیا میں دل چسپی رکھتی تھی جب کہ لڑکا ادویات کی تعلیم میں۔ جب ایک دوست نے انھیں اَن یَن سیلر جانے کا مشورہ دیا تو وہ استہزائی انداز میں مسکرائے، جو کیمیا گروں اور شعبۂ ادویات سے متعلق لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے، مگر پھر وہ گئے، دستاویزی مقاصد کی وجہ سے، جیسا کہ دونوں نے ایک دوسرے کو یقین دلایا تھا۔ آسکر نے کبھی جوان لوگوں کو اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر وہ بار بار آتے رہے؛ انھوں نے وہاں کبھی کچھ نہیں کھایا، اور چھ مارک چالیس پنس بچایا، اور ڈاڑھی کے بارے میں آنسو بہایا، جو کہیں غائب تھی، اور کہیں نرم اور کنواری جلد کو برباد کر رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اَن یَن سیلر سے دور رہنے کی کوشش کرتے۔ ایک دوشنبے نہیں آتے، مگر اس کے بعد والے دوشنبے موجود ہوتے تھے۔ اپنی انگلیوں کے درمیان کٹی ہوئی پیاز ملتے ہوئے وہ اعتراف کرتے تھے کہ انھوں نے چھ مارک چالیس پنس بچانے کی کوشش کی تھی؛ دونوں یہی کام سستی پیاز سے اپنے کمرے میں کر لیتے تھے، مگر اس میں وہ بات نہیں ہوتی تھی۔ آپ کو حاضرین کی ضرورت ہوتی ہے۔ ساتھیوں کے ساتھ مل کر رونا کس قدر آسان ہوتا ہے۔ اس طرح آپ میں برادری کا ایک حقیقی احساس ہوتا ہے جب دائیں بائیں اور اوپر گیلری میں آپ کے ساتھی طلبہ دل کھول کر رو رہے ہوں۔

ایک اور معاملہ تھا جس میں اَن یَن سیلر نے نہ صرف آنسو بخشے، بلکہ بتدریج شفا بھی دی تھی۔ بظاہر آنسوؤں نے ان کی جنسی رُکاوٹوں کو دور کر دیا تھا، اور ان کو ایک دوسرے سے بقول شخصے، قریب کر دیا تھا۔ لڑکے نے لڑکی کے مظلوم رخسار کا بوسہ لیا، لڑکی

نے لڑکے کی چکنی ٹھوڑی کو سہلایا، اور ایک دن انھوں نے اَن یَن سیلر آنا بند کر دیا تھا؛ اب انھیں اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ مہینوں بعد، آسکر کی ان سے 'کونِگز ایلی' میں ملاقات ہوئی۔ پہلے تو وہ انھیں پہچان نہیں سکا۔ چکنا گرہارڈ سُرخی مائل لہراتی ہوئی داڑھی میں تھا؛ مہاسوں والی گڈرون کے اوپری لب پر ہلکا سا گہرا دھبا بھی نہیں تھا، جو اس کے لیے بہت مناسب بات تھی۔ اس کی ٹھوڑی اور رخسار چکنے، تابندہ، اور سبزے سے عاری تھے۔ یعنی، ایک زیرِ تعلیم، مگر خوش حال شادی شدہ جوڑا۔ آسکر [تصور میں] انھیں پچاس برس بعد اپنے پوتے پوتیوں سے بات کرتے دیکھ سکتا تھا۔

لڑکی، گڈرون: "یہ تمھارے دادا کی داڑھی سے پہلے کی بات ہے۔"

لڑکا، گرہارڈ: "یہ ان دنوں کی بات ہے، جب تمھاری دادی اپنی داڑھی سے پریشان تھی، اور ہم دونوں ہر ہفتے اَن یَن سیلر جایا کرتے تھے۔"

مگر آپ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ تین موسیقار کس مقصد سے، لرزاں زینے کے نیچے براجمان ہیں؟ اس اَن یَن کی دُکان کا فائدہ کیا تھا؛ ایک باقاعدہ ملازم اور باقاعدہ تنخواہ پانے والے بینڈ کے لیے وہ سب، رونا دھونا، بین کرنا، اور دانت پیسنا کس کام کا ہوتا تھا؟ جب گاہک رو چکتے اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر چکتے، تو ہم اپنے ساز اٹھاتے، اور روزمرہ کی گفتگو کو روایتی موسیقی میں بدل دیا کرتے تھے۔ ہم مہمانوں کی اَن یَن سیلر سے واپسی کو آسان بنا دیتے تھے اور نئے مہمانوں کی آمد کے لیے جگہ مہیا کر دیتے تھے۔ کلیپ، شولے اور آسکر ذاتی طور پر پیاز کے رسیا نہیں تھے۔ مزید برآں، ہمارے معاہدے میں ایک شق تھی جس کی رو سے ہم پیاز کو اس طرح "استعمال" نہیں کر سکتے تھے جیسے کہ مہمان کرتے تھے۔ ہمیں اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ گٹار نواز شولے کے لیے افسوس کی کوئی وجہ نہیں تھی، وہ ہمیشہ خوش اور مطمئن دکھائی دیتا تھا، اُس وقت بھی جب عین راگ کے دوران اس کے بینجو کے دو تار ٹوٹ گئے تھے۔ کلیپ کے نزدیک، رونے اور ہنسنے کا تصور بھی واضح نہیں تھا۔ آنسو دیکھ کر وہ ہنسنے لگتا تھا؛ میں نے کسی کو کبھی اتنے زور سے ہنستے نہیں دیکھا تھا، جس طرح کلیپ، اپنی خالہ کے جنازے کے وقت ہنسا تھا، جو اس کی شادی سے قبل اس کی

قمیصیں اور جرابیں دھویا کرتی تھی۔ آسکر کے بارے میں کیا کہا جائے؟ آسکر کے پاس آنسوؤں کے لیے بہت جواز تھے۔کیا وہ سسٹر ڈوروتھیا کو اور اس ضائع شدہ رات کو جو اس نے ناریل کے لمبے ریشوں والے رَگ پر گزاری تھی بھلا دینے پر اپنے آنسو استعمال نہیں کر سکتا تھا؟ اور میری ماریا؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ماریا نے مجھے بہت دُکھ دیا ہے۔ کیا اس کا افسر اِسٹمپل 'پلک' کے اس فلیٹ میں جب چاہتا آ جا نہیں سکتا تھا؟ کیا میرے بیٹے کُرٹ نے اس کریانے کی دُکان کے مالک کو پہلے 'انکل اِسٹمپل' اور پھر ''پاپا اِسٹمپل'' کہنا شروع نہیں کر دیا تھا۔ اور ان کے بارے میں کیا کہا جائے جو دور افتادہ ریت بھرے قبرستان 'ساسپے' یا 'برنٹاؤ' کے مٹی والے قبرستان میں آرام کر رہے ہیں: بے چاری میری مما، احمق اور خوش مزاج جان برانسکی، اور باورچی ماتسیرات جو احساسات کو شوربے میں بدل دینے کا فن جانتا تھا؟ ان سب پر رونے کی ضرورت تھی، مگر آسکر ان قسمت والوں میں سے ہے جو اب بھی بغیر پیاز کے رو سکتا ہے۔ میری ماں نے میری مدد کی تھی۔ آسکر کو پگھلا کر آنسو بنا دینے میں محض چند خاص طریقے اختیار کرنے پڑتے تھے، جو اَن یَن سیکر کے مہنگے آنسوؤں سے نہ کم تر تھے نہ بہتر۔

جہاں تک اَن یَن سیکر کے مالک اِشمو کا معاملہ ہے، اس نے بھی کبھی اپنی پیاز نہیں چھوئی۔ وہ اپنے فاضل وقت میں باڑوں اور جھاڑیوں میں جو گوریاں شکار کرتا تھا ان سے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی، شکار کے بعد اِشمو ماری گئی گوریاؤں کو کسی اخبار پر قطار سے رکھ دیتا، ان کے پَروں کے چھوٹے چھوٹے بنڈلوں پر، قبل اس کے کہ ان کو ٹھنڈا ہونے کے لیے وقت ملتا، آنسو بہاتا، آنسو بہاتے ہوئے، وہ رھائن کے مرغ زاروں اور ساحلوں کے گول پتھروں پر پرندوں کی غذائیں بکھروایا کرتا۔ تہہ خانے میں تو اس کے پاس ایک غم کے اظہار کا اور ذریعہ تھا۔ اس کو واش روم کی خدمت گاروں پر ہفتے میں ایک بار گرجنے برسنے کا، اور تقریباً متروک طریقۂ اظہار، جیسے ''اخلاق باختہ''، ''کم بخت کسبی''، ''چڑیل'' جیسے الفاظ استعمال کرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ ہم، اسے چیخ کر ''دور ہو جا میرے سامنے سے''، ''ذلیل انسان! تیری نوکری ختم'' وغیرہ کہتے سنتے رہتے تھے۔

ان کو بغیر پیشگی اطلاع کے نوکری سے نکال دیتا، ان کی جگہ کسی اور کو بھرتی کر لیتا تھا، مگر جلد ہی وہ مشکل میں پڑ گیا، کہ واش روم کے لیے کوئی نیا خدمت گار نہیں ملتا تھا۔ اب اس کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ نکالے ہوئے لوگوں کو واپس بھرتی کرتا۔ وہ بخوشی ملازمت قبول کر لیتے؛ ان کے نزدیک اشمو کی توہین آمیز باتیں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں، اور اب وہ زیادہ تنخواہ بھی حاصل کر لیتے تھے۔ اَن یَن سیلر کے مہمان — اتنے رونے دھونے کے باعث — سہولتوں کا بے دریغ استعمال کرتے، اس کے علاوہ اشک فشاں انسان خشک آنکھوں والے متبادلین کے مقابلے میں زیادہ فیاض ہوتے ہیں۔ بالخصوص وہ شرفا جو ایک منٹ کے لیے باہر جانے کے لیے بھی بھرائی آوازوں اور آنسوؤں سے چھلکتی آنکھوں میں آنے جانے کی اجازت چاہتے ہیں، ان سے بخشش کے زیادہ امکانات ہوتے تھے۔ واش روم کے خدمت گاروں کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ تھا؛ پیاز کے نمونے سے مزین رومالوں کی فروخت، جس پر چھپائی میں "In the Onion Cellar" لکھا ہوتا تھا۔ ان رومالوں کی بہت مانگ تھی، کہ جب آنسو پونچھنے کے لیے ضرورت نہ ہوتو ان کو ایک پُرکشش یادگار کے طور پر رکھا جا سکتا تھا اور سر پر باندھا بھی جا سکتا تھا۔ ان کو اَن یَن سیلر کے پھریرے کی طرح گاڑی کے پیچھے آویزاں بھی کیا جا سکتا تھا، جس سے پتا چلتا کہ یہ شخص اَن یَن سیلر کا مستقل گاہک ہے۔ اس طرح تعطیل کے زمانے میں اشمو کے اَن یَن سیلر کا نام پیرس، Côte d'Azur، روم، راوینا، رمنی، حتیٰ کہ دور دراز ہسپانیہ تک پہنچ سکتا تھا۔

ہم موسیقاروں اور ہماری موسیقی سے ایک اور کام لیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی کچھ مہمان ایک کے بعد دوسری پیاز لے لیتے؛ اس کا نتیجہ آسانی سے وبا کی صورت، اور فاسد ہو کر رنگ رلیوں کی شکل اختیار کر جاتا تھا۔ اشمو اس عمل کی ممانعت پر اصرار کرتا؛ اور جب حضرات اپنی ٹائیاں، اور خواتین اپنے بلاوز کے تکمے کھولنے لگتیں تو وہ ہم کو اپنی موسیقی کے ذریعے اس ممکنہ پُرجوش شہوت انگیزی کے توڑ کا حکم دیتا تھا، مگر اشمو خود اس قسم کے نازک و دشوار حالات کا ذمے دار تھا؛ وہ خاص کر خطرے میں پڑنے والوں کو دو پیاز دینے کی مکارانہ عادت سے خود کو باز کیوں نہیں رکھتا تھا۔

سب سے زیادہ قابلِ دید ہنگامہ جو مجھے یاد ہے وہ آسکر کی پوری پیشہ ورانہ زندگی پر اثر انداز ہونے والا تھا، مگر مجھے اس حد سے نہیں جانا چاہیے کہ میں اس کو ایک فیصلہ کن موڑ کہہ دوں۔ اِشمو کی شگفتہ مزاج بیوی، بلی، بہت کم ہی سیلر آتی تھی، اور جب آتی تو اپنے دوستوں کے ہمراہ، اِشمو جس سے خوش نہیں ہوتا تھا۔ ایک رات وہ موسیقی کے مبصر ووڈے اور ماہرِ تعمیرات اور پائپ پینے والے وارکرلائی کے ساتھ آئی تھی۔ وہ دونوں سیلر کے مستقل آنے والے گاہک تھے، مگر ان کے غم نہایت بیزار کن قسم کے ہوتے تھے۔ ووڈے مذہبی وجوہ پر روتا — وہ بار بار کسی نہ کسی شے وغیرہ میں تبدیل یا دوبارہ تبدیل ہوتا رہتا تھا؛ پائپ نوش وارکرلائی اب بھی اس پروفیسری کے لیے ماتم کناں رہتا ہے جو اس نے ڈنمارک کی راتوں میں اُڑنے والی ایک تتلی کی خاطر ٹھکرا دی تھی جو اسے چھوڑ کر چلی گئی اور جنوبی امریکا کے ایک شخص سے شادی کر لی تھی جس سے اس کے چھ بچے ہوئے، جو اَب بھی وارکرلائی کے غم کا باعث تھی اور اس کے سال بہ سال پائپ بدلنے کا باعث ہوتی تھی۔ وہ حاسد ووڈے ہی تھا جس نے میڈم اِشمو کو پیاز کاٹنے پر اُکسایا تھا۔ اس نے پیاز کاٹی، آنسو بہے اور اس نے سب کچھ اُگلنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اِشمو کو ننگا کر دیا، اس کے بارے میں قصے بیان کیے، جو آسکر خاموشی سے آپ تک پہنچائے گا؛ وہ تو کئی طاقت ور گاہکوں کی مزاحمت تھی جس نے اِشمو کو اپنے آپ کو اپنی بیوی پر گرا دینے سے باز رکھا تھا؛ یہ نہ بھولیے گا کہ وہاں ہر میز پر چاقو رکھے ہوئے تھے۔ بہر حال، اِشمو کو بہ زور اس وقت تک روک لیا گیا تھا جب تک کہ نادان بلی اپنے دوستوں، ووڈے اور وارکرلائی، کے ساتھ وہاں سے کھسک نہیں لی تھی۔ اِشمو بہت پریشان تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ اپنی پیازی شال کو بار بار ٹھیک کر رہے تھے۔ کئی بار وہ پردے کے پیچھے غائب ہوا اور واش روم کے خدمت گار کو سخت سست کہا۔ بالآخر وہ بھری ہوئی جھائیں کے ساتھ واپس آیا اور جذبات سے بھری شادمانی کے ساتھ اپنے مہمانوں کو بتایا اس وقت وہ بہت فیاضانہ کیفیت میں تھا اور مفت پیاز بانٹنے کا ایک پھیرا لگانے والا تھا۔ جو اس نے کرنا شروع کر دیا تھا۔

ہر انسانی کیفیت میں، وہ کتنی ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو، کلیپ کوئی نہ کوئی لطیفہ پیش کر دیتا ہے، مگر اس بار وہ ذہنی دباؤ میں تھا اور اس نے اپنی بانسری تیار کر رکھی تھی۔ اس لیے کہ ہم جانتے تھے کہ پیاز کے نشے میں بدمست اتنے سارے لوگوں کو دوبارہ پیاز دینا، یعنی وہ آنسو دینا جو ساری رکاوٹیں بہا لے جائے، کتنا خطرناک ہو سکتا تھا۔

اشمو نے دیکھا کہ ہم سب اپنے سازوں کو تیار لیے بیٹھے تھے اور ہم کو بجانے سے منع کر دیا۔ میزوں پر سبزی کاٹنے والے چاقو اپنا کام کر رہے تھے۔ خوب صورت، گلابی رنگ کے بیرونی چھلکوں کو بے توجہی سے ایک طرف ڈال دیا گیا تھا۔ پیاز کے ہلکے سبز رنگ کی لکیروں والے شیشے جیسے گودے میں چاقو کام کر رہے تھے۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ خواتین میں گریہ شروع نہیں ہوا تھا۔ مرد حضرات جو اپنے کاروبار میں نووارد تھے — آٹے کی ایک بڑی مل کے مالک، ہوٹل کے مالک اور ان کے نوجوان دوست، اشرافیہ کے ایک فرد جو اہم تجارتی ادارے کی کاؤنسل میں اہم سمجھے جاتے تھے، مُردوں کے لباس تیار کرنے والوں سے بھری میز جو بورڈ میٹنگ کے لیے شہر آئے ہوئے تھے، گنجا اداکار جس کو سیکر میں دانت پیسنے والا کہا جاتا تھا، اس لیے کہ جب اس نے گریہ کیا تو اپنے دانت پیس رہا تھا — سب کے سب خواتین کے شامل ہونے سے پہلے گریہ کر رہے تھے، مگر نہ خواتین اور نہ حضرات نے گریہ کیا جس کا تقاضا پہلی پیاز نے کیا تھا: یہ ایک بدحواس، تشنجی گریے کا نشہ تھا۔ دانت پیسنے والے نے خون جما دینے والا دانت پیسا تھا؛ اگر وہ شہ نشین پر ہوتا تو تمام حاضرین اس کے ساتھ دانت پیسنے لگتے؛ مل کے مالک نے اپنا احتیاط سے تنگھی کیا ہوا بھورا سر میز پر رکھ دیا؛ ہوٹل کے مالک نے اپنے تشنج کو اپنے دُبلے پتلے نوجوان دوست کے تشنج میں گڈمڈ کر دیا۔ اشمو نے، جو زینے کے پاس کھڑا تھا، اپنی شال کو گر جانے دیا اور کینہ پرور طمانیت سے اپنے شتر بے مہار ساتھیوں کی طرف غور سے دیکھا۔ اچانک، پکی عمر کی ایک عورت نے اپنے داماد کی آنکھوں کے سامنے اپنا بلاؤز پھاڑ ڈالا۔ ہوٹل والے کے نوجوان دوست نے، جس کی قدرے اَن جانی شکل پر باتیں ہو چکی تھیں، اپنے سیاہ فام دھڑ کو برہنہ کر دیا تھا، اور ایک میز سے دوسری میز تک اچھل اچھل کر ایسا رقص کیا، جیسا شاید کہیں مشرق میں ہوتا ہوگا۔ رنگ رلیاں جاری تھیں، مگر شدت کے باوجود جس کے ساتھ یہ شروع ہوا تھا،

یہ ایک غیر دل چسپ، بے جان ماجرا تھا، جو تفصیل سے بیان کرنے قابل نہیں تھا۔

اِشمو مایوس ہوا؛ آسکر نے بھی کراہیت سے اپنے ابرو اُٹھائے، اور پھر لباس اُتارنے کے حسین مناظر نظر آنے لگے؛ مرد عورتوں کے زیر جاموں میں، تا تاری ٹائیوں اور گیلیس میں؛ ایک دو جوڑے میز کے نیچے؛ دانت پیسنے والا ایک چولی چبانے لگا اور بظاہر اس کا کچھ حصہ نگل بھی گیا تھا۔

بلبل ڈرا دینے والی تھی، لونڈے لپاڑی، جن کا کوئی ماضی نہ ہونے کے برابر تھا۔ جمع ہو گئے تھے۔ آخر کار اشمو، بیزار اور شاید پولیس سے خوف زدہ، زینے کے قریب والی اپنی جگہ سے اُٹھا، ہمارے قریب آ کر جھکا، پہلے کلیپ کو اس کے بعد مجھے گدگدایا اور سرگوشی میں کہا، "موسیقی!... کچھ بجاؤ!... خدا کے لیے ان کو روکو!"

مگر یہ پتا چلا کہ کلیپ خود، جس کو آسانی سے رام کیا جا سکتا تھا، لطف لے رہا تھا۔ قہقہے سے لرزتا، اپنی چھوٹی سی بانسری سے کچھ نہیں کر سکتا تھا شولے، جو کلیپ کو اپنا استاد سمجھتا تھا، قہقہے سمیت، ہر وہ کام کرتا جو کلیپ کرتا تھا۔ صرف آسکر باقی رہ گیا تھا — مگر اِشمو مجھ پر اعتماد کر سکتا تھا۔ میں نے بنچ کے نیچے سے اپنا نقارہ نکالا، لاپروائی سے ایک سگریٹ جلائی اور نقارہ نوازی شروع کر دی۔

بغیر کسی اشارے کے کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں، میں نے اپنا خیال پیش کیا۔ میں نے اپنے کیفے، کنسرٹ کے معمول کو فراموش کر دیا۔ نہ آسکر نے جاز بجایا۔ مگر میں دیوانہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ ٹھیک ہے، میں اچھا نقارہ نواز تھا، مگر hepcat نہیں۔ یقیناً، مجھے جاز پسند ہے، مگر مجھے ویانائی جاز بھی اچھا لگتا ہے۔ میں دونوں جاز بجا سکتا ہوں، مگر مجھے مجبور نہیں کیا گیا۔ جب اِشمو نے مجھے نقارہ بجانے کے لیے کہا، میں نے ہمیشہ وہی بجایا جو میں نے سیکھا تھا، میں نے دل سے بجایا تھا۔ وہ ایک سہ سالہ آسکر تھا جس نے چوب نقارہ اُٹھائی تھیں۔ میں نے پہلے کی طرح بجایا، میں نے دنیا کو اس انداز سے پیش کیا جیسا کہ ایک سہ سالہ دیکھتا ہے۔ میں نے سب سے پہلے ما بعد جنگ کے انسانوں کو قابو کیا تھا جو حقیقی نا ونوش کرنے کے قابل نہیں تھے: میں ان کو پوساڈووسکی وِیگ' میں آنٹی کاؤر کے

کنڈر گارٹن لے گیا تھا۔ جلد ہی ان کے منہ لٹک گئے تھے؛ انھوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیے، اپنے پیروں کے پنجے اندر کی طرف موڑ لیے، اور میرا انتظار کیا، ناممکن وعدے کیے۔ میں نے زینے کے نیچے کی اپنی جگہ چھوڑی اور آگے بڑھا۔ "Bake, bake, bake a cake"، بجایا وہ میرا پہلا نمونہ تھا۔ جب میں نے اپنی کامیابی ثابت کی — ہر بار بچوں جیسی خوشی کے ساتھ — میں نے ان کو ڈرانے کا فیصلہ کیا۔ "کہاں ہے کلوٹی، کہاں ہے چڑیل" کی نقارہ نوازی کی۔ اور میں نے بدمعاش کالی چڑیل کو اکسایا جو اسکول کے دنوں میں مجھے ڈراتی تھی اور حالیہ دنوں میں اور بھی خوف زدہ کرتی ہے؛ میں نے اس کو اس کے تمام بھیانک، کوئلے جیسے سیاہ ڈراؤنے پن سمیت تیزی سے ان ہنی سیکر سے گزارا، اور وہ نتائج نکالے، جن کے لیے اِشمو کو ان کاموں کے لیے پیاز درکار ہوتی تھی؛ خواتین اور حضرات بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے، خواتین اور حضرات گلابی اور سبز سے خوف زدہ تھے، انھوں نے مجھ سے رحم کی التجا کی اور پھر، ان کو تسلی دینے کے لیے، اور جزوی طور پر ان کو ان کے بیرونی اور اندرونی لباس میں، ان کے ریشم اور ساٹن میں، واپس لے جانے کے لیے میں نے اپنے نقارے پر "Green, green, green is my raiment" اور "Red, red, red is my raiment"، اس کے علاوہ "Blue, blue, blue..." اور "Yellow, yellow, yellow" بجایا۔ ان تمام رنگوں کے بعد میں نے ان کا ایک جلوس ترتیب دیا اور ان کو ہنی سیکر سے گزار کر لے گیا، گویا یہ 'جیش کنھا کر وگ' ہو۔ میں ان کو کریہہ 'گوٹن برگ مانومنٹ' سے ہوتا ہوا 'ارسن برگ' تک لے گیا، اور 'جوہانس ویزے' پر گلبہار کھلے ہوئے تھے جنھیں وہ، خواتین و حضرات، معصومانہ مسرت کی کیفیت میں توڑنے میں آزاد تھے۔ تب، بالآخر، سر براہ اِشمو سمیت ان سب کو پہلا نغمہ بجانے کی اجازت دی۔ ہم سب 'ڈیولس گلچ' پہنچنے والے تھے، جو ایک منحوس جگہ تھی، تب میں نے اپنے نقارے کے ذریعے کہا: بچو، اب تم جا سکتے ہو۔ اور انھوں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ تمام خواتین و حضرات، اِشمو سمیت، حتیٰ کہ دور افتادہ واش روم کے خدمت گاروں اور تمام چھوٹے بچوں نے خود کو گیلا کر لیا... پھس، پھس...

کرتے ہوئے گئے، سب اُکڑوں بیٹھ گئے اور ان آوازوں کو سُنا جو وہ کر رہے تھے اور سب نے اپنے پتلون گیلے کر لیے۔ یہ اسی وقت ہوا جب موسیقی بند ہوگئی، کہ میں نے ایک زور دار گونج کے ساتھ ایک بے ضبط مسرّت دی تھی۔ فقط میرے بارے میں سب دہاڑے، دبی ہنسی ہنسے، اور بچکانہ فضولیات بڑبڑائے:

چھوٹی سی اِک کھڑکی توڑو
بیئر میں چینی ڈالو
مسز پڈل بڑی دھوکے والی
پیاری، پیاری، پیاری

میں ان سب کو کوٹ ٹانگنے والے کمرے میں لے گیا جہاں ایک حواس باختہ طالبِ علم نے اِشمو کے کِنڈر گارٹن والوں کو زیر جامے دیے؛ پھر، معروف "Hard-working washerwomen scrubbing out the clothes," بجا بجایا، میں نے یہ سب کانکریٹ کے قدمچوں پر، پوستین میں ملبوس دربان کے قریب بجائے تھے۔ میں نے کِنڈر گارٹن کو برخواست کر دیا تھا، 1950 کے خزاں کے موسم کی ایک رات میں، جو قدرے سرد تھی مگر پری کہانیوں جیسے ستاروں سے سجی ہوئی تھی، گویا خاص کر اسی موقعے کے لیے تیار کرائی گئی ہو۔ اپنے گھروں سے بے پروا، کافی دیر تک وہ پرانے شہر میں بچکانہ حرکتیں کرتے رہے، اس وقت تک کہ پولیس نے ان کو ان کی عمریں، ان کی سماجی حیثیت، اور ٹیلی فون نمبر یاد دلائے۔

اور میں! میں ہنستا اور اپنے نقارے کو سہلاتا، اَن سُن سیلر کی طرح رواں تھا جہاں اِشمو اب بھی تالیاں بجاتا، کمان جیسی ٹانگیں اور پیشاب میں تر بتر زینے کے پاس کھڑا تھا، ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ اتنا ہی خوش تھا جیسے کہ آنٹی کاؤر کے کِنڈر گارٹن میں، وادیِ رھائن کے مرغ زاروں کی درمیان کھڑا تھا جب ایک بالغ اِشمو گوریاں شکار کر رہا تھا۔

# دیوارِ اوقیانوس یا ابدی کانکریٹ

میں تو صرف اس کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر اِشمو، اَن دِین سیلر کا مالک اور روحِ رواں، مجھے معاف نہیں کر سکا، اس لیے کہ میری تنِ تنہا نقارہ نوازی نے اس کے اچھے قیمت ادا کرنے والے مہمانوں کی بچگانہ انداز میں بات کرنے والے اور دھما چوکڑی کرنے والے بچوں میں قلبِ ماہیت کر دی تھی، جنھوں نے اپنے پتلون گیلے کر دیے، اور جب ان کے پتلون گیلے ہو گئے تو پیاز کے بغیر ہی رونے لگے تھے۔

آسکر اس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا وہ میری مسابقت برداشت کر سکتا تھا، جب کہ اس کے مہمان اس کی روایتی پیاز کو ایک طرف رکھ کر آسکر کا، یا آسکر کے نقارے کا مطالبہ کرنے لگے تھے، اس لیے کہ میں اپنے نقارے کی مدد سے، خواہ وہ کتنے ہی عمر رسیدہ اور کم زور کیوں نہ رہے ہوں، ان کے ذہنوں کو ان کے بچپنے میں واپس لے جا سکتا تھا۔ پہلے تو اِشمو، پیشگی اطلاع دیے بغیر، واش روم کے خدمت گاروں کو برطرف کر کے ہی مطمئن ہو جاتا تھا۔ اب اس نے پورے Rhine River Three کو برطرف کر دیا تھا۔ ہماری جگہ پر اس نے کسی چلتے پُرزے کو ملازم رکھ لیا تھا جو اگر آپ ایک آنکھ بند کر کے دیکھیں تو، خانہ بدوش جیسا دکھائی دیتا۔

مگر جب ہماری برطرفی کے نتیجے میں، کئی مہمانوں نے، جو بے حد وفادار تھے، اَن دِین سیلر سے ہمیشہ کے لیے علاحدہ ہو جانے کی دھمکی دی، تو اِشمو کو مفاہمت پر مجبور ہونا

پڑا۔ وہ چلتا پُرزہ ایک ہفتے میں تین بار رنا کامیاب ہوا۔ تین بار ہم نے کام بھی دکھایا اور ہمارے مشاہرے میں بیس ڈوئش مارک فی شب اضافہ بھی ہوا۔ وہاں بخشش بھی ملتی تھی؛ آسکر نے اپنا بچت اکاؤنٹ کھول لیا تھا اور سود ملنے پر خوش بھی ہوتا تھا۔

بہت جلد ہی، جب میرا بچت اکاؤنٹ میری ضرورتوں کا رفیق بننے والا تھا، موت ہمارے فرڈیننڈ اِشمو کو، ہماری ملازمت کو اور ہماری آمدنی کو چُرا لے گئی۔

میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اِشمو گوریاں مارا کرتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ہمیں اپنی مرسیڈیز میں لے جاتا اور تماشا دیکھنے کا موقع بھی دیتا تھا۔ میرے نقارے کے بارے میں ہماری نا اتفاقی کے باوجود، جس میں کلیپ اور شولے بھی شامل تھے، اس لیے کہ وہ میری طرف داری کرتے تھے، اِشمو اور اس کے موسیقاروں کے درمیان تعلقات اس وقت تک دوستانہ رہے، جب تک کہ، جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ہمارے درمیان موت حائل نہیں ہو گئی تھی۔

ہم سب گاڑی میں لد گئے۔ ہمیشہ کی طرح، اِشمو کی بیوی گاڑی چلا رہی تھی۔ کلیپ اس کے برابر بیٹھا تھا۔ آسکر اور شولے کے درمیان اِشمو بیٹھا، اپنے گھٹنوں پر رائفل رکھے تھا اور کبھی کبھی اس کو سہلانے لگتا تھا۔ ہم 'کیزر ورتھ' سے ذرا پہلے رُکے۔ رھائن کے دونوں کناروں پر پیڑوں کی قطاریں تھیں۔ شکار کی تیاری مکمل تھی۔ اِشمو کی بیوی کار ہی میں رُکی اور اخبار کھول کر پڑھنے لگی۔ کلیپ اپنے ساتھ کشمش وغیرہ لایا تھا اور اپنی قابلِ دید پابندی سے ان سے شغل کرنے لگا۔ شولے نے، جو نہ جانے کس مضمون کا طالبِ علم رہا تھا، اپنے دماغ پر زور ڈال کر دریائے رھائن کے بارے میں کچھ نظمیں نکالیں، جس نے عام نوعیت کی barges کے علاوہ بھی اپنا ادبی قدم بڑھایا تھا، جو، 'ڈوئس برگ' کی سمت، ہوا میں خزاں کی لہراتی پتیوں کا نظارہ پیش کر رہا تھا، حالاں کہ کیلنڈر کے مطابق اس وقت تک گرما ہی کا موسم تھا۔ اگر اِشمو کی رائفل نے وقتاً فوقتاً اپنی آواز نہ نکالی ہوتی تو 'کیزر ورتھ' کی اس شام کو پُر امن بلکہ پُر سکون کہا جا سکتا تھا۔

جب کلیپ نے اپنی کشمش وغیرہ کھا کر گھاس پر اپنی انگلیاں پونچھ لیں، اِشمو بھی اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ اخبار کے کاغذ پر رکھی گیارہ عدد، جیسا کہ اس نے خود کہا تھا، پروں کی

ٹھنڈی گیندوں کے علاوہ اس نے، بارہویں گیند رکھی جو اس وقت بھی لرز رہی تھی۔ شکاری اپنا ''سامان'' باندھ ہی رہا تھا— کسی لاانتہا وجہ سے اِشمو اپنا سارا شکار ہمیشہ اپنے ساتھ گھر لے جاتا تھا— کہ ایک گوریا ایک پیڑ کی جڑ پر آ کر بیٹھ گئی جسے دریا کی لہروں نے کنارے سے لگا دیا تھا، جو ہم سے زیادہ دور نہیں تھا۔ گوریا اس کے بارے میں اتنی شوخی کر رہی تھی کہ اِشمو مزاحمت نہیں کر سکا؛ اُس نے، جو کبھی بارہ سے زیادہ گوریاں شکار نہیں کرتا تھا، اس شام تیرہواں شکار کر لیا، جو اسے کرنا نہیں چاہیے تھا۔

جب وہ بارہ شکاروں کے ساتھ تیرہواں رکھ چکا تو ہم سب کالی مرسیڈیز کی طرف گئے اور میڈم اِشمو کو سوتا پایا۔ شولے اور کلیپ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ میں ان میں شریک ہونے والا تھا مگر نہیں ہوا؛ میرا جی چہل قدمی کو چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا، میں ٹرام گاڑی سے آؤں گا، میری پروا نہ کی جائے اور پھر وہ لوگ آسکر کے بغیر گاڑی لے گئے، جو بہت عقل مند تھا کہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں گیا۔

میں ان کے پیچھے آہستہ آہستہ چلا۔ مجھے زیادہ دور نہیں جانا تھا۔ سڑک کے ایک حصے کی مرمت ہو رہی تھی اور اس کا ایک متبادل راستہ تھا۔ متبادل راستہ بجری کے ایک گڑھے کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا۔ اور بجری کے اس گڑھے میں، سڑک سے اندازاً بیس فٹ نیچے، کالی مرسیڈیز پڑی ہوئی تھی، اس کے چاروں پہیے ہوا میں بلند تھے۔

مرمت کرنے والے مزدوروں نے کار سے تین زخمی افراد کو اور اِشمو کی لاش نکالی۔ ایمبولینس راستے میں تھی۔ میں اس گڑھے میں اُترا— میرے جوتے بجری سے بھر گئے تھے— اور جلد ہی زخمی لوگوں میں مصروف ہو گیا؛ درد کے باوجود جو اُن کو ہو رہا تھا، انھوں نے سوال پوچھنے شروع کیے، مگر نے انھیں بتایا نہیں کہ اشمو مر گیا تھا۔ اکڑا اور خوف زدہ چہرہ، آسمان کی طرف تھا، جس پر زیادہ تر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اخبار جس میں اس کی شام کا شکار تھا، کار سے باہر پڑا تھا۔ میں نے بارہ گوریاں گنی تھیں مگر تیرھویں نظر نہیں آئی۔ میں اس وقت بھی اسے تلاش کر رہا تھا جب ایمبولینس گڑھے میں گر رہی پڑی تھی۔

اشمو کی بیوی، کلیپ اور شولے کو زیادہ چوٹیں نہیں آئی تھیں۔ بس، کچھ چھوٹے

موئے زخم، چند ٹوٹی پسلیاں۔ جب میں کلیپ کو دیکھنے اسپتال گیا اور اس سے پوچھا کہ حادثہ کیسے ہوا، تو اس نے ایک حیرت انگیز قصہ سنایا۔ جس وقت وہ اس بجری کے گڑھے کے قریب سے آہستہ گزر رہے تھے، اس لیے کہ سڑک کی حالت خراب تھی، عین اس وقت باڑوں، جھاڑیوں اور پھل کے درختوں سے سیکڑوں، بلکہ شاید ہزاروں گوریاں جھنڈ کی صورت میں نکلیں اور مرسیڈیز پر سایہ بن کر ٹکرا گئیں جس سے سامنے کا شیشہ ٹوٹ گیا، اور اور مسز اِشمو خوف زدہ ہو گئی۔ محض گوریوں کی طاقت حادثے کا، اور اِشمو کی موت کا سبب بنی تھی۔

آپ کلیپ کے قصے کے بارے میں جو چاہیں سوچ سکتے ہیں، مگر آسکر اس وقت شک میں پڑ جاتا ہے، خاص کر جب غور کرتا ہے کہ جب جنوبی قبرستان میں اِشمو دفنایا جا رہا تھا اس وقت، وہ، یعنی آسکر اتنی گوریاں نہیں دکھی سکا تھا جتنی کہ وہ اس زمانے میں دیکھا کرتا تھا، جب اسے لوحِ مزار نصب کرنے کے لیے وہاں آنا پڑتا تھا۔ بہر حال جب میں کرایے کی ہیٹ پہنے سوگواروں کے ساتھ تابوت کے پیچھے چل رہا تھا، مجھے سیکشن نو میں کارنیف کی ایک جھلک نظر آئی تھی: وہ دو قبروں کی جگہ پر، اپنے ایک معاون کی مدد سے جو میرے لیے اجنبی تھا، ڈایورائٹ کی ایک لوح نصب کر رہا تھا۔ جب اِشمو کی میت سمیت تابوت سنگ تراش کے پاس سے ہوتا ہوا نئے تیار کردہ سیکشن دس کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو کارنیف نے قبرستان کے قوانین کے مطابق اپنی ہیٹ اُتار لی تھی: شاید میری کرایے کی ہیٹ کی وجہ سے وہ مجھے پہچان نہیں سکا تھا، مگر اس نے اپنے پکتے ہوئے، یا زیادہ پکے پھوڑے کی وجہ سے اپنی گردن سہلائی تھی۔

جنازے! میں آپ کو نہ جانے کتنے قبرستانوں میں لے گیا ہوں گا! کہیں، میں نے کہا تھا کہ جنازے دوسرے جنازوں کی یاد دلاتے ہیں۔ ٹھیک ہے، میں اِشمو کے جنازے کے بارے میں تفصیل سے، یا اس وقت کی آسکر کی، بہ بنائے استغراق، ماضی کی گفتگو سے پرہیز کروں گا۔ بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اِشمو کی تدفین عام قسم کی اور نفاست سے ہوئی تھی، کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوا تھا۔ میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جب اِشمو دفنایا جا چکا تھا، اس وقت ایک صاحب میرے پاس آئے تھے اور انھوں نے ڈاکٹر ڈوش کے نام سے اپنا تعارف کرایا تھا۔

ڈاکٹر ڈوش کنسرٹ کا دفتر چلاتا ہے مگر کنسرٹ اس کی ملکیت نہیں۔ وہ اُن مَنی سیکر کا مستقل مہمان رہا ہے: یہ بات خود اس نے ہی مجھے بتائی تھی۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا، مگر وہ اس وقت وہیں تھا، جب میں نے اِشمو کے گاہکوں کی فضول گفتگو کرنے والے بچوں میں قلبِ ماہیت کردی تھی۔ اس نے مجھے رازداری میں بتایا کہ میرے نقارے کے زیرِ اثر وہ خود بھی اپنے بچپنے کی مسرتوں میں لوٹ گیا تھا اور، جیسا کہ اس نے کہا تھا، وہ میری ''بہترین کرتب بازی'' سے بہت بڑا کام کرنے کے لیے بالکل تیار ہو گیا تھا۔ اس کو مجھے ایک معاہدہ پیش کرنے کے لیے کہا گیا تھا، بہترین معاہدہ: میں نے اس پر فوراً ہی دستخط کیوں نہیں کردیے تھے؟ شمشان کے باہر، جہاں لیوشگر، جو 'ڈوسلڈارف' میں وِلم سلومبر کے نام سے جانا جاتا تھا، جب اپنے سفید دستانے میں سوگواروں کا انتظار کر رہا تھا، ڈاکٹر ڈوش نے ایک کاغذ نکالا تھا جس میں بہت بڑی رقوم کے عوض، دستخط کرنے والے کو، جس کا اب ''آسکر نقارہ نواز'' کے نام سے حوالہ دیا جائے گا، بڑے تھیٹروں میں یک فنی کردار ادا کرنے کے لیے خود، بہ نفسِ نفیس، دو سے تین ہزار تک حاضرین کے سامنے شہ نشین پر پیش ہونا ہوگا۔ ڈوش اس وقت دل شکستہ ہو گیا جب میں نے کہا کہ میں فوراً دستخط نہیں کر سکتا۔ میں نے اس کی وجہ اِشمو کی موت بتائی تھی: اِشمو، میں نے کہا تھا، مجھ سے بہت قریب تھا، میں کسی طرح بھی، کسی اور کے ساتھ، اس وقت تک کام نہیں کرسکوں گا جب تک اس کی لاش اپنی قبر میں ٹھنڈی نہیں ہو جاتی۔ مجھے اس موضوع پر سوچنا پڑے گا، ہو سکتا ہے کہ مجھے تھوڑے دنوں کے لیے کہیں جانا بھی پڑ جائے: ڈاکٹر ڈوش کی اس پیش کش پر میں واپس آتے ہی غور کروں گا، تب ہی شاید میں اس کاغذ پر دستخط کرسکوں گا، جس کو اس نے معاہدہ کہا تھا۔

بہرحال، اگرچہ میں نے قبرستان میں کسی معاہدے پر دستخط نہیں کیے تھے، مگر آسکر کی مالی حالت نے اسے ڈاکٹر ڈوش سے کچھ رقم پیشگی لینے پر مجبور کردیا تھا، جو اس نے رازداری میں، ایک لفافے میں چھپا کر، جس میں اس کا تعارفی کارڈ بھی تھا، قبرستان کے باہر، جہاں اس نے اپنی گاڑی کھڑی کر رکھی تھی، دی تھی۔

اور پھر میں نے سفر اختیار کیا: مجھے ایک رفیقِ سفر بھی مل گیا تھا۔ دراصل، مجھے

اپنے ساتھ کلیپ کو لے جانا چاہیے تھا، مگر کلیپ اسپتال میں داخل تھا، کلیپ ہنس بھی نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ اس کی چار پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ماریا ساتھ ہوتی تو اچھا تھا، مگر گرما کی تعطیل کے دن تھے، اور گرٹ کو ہمارے ساتھ جانا پڑتا۔ اس کے علاوہ، ماریا اپنے افسر اینٹسبل کی ساتھ پھنسی ہوئی تھی، جو خود کو گرٹ سے پاپا اینٹسبل کہلوانے لگا تھا۔

بالآخر میں لانکیز کے ساتھ چلا۔ بلاشبہ آپ کو کارپورل لانکیز یاد ہوگا اور اس کی کسی زمانے کی منگیتر میوز اُلا بھی۔ جب پیشگی حاصل کی ہوئی رقم اور بچت اکاؤنٹ کی کتاب جیب میں لیے میں 'بحار وُر اشتراسے' میں واقع لانکیز کے اسٹوڈیو گیا تو مجھے توقع تھی کہ وہاں، میری سابقہ شریک کار موجود ہو گی؛ اور میں نے سوچا تھا کہ میں اسے بھی اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دوں گا۔

اُلا وہاں موجود تھی۔ دروازے کی قریب ہی اس نے مجھے بتایا: ہم نے دو ہفتہ ہوئے منگنی کر لی ہے۔ ہانسیشن کراگیس کے ساتھ اس کی بنی نہیں، اور اس کو منگنی توڑنی پڑی تھی۔ کیا میں ہانسیشن کراگیس سے واقف تھا؟

نہیں، آسکر نے کہا، کہ اسے بے حد افسوس تھا کہ وہ اُلا کے سابق منگیتر سے واقف نہیں تھا۔ آسکر نے فیاضانہ پیش کش کی، مگر قبل اس کے کہ اُلا قبول کرتی، اسٹوڈیو سے لانکیز بر آمد ہوا، اور خود کو آسکر کے سفر کا ہمراہ منتخب کیا، اور لمبی ٹانگوں والی میوز کے کان بند کر دیے اس لیے کہ وہ گھر میں ٹھہرنا نہیں چاہتی تھی اور مایوسی کے عالم میں رونے لگی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آسکر نے اپنا دفاع کیوں نہیں کیا؟ اگر وہ میوز کو سفر کا ساتھی بنانا چاہتا تھا تو اس نے اُلا کا ساتھ کیوں نہیں دیا تھا؟ اگرچہ میں اُلا کے ہمراہ سفر کی توقع کر رہا تھا، اُلا اتنی نازک، اُلا اتنی روئیں دار اور سنہرے بالوں والی تھی؛ اس کے علاوہ میں ایک میوز کی زیادہ قربت سے خائف تھا۔ بہتر ہے کہ ایسی شخصیتوں کو دور ہی رکھا جائے، میں نے اپنے آپ سے کہا تھا، ورنہ میوز کا بوسہ گھریلو عادت سی بن کر رہ جائے گا۔ عقل مندی اسی میں ہے کہ لانکیز کے ساتھ سفر کیا جائے جو اپنی میوز کی بوسے کی کوشش کے دوران خوب ڈھنائی کرتا ہے۔

ہماری منزل کے بارے میں کم بات ہوئی۔ بلاشبہ، 'نارمنڈی' ورنہ اور کہاں؟ ہم 'کان' اور 'کابورگ' کے درمیان کی قلعہ بندیاں دیکھنے جائیں گے کہ وہیں جنگ کے دوران ہم ملے تھے۔ مشکل صرف ویزے کی تھی، مگر آسکر وہ شخص ہے جو ویزہ وغیرہ پر اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔

لانکیز خصیص انسان ہے۔ جس افراط سے وہ، بُرے طریقے سے تیار کی ہوئی کینوس پر، پینٹ پھینکتا ہے — جو سستی چیز ہے اور آسانی سے اُڑا لی جاتی ہے — اسی طرح وہ سکے اور نوٹ نہیں لُٹاتا۔ وہ ایسا مسلسل تمباکو نوشی کرنے والا شخص ہے جس نے کبھی سگریٹ نہیں خریدی۔ مزید یہ کہ اس کی کنجوسی منظم طریقے سے ہوتی ہے: جب کوئی اسے سگریٹ پیش کرتا ہے تو وہ اپنے پتلون کی بائیں جیب سے دس پینی کا ایک سکہ نکالتا ہے، اس فیاضی کے اعتراف میں اپنی ٹوپی اُٹھاتا ہے، اور سکے کو اپنے پتلون کی دائیں جیب میں ڈال دیتا ہے جس میں وہ سکہ دوسرے سکوں کے ساتھ اپنی جگہ بنا لیتا ہے -- کتنے سکوں میں، یہ دن کے وقت کے حساب سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ وہ ہر وقت تمباکو نوشی کرتا رہتا ہے، ایک دن جب وہ خوش مزاجی کی کیفیت میں تھا، اس نے مجھے رازداری میں بتایا تھا، "میں صرف تمباکو نوشی میں روزانہ دو مارک بنا لیتا ہوں۔"

پچھلے برس اس نے 'وریسٹی' میں ایک بم زدہ عمارت خریدی تھی۔ اس کی قیمت اس کے دوستوں اور جاننے والوں کی دی ہوئی سگریٹ سے ادا ہوئی تھی۔

یہ تھا لانکیز، آسکر جس کے ساتھ نارمنڈی گیا تھا۔ ہم نے ایکسپریس ریل گاڑی میں سفر کیا تھا۔ لانکیز تو پیدل جانا چاہتا تھا، مگر چوں کہ وہ میرا مہمان تھا اور میں سفر خرچ ادا کر رہا تھا تو اس کو خاموش ہو جانا پڑا تھا۔ ہم سفیدے کے درختوں سے گزرے، جن کے عقب میں، جھاڑیوں کے حصار میں، مرغ زار تھے۔ بھوری اور سفید گایوں نے مضافاتی علاقو ں کو دودھیا چاکلیٹ کا اشتہار بنا دیا تھا، حالاں کہ اشتہاری مقاصد کے لیے آپ کو جنگ کی تباہیوں کو چھپا دینا ہوگا۔ سارے گاؤں، جن میں 'دیہہ' یا 'وینٹ' بھی شامل تھا جہاں میں نے اپنی روزی روٹی کھوئی تھی، اب بھی بہت خراب حالت میں تھے۔

'کابورگ' سے دریائے 'اورنے' کے دہانے تک، ہم ساحل کے کنارے کنارے پیدل گئے۔ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ ہم 'لی ہوم' کے قریب تھے جب لانکیز نے کہا، ہم ایک بار

پھر اپنے گھر پہنچ گئے ہیں، بیٹا۔ ذرا، ایک سگریٹ تو دینا۔'' پتلون کی ایک جیب سے دوسری جیب میں سکے کے تبادلے کے بعد اس نے اپنا بھیڑیے جیسا سر ریت کے ٹیلوں میں موجود کئی صحیح سالم پل باکسوں میں سے ایک پل باکس کی طرف بڑھایا۔ ایک لمبے ہاتھ سے اپنا سفری تھیلا، اپنی سفری easel اور ایک درجن فریم اپنے پیٹھ پر لادے؛ اور دوسرے لمبے ہاتھ سے مجھے کھینچتا کانکریٹ کی طرف لے گیا۔ آسکر کا سامان ایک صندوق، اور اس کے نقارے پر مشتمل تھا۔

بحرِ اوقیانوس کے ساحل پر قیام کے تیسرے دن — اس دوران ہم نے ڈورا سیون میں سے جمع ہو جانے والی ریت نکالی، اور محبت کرنے والے جوڑوں کی مکروہ نشانیاں صاف کیں، جو اس جگہ کو استعمال کرتے تھے، اس میں ایک بنچ اور ایک سلیپنگ بیگ ڈالا — لانکیو ساحل سے ایک اچھی بڑی سی کاڈ مچھلی لیے ہوئے آیا۔ کچھ ماہی گیروں نے یہ مچھلی اسے ان کی کشتی کی تصویر بنانے کے عوض دی تھی۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ہم ایک پل باکس کو ڈورا سیون کہتے تھے، یہ حیرت کی بات نہیں ہو گی کہ جب آسکر مچھلی صاف کر رہا تھا اس کا ذہن سسٹر ڈوروتھیا کی طرف منعطف ہو گیا ہو گا۔ اس دوران اچانک مچھلی کے کلیجے اور طحال سے اچھل کر خون نکلا جس سے میرے دونوں ہاتھ آلودہ ہو گئے۔ چھلکا اتارتے وقت میرے منہ پر سورج کی کرنیں پڑ رہی تھی، جس نے لانکیو کو بلا سوچے سمجھے آبی رنگ ڈال دینے کا موقع فراہم کر دیا۔ ہوا سے بچنے کے لیے ہم پل باکس کے پیچھے بیٹھ گئے۔ کانکریٹ کے گنبد پر اگست کا سورج آگ برسا رہا تھا۔ میں نے مچھلی پر لہسن ملا۔ مچھلی کے پیٹ میں، جس جگہ طحال اور کلیجا اور اس سے متعلق آلائش ہوتی ہے، اسے میں نے پیاز، پنیر اور جنگلی پودینے سے بھر دیا؛ مگر میں نے کلیجے اور طحال کو پھینکا نہیں؛ یہ دونوں مزے دار چیزیں مچھلی کے جبڑوں کے درمیان ٹھونس دیں، جسے میں نے ایک لیموں پھنسا کر کھول رکھا تھا۔ لانکیو نے کچھ فوجی معلومات حاصل کیں۔ اور وہ 'ڈورا فور'، 'ڈورا تھری' وغیرہ میں غائب ہو گیا۔ جلد ہی وہ کچھ بورڈ اور بڑے وفتی سے بنے ڈبے لیے واپس آیا۔ وفتی کے ڈبے اس نے پینٹ کرنے کے لیے رکھ لیے؛ لکڑی آگ جلانے کے لیے تھی۔

آگ جلائے رکھنے میں کوئی مشکل نہیں تھی؛ ساحل پر جگہ جگہ لہروں کی پھینکی ہوئی

لکڑیوں کے ٹکڑے بکھرے تھے، جن سے ریت پر مختلف قسم کے سائے بن گئے تھے۔ جلتے ہوئے کوئلوں پر میں نے لوہے کی بالکنی سے نکلی ہوئی جالی کا ایک ٹکڑا رکھ دیا، جو لانگیر کسی ویران ساحلی بنگلے سے توڑ لایا تھا۔ میں نے مچھلی پر روغنِ زیتون ملا اور اس کو گرم جالی پر رکھ دیا، اُس پر بھی تیل لگا دیا گیا تھا۔ میں نے چٹختی ہوئی مچھلی پر لیموں نچوڑا اور اس کو دھیمی آنچ پر پکنے کے لیے چھوڑ دیا — اس لیے کہ مچھلی کو پکانے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔

ہم نے کچھ خالی بالٹیوں پر ایک بڑا سا کولتار لگا تختہ رکھ کر میز بنائی تھی۔ ہمارے پاس اپنے کانٹے اور ٹین کی بنی پلیٹیں تھیں۔ لانگیر کی توجہ مبذول کرانے کے لیے، جو مچھلی کے اطراف بھوکے بگلے کی طرح گھوم رہا تھا، میں پل باکس کی طرف گیا اور اپنا نقارہ نکال لایا۔ اس کو ریت پر رکھ کر میں نے ہوا میں، اٹھتی لہروں کی مختلف آوازوں پر، اور بڑھتے ہوئے جوار بھاٹے پر نقارہ نوازی شروع کر دی۔

محاذ کا ہیر انجینئر، کانکریٹ کا معائنہ کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ کشوبیا سے نارمنڈی تک۔ فیلکس اور کٹی، دو قلابازوں نے پل باکس پر شادی کر لی اور جب آسکر ہوا کے مخالف نقارہ نوازی کر رہا تھا، ہوا کے خلاف اس نے ایک نظم پڑھی، جس سے پرہیز نے، جنگ کے بیچوں بیچ، آرام و سکون کے عہد کی آمد کا اعلان کیا تھا"... سکون کا خیال نشہ دار ہوتا ہے: رجحان بورژوا اور خود پسند ہوتا ہے..." کیٹی نے اپنے جرمن لہجے میں خطاب کیا؛ اور پروپیگنڈا کمپنی کے کپتان ہیرا نے اثباتی اشارہ کیا؛ اور میری روزویٹا نے پک نِک کی جھابی سنبھالی اور میز کو لے جا کر کانکریٹ پر رکھ دیا، ڈورا سیون کے اوپر؛ اور کارپورل لانگیر نے بھی ہماری سفید آٹے کی پاؤ روٹی کھائی، ہماری چاکلیٹ پی اور کپتان ہیرا کی سگریٹیں پیں...

"سنو آسکر!" اتنا کہہ کر لانگیر نے مجھے ماضی کے خواب سے جگا دیا۔ "آسکر! کاش میں تمھیں نقارے کی طرح پینٹ کر سکتا! مجھے ایک سگریٹ تو دو۔"

میں نے نقارہ نوازی تیز کر دی، اپنے ساتھی کو ایک سگریٹ دی، مچھلی کا معائنہ کیا، اور دیکھا کہ وہ ٹھیک ٹھاک تھی: اس کی آنکھیں سفید تھیں، پُرسکون، اور رقیق۔ آہستہ آہستہ میں نے آخری لیموں نچوڑا، اس طرح کہ اس کی کھال کا کوئی چھوٹا سا بھی حصہ رہ نہ جائے،

جو جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی، مگر جو خوب صورت بھورے رنگ کی ہو رہی تھی۔

''میں بہت بھوکا ہوں۔'' لانکیر نے کہا۔ اس نے اپنے لمبے، نوکیلے، پیلے دانت نکال دیے اور چارخانے والی قمیص کے اوپر سے، لنگور کی طرح، دونوں مٹھیوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگا۔

''سر لوگے یا دُم؟'' مچھلی کو مومی کاغذ پر رکھتے ہوئے میں نے پوچھا، جو اس نے میز پوش کی جگہ بچھا رکھا تھا۔

''تمھارا کیا مشورہ ہے؟'' لانکیر نے اس کے منہ سے سگریٹ چھینی اور بجھا دی۔

''دوستی میں تو کہوں گا: دُم لے لو۔ باورچی کی حیثیت میں: سر لینے کا مشورہ دوں گا؛ دوسری صورت میں، اگر میری مما اس جگہ اور اس وقت ہوتی، جو مچھلی کی بڑی رسیا تھی، تو کہتی: مسٹر لانکیر، دُم لے لیجیے، تب آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کو کیا ملا ہے؛ تیسری صورت یہ ہوگی کہ، ڈاکٹر میرے باپ کو نسخے میں ہمیشہ مچھلی لکھتا تھا...''

''مجھے ڈاکٹروں سے کوئی دل چسپی نہیں۔'' لانکیر نے بے اعتمادی کے لہجے میں کہا۔

''ڈاکٹر ہولاٹز میرے باپ کو ہمیشہ کاڈ مچھلی کا سر کھانے کا مشورہ دیتا تھا۔''

''تب تو میں دُم ہی لوں گا۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم مجھے کچھ اور تھمانا چاہ رہے ہو۔'' لانکیر اب بھی شبہے میں تھا۔

''آسکر کے لیے تو سر ہی بہتر ہے، اور میں اسی کو ترجیح دوں گا۔''

''اچھا، اگر تم اس کے اتنے دیوانے ہو، تو میں سر والا حصہ ہی لے لوں گا۔''

''آج کل تم پریشان معلوم ہوتے ہو، ہے نا، لانکیر؟'' میں نے کہا، ''ٹھیک! سر تمھارا ہے؛ میں دُم لے لوں گا۔ امید تھی کہ اس پر مکالمہ ختم ہو جائے گا۔''

''ہا، ہا'' لانکیر نے ہنس کر کہا، ''میرا خیال ہے کہ میں نے تمھیں بیوقوف بنا دیا ہے۔''

آسکر نے اعتراف کیا کہ اس نے لانکیر کو واقعی بیوقوف بنا دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس حصے کا مزہ ٹھیک نہیں ہوگا، جب تک کہ اس پر اس یقین کے ساتھ مصالحہ نہ لگایا جائے کہ اس نے مجھے بیوقوف بنا دیا ہے۔ میں نے اسے بہت چالاک، خوش قسمت حرامی کہا

اور ہم ساتھ ہی بیٹھ گئے۔

اس نے سر والا ٹکڑا لے لیا، میں نے باقی ماندہ لیموں دُم والے ٹکڑے کے گوشت پر نچوڑ دیا، اور جب میں نے اس کو اٹھایا تو مکھن کے باعث نرم، اس کے دو یا تین ٹکڑے علاحدہ ہو گئے۔

اپنے حصے کی ہڈیوں کو چوستے ہوئے لانگیز نے میرے حصے، دُم کی طرف، نظر کی: ''ذرا مجھے اپنی دُم کا مزہ تو چکھاؤ۔'' میں نے سر ہلا دیا، اس نے چکھنے کے لیے ایک ٹکڑا اُٹھا لیا؛ ابھی وہ فیصلہ کر نہیں پایا تھا کہ آسکر نے اس کے سر والے ٹکڑے سے کچھ لے کر چکھا اور اس کو ایک بار پھر یقین دلایا کہ وہ، یعنی لانگیز، ہمیشہ کی طرح اب بھی فائدے میں ہے۔

ہم نے مچھلی کے ساتھ سُرخ وائن پی۔ مجھے اس پر افسوس ہوا، ہمارے کافی کے پیالوں میں سفید وائن ہونی چاہیے تھی۔ لانگیز نے میرے افسوس کو نظر انداز کر دیا؛ جب وہ ڈورا سیون میں کارپورل تھا، اسے یاد آیا کہ وہ سوائے سُرخ وائن کے اور کچھ نہیں پیا کرتے تھے۔ جب حملہ شروع ہوا تھا اس وقت بھی وہ سُرخ وائن ہی پیا کرتے تھے، ''باپ رے باپ، کیا ہم وحشت ہو گئے تھے۔ کووالسکی، شیر باخ اور لیوٹ ہولڈ کو پتا بھی نہیں چلا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اور اب، وہ سب، کابورگ کی دوسری جانب، ایک ہی قبرستان میں لیٹے ہوئے ہیں۔ Arromanches کے بعد [نارمنڈی میں جہاں دوسری عالمی جنگ میں اتحادی فوجیں اُتری تھیں۔ مترجم] ہمارے اس علاقے میں ہر طرف ٹامی [برطانوی فوجی] ہی ٹامی تھے، لاکھوں کی تعداد میں کینیڈا کے سپاہی، پلک جھپکتے ہی ہر طرف موجود تھے، اور کہہ رہے تھے، ''کیا حال ہے تمھارا؟''

تھوڑی دیر بعد، اپنا کانٹا لہراتے اور مچھلی کے کانٹے تھوکتے ہوئے اس نے کہا، ''بوجھو تو سہی، آج 'کابورگ' میں مجھے کون نظر آیا تھا؟'' ''ہرتسوگ، لیفٹیننٹ ہرتسوگ! پاگل آدمی! تم تو اس سے مطالعاتی دورے میں مل بھی چکے ہو۔ یاد ہے نا، وہ تم کو؟'' بلاشبہ آسکر کو لیفٹیننٹ یاد، بلکہ اچھی طرح یاد تھا۔ لانگیز نے مچھلی کھانے کے دوران مزید بتایا کہ ہرتسوگ سال بہ سال 'کابورگ' آتا رہتا ہے، نقشوں اور سروے کرنے والے آلات کے ساتھ، اس لیے کہ، اس کے خیال کے مطابق ان حصار بندیوں نے اس کی نیندیں اُڑا دی

تھیں۔وہ کسی دن ڈورا سیون میں آنے والا ہے، کچھ پیمائش وغیرہ کرنے کے لیے۔

ہم مچھلی کھا رہے تھے— آہستہ آہستہ مچھلی کے مرکزی کانٹے کے خد وخال ابھرنے لگے تھے—کہ لیفٹیننٹ ہرتسوگ آدھمکا۔گھٹنے تک خاکی برجس، بھری بھری پنڈلیاں، ٹینس کے جوتے، مصنوعی ریشمی قمیص کی کھلے کالر والی قمیص سے نکلے اس کے بھورے بال۔ ظاہر ہے کہ ہم اپنی کرسیوں پر ہی بیٹھے رہے۔لانکیز نے آسکر کے نام سے، زمانۂ امن کے دوست اور زمانۂ جنگ کے یار کی حیثیت میں، میرا تعارف کرایا، اور ہرتسوگ کو ریزرو لیفٹیننٹ ہرتسوگ کے نام سے مخاطب کیا۔

ریزرو لیفٹیننٹ نے فوراً ڈورا سیون کا معائنہ شروع کردیا۔اس نے باہر سے شروعات کی، لانکیز نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ہرتسوگ نے چارٹ وغیرہ بھرے، دوربین کے ذریعے زمین اور سمندر کا معائنہ کیا۔پھر ایک لمحے کے لیے 'ڈورا سیکس' کی توپوں کے جھروکوں کو اس طرح سہلایا گویا وہ اپنی بیوی کو سہلا رہا ہو۔جب اس نے 'ڈورا سیون' کے اندرون، ہماری بنگلے، یا ہمارے موسمِ گرما کے مکان کے معائنے کی خواہش ظاہر کی تو لانکیز نے سنی اَن سنی کر دی: "ہرتسوگ، یار، تمھیں کیا ہوگیا ہے۔کانکریٹ میں گھستے پھر رہے ہو۔دس برس پہلے ہوتا تو کچھ بات بھی ہوتی، مگر اب تو یہ سب ماضی بن چکا ہے۔"

"ماضی" لانکیز کا تکیہ کلام تھا۔سورج کی روشنی میں ہر شے، یا تو خبر ہوتی ہے یا ماضی، مگر ریزرو لیفٹیننٹ کے مطابق کوئی شے ماضی نہیں تھی، کہ حسابات اب بھی صاف نہیں تھے، کہ کچھ چیزوں کو درست کرنا ہوگا، کہ تاریخ کے منصف کے سامنے ہر ایک کو اپنا حساب دینے کے لیے طلب کیا جائے گا: اسی لیے وہ "ڈورا سیون" کے اندرون کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔"میرا خیال ہے، لانکیز، کہ میں نے اپنی بات اچھی طرح واضح کردی ہے۔"

ہرتسوگ کا سایہ ہماری میز اور مچھلی پر پڑ رہا تھا۔وہ ہمارے اطرف سے ہو کر پِل باکس میں جانا چاہتا تھا، جس کے اوپر کانکریٹ سے بنے نقوش اب بھی کارپورل لانکیز کے فن کار ہاتھوں کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔

مگر ہرتسوگ ہماری میز سے پرے جا نہیں سکا۔تیزی سے اٹھتے ہوئے، لانکیز

کے ایک سکے نے، جس میں اس کا کانٹا اب بھی موجود تھا مگر اس کو استعمال نہیں کیا گیا تھا، ریز رو لیفٹیننٹ ہرتسوگ کو ریت پر چت کر دیا۔ پھر اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے، ہمارے کھانے میں ہونے والی خلل اندازی کی مذمت کرتے ہوئے، لانکیر کھڑا ہوا، لیفٹیننٹ کا گریبان پکڑا وراس کو گھسیٹتا ہوا ریت کے ڈھیر تک لے گیا— مجھے یاد ہے کہ ریت میں بننے والا نشان بالکل سیدھا تھا— اور اُچھال کر پرے پھینک دیا۔ وہ میری نظروں سے دور ہو گیا تھا، مگر بدقسمتی سے میری سماعت سے نہیں۔ اس نے اپنے تمام آلات جمع کیے، جو اس کے فوراً بعد ہی لانکیر نے پھینک دیے تھے، اور بڑبڑاتا، سارے تاریخی بھوتوں کو یک جا کرتا ہوا، جنھیں لانکیر نے ماضی کہہ کر رد کر دیا تھا، وہاں سے دفع ہو گیا۔ "یہ اتنا طاقت ور تو نہیں۔" لانکیر نے کہا، "اگر احمق ہے تب بھی۔ اگر جب گولیاں چلنی شروع ہوئی تھیں ہم اتنے مدہوش نہ ہوتے تو کون جانے کینیڈا والوں کا کیا حال ہوا ہوتا۔"

میں اثبات میں صرف سر ہی ہلا سکا تھا، اس لیے کہ صرف ایک دن قبل، جب سمندر اُتار پر تھا، مجھے کیکڑوں کے خالی خولوں کے درمیان پڑا، چغلی کھاتا، کینیڈا والوں کی وردی کا ایک بٹن مل گیا تھا۔ اتنا خوش جیسے کہ اس کو [اطالیہ کے قدیم علاقے] 'ایٹروریا' کا کوئی قدیم سکہ مل گیا ہو، آسکر نے وہ بٹن اپنے بٹوے میں چھپا کر رکھ لیا تھا۔

اگرچہ بہت مختصر تھی مگر، لیفٹیننٹ کی آمد نے بہت ساری یادیں اکٹھا کر دی تھیں۔ "یاد ہے نا لانکیر، جب ہمارا تھیٹر کا گروپ تمھارے کانکریٹ کا معائنہ کر رہا تھا، اور ہم نے پِل باکس کے اوپر بیٹھ کر ناشتا کیا تھا؟ اس دن بھی آج ہی جیسی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اور اچانک چھ یا سات راہبائیں، رومیل کے مارچوبوں میں کیکڑے تلاش کرتی آ گئی تھیں، اور تم کو، لانکیر، قاتل مشین گن سے ساحل کی صفائی کا حکم دیا گیا تھا۔"

مچھلی کا کانٹا چوستے ہوئے، لانکیر کو سب کچھ یاد آ رہا تھا؛ اسے تو ان کے نام بھی یاد آ رہے تھے: سسٹر اسکولاسٹیکا، سسٹر اگنیٹا... اس نے ایک نوآموز گلابی چہرے کا تذکرہ بھی کیا، جس کے چاروں طرف بے شمار سیاہ دھبے تھے۔ اس کا کھینچا ہوا راہبہ کا نقشہ اتنا واضح تھا کہ اس نے، جزوی طور پر، بلکہ صرف جزوی طور پر، میری دوست، تربیت یافتہ، بے دین نرس،

سسٹر ڈوروتھیا، کا نقش چھپا دیا تھا، جو کبھی میرے ذہن سے دور نہیں ہوا تھا۔ چند منٹ بعد — میں اتنا حیران نہیں ہوا تھا کہ اس کو معجزہ کہنے لگتا — 'کابورگ' کے ریت کے ڈھیروں کی جانب سے، لہراتی ہوئی آتی، ایک نوجوان راہبہ دکھائی دی۔ چھوٹا سا گلابی چہرہ، اطراف بہت سارے سیاہ دھبے؛ اس کو پہچاننے میں غلطی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو سورج سے بچانے کے لیے کالے رنگ کی چھتری لگائے تھی، ویسی ہی جیسی کہ عمر رسیدہ حضرات لگاتے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے اوپر سبز زہر جیسے رنگ کا سلولائیڈ کا چھجا لگا ہوا تھا، جیسا کہ ہالی ووڈ کے فلم ڈائریکٹر لگائے رہتے ہیں۔ ریت کے ڈھیروں سے پرے، کوئی اسے آواز دے رہا تھا، مگر وہاں تو کوئی نرس نہیں تھی۔ "سسٹر اگنیتا" آواز، اور زیادہ بلند ہوئی "سسٹر اگنیتا... کہاں ہو تم؟"

اور سسٹر اگنیتا، وہ جوانی جس کو ہماری کاڈ مچھلی کی مرکزی ہڈیوں سے پرے دیکھا جا سکتا تھا بولی، "میں یہاں ہوں... سسٹر اسکولاسٹیکا۔ اس جگہ ہوا نہیں ہے۔"

لانکیز نے اپنے دانت نکالے اور اپنے بھیڑیے جیسے سر کو لاپروائی سے ہلایا، گویا خود اس نے یہ کیتھولک پریڈ جمائی تھی، گویا دنیا کی کوئی شے اس کو چونکا نہیں سکتی تھی۔

اس نوجوان راہبہ نے ہمیں دیکھ لیا تھا، اور پِل باکس کی ایک جانب رُک کر کھڑی ہو گئی تھی۔ "اوہ" اس کے گلابی چہرے نے، نکلے ہوئے مگر بے عیب دانت کے درمیان سے سانس لیتے ہوئے کہا۔

"بچیا... سسٹر... چہل قدمی کے لیے نکلی ہو؟" لانکیز نے کہا۔

فوراً ہی جواب آیا، ہم لوگ سال میں ایک بار ضرور کسی ساحل پر جاتے ہیں، مگر میرا یہ پہلا سال ہے۔ میں نے اس سے پہلے کبھی سمندر نہیں دیکھا تھا۔ کتنا بڑا ہوتا ہے یہ۔"

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ آج بھی میں سمندر کے اس بیان کو ہی صحیح مانتا ہوں۔

لانکیز نے مہمان کا کردار ادا کیا، میرے حصے کی مچھلی میں سے کچھ توڑ کر اس کو پیش کر دیا۔

"سسٹر کیا تم مچھلی کھانا پسند کرو گی؟ ابھی تک گرم ہے۔"

میں حیران تھا، وہ کتنی روانی سے فرانسیسی زبان بول لیتا تھا۔ آسکر نے بھی بدیسی زبان بولنے کی کوشش کی، "پروا نہیں کرو۔ بہر حال، آج تو جمعے کا دن ہے۔"

"کیا تم لوگ ہمیشہ اسی میں رہتے ہو۔" راہبہ کو تجسس نے پوچھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہمارا پنڈل باکس اسے اچھا مگر ذرا مضحکہ خیز لگا تھا۔

مگر پھر بدقسمتی سے، ان کی بزرگ راہبہ اور پانچ دوسرے راہبائیں بھی، اپنی کالی چھتریوں سبز چھجوں اور ریت کے ڈھیروں سمیت اس منظر میں داخل ہو گئیں۔ اکیتھا تیزی سے ہَوا ہو گئی۔ جہاں تک میں مشرقی ہوا کے تیزی سے ادا کیے ہوئے الفاظ سمجھ سکتا تھا، ہوا نے راہبہ کو اپنے گروہ میں واپس جانے پر لیکچر جھاڑ دیا تھا۔

لانگیز خواب دیکھنے لگا، کہ وہ اپنے منہ میں اپنا کھانے کا کانٹا الٹا پکڑے ہوئے ہے اور ریت کے ڈھیروں پر لہراتے گروہ کو دیکھ رہا تھا۔ "یہ راہبائیں تو نہیں، یہ بادبانی کشتیاں ہیں۔"

"بادبانی کشتیاں سفید ہوتی ہیں" میں نے اعتراض کیا۔

"یہ سیاہ رنگ کے بادبانوں والی کشتیاں ہیں۔" لانگیز سے بحث کرنا آسان نہیں۔ اُس طرف، بائیں جانب پرچم بردار جہاز ہے۔ اکیتھا ایک تیز توپ بردار جہاز ہے۔ کشتی رانی کے لیے اچھا موسم ہے۔ قطار کی تشکیل ہو رہی ہے۔ سب سے آگے کے بادبان سے آخری سرے تک، مرکزی مستول، دو مستول سارے بادبان تیار، اُفق اور انگلستان کی طرف چل پڑے ہیں۔ ذرا سوچیے، کل صبح جب سارے نامی جاگے اور کھڑکیوں سے باہر دیکھا، تو انھیں کیا نظر آیا ہو گا؟ پچیس بڑا راہبائیں، سب پرچموں کے ساتھ عرشے پر کھڑی ہیں۔ اور یہ رہی توپوں کی پہلی یورش۔"

"مذہب کی نئی جنگ۔" میں نے اس کی مدد کی۔

میں نے مشورہ دیا کہ پرچم بردار جہاز کے لیے میری اسٹیورٹ، ڈی والیرا یا اس سے اچھا نام 'ڈان جوان' ہو گا۔ اور ایک نیا اور مزید متحرک آرمیڈا ٹرافالگر کا بدلہ لینے کے لیے۔ "کٹر مذہبی مردہ باد" جنگ کا نعرہ تھا اور اس بار کوئی نیلسن دستیاب نہیں تھا۔ جنگ شروع کرو، انگلستان اب جزیرہ نہیں رہا۔

لانگیز کے لیے یہ گفتگو زیادہ سیاسی ہوتی جا رہی تھی۔ راہبائیں بھاپ اڑاتی جا رہی ہیں۔

"بادبان کے ذریعے۔" میں نے غلطی درست کی۔

وہ بھاپ کے ذریعے ہو یا بادبان کے ذریعے، وہ 'کابورگ' کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ صرف ایک ذرا پیچھے رہ گئی تھی، سیڑھیوں پر جھکی، کوئی شے اُٹھائی اور کوئی شے گرا دی۔ بقیہ پورا بیڑا آہستہ آہستہ جا رہا تھا، ہوا کو چھیدتا ہوا، جلے ہوئے ساحلی سمندر کے پس منظر میں۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اسٹیئرنگ وہیل ٹوٹ گیا ہے، یا پھر وہ اپنا لنگر اُٹھا نہیں پا رہا ہے۔'' لانگیز نے اپنے سمندری نقش کو زمین پر رکھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ارے! یہ تو اگنیفا معلوم ہوتا ہے، تیز توپ بردار جہاز۔''

توپ بردار یا لڑاکا جہاز، وہ دراصل مسز اگنیفا تھی، وہی نو وارد، جو ہماری طرف آئی تھی، کیکڑے کے خول اٹھاتی ہوئی، اور ان میں سے کچھ پھینکتی ہوئی۔

''مسز تم کیا چن رہی ہو؟'' لانگیز اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کیا چن رہی تھیں۔

''خول۔'' اس نے اس لفظ کو صفائی سے، جھٹک کر ادا کیا تھا۔

''کیا تمھیں اس کی اجازت ہے؟ کیا یہ دنیاوی اشیا نہیں؟''

''میں نے مسز اگنیفا کی طرف سے جواب دیا، ''تم غلطی پر ہو، لانگیز۔ ''سمندری خول کوئی دنیاوی شے نہیں۔''

زمین سے نکلیں یا سمندر سے، وہ بہر حال اشیا ہیں۔ راہباؤں کے لیے نہیں ہیں۔ افلاس، افلاس اور زیادہ افلاس، راہباؤں کے لیے بس کچھ یہی ہوتا ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، مسز؟''

مسز اگنیفا اپنے نوکیلے دانتوں سے مسکرائی۔ ''میں چند عدد ہی رکھ لیتی ہوں۔'' وہ بھی کنڈرگارٹن کے لیے۔ بچے ان سے کھیلنا بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ کبھی سمندر کنارے نہیں گئے ہیں۔''

''تمھیں ہمارا یہ گھر کیسا لگا؟'' میں نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

لانگیز ذرا زیادہ براہِ راست انداز میں بولا، ''اندر آجاؤ اور خود ہی دیکھ لو، ہمارا بنگلہ۔ تمھیں کچھ خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔''

اس کے جوتے کی نوک اس کے لہنگے کے نیچے مضطرب ہو گئی، ریت اُڑانے لگی، اور وہ ریت ہوا نے اُٹھا کر ہماری مچھلی پر ڈال دی۔ اپنی بے اعتمادی کے باعث، اس نے ہمیں اور ہماری میز کو غور سے دیکھا، ان آنکھوں سے جو یقینی طور پر ہلکے بھورے رنگ کی تھیں۔[اور کہا] ''یہ یقیناً صحیح نہیں ہوگا۔''

''آؤ، سسٹر، ہمارے ساتھ چلو'' لانگیز نے اس کے سارے اعتراضات رد کر دیے اور کھڑا ہو گیا۔ ''کتنا اچھا منظر ہے۔ تم توپوں کے لیے بنے سوراخوں سے پورے ساحل کو دیکھ سکتی ہو۔''

اب بھی وہ تذبذب میں تھی؛ مجھے محسوس ہوا کہ اس کے جوتے ریت سے بھرے ہوئے تھے۔ لانگیز نے داخلے کی جانب اشارہ کیا۔ اس کی بنائی کانکریٹ کی زیبائشیں، تیز زیبائشی سایے ڈال رہی تھیں۔ ''اندر، سب کچھ صاف ہے۔''

شاید وہ لانگیز کا اندازِ دعوت تھا کہ راہبہ نے اندر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ''مگر ذرا ایک منٹ ٹھہرنا۔'' اور راہبہ نے لانگیز ے کے آگے پِل باکس میں سیٹی بجائی۔ لانگیز نے اپنے ہاتھ، پینٹروں کی طرح، اپنے پتلون پر پونچھے اور غائب ہو جانے سے پہلے مجھے دھمکی دی۔ ''خبردار، میری مچھلی نہ کھا جانا۔''

مگر میں اپنی مچھلی کھا چکا تھا۔ میں میز سے ہٹا اور خود کو ریتیلی ہوا کے سامنے چھوڑ دیا۔ میں نے ایک پیر سے اپنا نقارہ گھسیٹا اور نقارہ نوازی کے ذریعے اس کانکریٹ کے جنگل سے، اس قلعہ بند دنیا سے، اس تر کاری کی دنیا سے جسے رومیل با زچوب کہتے ہیں، نکلنے کی کوشش کی۔

پہلے، چھوٹی کامیابی سے میں نے محبت کی کوشش کی تھی؛ ایک زمانہ تھا جب میں ایک سسٹر سے محبت کرتا تھا۔ وہ کوئی راہبہ نہیں، بلکہ نرس سسٹر ڈوروتھیا تھی۔ وہ زائیڈلر کے فلیٹ میں، دھندلے شیشے کے ایک دروازے کے پیچھے رہتی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی، مگر میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ زائیڈلر کے فلیٹ کی راہداری بہت اندھیری تھی۔ اور ہمارے درمیان ایک ریشے دار رگز آ گیا تھا۔

ریشے وار دُکر پر اس موضوع پر عمل کرنے اور اس میں ناکامی کے بعد میں نے ماریا سے اپنی محبت کو توازن میں بدلنا چاہا اور اس کو تیزی سے بڑھتی ہوئی بیلوں کی طرح کانکریٹ پر چڑھانا چاہا تھا، مگر ایک بار پھر سسٹر ڈوروتھیا میری اور ماریا کی محبت کے بیچ میں آ گئی۔ سمندر سے کاربولک تیزاب کی بو آنے لگی، نرس کی وردی میں ملبوس سمندری پرندے مجھے اشارے کرنے لگے، سورج نے ریڈ کراس بین کی طرح چمکنے پر اصرار کیا۔

آسکر خوش ہوا جب اس کی نقارہ نوازی میں مداخلت کی گئی۔ mother superior اسکولاسٹیکا، اپنی پانچ راہباؤں کے ساتھ واپس آ رہی تھی۔ وہ تھکی دکھائی دے رہی تھیں اور ان کی چھتریاں نا امیدی سے ترچھی تھیں۔

"کیا تم نے ایک چھوٹی سی راہبہ یا ایک چھوٹی سے نوواروکو دیکھا؟ بچی بہت چھوٹی ہے۔ بچی نے کبھی سمندر بھی نہیں دیکھا۔ ضرور کہیں کھو گئی ہوگی، سسٹر اگنیتا، کہاں ہو تم؟"

اب جب کہ ہوا جہاز کے عقب میں تھی، میں کچھ نہیں کر سکتا تھا، سوائے اس کے کہ جنگی جہازوں کے ایک چھوٹے سے دستے کو دریائے 'اورنے' کے دہانے، Arromanches اور پورٹ 'وِسٹئن' کی طرف بھیج دیا جاتا، جہاں انگریز نے سمندر کی جانب سے داخل ہو کر ایک مصنوعی بندرگاہ پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ اتنے سارے لوگوں کے لیے پِل باکس میں مشکل ہی سے جگہ رہی ہوگی۔ مجھے اعتراف ہے کہ ایک لمحے کے لیے میں نے لانکیز کو ان کے آنے کی خبر سے حیران کرنا چاہا تھا، مگر دوستی، کراہت، کینہ پروری، سب نے مل کر مجھے 'اورنے' کے دہانے کی طرف انگوٹھے سے اشارہ کرنے سے باز رکھا تھا۔ راہباؤں نے میرے انگوٹھے کے اشارے پر عمل کیا تھا اور رفتہ رفتہ ریت کے ٹیلوں کی بلندی پر پسپا ہوتے ہوئے، ہوا کے اڑائے ہوئے چھ سیاہ دھبوں میں بدل گئیں؛ اور ان کا نوحہ کرتی سسٹر اگنیتا میرے پاس آئی، مسلسل ہوا میں ہلکی ہوتی ہوئی، حتیٰ کہ اسے ریت نے ہڑپ کر لیا تھا۔

باہر آنے والوں میں سب سے پہلا لانکیز تھا۔ ایک بار پھر وہی پینٹ کرنے والے کا طریقہ دکھایا۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنے پتلون پر پونچھے، ایک سگریٹ طلب کی، اس کو اپنی قمیص کی جیب میں رکھا اور ٹھنڈی مچھلی پر ٹوٹ پڑا۔ "یہ بھوک کو بڑھا دیتی ہے۔" اس نے

مکاری سے کہا اور دُم کے حصے کو ہڑپ کر گیا جو میرا تھا۔اس کے بعد اس نے دھوپ میں اپنے پاؤں پسار دیے۔

"اب وہ ناخوش ہو گی۔" میں نے "ناخوش" کے لفظ کو چباتے ہوئے استعارے کے انداز میں کہا۔

"بھلا کیسے؟ ناخوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔"

لانگیر کے لیے یہ ناقابلِ تصور تھا کہ اس کا انسانی تعلقات کا انداز کسی کو ناخوش کر سکے گا۔

"اب وہ کیا کر رہی ہے؟" میں نے سوال کیا، اگر چہ میں کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا۔

"سی رہی ہے۔" لانگیر نے اپنے کھانے کے کانٹے کے ذریعے کہا، "اپنی عادت ذرا سی ادھیڑ دی تھی، اب اس کو بخیہ کر رہی ہے۔"

"سلائی کرنے والی پہل باکس سے باہر آئی۔ اس نے فوراً چھتری کھولی اور خوشی سے غوں غوں کرنے لگی، پھر بھی مجھے ایک قسم کے تناؤ کے ساتھ محسوس ہوا کہ "واقعی یہ کوئی ربانی منظر ہے۔ پورا ساحل بھی اور سمندر بھی۔"

وہ ہماری باقی ماندہ مچھلی کے قریب رُکی۔

"کیا میں بھی...؟"

ہم دونوں نے فوراً سر ہلا دیا۔

"سمندری ہوا بھوک تیز کر دیتی ہے۔" میں نے اس کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا۔اس نے سر ہلایا اور ہماری مچھلی میں اپنے کھردرے، سُرخ شدہ ہاتھوں سمیت شامل ہو گئی، اپنا منہ بھر لیا۔وہ اس قدر غور و فکر اور پوری توجہ سے کھانے میں مشغول تھی گویا مچھلی سے پہلے کھائی ہوئی کسی شے کا اثر کم کرنا چاہتی ہے۔

میں نے اس کے کنٹوپ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہ ریوڑوں والا اپنا سبز رنگ کا آنکھوں والا چھجا پہل باکس ہی میں چھوڑ آئی تھی۔اس کی چکنی پیشانی پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے، قطار سے ابھرے ہوئے تھے، جو سفید کلف لگے فریم میں میڈونا جیسے معیار کے لگ رہے تھے۔ لانگیر نے مجھ سے ایک اور سگریٹ طلب کیا، حالاں کہ اس

نے پچھلا سگریٹ پیا نہیں تھا۔ میں نے اس کی طرف ڈبیا اچھال دی۔ جب کہ تین عدد سگریٹ اس کی قمیص کی جیب میں رکھے اور ایک ہونٹ میں لگا ہوا تھا، ہسٹر اگنیجا مڑی، اپنی چھتری پھینکی اور ریت کے ڈھیر کی طرف دوڑی—اس وقت میں نے دیکھا کہ وہ ننگے پاؤں تھی—اور لہروں کی طرف جا کر غائب ہو گئی۔

''بھاگ جانے دو۔'' لانکیز نے خطیبانہ انداز میں کہا، ''وہ واپس آئے گی، ہو سکتا ہے کہ نہ بھی آئے۔''

ایک لمحے کے لیے تو میں خاموش بیٹھا لانکیز کو سگریٹ پیتا دیکھتا رہا۔ پھر میں پہل باکس کے اوپر چڑھا اور ساحل کی طرف دیکھنے لگا۔ پانی کی سطح اونچی ہو گئی تھی اور ساحل بہت کم رہ گیا تھا۔

''کیا دیکھا؟'' لانکیز نے پوچھا۔

''وہ اپنے کپڑے اُتار رہی ہے'' بس وہ مجھ سے اتنا ہی کہلوا سکا تھا، ''شاید نہانے جا رہی ہے۔ ٹھنڈی ہونا چاہ رہی ہے۔''

بڑھتے سمندر میں جانا خطرناک ہوتا ہے، خاص کر کھانے کے فوراً بعد۔ وہ گھٹنوں تک پانی میں داخل ہو گئی تھی: آگے کی طرف جھکی، رفتہ رفتہ اس کا بدن زیر آب جا رہا تھا۔ پانی گرم نہیں رہا ہوگا، مگر اس کو اس کی پروا نہیں تھی: اس نے پیرنا شروع کیا، اچھا پیرنا جانتی تھی، کئی طریقے سے پیری اور لہروں میں غوطہ مارتی رہی۔

''اس کو پیرنے دو اور پہل باکس سے نیچے اتر آؤ۔''

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، لانکیز چت ریت پر لیٹا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ کاڈ کی سفید مرکزی ہڈی سورج کی روشنی میں چمکتی، میز پر چھائی ہوئی تھی۔

میں پہل باکس پر سے کودا۔

لانکیز نے اپنی پینٹر والی آنکھ کھولی اور کہا، ''اف خدایا، کیا تصویر ہوگی! بڑھتے سمندر کی لہروں میں ایک راہبہ۔''

''جانور کہیں کا!'' میں نے چیخ کر کہا، ''اور اگر وہ ڈوب گئی تو؟''

لانکیز نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، ”تو اس کو کہنا، ڈوبتی راہبہ۔“

”اور اگر وہ واپس آتی ہے اور تیرے پاؤں پڑ جاتی ہے تو؟“

بڑی آنکھوں والے پینٹر نے کہا، ”تب وہ، اور اس کی تصویر کا عنوان ہوگا، بے غیرت نرس۔“

اس کے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ اگر... سر یا دُم... غرق یا بے غیرت۔ اس نے میری سگریٹ لی، لیفٹیننٹ کو ریت کے ڈھیر سے نیچے پھینکا، میری مچھلی کھائی، ایک چھوٹی سی لڑکی کو، جس کو یسوع کی دلھن بننا تھا، پبل باکس کا اندروں دکھایا، اور جب وہ سمندر میں پیر رہی تھی، اپنے لونڈے جیسے پیر سے ہوا میں تصویریں بنائیں۔ اس نے تصویروں کو عنوان دیے اور ان کے پلاٹ بھی بیان کیے: بڑھتے سمندر میں راہبہ... آٹھ ضرب پانچ... ڈوبتی راہبہ... بے غیرت راہبہ... پچیس ہزار راہبائیں... ٹرافالگر میں راہبائیں... راہبائیں اور نیلسن کی شکست... ہوا میں اُچھلتی راہبہ... ہوا سے پہلے کی راہبہ... کیل لگاتی راہبہ... بے شمار سیاہی؛ سفید ناؤ اور ٹھنڈا پانی... حملہ... وحشی... صوفیانہ... بیزار، وغیرہ۔

اور ہماری رھائن لینڈ واپسی پر لانکیز نے واقعی، چوڑے اور نیچے، اونچے اور تنگ پیکروں میں یہ ساری تصویریں بنائیں۔ اس نے راہباؤں کا ایک پورا سلسلہ بنایا، ایسا تاجر تلاش کیا جو خود بھی راہباؤں کی طرح دیوانہ تھا، تینتالیس کینوسوں کی نمائش کی اور شوقین جمع کرنے والوں، صنعت کاروں، عجائب گھروں کو اور ایک امریکی کو سترہ عدد کینوس فروخت کیے؛ کچھ مبصرین نے تو لانکیز کو پکاسو سے مقابلہ کرنے کے قابل بھی سمجھا۔ یہ لانکیز کی کامیابی ہی تھی جس نے آسکر کو، کنسرٹ منیجر ڈاکٹر ڈوش کے تعارفی کارڈ کی تلاش پر راغب کیا، اس لیے کہ لانکیز کا فن ہی روٹی کی تلاش میں اکیلا نہیں تھا۔ وقت آ گیا تھا کہ سہ سالہ نقارہ نواز آسکر کے عالمی جنگ کے قبل از جنگ اور دورانِ جنگ تجربات کی بلند آہنگ خالص اور سنہرے مابعد جنگ کے عہد میں تقلیب کی جائے۔

# شاہانہ اُنگلی

"اچھا، تو یہ بات ہے۔" زائیڈ لر نے کہا، "تم نے مزید کام نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا کہ کلیپ اور آسکر سارا سارا دن ایک دوسرے کے کمرے میں بیٹھے کچھ نہیں کرتے ہیں۔ڈاکٹر ڈوش کی دی ہوئی پیشگی سے بچی ہوئی رقم سے میں نے دونوں کمروں کا کرایہ ادا کیا، مگر نومبر کے مہینے کے مالیاتی امکانات اچھے نہ تھے۔اس کے باوجود ہمارے پاس پیش کشیں بہت تھیں۔بہت سی رقص گاہیں ہم کو لے سکتی تھیں، مگر آسکر جاز بجا بجا کر پریشان ہو چکا تھا۔ یہ بات میرے اور کلیپ کے درمیان تعلقات پر اثر انداز ہو رہی تھی۔کلیپ کا کہنا تھا کہ میرے نقارے کے نئے انداز کا جاز سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ ٹھیک کہتا تھا، اور میں اس سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔وہ کہتا تھا کہ میں جاز کے تصور سے بے وفائی کر رہا ہوں۔نومبر کی ابتدا میں اس نے ایک نیا اور اچھا percussion man تلاش کر لیا ہے، جس کا نام بابی ہے اور یونی کارن سے تعلق رکھتا ہے، اور وہ پرانے شہر میں ایک مصروفیت قبول کر سکتا ہے۔اس کے بعد ہم ایک بار پھر دوست ہو گئے، باوجود ے کہ کلیپ نے اشتراکی خطوط پر سوچنا شروع کر دیا ہے، یا شاید یہ کہنا بہتر ہوگا کہ اشتراکیت پر بات کرنا شروع کر دیا ہے۔

بالآخر، ڈاکٹر ڈوش ہی میری آخری امید ٹھہرا۔میں چاہتا بھی تو ماریا کے پاس واپس جا نہیں سکتا تھا: اِلمتسیل طلاق لے رہا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری ماریا کو

سبز انتھنسیل بنانے والا تھا۔وقتاً فوقتاً میں کارنیٹ کے لیے ایک آدھ کندہ کاری کردیتا، یا اکادمی میں برائے سیاہ کردن یا تجریدیت کے لیے چلا جاتا۔ میں کسی خاص منصوبے کے بغیر اُلا سے ملنے چلا جاتا تھا، جو لانکیو کے اوقیانوسی سفر کے بعد لانکیو سے اپنی منگنی توڑنے پر مجبور ہو گئی تھی، اس لیے کہ لانکیو سوائے راہباؤں کے اور کچھ نہیں کرتا تھا، حتیٰ کہ اُس نے اُلا کی مزید دھنائی کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

ڈاکٹر ڈوش کا تعارفی کارڈ میری میز پر پڑا خاموش شکایت کرتا تھا۔ایک دن یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ مجھے ڈاکٹر ڈوش کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا تھا، مگر یہ جان کر میں خوف زدہ ہو گیا کہ اس کا پتا اور ٹیلی فون نمبر میری یادداشت میں کندہ ہو گیا تھا۔میں ان کو کسی نظم کی طرح پڑھ سکتا تھا۔صرف پڑھ سکتا ہی نہیں، بلکہ پڑھنے لگا تھا۔یہ سلسلہ تین دن تک چلتا رہا؛ ٹیلی فون نمبر نے کئی راتیں مجھے جگائے رکھا۔چوتھے دن میں قریبی ٹیلی فون بوتھ پر گیا اور ڈاکٹر ڈوش نے مجھ سے اس طرح بات کرنی شروع کیا گویا وہ میری کال کی توقع کر رہا تھا، اور مجھے اسی شام اپنے دفتر میں آنے کے لیے کہا؛ وہ اپنے افسر سے میرا تعارف کرانا چاہتا تھا، بلکہ اس کا افسر میرے انتظار میں تھا۔

ویسٹ کنسرٹ بیورو کا دفتر ایک نئی عمارت کی آٹھویں منزل پر تھا۔بیش قیمت قالین، آراستہ روشنی، ساؤنڈ پروف، کراری، لمبی ٹانگوں والی سیکریٹری، میرے قریب سے اپنے افسروں کے سگار کے دھویں گزارتی سیکریٹری لڑکیاں؛ مزید دو سیکنڈ کے بعد میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا۔

مگر ڈاکٹر ڈوش نے اپنے بازو پھیلا کر میرا خیر مقدم کیا، اگر چہ اس نے معانقہ نہیں کیا— آسکر کے نزدیک وہ بال بال بچ گیا تھا۔اس کے پہلو میں سبز سویٹر والی ایک لڑکی ٹائپ کر رہی تھی؛ جوں ہی میں داخل ہوا، اس کی مشین رُک گئی تھی؛ مگر فوراً ہی تیزی سے چل پڑی تھی تا کہ ضائع شدہ وقت کا ازالہ کیا جا سکے۔ڈوش نے میرے آنے کا اعلان کیا۔آسکر سامنے، بائیں جانب کی چھٹی، ہتھوں اور گدوں والی کرسی پر بیٹھ گیا جس کے گدے تیز سُرخ رنگ کے کپڑے سے بنائے گئے تھے۔تہہ ہو جانے والا ایک دروازہ کھلا،

ٹائپ رائیٹر کا سانس رُک گیا، کسی خفیہ قوت نے مجھے اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا، میری پشت پر دروازہ بند کر دیا گیا، ایک قالین، بڑے اور روشن کمرے سے لہراتا آیا اور مجھے آگے ایک بڑی سی میز تک لے گیا، جس کا اوپری حصہ لوہے کی نلکیوں سے بنے ڈھانچے پر رکھا ہوا تھا، اور مجھ سے کہا گیا: اب آسکر افسر کی میز کے سامنے کھڑا ہے، خبر نہیں کہ اس کا وزن کتنا ہے۔ میں نے اپنی نیلی آنکھیں اُٹھائیں، لامتناہی سطح کی خالی میز کی طرف نظر کی تو وہیل چیئر پر، جو دندان ساز کی میز کی طرح اوپر نیچے کی جا سکتی تھی، میرا دوست اور استاد بیرا، فالج زدہ، اپنی صرف ایک آنکھ اور انگلیوں کے سرے کے بل پر زندہ، بیٹھا ملا۔

اس کی آواز اب بھی موجود تھی۔ اور بیرا کی آواز بولی، "سو، ہم ایک بار پھر مل گئے، مسٹر ماتسیرات! کیا میں نے برسوں پہلے کہا نہیں تھا، جب تم نے ایک سہ سالہ کی حیثیت میں بھی دنیا کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی تھی، کہ ہم جیسے لوگ ایک دوسرے کو کبھی کھو نہیں سکتے؟ پھر بھی، میں دیکھ سکتا ہوں کہ تم نے اپنے جسم کے تناسب میں تبدیلی کر لی ہے، جو اگرچہ زیادہ نہیں، مگر تمھارے لیے قطعی فائدہ مند نہیں۔ کیا اُن دنوں تمھارا قد ٹھیک تین فٹ نہیں تھا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا، میری آنکھوں میں آنسو آنے ہی والے تھے۔

اور استاد کی وہیل چیئر کے عقب میں — جو بجلی کی ایک موٹر سے چلتی تھی اور ایک ہلکی، مسلسل گونج پیدا کرتی تھی — دیوار پر، سر سے سینے تک، روزویدا، عظیم رگونا، کی ایک تصویر، باروقی فریم میں جڑی، آویزاں تھی جو اس کے قد کے برابر تھی۔ بیرا کو یہ معلوم کرنے کے لیے کہ میں کیا دیکھ رہا ہوں میری نظروں کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے لب، جب وہ بولتا تھا، تقریباً بالکل ساکن رہتے تھے۔ "اوہ، اچھا، ہماری، پیاری، روزویدا! ...... میں سوچ رہا ہوں، کیا اسے یہ نیا آسکر اچھا لگتا؟ میرا خیال ہے، کہ بہت اچھا نہیں۔ وہ کوئی اور آسکر تھا، جس کو وہ چاہتی تھی، ایک سہ سالہ، فرشتوں جیسے رخسار، مگر، اُف، بہت پیارے تھے! روزویدا تو اسے پوجتی تھی، اور وہ یہ بات بتاتے تھکتی نہیں تھی، مگر ایک دن وہ اس کے لیے کافی لینے نہیں گیا؛ وہ خود کافی لینے گئی اور جان سے گئی۔ اور اگر میں غلط نہیں، تو صرف وہی ایک قتل نہیں تھا جو فرشتہ صفت ننھے آسکر نے کیا تھا۔ مگر، یہ چ

نہیں کہ اس کی نقارہ نوازی نے اپنی بے چاری مما کی جان لی تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے روزویا کی طرف دیکھا، خدا کا شکر ہے کہ میں رو سکتا تھا۔ ہیرا نے دوسرا وار کرنے کے لیے پینترا بدلا، ''اور جان برانسکی، ڈاک خانے کے سیکریٹری کا کیا بنا تھا، جسے سہ سالہ آسکر اپنا قیاسی باپ کہنا پسند کرتا تھا؟ آسکر نے اسے centurions کے حوالے کر دیا تھا، جنھوں نے اس کو گولی ماردی تھی۔ اور اب، مسٹر آسکر ماتسیرات، تم میں اتنی جسارت تھی کہ اپنا قد بڑھا لیا، اور شاید تم مجھے بتاؤ گے کہ تمھارے دوسرے قیاسی باپ، ماتسیرات، کریانے کی دُکان والے کا کیا حشر ہوا؟''

میں نے پھر اعتراف کیا۔ میں نے قبول کیا کہ میں نے ہی ماتسیرات کو قتل کیا تھا، اس لیے کہ میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا، اور اپنے جج کو بتایا کہ کس طرح میں نے اس کی سانس روک کر اسے مار ڈالا تھا۔ میں کبھی روسی نامی گن کے پیچھے نہیں چھپا، مگر کہا، ''استاد ہیرا، وہ میں ہی تھا؛ یہ جرم بھی میں نے ہی کیا تھا۔ میں اس موت کے بارے میں بے گناہ نہیں ہوں۔ رحم کیجیے!''

ہیرا ہنسا، مگر مجھے معلوم نہیں کس بات پر۔ اس کی وہیل چیئر لرزی، ہواؤں نے اس بونے کے بال لاکھوں شکنوں پر بکھیر دیے جس سے اس کا چہرہ مزین تھا۔

میں نے ایک بار پھر رحم کی درخواست کی، مٹھاس کے اضافے سے اپنی آواز بدلتے ہوئے، جو میں سمجھتا تھا کہ اثر انداز ہوگی، اور اپنے ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا، جو میں جانتا تھا کہ خوب صورت تھے، ''رحم... میرے پیارے استاد... رحم!'' ہیرا نے، جو خود میرے معاملے میں جج بن گیا تھا اور اس کردار کو ادا کرنے میں کمال کر دیا تھا، ہاتھی دانت کے بنے بورڈ پر لگا ایک بٹن دبایا، جو اس نے اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں کے درمیان پکڑ رکھا تھا۔

میرے عقب کا قالین سبز سویٹر والی لڑکی کو لے آیا، جس کے ہاتھ میں ایک فولڈر تھا۔ اس نے فولڈر کا سارا سامان نکال کر شاہ بلوط کی لکڑی سے بنی میز پر ڈھیر کر دیا، جو اندازاً میری ہنسلی کی ہڈی کے برابر اونچا تھا، اتنا اونچا کہ میں دیکھ نہیں سکتا تھا کہ وہ کیا کچھ پھیلا رہی تھی۔ اس کے بعد لڑکی نے مجھے ایک فاؤنٹین پن دیا۔ اپنے دستخط سے مجھے ہیرا کا رحم خریدنا تھا۔ اس کے

باوجود میں نے چند سوالات کرنے کی ہمت کی۔ میں بغیر دیکھے تو دستخط نہیں کر سکتا تھا!

"تمھارے سامنے رکھی دستاویز" ہیرا نے کہا، "ایک معاہدہ ہے تمھاری پیشہ ورانہ خدمات کے لیے۔ تمھارے پورے نام کی ضرورت ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم کس سے سودا کر رہے ہیں۔ پہلا نام، اور آخری نام: آسکر... ماتسیرات۔"

جس لمحے میں نے دستخط کیے، بجلی کے موٹر کی گونج زیادہ طاقت ور ہو گئی تھی۔ میں نے فاؤنٹین پین سے عین اس وقت سر اٹھا کر دیکھا تھا، جب ایک وہیل چیئر تیزی سے کمرے سے گزری اور پہلو کے دروازے سے غائب ہو گئی تھی۔

شاید قاری سوچے گا کہ دو نقلوں پر مشتمل اس معاہدے کے ذریعے، میں نے جس پر دستخط کیے تھے، میں نے اپنا ضمیر بیچ دیا تھا، یا میں نے کوئی اور خوف ناک جرم کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر ڈوش کی مدد سے میں نے راہداری میں معاہدے کا مطالعہ کیا، اور یہ سمجھنے میں مجھے کوئی مشکل نہیں ہوئی تھی کہ آسکر کو سامعین کے سامنے اپنے نقارے کے ساتھ اکیلے پیش ہونا، اور نقارہ نوازی کرنی پڑے گی، اُسی طرح، جیسے میں نے ایک سہ سالہ کی حیثیت سے، اور ایک بار پھر، ابھی حال ہی میں اشمو کے اَن یَن سیلر میں نقارہ نوازی کی تھی۔

مجھے دوسری فیاضانہ پیشگی رقم ادا کی گئی، جس پر میں نے گزر بسر کی، جب میرے بارے میں نشر و اشاعت کی جا رہی تھی۔ میں وقتاً فوقتاً دفتر آتا اور انٹرویو کرنے والوں، تصاویر بنانے والوں کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ ڈاکٹر ڈوش اور سویٹر والی لڑکی مجھ سے ہمیشہ اچھی طرح پیش آتی، مگر پہلی ملاقات کے بعد میں نے ہیرا کو کبھی نہیں دیکھا۔

اپنے پہلے دورے سے پہلے بھی میں بہتر معیار کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ پھر بھی، کلیپ کی خاطر میں زائیڈ کر کے فلیٹ ہی میں رہا۔ ایجنسی سے میری معاملت پر کلیپ بہت ناراض ہوتا تھا؛ جتنا ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کے تسکین کے لیے کہا، مگر میں نے ہار نہیں مانی، اور ہمیں پرانے شہر جانے، بیئر پینے یا تازہ خون کی ساسیج کھانے کے مواقع بھی فراہم نہیں ہوئے۔ اس کے بجائے، اپنے آپ کو سفری زندگی کے لیے تیار کرنے کی خاطر میں

نے ریلوے اسٹیشن پر اعلیٰ درجے کا ڈنر کھانا شروع کر دیا تھا۔

آسکر کے لیے ممکن نہیں کہ ان سطور میں وہ اپنی کامیابی کی تفصیلات فراہم کر سکے۔ اشاعتی پوسٹر، جو مجھے ایک معجزاتی انسان، دعا تعویذ سے علاج کرنے والا اور مسیحا سے ذرا کم حیثیت میں پیش کر رہے تھے، جو بے ایمانی کی حد تک مؤثر ثابت ہوئے۔ میری افتتاحی پیش کش وادیِ رُوہرز کے شہروں کے بڑے بڑے ہال میں منعقد ہوئی جن میں پندرہ سو سے دو ہزار تک آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ ایک دائرۂ نور مجھے تنِ تنہا سیاہ مخمل کے پردے کے مقابل، ڈنر جیکٹ میں ملبوس، دریافت کرتا تھا۔ میں نقارہ نوازی کرتا، مگر میرے سامعین جاز کی آت والے نوجوانوں پر مشتمل نہیں ہوتے تھے۔ نہیں! جو مجھے سننے اور دیکھنے کے لیے جمع ہوتے وہ درمیانہ عمر، بڑی عمر والے اور سہارے سے چلنے والے مریضوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ میرا پیغام زیادہ تر عمر رسیدہ لوگوں کو مخاطب کرتا تھا اور وہ ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے تھے۔ جب میں اپنے سہ سالہ نقارے کو جگاتا تو وہ خاموش بیٹھے نہیں رہتے تھے؛ وہ اپنی مسرتوں کا اظہار کرتے، اپنی عمر کے لحاظ سے نہیں، بلکہ سہ سالہ بچوں کی غوں غاں میں۔ جب آسکر نے معجز نما راسپوتین کی معجزانہ زندگی سے ایک کھیل پیش کیا تو انھوں نے ''راشو، راشو'' کہہ کر مجھے داد دی۔ مگر سامعین کی زیادہ تعداد راسپوتین کو پسند نہیں کرتی تھی۔ میری سب سے نمایاں کامیابیاں خاص واقعات پر مشتمل پیش کشوں پر نہیں، بلکہ شیرخوارگی اور بچپنے کی سطح کی پیش کشوں پر ہوئی تھیں۔ میں نے ان کو ایسے عنوان دیے تھے جیسے کہ: ''بچے کا پہلا دانت''، ''حیوانی کالی کھانسی''، ''خارش آور موزے''، ''آگ کا خواب، بستر میں پیشاب'' وغیرہ۔

بزرگ ناظرین کو یہ اچھے لگے۔ انھیں مکمل تفصیلات اچھی لگتی تھیں۔ انھوں نے اپنے پہلے دانت کاٹے اور ان کے مسوڑھے درد کرنے لگے۔ جب میں نے انھیں کالی کھانسی سے عفونت زدہ کیا تو دو ہزار بوڑھے کھانسنے لگے۔ جب میں نے انھیں اونی موزے پہنائے تو کیسا کھجانے لگے تھے۔ نہ جانے کتنی بوڑھی خواتین، کتنے بوڑھے حضرات نے اپنے زیر جامے گیلے کر دیے، ان گدوں کے علاوہ جن پر وہ بیٹھی یا بیٹھے ہوئے

تھے، جب میں نے بچوں کو آگ کے خواب دکھائے تھے۔اب یاد نہیں کہ یہ واقعہ 'دوپہال' یا 'بوخم' میں ہوا تھا؛ نہیں، یہ 'ریکلنگ ہاؤسن' میں پیش آیا تھا۔اس وقت میں بوڑھے کان کنوں کی رہائش گاہ میں اپنی پیش کش کر رہا تھا جس کا انتظام ان کی یونین نے کیا تھا۔گزرے دنوں والے ان بے چاروں کی— میں نے اپنے آپ سے کہا— تمام عمر سیاہ کوئلہ نکالتے بسر ہوئی تھی؛ یقیناً یہ لوگ ذرا سی سیاہ دہشت تو برداشت کر لیں گے۔ چناں چہ آسکر نے نقارے پر ''بد اعمال کالی چڑیل'' پیش کیا تو، کیا دیکھتے ہیں، کہ پندرہ سو بوڑھے کھوسٹ کان کنی، جن کی زندگی وتشتی کان، دھماکے، سیلاب زدہ گڑھے، ہڑتال اور بیروزگاری میں گزری تھی، خون جما دینے والی آواز میں چیخے، جیسی چیخ میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ان کی چیخوں سے— ان ہی کی وجہ سے میں اس کا تذکرہ کر رہا ہوں— دبیز پردوں سے ڈھکی ہونے کے باوجود کئی کھڑکیوں کے شیشے مسمار ہو گئے تھے۔گویا مجھے میری شیشہ شکن آواز واپس مل گئی تھی، مگر میں نے اسے استعمال نہیں کیا؛ میں اپنا کاروبار تباہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جی ہاں! کاروبار اچھا تھا۔جب دورہ ختم ہوا اور میں نے ڈاکٹر ڈوش سے حساب کتاب کیا تو میرا ٹین کا نقارہ تو سونے کی کان نکلا۔

میں نے استاد بیرا کے بارے پوچھا بھی نہیں، اس لیے کہ اس سے دوبارہ ملنے کی امید نہیں رہی تھی، مگر جیسا کہ ڈاکٹر ڈوش نے مجھے بتایا تھا، بیرا میرا انتظار کر رہا تھا۔

بیرا سے میری دوسری ملاقات، پہلی سے بہت مختلف تھی۔اس بار آسکر کو شاہ بلوط کی میز کے سامنے کھڑا نہیں ہونا پڑا تھا۔اس کے برعکس، میں بجلی کی کرسی میں بیٹھا، جو بیرا کے لیے فرمائش سے بنوائی گئی تھی۔ڈاکٹر ڈوش نے میرے بارے میں پریس اعلانات کی ٹیپ بنوائی تھی، جو ہم اور بیرا بیٹھے سنتے رہے۔بیرا بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔میرے لیے اخباروں کے پُر جوش اظہارات قدرے شرمندگی کا باعث تھے۔وہ مجھے مسلک کی صورت دے رہے تھے، آسکر اور اس کا نقارہ جسم و روح کا شافی بن گیا تھا۔سب سے اچھی شفا جو ان سے ملی تھی وہ یادداشت کی خرابی کے مرض میں تھی۔''آسکریت'' لفظ پہلی بار سنا گیا تھا، مگر نہیں، میں افسوس سے کہنا چاہتا ہوں، کہ یہ آخری بار سنا گیا تھا۔

بعد میں، سوئیٹر والی لڑکی میرے لیے چائے لائی اور استاد کی زبان پر دو گولیاں رکھیں۔
ہم نے گپ شپ کی۔ اب وہ الزام تراش نہیں تھا۔ اب تو برسوں پہلے کے Four Seasons Café جیسے حالات تھے، بس سینیورا میری روزویدا موجود نہیں تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے ماضی کی کسی طویل کہانی کے دوران پیرا سو گیا تھا، میں دس پندرہ منٹ تک وہیل چیئر سے کھیلتا رہا، کبھی موٹر چلاتا، کبھی فرش پر ادھر اُدھر دوڑاتا، دائیں بائیں گھماتا۔ مجھے اس غیر معمولی فرنیچر کو چھوڑنا مشکل ہو رہا تھا جو مجھے ہر ممکن اور بے ضرر آرام پہنچا رہا تھا۔

میرا دوسرا دورہ Advent کے دنوں میں ہوا۔ میں نے اس کی مناسبت سے اپنا پروگرام بنایا تھا، جس کی مذہبی پریس میں بہت پذیرائی ہوئی۔ اس لیے کہ میں عادی گنہگاروں کو دل چھو لینے والی آوازوں میں کرسمس کے گیت گاتے چھوٹے چھوٹے بچوں میں تبدیل کر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ دو ہزار پانچ سو بوڑھی روحیں لہک لہک کر "یسوع! تیرے لیے ہی جیتا ہوں، تیرے لیے ہی مرتا ہوں" گا رہی تھیں، جن سے کبھی اس قسم کی بچگانہ معصومیت اور مذہبی جذباتی شدت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

میرا تیسرا دورہ کارنیوال کے زمانے میں ہوا تھا اور ایک بار پھر میں نے اپنے پروگرام کو نئے سرے سے ترتیب دیا تھا۔ کوئی بھی نام نہاد پُرلطف کارنیوال ان شاموں کے مقابلے میں زیادہ مسرت انگیز اور پُرسکون نہیں ہو سکتا جن میں مفلوج دادیاں Carmens اور انڈین حسیناؤں میں بدل دی جاتی ہوں اور دادا تڑ تڑ گولیاں چلاتا لڑائیوں میں اپنے ڈاکوؤں کی رہنمائی کرتا دکھائی دیتا ہو۔

کارنیوال کے بعد میں نے ایک ریکارڈ بنانے والی کمپنی سے معاہدہ کیا۔ ریکارڈنگ ساؤنڈ پروف اسٹوڈیو میں ہوئی تھی۔ پہلے تو اسٹوڈیو کے بے رس اور بنجر ماحول نے میری نقارہ نوازی کے انداز کو بے کیف کر دیا تھا، مگر میں نے بعد میں اس کی دیواروں کو بوڑھے لوگوں کی بڑی بڑی تصویروں سے بھروا دیا تھا، جیسے لوگ بوڑھوں کے لیے مخصوص گھروں میں یا پارک کی بنچوں پر دیکھے جاتے ہیں۔ ان پر توجہ مرکوز کرنے کے بعد میں اسی ایقان کے ساتھ نقارہ نوازی کر سکتا تھا جیسی انسانی حرارت سے پُر جگہوں پر کی گئی تھی۔

ریکارڈ گرما گرم تازہ روٹیوں کی طرح بکے۔ آسکر دولت مند بن گیا۔ تو کیا اس نے زائیڈلر کے فلیٹ کا وہ خستہ حال کمرہ چھوڑ دیا جو کبھی واش روم تھا؟ جی نہیں! کیوں نہیں؟ اپنے دوست کلیپ اور دھندلے شیشوں کے دروازے کے پیچھے خالی کمرے کی خاطر، جس میں کبھی سسٹر ڈوروتھیا رہتی اور سانس لیتی تھی۔ آسکر نے اپنی دولت کا کیا استعمال کیا؟ اس نے ماریا، اپنی ماریا کو شادی کی پیش کش کی۔

میں نے ماریا سے کہا تھا، اگر تم اِشتسیل کو روانگی کا پروانہ دے دو؛ اگر نہ صرف تم اس سے شادی کا خیال چھوڑ دو، بلکہ اس کو اپنے گھر سے نکال دو، تو میں تم کو ایک جدید غذا کی چلتی ہوئی چین خرید دوں گا۔ اس لیے کہ میری پیاری ماریا، تم کاروبار کے لیے پیدا ہوئی تھیں، اس واہیات مسٹر اِشتسیل کے لیے نہیں۔

میں نے ماریا کے بارے میں غلطی نہیں کی تھی۔ اس نے مسٹر اِشتسیل کو چھوڑ دیا، اور میرے مالیاتی تعاون سے، 'فرائیڈ رِخ اشتراسے' میں ایک اوّل درجے کا غذائی اسٹور قائم کر لیا۔ کاروبار نے ترقی کی اور تین برس بعد، یعنی پچھلے ہفتے، بلکہ کل ہی — خوشی سے پھولے نہ سماتی، اور تشکر کے اعتراف کے ساتھ — ماریا نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے 'اوبر کاسل' میں ایک شاخ بھی قائم کر لی ہے۔

کیا یہ سب میرے ساتویں یا آٹھویں دورے کے بعد ہوا تھا؟ بہر حال، وہ جولائی کا مہینہ تھا اور بہت گرم۔ مرکزی اسٹیشن سے، جہاں میں عمر رسیدہ آٹوگراف لینے والوں کے ہجوم میں گھر گیا تھا، میں نے کنسرٹ کے دفتر جانے کے لیے ٹیکسی لی، اور وہاں اترتے ہی مزید عمر رسید آٹوگراف لینے والوں نے مجھے گھیر لیا، جن کو اپنے پوتوں نواسوں کی نگہبانی پر ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے نام کا اعلان کیا، دروازہ کھل گیا اور قالین ہی بڑی میز تک لے گیا مگر میز کے پیچھے منتظر نہ بیرا تھا اور نہ اس کی وہیل چیئر۔ وہاں صرف مسکراتا ڈاکٹر ڈوش بیٹھا ہوا تھا۔

بیرا کا انتقال ہو گیا تھا۔ کئی ہفتے قبل مرا تھا وہ۔ اس نے اپنے دفتر والوں کو اپنی علالت کے بارے میں کچھ بتانے سے منع کر دیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ اس کی موت کو آسکر کے دوروں میں خلل انداز نہیں ہونا چاہیے۔ جلد ہی اس کی وصیت پڑھی

گئی: مجھے اس کی ملکیت کا ایک مختصر حصہ اور روزویدا کی تصویر ورثے میں ملی تھی، جو اس کی میز کے قریب ٹنگی ہوتی تھی۔ ساتھ ہی مجھے شدید مالیاتی نقصان ہوا، اس لیے کہ میں مزید کام کرنے کی کیفیت میں نہیں تھا۔ میں نے دو مکمل دورے معطل کر دیے ـــ جنوبی جرمنی اور سوئٹزرلینڈ کے ـــ ناکافی نوٹس پر، اور معاہدہ توڑنے پر مجھ پر مقدمہ کر دیا گیا تھا۔

اور افسوس کہ میرا نقصان، مالیاتی نقصان سے بھی زیادہ تھا۔ ہیرا کی موت میرے لیے شدید صدمہ تھی میں جس سے ایک رات میں نکل نہیں سکا تھا۔ میں نے اپنے نقارے کو تالا لگا دیا، اپنے کمرے سے ہلنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ حالات میں مزید خرابی یہ ہوئی کہ یہی وہ وقت تھا جسے میرے دوست کلیپ نے سُرخ بالوں اور سگریٹ والی لڑکی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے لیے چنا، اور یہ سب اس لیے ہو رہا تھا کہ ایک بار اس نے لڑکی کو اپنی تصویر دے دی تھی۔ شادی سے کچھ دن قبل، میں جس میں مدعو نہیں تھا، اس نے اپنا کمرہ خالی کر دیا اور اُستاکم منتقل ہو گیا تھا۔ آسکر اب زائیڈلر کے فلیٹ کا اکیلا کرایے دار رہ گیا تھا۔

میرا غم بھی ایک سفری کہانی کی مانند تھا۔ میں نے دونوں کمروں کے دروازے کھولے، خود کو نہانے کے ٹب سے گھسیٹتا، ڈوروتھیا کے کمرے کی جانب جانے والے ریشے کے زٹر تک لے گیا، کپڑے کی خالی الماری میں جھانکا، واش اسٹینڈ کے آئینے کی تضحیک کا سامنا کیا، بڑے سے خالی بستر کو دیکھ کر مایوس ہوا، راہداری کی طرف پسپا ہوا اور بھاگ کر کمرے میں گھس گیا، مگر وہ جگہ بھی ناقابلِ برداشت تھی۔ بلاشبہ، تنہا مجرد لوگوں کی ضروریات کی پیش بینی کے سبب، ایک مشرقی پروشیائی نے، جو اپنی ماسوریائی [ماسوریا شمالی پولینڈ کا جھیلوں والا علاقہ ہے۔ مترجم] جائیداد سے ہاتھ دھو چکا تھا، 'جوبتر اشتراسے' کے قریب ہی ایک ادارہ قائم کیا تھا جو کرایے پر کتے فراہم کرتا تھا۔

وہیں سے میں نے ایک چمک دار سیاہ رنگ کا، طاقت ور اور ذرا زیادہ موٹا تازہ راٹ وائلر کتا، لوکس کرایے پر لیا۔ بجائے اس کے کہ میں نہانے کے ٹب اور سسٹر ڈوروتھیا کی خالی کپڑے کی الماری تک دوڑتا رہتا، میں نے لوکس کے ساتھ چہل قدمی شروع کر دی۔ لوکس کبھی کبھی مجھے دریائے رھائن کی طرف لے جاتا، جہاں وہ جہازوں پر بھونکتا۔ اکثر وہ مجھ کو

'راتھو'، 'گرافس برگ فاریسٹ' لے جاتا جہاں وہ محبت کرنے والوں پر بھونکتا۔ جولائی 1951 کے آخر میں وہ مجھے 'گیرے شائم' کے مضافات میں لے گیا جو نئے کارخانوں اور ایک بڑے شیشے کی مصنوعات کے ادارے کی مدد سے، تیزی سے اپنا دیہی کردار کھوتا جا رہا ہے۔ 'گیرے شائم' سے پرے، باڑوں سے علاحدہ کیے گئے، گھریلو سبزی اگانے والے باغیچوں کے درمیان سے گھومتا گھماتا ایک راستہ چراگاہوں اور اناج کے کھیتوں کی طرف جاتا ہے۔

کیا میں بتا نہیں چکا ہوں کہ اس دن بہت گرمی تھی، جب لوکس مجھے 'گیرے شائم' اور 'گیرے شائم' سے پرے، اناج کے کھیتوں — غالباً رائی کے — اور باغیچوں کی طرف لے گیا تھا؟ جب مضافات کے آخری گھر ہمارے پیچھے رہ گئے تو میں نے لوکس کی رسّی کھول دی تھی۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے لگا رہا؛ وہ وفادار کتا تھا، اور غیر معمولی طور پر وفادار، اس لیے کہ اس نوعیت کے کاروبار میں اسے کئی مالکوں کا وفادار ہونا پڑتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوکس میری پسند سے کہیں زیادہ 'مہذب' تھا، کہ میں اس کو اِدھر اُدھر بے لگام دوڑتا پھرتا دیکھنا چاہتا تھا اور میں نے کئی بار اسے یہ خیال دینے کے لیے ٹھوکریں بھی ماری تھیں، مگر جب وہ بھاگا بھی تو، صاف ظاہر تھا کہ اس کے ضمیر نے اسے پریشان کیا تھا۔ واپسی پر وہ اپنا چمک دار سیاہ رنگ کا سر جھکا دیتا اور اپنی — محاورتاً — وفادار آنکھوں سے مجھے دیکھتا۔

"لوکس اب دوڑ بھی جا" میں نے مطالبہ کیا، "بھاگ یہاں سے۔"

کئی بار اس نے میرا حکم مانا، مگر اتنے کم وقت کے لیے جاتا۔ ایک دن میں بہت خوش ہوا جب وہ بہت دیر کے لیے رائی کے کھیت میں غائب ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا، شاید وہ کسی خرگوش کے پیچھے ہوگا۔ یا شاید اس کو، کتا ہونے کے لیے تنہائی کی ضرورت ہوئی ہو گی، بالکل اسی طرح جیسے کبھی تھوڑی دیر کے لیے، کتے کے بغیر، آسکر بھی انسان ہونا چاہے گا۔

میں نے اپنے اطراف پر کوئی توجہ نہیں دی۔ نہ باغیچوں نہ 'گرے شائم'، نہ کہر آلود نشیبی شہر نے میری آنکھوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ میں ایک زنگ آلود نقارے پر بیٹھ گیا، جس پر کسی زمانے میں تار لپیٹے گئے تھے اور آسکر شاید ہی کبھی اپنی زنگ آلود نشست پر بیٹھا ہوگا

جب سے اس نے تاروالے نقارے پر اپنے انگلیوں کے جوڑوں سے نقارہ نوازی شروع کی تھی۔ دن بہت گرم ہو رہا تھا۔ اس قسم کے موسم کے لیے میرا سوٹ بہت بھاری تھا۔ لوکس چلا گیا تھا اور واپس نہیں آیا۔ بلاشبہ کوئی لوہے سے ڈھلا تاروں والا نقارہ میرے ٹین کے نقارے کی جگہ نہیں لے سکتا: میں بتدریج ماضی میں واپس چلا گیا۔ جب میں اٹک گیا، جب اسپتالوں اور نرسوں سے بھرے پچھلے چند برسوں کے نقوش دوبارہ ابھرنے پر مصر ہو گئے، تو میں نے اپنی دو خشک چھڑیاں اٹھائیں اور اپنے آپ سے کہا، آسکر بس ایک منٹ انتظار کرو۔ ہمیں دیکھنے دو کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔ اور پھر میری پیدائش کے لمحے کے دو ساٹھ واٹ کے بلب روشن ہو گئے۔ ان کے درمیان پتنگے نے نقارہ نوازی کی، جس کے دوران طوفان نے بہت دور کچھ فرنیچر ہٹائے۔ میں نے ماتسیرات کو بولتے سنا، اور ایک لمحے بعد مما کو۔ ماتسیرات نے مجھ سے اسٹور کا وعدہ کیا، مما نے ایک کھلونے کا وعدہ کیا: تین برس کی عمر میں مجھے ایک نقارہ دیا جائے گا اور پھر آسکر نے جلد سے جلد تین برس گزارنے کی کوشش کی: میں نے کھایا، پیا، نکالا گیا، وزن بڑھایا، اپنا وزن کرنے، لپیٹنے، نہلانے، پاؤڈر لگانے، ٹیکا لگانے اور اپنی تعریف کرنے دیا: میں نے انھیں میرے نام سے پکارنے دیا، مسکرایا جب توقع کی گئی، ہنسا جب ضروری ہوا، صحیح وقت پر سویا، وقت پر جاگا، اور سونے کے دوران ایسی صورت بنائی جسے بالغ افراد فرشتوں جیسا چہرہ کہتے ہیں۔ مجھے کئی دست آئے، اور کئی بار نزلہ ہوا، کالی کھانسی ہوئی، کھانستا رہا اور اس وقت کھانسنا چھوڑا جب میں اس کی مشکل تال کا ماہر ہو گیا، جب میں نے اس کو ہمیشہ کے لیے اپنی کلائی میں ڈال لیا، اس لیے کہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں "کالی کھانسی" میرے خزانے کا ایک ٹکڑا ہے، اور جب آسکر نے دو ہزار سامعین کے لیے [نقارے پر] "کالی کھانسی" نامی کھیل پیش کیا تو دو ہزار بوڑھے مرد اور عورتیں کھانسنے لگے تھے۔

لوکس میرے قدموں میں گر کر بسورنے لگا، میرے گھٹنوں سے لپٹتا۔ اُف یہ کرایے والا کتا، جسے میری تنہائی نے لینے پر مجبور کیا تھا۔ اُدھر چاروں پیروں پر کھڑا، دُم ہلاتا، یقیناً یہ کتا ہے، کتے جیسا ہے، اس کے رال بھرے جبڑوں میں کچھ ہے: کوئی لکڑی، کوئی پتھریا جو کچھ ایک کتے کو پسند ہوتا ہے۔

رفتہ رفتہ میرا بچپن— وہ بچپن جو مجھے بہت عزیز ہے— چلا گیا۔میرے مسوڑھوں کا درد، میرے پہلے دانت کا پیش خیمہ ختم ہو گیا؛ تھک کر میں پیچھے کی طرف جھکا— ایک بالغ کوزہ پشت، احتیاط سے، مگر ذرا زیادہ ملبوس، کلائی میں گھڑی، ہاتھوں میں شناختی کاغذات، بٹوے میں بینک نوٹوں کا ایک بنڈل۔ میں نے ہونٹوں کے درمیان ایک سگریٹ لگائی، اس کو شعلہ دکھایا اور تمباکو پر بھروسا کیا کہ وہ میرے جوف دہن سے ایام طفولیت کے حاوی ذائقے بے دخل کر دے گا۔

اور لوکس؟ لوکس مجھ سے لپٹ رہا تھا۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا، اس پر سگریٹ کا دھواں چھوڑا۔ اسے اچھا نہیں لگا مگر وہ جما رہا اور اپنا بدن رگڑتا رہا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے چاٹا۔ میں نے ٹیلی گراف کے قریبی تار تلاش کیے، ابابیلوں کے لیے، جو میرے علم کے مطابق پیچھے پڑ جانے والے کتوں کا علاج ہوتی ہیں۔ وہاں کوئی ابابیل نہیں تھی، اور لوکس نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے میرے پتلون اور میری ٹانگ کے درمیان اپنی تھوتھنی ڈال دی، کسی ایسی جگہ کی تلاش میں، اس یقین کے ساتھ، گویا اس کے مشرقی پروشیائی مالک نے اسے اس قسم کی تربیت دی ہو۔

میرے جوتے کی ایڑی دوبار اس کے لگی۔ وہ چند فٹ پسپا ہو کر وہیں کھڑا ہو گیا تھرتھراتا، چاروں پیروں پر کھڑا رہا مگر مسلسل اپنی تھوتھنی پیش کرتا رہا، اس چھڑی یا پتھر کے ساتھ، اتنے اصرار کے ساتھ، گویا جو کچھ اس کے پاس تھا، چھڑی یا پتھر نہیں بلکہ میرا ہوا تھا جسے میں محسوس کر سکتا تھا، اپنے کوٹ یا اپنی گھڑی میں جو سنائی دینے والی آواز سے میری کلائی پر ٹِک ٹِک کر رہی تھی تو پھر وہ کیا چیز پکڑے ہوئے تھا؟ ایسی کون سی اہم، اتنی ممتاز شے تھی کہ مجھے دکھانے کے قابل تھی۔

میں نے اس کے گرم جبڑوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے، وہ شے اب میرے ہاتھ میں تھی، اور میں جانتا تھا کہ میرے ہاتھ میں کیا تھا، مگر میں نے ایسا ظاہر کیا گویا میں الجھن میں ہوں، گویا میں اس شے کو کوئی نام دینا چاہتا ہوں جو لوکس رائی کے کھیت سے میرے پاس لایا تھا۔

انسان کے جسم کے ایسے بھی حصے ہوتے ہیں جس کا زیادہ آسانی سے اور درستی

کے ساتھ اسی وقت معائنہ کیا جا سکتا ہے جب وہ جسم سے الگ ہوں، مرکز سے لاتعلق ہوں۔ وہ شے دراصل ایک انگلی تھی۔ ایک نسوانی انگلی۔ انگوٹھی پہننے والی انگلی۔ ایک نسوانی انگوٹھی پہننے والی انگلی۔ ایک پُرکشش انگوٹھی سمیت نسوانی انگلی۔ ہتھیلی کی پانچ ہڈیوں اور انگلی کے پہلے جوڑ کے درمیان، انگوٹھی سے تقریباً پون انچ نیچے، انگلی کاٹی گئی تھی۔ کٹائی صاف تھی اور بیرونی عضلے کا ریشہ نظر آ رہا تھا۔

وہ ایک خوب صورت انگلی، ایک متحرک انگلی تھی۔ اس کا نگینہ سونے کے چھ کانٹوں والی انگوٹھی پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ نگینہ نیلگوں زبر جد تھا۔ انگوٹھی پہنی جانے کے باعث اتنی گھس گئی تھی کہ ورثہ معلوم ہوتی تھی۔ میل کی لکیر کے علاوہ، ناخن کے نیچے بھری مٹی سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ انگلی نے کھرچنے یا زمین کھودنے کی کوشش کی تھی؛ ناخن قرینے سے تراشے ہوئے تھے۔ میں نے اسے کتے کی گرم تھوتھنی سے نکال لیا تو انگلی ٹھنڈی محسوس ہوئی۔ اس کا زردی مائل رنگ بھی اسے ٹھنڈا ہی پیش کر رہا تھا۔

کئی مہینوں سے آسکر اپنے کوٹ کی بیرونی جیب میں ایک ریشمی رومال لگائے رکھتا تھا۔ اس نے انگوٹھی کی انگلی کو ریشم کے اس مربعے پر رکھا تو اس نے محسوس کیا کہ انگلی کے، تیسرے جوڑ تک کے اندرونی حصے کی لکیریں دیکھ کر ظاہر ہوتا تھا یہ کسی مسلسل محنت کرنے والے ہاتھ کی انگلی تھی۔

انگلی کو رومال میں لپیٹنے کے بعد، میں تاروں والے نقارے سے اٹھا، کتے کی گردن تھپتھپائی اور داہنے ہاتھ میں رومال اور انگلی تھامے گھر کی طرف چل دیا۔ اپنی دریافت کے ساتھ کچھ نہ کچھ کرنے کے منصوبے بناتا، میں قریبی باغ کی باڑ تک پہنچا۔ یہی وہ وقت تھا جب وٹلر، جو سیب کے درخت کی پالنے جیسی ایک شاخ پر لیٹا رہتا تھا، مجھے اور کتے کو دیکھ کر مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔

# آخری ٹرام گاڑی اور مرتبان

وہ آواز، وہی لاف زنی، وہی ریں ریں! مزید یہ کہ وہ سیب کے درخت کی ایک پالنے جیسی ڈال پر لیٹا ہوا تھا۔ ''وہ چالاک کتا پھر آ گیا۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

میں قدرے حیران، ''تم وہاں چڑھے کیا کر رہے ہو؟''

وہ، کسل مندی سے انگڑائی لیتے ہوئے بولا، ''یہ صرف پکانے والے سیب ہیں، یقین جانو، تمھیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

وہ میرے اعصاب پر سوار ہوتا جا رہا تھا: ''کسے پروا ہے کہ یہ کون سے سیب ہیں؟ تم کیا سمجھتے ہو، کہ میں ڈر جاؤں گا؟''

اس کی ریں ریں اب پھنکار بنتی جا رہی تھی۔ ''تم مجھے سانپ سمجھے ہو گے۔ اس زمانے میں بھی پکانے والے سیب ہوا کرتے تھے۔''

میں، غصے میں: ''تمثیلی بکواس!''

وہ، مکاری سے: ''شاید، تم سمجھتے ہو کہ صرف کھانے والے سیب ہی گناہ کے قابل ہوتے ہیں؟''

میں جانے ہی والا تھا۔ جنت کے پھلوں کے بارے میں بحث کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تب اس نے زیادہ براہِ راست کوشش کی۔ پھرتی سے پیڑ پر سے کودا، بیدِ مجنوں کی طرح لمبا، باڑ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا: ''تمھارے کتے کو رائی کے کھیت میں کیا ملا؟''

نہ جانے کیوں میں نے کہہ دیا: ''ایک پتھر۔''

''اور تم نے وہ پتھر اپنی جیب میں رکھ لیا؟'' میری خوش قسمتی کہ وہ مجھ پر جرح نہیں کر رہا تھا۔ ''مجھے جیب میں پتھر رکھنا اچھا لگتا ہے۔''

''مجھے تو وہ چھڑی ہی جیسا لگا تھا۔''

''ہاں، ہو سکتا ہے۔ میں پھر بھی کہوں گا کہ وہ ایک پتھر ہے''

''اچھا، تو وہ ایک چھڑی ہے؟''

''مجھے کیا پروا، چھڑی ہے یا پتھر، پکائے جانے والے سیب ہیں یا کھائے جانے والے...... ایک لچک دار چھڑی؟''

''کتا گھر جانا چاہتا ہے۔ میں چلتا ہوں۔''

''گوشت کے رنگ کی چھڑی۔''

''تم اپنے سیب کی فکر کیوں نہیں کرتے؟ چل، لوکس۔''

''گوشت کے رنگ کی چھڑی... لچک دار چھڑی، اور اس میں ایک انگوٹھی؟''

''آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں صرف ایک آدمی ہوں، اس کتے کے ساتھ چہل قدمی کر رہا ہوں۔ میں نے اسے چہل قدمی کے لیے لیا ہے۔''

سبحان اللہ۔ دیکھو تو، یہ کیا ہے۔ میں بھی کچھ اُدھار لینا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے دو گے، صرف ایک سیکنڈ کے لیے، وہ خوب صورت انگوٹھی، جو چھڑی پر چمکی اور انگلی کی انگوٹھی بن گئی؟ میرا نام ویٹکر ہے۔ گاٹ فریڈ فان ویٹکر۔ اپنے خاندان کا آخری فرد ہوں۔''

لہٰذا اس طرح میں ویٹکر کا واقف کار بن گیا تھا۔ ابھی دن گزرا بھی نہیں تھا کہ ہم دوست بن گئے، اور میں اب بھی اسے دوست کہتا ہوں۔ صرف چند روز قبل، جب وہ مجھ سے ملنے آیا تھا، میں نے کہا تھا، میں بہت خوش ہوں، میرے پیارے گاٹ فریڈ، کہ تم نے مجھے پولیس میں تبدیل کر دیا ہے، اب میں عام اجنبی نہیں رہا۔''

اگر واقعی فرشتے ہوتے ہیں، تو ویٹکر جیسے دکھائی دیتے ہوں گے، لمبا— بیدِ مجنون جیسا— شگفتہ مزاج— لچک دار— بجائے کسی نرم جسم والی، بے قرار لڑکی کو گلے لگانے کو،

کسی بے ثمر بجلی کے کھمبے سے لپٹ جانے والا۔

پہلی نظر میں آپ کو اصلی ڈیکر نظر نہیں آتا۔ اپنے اطراف کے مطابق، وہ خود کو دھاگے کی طرح، کھیت میں لگے پتلے کی طرح یا کسی پیڑ کی شاخ میں بدل لیتا ہے۔ اسی وجہ سے میں اسے دیکھ نہیں پایا، جب میں تار والے نقارے پر بیٹھا تھا اور وہ سیب کے درخت پر۔ کتا بھونکا نہیں تھا، اس لیے کہ کتے کسی فرشتے کو نہ دیکھ سکتے ہیں، نہ سونگھ سکتے ہیں اور نہ اس پر بھونک سکتے ہیں۔''

''میرے پیارے گاٹفریڈ، کیا تم مہربانی کرو گے؟'' میں نے پرسوں اس سے کہا تھا ''کہ اس بیان کی ایک نقل مجھے بھیج دو جو تم نے دو برس قبل پولیس کو دیا تھا؟'' وہی بیان میرے مقدمے کی بنیاد بنا تھا اور بعد میں گواہی کی دستاویز بن گیا تھا۔

یہ رہی نقل۔ میں اس سے خود بیان کرنے کے لیے کہا، جو اس نے میرے خلاف عدالت میں دیا تھا:

اس دن، میں، گاٹ فریڈ ڈیکر سیب کے ایک درخت کی پالنے جیسی شاخ پر لیٹا ہوا تھا، جو میری ماں کے باغیچے کے کنارے واقع ہے اور ہر برس اتنے پھل دیتا ہے جو ہمارے سات مربے بنانے والے مرتبان بھرنے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ میں پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا، میری بائیں جانب کی کمر شاخ کی کجی سے لگی ہوئی تھی، جس پر کائی سی لگی ہوئی تھی۔ میرے پاؤں 'گرے شائم' شیشے کے کارخانے کی طرف تھے۔ میں کیا دیکھ رہا تھا؟ میں بالکل سامنے دیکھ رہا تھا، اس انتظار میں تھا کہ میرے میدانِ نظر کے سامنے کچھ ہو۔

ملزم، جو آج میرا دوست ہے میرے میدانِ نظر میں ظاہر ہوا۔ اس کے ساتھ ایک کتا تھا، اس کے اطراف گھومتا ہوا، کتے کی طرح۔ اس کا نام، جیسا کہ ملزم نے مجھے بعد میں بتایا تھا، لوکس تھا، راٹ وائلر نسل کا، اور اس دُکان سے کرایے پر مل سکتا تھا، جو سینٹ روش چرچ سے زیادہ دور نہیں تھی۔

ملزم تار والے خالی ڈرم پر بیٹھا، جو جنگ کے بعد سے، میری ماں، ہلس جان ڈیکر کے مذکورہ باورچی خانے کے باہر رکھا ہوا تھا۔ جیسا کہ عدالت کو علم ہے، ملزم ایک چھوٹا سا آدمی ہے۔

مزید یہ کہ اگر ہم سچ کہنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ناقص آدمی ہے۔اسی حقیقت نے مجھے اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔اس کا طرزِ عمل بھی مجھے عجیب لگا تھا۔اس چھوٹے، قرینے سے ملبوس آدمی نے زنگ آلودہ تاروالے نقارے پر نقارہ نوازی کی، پہلے اپنی انگلیوں سے، اس کے بعد دو خشک چھڑیوں سے۔آپ کو یاد ہوگا کہ ملزم پیشے کے اعتبار سے نقارہ نواز ہے اور جیسا کہ بلا کسی شبہے کے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ اپنا کام ہر جگہ اور ہر وقت کرتا رہتا ہے؛ اور اگر آپ مزید غور کریں تو دیکھیں گے کہ تاروالے نقارے میں کوئی خاص بات ہے، جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے، جو عوام کو اسے بجانے پر اکساتی ہے۔اور یہ بیان کرنا قطعاً غیر ضروری نہیں کہ موسمِ گرما کے ایک گرم دن، ملزم آسکر ماتسیرات، مسز ہیلس فان ڈِلر کے باورچی خانے کے باہر تاروالے نقارے پر بیٹھا، بیدِ مجنون کی دو غیر مساوی چھڑیوں کی مدد سے، متوازن تال میں ترتیب دی ہوئی آوازیں نکال رہا تھا۔

میں مزید تصدیق کرتا ہوں کہ لوکس نامی کتا تھوڑی دیر کے لیے ایک رائی کے کھیت میں غائب ہو گیا تھا، جی ہاں، رائی کی فصل کٹائی کے لیے تیار تھی۔اگر مجھ سے یہ سوال کیا جائے کہ وہ کتنی دیر غائب رہا تھا تو میں اس کا جواب دینے سے قاصر ہوں، اس لیے کہ جوں ہی میں اپنے سیب کے درخت کی پالنے جیسی شاخ پر لیٹ جاتا ہوں، مجھے وقت کا احساس نہیں رہتا۔اگر میں کہوں کہ کتا کافی دیر کے لیے غائب ہوا تھا، تو اس کا مطلب ہوگا کہ میں اسے بھول گیا تھا، اس لیے کہ مجھے اس کا کالا کوٹ اور لچکیلے کان بہت پسند تھے۔

میں یہ کہنے میں خود کو حق بجانب محسوس کرتا ہوں کہ ملزم کتے کو بھولا نہیں تھا۔

جب لوکس نامی کتا پکی رائی کے کھیت سے واپس آیا تو دانتوں کے درمیان وہی کوئی شئے ساتھ لایا تھا۔میں اس شے کو چھڑی، پتھر یا شاید ٹین کا ایک ڈبا سمجھا تھا۔صرف اس وقت جب ملزم نے وہ بنائے جُرم شے کتے کی تھوتھنی سے نکالی تھی تو میں نے یقینی طور پر پہچان لیا تھا کہ وہ کیا شے تھی، مگر اس دوران جب کتے نے، وہ شے پکڑے ہوئے اپنی تھوتھنی ملزم کی پتلون کے بائیں پائنچے سے رگڑی تھی تو میں کہوں گا کہ اس وقت تک، جب ملزم نے اس شے کا قبضہ لیا تھا، کئی منٹ گزر چکے تھے، کتنے منٹ گزر چکے تھے، میں حتمی طور پر کہہ نہیں سکتا۔

کتے نے اپنے عارضی مالک کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی بہت کوشش کی تھی، مگر ملزم اپنے، بے تنوع، دیوانہ پن، بلکہ بیگانہ انداز میں نقارہ نوازی میں مشغول رہا۔صرف اس وقت جب کتے نے مبتذل طریقے سے اپنی تھوتھنی ملزم کی ٹانگوں کے درمیان ٹھونسنے کی کوشش کی، تب اس نے اپنی بید مجنوں سے بنی چھڑیاں پھینک کر اپنے دائیں پیر سے — مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ دایاں پیر ہی تھا — کتے کو ٹھوکر ماری تھی۔کتا ایک نصف دائرہ بنا کر، کتے کی طرح لرزتا واپس آیا اور اس نے ایک بار پھر اس شے سمیت اپنی تھوتھنی ملزم کو پیش کی تھی۔بغیر اُٹھے ہوئے، ملزم نے اپنا بایاں ہاتھ کتے کے دانتوں کی طرف بڑھایا تھا۔اپنی دریافت سے سبک دوشی کے بعد کتا کئی فٹ پیچھے چلا گیا۔ملزم نے بیٹھے ہوئے، وہ شے اپنے ہاتھ میں رکھی، مٹھی بند کی، کھولی، پھر بند کی، اور جب اگلی بار مٹھی کھولی تو میں نے کوئی شے چمکتی ہوئی دیکھی تھی۔ جب ملزم اس شے کو دیکھنے کا عادی ہو گیا، تو اس نے اس شئے کو اپنے انگوٹھے اور پہلی انگلی کی مدد سے، تقریباً آنکھ کی سطح تک بلند کیا تھا۔

اس وقت میں نے اس شے کی انگلی کے طور پر شناخت کی تھی، اور ایک لمحہ بعد، چمک کے باعث اس انگلی کی، انگوٹھی کی انگلی کی حیثیت میں شناخت کی تھی۔بالکل ان جانے طور پر، کسی خاص وجہ کے بغیر، میں نے مابعد جنگ کے اس نہایت دل چسپ مقدمے کو ایک نام دے دیا تھا۔اس کے بعد سے، اکثر و بیش تر، میں، گاٹ فریڈ ونگر، اس Ring Finger Case کا مرکزی گواہ کہا جانے لگا تھا۔

چوں کہ ملزم غیر متحرک رہا تو میں بھی غیر متحرک ہو گیا تھا۔دراصل اس کی بے حرکتی نے خود ہی مجھے مطلع کر دیا تھا۔اور جب ملزم نے اس رومال میں، جو وہ اپنے کوٹ میں لگاتا رہا تھا، انگلی اور انگوٹھی کو احتیاط سے لپیٹا تو مجھے تار والے نقارے پر بیٹھے آدمی سے ہم دردی ہو گئی: کتنا صاف ستھرا اور قاعدے کا پابند ہے وہ، اب ایک انسان ہے میں جسے جاننا چاہوں گا۔پھر یہ ہوا کہ میں نے اس کو پکارا تھا جب وہ اپنے کرایے والے کتے کے ساتھ 'گریسے شائم' کی طرف جانے والا تھا۔اس کا پہلا ردِ عمل مشتعل کر دینے والا، بلکہ متکبرانہ تھا۔آج تک میں سمجھ نہیں پایا ہوں، کیوں، کیا اس لیے کہ میں ایک پیڑ پر لیٹا ہوا تھا: اسے

مجھ کو علامتی سانپ کے طور پر لینا چاہیے تھا، حتیٰ کہ شبہ کرنا چاہیے تھا کہ میری ماں کے پکائے جانے والے سیب جنت کی قسم کے سیب ہیں بھی کہ نہیں۔

ہو سکتا ہے کہ پیڑوں کی شاخ پر لیٹنا شیطان کی پسندیدہ عادت ہو، مگر میرے معاملے میں یہ محض بیزاری تھی، ایک ذہنی کیفیت تھی جو اکثر بغیر کسی وجہ کے طاری ہو جاتی تھی، جو مجھے ہفتے میں کئی بار مندرجہ بالا پیڑ پر آرام کی کیفیت میں لیٹنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ شاید بیزاری خود ہی مطلق بدی ہو۔ اور اب مجھے پوچھنے دیجیے کہ وہ کون سا محرک تھا جو اُس گرم دن ملزم کو 'ڈوسلڈارف' کے مضافاتی علاقے 'گرے شائم' لے گیا تھا۔ تنہائی، جیسا کہ اس نے بعد میں اعتراف کیا تھا۔ مگر کیا بیزاری اور تنہائی جڑواں بہنیں نہیں؟ میں یہ نکات ملزم کی وضاحت کی نیت سے اُٹھا رہا ہوں، نہ کہ اس کو پریشان کرنے کے لیے، کہ اس لیے، جس وجہ سے میں اسے پسند کرنے، اس سے بات کرنے اور دوستی کرنے لگا تھا، وہ اس کا مخصوص اندازِ بدی، اس کی نقارہ نوازی تھی جس نے بدی کو اس کے اپنے ترتیب وار اجزائے ترکیبی میں حل کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس پر میری الزام تراشی، وہ عمل جو اس کو یہاں ملزم کی حیثیت میں، اور مجھے گواہ کی حیثیت میں لایا ہے، ایک کھیل تھا جو ہم نے ایجاد کیا تھا، ایک طریقہ تھا اپنی بیزاری اور تنہائی کو کسی اور طرف لگانے اور دل بہلانے کا۔

کچھ تذبذب کے بعد ملزم نے، میری درخواست پر انگوٹھی، اُس انگوٹھی کی انگلی سے اتار کر — جو آسانی سے اُتر گئی تھی — میری چھنگلیا میں پہنا دی تھی۔ انگوٹھی صحیح فٹ تھی اور میں بہت خوش تھا۔ میرے خیال میں آپ کو یہ بتانا ضروری نہیں کہ انگوٹھی کو پہن کر دیکھنے سے قبل میں پیڑ سے اُٹھ کر نیچے اُتر آیا تھا۔ باڑ کی دونوں جانب کھڑے، ہم دونوں نے اپنا اپنا تعارف کرایا اور تھوڑی دیر، مختلف سیاسی موضوعات پر کچھ باتیں کیں، پھر اس نے انگوٹھی مجھے دے دی تھی۔ انگلی اس نے بہت احتیاط سے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ ہم دونوں متفق تھے کہ وہ انگلی کسی عورت کی تھی۔ جب میں انگوٹھی پکڑے ہوئے تھا، اور روشنی کو اس پر رقص کرنے دیا، اس وقت ملزم نے، اپنے بائیں ہاتھ سے باڑ پر ایک پُر جوش رقص کی تال پیش کی تھی۔ میری ماں کے باغیچے کے اطراف کی چوبی باڑ بہت خستہ حالت میں تھی؛ ملزم کی

تھاپ پر باڑ جھن جھنا، کھڑکھڑا اور لرز رہی تھی۔مجھے معلوم نہیں کہ ہم دونوں، آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کرتے کتنی دیر وہاں کھڑے رہے تھے۔ہم اس معصومانہ تفریح میں مشغول تھے کہ ہمیں درمیانہ درجے کی بلندی پر پرواز کرتے ہوائی جہاز کے انجن کی آواز سنائی دی؛ جہاز غالباً 'لوہ باؤسن' میں اترنے کی تیاری کر رہا تھا۔حالاں کہ ہم دونوں تجسس میں تھے کہ یہ جہاز دو انجنوں پر اترے گا یا چار انجنوں پر، مگر ہم نے اپنی نظریں ایک دوسرے پر سے ہٹائی نہیں تھیں، نہ ہی جہاز کی طرف دیکھا تھا؛ بعد میں جب ایک بار پھر کھیل کھیلنے کا موقع آیا تو ہم نے اس کو ایک نام دیا تھا: لیوشگر کی پرہیز گاری؛ ایسا لگتا ہے گویا لیوشگر کسی دوست کا نام ہے، جس کے ساتھ ملزم نے برسوں پہلے یہ کھیل کھیلا تھا، عام طور پر قبرستانوں میں۔

جب جہاز کو— دو انجنوں پر یا چار انجنوں پر— اترنے کا میدان مل گیا— مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ— میں نے انگوٹھی واپس کردی تھی۔ملزم نے اس کو اسی انگلی پر پہنا دیا، جسے ایک بار پھر رومال میں لپیٹ دیا، اور مجھ سے کچھ دور ساتھ چلنے کی درخواست کی۔

یہ واقعہ جولائی کی سات تاریخ 1951 کا تھا۔ہم ایک ساتھ 'گرے شائم' ٹرام کار کے آخری اسٹیشن تک گئے، مگر جس گاڑی پر ہم سوار ہوئے وہ ایک ٹیکسی تھی۔

اس کے بعد سے ملزم نے مجھ سے بے حد فیاضی سے پیش آنے کے کئی موقعے نکالے۔ہم ٹیکسی میں شہر گئے، اور ٹیکسی کو، سینٹ روش چرچ کے قریب، کتے کرایے پر دینے والی دُکان کے باہر انتظار میں کھڑا رکھا۔لوکس کو واپس دینے کے بعد ہم 'بلنگ' اور اوبر بلک' سے ہوتے ہوئے مغربی قبرستان گئے، جہاں مسٹر ماتسیرات کو بارہ مارک سے زیادہ کرایہ ادا کرنا پڑا تھا۔اس کے بعد ہم کارنیف کے سنگ تراشی کے ادارے گئے۔

وہ جگہ نفرت انگیز حد تک گندی تھی، اور مجھے خوشی ہوئی جب سنگ تراش نے میرے دوست کا دیا ہوا کام پورا کیا۔اس میں ایک گھنٹا لگ گیا تھا۔جب میرا دوست پیارے انداز میں اوزار اور مختلف قسم کے پتھروں کے بارے میں مجھے لیکچر دے رہا تھا، مسٹر کارنیف نے، انگلی پر کوئی تبصرہ کیے بغیر— انگوٹھی کے بغیر— پلاسٹر سے انگلی کا سانچا بنا دیا۔اس دوران میری صرف آدھی آنکھ کھلی تھی۔پہلے انگلی پر کچھ لگانا پڑا تھا؛ یعنی اس نے

انگلی پر چربی ملی اور اس کے اطراف ایک ڈور باندھی۔ پھر اس نے پلاسٹر چڑھایا، مگر پلاسٹر کے سخت ہونے سے پہلے، اس ڈور کے ذریعے مولڈ کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ پیشے کے اعتبار سے میں ڈیکوریٹر ہوں اور پلاسٹر بنانا میرے لیے نئی بات نہیں، اس کے باوجود، اس وقت جب مسٹر کارنیف نے وہ انگلی اُٹھائی تھی، اس کا معیار غیر جمالیاتی ہو گیا تھا، جو اس وقت ختم ہوا جب سانچا بن جانے کے بعد ملزم نے انگلی واپس لی اور اس کو چکنائی سے پاک کیا تھا۔ میرے دوست نے سنگ تراش کو اُجرت دی، حالاں کہ مسٹر کارنیف رقم لینے پر تیار نہیں تھا، اس لیے کہ وہ مسٹر ماتسیرات کو اپنا رفیقِ کار سمجھتا تھا، اور یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آسکر نے، جسے وہ مسٹر ماتسیرات کہہ رہا تھا، اس کے پھوڑوں کو کسی اُجرت کے بغیر نچوڑا تھا۔ جب سانچا سخت ہو گیا تو سنگ تراش نے ڈھلائی کو نکالا، مسٹر ماتسیرات کو سانچا دیا، اور وعدہ کیا کہ اگلے چند دنوں میں وہ اور بھی سانچے بنا دے گا۔ تب وہ، اپنے لوحِ مزارات کی نمائش سے گزرتا ہوا ہمیں 'بہت وِیگ' تک پہنچانے گیا۔

دوسری ٹیکسی ہم کو مرکزی اسٹیشن لے گئی۔ وہاں ملزم نے بہترین ریسٹوران میں انواع و اقسام کی غذاؤں سے میری مدارات کی۔ ویٹروں سے اس کی دوستانہ لہجے میں بات چیت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ان کا باقاعدہ گاہک ہوگا۔ ہم نے ہارس ریڈش کے ساتھ گائے کا اُبلا گوشت، دریائے رھائن کی سامن مچھلی اور پنیر کھایا اور سب کے اوپر شیمپین نوش کی۔ جب ہماری گفتگو واپس انگلی کی طرف گئی، تو میں نے مشورہ دیا کہ اس کو کسی اور کی ملکیت سمجھا جانا چاہیے، اور اس کو مشورہ دیا کہ انگلی کو گم ہونے اور پائی جانے والی اشیا کے دفتر بھیج دیا جانا چاہیے، خاص کر اس لیے بھی کہ اس کا سانچا تیار کیا جا چکا ہے۔ اس پر ملزم نے بہت سختی سے جواب دیا تھا کہ وہ خود کو اس کا قانونی طور پر حق دار سمجھتا ہے، اس لیے کہ اس سے اس کی ولادت کے موقع پر ایسی ہی انگلی کا— کوڈ کی صورت میں، جس سے مراد "drumstick" تھیں— وعدہ کیا گیا تھا: مزید یہ کہ، ہربرٹ ٹروزنسکی کی پشت پر بنے نشانات بھی انگلی جیسے تھے: مزید یہ کہ 'ساسپے' کے قبرستان میں کچھ کارتوس کے خول بھی پائے گئے تھے جن کے طول و عرض کے مضمرات مستقبل کی انگوٹھی کی انگلی کے تھے۔

حالاں کہ پہلے میں اپنے نو دریافت دوست کے دلائل پر مسکرایا، مگر مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ ایک صاحبِ ادراک و بصیرت چوبِ نظارہ، پیٹھ کا نشان، کارتوس کا خول اور انگوٹھی کی انگلی کے تسلسل سے صرفِ نظر نہیں کر سکے گا۔

تیسری بار ٹیکسی کی سواری ڈنر کے بعد مجھے گھر لے گئی۔ہم نے پھر ملنے کا وعدہ کیا، اور جب تین دن بعد میں اپنے دوست سے ملا تو اس کے پاس میرے لیے حیرت کی بات تھی۔

پہلے اس نے مجھے اپنے کمرے دکھائے۔ابتدا میں اس نے صرف ایک کمرہ کرایے پر لیا تھا، نہایت فضول جگہ جو پہلے غسل خانے کے طور پر استعمال کی جاتی تھی، مگر بعد میں جب اس کی نظارہ نوازی نے اسے دولت اور شہرت دی تو اس نے ایک بے دریچہ گوشے کے لیے مزید کرایہ دینا منظور کیا، جس کو وہ مسز ڈوروتھیا کا کمرہ کہتا تھا۔اس کے بعد اس نے تیسرا کمرہ بھی کرایے پر لیا، جو پہلے ملزم کے ساتھی، موسیقار ایک مسٹر منشر کے تصرف میں تھا۔یہ سب اس کو صرف چند سکوں کے عوض مل گیا تھا، اس لیے کہ مسٹر زائیڈگر، مالک مکان، مسٹر ماتسیرات کی خوش اقبالی سے اچھی طرح واقف تھا اور اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے پُرعزم تھا۔

وہ مسز ڈوروتھیا کا کمرہ تھا جہاں ملزم نے اپنی حیرت انگیزی تیار کی تھی۔ایک واش اسٹینڈ کی مرمریں سطح پر — یا مجھے اس کو فرنیچر کا ایک حصہ یا پیچھے لگے آئینے کے باعث سنگھار میز کہنا چاہیے — ایک مربّا بنانے والا مرتبان رکھا ہوا تھا، جو تقریباً اسی پیمائش کا تھا جیسا کہ میری ماں، ہیلس فان ڈیگر، سیب کی چٹنی رکھنے کے لیے استعمال کرتی ہے جو ہمارے پکانے والے سیب سے تیار کی جاتی ہے۔اس مرتبان میں سیب کی چٹنی نہیں، بلکہ الکحل میں انگوٹھی والی انگلی تیر رہی تھی۔فخریہ انداز میں، ملزم نے مجھے کئی ضخیم سائنسی کتب دکھائیں، انگلی کو محفوظ کرنے کے عمل میں جن سے رجوع کیا گیا تھا۔میں نے خاکوں اور تصاویر پر رُکتے ہوئے، لاپروائی سے ان کی ورق گردانی کی، مگر اعتراف کیا کہ ملزم نے بہت اچھا کام کیا تھا اس لیے کہ انگلی کی شکل جوں کی توں تھی۔سجاوٹ کا ماہر ہوتے ہوئے میں نے اس کو یہ بھی بتایا کہ آئینے کے نیچے رکھا مرتبان اپنے مشمولات کے ساتھ دل چسپ سجاوٹ کا سامانِ بن گیا تھا۔جب ملزم نے دیکھا کہ میں مرتبان کا دوست بن گیا ہوں، تو اس نے مجھے بتایا کہ

کبھی کبھی وہ اسکی عبادت بھی کرتا ہے، اس سے دعا بھی مانگتا ہے۔میرا تجسس بڑھ گیا اور میں نے اس سے دعا کا ایک نمونہ طلب کیا۔اس کے بدلے میں اس نے ایک رعایت طلب کی —مجھے کاغذ اور پنسل دیتے ہوئے مجھ سے دعا لکھنے کی فرمائش کی۔ میں اس سے سوالات پوچھ سکتا تھا؛ کہ دعا کرتے وقت، وہ اپنے تمام تر علم کی بنیاد پر صحیح ترین جواب دے گا۔

اس مقام پر میں حلفی شہادت میں رقم کر رہا ہوں ملزم کے الفاظ، اپنے سوالات، اس کے جوابات:

محفوظ کرنے والے مرتبان کی تعظیم: میں تعظیم کرتا ہوں۔

کون، میں؟ آسکر یا میں؟... میں، دیانت داری سے؛ آسکر بدحواسی کے ساتھ۔ عقیدت، دائمی، تکرار کی پروا نہیں۔ میں تیز فہمی سے،بغیر یادداشت کے؛ آسکر، تیز فہمی سے کہ اس کی یادداشت مکمل ہے۔ میں، ٹھنڈا، گرم، نیم گرم۔ زیرِ امتحان مجرم۔بغیر امتحان معصوم۔ مغلوب مجرم، اس لیے کہ معافی طلب کی، معافی کا بوجھ اتار دیا، اس کے لیے لڑتا رہا، اس سے آزاد رہا، اس پر یا اس کے بارے میں ہنسا، اس کے لیے رویا، تقریر میں کفر بکا، خاموشی میں کفر بکا، میں بولتا نہیں، میں خاموش نہیں رہتا، میں دعا کرتا ہوں۔ میں تعظیم کرتا ہوں۔

کس کی؟...شیشے کے مرتبان کی؟

کس قسم کا مرتبان؟... کسی شے کو محفوظ کرنے کا مرتبان۔

اس میں کیا محفوظ ہے؟—ایک انگلی۔

کس قسم کی انگلی؟—انگوٹھی والی ایک انگلی۔

کس کی انگلی؟—سنہرے بالوں والی کی۔

سنہرے بالوں والی کون؟—درمیانہ قد۔

پانچ فٹ چار؟—پانچ فٹ پانچ۔

نفرت انگیز نشانات؟—ایک مسا۔

کہاں؟—بازو کے اندرونی جانب۔

دایاں، یا بایاں؟—دایاں۔

انگوٹھی کی انگلی، کہاں کی؟— بائیں ہاتھ کی۔

منگیتر؟— ہاں، مگر شادی شدہ نہیں۔

مذہب؟— پروٹسٹنٹ۔

باکرہ؟— باکرہ۔

پیدائش؟— نہیں معلوم۔

کہاں؟— ہینوور کے قریب۔

کب؟— دسمبر۔

بُرج: قوس یا جدی؟— قوس۔

کردار؟— بُز دل۔

نیک فطرت؟— باضمیر، باتونی۔

شعور؟— کفایت شعار، حقیقت پسند، مگر خوش دل۔

شرمیلی؟— ذائقے کی رسیا، صاف گو اور متعصب۔ زرد ی مائل، سفر کا خواب دیکھنے والی، حیض بے قاعدہ، سست مزاج، دکھ جھیلنا پسند ہے اور اس کے بارے میں بات کرتی ہے، تخیل سے عاری، مجہول، انتظار کرتی ہے کہ کیا ہونے والا ہے، اچھی سامع ہے، اتفاق پر سر ہلاتی ہے، بازو باندھے رہتی ہے، گفتگو کے دوران نظریں نیچی رکھتی ہے، بات کی جائے تو آنکھیں کھلی رکھتی ہے، رنگ سُرمئی، پُتلی کے نزدیک بھورا، انگوٹھی افسر کا تحفہ تھی، شادی شدہ آدمی تھا، پہلے لینی نہیں چاہی، پھر لے لی، تجربہ خوف ناک رہا، ریشے، شیطان، بہت ساری سفیدی، سفر پر گئی، منتقل ہو گئی، واپس آئی، رُک نہیں سکی، حاسد بھی ہے مگر بے وجہ۔ بیماری ہے بھی نہیں بھی موت ہے بھی نہیں بھی، ہاں، نہیں، بس بہت ہو گیا میں اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا۔

نیلے پھول چن رہی تھی جب قاتل آیا تھا— نہیں، قاتل ہر وقت ساتھ رہتا تھا۔

آمین؟— آمین۔

میں گاٹ فریڈ ڈِلر، یہ استدعا، اگرچہ ابھی محسوس ہو گی، منسلک کر رہا ہوں صرف

اس لیے کہ، انگوٹھی کی انگلی کی مالک سے متعلق اس میں شامل اشارے، مقتول عورت، مسٹر ڈوروتھیا کوئن گر، کے بارے میں دی گئی شہادت سے بہت ملتے ہیں۔اس کے باوجود، میں مجرم کی اس حجت پر کہ اس نے ڈوروتھیا کوئن گر کو قتل نہیں کیا ہے، نہ کبھی اسے رو بہ رو دیکھا ہے، شبہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں۔

میں بہرحال، محسوس ہوتا ہے کہ جس عقیدت و احترام کے ساتھ ملزم نے اس مرتبان کے سامنے دعا کی تھی اور نقارہ نوازی کی تھی — وہ گھٹنوں کے بل کھڑا تھا اور اس کا نقارہ اس کے گھٹنوں کے درمیان پھنسا ہوا تھا — وہ اس کے حق میں ایک دلیل ہے۔

مجھے، بعد کے برسوں میں، ملزم کو دعا کرتے اور نقارنوازی کرتے دیکھنے کے مزید مواقع ملے تھے، اس لیے کہ اس نے جلد ہی مجھے ایک کثیر تنخواہ کی پیش کش کر دی تھی — جو میں نے قبول کر لی تھی — کہ میں اس کے دوروں میں اس کے ساتھ رہوں گا، جنھیں اس نے کچھ عرصے کے لیے معطل کر دیا تھا مگر انگوٹھی کی انگلی کی دریافت کے بعد دوبارہ شروع کر دیا تھا۔ ہم پورے مغربی جرمنی گئے اور مشرقی علاقے میں، بلکہ ملک سے باہر بھی ہمیں فن کے مظاہرے کے پیش کش کی گئی تھی، مگر مسٹر ماتسیرات نے وفاقی جرمنی کی حدود میں رہنے کو ترجیح دی تھی، اور جیسا کہ خود اس نے کہا تھا کہ وہ عام قسم کی بین الاقوامی مسابقت اور دوڑ بھاگ میں شامل نہیں ہونا چاہتا۔ اپنی فنی پیش کش سے پہلے کبھی اس نے مرتبان کے سامنے نہ دعا کی اور نقارہ نوازی کی تھی۔ مگر اپنی پیش کش، اور ایک طویل ڈنر کے بعد وہ اپنے ہوٹل میں واپس جاتا، تب دعا کرتا اور نقارہ نوازی کرتا تھا، اور میں سوالات کرتا اور جوابات لکھتا جاتا تھا؛ اس کے بعد وہ اپنی دعا کا پچھلے دنوں اور ہفتوں کی دعاؤں سے تقابل کرتا تھا۔ دعائیں مختلف طوالت کی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی الفاظ شدت سے ٹکراتے تھے، بعد کے دنوں میں تال رواں، تقریباً مراقبے جیسی ہوتی تھی۔ پھر بھی، وہ دعائیں جو میں نے جمع کی تھیں اور اس سے استدعا کے ساتھ عدالت کے سامنے پیش کر رہا ہوں، ان میں میرے پہلے مخطوطے کے علاوہ زیادہ اطلاعات نہیں، جو میں نے اپنے بیان میں شامل کر دی ہیں۔

اس برس، دوروں کے درمیان میری مسٹر ماتسیرات کے کچھ دوستوں اور رشتے

داروں سے سطحی شناسائی ہو گئی تھی۔ ملزم کی سوتیلی ماں مسز ماریا ماتسیرات سے، جس کا وہ بہت احترام کرتا ہے، کچھ پابندیوں کے ساتھ میری ملاقات ہوئی تھی۔ اور اسی شام میری ملزم کے سوتیلے بھائی کُرٹ ماتسیرات سے بھی شناسائی ہو گئی، جو گیارہ برس کا شائستہ لڑکا ہے۔ مسز ماریا ماتسیرات کی بہن مسز گسٹے کوئیسٹر نے بھی مجھ پر اچھا تاثر چھوڑا تھا۔ جیسا کہ ملزم نے میرے سامنے اعتراف کیا تھا، مابعد جنگ کے برسوں میں اپنے خاندان سے اس کے تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ ان میں تبدیلی اس وقت آئی، جب مسٹر ماتسیرات نے اپنی سوتیلی ماں کی ایک بڑی غذائی دُکان قائم کرنے میں مدد کی تھی، جس میں گرم ملکوں کے پھل بھی فروخت ہوتے تھے؛ اور جب بھی مشکلات ہوتیں، ان کی مالی امداد بھی کرتا تھا، کہ اس کے اپنی سوتیلی ماں اور سوتیلے بھائی سے بھی دوستانہ تعلقات ہو گئے تھے۔

مسٹر ماتسیرات نے اپنے کئی سابق ساتھیوں سے بھی میرا تعارف کرایا، جن میں زیادہ تر جاز موسیقار تھے۔ مسٹر منسٹر، جسے ملزم بے تکلفی میں کلیپ کہتا تھا، مجھے ایک خوش مزاج اور ملنسار آدمی لگا، مگر مجھ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں اتنے سارے لوگوں سے تعلقات قائم رکھ سکتا۔ اگرچہ ملزم کی فیاضی کے طفیل، اس دوران مجھے اپنے پیشے کا کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی، میرے پیشے کی محبت نے، دوروں کے درمیان، مجھے دو چار نمائشی کھڑکیاں سجانے کا موقع فراہم کیا تھا۔ ملزم نے میرے کام میں دوستانہ دلچسپی لی تھی۔ اکثر رات گئے تک وہ سڑک پر کھڑا مجھے اپنے فن کی مشق کرتے دیکھتا تھا۔

بسا اوقات جب کام ہو چکتا، ہم شہر کی طرف نکل جاتے۔ گو ہم پرانے شہر سے گریز کرتے تھے، اس لیے کہ خود ملزم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کھڑکیوں میں لگے گہرے سبز رنگ کے موٹے شیشوں یا قدیم طرز کے گوتھک حروف کے سائن بورڈ برداشت نہیں کر پاتا۔ اس قسم کے تفریحاتی سفر میں سے ایک — اور اب میں اپنے بیان کے اختتام پر آ رہا ہوں — ہم کو انٹر راتھ کے راستے ٹرام گوری میں لے گیا۔ اس وقت نصف شب گزر چکی تھی۔

ہم وہاں دنیا و مافیہا، اور ایک دوسرے سے بے خبر، پُرسکون کیفیت میں کھڑے آخری ٹرام گاڑیوں کو، طے شدہ وقت پر نکلتے دیکھتے رہے تھے۔ عجیب منظر تھا۔ چاروں طرف

رات کا اندھیرا۔ دور سڑک پر، اس لیے کہ یہ جمعہ تھا، ایک عورت کی بدمست دہاڑ۔ اس کے علاوہ مکمل خاموشی، اس لیے کہ آخری ٹرام گاڑیاں، اس کے باوجود کہ موڑ پر وہ گھنٹیاں یا تیز آواز پیدا کرتیں، شور نہیں کر رہی تھیں۔ تقریباً سب گاڑیاں سیدھی ٹرام گودی میں جاتی تھیں۔ مگر چند باہر ہی، جگہ جگہ، خالی، مگر نمائشی روشنیوں سے منور کھڑی تھیں۔ یہ کس کا تخیل تھا؟ ہم دونوں نے، میں پہلا تھا جس نے کہا تھا، ''خوب! میرے پیارے دوست، کیا خیال ہے؟'' مسٹر ماتسیرات نے سر ہلایا اور عجلت کا مظاہرہ کیے بغیر، ہم دونوں ٹرام گاڑی میں داخل ہو گئے۔ میں نے چلانے والے کی جگہ سنبھال لی اور جلد ہی اس کا عادی ہو گیا۔ میں نے آہستگی سے چلانا شروع کیا، مگر بتدریج رفتار بڑھتی گئی۔ میں اچھا چلانے والا نکلا۔ ماتسیرات نے— اب تیز روشنی میں نہائی ٹرام گودی ہمارے پیچھے تھی— ان الفاظ میں میری دلیری کا اعتراف کیا تھا، ''گاٹفریڈ، تمھارا پتسمہ یقیناً ٹھیک ٹھاک ہوا ہوگا، کہ تم ٹرام گاڑی اتنی اچھی طرح چلا سکتے ہو۔''

اس غیر مانوس پیشے نے مجھے بہت مسرور کیا۔ ٹرام گودی کو ہماری روانگی کی خبر نہیں ہوئی، اس لیے کہ ہمارا پیچھا نہیں کیا گیا۔ وہ لوگ بجلی بند کر کے ہمیں آسانی سے روک سکتے تھے۔ میں 'فلنگرن' کی جانب چلا؛ 'فلنگرن' کے بعد میں نے 'ہانتل' سے ہوتے ہوئے 'راتھ' اور 'راٹنگن' کی طرف جانے کا ارادہ کیا، مگر مسٹر ماتسیرات نے مجھے 'گرافن برگ' اور 'گرے شائم' کی طرف جانے کے لیے کہا۔ اگرچہ Lions' Den رقص گاہ کے نیچے والی پہاڑی کے بارے میں مجھے کچھ خدشات تھے، میں نے ملزم کے کہے پر عمل کیا۔ ہم پہاڑی پر چڑھ گئے، رقص گاہ ہمارے پیچھے رہ گئی، مگر ہمیں اچانک بریک دبانے پڑے، اس لیے کہ پٹڑی پر تین آدمی کھڑے تھے۔

'ہانتل' کے تھوڑی دیر بعد مسٹر ماتسیرات سگریٹ پینے کے لیے گاڑی کے اندر چلا گیا تھا، اور اب صرف میں، گاڑی چلانے والا، رہ گیا تھا جسے "All aboard!" کی صدا لگانی پڑی تھی۔ دو آدمی سیاہ پٹی لگی سبز رنگ کی ہیٹ پہنے تھے؛ تیسرا آدمی، جسے دونوں نے پکڑ رکھا تھا، ننگے سر تھا۔ میں نے دیکھا کہ ٹرام گاڑی پر چڑھنے کی کوشش میں تیسرے آدمی سے، یا تو اس کے اناڑی پن کے باعث، یا کم زور نظر کی وجہ سے کئی بار پائیدان چھوٹ

گیا تھا۔ اس کے ساتھیوں یا چوکی داروں نے اس کی مدد کی، بلکہ صحیح معنوں میں کہا جا سکتا ہے، اس کو ظالمانہ انداز میں میرے، یعنی چلانے والے کے پلیٹ فارم پر، اور اس کے بعد گاڑی کے اندر گھسیٹ لیا تھا۔ میں چل پڑا تھا کہ اچانک پیچھے سے، گاڑی کے اندر سے، مجھے قابلِ رحم ریں ریں اور ایک زوردار آواز سنائی دی، گویا کسی کو چانٹا مارا گیا تھا، مگر پھر مجھے مسٹر ماتسیرات کی کڑکتی آواز سنائی دی جو تو واردوں کو ایک، زخمی نصف نابینا کو، جس کی عینک کہیں گر گئی تھی، مارنا بند کرنے کی ہدایت دے رہا تھا۔ "تم اپنے کام سے کام رکھو" میں نے ایک سبز ہیٹ والے کو دھاڑتے سنا۔ اب اس کو مزہ چکھنا پڑے گا۔ بس بہت ہو چکا۔"

جس وقت میں 'گرے شائم' کی جانب آہستہ آہستہ جا رہا تھا، میرے دوست ماتسیرات نے پوچھا، اس بے چارے کا قصور کیا ہے۔ اس کے بعد گفتگو نے ایک حیرت انگیز رُخ اختیار کر لیا۔ ہم اُن دنوں میں پہنچ گئے، جنگ کے پہلے دن۔ یکم ستمبر 1939 اور معلوم ہوا کہ اس آدمی نے، جس کی نظر اتنی کم زور تھی کہ وہ تقریباً نابینا تھا، بے قاعدہ فوجی کی حیثیت میں، کسی پولش ڈاک خانے کے دفاع میں حصہ لیا تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ مسٹر ماتسیرات کو، جو اس وقت مشکل سے پندرہ برس کا رہا ہوگا، سارے واقعات سے واقف ہے؛ اس نے تو اس بیچارے شیطان کو وکٹر ویلاہون کے نام سے پہچان بھی لیا تھا، ایک کم زور نظر ملازم جو منی آرڈر تقسیم کیا کرتا تھا، جنگ میں جس کی عینک کھو گئی تھی، فرار ہو گیا تھا، جب جنگ چل رہی تھی، اور اپنے تلاش کرنے والوں کو چکمہ دے گیا تھا۔ انھوں نے 1939 کا جاری شدہ حکم نامہ تعمیلِ سزائے موت پیش کیا۔ بالآخر انھوں نے اس کو پکڑ لیا، ایک سبز ہیٹ والا چلایا؛ اور دوسرے نے اس سے اتفاق کیا، "بے حد مسرت ہے کہ اس کو دھر لیا گیا ہے۔ میں نے اپنا سارا فرصت کا وقت لگا دیا تھا، حتیٰ کہ اپنی چھٹیاں بھی۔ حکم، اگر آپ مہربانی کریں، حکم ہوتا ہے، اور یہ تو 1939 سے التوا میں تھا۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ میرے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں۔ میرا اپنا کام ہے۔" معلوم ہوا کہ وہ شخص سیلز مین تھا، اور کے ساتھ کی اپنی مشکلات بھی تھیں، مشرقی علاقے میں اس کا کاروبار تباہ ہو گیا تھا، اور اس کو نئے سرے سے شروع کرنا پڑا تھا۔ "مگر اب مزید برداشت نہیں کیا جا سکتا؛ آج رات ہم وہ حکم بجا لائیں گے، اور ماضی کا یہ قصہ آج ختم ہو جائے

گا۔خوش قسمتی کہ ہم آخری ٹرام گاڑی پر چڑھے تھے۔"

اس طرح، بالکل بے ارادہ، میں 'گرے شائم' جانے والی ایک ٹرام کار کا چلانے والا بن گیا، جس پر وہ جلاد سوار تھے اور ان کا شکار۔ 'گرے شائم' کا بازار اُلٹا پلٹا اور ویران پڑا تھا؛ یہاں سے میں دائیں جانب مُڑا، مسافروں کو شیشے کے کارخانے کے قریب آخری اسٹیشن پر اُتارنے کے لیے، اور وہاں سے ہم ماتسیرات کے گھر جانے کے لیے۔ آخری اسٹیشن سے تین اسٹیشن پہلے، مسٹر ماتسیرات اُتر کر پلیٹ فارم پر آیا، جہاں پیشہ ور ٹرام چلانے والے اپنے لنچ بکس جمع کرتے ہیں، اپنا بریف کیس جمع کیا، جس میں، جیسا کہ مجھے علم تھا شیشے کا مرتبان رکھا ہوا تھا۔

"ہمیں اس کو بچانا ہی ہوگا۔ یہ وکٹر ہے، بے چارہ وکٹر!" مسٹر ماتسیرات بہت پریشان تھا۔

اس کو اب تک صحیح عینک نہیں ملی ہے۔ اس کی قریب کی نظر بہت کم زور ہے، وہ اسے گولی ماریں گے، اور وہ غلط سمت دیکھ رہا ہوگا۔" جلاد مجھے نہتے لگ رہے تھے، مگر مسٹر ماتسیرات کو ان کے کوٹوں میں بے ہنگم ابھار نظر آ گئے تھے۔

"وہ پولش ڈاک خانے کا منی آرڈر تقسیم کرتا تھا۔ اب وہ وفاقی ڈاک خانے میں وہی کام کرتا ہے، مگر یہ لوگ کام کے وقت کے بعد اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں، ان کے پاس اب بھی اس کو گولی مار دینے کا حکم نامہ موجود ہے۔"

اگر چہ میں مسٹر ماتسیرات کی تشریحات کو پوری طرح سمجھ نہیں سکا تھا، میں نے وعدہ کر لیا تھا کہ میں گولی مارنے کے وقت موجود ہوں گا، اور اس عمل کو روکنے کی کوشش کروں گا۔

شیشے کے کارخانے کے پیچھے، پہلے باغیچوں سے ذرا پہلے — اگر چاند نکلا ہوتا تو میں اپنی ماں کا باغیچہ اور اس کا سیب کا درخت دیکھ سکتا تھا — میں نے بریک لگائیں اور گاڑی کے اندر چلا کر کہا، "آخری اسٹاپ — سب باہر۔" اور اپنی سبز ہیٹ اور سیاہ پٹیوں میں وہ بھی باہر نکلے۔ بے چارے وکٹر کو ایک بار پھر پائیدان پر مشکل ہوئی۔ اس وقت مسٹر ماتسیرات باہر نکلا، مگر پہلے اس نے اپنے کوٹ کے اندر سے اپنا نقارہ نکالا اور مجھ سے

مرتبان سمیت بریف کو سنبھالنے کے لیے کہا۔

ہم تجلا واور ان شکار کے پیچھے چلے۔ ٹرام گاڑی کی روشنیاں اب بھی جل رہی تھیں اور پلٹ کر دور فاصلے پر اسے دیکھ سکتے تھے۔

ہم باغیچے کی باڑ کے ساتھ ساتھ چلے۔ مجھے نقاہت محسوس ہونے لگی تھی۔ جب وہ تینوں ہمارے آگے رُک کر کھڑے ہو گئے، تو میں نے دیکھا حکم کی بجا آوری کے لیے کہ میری ماں کا باغیچہ چنا گیا تھا۔ ہم دونوں نے احتجاج کیا۔ ہم کو نظر انداز کرتے ہوئے انھوں نے تختے سے بنی باڑ گرادی، یہ مشکل کام نہیں تھا اس لیے کہ باڑ خود ہی ڈھیہ جانے والی تھی؛ اور بے چارے وکٹر کو سیب کے درخت سے باندھ دیا گیا، میری خمیدہ شاخ کے بالکل نیچے۔ جب ہمارا احتجاج جاری رہا تھا انھوں نے مڑے تڑے حکم نامے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ اس پر کورٹ مارشل کے انسپکٹر کے دستخط تھے جس کا نام زیلیونکی تھا، اور تاریخ اگر صحیح یاد ہے، تو اکتوبر 1939 کی پانچویں تھی۔ اس پر لگی ربڑ کی مہر بھی صحیح لگتی تھی۔ سخت نا امیدی کا عالم تھا۔ اس کے باوجود ہم نے اقوامِ متحدہ کے بارے میں بات کی، اجتماعی جُرم، آؤن آور وغیرہ وغیرہ؛ مگر ایک سبز ہیٹ والے نے سارے اعتراضات ایک طرف کر دیے، جن کی کوئی قانونی بنیاد نہیں تھی، اس نے ہمیں یقین دلایا، اس لیے کہ میثاقِ امن پر دستخط ہی نہیں ہوئے تھے، حتیٰ میثاق تیار بھی نہیں کیا گیا تھا۔ میں بھی تمھاری طرح آؤین آور کو ہی ووٹ دیتا ہوں۔'' وہ کہتا رہا۔

ہم نے کچھ نہیں کیا۔ جب سبز ہیٹ نے اپنے کوٹ کے اندر سے مشین پستول نکالے، مسٹر ماتسیرات نے اپنا نقارہ بھی نکال لیا۔ اس وقت چاند بادلوں سے نکلا اور مسٹر ماتسیرات نے نقار نوازی شروع کر دی... بے جگری سے۔

ایک حیرت انگیز تال تھی، مگر جانی پہچانی۔ بار بار حرف O بجتا؛ کھو جاتا، ابھی تک کھویا نہیں ہے۔ پولینڈ ابھی تک کھویا نہیں ہے! مگر وہ بے چارے وکٹر کی آواز تھی، اسے مسٹر ماتسیرات کی نقارہ نوازی کے حروف یاد تھے: جب تک ہم زندہ ہیں پولینڈ مر نہیں سکتا۔ سبز ہیٹ والے بھی اس تال سے واقف معلوم ہوتے تھے۔ میں چاندنی میں ان کو اپنی مشین کے پیچھے دہشت زدہ ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ وہ دہشت زدہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ

مارچ نے جو مسٹر ماتسیرات اور بے چارے وکٹر نے باغیچے میں شروع کیا تھا، پولش گھڑ سوار رسالے کو جگا دیا تھا۔ شاید چاند نے مدد کی تھی، یا ہو سکتا کہ نقارے، چاند اور بے چارے مایو پیا کے مریض کی ابھرتی ہوئی تیز آواز، سب نے مل کر گھڑ سواروں کو زمین سے اُچھلنے پر مجبور کر دیا تھا؛ سانڈ گھوڑے ہنہنائے، ٹاپیں گرجیں، نتھنوں سے بھاپ نکلی، مہمیز کھڑکھڑائیں، بُڑے، بُڑے... نہیں، ہرگز نہیں: گرج نہیں، چنگھاڑ نہیں، ہنہناہٹ یا بُڑے کی پکار نہیں بخاموشی سے وہ 'گرے شائم' کے کھیتوں کے اوپر سے گزر گئے، مگر بلا شبہ وہ پولش اُہلانوں (Uhlans) کے پرے تھے، اس لیے کہ مسٹر ماتسیرات کی سرخ اور سفید پالش کی طرح، کی تکونی جھنڈیاں ان کے نیزوں سے چمٹی ہوئی تھیں؛ نہیں، چمٹی صحیح لفظ نہیں، وہ تیریں، وہ لہرائیں، اور دراصل پورا پرا چاندنی میں تیرا، شاید چاند سے آ رہا تھا، تیر گیا، پہیوں پر بائیں جانب گھوم گیا ہمارے باغیچے کی طرف پھرا، گوشت اور خون کا نہیں، بکس سے نکلے ہوئے نئے کھلونوں کی طرح، توہمات کی طرح، مسٹر ماتسیرات کے نگہبان کی خوف آور مخلوں جیسا جو وہ گرہ دار ڈوریوں سے بناتا ہے، بے آواز مگر گرجتے ہوئے، بغیر گوشت کے، بغیر خون کے، پھر بھی پولش، ہم تک آئے گرجے، اور ہم نے اپنے آپ کو زمین پر گرا دیا، جب کہ چاند اور پولینڈ کے گھڑ سوار ہمارے اوپر سے، میری ماں کے باغیچے کے اوپر سے، اور تمام قرینے سے سنوارے باغیچوں کے اوپر سے پھلانگ گئے، مگر انھوں نے باغیچوں کو نقصان نہیں پہنچایا۔ وہ صرف بے چارے وکٹر کو ساتھ لے گئے، اور دونوں جلاد کھلے میدانوں میں، چاندنی میں گم، مگر ابھی تک گم نہیں ہوئے تھے، وہ مشرق کی جانب سرپٹ دوڑتے چلے گئے، پولینڈ کی جانب، چاند سے بھی پرے۔

ہانپتے ہوئے، ہم نے رات کے خاموش ہو جانے کا انتظار کیا، آسمانوں کے ایک بار پھر بند ہونے کا انتظار کیا، اور روشنی کو ہٹا دینے کا انتظار کیا جو اکیلی ہی ان سواروں کو جو عرصہ ہوئے مر چکے تھے، خاک ہو چکے تھے آخری حملے پر اُکسا سکتی تھی۔ میں پہلا شخص تھا جو کھڑا ہوا تھا۔ حالاں کہ میں نے چاند کے اثر کو کم نہیں سمجھا تھا، میں نے مسٹر ماتسیرات کو اس کی شان دار کامیابی پر مبارک باد دی تھی: اس کو فتح قرار دیا تھا۔ اس نے مجھے تھکے تھکے

بد دلی کے انداز سے کنارے ہٹایا۔ ''فتح، میرے پیارے گاٹ فریڈ؟ میں کئی فتوحات کر چکا ہوں، زندگی میں بہت کامیابی حاصل کر چکا ہوں۔ میں ایک بار نا کامیاب ہونا بھی پسند کروں گا، مگر یہ بہت مشکل کام ہے، اور بہت محنت مانگتا ہے۔''

یہ تقریر میری پسند کی نہیں تھی، اس لیے کہ میں محنتی آدمی ہوں اور مجھے کبھی معمولی سی بھی کامیابی نہیں ملی ہے، چہ جائے کہ فتح۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا مسٹر ماتسیرات میں تشکر کی کمی ہے، اور میں نے اس سے اتنا ہی کہا، ''تم بہت تکبر کر رہے ہو، آسکر!'' میں نے جرأت کی — اس وقت تک ہم ایک دوسرے کو اس کے پہلے نام سے مخاطب کرنے لگے تھے۔ ''تمام اخبارات تم سے بھرے ہوئے ہیں۔ تم نے اپنا نام بنا لیا ہے۔ میں دولت کے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوں۔ مگر کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ میرے لیے آسان ہے، جس کے بارے میں کسی اخبار نے کبھی اس قدر بھی نہیں لکھا ہے، کہ میں تمھارے جیسے شہرت کے ڈارلنگ کے ساتھ ساتھ رہتا ہوں۔ اُف، میں کتنا چاہتا ہوں کہ کوئی بڑا، منفرد، قابلِ دید کام کروں جیسا تم نے ابھی کیا ہے، سب کچھ خود کروں اور اخباروں میں داخل ہو جاؤں، طباعت میں اس طرح میرا ذکر کیا جائے: یہ تھا گاٹ فریڈ فان وِٹلر کا کارنامہ!''

مجھے مسٹر ماتسیرات کے قہقہے سے ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ پیٹھ کے بل لیٹا ہوا تھا، اور اپنے کوبڑ کو مٹی میں رگڑ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے گھاس کے گچھے کھینچ کر نکال رہا تھا، ان کو ہوا میں اچھال رہا تھا، کسی وحشی دیوتا کی طرح ہنس رہا تھا جو، سب کچھ کر سکتا ہو: کوئی شے اتنی آسان نہیں ہو سکتی، میرے دوست۔ لو یہ بریف کیس۔ خوش قسمتی، کہ پولش گھڑسوار رسالے نے اسے کچل نہیں دیا ہے۔ یہ میں تمھیں تحفے میں دے رہا ہوں؛ اس میں ایک مرتبان ہے جس کے اندر ایک انگوٹھی والی انگلی ہے۔ اس کو لو، 'گرے شائم' کی طرف دوڑو، ٹرام گاڑی ابھی وہیں ہے، اس کی تمام روشنیاں روشن ہیں۔ اندر جاؤ، اسے 'فُرستنوال' کی طرف چلا کر لے جاؤ، میرا تحفہ پولیس ہیڈ کوارٹرس لے جاؤ۔ میرے خلاف رپورٹ درج کراؤ اور کل کے تمام اخباروں میں تم اپنا نام دیکھو گے۔''

پہلے تو میں نے اس کی پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا: میں نے کہا کہ اس

مرتبان اور انگلی کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ مگر اس نے مجھے یقین دلایا: اس نے کہا، اس انگلی کے معاملے سے وہ تنگ آچکا ہے، اس کے علاوہ اس کے کئی پلاسٹر کے سانچے ہیں، اس نے سونے کا سانچا بھی بنوا لیا تھا۔ اس لیے کیا میں سوچ لوں، بریف کیس اٹھاؤں، کار میں بیٹھوں اور پولیس کے پاس چلا جاؤں۔

سو، میں چل پڑا۔ میں اپنے پیچھے بہت دیر تک مسٹر ماتسیرات کی ہنسی سنتا رہا۔ وہ وہیں ٹھہرا رہا، پشت کے بل لیٹا رہا۔ رات کے حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا، جب کہ میں شہر کی طرف چل دیا تھا۔ دوسرے دن صبح تک میں پولیس کے پاس نہیں گیا، مگر مسٹر ماتسیرات کا شکریہ، کہ میری رپورٹ نے اخباروں کو میری طرف متوجہ کر دیا تھا۔

اس دوران میں، مہربان مسٹر ماتسیرات 'گرے شائم' کے باہر سیاہ رات کی سیاہ گھاس پر لیٹا ہنستا رہا، کئی مہلک ستاروں کے سامنے قہقہے لوٹتا رہا، اتنی زور سے ہنسا کہ میں نے اپنا کوب گرم مٹی میں رگڑا، اور سوچا: سو جاؤ آسکر، تھوڑی دیر سو لو، قبل اس کے کہ پولیس آئے اور تمھیں جگا دے۔ پھر کبھی تم اتنی آزادی سے چاند کے نیچے لیٹ نہیں پاؤ گے۔

اور جب میں جاگا تو میں نے دیکھا، اور یہ دیکھنے سے پہلے کہ دن نکل آیا تھا، کوئی میرے چہرے کو چاٹ رہا تھا: اس سنسنی کا معیار گرم جوش، سخت تھا مگر بہت نہیں، اور نم آلود۔

کیا اتنی جلد پولیس آ سکتی تھی، ڈیگر کی جگائی، پولیس تم کو چاٹ کر جگا رہی تھی؟ مجھے اپنی آنکھ کھولنے کی کوئی جلدی نہیں تھی، مگر میں نے کچھ دیر کے لیے خود کو چاٹا جانے دیا: گرم جوشی سے، نمی سے، بہت سختی سے نہیں، کہ یہ عمل بہت فرحت بخش تھا۔ میں نے اس بات کی پروا نہیں کی کہ کون مجھے چاٹ رہا تھا: یا تو پولیس ہوگی، آسکر نے لقمہ دیا یا کوئی گائے۔ اس کے بعد ہی میں نے اپنی نیلی آنکھیں کھولیں۔

جا بجا کالے اور سفید دھبے، وہ مجھ پر سانس خارج کر رہی تھی اور مجھ کو اس وقت تک چاٹتی رہی جب تک کہ میں نے آنکھیں کھول نہیں دی تھیں۔ دن نکل آیا تھا، مطلع صاف سے ابر آلود تک تھا، اور میں نے خود سے کہا تھا، آسکر اس گائے پر اپنا وقت ضائع نہ کرو، خواہ اس کے دیکھنے کے انداز میں کوئی روحانیت ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی کھردری،

سکون بخش زبان کو، اپنی یادداشت بند کردینے کے ذریعے ساکن نہ کردینے دو۔ یہ دن ہے، مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں، تم کو جان بچا کر بھاگ جانا چاہیے۔ وِٹلر تمھیں پھانس رہا ہے؛ لہٰذا تمھیں فرار ہو جانا چاہیے۔ بغیر حقیقی فرار کے تم پر حقیقی الزام نہیں لگ سکتا۔ گائے کو چھوڑو اور بھاگ نکلو۔ دونوں صورت میں وہ تمھیں پکڑ لیں گے، تو خود کو پریشان کیوں کرو؟

اور ایک گائے سے اس طرح چائے، دھوئے گئے اور کنگھی کیے جانے کے بعد میں فرار ہو گیا۔ اپنی پرواز کے پہلے چند قدم کے بعد میں نے ایک طوفانی، صباحی قہقہہ لگایا تھا۔ اپنا نقارہ گائے کے پاس چھوڑتے ہوئے، جو میٹھی جگالی کر رہی تھی، میں ہنستا اپنی پرواز پر روانہ ہو گیا۔

# تمیں

ارے ہاں— میرا فرار! اس کے بارے میں بھی تو بتانا ہے۔ میں وِگر کی الزام تراشی کی قدر و قیمت بڑھانے کے لیے فرار ہوا تھا۔ فرار کے لیے، میں نے خود سے کہا تھا، سب سے پہلے کسی منزل کی ضرورت ہوتی ہے۔ کس طرف، آسکر، کہاں فرار ہونے کا ارادہ ہے؟ سیاسی رُکاوٹوں، نام نہاد آہنی پردے نے مجھے مشرق کی سمت فرار نہیں ہونے دیا۔ اپنی نانی کوواچکی کے چار لہنگوں کی طرف جانا بھی ممکن نہیں تھا، جو آج بھی کشوبیا کی آلو کی کاشت میں لہراتے ہیں، حالاں کہ— میں نے اپنے آپ سے کہا تھا— کہ اس فرار کا رُخ اسی جانب ہونا چاہیے، کہ میری نانی کے لہنگے موزوں منزل بن سکتے ہیں۔

بہ سبیلِ تذکرہ، آج میری تیسویں سالگرہ کا دن ہے۔ تیس برس کی عمر میں فرار جیسے سنجیدہ مسائل پر، وہ آدمی کی حیثیت میں ہو یا لڑکے کی، بحث کی جانی چاہیے۔ جب وہ تیس موم بتیوں سے مزین کیک لے کر آئی تو ماریا نے کہا تھا، "آسکر تم اب تیس برس کے ہو گئے ہو۔ اب تمھیں ہوش میں آجانا چاہیے۔"

کلیپ، میرے دوست کلیپ نے ہمیشہ کی طرح مجھے جاز کے کچھ ریکارڈ دیے، اور میرے کیک پر تیس موم بتیاں جلانے کے لیے پانچ دیا سلائیاں جلائیں۔ "اصل زندگی تیسویں برس شروع ہوتی ہے۔" کلیپ نے کہا تھا: اس کی عمر انتیس ہے۔

مگر میرے دوست گاٹ فریڈ وِٹلر نے، جسے میں دل سے چاہتا ہوں، مجھے مٹھائیاں

دیں، میرے پلنگ میں لگی باڑوں پر جھکا اور چپکے سے کہا تھا،" جب یسوع تمیں برس کے ہوئے تھے تو انھوں نے [اپنی نبوت کا] اعلان کردیا تھا اور اپنے اطراف شاگرد جمع کر لیے تھے۔"ڈاکٹر ہمیشہ میرے معاملات خراب کر دیتا ہے۔ محض اس لیے کہ میں تمیں برس کا ہوں، وہ چاہتا ہے کہ میں اپنا پلنگ خالی کردوں اور شاگرد بنا لوں۔ پھر میرا وکیل ایک کاغذ لہراتا اور مبارک باد کا بھونپو بجاتا ہوا آیا۔ اپنی نائیلون کی ہیٹ میرے پلنگ کے کھمبے پر ٹانگی اور میرے اور سالگرہ میں مدعو میرے دوستوں کے سامنے اعلان کیا،" کیسا خوش گوار اتفاق ہے! آج میرا موکل اپنی تیسویں سالگرہ منا رہا ہے؛ اور آج ہی مجھے خبر ملی ہے کہ انگوٹھی کی انگلی کا مقدمہ دوبارہ شروع کیا جا رہا ہے۔ ایک نیا سراغ مل گیا ہے۔ سسٹر بیٹا، اس کی دوست اور، آپ کو یاد ہے..."

بالکل وہی ہوا، میں جس کے بارے میں برسوں سے خوف زدہ تھا، کہ وہ قاتل کو تلاش کرلیں گے، مقدمہ دوبارہ شروع ہوگا، مجھے بری کردیں گے، مجھے اس اسپتال سے فارغ کردیں گے، میرا خوب صورت پلنگ چھین لیں گے، بادوباراں میں مجھے ٹھنڈی گلی میں ڈال دیں گے، اور تیس سالہ آسکر کو اپنے اور اپنے نقارے کے اطراف شاگرد جمع کرنے پر مجبور کردیں گے۔

لہٰذا وہ سسٹر بیٹا جس نے میری پیاری سسٹر ڈوروتھیا کو رشک، جلن اور حسد میں قتل کیا ہے۔ آپ کو شاید یاد ہوگا کہ ان دو نرسوں کے درمیان... ایسے حالات عموماً فلموں میں دکھائے جاتے ہیں... ڈاکٹر ورنر نام کا ایک آدمی تھا۔ معاملہ الجھا ہوا تھا۔ بیٹا ڈاکٹر ورنر سے محبت کرتی تھی، ڈاکٹر ورنر ڈوروتھیا کی محبت میں گرفتار تھا، جب کہ ڈوروتھیا کسی سے محبت نہیں کرتی تھی، اور اگر کرتی تھی بھی تو ننھے آسکر سے، جو بہت خفیہ تھی۔ ورنر بیمار ہوگیا۔ ڈوروتھیا نے اس کی تیمارداری کی، اس لیے کہ وہ اسی کے وارڈ میں داخل تھا۔ سسٹر بیٹا اس صورت کو برداشت نہیں کرسکی۔ وہ ڈوروتھیا کو بہلا پھسلا کر چہل قدمی کے لیے رائی کے کھیت میں لے گئی اور اسے قتل کردیا، آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اسے 'گرے شائم' میں رائی کے کھیت میں قتل کردیا۔ اب سسٹر بیٹا ڈاکٹر ورنر کی تیمارداری کرنے میں آزاد تھی۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے ورنر کی ذرا خاص طریقے سے نگہ داری کی، اس حد تک کہ وہ ٹھیک نہیں ہو سکا، یعنی معاملہ بالکل برعکس تھا۔ شاید محبت میں پاگل نرس نے اپنے آپ سے کہا

ہوگا: جب تک یہ بیمار ہے، یہ ہمارا ہوگا۔تو کیا وہ وزنر کو ضرورت سے زیادہ دوائیں دیتی تھی؟ کیا وہ اپنے مریض کو غلط دوائیں دیتی رہی؟ بہر حال، ڈاکٹر وزنر چل بسا، مگر جب مسٹر بیبا نے عدالت میں حلفیہ گواہی دی تو اس نے غلط دوا یا بہت زیادہ دوا کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ مسٹر ڈوروتھیا کے ساتھ رائی کے کھیت میں جانے کے بارے میں منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ اسی طرح، آسکر نے بھی کسی بات کا اعتراف نہیں کیا، مگر چوں کہ وہ، مرتبان میں محفوظ، الزام کا باعث ہونے والی، انگلی کا مالک تھا، اس کو رائی کے کھیت میں ہونے والے جرم میں سزا ہو گئی، مگر اس کیفیت کے باعث کہ آسکر اپنے اعمال کا پوری طرح ذمے دار نہیں ہو سکتا تھا، انھوں نے مجھے دماغ کے اسپتال میں داخل کر دیا۔ بہر حال سزا پانے اور اسپتال بھیج دیے جانے سے پہلے ہی آسکر فرار ہو گیا، اس لیے کہ میں چاہتا تھا کہ میرے غائب ہونے سے میرے دوست گاٹ فریڈ کی الزام تراشی کی قدر بڑھ جائے۔

فرار کے وقت میں اٹھائیس برس کا تھا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے تک تیس عدد موم بتیاں میری سالگرہ کے کیک پر بلغمی انداز میں موم ٹپکا رہی تھیں۔ میرے فرار کے وقت ستمبر کا مہینہ تھا، جیسا کہ آج ہے۔ میں سنبلہ برج میں پیدا ہوا تھا، مگر اس وقت تو میں اپنے فرار کے بارے میں بات کر رہا ہوں، اپنی پیدائش کے بارے میں نہیں جو بجلی کے دو بلب کے نیچے ہوئی تھی۔

جیسا کہ میں بتا چکا ہوں، مشرق کی طرف فرار کا راستہ، یعنی میری نانی کے گھر جانے والی سڑک، بند تھی۔ لہٰذا جیسا کہ آج کل ہر کوئی کر رہا ہے، میں نے مغرب کی طرف فرار کا فیصلہ کیا۔ آسکر، میں نے اپنے آپ سے کہا، اگر سیاست کے ناقابلِ فہم طریقے تم کو اپنی نانی کی طرف جانے سے روک رہے ہیں، تو تم اپنے نانا کے پاس کیوں بھاگ نہیں جاتے، جو ریاست ہائے متحدہ کے شہر بفلو میں رہتا ہے؟ امریکا کو اپنی منزل بنالو: دیکھتے ہیں کہ تم کہاں تک کامیاب ہوتے ہو۔

امریکا میں مقیم نانا کوواچکی کی طرف فرار کا خیال مجھے اس وقت بھی آیا تھا جب میری آنکھیں بند تھیں اور 'گرے شائم' کے قریب مرغ زار میں گائے مجھے چاٹ رہی تھی۔ اس وقت صبح کے سات بجے رہے ہوں گے اور میں نے اپنے آپ سے کہا تھا، دکانیں آٹھ بجے کھلتی

ہیں۔ ہنستے ہوئے، میں نے گائے کے پاس اپنا نقارہ چھوڑا اور اپنے آپ سے کہتا ہوا، وہاں سے بھاگ لیا۔ گاٹ فریڈ تھکا ہوا تھا اور مجھے شبہ تھا کہ وہ آٹھ بجے یا ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے پولیس کے پاس جاسکے گا۔ اس موقعے کا فائدہ اٹھاؤ۔ 'گرے شائم' کے خوابیدہ مضافات میں ٹیلی فون کے ذریعے ٹیکسی بلانے میں دس منٹ لگے۔ ٹیکسی مجھے مرکزی اسٹیشن لے گئی۔ میں راستے میں اپنی رقم گِن رہا تھا؛ مجھے کئی بار پھر سے رقم گِننی پڑی تھی اس لیے کہ میں ہنسنے سے، اور صبح کے تازہ قہقہوں کا طوفان اٹھانے سے باز نہیں رہ سکا۔ اس کے بعد میں نے اپنے پاسپورٹ کی ورق گردانی کی اور دیکھا کہ ویسٹ کنسرٹ بیورو کے طفیل میرے پاس فرانس اور ریاست ہائے متحدہ کے ویزے موجود تھے۔ ڈاکٹر ڈوش کو امید تھی کہ ایک دن آئے گا جب آسکر نقارہ نواز ان ممالک کا دورہ کرنے پر راضی ہو جائے گا۔

میں نے خود سے کہا، چلو پیرس چلیں، شہر اچھا ہے بھی اور اچھا لگتا بھی ہے۔ یہ فلموں ہی میں ہو سکتا ہے، کہ پائپ پیتا [فرانسیسی فلمی اداکار] Gabin، مجھے، سنگ دلی سے مگر مہربانی اور مفاہمت کے ذریعے، تلاش کرتا نظر آئے گا۔ مگر میرا کردار کون ادا کرے گا؟ چیپلن؟ پکاسو؟ فرار کے خیالات کے زیرِ اثر ہنستا، میں قدرے شکن آلود پتلون میں ملبوس اپنے زانو پر ہاتھ مار رہا تھا، جب ٹیکسی والے نے مجھ سے سات مارک اُجرت طلب کی تھی۔ میں نے رقم ادا کی اور اسٹیشن کے ریستوران میں ناشتا کیا۔ میں نے میز پر، ابلے انڈوں کی پلیٹ کے برابر، ریل گاڑیوں کا نظامِ اوقات پھیلایا اور ایک مناسب گاڑی تلاش کر لی۔ ناشتے کے بعد میرے پاس زرِ مبادلہ لینے اور اعلیٰ درجے کا ایک چرمی سوٹ کیس خریدنے کا وقت تھا۔ 'جو لیجر اشتراسے' میں نظر آجانے کے خوف کے پیشِ نظر، میں نے قریب ہی سے ڈھیلی ڈالی چند قمیصیں، ہلکے سبز رنگ کا ایک پاجامہ سوٹ، دانت صاف کرنے کا برش، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ سے اپنا سوٹ کیس بھر لیا۔ چوں کہ کفایت شعاری کی ضرورت نہیں تھی، میں نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ خریدا اور ایک آرام دہ گدوں والی کھڑکی کی نشست پر، بغیر کسی جسمانی کوشش کے اپنا فرار شروع کیا۔ نشست کے آرام دہ گدوں نے مجھے سوچنے میں مدد دی۔ جب میرے باقاعدہ فرار کا افتتاح کرتی ہوئی ریل گاڑی اسٹیشن سے باہر نکلی تو آسکر نے

خوف پیدا کرنے والی باتوں پرغور کرنا شروع کیا، اور اپنے آپ سے کہا، جو بلاوجہ نہیں تھا، خوف سے عاری فرار کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا، مگر آسکر، تمھیں خطرہ کیا ہے؟ وہ فرار کسی کام کا نہیں، اگر پولیس تم سے سوائے صبح کے تبسم کے کچھ نہ اُگلوا سکے؟

آج میں تیس برس کا ہو گیا ہوں؛ فرار اور مقدمہ دونوں پیچھے رہ گئے ہیں مگر خوف، جس کے بارے میں درمیانِ فرار میں نے خود سے باتیں کی ہیں، مجھ پر اب بھی طاری ہے۔

وہ ریل کی پٹریوں کے متوازن دھکے تھے یا ریل گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ؟ آہستہ آہستہ گانا تشکیل پانے لگا، اور 'آخن' سے ذرا پہلے مجھے ان کا پورا احساس ہو گیا تھا: تنوع سے عاری الفاظ تھے وہ۔ میں فرسٹ کلاس نشست کے پُر تکلف گدوں میں غرق ہوا تو وہ مجھ پر حاوی ہو گئے۔ 'آخن' کے بعد بھی وہ میرے ساتھ ساتھ تھے، زیادہ واضح، خوف زدہ کر دینے والے؛ اور میں بہت خوش ہوا جب کسٹم کے افسروں نے موضوعِ گفتگو بدل دیا تھا۔ وہ میرے نام یا پاسپورٹ پر توجہ دینے کے بجائے میرے کوب میں زیادہ دل چسپی لے رہے تھے، اور میں نے خود سے کہا تھا، اُف، وہ وِٹلر! وہ اکل کھرا۔ گیارہ بج رہے ہیں مگر وہ ابھی تک مرطبان سمیت پولیس کے پاس پہنچا نہیں ہے؛ جب کہ میں، صرف اس کی خاطر، طلوعِ فجر کے وقت سے فرار میں مصروف رہا ہوں، اپنی حالتِ خوف کو بڑھاتا رہا ہوں تا کہ میں فرار کا جواز پیدا کر سکوں۔ بلجیم، اُف خدایا، میں کیسے خوف میں تھا جب پٹریاں گا رہی تھیں:

کہاں ہے کلوٹی، کہاں ہے چڑیل
یہی ہے وہ کالی، یہی ہے وہ سالی
بابا......بابا......بابا۔

آج میں تیس برس کا ہوں۔ مجھ پر نئے سرے سے مقدمہ چلایا جائے گا، غالباً میں بری ہو جاؤں گا۔ مجھے باہر نکال دیا جائے گا اور ہر طرف، ریل گاڑیوں میں، ٹرام کاروں میں، وہ الفاظ میرے کانوں میں بجیں گے: "کہاں ہے کلوٹی، کہاں ہے چڑیل؛ یہی ہے وہ کالی، یہی ہے وہ سالی۔"

پھر بھی، کلوٹی چڑیل کے خوف کے باوجود، میں ہر اسٹیشن پر جس کی موجودگی کی

توقع کر رہا تھا، سفر خاصا خوش گوار رہا۔ پورے ڈبے میں اکیلا میں ہی تھا— مگر ہو سکتا ہے کہ اگلے ڈبے میں وہ بھی رہی ہو، پارٹیشن کے بالکل قریب!— پہلے بلجیم والوں سے، اس کے بعد فرانس کے کسٹم افسروں سے میری صاحب سلامت ہوئی؛ میں اونگھتا رہا، اور کسی کے رونے کی آواز سے جاگ اٹھا۔ چڑیل کے خیال سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں نے ڈر اشپیگل (Der Spiegel) رسالے کی ورق گردانی شروع کر دی، جو میں نے 'ڈوسلڈارف' اسٹیشن کے پلیٹ فارم سے خریدا تھا: کہاں کہاں پہنچ جاتے ہیں یہ لوگ بھی، کتنے باخبر ہوتے ہیں یہ؛ میں اپنے آپ سے کہتا رہا۔ مجھے اپنے منیجر کے بارے میں بھی ایک خبر مل گئی۔ ڈاکٹر ڈوش نے مصدقہ طور پر کہا تھا کہ میں، مسمی آسکر نقارہ نواز، اچھی طرح جانتا تھا کہ میں ڈوش ایجنسی کی روٹی پانی کا بنیادی سہارا ہوں— کیا تصویر بنی تھی میری۔ اور بنیادی سہارا، آسکر، اپنے ذہن میں میری گرفتاری کے بعد ویسٹ کنسرٹ بیورو کے ناگزیر انہدام کی تصویر بنتی دیکھ رہا تھا۔

کبھی، زندگی بھر، میں کالی چڑیل سے خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ یہ صرف میرے فرار کے بعد ہی ہوا تھا، جب میں نے خوف زدہ ہونا چاہا تھا، کہ یہ چڑیل مجھ میں سما گئی تھی، اور آج تک، میری تیسویں سالگرہ پر بھی، سمائی ہوئی ہے، اگرچہ زیادہ تر سوئی رہتی ہے۔ طرح طرح کی شکل اختیار کرتی ہے۔ کبھی کبھی یا مثال کے طور پر، ''گوئٹے'' کا نام ہے جو مجھے چیخنے اور بستر کی چادر کے نیچے چھپ جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اپنے لڑکپن کے بعد سے، میں نے اس شہزادے شاعر کو پڑھنے کی کوشش کی ہے؛ اس کی اولمپئن خاموشی اب بھی مجھے خوف میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اب بھی، جب چمک دار اور کلاسیکی، مگر سیاہی کے بھیس میں، کالی چڑیل کی طرح، کسی راسپوتین سے کہیں زیادہ دغاباز، وہ میرے پلنگ کی گی حفاظتی سلاخوں سے گھورتا ہے اور مجھ سے، میری تیسویں سالگرہ پر سوال کرتا ہے، ''کہاں ہے کلوٹی، کہاں ہے چڑیل؟'' تو میں سخت خوف زدہ ہو جاتا ہوں۔ ہاہا، ہاہا...

فراری آسکر کو پیرس لے جانے والی ریل گاڑی مجھ پر ہنسی۔ ابھی میں بین الاقوامی پولیس کی آمد کی توقع کر رہا تھا کہ ہماری گاڑی 'نارڈ' اسٹیشن میں داخل ہوئی، جسے فرانسیسی

Gare du Nord کہتے ہیں۔ مگر کوئی میرا انتظار نہیں کر رہا تھا، صرف ایک حمال تھا، جس سے سُرخ وائن کی اتنی بو آ رہی تھی کہ اپنی تمام تر نیک نیتی کے باوجود میں اس کو ہی کالی چڑیل سمجھ بیٹھا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس اس کے حوالے کیا تا کہ وہ مجھے باہر جانے والے پھاٹک سے چند گز کے فاصلے تک پہنچا دے۔ پولیس اور چڑیل، میں نے سوچا، غالباً پلیٹ فارم ٹکٹ پر رقم ضائع نہیں کرتے؛ وہ پہلے تم سے چھیڑ چھاڑ کریں گے اور پھاٹک کے باہر تمھیں گرفتار کر لیں گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم باہر نکلنے سے پہلے اپنا سوٹ کیس سنبھال لو۔ مگر میرا سوٹ کیس لینے کے لیے پولیس باہر موجود نہیں تھی؛ میٹرو تک مجھے خود ہی گھسیٹ کر لے جانا پڑا تھا۔ میں میٹرو کی مشہور بو پر اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ میں نے حال ہی میں کہیں پڑھا تھا کہ اس بو کی ایک خوش بو بنائی گئی ہے اور آپ اس کو اپنے اوپر خود ہی چھڑک سکتے ہیں۔ میٹرو نے بھی، ایسی تال میں، جو ریلوے کی تال سے مختلف تھی، کالی چڑیل کی بابت پوچھا تھا۔ مجھے ایک اور بات نظر آئی تھی کہ دوسرے تمام مسافر خوف سے پسینے پسینے ہو رہے تھے، شاید میری طرح وہ بھی اس سے خوف زدہ تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں میٹرو سے ہی Porte d'Italie تک جاؤں گا، جہاں سے 'اورلی' ہوائی اڈے کے لیے ٹیکسی لے لوں گا۔ اگر میں 'نارڈ ریلوے اسٹیشن پر گرفتار نہیں ہوا تو، میں نے سوچا، کہ دنیا کا مشہور ہوائی اڈہ 'اورلی'— جہاں وہ چڑیل ہوائی میزبان کی وردی میں ملبوس ہو گی— بہتر رہے گا، کہ گرفتاری کے لیے وہ جگہ اچھی رہے گی۔ راستے میں ایک بار گاڑی بدلنی پڑی، میں خوش تھا کہ میرا سوٹ کیس زیادہ بھاری نہیں تھا۔ میٹرو مجھے جنوب کی طرف لے جا رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا: آسکر، کہاں اُترنے کا ارادہ ہے؟ اُف خدایا، ایک دن میں کیا کیا واقعات ہو سکتے ہیں، اس صبح 'گریشائم' کے قریب تمھیں ایک گائے چاٹ رہی تھی، تم بے خوف اور خوش تھے، اور اب تم پیرس میں ہو۔ آخر تم کہاں اترو گے، وہ خوف ناک کلوٹی، تم سے ملنے کس جگہ آئے گی؟ Place d'Italie میں، 'پورٹے' سے پہلے نہیں؟

میں میسن بلانچ پر یہ سوچتا ہوا اُترا، جو 'پورٹے' سے پہلے کا اسٹیشن ہے کہ وہ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ میں سوچ رہا ہوں کہ وہ 'پورٹے' پر میرے انتظار میں ہوں گے۔ مگر چڑیل جانتی

ہے کہ میں کیا سوچتا ہوں اور وہ کیا سوچتے ہیں۔ اس کے علاوہ، میں اس سب سے تنگ بھی آ چکا تھا۔ میرا فرار، اور اس کے لیے جو تکلیف میں نے اٹھائی ہے، تھکا دینے والی تھی۔ آسکر کی ہوائی اڈے جانے کی خواہش ختم ہو چکی تھی؛ اس مرحلے پر اسے 'اورلی' سے زیادہ میسن بلانچ اچھا لگا۔ وہ صحیح بھی تھا۔ اس لیے کہ اس اسٹیشن پر بجلی کی سیڑھیاں ہوتی ہیں۔ بجلی کی سیڑھیوں کے ساتھ، میں نے سوچا، دو چار بلند حوصلے مجھے جوش دلانے کے لیے کافی ہوں گے، اور چڑیل کے لیے کھڑ کھڑاہٹ بھی صحیح رہے گی۔ "یہی ہے کلوٹی، یہی ہے چڑیل... ہاہا... ہاہا... ہاہا"

آسکر الجھن میں تھا۔ اس کا فرار، ختم ہونے کو ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی کہانی بھی ختم ہونے والی ہے: کیا میسن بلانچ کی بجلی کی سیڑھیاں، اونچی، ڈھلوانی اور اتنی علامتی ہوں گی کہ ان یادداشتوں پر کھڑکھڑاتا پردہ ڈال دیں گی۔

مگر میری تیسویں سال گرہ بھی تو ہے۔ ان تمام لوگوں کے لیے جو محسوس کرتے ہیں کہ بجلی کی سیڑھی بہت زیادہ آواز کرتی ہے، اور ان لوگوں کے لیے جو کالی چڑیل سے نہیں ڈرتے، میں اپنی تیسویں سالگرہ کو ایک متبادل اختتام کے طور پر پیش کرتا ہوں۔ کیا تمام سال گرہوں میں سے تیسویں سالگرہ سب سے زیادہ اہم نہیں ہوتی؟ اس میں تین خصوصیات ہوتی ہیں، اور یہ ساٹھ کی پیش بندی کرتی ہے، اس لیے وہ غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ چوں کہ میری سالگرہ کے کیک پر تیس موم بتیاں جل رہی تھیں۔ میں رفعت کے باعث خوشی سے رو سکتا تھا، مگر میں ماریا کے سامنے شرمندہ تھا، اب تم کو رونے کا حق نہیں رہا۔

جوں ہی میں نے بجلی کے زینے پر پہلا قدم رکھا — اگر بجلی کی سیڑھی میں پہلا زینہ ہوتا ہے — اور اس نے مجھے اوپر لے جانا شروع کیا تو میں ہنس پڑا۔ اس کے باوجود، یا اپنے خوف کے باعث، میں ہنستا رہا۔ آہستہ آہستہ سیڑھی اوپر گئی، اور وہ اوپر پہنچ گئے۔ کم از کم آدھی سگریٹ کے لیے وقت تھا۔ مجھ سے دو قدم اوپر ایک محبت کرنے والا جوڑا کھلم کھلا مصروف تھا۔ ایک قدم نیچے ایک بوڑھی عورت تھی جسے پہلے میں بلاوجہ چڑیل سمجھ بیٹھا تھا۔ اس نے پھلوں سے سجی ہیٹ پہن رکھی تھی۔ سگریٹ پیتے ہوئے میں نے ان خیالات کو جمع کیا، بجلی کی سیڑھی کو جن کا مشورہ دینا چاہیے تھا۔ واپسی پر آسکر جہنم سے واپس آتے ہوئے

دانتے کے روپ میں تھا؛ اوپر کی طرف، سیڑھی کے آخر میں، ورانچینگل رسالے کے رپورٹر اس کے منتظر تھے۔ ''ہاں دانتے'' انھوں نے پوچھا ''بتاؤ، وہاں کا حال کیسا ہے؟'' اس کے بعد میں شہزادے شاعر کے روپ میں گویئٹے تھا، اور رپورٹروں نے مجھ سے دریافت کیا کہ مجھے ماؤں سے ملاقات میں کیسا لطف آیا۔ مگر میں شاعروں سے عاجز آ چکا تھا، اور میں نے سوچا، کیا یہ ورانچینگل کے رپورٹر نہیں، جاسوس ہیں جو اپنی جیبوں میں اپنے شناختی بلے چھپائے کھڑے ہیں۔ یہ وہی تو ہے — یہی ہے وہ کالی چڑیل۔ ہاہاہا... ہاہاہا...''

بجلی کی سیڑھی سے ملحق عام زینہ بھی تھا، مسافروں کو نیچے میٹرو اسٹیشن لے جانے والا۔ باہر شاید بارش ہو رہی تھی۔ لوگ بھیگے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میں فکرمند ہوگیا: 'ڈوسلڈارف' چھوڑتے وقت برساتی خریدنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ بہر حال میں نے اوپر ایک اور نظر ڈالی، اور آسکر نے لوگوں کو شہری چھتریاں لیے دیکھا — نگران کے باعث کالی چڑیل کے وجود پر شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں انھیں کیسے مخاطب کروں؟ میں آہستہ آہستہ سگریٹ کا مزہ لیتا؛ جس آہستگی سے سیڑھی میری بلند خیالی کو جگاتی اور میرے علم کو زرخیز کر رہی تھی، میں سوچ رہا تھا: بجلی کی سیڑھی، آدمی کو نئے سرے سے جوان کر دیتی ہے، بجلی کی سیڑھی پر بوڑھے اور بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ مجھے بجلی کی سیڑھی چھوڑ دینے کا اختیار تھا، ایک سہ سالہ بچے یا ساٹھ سالہ آدمی کی حیثیت میں، اور انٹرپول سے ملنے کا۔

شاید بہت دیر ہو گئی تھی۔ میرے پلنگ کا آہنی سرھانہ بہت تھکا نظر آ رہا تھا۔ اور برونو، میرا نگہبان سوراخ سے مجھے اپنی بھوری آنکھیں دکھا رہا تھا۔ اُدھر، آبی رنگوں سے بنی تصویر کے نیچے، اپنی تیس موم بتیوں سمیت سالگرہ کا میرا کیک، بالکل سالم، رکھا ہوا تھا۔ شاید ماریا سو گئی ہے۔ کسی نے، وہ شاید ماریا کی بہن گسٹے تھی، جس نے میرے لیے اگلے تیس برس خوش قسمتی کی خواہشات پیش کی تھیں۔ اسکول کے لڑکے، مثالی طالب علم، ہمیشہ اول نے والے کرٹ نے کیا کیا۔ میرے بیٹے کرٹ نے میری سالگرہ پر کیا خواہش پیش کی؟ مجھے ماریا کی گہری نیند پر رشک آتا ہے۔ ماریا سوتی ہے تو اس کے ساتھ، اس کے اطراف کا

فرنیچر بھی سو جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں، گرٹ نے میری تیسویں سالگرہ پر جلد صحت مند ہو جانے کی خواہش کی ہے، مگر مجھے بس ماریا کی گہری نیند کی ایک چھانک چاہیے، اس لیے کہ میں تھک چکا ہوں۔کلیپ کی جوان بیوی نے میرے کوب کے لیے ایک احمقانہ مگر بامعنی نظم ترتیب دی تھی۔شہزادی ایوجین بھی ناقص تخلیق تھا، مگر وہ نقص 'بیلگریڈ' کے قلعے کی فتح میں مانع نہیں ہوا تھا۔شہزادے ایوجین کے بھی دو باپ تھے۔اب میں تیس برس کا ہوں، مگر میرا کوب کم عمر ہے۔لوئی چہاردہم شہزادہ ایوجین کا قیاسی باپ تھا، وہ سمجھے تھے کہ یہ خوش قسمتی واپس لائے گا۔شہزادہ ایوجین ناقص تھا، اسی وجہ سے وہ طبعی موت مرا تھا۔اگر یسوع بھی کوزہ پشت ہوتے تو وہ ان کو کبھی صلیب پر کیلوں سے گاڑ نہ پاتے۔چوں کہ میں بھی تیس برس کا ہو گیا ہوں، تو کیا واقعی مجھے بھی دنیا میں نکل کر اپنے اطراف مرید جمع کرنے چاہئیں۔

مگر یہی وہ خیالات ہیں جو آپ کو بجلی کی سیڑھی پر آتے ہیں۔بلند تر اور بلند تر، یہ مجھ پر طاری ہوتے گئے۔میرے آگے اور مجھ سے پُرشوق محبت کرنے والے؛ عقب میں، اور میرے نیچے ہیٹ پہنے وہ عورت: باہر بارش ہو رہی تھی، اور اوپر انٹرپول کے جاسوس کھڑے تھے۔بجلی کی سیڑھیوں کے قدمچوں پر سلیٹیں لگی تھیں۔بجلی کی سیڑھی پر چڑھنا، سوچ بچار کے لیے بہترین وقت ہوتا ہے، ہر بات پر غور کرنے کا: تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ تم کہاں جا رہے ہو؟ تم کون ہو؟ تمھارا اصل نام کیا ہے؟ تم چاہتے کیا ہو؟ طرح طرح کی بوئیں مجھ پر حملہ آور ہوئیں— ماریا کا جوانی سے بھرپور ونیلا؛ سارڈین مچھلی کا تیل، جو میری ماں ٹین کے ڈبے میں گرم کرتی اور گرم ہی پیتی رہی، جب تک کہ خود بالکل ٹھنڈی نہیں ہو گئی اور زیرِ خاک لٹا دی نہیں دی گئی۔جان برانسکی کا کولون خوش بو کا فراوانی سے استعمال، قبل از وقت موت، جس کی بو اس کے تمام کاجوں کے ذریعے سرایت کر گئی تھی۔

گریف کی سبزی کی دُکان کے گودام سے سرما کے آلوؤں کی بو آ رہی تھی۔اور ایک بار پھر، اوّل آنے والے طلبہ کے سلیٹ صاف کرنے والے اسفنجوں کی بو، جو فضا میں لہرا رہی تھی اور میری روزویدا بھی، جو دار چینی اور جائفل جیسی مہکتی تھی۔ جب مسٹر فان گولڈ نے میرے بخار پر جراثیم کش مادہ چھڑکا تھا، میں کاربولک تیزاب کے بادلوں میں تیر گیا تھا۔اوہ،

اور سیکریڈ ہارٹ چرچ کی کیتھلک بوئیں، ان تمام قباؤں کی، جن کو کبھی دھوپ نہیں دکھائی گئی تھی، اور ٹھنڈی گرد، اور میں بائیں جانب کی شہ نشین پر، اپنا نقارہ اُدھار دیتا ہوا، مگر کس کو؟

مگر، اس قسم کے خیالات آنے لگتے ہیں جب آپ بجلی کی سیڑھی پر ہوتے ہیں۔

آج وہ مجھے روک دینا چاہتے ہیں، صلیب پر کیل سے گاڑنے کے لیے۔ وہ کہتے ہیں: تم تیس برس کے ہو گئے ہو۔ تمھیں اپنے پیروکار اکٹھے کرنے چاہییں۔ یاد کرو، تم نے کیا کہا تھا، جب انھوں نے تم کو گرفتار کیا تھا۔ اپنی سالگرہ کے کیک کی موم بتیاں رکھو، بستر سے باہر نکلو اور پیروکار جمع کرو۔ اس کے علاوہ بھی تیس برس کے آدمی کے لیے کتنے سارے امکانات ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر وہ مجھے اسپتال سے نکال دیتے ہیں تو میں ماریا کو شادی کی پیش کش کر سکتا ہوں۔ آج اس کے امکانات زیادہ ہو سکتے ہیں۔ آسکر نے اس کا کاروبار قائم کر دیا ہے، مشہور ہے، اپنے ریکارڈوں سے اچھی خاصی دولت کما رہا ہے اور قد بھی بڑھ گیا ہے، زیادہ سنجیدہ ہو گیا ہے۔ تیس برس کی عمر میں مرد کو شادی کر لینی چاہیے۔ یا میں کنوارہ رہ کر اپنے کئی پیشوں میں سے ایک سے شادی کر سکتا ہوں، کوئی اچھی سی shell-lime کان خرید سکتا ہوں، سنگ تراش ملازم رکھ سکتا ہوں، اور معماروں کو براہِ راست پتھر فراہم کر سکتا ہوں۔ تیس کی عمر میں مرد کو کوئی پیشہ اختیار کر لینا چاہیے۔ یا — اگر مصنوعی طور پر تیار شدہ سلوں کی وجہ سے میرا کاروبار تباہ ہو جائے — میں میوز اُلا کے درمیان اپنی شراکت کو دوبارہ شروع کر سکتا ہوں، اور ساتھ ہی، ہم فن کاروں کو تصورات بھی فراہم کر سکتے ہیں۔ کسی دن میوز کو میں ایک ایمان دار عورت بنا سکتا ہوں، بے چاری، ان تمام اچانک مصروفیات والی۔ تیس کی عمر میں مرد کو شادی کر لینی چاہیے۔ یا میں یورپ سے تھک کر ہجرت کر جاؤں — امریکا، اپنے خوابوں کے شہر بفلو۔ یا میں اپنے نانا جو کوچک، سابق لکھ پتی، آتش زن جوزف کو واچکی کی تلاش میں نکل پڑوں۔ تیس برس کے مرد کو گھر بسا لینا چاہیے۔ یا میں ہار مان لوں اور صلیب پر کیلوں سے گڑ جاؤں۔ محض اس لیے کہ اتفاق سے میں تیس کا ہو گیا ہوں، میں مسیح بن جاؤں اور لوگ مجھے اس روپ میں دیکھیں: اپنے بہتر فیصلے کے خلاف میں اپنے نقارے کو استطاعت سے زیادہ برداشت کرنے دوں؛ میں اس کو علامت بنا دوں،

کوئی فرقہ، کوئی جماعت یا صرف کوئی قیام گاہ۔

اوپر محبت کرنے والوں اور میرے نیچے والی عورت کے باوجود، بجلی کی سیڑھی والے خیالات مجھ پر یورش کرتے رہے۔ کیا میں کہہ چکا ہوں کہ محبت کرنے والے، ایک نہیں، دو قدم اوپر تھے، کہ میں نے اپنا سوٹ کیس، اپنے اور محبت کرنے والوں کے درمیان رکھ دیا تھا؟ فرانس کے نوجوان لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں۔ جب بجلی کی سیڑھی ہم سب کو اوپر لے جا رہی تھی، لڑکی نے اپنی چرمی جیکٹ کے بٹن کھولے، پھر لڑکے کی قمیص کھولی اور اس کی اٹھارہ برس کی برہنہ جلد کو سہلانے لگی تھی، مگر لڑکی کی حرکات اتنی کاروباری، اتنی غیر شہوانی تھیں کہ میرے ذہن میں ایک شبہ پیدا ہوا — پیرس کی، بے حجاب محبت کی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے حکومت ان کو رقم ادا کرتی ہوگی۔ مگر جب انھوں نے بوسے لیے تو میرا شبہ دور ہو گیا، اس لیے کہ لڑکے کا تقریباً دم گھٹ گیا تھا اور اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ میں نے اپنی سگریٹ بجھا دی تھی، اس لیے کہ میں جاسوسوں سے سگریٹ نہ پینے والا بن کر ملنا چاہتا تھا۔ میرے نیچے والی سیڑھی پر کی عورت اور اس کی ہیٹ نے — جو میرے چھوٹے قد کے باعث میرے سر کے برابر آ گئی تھی — متوجہ کرنے کے لیے کچھ نہیں کیا، بس اس نے بڑبڑا کر اپنی حد تک تھوڑا سا احتجاج کیا تھا، مگر یہ تو پیرس کے بہت سے لوگ کرتے رہتے ہیں۔ [بجلی کی سیڑھی کی] ربڑ سے ڈھکی ریلنگ ہمارے ساتھ ساتھ اوپر چل رہی تھی۔ آپ اس پر اپنا ہاتھ رکھ کر، اپنے ہاتھ کو مفت کی سیر کرا سکتے ہیں۔ اگر میں اپنے دستانے ساتھ لایا ہوتا تو میں ایسا ضرور کرتا۔ دیوار پر لگا ہر ٹائل روشنی کا ایک چھوٹا سا قطرہ منعکس کر رہا تھا۔ کریم رنگ پائپ اور تار ہمارے ہم سفر تھے۔ یہ نہیں سوچا جانا چاہیے کہ بجلی کی سیڑھی کوئی شیطانی عقیدہ پیش کر رہی تھی۔ اپنے میکانکی کردار کے باوصف یہ ایک شریفانہ، تن آسان اختراع تھی۔ اپنی ساحرانہ جھنکار کے ساتھ میسن بلانچ میٹرو اسٹیشن مجھے بالکل گھر جیسی خوش گوار جگہ لگی تھی۔ بجلی کی سیڑھی پر، باوجود اپنے خوف کے، باوجود چڑیل کے، میں خوش وخرم رہتا، اگر میرے اطراف کے لوگ مکمل طور پر اجنبی نہ ہوتے، بلکہ میرے دوست اور اعزہ ہوتے، زندہ یا مُردہ — ماآسیرات اور جان برانسکی کے درمیان بے چاری میری

مما ہوتی: بھورے بالوں والی چوہیا مدر ٹروڈینسکی، اپنے بچوں، ہربرٹ، گُشٹے، فرٹز، ماریا سمیت ہوتی؛ گر ریف سبزی فروش اور اس کی سلوویائی لینا ہوتی؛ اور ہاں، ہیر استاد اور زم و دل کُربا روزویا ہوتی؛ وہ سب ہوتے جنھوں نے میرے قابلِ اعتراض وجود کی تشکیل کی تھی، جو میرے پایاب وجود پر غمگین ہوا کرتے تھے، مگر اوپر جہاں بجلی کی سیڑھی ختم ہوتی تھی، میں پسند کرتا کہ انٹرپول والوں کی جگہ، کالی چڑیل کی بالکل متضاد: میری نانی انا کو اچکی پہاڑ کی طرح کھڑی، خدام کے ساتھ میرے خیر مقدم کو موجود ہوتی، اور میرا سفر اس کے لہنگوں کے نیچے، پہاڑ کے مرکز میں پہنچ کر ختم ہوتا۔ مگر وہاں تو دو حضرات تھے، لہنگے میں نہیں، امریکی طرز کی برساتیاں پہنے ہوئے۔ اور میرے سفر کے آخر میں، مجھے اپنے پیروں کی دسوں انگلیوں سے مسکراتے ہوئے، اپنے آپ سے اعتراف کرنا پڑا تھا کہ وہ بے شرم محبت کرنے والے، اور نچلی سیڑھی پر بڑبڑانے والی عورت، سب دراصل عام اور سادہ قسم کے جاسوس تھے۔

اب اور کیا کہوں— بجلی کے بلب کے نیچے پیدا ہوا، تین برس کی عمر میں ارادتاً اپنی بڑھوتری روک دی، نقارہ دیا گیا، گانے کی آواز سے شیشے توڑے، ونیلا سونگھی، گرجا گھروں میں کھانسا، چیونٹیوں پر غور کیا، قد بڑھانے کا فیصلہ کیا، نقارے کو دفن کیا، مغرب کی طرف ہجرت کی، مشرق کھویا، سنگ تراشی سیکھی، ماڈل کے طور پر کام کیا، دوبارہ نقارہ نوازی کی، کانکریٹ دیکھنے گیا، دولت کمائی، انگلی محفوظ کی، انگلی دے دی، ہنستے ہوئے فرار کیا، بجلی کی سیڑھی چڑھا، گرفتار ہوا، سزا ہوئی، دماغ کے اسپتال بھیج دیا گیا، جلد ہی بری ہونے والا ہوں، آج تیسویں سال گرہ منا رہا ہوں، اور اب بھی کالی چڑیل سے ڈرتا ہوں۔ میں نے سگریٹ پھینکی۔ وہ بجلی کی سیڑھی کے کسی قدمچے کی نالی میں پھنس گئی۔ پینتالیس ڈگری اوپر کی جانب کچھ دور سفر کیا، تین قدم افقی سفر کیا، اس کے بعد جاسوس محبت کرنے والوں نے اور جاسوس دادی اماں نے بجلی کی سیڑھی سے ایک ساکن پلیٹ فارم پر دھکیل دیا۔ جب انٹرپول کے حضرات خود کو متعارف کرا چکے اور اس کو ماتسیرات کے نام سے پکارا، تو اس نے، بجلی کی سیڑھیوں کے خیالات کے حکم کے مطابق، پہلے جرمن زبان میں جواب دیا، ''میں ہوں یسوع!'' اس کے بعد یہ جانتے ہوئے کہ وہ بین الاقوامی جاسوس ہیں، فرانسیسی زبان میں، پھر آخر میں انگریزی زبان میں کہا، ''میں یسوع ہوں!''

باوجود اس نے مجھے آسکر کے نام سے گرفتار کر لیا گیا۔ کسی مزاحمت کے بغیر، میں نے خود کو قانون کی حفاظت میں دے دیا اور چوں کہ Avenue d'Italic پر بارش ہو رہی تھی، انٹر پول والوں کی چھتری تلے چلا گیا، مگر مجھے اب بھی خوف تھا۔ کئی بار میں نے دیکھا، کئی بار اپنے اطراف، اِدھر اُدھر دیکھا، جی ہاں، میں نے کالی چڑیل کو سڑک پر اور اس بعد گزرتے لوگوں کی نہایت تحمل کے ساتھ، مجمعے میں دل گیری کرتے دیکھا، جو پیال سے بھری گاڑی کے اطراف جمع ہو گیا تھا۔

الفاظ ختم ہوتے جا رہے ہیں، اور میں سوچ رہا ہوں کہ دماغی اسپتال سے ناگزیر فراغت کے بعد آسکر کیا کرے گا— شادی؟ کنوارا رہے گا؟ ہجرت؟ ماڈل؟ پتھر کی کان خریدے گا؟ پیرو کار جمع کرے گا؟ کسی فرقے کی بنیاد ڈالے گا؟

ان تمام امکانات کا، جو ایک تیس سالہ کے لیے آج کل موجود ہیں، تجزیہ کرنا پڑے گا، مگر میں اپنے نقارے کے بغیر کیسے تجزیہ کروں؟ لہٰذا میں ایک چھوٹا سا 'ٹوٹی' بجاؤں گا جو میرے نزدیک زیادہ حقیقی ہو گیا ہے، زیادہ خوف آور ہو گیا ہے: میں کالی چڑیل کو بلاؤں گا اور اس سے مشورہ کروں گا، اور پھر کل صبح میں اپنے نگہبان برونو کو بتا سکوں گا کہ تیس سالہ آسکر کسی 'بگابو' (buggaboo) کے زیرِ سایہ کیا منصوبے بنا رہا ہے، جو روز بروز سیاہ سے سیاہ تر ہوتا جا رہا ہے، وہی پرانا دوست ہے جو مجھے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر ڈراتا رہتا تھا، جو کوئلے کے تہہ خانے میں بوبو کہتا تھا اور میں ہنسنے لگتا تھا، مگر وہاں بھی وہی کچھ ہوتا تھا، انگلیوں کے ذریعے باتیں کرنا، کنجی کے سوراخ کے ذریعے کھانسنا، اسٹوو میں گلے شکوے کرنا، دروازے کے قلابوں کے ثمر میں آواز نکالنا، جب جہاز کہر کے بھونپو بجاتے تو چمنی سے دھواں نکالنا، جب کوئی مکھی دوہرے شیشے کے درمیان مرنے سے پہلے گھنٹوں بھن بھن کرنے لگتی، جب بام مچھلیاں مما کے لیے اور مما بام مچھلیوں کے لیے ہنگامہ کرتی، اور جب سورج 'ناور ماؤنٹین' کے عقب میں ڈوبتا مگر کرنوں سے روشن امبر پر زندہ رہتا ہے۔ ہربرٹ کس کے پیچھے تھا جب اس نے چوبی مجسمے پر حملہ کیا تھا؟ اور مرکزی شہہ نشین کے عقب میں کیتھولکیت کیا ہو گی، بغیر چڑیل کے، جو اپنے سایے سے ہر اعتراف کرنے والے

کو بدنام کرد یتی ہے؟ یہ اسی کا سایہ پڑا تھا جب ہنکس منڈ کے کھلونے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ہماری عمارت کے صحن کے لونڈے لونڈیاں، ایکسل مشکے اور نوشی آئیگ، سوی کاٹر اور ہانشی کالس، سب جانتے تھے: جب وہ اینٹ کا شوربا بنا رہے تھے، تو کیا گا رہے تھے:

کہاں ہے وہ سائی، تارکول جیسی کالی

یہاں ہے وہ کالی، شرافت سے خالی چڑیل

ہاہا... ہاہا... ہاہا

تم ہی پہ ہے الزام، تم ہی ہو ناکام

تمھارا ہے سارا قصور، تم ہی تم ہو ہر جا حضور

کہاں ہے وہ سائی، تارکول جیسی کالی

وہ ہمیشہ وہاں رہی ہے، woodruff فز پاؤڈر میں بھی، بلبلے چھوڑتی، مگر معصوم بنی رہی؛ وہ کپڑوں کی الماری میں رہی، کپڑے کی ہر الماری میں، جس میں کبھی میں رہا تھا؛ بعد میں، تکونے چہرے والی لوسی رینوانڈ کے بل میں رہی، سائیج کی سینڈوچ کھائی اور تمام گرد جھاڑنے والوں کو غوطہ مینار پر بھیجا؛ صرف آسکر باقی رہا، اس نے چیونٹیوں کو دیکھا اور اس کو معلوم تھا: اس (عورت) کا سایہ تھا جو کئی گنا بڑھا ہے اور اس مٹھاس پر عمل کر رہا ہے۔ تمام الفاظ: مقدس، ملول، شان دار، کنواریوں کی کنواری... اور تمام پتھر: سنگِ سیاہ، کلسی پتھر، ڈائیورائٹ، رشل لائم میں گھونسلے، سنگِ جراحت، بہت نرم... اور تمام ٹوٹے ہوئے شیشے، شفاف شیشے، بال جیسے مہین شیشے... اور تمام کریانے کا سامان۔ ہر قسم کا آٹا اور چینی، ہم جنس لوگوں کی دولت، اور نصف پاؤنڈ کے تھیلے۔ بعد میں چار بلّے، جن میں سے ایک کا نام بسمارک تھا، ایک دیوار جس پر تازہ سفیدی پھیری جاتی تھی، پولینڈ والے جو موت کی رفعتوں میں تھے، خاص اعلانات ہو رہے تھے: کون جہاز ڈوبا، کب ڈوبا۔ ترازوؤں سے لڑھکتے آلو پیروں کی جانب مخروطی بکسے، قبرستان، میں جن میں کھڑا ہوا، پرچم میں جن پر گھٹنوں کے بل جھکا، ناریل کے ریشے میں جن پر لیٹا... آسکر سے یہ نہ پوچھو کہ وہ کون ہے! الفاظ مجھے ناکام بنا رہے ہیں۔ پہلے وہ پیچھے تھی، بعد میں اس نے میرے کوب کو بوسہ دیا... اب یا کبھی نہیں...

اب وہ میرے سامنے ہے... قریب آتی جا رہی ہے......

ہمیشہ ہمارے عقب میں رہی ہے وہ کالی کلوٹی چڑیل

اور اب سامنے بھی مرے ہے سیاہی کوئی

وہ سب حرف کالے، وہ کالا سا کوٹ، اور وہ کالا مال

مگر اب نہ بچوں نے گایا، تو کب گائیں گے:

کہاں ہے کلوٹی، کہاں ہے چڑیل؟

یہاں ہے وہ کالی، یہاں ہے وہ سالی

ہَہا ہا... ہَہا ہا... ہَہا ہا... ہہا

اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت یوں تو پرانی ہے اور بلاشبہ اس شعبے میں ہونے والا کام وقیع بھی ہے، لیکن اس حقیقت سے بہر حال انکار ممکن نہیں کہ ہمارے ہاں ترجمے کی اب بھی بہت گنجائش اور ضرورت ہے۔ اس بات کا احساس ہمیں خاص طور پر اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب اردو میں ترجمے کا کوئی اہم اور معیاری کام سامنے آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہوگی کہ ایسے کسی کام کو دیکھ کر اور مترجم کی صلاحیت کا اندازہ کر کے ہم سوچتے ہیں کہ وہ کتنا اور کیسا کام کر سکتا ہے۔ اس وقت میں اسی احساس سے دوچار ہوں اور میرے پیش نظر باقر نقوی کی نوبیل سیریز کی تیسری کتاب ''نوبیل حیاتیات'' ہے۔

گزشتہ چند برسوں میں باقر نقوی نے ترجمے کے شعبے میں جو بلند پایہ کام کیے ہیں، جیسے ''نوبیل ادبیات''، ''نوبیل امن کے سو برس'' اور اس کے بعد نوبیل انعام پانے والی ادیبہ ہرتا میولر کا ناول ''قلبی سرزمین'' — ان کاموں کے بارے میں بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ یہ باقر نقوی کی ادبی کارگزاری کا معتبر حوالہ تو ہیں ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردو ترجمے کے سفر کے روشن سنگ ہائے میل بھی ہیں۔ ان کے بعد باقر نقوی اب ایک اور کارنامے ''نوبیل حیاتیات'' کے ساتھ اردو قارئین کے سامنے ہیں۔

باقر نقوی ترجمے کی باکمال صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ نہیں کہ وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں، بلکہ اس کا سب سے اہم سبب ان کا تخلیقی مزاج ہے جو ان کے ترجمے کو ایسی رواں اور چاشنی عطا کرتا ہے جو بلاشبہ عہد حاضر کے ترجمہ نگاروں میں کم ہی لوگوں کے یہاں نظر آتی ہے۔ مصنف کے مافی الضمیر اور اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے کسی تحریر کو اپنی زبان کے سانچے میں رچاؤ کے ساتھ ڈھال لینا، یقیناً بڑے کارنامے سے کم نہیں۔ باقر نقوی اس عہد میں یہی کارنامے سرانجام دے رہے ہیں — اور ایک تواتر، ایک تسلسل کے ساتھ — جو خود ایک قابلِ رشک بات ہے۔

سید مظہر جمیل

نوبیل حیاتیات

باقر نقوی سے میرا دیرینہ تعارف ہے۔ اچھے شاعر اور اچھے انسان کی حیثیت سے انھوں نے اپنی پہچان برسوں پہلے بنالی تھی۔ وہ بہت زیادہ مشاعرے پڑھتے ہیں اور نہ ہی انھوں نے اپنے حلقۂ احباب کو بہت زیادہ وسیع کیا ہے، لیکن اپنی جو پہچان انھوں نے ایک بار قائم کی، وہ گزرتے وقت کے ساتھ مستحکم ہوتی چلی گئی۔ اگر میں یہ کہوں کہ گزشتہ برسوں میں وہ اپنی ادبی شناخت کے ابتدائی حوالے سے بہت آگے نکل گئے ہیں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

شناخت کے اس نئے سفر کا آغاز باقر نقوی نے کچھ سال پہلے سائنسی موضوعات سے اپنی غیر معمولی دل چسپی کے اظہار سے کیا تھا۔ خلیے اور الیکٹرونکس پر ان کی کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کے ساتھ ہی الفریڈ نوبیل پر انھوں نے کتاب لکھی — اور بس پھر تو وہ جان جیا ایسا کھلا۔ پہلے ''نوبیل ادبیات'' پھر ''نوبیل امن کے سو برس'' جیسی تاریخ میں زندہ رہنے والی کتابیں انھوں نے اردو قارئین کی نذر کیں۔ اس سلسلے کی تیسری کتاب اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے جو پوری تین ویں صدی کے ادویات کے شعبے میں نوبیل انعام حاصل کرنے والوں کی تقریروں اور ان کے کام کے تعارفی خطبات کے ترجمے پر مشتمل ہے۔ ادب، امن اور ادویات تینوں شعبے ویسے تو ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں، لیکن دیکھا جائے تو تینوں انسانی زندگی کی فلاح، ترقی اور خوش حالی سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ باقر نقوی نے نہ صرف اس تعلق کو بخوبی سمجھا ہے، بلکہ آج کی انسانی صورت حال میں اس کی شدید ضرورت کو بھی واضح طور پر محسوس کیا ہے۔ اسی لیے انھوں نے اہل اردو کو یہ بیش قیمت تحفے پیش کیے ہیں۔ سچ پوچھیے تو ترجمے کا یہ کام مجھے تو بہت سوں کے طبع زاد کام سے بھی بہت زیادہ قدر و قیمت کا حامل نظر آتا ہے۔ یہ کام ادارے کرتے تو بھی مبارک باد کے مستحق ہوتے، اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ باقر نقوی کے انفرادی کارناموں کی بڑھ چڑھ کر پذیرائی ہونی چاہیے۔

عطاء الحق قاسمی

جرمن قوم کی طرح جرمن ادب بھی اپنی ایک خاص شناخت رکھتا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ جرمن قوم جس طرح کے تغیرات اور تاریخ کے نشیب و فراز سے گزری ہے، اس کے ادب میں ہر تغیر کا ایک نمایاں عکس ملتا ہے۔ جرمن قوم نے عظیم شاعر، ادیب اور فلسفی پیدا کیے ہیں۔ اس روایت کو ہر دور میں ایک نئی آب و ہوا ملتی رہی۔ بیس ویں صدی میں ٹامس مان، ہرمن ہیس جیسے ناول نگار پیدا ہوئے۔ ان کے بعد ایک اہم نام گنتر گراس کا ہے، جنھوں نے مزاحمتی ادب اور سماجی حقیقت نگاری کو ایک نئے زاویے سے پیش کیا۔ گنتر گراس نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں اور افسانوں اور ناولوں کے ذریعے بھی انھوں نے جرمن ادب کو ایک نئی فضا سے آشنا کیا ہے۔ کئی بار ادبی دنیا کو یہ یقین ہوا کہ اس بار گنتر گراس کو ادبیات کا نوبیل انعام مل جائے گا لیکن باوجود اس میں تاخیر ہوتی رہی۔ آخر کار گنتر گراس کے ادبی اور تخلیقی معیار کے اعتراف میں ۱۹۹۹ء میں انھیں ادب کا نوبیل انعام مل گیا۔

گنتر گراس کے تمام ناولوں میں "دی ٹن ڈرم" کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اپنے موضوع، کرداروں اور تکنیک کے لحاظ سے یہ ناول ایک عجوبے سے کم نہیں۔ گراس کے اس اہم ناول کا ترجمہ معروف شاعر، افسانہ نگار اور مترجم باقر نقوی نے بڑی توجہ اور دیدہ ریزی سے کیا ہے۔ خوشی ہے کہ یہ ناول "نقارہ" کے عنوان سے اردو میں پہلی بار منظرِ عام پر آ رہا ہے۔ اس سے پہلے گنتر گراس کی چند تحریروں کا یقیناً ترجمہ ہوتا رہا ہے لیکن ان کے کسی بھی ناول کا اردو میں یہ پہلا مکمل ترجمہ ہے جسے باقر نقوی کے ادب شناس ذہن نے ترجمے کے لیے منتخب کیا۔ اس ترجمے کی زبان اور واقعات کسی حد تک مروجہ فکشن کے اسالیب سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اس کے مختلف اسلوب کو گرفت میں لے کر اردو میں ڈھال دینا یقیناً ایک کارنامہ ہے جسے باقر نقوی نے بڑی خوبی اور سلیقے سے مکمل کیا ہے۔

پروفیسر سحر انصاری

نقارہ

جرمن ادیب گنتر گراس کا شمار ان باکمال لکھنے والوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے لکھے ہوئے لفظوں اور رہ رہی ہوئی زندگی میں دوئی مٹانے کا ہنر پا لیا تھا — اور یہ ہنر ہما شما کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تپسیا کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور اس آگ کی بھی جو لکھنے والے کے اندر دوں کو دہکائے بھی رکھتی ہے اور روشن بھی۔ ان چیزوں کے ساتھ قسمت کی یاوری بھی اپنا ایک کام کرتی ہے۔ گنتر گراس کے تخلیقی معرکوں میں ان حقیقتوں کا احساس سب سے زیادہ اس کے ناول "دی ٹن ڈرم" کی بابت ہوتا ہے۔ یہ ناول کیا ہے، فن کے زندگی بن جانے کا معرکہ ہے، اور گنتر گراس اول تا آخر اس معرکے میں سرخ رو نظر آتا ہے۔ یہ گراس کی خوش قسمتی ہے اور اس ناول کے مترجم باقر نقوی کی خوش قسمتی ہے اور ہماری — ہم سب اردو پڑھنے والوں کی بھی خوش قسمتی ہے کہ گراس کا مزاج اور اس کا احساس اور لکھنے کا انداز اس ترجمے میں بڑی خوبی سے آ گیا ہے۔ باقر نقوی نے گزشتہ برسوں میں اردو ترجمے کے شعبے میں بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کا ایک کے بعد دوسرا کارنامہ سامنے آیا اور ایسا کہ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ خدا انھیں خوش رکھے اور وہ اسی طرح اپنی زبان اور اپنے ادب کو ثروت مند بناتے رہیں۔

اسد محمد خاں

جرمن ادیب گنٹر گراس کا شمار ان باکمال لکھنے والوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے لکھے ہوئے لفظوں اور برتی ہوئی زندگی میں دوئی مٹانے کا ہنر پا لیا تھا — اور یہ ہنر ہما شما کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے لیے تپسیا کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور اس آگ کی بھی جو لکھنے والے کے اندروں کو دہکائے بھی رکھتی ہے اور روشن بھی۔ ان چیزوں کے ساتھ قسمت کی یاوری بھی اپنا ایک کام کرتی ہے۔ گنٹر گراس کے تخلیقی معرکوں میں ان حقیقتوں کا احساس سب سے زیادہ اس کے ناول ”ٹن ڈرم“ کی بابت ہوتا ہے۔ یہ ناول کیا ہے، فن کے زندگی بن جانے کا معرکہ ہے، اور گنٹر گراس اول تا آخر اس معرکے میں سرخرو نظر آتا ہے۔ یہ گراس کی خوش قسمتی ہے اور اس ناول کے مترجم باقر نقوی کی خوش قسمتی ہے اور ہماری — ہم سب اردو پڑھنے والوں کی بھی خوش قسمتی ہے کہ گراس کا مزاج اور اس کا احساس اور لکھنے کا انداز اس ترجمے میں بڑی خوبی سے آ گیا ہے۔ باقر نقوی نے گزشتہ برسوں میں اردو ترجمے کے شعبے میں بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ ان کا ایک کے بعد دوسرا کارنامہ سامنے آیا اور ایسا کہ دیکھ کر جی خوش ہوا۔ خدا انھیں خوش رکھے اور وہ اسی طرح اپنی زبان اور اپنے ادب کو ثروت مند بناتے رہیں۔

اسد محمد خاں

ISBN 978-969-540083-8